آثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت
زیرِ نظر
اُستادِ محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۸

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ
زیرِ سرپرستی
حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ———— تفسیر نمونہ
جلد ———— ۸
زیر نظر ———— آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم ———— حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رح
ناشر ———— مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰ ر گنگا رام بلڈنگ،
شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور
مطبع ———— معراج دین پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت ———— ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ہدیہ ———— [redacted]

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر
۲۴ر الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۲۴۲۳، ۷۳۱۴۳۱۱

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ — کلام حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر — تفسیر نمونہ — کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلیٰ اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیام قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ، کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مُسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۸ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۱۴ میں سے صفحہ ۱۶۹ تا ۴۶۷، جلد ۱۵ مکمل شامل کی گئی ہے، چنانچہ یہ جلد سُورہ مومنون، سُورۂ نور، سُورۂ فرقان، سُورہ شعراء اور سُورہ نمل کی تفسیر اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھدَاء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر بُرہان	از	مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سید قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفٰی مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن ۲۷ ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملّت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِّ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک " ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطّوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے نکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماء میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیهم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دَور کی تفاسیر کو دینا ہو گا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گونا گوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا مَیں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی گیارہ جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی بارہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا مَیں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہو گی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہو گی [1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی [2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی مَیں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو [illegible] یر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دَور میں مؤلف کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گونا گوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بار الٰہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تُو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم۔ ایران
یکم رجب المرجب ۱۴۰۱ ہجری

تفسیر نمونہ جلد ۸

فہرست

سُورۂ مؤمنون	۲۶
سورۂ مومنون کی فضیلت	۲۷
سورۂ مومنون کے مندرجات	۲۸
آیت ۱ تا ۱۱	۳۰
مؤمنین کے نمایاں اوصاف	۳۱
چند اہم نکات	۳۷
۱۔ "افلح" کا مفہوم	۳۷
۲۔ دائمی اور کم مُدتی شریکِ حیات	۳۸
۳۔ خضوع وخشوع، رُوح نماز ہے	۳۸
آیت ۱۲ تا ۱۶	۴۰
رحم مادر میں "جنین" کے ارتقائی مراحل	۴۱
چند اہم نکات	۴۴
۱۔ مبداء اور معاد کا اثبات ایک دلیل ہے۔	۴۴
۲۔ رحم مادر میں انسان کی ارتقاء کا آخری مرحلہ	۴۴
۳۔ ہڈیوں پر گوشت کا غلاف	۴۵
۴۔ ہڈیوں کا پائیدار اور محافظ غلاف	۴۵
آیت ۱۷ تا ۲۲	۴۷
توحید کی نشانیوں کا ایک بار پھر تذکرہ	۴۸
آیت ۲۳ تا ۲۵	۵۴
کور دل مغروروں کی منطق	۵۵
آیت ۲۶ تا ۳۰	۵۷
ایک باغی قوم کا انجام	۵۹
آیت ۳۱ تا ۴۱	۶۲
قوم ثمود کا عبرت ناک انجام	۶۴
چند اہم نکات	۶۷
۱۔ پُرتعیش زندگی اور اس کے منحوس نتائج	۶۷
۲۔ "تراب" اور "عظام" کا مفہوم	۶۸
۳۔ "غثاء" سے کیا مُراد ہے	۶۸
۴۔ ایک عمومی انجام	۶۸
آیت ۴۲ تا ۴۴	۷۰
سرکش اقوام کی یکے بعد دیگرے ہلاکت	۷۱
آیت ۴۵ تا ۴۹	۷۳
حضرت موسیٰؑ کا قیام اور فرعونیوں کی تباہی	۷۴
آیت ۵۰	۷۷
اللہ کی ایک اور نشانی	۷۷
آیت ۵۱ تا ۵۴	۷۹

سب ایک اُمت ہیں	۸۰
آیت ۵۵ تا ۶۱	۸۵
بھلائیوں میں سبقت کرنے والے	۸۶
آیت ۶۲ تا ۶۷	۸۹
جہالت میں ڈوبے ہوئے دل	۹۰
آیت ۶۸ تا ۷۴	۹۴
مُنکرین کی بہانہ سازیاں	۹۵
چند اہم نکات	۹۸
۱۔ حق پرستی اور خواہشات پرستی	۹۸
۲۔ رہبر کی صفات	۹۹
۳۔ اکثریت حق کی طرف نہیں ہوتی	۱۰۰
آیت ۷۵ تا ۸۰	۱۰۳
خدا مختلف طریقوں سے بیدار کرتا ہے	۱۰۴
آیت ۸۱ تا ۹۰	۱۰۹
فیصلہ تمہارا ضمیر کرے	۱۱۱
چند اہم نکات	۱۱۳
۱۔ کچھ الفاظ کے معانی	۱۱۳
۲۔ معاد پر ایمان ۔ قدرت خدا کے حوالے سے ۔	۱۱۳
۳۔ آیات کے آخری حصّے کا فرق	۱۱۴
آیت ۹۱ تا ۹۲	۱۱۵
شرک دُنیا کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے	۱۱۵
آیت ۹۳ تا ۹۸	۱۱۹
شیطانی وسوسوں سے پناہ بخدا	۱۲۰
چند اہم نکات	۲
۱۔ "ھمزات الشیاطین" کیا ہے	۲
۲۔ بُرائی کا جواب بھلائی سے	۲
آیت ۹۹، ۱۰۰	۴
ناممکن تقاضا	۵
چند اہم نکات	۲۶
۱۔ "ربّ ارجعون" میں مخاطب کون ہے؟	۶
۲۔ "فیما ترکت" کا مفہوم	۲۷
۳۔ "کلّا" یہاں کس چیز کی نفی کرتا ہے	۱۲۷
۴۔ عالم برزخ کیا ہے؟	۱۲۸
برزخ اور عالمِ ارواح سے ارتباط	۱۳۳
عالمِ برزخ کا ایک خاکہ	۱۳۴
آیت ۱۰۱ تا ۱۰۴	۱۳۷
بدکرداروں کی سزا کا ایک گوشہ	۱۳۸
چند اہم نکات	۱۴۱
۱۔ جس روز سب رشتہ داریاں ختم ہوجائیں گی۔	۱۴۱
۲۔ "اصمعی" کی ہلا دینے والی داستان	۱۴۲
۳۔ سزا اور گناہ میں مناسبت	۱۴۵
آیت ۱۰۵ تا ۱۱۱	۱۴۷
مجھ سے بات کرو	۱۴۸
آیت ۱۱۲ تا ۱۱۶	۱۵۱
اس دُنیا کی عمر تھوڑی ہے	۱۵۲
موت زندگی کا خاتمہ نہیں	۱۵۵

آیت ۱۱۷، ۱۱۸	۱۵۰
کامیاب اور ناکام	۱۵۷
سورۂ نور	۱۶۰
سورۂ نور کی فضیلت	۱۶۱
سورۂ نور کے مضامین	۱۶۱
آیت ۱ تا ۳	۱۶۳
زانی مرد اور زانی عورت کی سزا	۱۶۴
چند اہم نکات	
۱۔ وہ مواقع جہاں زانی کی سزا موت ہے	۱۶۸
۲۔ زانی عورت کا ذکر مرد سے پہلے کیوں؟	۱۶۹
۳۔ سزا لوگوں کی موجودگی میں کیوں؟	۱۶۹
۴۔ اس سے پہلے زانی کے لیے کیا سزا تھی؟	۱۶۹
۵۔ اجرائے حد میں کمی بیشی ممنوع ہے	۱۷۰
۶۔ زانی کے ساتھ شادی بیاہ کی حرمت کی شرائط۔	۱۷۰
۷۔ حرمتِ زنا کا فلسفہ	۱۷۱
آیت ۴، ۵	۱۷۲
تہمت کی سزا	۱۷۲
چند اہم نکات	۱۷۴
۱۔ آیت میں "رمی" کا کیا معنی ہے؟	۱۷۴
۲۔ چار گواہ کیوں؟	۱۷۵
۳۔ قبولیت توبہ کی اہم شرط	۱۷۵
۴۔ احکام قذف	۱۷۶
آیت ۶ تا ۱۰	۱۷۸
شانِ نزول	۱۷۹
بیوی پر تہمت لگانے کی سزا	۱۸۰
چند اہم نکات	۱۸۲
۱۔ حکم قذف صرف بیوی اور شوہر کیلیے کیوں مخصوص ہے۔	۱۸۲
۲۔ "لعان" ایک مخصوص عمل	۱۸۲
۳۔ آیت میں جملہ شرطیہ کی جزائے محذوف	۱۸۳
آیت ۱۱ تا ۱۶	۱۸۴
شانِ نزول	۱۸۵
شانِ نزول کے بارے میں تحقیق	۱۸۹
ایک بہت بڑی تہمت	۱۹۰
آیت ۱۷ تا ۲۰	۱۹۵
برائیوں کی اشاعت ممنوع ہے	۱۹۵
چند اہم نکات	۱۹۸
۱۔ "فحشاء" کی اشاعت سے کیا مراد ہے	″
۲۔ غلط پراپیگنڈا۔ ایک بلا	۱۹۹
۳۔ گناہ کو معمولی سمجھنا	۲۰۰
آیت ۲۱ تا ۲۵	۲۰۱
جزا و سزا حساب و استحقاق کے مطابق ہوگی	۲۰۲
آیت ۲۶	۲۰۹
کند ہم جنس باہم جنس پرواز	۲۰۹
چند اہم نکات	۲۱۰
۱۔ "خبیثات" اور "خبیثون" کون ہیں؟	۲۱۰

۲۔ یہ حکم تکوینی ہے یا تشریعی؟	۲۱۱
۳۔ ایک سوال کا جواب	۲۱۱
آیت ۲۷ تا ۲۹	۲۱۳
بغیر اجازت لوگوں کے گھروں میں نہ جاؤ	۲۱۴
چند اہم نکات	۲۱۵
۱۔ گھر کی چار دیواری کا تحفظ اور آزادی	۲۱۵
۲۔ غیر رہائشی گھروں سے کیا مراد ہے؟	۲۱۷
۳۔ بغیر اجازت لوگوں کے گھروں میں جھانکنے کی سزا۔	۲۱۸
آیت ۳۰، ۳۱	۲۱۹
شانِ نزول	۲۲۰
بے پردگی اور بے حیائی کے خلاف اقدام	۲۲۱
چند اہم نکات	۲۲۵
۱۔ پردے کا فلسفہ	۲۲۵
۲۔ چہرے اور ہاتھوں کا استثناء	۲۲۹
۳۔ "نسائھن" سے کون مراد ہیں؟	۲۳۰
۴۔ "او ما ملکت ایمانھن" کی تفسیر	۲۳۱
۵۔ "اولی الاربۃ من الرجال" کی تفسیر	۲۳۱
۶۔ کون سے بچے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں	۲۳۲
۷۔ چچا اور ماموں کو محارم میں کیوں شمار نہیں کیا گیا؟	۲۳۲
۸۔ جنسی جذبات کو تحریک دینے والے تمام عوامل ممنوع ہیں۔	۲۳۳
آیت ۳۲ تا ۳۴	۲۳۴
آسان شادی بیاہ کی ترغیب	۲۳۵
چند اہم نکات	۲۴۰
۱۔ شادی خدائی حکم ہے	۲۴۰
۲۔ "والصالحین من عبادکم و امائکم" کی تفسیر	۲۴۲
۳۔ عقائد مکاتبہ	۲۴۳
آیت ۳۵ تا ۳۸	۲۴۴
آیت نور	۲۴۵
چند روایات	۲۵۵
آیت ۳۹، ۴۰	۲۵۹
سراب کی طرح کے اعمال	۲۵۹
آیت ۴۱، ۴۲	۲۶۳
سب اس کی تسبیح کرتے ہیں	۲۶۳
چند اہم نکات	۲۶۴
۱۔ "اَلَمْ تَرَ" کا مفہوم	۲۶۴
۲۔ موجوداتِ عالم کی تسبیح	۲۶۴
۳۔ پرندوں کی مخصوص تسبیح	۲۶۵
۴۔ "کل قد علم صلوٰتہ و تسبیحہ" کی تفسیر	۲۶۶
۵۔ "صلوٰۃ" سے کیا مراد ہے؟	۲۶۶
آیت ۴۳ تا ۴۵	۲۶۸
کچھ اور عجائبات خلقت	۲۶۹
ایک سوال کا جواب	۲۷۱
چند اہم نکات	۲۷۳

۱۔ آیت میں "ماء" سے کیا مراد ہے	۲۷۳
۲۔ ایک سوال کا جواب	۲۷۴
۳۔ زندگی مختلف صورتوں میں	۲۷۵
آیت ۴۶ تا ۵۰	۲۷۷
شانِ نزول	۲۷۸
ایمان اور خدا کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم	۲۷۹
چند اہم نکات	۲۸۱
۱۔ نفاق کی بیماری	۲۸۱
۲۔ عادلانہ فیصلہ صرف خدا کا ہوتا ہے	۲۸۲
آیت ۵۱ تا ۵۴	۲۸۴
حق پر ایمان اور تسلیم کامل	۲۸۵
آیت ۵۵	۲۸۹
شانِ نزول	۲۸۹
مستضعفین کی عالمی حکومت	۲۹۰
چند اہم نکات	۲۹۱
۱۔ "کما استخلف الذین من قبلھم" کی تفسیر	۲۹۱
۲۔ اللہ کا یہ وعدہ کن سے ہے؟	۲۹۲
۳۔ اصلی ہدف شرک سے پاک عبادت	۲۹۳
آیت ۵۶، ۵۷	۲۹۵
عذابِ الٰہی سے فرار ممکن نہیں	۲۹۵
آیت ۵۸ تا ۶۰	۲۹۷
والدین کے کمرے میں آنے کے آداب	۲۹۸
چند اہم نکات	۳۰۲
۱۔ اجازت لینے کا فلسفہ	۳۰۲
۲۔ سن رسیدہ عورتوں کے لیے پردے کا حکم	۳۰۳
آیت ۶۱	۳۰۵
جن گھروں میں جا کر کھانا جائز ہے	۳۰۶
چند اہم نکات	
۱۔ کیا کسی کے ہاں سے کھانا کھانے کے لیے اجازت شرط ہے؟	۳۰۹
۲۔ اس حکمِ اسلامی کا فلسفہ	۳۱۰
۳۔ "صدیق" سے کون مراد ہے؟	۳۱۱
۴۔ "ما ملکتم مفاتحہ" کی تفسیر	۳۱۲
۵۔ سلام و تحیّت	۳۱۲
آیت ۶۲ تا ۶۴	۳۱۴
شانِ نزول	۳۱۵
رسول اللہ کو تنہا نہ چھوڑو	۳۱۶

سورۂ فرقان

سورۂ فرقان	۳۲۲
سورہ فرقان کے مضامین	۳۲۳
سورہ فرقان کی فضیلت	۳۲۴
آیت ۱، ۲	۳۲۵
موجوداتِ عالم کا صحیح اندازہ	۳۲۸
آیت ۳ تا ۶	۳۳۲
طرح طرح کی تہمتیں	۳۳۳
آیت ۷ تا ۱۰	۳۳۸

شانِ نزول	۳۳۹
خزانے اور باغات کیوں نہیں؟	۳۳۹
آیت ۱۱ تا ۱۶	۳۴۵
بہشت اور دوزخ کا موازنہ	۳۴۵
چند ایک نکات	۳۴۸
آیت ۱۷ تا ۱۹	۳۵۱
چند ایک نکات	۳۵۲
۱۔ معبود سے کیا مراد ہے؟	۳۵۳
۲۔ توحید سے انحراف کیوں؟	۳۵۴
۳۔ "بور" کیا ہے؟	۳۵۵
آیت ۲۰	۳۵۶
شانِ نزول	۳۵۶
تمام پیغمبرؑ ایسے تھے	۳۵۷
ایک سوال اور اس کا جواب	۳۵۸
آیت ۲۱ تا ۲۳	۳۵۹
بہت بڑے دعوے	۳۵۹
اعمالِ صالح کی تباہی	۳۶۰
آیت ۲۵، ۲۶	۳۶۶
آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا	۳۶۶
آیت ۲۷ تا ۲۹	۳۷۰
شانِ نزول	۳۷۰
بُرے دوست نے گمراہ کیا	۳۷۱
دوستی کا اثر	۳۷۳
آیت ۳۰ تا ۳۴	۳۷۵
خداوندا! لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا	۳۷۶
چند اہم نکات	۳۷۸
۱۔ "جعلنا لکل نبی عدوًا" کی تفسیر	۳۷۸
۲۔ قرآن کا تدریجی نزول کیوں؟	۳۷۹
۳۔ ترتیلِ قرآن کا معنی	۳۸۱
۴۔ "یحشرون علی وجوھھم" کی تفسیر	۳۸۲
آیت ۳۵ تا ۴۰	۳۸۳
درسِ عبرت سے لاپروائی	۳۸۴
چند اہم نکات	۳۸۶
۱۔ "اصحابُ الرّاس" کون ہیں؟	۳۸۶
۲۔ کچھ لرزا دینے والے درس	۳۸۹
آیت ۴۱ تا ۴۴	۳۹۰
جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ	۳۹۰
چند نکات	۳۹۴
۱۔ ہوس پرستی اور اس کا دردناک انجام	۳۹۴
۲۔ جانوروں سے بڑھ کر گمراہ کیوں؟	۳۹۷
آیت ۴۵ تا ۵۰	۳۹۹
سائے کی حرکت	۴۰۰
چند اہم نکات	۴۰۵
۱۔ بہت سے چوپائے اور انسان	〃
۲۔ "نسقیہ" کا مفہوم	〃
۳۔ پہلے زمینوں کا ذکر	〃
۴۔ پانی کا پہلا فائدہ	۴۰۶
آیت ۵۱ تا ۵۵	۴۰۷

دو مختلف سمندر ساتھ ساتھ	۴۰۸
چند اہم نکات	۴۱۳
۱۔ صرف ایک قیادت	۴۱۳
۲۔ قرآن ۔ ذریعہ جہاد ہے	۴۱۴
آیت ۵۶ تا ۵۹	۴۱۶
میری اجرت تمہاری ہدایت ہے	۴۱۹
چند اہم نکات	۴۱۹
۱۔ اجرِ رسالت	۴۱۹
۲۔ کس پر بھروسہ کرنا چاہیے	۴۲۱
آیت ۶۰ تا ۶۲	۴۲۲
آسمانی برج	۴۲۲
آیت ۶۳ تا ۶۷	۴۲۷
خدا کے خاص بندوں کی صفات	۴۲۸
چند ایک نکات	۴۳۲
۱۔ مومنین کی رفتار	۴۳۲
۲۔ بخل اور فضول خرچی	۴۳۳
آیت ۶۸ تا ۷۱	۴۳۴
"عباد الرحمٰن" کی کچھ اور صفات	۴۳۴
سیئات کی حسنات میں تبدیلی	۴۳۸
آیت ۷۲ تا ۷۶	۴۴۰
عباد الرحمٰن کی جزا	۴۴۱
آیت ۷۷	۴۴۷
دعا کی اہمیت	۴۴۷
ایک نکتہ	۴۴۸
دعا، خود سازی اور خداشناسی کا راستہ	۴۴۸

سورہ شعراء

سورہ شعراء	۴۵۱
سورہ شعراء کے مندرجات	۴۵۲
سورہ شعراء کی فضیلت	۴۵۳
آیت ۱ تا ۶	۴۵۴
وہ ہر نئی چیز سے خوف کھاتے ہیں	۴۵۵
چند ایک نکات	۴۵۸
۱۔ ایمان آزادی کے ساتھ ہی سودمند ہوتا ہے۔	۴۵۸
۲۔ کلام اللہ حادث ہے یا قدیم	۴۵۹
آیت ۷ تا ۹	۴۶۰
نباتات میں زوجیت	۴۶۰
آیت ۱۰ تا ۱۵	۴۶۳
حضرت موسیٰ کی رسالت کا آغاز	۴۶۴
آیت ۱۶ تا ۲۲	۴۶۸
فرعون سے معرکۃ الآرا مقابلہ	۴۶۹
آیت ۲۳ تا ۲۹	۴۷۴
دیوانگی کی تہمت اور قید کی دھمکی	۴۷۵
آیت ۳۰ تا ۳۷	۴۷۸
تمہارا ملک خطرے میں ہے	۴۷۹
آیت ۳۸ تا ۴۲	۴۸۳
ہر طرف سے جادوگر پہنچ گئے	۴۸۳
آیت ۴۳ تا ۵۱	۴۸۶

جادوگروں کے دلوں میں نورِ ایمان چمک اٹھا	۴۸۷
آیت ۵۲ تا ۵۹	۴۹۳
ہم نے انہیں باہر نکال دیا	۴۹۴
چند ایک نکات	۴۹۶
۱۔ آیا بنی اسرائیل نے مصر میں حکومت کی ہے۔	۴۹۶
۲۔ آیات کی ترتیب	۴۹۷
آیت ۶۰ تا ۶۸	۴۹۸
فرعون والوں کا دردناک انجام	۴۹۹
چند ایک نکات	۵۰۲
۱۔ بنی اسرائیل کی گزرگاہ	۵۰۲
۲۔ بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونوں کی غرقابی۔	۵۰۳
۳۔ قدرت کے باوجود رحیم ہے	۵۰۴
آیت ۶۹ تا ۸۲	۵۰۵
میں ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں	۵۰۶
آیت ۸۳ تا ۸۷	۵۱۱
حضرت ابراہیم کی اہم دعائیں	//
آیت ۸۸ تا ۱۰۴	۵۱۵
معبودوں اور گمراہ عابدوں کا جھگڑا	۵۱۵، ۵۱۷
چند ایک نکات	۵۲۰
۱۔ قلبِ سلیم ہی نجات کا راستہ ہے	۵۲۰
۲۔ آیت "فکبکبوا ...." کا مفہوم	۵۲۳
۳۔ آیت "فما لنا من شافعین ولا ....." کا مفہوم	۵۲۳
آیت ۱۰۵ تا ۱۱۵	۵۲۵
نوحؑ کے گرد افراد	۵۲۶
آیت ۱۱۶ تا ۱۲۲	۵۳۰
نوحؑ نجات پا گئے اور مشرک غرق ہو گئے	۵۳۰
آیت ۱۲۳ تا ۱۳۵	۵۳۳
قومِ عاد کے جرائم اور بے راہروی	۵۳۴
آیت ۱۳۶ تا ۱۴۰	۵۴۰
نصیحت ہم پر اثر نہیں کرتی	۵۴۰
آیت ۱۴۱ تا ۱۵۲	۵۴۲
مسرفین کی اطاعت نہ کرو	۵۴۳
اسراف اور فساد فی الارض کا باہمی رابطہ	۵۴۵
آیت ۱۵۳ تا ۱۵۹	۵۴۷
قومِ صالح کی ہٹ دھرمی	۵۴۸
آیت ۱۶۰ تا ۱۶۶	۵۵۱
بے حیا قوم	۵۵۲
چند اہم نکات	۵۵۳
۱۔ لواطت ایک شرمناک فعل ہے	۵۵۳
۲۔ لواطت کے خطرناک نتائج	۵۵۴
آیت ۱۶۷ تا ۱۷۵	۵۵۶
قومِ لوطؑ کا انجام	۵۵۷
آیت ۱۷۶ تا ۱۸۳	۵۶۱
شعیبؑ اور اہلِ ایکہ	۵۶۲
آیت ۱۸۵ تا ۱۹۱	۵۶۶
اس سرکش قوم کا انجام	۵۶۷

چند اہم نکات ۵۶۹
۱۔ انبیاء کی دعوت میں مکمل ہم آہنگی ۵۶۹
۲۔ سب کی دعوت کا آغاز تقویٰ ہے ۵۷۰
۳۔ شرک سب برائیوں کی بنیاد ہے ۵۷۰
آیت ۱۹۲ تا ۱۹۷ ۵۷۲
گذشتہ کتابوں میں قرآن کی عظمت ۵۷۲
آیت ۱۹۸ تا ۲۰۳ ۵۷۵
اگر قرآن کسی عجمی پر نازل ہوتا تو ۵۷۵
چند ایک نکات ۵۷۷
۱۔ قومی اور قبائلی تعصبات ۵۷۷
۲۔ دُنیا کی طرف لوٹ جانے کی درخواست ۵۸۰
آیت ۲۰۴ تا ۲۱۲ ۵۸۲
قرآن پاک پر ایک اور تہمت ۵۸۳
آیت ۲۱۳ تا ۲۲۰ ۵۸۶
قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت ۵۸۷
چند ایک نکات ۵۸۹
۱۔ "تقلبك فی الساجدین" کی تفسیر ۵۸۹
۲۔ دعوت ذوالعشیرہ ۵۹۱
آیت ۲۲۱ تا ۲۲۷ ۵۹۳
رسولِ اکرمؐ شاعر نہیں ہیں ۵۹۴
چند اہم نکات ۵۹۷
۱۔ پیغمبر پر شاعری کی تہمت کیوں؟ ۵۹۷
۲۔ اسلام میں شعر و شاعری کا مقام ۵۹۸
۳۔ ذکرِ خدا ۶۰۲

سُورہ نمل

سُورہ نمل ۶۰۳
سُورہ نمل کے مضامین ۶۰۵
سورہ نمل کی فضیلت ۶۰۶
آیت ۱ تا ۶ ۶۰۷
قرآن ایک حکیم دانا کی طرف سے ہے ۶۰۸
حق بینی اور ایمان ۶۱۱
آیت ۷ تا ۱۴ ۶۱۳
موسیٰؑ آگ کے شعلے کی اُمید لے کر آئے ۶۱۴
آیت ۱۵، ۱۶ ۶۲۱
داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حکومت ۶۲۱
چند اہم نکات ۶۲۵
۱۔ دین اور سیاست ۶۲۶
۲۔ نظامِ حکومت الٰہیہ ۶۲۶
۳۔ پرندوں کی بولی ۶۲۸
۴۔ "لا وارث" حدیث ۶۳۰
آیت ۱۷ تا ۱۹ ۶۳۳
حضرت سلیمانؑ وادیٔ نمل میں ۶۳۳
چند اہم نکات ۶۳۷
۱۔ جناب سلیمانؑ کا جانوروں کی بولی جاننا ۶۳۷
۲۔ حضرت سلیمانؑ اور شکرِ الٰہی ۶۳۸
۳۔ حضرت سلیمانؑ اور عملِ صالح ۶۳۹
آیت ۲۰ تا ۲۶ ۶۴۰
ہدہد اور ملکہ سبا کی داستان ۶۴۱

چند اہم نکات ۶۴۵
چند سبق آموز باتیں ۶۴۵
چند سوال اور ان کے جواب ۶۴۶
آیت ۲۷ تا ۳۵ ۶۴۷
بادشاہ تباہیاں لاتے ہیں ۶۴۸
چند ایک نکات ۶۵۲
۱۔ نامہ نگاری کے آداب ۶۵۲
۲۔ آیا سلیمانؑ نے اپنی پیروی کی دعوت کی ۶۵۴
۳۔ اس داستان کے اہم اشارے ۶۵۴
۴۔ بادشاہوں کی علامت ۶۵۵
آیت ۳۶، ۳۷ ۶۵۶
مجھے مال کے ذریعے نہ ورغلاؤ ۶۵۶
چند ایک نکات ۶۵۸
۱۔ زہد مادی وسائل سے استفادہ نہ کرنے کا نام نہیں ۶۵۸
۲۔ کچھ سبق آموز باتیں //
آیت ۳۸ تا ۴۰ ۶۶۰
پلک جھپکتے ہی تخت موجود ۶۶۱
چند ایک نکات ۶۶۴
۱۔ چند سوال اور ان کے جواب ۶۶۴
۲۔ دو اہم چیزیں طاقت اور امانت ۶۶۵
۳۔ "علم من الکتاب" اور "علم الکتاب" میں فرق ۶۶۵
۴۔ "ھذا من فضل ربی" ۶۶۶
۵۔ تخت کو کیسے حاضر کر دیا؟ ۶۶۷
آیت ۴۱ تا ۴۴ ۶۶۸
ملکہ سبا کے دل میں نورِ ایمان ۶۶۹
چند اہم نکات ۶۷۳
۱۔ ملکہ سباء کا انجام ۶۷۳
۲۔ سلیمانؑ کی داستان کا خلاصہ ۶۷۳
آیت ۴۵ تا ۴۷ ۶۷۵
حضرت صالحؑ اپنی قوم کے سامنے ۶۷۵
ایک نکتہ ۶۷۸
"فال اور تطیر" ۶۷۸
آیت ۴۸ تا ۵۳ ۶۸۰
نو مفسد ٹولوں کی سازش ۶۸۱
چند اہم نکات ۶۸۳
۱۔ قوم ثمود کو کیا سزا ملی؟ ۶۸۳
۲۔ بچ جانے والے ۶۸۴
۳۔ "خاویہ" کا مفہوم ۶۸۴
۴۔ ظلم کا نتیجہ ۶۸۴
۵۔ قوم ثمود کو سزا کب ملی؟ ۶۸۴
آیت ۵۴، ۵۵ ۶۸۶
قوم لوط کی بے راہروی ۶۸۶
آیت ۵۶ تا ۵۹ ۶۸۸
جہاں پاک دامنی عیب بن جاتی ہے ۶۸۸
آیت ۶۰ تا ۶۴ ۶۹۳
یہ دلائل اور پھر بھی شرک ۶۹۴

چند اہم نکات	۴۰۰
۱۔ مضطر کون ہے؟	۴۰۰
۲۔ ہر جگہ منطقی دلائل کی دعوت	۴۰۱
۳۔ گذشتہ آیات کا خلاصہ	۴۰۲
آیت ۶۵ تا ۶۸	۴۰۳
آیت ۶۹ تا ۷۵	۴۰۶
ان کی سازشوں سے نہ گھبرائیں	۴۰۸
ایک نکتہ	۴۱۱
آیت ۷۶ تا ۸۱	۴۱۳
اندھے اور بہرے آپ کی بات نہیں مانیں گے۔	۴۱۴
چند ایک نکات	۴۱۶
۱۔ توکل کے اسباب	۴۱۶
۲۔ موت اور حیات قرآن کی رو سے	۴۱۷
آیت ۸۲ تا ۸۵	۴۲۰
چند ایک نکات	۴۲۳
۱۔ "دابۃ الارض" سے کیا مراد ہے	۴۲۳
۲۔ "رجعت" کتاب و سنت کی روشنی میں	۴۲۶
۳۔ رجعت کا فلسفہ	۴۳۰
۴۔ رجعت اور ارادے کی آزادی	۴۳۱
۵۔ عقیدہ رجعت اسلام کی بنیادی شرائط میں سے نہیں۔	۴۳۲
آیت ۸۶ تا ۸۸	
زمین کی حرکت۔ قرآن کا سائنسی معجزہ	
آیت ۸۹ تا ۹۳	
رسول اللہ کی ذمہ داری	

٭ ٭ ٭

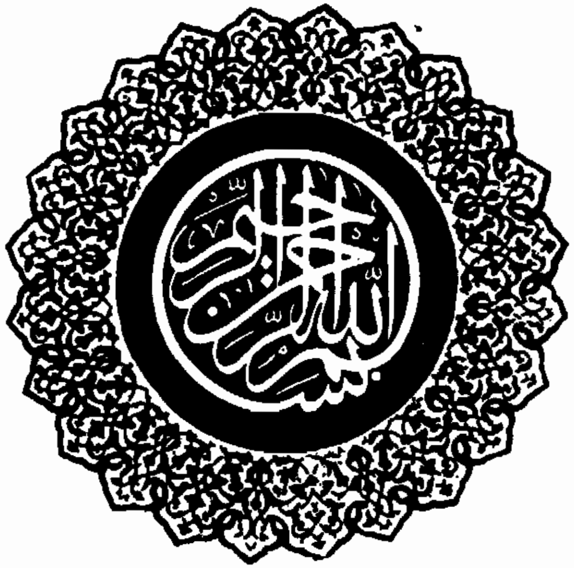

اللهم صل علی محمد وآل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۸

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سُورہ مومنون ۲۔ سُورہ نُور ۳۔ سُورہ فرقان ۴۔ سُورہ شعراء ۵۔ سُورہ نمل

سُورۂ مؤمنون: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۱۱۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۸

سُورۂ نُور: مدنی سُورت ہے اور اس کی ۶۴ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۸

سُورہ فرقان: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۷۷ آیات ہیں۔

پارہ ۱۸ ــــ ۱ تا ۲۰ پارہ ۱۹ ــــ ۲۱ تا ۷۷

سُورۂ شعراء: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۲۲۷ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۱۹

سُورۂ نمل: مکّی سُورت ہے اور اس کی ۹۳ آیات ہیں۔

پارہ ۱۹ ــــ ۱ تا ۵۹ پارہ ۲۰ ــــ ۶۰ تا ۹۳

سُورۂ مُؤمنُون

یہ سُورت مکہ میں نازل ہوئی اس کی ۱۱۸ آیتیں ہیں

سُورۂ مُؤمنُون
کی
فضیلت

پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰؑ کی طرف سے ہم تک پہنچنے والی روایات کے مطابق یہ سُورت بڑی فضیلت کی حامل ہے۔
رسول اکرمؐ سے ایک روایت ہے۔

من قرء سورة المؤمنین بشرته الملائكة یوم القیٰمة بالروح والریحان وما تقربه عینه عند نزول ملك الموت۔

اس سورت کی قرات کرنے والے ہر شخص کو روز قیامت، فرشتے رُوح اور ریحان کی بشارت دیں گے اور جس وقت ملک الموت اس کی رُوح قبض کرنے کے لیے آئے گا۔ اور اسے ایسی خوشخبری سنائے گا۔ اس کی آنکھیں روشن اور ٹھنڈی ہو جائیں گی [۱]

ایک اور روایت امام صادقؑ سے مروی ہے۔

من قرء سورة المؤمنین ختم الله له بالسعادة إذا كان يدمن قرائتها في كل جمعة، وكان منزله في الفردوس الاعلیٰ مع النبیین والمرسلین۔

جو شخص سورۂ مومنون کو پڑھے اور ہر جمعہ برابر پڑھتا رہے۔ اس کا خاتمہ سعادت پر ہوگا۔ اور انبیا و مرسلین کے ساتھ فردوس بریں میں رہے گا۔ [۲]

ہم اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا فضائل اور قرأت کی برکتیں، مفاہیم و مطالب سورت پر غور و فکر اور ان پر عمل کے ارادے کے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ یہ آسمانی کتاب، انسان سازی اور تعمیر کردار کے تربیتی

---

[۱] تفسیر مجمع البیان ج، ص۹۸

[۲] تفسیر مجمع البیان ج، ص۹۸

ں کے عملی پروگراموں کا مجموعہ ہے اور واقعی اگر کوئی شخص اس سورہ میں بیان شدہ مطالب کا عملی نمونہ بن جائے۔ اگرچہ مومنین
صفات کے بیان پر مشتمل پہلی چند آیتوں پر ہی عمل پیرا ہو جائے تو تمام کے تمام اعزازات نصیب ہوں گے اسی لیے بعض
بت میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا۔

لقد انزل الیٰ عشر اٰیات من اقامهن دخل الجنة۔

مجھ پر دس آیتیں ایسی نازل ہوئی ہیں، کہ اگر کوئی ان کا عملی نمونہ بن جائے تو جنت میں جائے گا [1]
" قرء " (پڑھے) کے بجائے " اقامہ " (عمل کرے) کا لفظ ہمارے مذکورہ بالا مفہوم کی تائید کرتا ہے کہ آیتوں میں
ن شدہ مفاہیم کا مقصد عملی شکل میں ان کو اپنانا ہے۔ نہ یہ کہ صرف زبان سے پڑھ لینا۔

سورہ مؤمنون کے مندرجات

اس سورۃ کے نام سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کا اہم حصہ مومنین کی برگزیدہ صفات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے
عقیدے اور عمل کے سلسلے میں کچھ بحثیں ہیں۔ جو دراصل مذکورہ صفات ہی کی تکمیل کا بیان ہے۔

اس سورہ کے جملہ مطالب کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ

پہلی آیت (قد افلح المؤمنون . . . . .) سے شروع ہو کر بعد کی چند آیتوں تک مومنین
فلاح و کامیابی کے سبب چند صفات پر مشتمل ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ صفات کتنی جچی تلی، جامع اور زندگی کے انفرادی
اجتماعی کئی پہلوؤں کو دامن میں سیلے ہوئے ہیں۔

دوسرا حصہ

چونکہ پہلے حصے میں بیان شدہ تمام اوصاف کی بنیاد توحید اور ایمان باللہ پر ہے۔ لہٰذا اس حصے میں معرفت ذات
ی کی مختلف علامتوں اور عالم کائنات میں اللہ کی بہت سی آفاقی اور ذاتی نشانیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کائنات
آفرینش وابتداء کے حیرت انگیز نظام میں سے آسمان، زمین، انسان اور جانوروں کی پیدائش اور نباتات کو اللہ کی عجیب
ریب قدرت کے کرشمے شمار کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ

اس حصے میں عملی جہت کی تکمیل کے لیے چند عظیم پیغمبروں، مثلاً حضرت نوحؑ، ہودؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی کچھ سبق
ز سوانح بیان کی گئی ہے اور ان کی زندگی کے بعض نشیب و فراز بیان کئے گئے ہیں۔

چوتھا حصہ

اس حصے میں متکبر اور مغرور طاقتوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ منطقی دلائل بلکہ تند و تیز تنبیہوں کے ذریعے

[1] تفسیر روح المعانی ج ۱۸ ص ۲۔

انہیں اللہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے تاکہ "رجوع الی اللہ" پیدا ہو سکے۔

پانچواں حصہ

اس حصے میں اختصار کے ساتھ معاد اور قیامت کا ذکر ہے۔

چھٹا حصہ

اس حصے میں کائنات پر اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور ہر جگہ پر اس کے حکم کے اثر و نفوذ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ساتواں اور آخری حصہ

اس حصے میں قیامت، حساب کتاب، نیک لوگوں کی جزاء اور بداعمالیوں کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے انسان کی
غرض خلقت کے بیان کے ساتھ سورہ کا اختتام ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا کہ اعتقادی، عملی اور پیدائش و آفرینش سے متعلق مسائل اور مومنین کے سیر و سلوک کو شروع سے
آخر تک بیان کرنے والی یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی، مگر بعض مفسرین کے بقول اس سورت کی چند آیتیں مدینہ میں نازل ہوئیں
چونکہ اس سورۃ میں زکوٰۃ سے متعلق آیت موجود ہے اور سب کو معلوم ہے کہ زکوٰۃ کا حکم مدینے میں آیا۔ لہٰذا یہ خیال پیدا
ہوا کہ یہ سورت ساری کی ساری مکہ میں نازل نہیں ہوئی۔

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۳ : خذ من اموالهم صدقة . . . . . .
جب نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے بعض اشخاص کو حکم دیا کہ مختلف علاقے کے لوگوں سے وصول کریں البتہ ذہن میں رہے
کہ زکوٰۃ کا مفہوم بہت وسیع ہے اس سے مراد "زکوٰۃ واجب" ہی نہیں، بلکہ زکوٰۃ مستحب بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ اکثر روایات
میں ہے کہ نماز و زکوٰۃ ساتھ ساتھ رہی ہیں۔

بعض علماء کے خیال میں مکہ میں بھی زکوٰۃ واجب تھی، مگر اجمالی طور پر یعنی ہر مسلمان پر واجب تھا کہ اپنے مال میں سے ایک معین مقدار
غریبوں اور محتاجوں کو دے۔ جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو باقاعدہ ایک نظام زکوٰۃ تشکیل دیا گیا۔ نصاب مقرر کیے گئے
عمال کا تقرر ہوا اور اسلامی مملکت کے مختلف حصوں سے زکوٰۃ کی وصولی حکومتی سطح پر کی گئی۔ [1]

[1] اس سلسلے میں امام باقرؑ اور امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت ہے۔
"فرض الله الزكوة مع الصلوة"
اللہ نے زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ واجب فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ

۲۔ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ

۳۔ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ

۴۔ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ

۵۔ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ

۶۔ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۚ

۷۔ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡعٰدُوۡنَ ۚ

۸۔ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَعَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ

۹۔ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۘ

۱۰۔ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ۙ

۱۱۔ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ مومنین کامیاب ہوئے۔

۲۔ وہ جو نماز میں عجز و انکساری کرتے ہیں

۳۔ اور وہ جو لغویات اور بے ہودگی سے بچتے ہیں۔

۴۔ اور وہ جو زکوٰۃ دیتے ہیں

۵۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

۶۔ سوائے اپنی بیویوں اور کنیزوں کے کیونکہ ان کے سلسلے میں وہ لائق ملامت نہیں ہیں۔

۷۔ اور اس راستے سے انحراف کرنے والا ہی تجاوز کرنے والا ہے۔

۸۔ اور وہ جو امانتوں اور وعدوں پر پورا اترتے ہیں

۹۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

۱۰۔ (بیشک) وہی وارث ہیں۔

۱۱۔ وہ فردوس بریں کے وارث ہوں گے اور مدام اسی میں رہیں گے۔

تفسیر

مؤمنین کے نمایاں اوصاف

پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اس سورہ کا نام اس کی ابتدائی آیتوں کی وجہ سے ہے، جو مؤمنین کی خصوصیات پُر مغز اور بامعنی چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کرتی ہیں۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین کے اوصاف کے بیان سے پہلے ان کی پُر کیف اور مایۂ ناز زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاکہ دلوں میں اس بلند و بالا مرتبے کو حاصل کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہو۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے۔ مومنین کامیاب ہو گئے اور ہر لحاظ سے اپنے مقصد کو پا گئے۔ (قد افلح المؤمنون)۔

"افلح" "فلح" اور "فلاح" سے ہے۔ اس کے اصلی معنیٰ چیرنا اور پھاڑنا ہیں۔ اس کے علاوہ ہمہ جہت کامیابی حاصل کرنا، مقصد کو پا لینا اور خوشش نصیب ہونا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ دراصل جتنے افراد کامیاب نجات یافتہ اور خوش بخت ہوتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کو چیر کر ہی اپنی منزلِ کامیابی کی طرف راستہ بناتے ہیں۔

البتہ فلاح اور کامیابی مادی اور معنوی دونوں پہلوؤں پر محیط ہے اور مومنین کے لیے دونوں جہات مراد ہیں۔
دنیادی کامرانی و کامیابی یہ ہے کہ انسان آزاد، سربلند، مستحکم اور بے نیاز رہے اور ایمان کے بغیر یہ مقام حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اُخروی کامیابی یہ ہے کہ اللہ کے جوارِ رحمت میں اچھے ساتھیوں اور ابدی نعمتوں میں باوقار اور سربلند رہے۔ راغب اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں۔

دنیاوی فلاح تین چیزوں میں مُضمر ہے۔ (i) بقاء (ii) بے نیازی اور (iii) عزت و وقار اور فلاح اُخروی چار چیزوں میں ہے۔
(i) بقاء غیر فانی (ii) ہر قسم کی احتیاج سے بے نیازی اور (iii) ہمہ جہت وقار اور عزت اور (iv) ہر قسم کی جہالت سے نجات دینے والا علم۔

اس کے بعد مومنین کے اوصاف میں سب سے پہلے نماز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو عالمِ نماز میں سراپا عجز و انکساری بنے ہُوئے ہوتے ہیں۔ (الذین ھم فی صلاتھم خاشعون)۔

"خاشعون" "خشوع" سے ہے۔ اس کا معنیٰ جسمانی اور ذہنی عجز و انکساری ہے۔ یہ لفظ اس حالت کو بیان کرتا ہے جو ایک بزرگ و برتر ذات کی موجودگی میں کسی شخص میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتی ہے۔

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید مومنین کے نماز پڑھنے کو اس کی علامت شمار نہیں کرتا۔ بلکہ نماز میں عجز و انکساری کو ان کی خصوصیت قرار دیتا ہے۔ یعنی یہ واضح کرتا ہے کہ مومنین کی نماز بے معنیٰ اور بے رُوح حرکات و سکنات نہیں۔ بلکہ عالمِ نماز میں وہ پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ غیر اللہ سے مکمل طور پر منقطع ہوتے ہیں۔ اور صرف ذات پروردگارِ عالم سے رشتہ جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے میں وہ ذہنی اور جسمی طور پر اپنے پالنے والے سے راز و نیاز کرتے ہُوئے عالم استغراق میں کچھ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کے بدن کے ہر ایک عضو پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ ذاتِ لا متناہی کے مقابلے میں اپنے کو ایک ذرہ اور بحرِ ناپیدا کنار کے مقابلے میں ایک قطرہ سمجھنے لگتے ہیں۔ نماز کے لمحات ان کے لیے تہذیبِ نفس اور تربیتِ رُوح کا بہترین ذریعہ ہُوتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ایک شخص کو حالتِ نماز میں اپنی داڑھی سے کھیلتے ہُوئے دیکھا۔ آپ نے فرمایا۔

"اما انہ لو خشع قلبہ لخشعت جوارحہ!"

"اگر اس کا دل حالتِ عجز میں ہوتا تو اس کے اعضاء بھی عجز میں ہوتے۔"

یہ روایت اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ نماز میں خشوع، ایک باطنی کیفیت ہے جو ظاہر پر اثر انداز ہوتی ہے عظیم ہادیانِ اسلام عالمِ نماز میں اس درجہ خضوع و خشوع میں ہوتے تھے کہ غیر اللہ سے بالکل بے گانہ ہو جاتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے کبھی پیغمبر اسلامؐ حالتِ نماز میں آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے۔ مگر اس آیت کے نزول کے بعد آپ ہمیشہ اپنی نظریں زمین کی طرف رکھتے تھے۔ [1]

عالمِ نماز میں عجز و انکساری کے ذکر کے بعد مومنین کی دوسری صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ نیز وہ ہر قسم کی بے ہودگی سے مُنہ موڑے ہُوئے ہوتے ہیں۔

(والذین ھم عن اللغو معرضون)۔

دراصل مومنین کی زندگی کی تمام حرکات و جہات، مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے ہیں۔ اور مقصد بھی تعمیری اور مفید، کیونکہ لغو کا مطلب بے مقصد یا وہ مقصد جس کا مفید نتیجہ برآمد نہ ہو، بقول عظیم مفسروں کے لغو کے مندرجہ ذیل معانی ہیں۔

(i) بے مقصد، بے ہودہ اور مفید نتیجہ نہ دینے والا فعل (ii) ہر وہ گفتگو یا عمل جو خاطر خواہ نتیجہ نہ رکھتا ہو
(iii) باطل (iv) گناہ (v) جھوٹ
(vi) گالی یا جوابی گالی (vii) موسیقی اور گانا بجانا (viii) شرک

مندرجہ بالا سب کے سب معانی مجموعی اور کلی معنیٰ کا حصہ ہیں۔ "لغو" میں صرف بے ہودہ باتوں اور افعال کا مفہوم ہی نہیں پایا جاتا، بلکہ وہ بے ہودہ باتیں یا وہ فضول قسم کے افعال جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیں۔ نیز معقول اور مفید امور پر غور و فکر کرنے کا موقع نہ دیں۔ سب لغو کے مفہوم میں شامل ہیں۔

درحقیقت مومنین ایسے تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ جو نہ صرف باطل افکار، بے ہودہ گفتگو اور فضول کاموں میں مشغول نہیں ہوتے، بلکہ ان سے مُنہ موڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مومنین کی تیسری صفت بیان کی گئی ہے جو معاشرتی اور مالی پہلو رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ (والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون[2])۔

ہم سطور بالا میں بیان کر آئے ہیں کہ چونکہ یہ سُورت مکی ہے اور مکہ میں عام زکوٰۃ کا حُکم نہیں آیا تھا۔ لہٰذا مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہماری نظر میں صحیح بات یہ ہے کہ اس آیت میں زکوٰۃ کا حکم واجب زکوٰۃ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مستحبی

---

[1] تفسیر صافی اور مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

[2] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر فخر الدین رازی۔

[3] یہاں "زکوٰۃ" مصدری معنیٰ رکھتی ہے اسی لیے بعد میں "فاعلون" آیا ہے۔ مگر بعض مفسرین نے زکوٰۃ کے مشہور معنیٰ ہی سمجھے ہیں یعنی اپنے مال میں سے ایک معین مقدار، راہِ خدا میں خرچ کرنا، اس صورت میں فاعلون یعنی "مؤدون" (ادا کرنے والا) ہوگا۔

زکاتیں شریعتِ اسلام میں بکثرت تھیں جس زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں آیا وہ واجب تھی۔ لیکن مستحبی زکوٰۃ کا حکم مدینہ سے پہلے بھی آچکا تھا۔

بعض مفسرین کے بقول مکہ میں بھی واجب زکوٰۃ کا حکم تھا مگر نصاب مقرر نہ تھا۔ مسلمان پابند تھے کہ اپنے مال میں سے کچھ مقدار محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دیں۔ جب مدینہ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی گئی "بیت المال" تشکیل دیا گیا اور ایک مالی نظام کے طور پر "زکوٰۃ" کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ تب نصاب مقرر ہوا اور پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے ملک کے مختلف حصّوں میں عمال بھیجے گئے۔ تاکہ حکومتی سطح پر زکوٰۃ جمع کر سکیں۔

البتہ فخرالدین رازی اور آلوسی جیسے مفسرین نے اور راغب نے اپنی کتاب "مفردات" میں لکھا ہے کہ اس آیت میں زکوٰۃ سے مراد ہر قسم کا کارِ خیر، تزکیہ اور تہذیب نفس ہے۔ مگر ہماری نظر میں یہ بعید بات ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے اسلوب کے تحت جہاں بھی نماز اور زکوٰۃ اکٹھے ذکر ہوئے ہیں۔ وہاں زکوٰۃ سے مراد مالی خرچ ہے۔ لہٰذا یہاں بھی زکوٰۃ راہ خدا میں خرچ کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور معنی کرنے کے لیے "قرینے" کی ضرورت ہے جو یہاں مفقود ہے۔

مومنین کی چوتھی صفت پاکدامنی، عفت اور ہر قسم کے غیر قانونی جنسی اختلاط سے پرہیز ہے۔ ارشاد ہورہا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی شرمگاہ کو بے حیائی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ (والذین ھم لفروجھم حافظون)۔[1]

البتہ اپنی بیویوں، کنیزوں سے جنسی تلذذ حاصل کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ کسی طرح بھی قابل ملامت نہیں ہیں۔

(الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین)۔

نفسانی خواہشات میں جنسی خواہش، بڑی طاقت ور اور سرکش ہے۔ لہٰذا اس پر قابو پانے کے لیے قوی ایمان اور بلند درجے کے تقویٰ کی ضرورت ہے۔ اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: جو شخص (قانونی تلذذ جنسی) کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرے، وہی حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔

(فمن ابتغیٰ وراء ذٰلک فاولٰئک ھم العادون)۔

"شرمگاہ کی حفاظت" کی اصطلاح اس حقیقت کو آشکار کر رہی ہے۔ اگر جنسی خواہش کو دبانے کے لیے نفس کی مسلسل اور برابر نگرانی نہ کی جائے تو جنسی بے راہ روی کا زبردست اندیشہ ہے۔

"بیویوں" سے مراد دائمی اور وقتی دونوں ازواج ہیں۔ البتہ بعض اہل سنت مفسرین اس مسئلے میں ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

"غیر ملومین" (وہ قابل ملامت نہیں ہیں) کی اصطلاح شاید گمراہ عیسائیوں کے باطل افکار کی طرف اشارہ کر رہی ہے، بعض عیسائی جو اصل مذہب عیسائیت سے منحرف ہو چکے ہیں۔ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ہر قسم کا جنسی اختلاط حرام ہے اور انسانی شرف کے منافی ہے اور اسے ترک کرنا انسان کی شان تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں "رومن کیتھولک" فرقے کی عورتیں اور مرد تارک الدنیا ہوتے ہیں اور کنوارپن میں ہی زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ اور شادی کو روحانی منصب کے خلاف تصور

[1] "فروج" "فرج" کی جمع ہے اور افزائش نسل کی طرف اشارہ ہے۔

کرتے ہیں (اگرچہ درپردہ وہ جنسی تسکین کے کئی راستے اپنا لیتے ہیں) عیسائی مصنفین نے خود اس عنوان سے جو کتابیں لکھی ہیں وہ پادریوں اور راہباؤں کے جنسی اختلاط کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔[1]

بہرحال یہ ناممکنات میں سے ہے کہ جو فطری میلان اور خواہش ایک بہترین نظام کے اہم جزو کے طور پر پیدا کیا جائے اور پھر اس کی تسکین کو حرام سمجھا جائے یا اسے انسانی شرف کے منافی سمجھا جائے۔

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ بیوی کی حلت کے سلسلے میں بعض استثنائی مواقع پر قربت سے ممانعت مثلاً ان کے ماہانہ مخصوص ایام میں اصل مسئلہ سے کوئی تضاد نہیں رکھتا۔ کنیزوں کے حلال ہونے کے مسئلے میں بھی بعض شرائط عائد کی گئی ہیں۔ جن کا ذکر فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ یوں نہیں کہ ہر کنیز ہر مالک پر ہر حالت میں حلال ہو۔

بہت سے پہلوؤں اور حالات کے اعتبار سے کنیزوں کی شرائط بیویوں کی شرائط سے ملتی جلتی ہیں۔

زیرِ بحث آٹھویں آیت میں مومنین کی پانچویں اور چھٹی نمایاں صفت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو امانتیں لوٹاتے ہیں۔ اور وعدہ وفا کرتے ہیں۔

(والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون)

امانتوں کی حفاظت اور ان کا صحیح و سالم مالک کو لوٹانا اپنے وسیع تر مفہوم میں مومنین کی نمایاں صفت ہے اور اسی طرح خالق و مخلوق سے کیے گئے وعدوں کو نبھانا بھی امانت کے وسیع تر مفہوم میں اللہ اور انبیاءؑ کی امانتوں میں شامل ہے۔ اسی طرح لوگوں کی امانتیں بھی اس میں آتی ہیں۔ اللہ کی ان گنت نعمتوں میں سے ہر ایک اس کی امانت ہے۔ دین، قانونِ الٰہی، آسمانی کتابیں، دینی راہنماؤں کی ہدایات سب کی سب امانتیں ہیں۔ اور اسی طرح اولاد، مال منصب اور مقام بھی۔ مومنین ساری زندگی ان امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی ادائیگی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اور دُنیا سے جاتے ہوئے اپنی شریف النفس نسل جسے انہوں نے ان کی حفاظت کے لیے تربیت کیا ہوتا ہے کے سپرد کر دیتے ہیں۔

لفظ "امانت" کی عمومیت کی دلیل لفظ کی وسعت اور اطلاق کے علاوہ، امانت کے مفہوم کے بارے میں متعدد روایات بھی ہیں۔ جو امانت کی تفسیر میں بیان ہوئی ہیں کبھی امانت سے مراد آئمہ معصومینؑ کی امانت ہے، جسے ایک امام دُنیا سے جاتے ہوئے اپنے بعد کے امام کے سپرد کرتا ہے۔[2] اور کبھی مطلقاً "ولایت و حکومت"۔

امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے معتمد علیہ شاگرد جناب زرارہ سورہ نساء آیت ۵۸۔

ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا

کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

یہاں امانت سے مراد حکومت و ولایت ہے، جس کو اس کے اہل کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔[3]

[1] ویل ڈیورانٹ کی مشہور تاریخ ملاحظہ ہو۔

[2]،[3] تفسیر برہان ج۱ ص۳۸۰۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و ولایت اہم ترین امانت ہے جسے اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیئے۔ اسی طرح عہد و پیمان نبھانے کے لیے عمومی دلیل بھی قرآن مجید کی دیگر آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ فرمایا گیا ہے۔

"واوفوا بعهد الله إذا عاهدتم" (نحل ۹۱)

"جب تم اللہ سے کوئی وعدہ کرو تو وفا کرو" (نحل - ۹۱)

توجہ طلب بات یہ ہے کہ بعض آیتوں میں امانت کی ادائیگی یا امانت میں خیانت نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب کہ زیر بحث آیت میں صرف "امانت" کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو امانت کی مکمل حفاظت نگرانی اور صحیح ادائیگی دونوں پر محیط ہے۔ اس بنا پر اگر کبھی کسی امانت کے ضمن میں اس چیز کی اصلاح میں کوتاہی کی وجہ سے نقصان کا ڈر ہو تو امانت دار کی ذمہ داری بھی ہوگی کہ مطلوبہ اصلاح بھی کرے تو یوں امانت کے ذیل میں تین کام سپرد کیے جاتے ہیں۔

ا۔ ادائیگی (ii) حفاظت (iii) اصلاح۔

بہر حال یہ مسلمہ امر ہے کہ انسان کے اجتماعی نظام کی بنیاد وعدوں کی وفا امانتوں کی حفاظت اور ان کی ادائیگی پر ہے۔ ورنہ معاشرے کا توازن بگڑ جائے اور ہر چیز درہم برہم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ لادین افراد اور معاشرے بھی اپنے توازن کو برقرار رکھنے کیلئے وعدہ خلافی اور امانت میں خیانت سے بچتے ہیں۔ اور کم از کم اپنے مجموعی و اجتماعی مسائل میں ان دو امور کی حفاظت اپنی ذمہ داری جانتے ہیں۔

امانت کی اہمیت کے عنوان سے ہم اسی تفسیر کی جلد نمبر ۲ میں سورۂ نساء کی آیت ۸۵ اور جلد نمبر ۴ میں سورۂ انفال آیت نمبر ۲۷ کی تفسیر کے ذیل میں تفصیلاً بحث کر چکے ہیں۔ نیز وعدہ وفائی کے عنوان سے جلد ۴ میں سورۂ مائدہ آیت ۱ اور جلد ۶ میں سورۂ نحل آیت ۹۱ کی تفسیر کے ذیل میں مفصل لکھ چکے ہیں۔

نویں آیت میں مومنین کی آخری نمایاں صفت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

(والذين هم على صلواتهم يحافظون)

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین کی پہلی بیان شدہ خصوصیت و صفت "نماز میں خضوع و خشوع" ہے اور آخری "نماز کی حفاظت" مختصر یہ کہ مومنین کے اوصاف کی ابتدا بھی نماز ہے اور انتہا بھی نماز، کیونکہ نماز خالق و مخلوق کے درمیان بہترین رابطہ ہے۔ نماز اعلیٰ تربیت کا اعلیٰ سطح کا مدرسہ ہے۔ نماز روح کی بیداری اور گناہوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہے، نماز روح کی بیداری کا ذریعہ اور گناہوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ مختصر یہ کہ اگر نماز تمام آداب و شرائط کے ساتھ ادا کی جائے تو تمام نیکیوں اور خوبیوں کے لیے قابل اطمینان وسیلہ بن جاتی ہے۔

یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس سلسلے کی پہلی اور آخری آیت دو مختلف مفاہیم پیش کر رہی ہیں، پہلی آیت میں "صلوٰۃ" مفرد استعمال ہوا ہے۔ جبکہ آخر میں "صلوات" جمع کی صورت میں آیا ہے۔ پہلی آیت روح نماز یعنی خضوع و خشوع اور ایک باطنی کیفیت کی اہمیت بیان کر رہی ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جو انسان کے تمام اعضاء و جوارح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جبکہ آخری آیت نماز کے اوقات، آداب، شرائط اور مقام نماز، تعداد وغیرہ کی اہمیت کو اجاگر کر رہی ہے۔ گویا کہ سچے مومن

نمازیوں کو ہدایات دے رہے ہیں۔ کہ ہر ایک نماز کی ادائیگی کے عالم میں تمام مذکورہ آداب و شرائط کا لحاظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ نماز کی اہمیت کے بارے میں ہم اسی تفسیر کی جلد ۵ میں، سورۂ ہود آیت ۱۱۴ اور جلد ۲ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۰۳ اور جلد نمبر ۷ سورۂ طٰہٰ آیت ۱۴ تفسیر کے ذیل میں مفصل بیان کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

مومنین کے نمایاں اوصاف کے بیان کے بعد نتیجۃً بیان کیا جاتا ہے۔ وہی وارث ہیں۔ (اولٰئك هم الوارثون)۔ وہی ہیں جو فردوس بریں کے بھی وارث و مالک ہیں۔ اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (الذين يرثون الفردوس هم فيها خالدون)۔

"فردوس" لغوی طور پر اس لفظ پر کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ دراصل یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ بعض اسے رومی زبان کا لفظ سمجھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور بعض کے خیال میں فارسی زبان سے آیا ہے۔ بہر حال اس کا معنیٰ باغ یا ایسا باغ ہے جس میں زندگی کی تمام نعمات خداوندی موجود ہوں۔ بہر حال یہ ایسی بہشت بریں ہے۔ جو جنت کے بہترین باغوں میں سے ہے۔

وارث ہونے سے شاید یہ مراد ہو کہ مومنین بغیر زحمت کے اس مقام تک پہنچ جائیں گے۔ جس طرح انسان بغیر کسی زحمت و کوشش کے وراثت پا لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مومنین کو جنت تک پہنچنے کے لیے دنیا میں تزکیہ نفس کے عمل کو پورا کرتے ہوئے بڑی جانسوز مشقت اٹھانا پڑی۔ مگر فردوس بریں کی شکل میں جتنی عظیم کثیر اور اعلیٰ جزا انہیں دی جائے گی۔ اس کے مقابلے میں ان کے اعمال دنیا گویا کچھ بھی نہیں اور یوں معلوم ہوگا، جیسے بغیر کچھ کیے ہی اتنا کچھ مل گیا ہو۔

اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث پیش نظر رہنی چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔

ما منكم من احد الا وله منزلان: منزل في الجنة، ومنزل في النار فان مات ودخل النار ورث اهل الجنة منزله

تم میں سے ہر ایک شخص دو گھروں کا مالک ہے۔ ایک جنت میں دوسرا جہنم میں۔ اگر ایک شخص مر جائے اور دوزخ میں جائے تو اس کا جنت والا گھر، اہل جنت کو ورثے میں مل جائے گا۔"

"ورثہ" کی اصطلاح کے ذیل میں مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید از قیاس نہیں جانا کہ یہ لفظ مومنین کے انجام کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ ورثہ آخر کار ورثاء تک پہنچتا ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیتوں کے مطابق جنت کا یہ عالی شان درجہ ان مومنین کے لیے مخصوص ہے جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہوں۔ رہ گئے دوسرے جنتی لوگ تو وہ نچلے درجے ... ہوں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ **افلح کا مفہوم:** فعل ماضی کا صیغہ ہے۔ مومنین کی حتمی کامیابی کے سلسلے میں فعل ماضی کا استعمال تاکید کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان کی کامیابی اور فلاح اس قدر مسلّم امر ہے گویا کہ پہلے ہی طے ہے۔ مزید برآں جملے کے

کے آغاز میں "قد" کا استعمال تاکیدِ مزید کے لیے ہے۔ "خاشعون" "معرضون" "راعون" اور "یحافظون"
و "اسم فاعل" یا "فعل مضارع" کے صیغے ہیں۔ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ مومنین کے یہ اعلیٰ اوصاف وقتی اور عارضی نہیں ہیں۔ بلکہ مستقل و دائمی ہیں۔

۲۔ **دائمی اور کم مدتی شریکِ حیات:** مذکورہ بالا آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں پر دو طرح سے حلال ہیں:

i ۔ بیوی کی صورت میں۔

ii ۔ کنیز اور لونڈی کی صورت میں (خاص شرائط کے ساتھ)

اس لیے یہ آیت فقہی کتب میں "باب نکاح" میں کئی مباحث کے لیے مستند قرار پائی ہے۔

بعض اہل سنت مفسرین نے کوشش کی ہے کہ اس آیت کو نکاح موقت کی نفی اور اسے زنا ہی کے ذیل میں ثابت کرنے کے لیے سند کے طور پر پیش کریں۔

یہ حقیقت ہے کہ نکاح موقت متعہ مسلہ طور پر پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ آغاز اسلام میں بہت سے صحابہؓ نے اس پر عمل کیا تھا۔ اور کوئی مسلمان اس کی صحت سے انکار نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ اس میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں رائج تھا مگر بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے اسے حرام قرار دیا۔

اس مسلہ حقیقت کے پیش نظر مذکورہ اہل سنت علماء کے نظریے کا یہ مفہوم سمجھا جائے گا (العیاذ باللہ) پیغمبر اکرم نے زنا کو جائز جانا (چاہے تھوڑی سی مدت کے لیے ہی سہی) مگر یہ ناممکنات میں سے ہے۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر، غور کیجیے کہ حقیقت یہ ہے کہ "متعہ" بھی نکاح کا ایک طریقہ ہے اور اس کی اکثر شرائط وہی ہیں۔ جو دائمی شادی کی ہیں اس لیے یہ بھی (الا علیٰ ازواجھم) کے جملے میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "کچھ مدتی شادی" کا صیغہ نکاح پڑھتے ہوئے وہی الفاظ اور صیغے "انکحت" "زوجت" مدت کی قید کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور یہی اس کی حلت اور جواز کی بہترین دلیل بھی ہے۔

اسی تفسیر کی جلد ۲ میں سورۂ نساء آیت ۲۴ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نکاح موقت اسلام میں اس کا شرعی جواز اس کا منسوخ نہ ہونا اور اس کا اجتماعی فلسفہ وغیرہ جیسے مسائل پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

۳۔ **خضوع و خشوع رُوح نماز ہے** اگر قرأت رکوع، سجود اور اذکار کو ایک جسم سے تشبیہ دیں تو حقیقتِ نماز کی طرف اور اس کی طرف جس کی نماز پڑھتے ہیں، قلبی توجہ اور باطنی یکسوئی رُوح نماز ہے۔

"خشوع"، عجز و انکساری اور ادب کے ساتھ دلی توجہ کا دوسرا نام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مومنین نماز کو ایک بے رُوح ڈھانچہ نہیں سمجھتے، بلکہ ان کی پوری توجہ نماز کی باطنی کیفیت اور حقیقت پر ہوتی ہے۔ اکثر لوگ ایسے ہیں جو نماز میں از حد کوشش کرتے ہیں کہ عالم نماز میں خضوع و خشوع اور اللہ کی طرف دلی توجہ کریں، مگر وہ ایسا کر نہیں پاتے، نماز اور دیگر عبادات کے دوران

خضوع و خشوع اور حضور قلب کے لیے مندرجہ ذیل امور پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے۔

i ۔ معلومات کو اس حد تک پہنچائیے کہ انسان کی نگاہ میں دُنیا کی ذِلت و پستی اور اللہ کی رفعت و بلندی اور عظمت و بزرگی واضح ہو جائے تاکہ کوئی بھی دنیادی امر اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے وقت اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔

ii ۔ پریشان خیالی اور ذہنی انتشار حواس کو ایک طرف مرکوز رکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا انسان جتنا ان کو کم کرے، دلی توجہ اور یکسوئی میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

iii ۔ اس سلسلے میں نماز اور دیگر عبادات کے لیے مقام کا محل وقوع بھی خاصہ مؤثر ہے۔ اسی بنا پر ایسی جگہوں پر نماز ادا کرنا مکروہ ہے، جو انسان کی توجہ ہٹانے کا سبب ہوں۔ مثلاً آئینے کے سامنے نماز پڑھنا، کھلے دروازوں کے سامنے جہاں سے لوگوں کی آمد و رفت ہوئی ہو، نماز پڑھنا اور کسی تصویر یا پُرکشش منظر کے سامنے نماز ادا کرنا وغیرہ اسی وجہ سے مساجد زیب و زینت اور آرائش سے خالی ہونی چاہئیں تاکہ انسان کی توجہ مکمل طور پر اللہ کی طرف ہی رہے

iv ۔ گناہ سے پرہیز کرنا۔ کیونکہ گناہ کے ارتکاب سے انسان اللہ سے دُور ہو جاتا ہے اور نماز میں حضور قلبی سے محروم رہتا ہے۔

v ۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنیٰ اور اس کے افعال و اذکار سے واقفیت حاصل کرنا۔

vi ۔ نماز کے مخصوص آداب اور مستحبات کو ادا کرنا، چاہے ان کا تعلق مقدماتِ نماز سے ہو یا خود اصل نماز سے۔

vii ۔ مذکورہ بالا تمام امور سے قطع نظر خضوع و خشوع کے حصول کے لیے مسلسل اور پیہم مشق اور پوری توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان شروع شروع میں تھوڑی دیر کے لیے دلی یکسوئی پیدا کر لیتا ہے اور اگر وہ اس کی مسلسل مشق کرے اور ہر نماز میں برابر اس کے اضافے کی کوشش کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسا ملکہ پیدا نہ کر لے کہ ہمیشہ حالتِ نماز میں وہ غیر اللہ سے بالکل بے نیاز ہو جائے۔ (قابلِ غور ہے)

۱۲۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝
۱۳۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝
۱۴۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝
۱۵۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝
۱۶۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۲۔ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔
۱۳۔ پھر ہم نے اسے نطفے کی صورت میں ایک اطمینان بخش جگہ (رحم) میں رکھا۔
۱۴۔ پھر نطفے کو علقہ (جمے ہوئے خون) کی صورت دی اور علقہ کو مضغہ (گوشت کے لوتھڑے کی سی چیز) کی شکل بخشی اور پھر ہم نے اس لوتھڑے کو ہڈیوں کی شکل دی۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ اس کے بعد ہم نے

اس کو ایک نئی صورت میں پیدا کیا۔ وہ خدا عظیم ہے، جو خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔
۱۵۔ اس کے بعد تمھیں مرنا ہے۔
۱۶۔ پھر روزِ قیامت دوبارہ اُٹھائے جاؤ گے۔

تفسیر

رحم مادر میں "جنین" کے ارتقائی مراحل

گذشتہ آیتوں میں سچے مومنین کے اوصاف اور ان کی بہترین اُخروی جزا کا ذکر اور ان کی صفوں میں شامل ہونے کے شوق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن کیونکر اور کس طریقے سے؟ زیر بحث اور اس کے بعد آنے والی آیتوں کا ایک حصّہ ایمان اور معرفت کے حصول کے بنیادی طریقوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پہلے انسان کے باطنی اور اندرونی اسرار و رموز کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اس مقام پر قرآن درحقیقت انسان کو عالم النفس کی سیر کرواتا ہے۔ اور اس کے بعد میں آنے والی آیتوں میں انسان کی توجہ خارجی کائنات کے حیرت انگیز وجود کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور یہ دراصل سیر آفاق ہے۔ سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔ ہم نے، انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ (ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين)۔[1]

بے شک یہ انسان کی خلقت کی پہلی منزل ہے، وہ انسان جو بے پناہ قابلیتوں اور صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اتنی رفعت کا حامل ہے کہ "افضل مخلوقات اور افضل موجودات اس کا طُرّہ ہے۔ اس بے قیمت مٹی سے بنا ہے، وہ مٹی جو بے اہمیت ہونے میں ضرب المثل ہے، یہی تو اللہ کی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے حقیر سے مادے سے "رفیع شاہکار" بنایا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: پھر ہم نے اسے پُرامن جگہ پر بطورِ نطفہ ٹھہرایا۔ (ثم جعلناه نطفة في قرار مكين)۔

---

[1] "سُلالة" (بروزن "عصارہ") اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو کسی دوسری چیز سے لی جائے اور درحقیقت اس کا نچوڑ اور جوہر ہو۔ (تفسیر مجمع البیان)

دراصل پہلی آیت عمومی طور پر تمام انسانوں کی خلقت کی ابتدار کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس میں آدم بھی شامل ہیں اور اس کی لاد بھی اور یہ بتا رہی ہے کہ سب مٹی اور گارے سے پیدا کیے گئے ہیں۔ دوسری آیت میں دوام اور افزائش نسل آدم کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ کہ رحم مادر میں نر و مادہ کا نطفہ کس طرح ترکیب پاتا ہے۔ درحقیقت یہ بحث سورۂ سجدہ آیت ۷ اور ۸ میں بیان شدہ مطلب کے مشابہ ہے اور وہ یہ ہے۔

"وبدء خلق الانسان من طين ثمّ جعل نسله من سلالة من ماء مهين"۔

انسان کی ابتدار گارے سے ہوئی، پھر اس کی نسل ایک ٹپکنے والے حقیر پانی کے ذریعے باقی رکھی گئی۔

رحم مادر کو قرار مکین پر امن قیام گاہ کہہ کر انسانی جسم میں اس کی خاص حیثیت اور مقام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رحم، انسانی جسم میں ایک محفوظ ترین مقام پر واقع ہے۔ ایک طرف سے ریڑھ کی ہڈی کا مضبوط ستون ہے، دوسری طرف ہنیسے کی مانند کمر کی مضبوط ہڈیاں، تیسری طرف سے پیٹ کے تہ بتہ پردے اور چوتھی طرف بازوؤں کی حفاظت یہ سب اس پر امن قیام گاہ کے واضح مظاہر ہیں۔ اس کے بعد رحم مادر میں نطفے کے تعجب انگیز اور ہوش رُبا مختلف مراحل اور خلقت کی مختلف صورتیں جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں یکے بعد دیگرے اس پُر امن قیام گاہ میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے ارشاد ہوتا ہے: پھر ہم نطفے کو جمے ہُوئے خون، کی شکل میں لے آتے، پھر جمے ہُوئے خون کو چبائے ہُوئے گوشت کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر اسی کو ہڈی کی شکل دی اور پھر ہڈیوں پر گوشت کی تہ چڑھادی۔ (ثمّ خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظامًا فكسونا العظام لحمًا۔)

<u>نطفے</u> کے مرحلے سمیت مذکورہ بالا پانچ مختلف مراحل تشکیل پاتے ہیں۔ جن میں کا ہر ایک بجائے خود ایک حیرت انگیز عالم ہے۔ جو عجائبات کا مجموعہ ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں جنین شناس جس پر گہری تحقیق کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جس زمانے میں قرآن مجید نے" انسانی جنین" کی خلقت کے عجوبے کا انکشاف کیا تھا۔ اس وقت اس سائنسی ترقی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

آیت کے آخری حصے میں واقعی اہم ترین مرحلے کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ یہ مرحلہ بلاشبہ سربستہ اور معنی خیز ہے۔ پھر ہم نے اس میں ایک نئی خلقت پیدا کر دی (ثمّ انشأ ناه خلقًا اٰخر)۔

وہ خدا جو خلق کرنے والوں میں سے بہترین ہے وہ بہت عظیم ہے۔ (فتبارك الله احسن الخالقين)۔

بے شک، رحم مادر میں تاریکی کے پردوں کے اندر حقیر پانی کے قطرے سے اتنی عمدہ خوبصورت اور عجیب و غریب کمالات کی حامل تصویر بنانے کا بے مثال کار لائق تحسین و آفرین ہے۔ اس حقیر سے موجود میں اتنی قابلیتیں اور صلاحیتیں بھر دینے والا علم و حکمت کا حامل لائق ستائش و تحسین ہے۔ آفرین اس پر اس کی اس بے نظیر خلقت پر۔

ضمنی طور پر یہ بھی بیان ہو جائے کہ "خالق" مادہ "خلق" سے ہے اور اس کا مطلب ماپنا اور پیمائش کرنا ہے۔ عرب جب چمڑے کو کاٹنے کے لیے ماپتے ہیں۔ تو اس کے لیے "خلق" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ خلقت میں چونکہ پیمائش اور ناپ تول کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ لہٰذا اس پر بھی "خلق" کا لفظ استعمال ہوتا ہے

"احسن الخالقين" اضافت کی یہ ترکیب ذہنوں میں ایک سوال کو جنم دیتی ہے کہ کیا اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خالق بھی ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی طرح طرح سے توضیح کی ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں اور لفظ "خلق" غیر اللہ کی ایجاد، اختراع اور صنعت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ اللہ کا کسی چیز کو خلق کرنا اور مخلوق کا خلق کرنا ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اللہ کسی چیز کو خلق کرتے ہُوئے اس کے اصل مادہ اور شکل و صورت دونوں کو خلق کرتا ہے۔ جبکہ انسان کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے تو پہلے سے موجود مواد کو استعمال کر کے کوئی نئی شکل دیتا ہے۔ مثلاً تعمیراتی مواد (ریت، مٹی، پتھر) سے عمارتیں اور لوہے اور دیگر دھاتوں سے کاریں، بسیں یا مشینیں بنا لیتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کی خلقت اور پیدا کرنا، لامتناہی و غیر محدود ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ۔ (رعد - ۱۶)

جب کہ انسان بہت ہی محدود پیمانے پر ایجادات کر سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انسان کی ایجادات میں کئی نقائص پائے جاتے ہیں۔ اور چاہیئے کہ مسلسل عمل کرتے ہُوئے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ مگر اللہ کی مخلوق ہر قسم کے عیوب و نقائص سے مبرّا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر انسان یہ قابلیت اور تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے۔ تو یہ بھی اللہ کی مرضی سے ہی ہے۔ کیونکہ اس کی اجازت کے بغیر تو درخت کا پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۱۱۰ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے۔

واذ تخلق من الطين كهيئة الطير باذني

جب تم میری اجازت سے گیلی مٹی سے پرندے کی طرح کی ایک شکل بناتے تھے۔

بعد کی آیت توحید اور مبدار کے بارے میں بات کرتے ہُوئے بڑی خوبصورتی لطافت اور سلیقے سے مسئلے کا رُخ معاد اور قیامت کی طرف موڑ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ان تمام عجیب و غریب خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوصف انسان ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک وقت آئے گا کہ یہ عجیب عمارت زمین بوس ہو جائے گی اور پھر تم اس زندگی کے بعد سب کے سب مر جاؤ گے۔

(ثمّ انكم بعد ذٰلك لميتون)۔

لیکن اس تصور کی نفی کے لیے کہ انسان کے مرنے سے تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ چند روزہ عظمت و شوکت

کس کام کی، بس یہ ایک فضول کھیل ہے) فوڑا یہ کہا جاتا ہے: پھر تم روزِ قیامت، اُٹھائے جاؤ گے (دوبارہ تمھیں زندگی دی جائے گی. البتہ وہ زندگی اعلےٰ درجے کی اور وسیع تر جہان میں ہوگی۔ (ثم انکم یوم القیامۃ تبعثون)

چند اہم نکات

۱۔ مبتدا اور معاد کا اثبات ایک دلیل سے

توجہ طلب بات یہ ہے کہ "عالم جنین میں خلقت انسان کے مختلف مراحل کو زیرِ بحث آیت میں اللہ کی قدرت کاملہ اور بے مثال کمال کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے. جب کہ اس سے پہلے سورۂ حج میں اسی مسئلے کو انسان کی بازگشت، کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ زیرِ بحث آیت میں بھی اس مسئلے کی بنیاد پر معاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[۱]

جی ہاں! پنہاں رحم میں انسانی خلقت کے عجائبات ہر روز نیا رُخ اختیار کرتے ہیں، اس عظمتِ الٰہی کو پہچاننا چاہیئے۔ گویا ماہر مصوروں، کاریگروں اور تخلیق کاروں کا ایک گروہ ہے. جو پانی کے ایک قطرے کے پاس بیٹھا اور شب و روز اس پر کام کر رہا ہے اور اس قطرۂ ناچیز کو بڑی باریکی سے اور انتہائی لطیف انداز سے زندگی کے مختلف مراحل سے گزار رہا ہے۔ جنین کے رشد اور نشوونما کے مختلف مراحل کی اگر ایک مکمل اور صحیح فلم بن سکتی اور اسے دیکھ سکتے تو ہم سمجھتے کہ کیسے عجائب و غرائب اور کیسی عمدہ کاریگری اس میں پنہاں ہے۔

تاہم عصرِ حاضر میں جنین شناسی کے بارے میں بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ ماہرین کی روز افزوں تحقیقات اور تجربات نے اس سلسلے میں بہت سے مسائل واضح کر دیے ہیں۔ انسان کی نگاہ جب ان تحقیقات کے نتائج پر پڑتی ہے تو بے اختیار "فتبارک اللہ احسن الخالقین" کا نغمہ اس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف ہر روز نیا رُوپ اختیار کر لینے والی پے در پے تخلیقات اور پھر خصوصًا پانی کے ایک چھوٹے سے قطرے سے ایک مکمل انسان کی پیدائش اس امر کی غماز ہے کہ اللہ معاد اور انسان کو حیاتِ نو عطا کرنے پر قادر ہے۔ اس طرح سے ایک دلیل سے دو مقصد پورے ہوتے ہیں۔ اور ایک کرشمے سے دو کام انجام پا جاتے ہیں۔[۲]

۲۔ رحم مادر میں انسان کی ارتقاء کا آخری مرحلہ

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں رحم میں انسان کی خلقت کے پانچ مراحل کا ذکر لفظ "خلق" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر آخری مرحلے کو "انشاء" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے. ماہرینِ لغت کے بقول "کسی چیز کو ایجاد کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے پالنے کو "انشاء" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آخری منزل پہلے تمام مراحل (نطفہ، علقہ

---

[۱] سورۂ حج کی ابتداء میں آیت ۵ تا ۷، کے ذیل میں ہم نے جنین شناسی کے حوالے سے معاد پر گفتگو کی ہے۔ (اسی ساتویں جلد کے آغاز کی طرف رجوع کیجیئے)

[۲] مراحل جنین اور شاہکار تخلیق کے بارے میں تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں ہم نے سورۂ آلِ عمران کی چھٹی آیت کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

مضغہ ہڈی اور گوشت کے غلاف) سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ ایک اہم مرحلہ ہے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید اجمالی طور پر صرف یہ کہہ رہا ہے کہ پھر ہم نے اسے ایک نئی خلقت دی اور اس کے بعد فوڑا پکار اُٹھتا ہے۔

"فتبارک اللہ احسن الخالقین"

یہ کیسی منزل ہے کہ جو اس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ یہ وہی مرحلہ ہے۔ جب بے جان "جنین" زندگی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس میں حرکت اور احساس پیدا ہوتا ہے۔ جنبش کرتا ہے۔ اسلامی روایات میں اس مرحلے کو "نفخ رُوح، اور روح پھونکے جانے کا مرحلہ) کہتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے۔ جہاں انسان ایک جست کے ساتھ جماداتی اور نباتاتی زندگی سے حیواناتی اور اس سے بھی کہیں آگے انسانی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور اس کا فاصلہ پہلے مراحل سے اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ "ثم خلقنا" کے الفاظ اس کا مفہوم ادا کرنے سے کوتاہ دامنی کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا "ثُمَّ اَنشَاْنٰا" فرما کر اس منزل کی رفعت کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ وہ منزل ہے، جہاں انسان ایک مخصوص ساخت اور پرداخت کا حامل ہو کر عالم میں ممتاز حیثیت حاصل کر لیتا ہے جس بنا پر یہ اللہ کی خلافت کا اہل بنتا ہے اور جو امانت آسمان اور پہاڑ نہ اُٹھا سکے تھے۔ اس کا قرعہ اس کے نام نکلتا ہے۔ واقعی یہ وہ مقام ہے جہاں "عالم کبیر" اپنی تمام تر وسعتوں اور رفعتوں کے ساتھ اس "عالم صغیر" میں سمو دیا جاتا ہے اور حقیقی معنیٰ میں (تبارک اللہ احسن الخالقین) کا شاہکار قرار پاتا ہے۔

۳۔ ہڈیوں پر گوشت کا غلاف

زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں تفسیر "فی ظلال القرآن" کا مؤلف ایک عجیب جُملہ لکھتا ہے اور وہ جُملہ یہ ہے کہ "جنین" جب "علقہ" اور "مضغہ" کے مراحل سے گزر جاتا ہے تو اس کے تمام سیل ہڈیوں کے خلیوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد تدریجًا ہڈیوں پر عضلات اور گوشت کا غلاف چڑھتا ہے۔ اس بنا پر (کسونا العظام لحمًا) کا جُملہ ایک سائنسی معجزہ ہے جو ایسے سائنسی مسئلہ کی نقاب کشائی کر رہا ہے، جو اس زمانے میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا۔ کیونکہ قرآن مجید یہ نہیں کہتا کہ ہم نے "مضغہ" کو ہڈی اور گوشت میں بدلا۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ "مضغہ" کو ہڈی بنایا، پھر اس پر گوشت کا غلاف چڑھایا۔ گویا واضح کر رہا ہے کہ "مضغہ" پہلے ہڈی میں تبدیل ہوتا ہے اور اس کے بعد اس پر گوشت کی تہ چڑھتی ہے۔

۴۔ ہڈیوں کا پائیدار اور محافظ غلاف

دراصل عضلات اور گوشت پوست کو ہڈیوں کے لباس سے تعبیر کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ اگر ہڈیوں کے اُوپر یہ لباس نہ ہوتا تو انسان کا جسم نہایت کریہ المنظر اور بدصورت دکھائی دیتا۔ (بالکل ان انسانی سانچوں کی طرح جو اگرچہ ہم نے دیکھے نہیں۔ البتہ ان کی تصاویر ضرور دیکھی ہیں۔)

قطع نظر اس سے کہ لباس انسان کے جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ گوشت پوست اور عضلات بھی ہڈیوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر ہڈیوں پر یہ موٹا غلاف نہ ہوتا تو جسم پر لگنے والی ہر چوٹ ہڈیوں کو براہِ راست

نقصان پہنچاتی اور انہیں توڑ دیتی۔

جس طرح لباس انسان کے جسم کی سردی یا گرمی سے حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح گوشت ہڈیوں کی حفاظت کرتا ہے جو انسانی جسم کا اصل ڈھانچہ ہیں، ان تمام امور کا واضح بیان قرآن مجید کے علوم کی گہرائی کی روشن علامت ہے۔

۱۷۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ○

۱۸۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ ۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ○

۱۹۔ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○

۲۰۔ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ○

۲۱۔ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○

۲۲۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۷۔ اور یقیناً ہم نے تمہارے اوپر سات راستے (منزلیں) بنائے ہیں اور ہم (اپنی) مخلوق سے نہ کبھی غافل تھے اور نہ ہیں۔

۱۸۔ اور ہم نے آسمان سے ایک معین مقدار میں پانی اتارا اور اسے زمین

میں (مخصوص جگہوں پر) ٹھہرا دیا اور ہم اسے لے جانے پر مکمل طور پر قادر ہیں۔

۱۹۔ پھر اسی کے ذریعے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ اگائے اور ان باغوں میں بہت زیادہ پھل ہیں۔ کہ جن میں سے تم کھاتے ہو۔

۲۰۔ اور وہ درخت جو طور سینا سے اگتا ہے، اس میں روغنیات بھی ہیں اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی فراہم ہوتا ہے۔

۲۱۔ اور تمہارے لیے چوپایوں میں ایک سبق ہے، ان کے پیٹ میں (دودھ کی صورت میں) جو کچھ ہے، اس سے ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ ان میں تمہارے لیے بہت سے فائدے ہیں اور ان کا گوشت بھی تم کھاتے ہو۔

۲۲۔ نیز تم ان پر اور کشتیوں پر سواری کرتے ہو۔

تفسیر

توحید کی نشانیوں کا ایک بار پھر تذکرہ۔

ہم نے اُوپر بیان کیا کہ مومنین کے اوصاف بیان کرنے کے بعد قرآن مجید ایمان کے حصول کے طریقے بیان کرتا ہے گذشتہ آیتوں میں اللہ کی قدرت و عظمت کی وہ نشانیاں جو خود ہمارے جسموں میں موجود ہیں۔ کا تذکرہ کیا گیا۔ زیرِ بحث آیتوں میں انسان سے باہر کی کائنات میں اللہ کی نشانیوں میں سے زمین و آسمان میں اس کی عظمتِ قدرت کے مظاہر کا تذکرہ ہے۔

سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے ہیں (و لقد خلقنا فوقکم سبع طرائق)۔

"طرائق" "طریقۃ" کی جمع ہے۔ اور اس کا مطلب راستہ یا عمارت کی منزل ہے۔ اوّل الذکر معنیٰ کی بنیاد

پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ ہم نے تمہارے اُوپر سات راستے بنائے۔ شاید یہ فرشتوں کی آمد و رفت کے راستوں کا ذکر ہو یا ستاروں اور سیاروں کے مداروں کا ذکر ہو۔ موخر الذکر معنیٰ کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے اوپر سات منزلیں (سات آسمان) بنائے۔

سات آسمان کے بارے میں ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اشارۃً عرض ہے کہ اگر سات کے عدد کو تکثیر کے معنیٰ میں لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمہارے اوپر بہت سے کرّات سماوی، اجرام فلکی، عوالم، ستارے اور سیارے ہیں۔

منزلوں کا مفہوم کسی طرح بھی بطلیموسی نظریئے پر منطبق نہیں ہوتا۔ کہ جس کے مطابق سات آسمان پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر موجود ہیں اور نہ ہی یہ تصور ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید ایک باطل مفروضے کو اپنی گفتگو کی بنیاد بنائے، بلکہ طرائق اور طبقات اس حقیقت کی طرف اشارہ ہیں کہ ہم سے مختلف فاصلوں پر مختلف عوالم اور جہان آباد ہیں اور ہمارے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک دوسرے سے اُوپر ہے۔ بعض بہت دُور ہیں اور بعض نزدیک۔

اور اگر "سبع" کے معنیٰ صرف سات لیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جس کائنات کو ہم دیکھتے ہیں۔ (جو ہماری کہکشاؤں، سیاروں اور ستاروں کا مجموعہ ہے) اس کے علاوہ اور عالم ہیں جو ہمارے اوپر بنائے گئے ہیں۔ اور جن تک ابھی انسان کو دسترس حاصل نہیں ہوئی ہے۔

اگر نظامِ شمسی کا بغور جائزہ لیں، سُورج کے گرد مختلف سیاروں کی ترتیب کا گہرا مطالعہ کریں تو ایک اور تفسیر بھی کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ سُورج کے گرد گھومنے والے سیاروں کی کل تعداد ۹ ہے، عطارد اور زہرہ نامی دو سیاروں کا مدار زمین کے مدار کے نیچے ہے اور باقی چھ سیاروں کا مدار زمین کے اُوپر عین اس طرح ہے، جس طرح چند منزلہ عمارت کی منزلیں ہوتی ہیں۔ مزید برآں چاند کا مدار بھی زمین کے اُوپر ہی ہے، اس طرح زمین کے اُوپر منزل بہ منزل کل سات مدار ہوئے گویا زمین کے اوپر سات منزلیں قرار پاتی ہیں۔ (غور کیجیے گا)[1]

مختلف کہکشاؤں اور عوالم کی کثرت و وسعت سے شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال اُبھرے کہ ان کا پیدا کرنے والا کہیں ان سے غافل نہ ہو جائے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہُوئے آیت کے آخری حصے میں ارشاد ہوتا ہے۔ ہم اپنی پیدا کردہ خلقت سے غافل نہ تھے اور نہ ہیں۔ (وما کنا عن الخلق غٰفلین)۔

یہاں لفظ "خلق" استعمال کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ "خلقت کا وجود بجائے خود دلیل ہے کہ پیدا کرنے والے کے علم میں سب کچھ ہے اور اس کی پوری توجہ اس کی طرف مبذول ہے اور کبھی ایسا نہیں ہو سکتا، کہ پیدا کرنے والا اپنی مخلوق سے غافل ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کی تفسیر یہ ہو کہ ہم نے فرشتوں کی آمد و رفت کے لیے تمہارے اوپر بہت سے راستے بنا رکھے ہیں۔ ہم تمہارے حالات سے بے خبر نہیں اور ہمارے فرشتے بھی تمہاری حرکات و سکنات کے گواہ ہیں۔

---

[1] سات آسمانوں کی مزید وضاحت کے لیے اسی تفسیر کی پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۹ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

بعد کی آیت زمین وآسمان کی ان گنت برکتوں اور نعمتوں اور اللہ کی قدرت کاملہ کے لاتعداد مظاہر میں سے ایک مظہر یعنی بارش کے بارے میں کہہ رہی ہے: ہم نے آسمان سے ایک معین مقدار میں پانی اُتارا۔ (وانزلنا من السماء ماءً بقدر)۔ نہ اتنی زیادہ بارش کہ بہا لے جانا والا سیلاب بن جائے اور نہ اتنی کم نباتات وحیوانات کی پیاس بھی نہ بجھے۔ اس میں شک نہیں کہ آسمانوں کے بعد جب زمین پر نظر کریں تو عطیات پروردگار میں سے اہم ترین عطیہ پانی ہے۔ جو تمام زندہ موجودات کی زندگی کا ضامن ہے۔ اس کے بعد اسی سلسلے کا ایک اور زیادہ اہم مسئلہ یعنی زیرزمین پانی کے ذخائر کا ذکر کرتے ہُوئے ارشاد ہوتا ہے۔ ہم نے اس پانی کو زیرزمین پانی کے ذخائر میں محفوظ کیا ہے۔ حالانکہ اگر ہم چاہتے کہ اسے ختم کردیں۔ تو ہمیں ایسا کرنے کی پوری طاقت ہے (فاسکناہ فی الارض وانا علی ذهاب به لقادرون)۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین نے دو بالکل مختلف طبقوں سے تشکیل پائی ہے ایک پانی کو اپنے اندر جذب کرنے والا اور دوسرا جذب نہ کرنے والا۔ اگر زمین کا کرلیسٹ (THE CROST) ہرجگہ جاذب ہوتا تو چاہے کتنا بھی مینہ برستا زمین کے اندر ہی جذب ہو کر اس کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے، وسیع وعریض زمین کی تمام سطح خشک رہتی اور پانی کا ایک قطرہ تک نہ ملتا۔

اس کے برعکس اگر ہر جگہ زمین کی سطح غیر جاذب اور سنگلاخ ہوتی تو بارش کا سارے کا سارا پانی سطح زمین کے اوپر ہی رہتا اور رطوبت تعفن کا یہ عالم ہوتا کہ عرصۂ زمین انسان کے لیے تنگ ہو جاتا اور زندگی کا ضامن پانی انسان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتا۔ لیکن احسان کرنے والے عظیم اللہ نے زمین کی سطح کے اُوپر کے حصّے کو جاذب آب اور نچلے حصّے کو غیر جاذب بنایا: تاکہ سطح زمین سے پانی تو نیچے چلا جائے۔ مگر اتھاہ گہرائیوں میں کم ہونے کی بجائے ایک خاص گہرائی تک جاکر غیرجاذب سطح پر رُک کر اکٹھا ہو جائے۔ تاکہ بعد میں کنوؤں اور چشموں اور ٹیوب ویلوں کی صورت میں فضا کو مکدر کیے بغیر انسان کے لیے قابلِ استفادہ بن سکے۔

یہ خوشگوار اور مزیدار پانی جس کو آج گہرے کنوؤں سے نکال کر اپنے اندر نئی توانائی پیدا کرتے ہیں۔ شاید ہزاروں برس پہلے برسنے والی گھٹاؤں کا ہو جو متعفن ہُوئے بغیر آج کے لیے جمع کیا گیا ہو۔ بہرحال وہ ذات بابرکات جس نے انسان کو زندگی کے لیے پیدا کیا ہے اور پانی کو زندگی کا اہم ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس نے انسان سے بہت پہلے اس مادۂ حیات کو جمع کرنے کیلئے اہم ذخائر پیدا کئے اور ان میں پانی جمع کیا۔

البتہ "برف" کی صورت میں اس "مادۂ حیات" کا ایک حصّہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی ہے۔ جو یا تو سال بھر برابر پگھل پگھل کر دریاؤں کا منبع قرار پاتا ہے یا صدیوں بلکہ ہزاروں سال "گلیشیر" کی صورت میں وہیں رُکا رہتا ہے، حتیٰ کہ موسمی تغیر وتبدل کے ذریعے اسے نیچے پھسلنے کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ پیاسے اور خشک بیابانوں کو سیراب کرے۔

لیکن "فی الارض" میں "ارض" کے ساتھ "فی" پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت زیرزمین پانی کے ذخائر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ نہ کہ اُوپر کے ذخائر کی طرف۔

ﻟﮧ یاد رہے کہ گندے پانی کا زمین میں جذب ہونا اس کی تطہیر کا سبب بنتا ہے۔

اس کے بعد بارش کے بابرکت اثرات اور اس سے ہونے والی پیداوار کی طرف اشارہ ہو رہا ہے: اور اس کے ذریعے ہم نے تمھارے لیے کھجور اور انگور کے باغ اگا دیئے، جن میں تمھارے کھانے کے لیئے ڈھیر سارے پھل موجود ہیں۔ (فانشأنا لكم به جنات من نخيل واعناب لكم فيها فواكه كثيرة ومنها تاكلون)۔

بارش سے پیدا ہونے والے پھل صرف کھجور اور انگور ہی تو نہیں ہیں، بلکہ طرح طرح کے ان گنت پھل ہیں اور دیگر پیداوار بھی ہے۔ آیت میں صرف ان دو کا ذکر مجموعی پیداوار میں سے عمدہ اور اعلیٰ ہونے کی بناء پر کیا گیا ہے اور "منها تاكلون" یعنی ان میں سے تم کھاتے ہو" شاید اس طرف اشارہ ہو کہ نعمتوں سے مالا مال ان باغوں میں صرف پھل فروٹ ہی تو نہیں۔ بلکہ یہ کھانے پینے کی چیزیں ان گنت پیداوار کا ایک حصّہ ہیں۔

نخلستانوں سمیت تمام باغات انسان کی غذائی ضروریات کے علاوہ اور بہت سے فوائد کے حامل ہیں۔ مثلاً ان کے پتوں سے چٹائیاں اور بعض اوقات کپڑے بھی بنتے ہیں۔ ان کی لکڑی سے گھر، فرنیچر اور سواریاں، بنتی ہیں، بعض درختوں کی جڑی بوٹیوں سے دوائیاں تیار کی جاتی ہیں، انسان کے کام کرنے والے جانور پتّوں سے پیٹ پالتے ہیں۔ اور لکڑیاں بطور ایندھن استعمال ہوتی ہیں۔

فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں" منها تاكلون" سے ایک اور احتمال کا اظہار بھی کیا ہے۔ بقول ان کے اس سے یہ مراد ہے کہ

یہ باغات تمھارا ذریعۂ معاش ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں کام سے روٹی کھاتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی کی گزر بسر اس کام پر ہے۔ ﻟﮧ

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ زیرِ بحث آیت میں انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز "نطفے کا پانی" اور نباتاتی زندگی کا نقطۂ آغاز "بارش کا پانی"، بیان کیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ زندگی کے ان دونوں کا سرچشمہ پانی ہے۔ بے شک ہر جگہ اللہ کا ایک ہی قانون حکم فرما ہے۔

اس کے بعد بارش کے پانی سے نمو پانے والے ایک اور بابرکت درخت کا ذکر کرتے ہُوئے ارشاد ہوتا ہے کہ کھجور انگور اور دیگر پھلوں کے درختوں کے علاوہ" طور سینا سے اُگنے والا ایک اور درخت بھی ہے۔ جس سے تیل اور سالن کھانے والوں کو حاصل ہوتا ہے" (وشجرة تخرج من طور سيناء تنبت بالدهن وصبغ للأكلين)۔

طور سینا کے متعلق مفسرین نے دو عمدہ احتمالات کا اظہار کیا ہے۔

(ا) صحرائے سیناء میں موجود مشہور" کوہ طور" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے کوہِ طور سے اگنے والے درخت کو" زیتون کا درخت" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حجاز کے عرب جب بے آب وگیاہ صحراؤں سے گذرتے ہُوئے شمال کی طرف بڑھتے تھے۔ تو زیتون کے درختوں سے بھرا ہوا پہلا زرخیز علاقہ صحرائے سینا کے جنوب میں یہی طور کا علاقہ تھا (نقشہ دیکھنے سے

ﻟﮧ پہلی تفسیر کی بناء پر "من" "تبعیضیہ" ہے اور دوسری کے مطابق "نشویہ" ہے۔

بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے)

(۱) "طورسینا" بطور صفت استعمال ہوا ہے یہ اصطلاح بابرکت اور مقدس پہاڑ یا درختوں سے بھرا ہوا پہاڑ اور یا خوبصورت وحسین پہاڑ کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ "طور" بمعنیٰ پہاڑ ہے، اور "سینا" بابرکت، خوبصورت اور سرسبز وشاداب کے معنیٰ میں ہے۔

"صبغ"، کا مطلب دراصل "رنگ" ہے۔ عام طور کھانا کھاتے ہوئے انسان جب چپاتی سالن کے ساتھ کھاتا ہے تو وہ رنگین ہو جاتی ہے۔ لہذا تمام قسم کے روٹی سالن کو "صبغ" کہا گیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ "صبغ" زیتون کے تیل کی طرف اشارہ کررہا ہو، جسے کھانے کے ساتھ کھایا جاتا ہے یا مختلف قسم کے سالن کی طرف اشارہ ہو جو مختلف درختوں سے تیار کیے جاتے ہیں۔

اس مقام پر ایک سوال ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ طرح طرح کے بے شمار پھلوں میں سے صرف کھجور، انگور اور زیتون تین پھلوں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے، ماہرین خوراک کی جدید تحقیق کے مطابق بہت کم پھل ایسے ہیں۔ جو انسانی صحت کے لیے ان تین پھلوں کے برابر مفید اور مؤثر ہوں۔

زیتون کا تیل انسانی بدن کی ساخت اور مفید رطوبتوں کے لحاظ سے بڑی قابل قدر شئے ہے، اس میں حرارتی عنصر بہت زیادہ ہے جگر کے لیے مفید ہے اور گردوں کے کئی عارضوں کو ختم کرنے والا ہے، گردے کے درد اور پتھری کا بہترین نسخہ ہے۔ اعصاب کے لیے مقوی ہے۔ مختصر یہ کہ انسانی صحت کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

"کھجور" کی اتنی تعریف کی گئی ہے کہ اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہے، کھجور سے حاصل کی ہوئی چینی اعلیٰ اور مکمل چینی ہے ماہرین خوراک کی اکثریت کے مطابق کھجور" مانع سرطان" ہے۔ ماہرین نے اس میں تیرہ قسم کی حیاتین اور پانچ قسم کے وٹامن کا انکشاف کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ کھجور کو قیمتی غذا کے سرچشمہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اور "انگور" بعض ماہرین کے مطابق ایک فطری "میڈیکل سٹور" ہے۔ انسانی بدن کے لیے شیر مادر کی سی خاصیتیں رکھتا ہے، جسم میں گوشت سے دگنی حرارت پیدا کرتا ہے، مصفّیٰ خون ہے، بدن کے زہریلے مادے خارج کر دیتا ہے اور اس میں موجود طرح طرح کے وٹامن انسان کو قوت وطاقت دیتے ہیں۔ [1]

نباتاتی نعمتوں کے بعد بارش کے پانی سے پلنے والی حیواناتی نعمتوں کے ایک اہم حصے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ چوپایوں میں تمہارے لیے لمحہ فکریہ ہے (وان لکم فی الانعام لعبرة)۔ [2]

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے، اس سے ہم تمھیں سیراب کرتے ہیں۔ (نسقیکم مما فی بطونها)۔

---

[1] ان تین حیات بخش پھلوں کی مزید تفصیلات کے لیے اس تفسیر کی جلد ۶ سورۂ نحل آیت نمبر ۔۔ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

[2] یہاں۔ "عبرة" کا بطور نکرہ استعمال اس عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔

بے شک خون اور اسی طرح کی کئی ایک غلاظتوں میں سے "دودھ" جیسی مزیدار اور خوشگو مقوی اور مکمل غذا نکالی جاتی ہے۔ تاکہ انسان سمجھ سکے کہ اللہ آلودہ چیزوں میں سے پاک اور مزیدار چیز نکالنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہا جا رہا ہے کہ جانوروں سے متعلق سبق آموز امور کی برکتیں اور نعمتیں صرف دودھ تک ہی محدود نہیں بلکہ" ان میں تمھارے لیے اور بھی فائدے ہیں اور تم ان کا گوشت کھاتے ہو (ولکم فیها منافع کثیرة ومنها تأکلون)۔

حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے گوشت کا استعمال جسم کی غذائی ضرورات کو پورا کرتا ہے، اس کے علاوہ ان کی کھالیں کئی قسم کے لباس اور شامیانے وغیرہ بنانے کے کام آتی ہیں۔ ان کے بالوں سے چٹائیاں، لباس، اون اور کئی طرح کے اوچھاڑ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ان کے بدن کے بعض اعضاء سے دوائیاں بنتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے گوبر سے ایندھن کے علاوہ درختوں اور فصلوں کے لیے بڑی مفید کھاد تیار کی جاتی ہے۔ ان سب سے قطع نظر سواری کے لیے خشکی میں چوپایوں کو اور دریاؤں میں کشتی کو استعمال کرتے ہو اور اپنی منزلوں تک پہنچتے ہو۔

(وعلیها وعلی الفلک تحملون) [1]

جانوروں کی انواع، خواص اور فوائد واقعی سرمایۂ غور وفکر ہیں۔ ایک طرف یہ انسان کو ان نعمتوں کے پیدا کرنے والے کی معرفت دلاتے ہیں اور دوسری طرف اس کو شکر گزاری کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔ [2]

یہاں صرف ایک سوال باقی رہتا ہے، وہ یہ کہ چوپائے اور کشتیاں ایک ہی صف میں کیسے کھڑی کر دی گئی ہیں؟ ایک نقطے کو سمجھنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انسان کو ساری زمین میں سواری کی ضرورت ہے۔ اس لیے بری سواری کے ساتھ ساتھ بحری سواری کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ درحقیقت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ میں بھی انسان کو عطا کی جانے والی نعمتوں کے ذیل میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

"وحملناهم فی البر والبحر"

"ہم انہیں خشکیوں اور پانیوں میں ادھر ادھر لے جاتے ہیں"۔

---

[1] اسی تفسیر کی جلد ۶ میں سورۂ نحل آیت ۸۰ کی تفسیر کے ذیل میں جانوروں سے استفادہ کے بارے میں مفصل بحث موجود ہے۔

[2] اسی تفسیر کی جلد ۶ میں سورۂ نحل آیت نمبر ۱۴ اور اسی جلد ۷، سورۂ حج آیت ۶۵ کی تفسیر کے ذیل میں کشتیوں کی اہمیت اور ان سے استفادہ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۲۳۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○

۲۴۔ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○ۚ

۲۵۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ○

ترجمہ

۲۳۔ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے اپنی قوم سے کہا "اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی اور معبود نہیں کیا تم (پھر بھی بتوں کی پرستش سے) پرہیز نہیں کرتے؟

۲۴۔ ان کی قوم کے سردار (اور مغرور لوگ) کہ جو کافر تھے، کہنے لگے کہ یہ شخص تمہاری ہی طرح کا بشر ہے اور یہ تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے، اور اگر اللہ نبی بھیجنا چاہتا تو فرشتے نازل کرتا، ہم نے اپنے آباء و اجداد سے اس قسم

کی کوئی بات کبھی نہیں سُنی۔

۲۵۔ یہ آدمی تو بس ایک طرح کے جنون میں مبتلا ہے۔ کچھ عرصہ اس کے بارے میں صبر کرو (یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو جائے یا یہ اس بیماری سے نجات پالے)

تفسیر

کوردل مغروروں کی منطق

گذشتہ آیتوں میں توحید، معرفت پروردگار اور عالم خلقت میں اس کی عظمت کے دلائل کے بارے میں گفت گو تھی اسی مطلب کو عظیم انبیاءؑ کی زبانی اور ان کی تاریخ کے حوالے زیر بحث لایا گیا ہے۔ آئندہ کی آیات میں بھی یہی سلسلۂ کلام جاری جاری ہے۔

سب سے پہلے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوحؑ جو توحید کے داعی اور اس کی تبلیغ و ترویج کرنے والے ہیں۔ سے ابتدا کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا، میری قوم! خدائے واحد کی عبادت کرو کہ جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ (ولقد ارسلنا نوحًا الٰی قومہٖ فقال یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ)۔

کیا اس واضح بیان کے باوجود تم بتوں کی پرستش سے پرہیز نہیں کرتے (افلا تتقون)۔

اس پر ان کی قوم کے دولت مند، مالدار اور مغرور افراد جو صرف ظاہر بین اور کور باطن تھے، کہنے لگے۔ یہ تمہاری طرح کا ایک عام آدمی ہے، جو تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اسی جذبے کے تحت یہ تم پر مسلط ہونا چاہتا ہے۔ (فقال الملؤا الذین کفروا من قومہٖ ماھذا الّا بشر مثلکم یرید ان یتفضّل علیکم)۔

اور یوں ان کا انسان ہونا انہیں حضرت نوحؑ کا پہلا "عیب" نظر آیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے ان پر الزام لگایا کہ یہ "ہوسِ اقتدار" میں مبتلا ہے۔ اور اس مقصد کو پانے کے لیے اُس نے توحید، دین اور تبلیغ کرنے کا ڈھونگ رچایا ہے۔ انہوں نے یہ کہا، اگر اللہ کوئی رسول بھیجتا بھی یقیناً اس مقصد کے لیے فرشتے بھیجتا (ولو شآء اللہ لانزل ملٰٓئکۃ)۔

اس مہمل اور فضول منطق کی دلیل انھوں نے یہ پیش کی کہ "ہم نے اپنے آباء و اجداد سے کبھی یہ نہیں سُنا کہ ایک انسان نبوت کا دعوٰے کرے یا اپنے آپ کو اللہ کا نمائندہ سمجھے۔ (ماسمعنا بھٰذا فی اٰبائنا الاوّلین)۔

لیکن ان بے بنیاد باتوں نے عظیم پیغمبرؑ کے پائے استقلال میں کوئی تزلزل پیدا نہ کیا۔ اور انہوں نے پُورے زور وشور سے اپنی دعوت جاری رکھی اور ان کے کسی کام میں بڑا بننے اور خواہش اقتدار کی کوئی علامت نہ تھی۔

چنانچہ انہوں نے ان پر" پاگل پن اور دیوانگی کا ایک اور الزام لگایا۔ یہ وہ الزام ہے جو تاریخِ انبیاء میں اکثر پیغمبروں پر لگایا جاتا رہا ہے۔ وہ کہنے لگے: وہ تو ایک پاگل اور دیوانہ آدمی ہے، لہٰذا اس وقت تک تمہیں صبر کرنا چاہیئے کہ اسے موت آجائے یا اس مرض سے شفا پالے (ان ھو الا رجل بہ جنۃ فتربصوا بہ حتّٰی حین)۔

لائق توجہ بات ہے کہ انھوں نے اس اولوالعزم پیغمبرؑ پر" پاگل پن" اور "دیوانگی" کی تہمت اس لیے لگائی کہ وہ اس حقیقت کو پُوری طرح چھپا سکیں کہ اس کی ساری باتیں عقل و منطق کی بہترین مثال ہیں۔ دراصل وہ کہنا چاہتے تھے کہ چونکہ دیوانگی کی کئی قسمیں ہیں اور بیشتر پاگل ہمیشہ پاگل پن کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ ان پر دوروں کی سی کیفیت ہوتی ہے کبھی صحیح العقل نظر آتے ہیں اور کبھی پاگل۔

" فتربصوا بہ حتّٰی حین" کا جُملہ شاید حضرت نوحؑ کی موت تک کے انتظار کی طرف اشارہ ہو، جس کا مخالفین بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جُملے سے "دیوانگی" کی بیماری پر وہ تاکید مزید کر رہے ہوں، یعنی ان کی صحت یابی تک انتظار کرو۔ [1]

بہر حال حضرت نوحؑ پر انہوں نے اپنی باتوں میں تین بیہودہ اور متضاد الزامات لگائے اور ہر ایک الزام کو ان کی رسالت کی نفی کی دلیل قرار دیا۔ اُن کی طرف سے یہ الزامات تھے۔

(i) اصولی طور پر انسان کی طرف سے نبوت کا دعوٰی سراسر جھُوٹ ہے اور پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا اور اگر اللہ نبی ہی بھیجنا چاہتا تو لازمی طور پر فرشتوں سے یہ کام لیتا۔

(ii) نوحؑ ایک اقتدار پسند شخص ہے اور اپنے اس مقصد کو پانے کے لیے اس نے نبوت کے دعوے کو ذریعہ بنایا ہے۔

(iii) نوحؑ صحیح الدماغ آدمی نہیں ہے اور اس کا دعوائے نبوت اسی بیماری کا نتیجہ ہے۔

چونکہ ان بے بنیاد اور بے ربط الزامات کے جوابات بالکل واضح ہیں۔ اور کئی جگہ پر دیئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر قرآن مجید نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یہ مُسلم ہے کہ انسان کا رہبر خود اسی کی نوع سے ہونا چاہیئے

[1] ۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس جُملے سے مراد یہ ہے کہ "اس کو کچھ مدت کے لیے قید کر دو، اور بعض نے یہ مراد لی ہے "سر دست اسے اس کے حال پر چھوڑ دو پھر دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ دونوں تفسیریں ہرگز صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

تاکہ وہ انسانی ضروریات، تکالیف اور مسائل سے واقفیت رکھتا ہو، مزید برآں ہمیشہ سے ہی پیغمبرؑ خود بنی نوع انسان سے ہی ہوا کرتے تھے۔ دوسرے انبیاءؑ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ان کی نمایاں ترین صفات تواضع انکساری اور ہر قسم کی بالادستی اور اقتدار پسندی کی نفی رہی ہیں اور انبیاء کی عقل اور سُوجھ بُوجھ ان کے دشمنوں پر بھی بالکل آشکار تھی اور وہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

۲۶۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝
۲۷۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا
فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ
كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ
عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝
۲۸۔ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝
۲۹۔ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ
الْمُنْزِلِيْنَ ۝
۳۰۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ (نوح نے کہا) پالنے والے مجھے جھٹلانے والوں کے خلاف میری مدد فرما۔

۲۷۔ ہم نے (نوح کو) وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہمارے فرمان کے مطابق کشتی بنا۔ پس جب ان کو غرق کرنے کے لیے، ہمارا حکم

آئے اور تنور سے پانی ابلنے لگے (جو طوفان آپہنچنے کی نشانی ہے) تو تمام جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں بٹھا لے۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی بٹھا لے، سوائے ان کے جن کی ہلاکت کا پہلے ہی سے حکم جاری کر دیا گیا ہے (یہ اشارہ حضرت نوحؑ کی بیوی اور ان کے ناخلف بیٹے کی طرف ہے) اور ان ظالموں کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا، کیونکہ انھیں تو ہلاک ہی ہونا ہے۔

۲۸۔ اور جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں ٹھیک سے بیٹھ جائیں تو کہنا تعریف کے لائق وہی ذات ہے۔ جس نے ہمیں ظالموں سے نجات بخشی۔

۲۹۔ اور کہنا: پالنے والے ہمیں بابرکت جگہ پر پار لگا۔ کہ تو بہترین پار لگانے والا ہے۔

۳۰۔ (بے شک) اس (واقعے) میں عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور ہم یقیناً سب کی آزمائش کریں گے۔

تفسیر

ایک باغی قوم کا انجام

گزشتہ آیتوں میں دشمنوں کی طرف سے حضرت نوحؑ پر لگائے جانے والے چند بے بنیاد الزامات کا تذکرہ کیا گیا۔ قرآن مجید کی دیگر آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سرکش قوم کی طرف سے دی جانے والی اذیتیں یہی نہیں تھیں۔ بلکہ وہ جس طرح سے بھی آپؑ کو تنگ کر سکتے تھے۔ انہوں نے کیا۔ حضرت نوحؑ نے اپنی تمام ہر ممکنہ کوششوں کے ساتھ انہیں شرک

کُفر اور گمراہی سے نکالنا چاہا۔ لیکن جب سوائے معدودے چند افراد کے ان پر کوئی ایمان نہ لایا تو آپؑ مایوس ہو گئے اور اللہ سے مدد چاہی۔ اس مرحلے کا ذکر زیرِبحث پہلی آیت میں کیا جا رہا ہے۔

اس نے عرض کیا: پالنے والے! مجھے جھٹلانے والوں کے خلاف میری مدد فرما۔ (قال رب انصرنی بما کذّبون)۔ [1]

اللہ کا حکم آپہنچا حضرت نوحؑ اور آپ کے چند ساتھیوں کو نجات ملی اور ہٹ دھرم کافروں اور مشرکوں کی سزا کے لیے حالات پیدا ہو گئے۔ "ہم نے نوحؑ کو وحی کی کہ ہماری ہدایات کے مطابق اور ہماری نگرانی میں کشتی بنا۔ (فاوحینا الیہ ان اصنع الفلک باعیننا ووحینا)۔

"بِاَعْیُنِنَا" یعنی ہماری نظروں کے سامنے، اس کا یہ مفہوم ہے کہ تمھاری تمام تر کارکردگی ہمارے سامنے ہے اور تمھیں ہماری پوری تائید حاصل ہے۔ لہٰذا مطمئن ہو کر اپنے مشن کو جاری رکھو اور کسی خوف و خطر کو خاطر میں نہ لاؤ۔ "وحینا" سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی سازی کی تفصیلات وحی سے سیکھیں، کیونکہ تاریخ کے مطابق اس زمانے تک کشتی کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ چنانچہ آپؑ نے، اپنے مقصد کی ضروریات کے مطابق کشتی کو ہر عیب اور نقص کے بغیر بنا لیا اس کے بعد ارشاد ہوا۔ اور جب ہمارا فرمان پہنچے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ تنور سے پانی ابلنے لگے گا۔ سمجھ لینا کہ طوفان کا وقت آگیا ہے تو فوراً ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں بٹھا لینا۔ (فاذا جآء امرنا وفار التنور فاسلک فیھا من کل زوجین اثنین)۔

اپنے اہلِ خانہ اور دوستوں میں سے صاحبانِ ایمان کو بھی بٹھا لینا، مگر ان کو نہ بٹھانا جن کی ہلاکت کا پہلے سے فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ (حضرت نوحؑ کی بیوی اور ایک بیٹے کی طرف اشارہ ہے) (واھلک الّا من سبق علیہ القول منھم)۔

اس کے بعد یہ کہا جا رہا ہے: اور ان ظالموں (کہ جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور دوسروں پر بھی ظلم کیا) کے بارے میں کوئی سفارش نہ کرنا، کیونکہ وہ سب کے سب غرق ہو کے رہیں گے۔ اور اس میں کہنے سُننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون)۔

یہ تنبیہ اس لیے کردی گئی تھی کہ شاید حضرت نوحؑ انسانی فطری جذبے، شفقتِ پدری سے متاثر ہو جائیں اور ان کی سفارش کر بیٹھیں، جب کہ وہ کسی قسم کی سفارش کے مستحق نہیں تھے۔

بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: جس وقت تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں ٹھیک سے بیٹھ جاؤ۔ تو اس نعمتِ

---

[1] "بما کذبون" کی "با" شاید سببی ہو یا بائے "سببیت" اور اس میں "ما" شاید "مصدریہ" ہو یا "موصولہ" ہر ایک صورت میں معنی جدا ہوں گے۔ مگر مفہوم میں زیادہ فرق پیدا نہیں ہو گا۔ (قابلِ غور ہے)

عظمیٰ پر اللہ کی حمد و ثناء کرو اور کہو کہ تعریف ہے اس خدا کی جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دی (فاذا استویت انت ومن معک علی الفلک فقل الحمد للہ الذی نجانا من القوم الظالمین)۔

اللہ کی حمد کے ظالموں سے نجات" جیسی عظیم نعمت پانے کے بعد یُوں دُعا کرو: اور کہو! پالنے والے، مجھے بابرکت جگہ پر پار لگانا کہ تو بہترین پار لگانے والا ہے۔ (وقل رب انزلنی منزلًا مبارکًا وانت خیر المنزلین)۔

لفظ "منزل" شاید رسم مکان ہو، یعنی طوفان ختم جانے کے بعد ہماری کشتی ایسی سرزمین پر پہنچانا جو کثیر برکتوں کی حامل ہو۔ تاکہ ہم اطمینان سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ یہ مصدر میمی بھی ہو سکتا ہے، یعنی ہمارا زمین پر اترنا نہایت موزوں اور مناسب ہو۔ کیونکہ طوفان کے بعد جب کشتی زمین پر رُکے گی۔ تو کشتی میں سوار لوگوں کو کئی خطرات کا سامنا ہوگا۔ مثلاً رہنے سہنے کے لیے سازگار جگہ کا نہ ہونا، خوراک اور غذا کی کمی اور وباء پھوٹنے کا ڈر وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے حضرت نوحؑ دُعا کر رہے ہیں۔ کہ یا اللہ انھیں صحیح و سالم اور موزوں کیفیت میں زمین پر اُتار دے۔

زیرِ نظر آخری آیت میں مجموعی طور پر پورے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ نوحؑ اور ان کی کامیابی اور ظالم اور باغی قوم کو ان کی بداعمالیوں کی سخت سزا کے اس سارے واقعے میں صاحبانِ عقل و فکر کے لیے عبرت و سبق کی نشانیاں موجود ہیں۔ (انّ فی ذٰلک لاٰیات)۔

اور یقیناً ہم سب کی آزمائش کریں گے (وان کنّا لمبتلین)۔

شاید یہ جُملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ ہم نے قومِ نوحؑ کو ہر طرح سے آزمایا اور جب وہ لوگ ہر امتحان میں ناکام رہے، تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ یہ بھی ہو سکتا کہ اس جُملہ کا مفہوم یہ ہو کہ ہم ہر زمانے میں ہر جگہ کے لوگوں کو آزماتے اور پرکھتے رہیں گے۔ اور مذکورہ بالا واقعات صرف قوم نوح ہی سے خصوصیت نہیں رکھتے۔ ہر دور میں مختلف طریقوں سے آزمائش جاری رہے گی اور جو لوگ انسان کی ترقی و تکامل کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے۔ انہیں ہٹا دیا جائے گا۔ تاکہ انسان اپنی راہ تکامل پر گامزن رہے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ زیرِبحث آیتوں میں صرف حضرت نوحؑ کے کشتی بنانے اور ان کے اور ان کے ساتھیوں کے سوار ہونے اور نجات پانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر گناہگاروں کا انجام کیا ہوا، کچھ وضاحت نہیں کی گئی۔ البتہ (انھم مغرقون) (وہ یقیناً غرق ہوں گے) کے جملے سے انکا انجام بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا وعدہ ہمیشہ سچا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ قوم نوحؑ کی عظیم پیغمبر کے خلاف کارروائیاں اور پھر ان کا عبرت ناک انجام، کشتی سازی کا واقعہ تنور سے پانی کا اُبلنا، طوفان کا سب کو گھیر لینا، حضرت نوحؑ کے بیٹے کا غرق ہونا وغیرہ بہت سے اہم نکات ہیں۔ جن کا ہم نے جلد ۵ میں سورۂ ہُود کی تفسیر کے ذیل میں مفصل جائزہ لیا ہے۔ انشاء اللہ باقی تفصیلات سورۂ نوحؑ کی تفسیر میں آئیں گی۔

۳۱۔ ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝

۳۲۔ فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ
مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝

۳۳۔ وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا
وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا
تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝

۳۴۔ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا
لَّخَاسِرُونَ ۝

۳۵۔ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَ
عِظَامًا أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ ۝

۳۶۔ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ۝

۳۷۔ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا
وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝

۳۸۔ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ
لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ۝

۳۹۔ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ۝

۴۰۔ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ ۝

۴۱۔ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ
فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ

۳۱۔ پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور قوم کو پیدا کر دیا۔

۳۲۔ اور ہم نے انہی میں سے ایک رسول ان کی طرف بھیجا کہ خدائے یکتا کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کوئی اور تمھارا معبود نہیں۔ کیا (اس کے باوجود شرک و بت پرستی) سے تم پرہیز نہیں کرتے۔

۳۳۔ اس کی قوم کے وہ وڈیرے جو کافر ہو گئے اور انھوں نے لقائے آخرت کو جھٹلایا تھا اور جنھیں ہم نے دُنیا میں نعمتوں سے نوازا تھا، بولے: یہ تو تمھاری ہی طرح کا ایک بشر ہے۔ جو تمھاری ہی طرح کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔

۳۴۔ اور اگر اپنی ہی طرح کے ایک بشر کی اطاعت کرو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔

۳۵۔ کیا تم سے وہ یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ تو دوبارہ تم قبروں سے نکلو گے۔

۳۶۔ بہت بعید اور بہت بعید ہیں وہ وعدے کہ جو تم سے کیے جا رہے ہیں۔

۳۷۔ زندگی یہی دُنیا ہی کی ہے۔ برابر یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ کچھ لوگ مر جاتے ہیں اور دوسرے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ہم ہرگز دوبارہ اُٹھائے نہیں جائیں گے۔

۳۸۔ یہ محض ایک جھوٹا شخص ہے، جس نے اللہ پر بہتان باندھا ہے، ہم اس پر کبھی ایمان نہ لائیں گے۔

۳۹۔ اس نے عرض کیا! پالنے والے ان کی طرف سے جھٹلانے کے خلاف میری مدد فرما۔

۴۰۔ اللہ نے فرمایا: بہت جلد وہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔ مگر اس وقت جب کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

۴۱۔ پس بجا طور پر آسمانی بجلی نے انھیں آلیا۔ اور ہم نے انھیں سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی مانند کر دیا، دُور ہوا ظالم قوم! رحمت خدا سے۔

تفسیر

قوم ثمود کا عبرتناک انجام

زیرِ بحث آیتیں، حضرت نوح کے بعد آنے والی دیگر اقوام اور ان کے نظریات جو سابق کفار سے ہم آہنگ تھے کا تذکرہ کر رہی ہیں۔ اسی طرح ان کے دردناک انجام کا ذکر کرتے ہیں۔

گذشتہ آیتوں میں کی گئی بحث کی تکمیل کر رہی ہیں۔ سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔: ان کے بعد ہم نے ایک اور گروہ کو پیدا کیا اور ایک دوسری قوم معرضِ وجود میں آگئی۔ (ثم انشأنا من بعدھم قرنا اٰخرین)

"قرن" کا مادہ "اقتران" ہے۔ اور اس کا معنیٰ قریب اور نزدیک ہے۔ چنانچہ وہ قومیں جو ایک ہی زمانے میں ہوں ان کو "قرن" کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ان کے دور کو بھی قرن کہا جاتا ہے۔ مختلف قوموں کے نزدیک قرن کی مقدار مختلف ہے یہ تیس سال کا بھی ہوتا ہے اور سو سال کا بھی۔

چونکہ انسان کسی منصوص من اللہ رہبر و قائد کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اللہ نے توحید کی دعوت دینے اور آئین حق کی تبلیغ کے لیے ایک پیغمبر کو ان کی طرف بھیجا تاکہ ان کو کہے کہ اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا لائق عبادت نہیں (فارسلنا فیھم رسولا منھم ان اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ)۔

یہ وہی دعوت ہے جو انبیاءؑ کے مشن کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ توحید کی آواز تھی جو انفرادی اور اجتماعی تمام بھلائیوں کی اساس ہے۔ اس کے بعد اللہ کا نمائندہ تاکید مزید کے طور پر کہتا ہے: کیا اس واضح دعوتِ توحید کے بعد بھی تم شرک و بت پرستی سے پرہیز نہیں کرو گے (افلا تتقون)۔

یہ کونسی قوم تھی اور ان کے پیغمبر کا کیا نام تھا۔ اس سلسلے میں مفسرین نے قرآن مجید کی دیگر آیات کے مطالعہ سے دو احتمالات کا اظہار کیا ہے۔

(۱) یہ قوم ثمود ہے جو حجاز کے شمال میں آباد تھی۔ اللہ کے عظیم نبی حضرت صالحؑ ان کی طرف مبعوث برسالت ہوئے۔ مگر قوم نے انکار کیا نافرمانی اور سرکشی کی۔ آخرکار دل دہلا دینے والی ایک "صیحہ آسمانی" (ہولناک بجلی) گری اور وہ سب نیست و نابود ہو گئے اس دعوے کا ثبوت ان کو دی جانے والی سزا "صیحہ" ہے جو زیرِ بحث آیت کے آخر میں بیان کی گئی ہے اور سُورہ ہُود کی آیت نمبر ۶۷ میں بھی قوم صالح کے بارے میں اسی سزا کا ذکر ہے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ قوم عاد ہے۔ ان کے پیغمبر حضرت ہُود تھے۔ قرآن مجید کی بعض آیتوں میں ان کی روداد قوم نوح کے واقعات کے فوراً بعد بیان کی گئی ہے۔ یہی اس دعوے کی دلیل ہے۔[1]

لیکن سورۂ "الحاقہ" کی آیت ۶، ۷ کے مطابق قوم عاد کی سزا شدید قسم کی تیز آندھی تھی جو برابر سات راتیں اور آٹھ دن ان کے درپے رہی۔ اس لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ اس عظیم پیغمبرؑ کی دعوتِ توحید کے جواب میں سرکش قوم کا ردِ عمل کیا تھا، قرآن مجید کے بقول وڈیروں کے اس خود پسند طبقے نے اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا کہ آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا۔ حالانکہ ہم نے انہیں دُنیا کی بہت سی نعمتوں سے مالامال کر رکھا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تمہاری ہی طرح کا انسان ہے۔ جو تم کھاتے ہو۔ یہ بھی کھاتا ہے۔ اور جو تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔ (وقال الملا من قومہ الذین کفروا وکذبوا بلقاء الاٰخرۃ واترفناھم فی الحیٰوۃ الدنیا ما ھذا الا بشر مثلکم یأکل مما تأکلون منہ ویشرب مما تشربون)۔

بے شک وہ اشراف کا خوشحال طبقہ جو قرآن مجید کی اصطلاح میں "ملأ" ہے۔ (یہ طبقہ صرف ظاہر بین تھا اور کور باطن تھا) وہ اس عظیم پیغمبر کے مشن کو اپنے مفاد کا مخالف، ناجائز منافع خوری، استحصال اور بے جا بالادستی سے متصادم دیکھ رہا تھا۔ یہ طبقہ اپنی پُر تعیش زندگی کی وجہ سے اللہ سے کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اور آخرت کا منکر تھا۔

---

[1] سورہ ہود آیت ۵۰، سورۂ اعراف آیت ۶۵ اور سورۂ شعراء کی آیت نمبر ۱۲۳ ملاحظہ ہوں۔

یہ طبقہ اس عظیم پیغمبر کے مقابلے میں آگیا۔ اس کے خیالات اور نظریات بالکل وہی تھے جو قوم نوحؑ کے متکبر وڈیروں کے تھے۔ انہوں نے اللہ کے نمائندوں کے انسان ہونے اور دیگر انسانوں کی طرح کھانے پینے کو ان کی رسالت کی نفی کی دلیل قرار دیا۔ حالانکہ یہ بات ان مایۂ ناز شخصیتوں کی نبوت و رسالت کی پُر زور تائید تھی۔ کہ وہ عام لوگوں میں سے ہوں تاکہ انسان کی ضروریات اور مسائل سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ مزید برآں وہ ایک دوسرے سے کہتے۔ اگر تم اپنے ہی جیسے آدمی کے مطیع بن گئے تو یہ بڑی نقصان دہ بات ہوگی۔ (ولئن اطعتم بشرًا مثلکم انکم اذًا الخاسرون)۔

یہ کور باطن اتنا نہیں سمجھتے تھے کہ خود تو یہ توقع کر رہے ہیں کہ لوگ ان کے شیطانی عزائم کی تکمیل اور پیغمبر سے مقابلے کے لیے ان کی پیروی کریں، مگر اس شخصیت کی اطاعت و پیروی کو جو منبع وحی سے وابستہ ہے اور جس کا دل نورِ علم پروردگار عالمین سے منور ہے، انسان کے لیے ذلت، ننگ و عار اور "حریت" کے منافی بتارہے تھے۔

اس کے بعد انھوں نے معاد اور قیامت کا انکار کیا، جس کو ماننا ہمیشہ سے خود سر اور ہواوہوس کے رہبر لوگوں کے لیے مشکل رہا ہے۔ اور کہا، کیا یہ شخص تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ مرنے کے بعد مٹی اور بوسیدہ ہڈی ہو جاتے کے بعد تم ایک بار پھر قبروں سے نکلوگے اور ایک نئی زندگی پاؤگے۔ (ایعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابًا وعظامًا انکم مخرجون)۔

بہت دور اور بہت دُور کی بات ہیں۔ وہ وعدے جو تم سے کیے گئے، بالکل بے بنیاد اور کھوکھلے ہیں۔ (ھیھات ھیھات لما توعدون)۔

مجموعی طور پر کیا یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی جو مر گیا ہو۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا ہو، اس کے اجزاء ادھر اُدھر بکھر گئے ہوں، وہ دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے؟ نہیں یہ محال ہے، یہ محال بات ہے۔

مزید برآں معاد کے انکار پر تاکید مزید کے طور پر انہوں نے یہ بھی کہا:

زندگی صرف یہی دنیاوی زندگی ہی تو ہے۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے۔ کہ ایک گروہ مرجاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے، لہٰذا موت کے بعد کچھ بھی نہیں ہے اور ہم ہرگز قبروں سے نہیں اٹھیں گے۔ (ان ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین)۔

آخر میں اپنے نبی پر ایک مجموعی الزام لگاتے ہُوئے انہوں نے کہا، یہ ایک جھوٹا شخص ہے، جس نے اللہ پر بہتان باندھا ہے اور ہم اس پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے (ان ھو الا رجل افترٰی علی اللہ کذبًا وما نحن لہ بمؤمنین)۔

نہ اس کی رسالت اللہ کی طرف سے ہے نہ قیامت سے متعلق اس کے وعدے سچے ہیں اور نہ ہی دوسرے احکام ایسے ہیں۔ کوئی عقلمند آدمی اس پر کیسے ایمان لا سکتا ہے۔ یوں ان کی سرکشی اور ہٹ دھرمی حد سے بڑھ گئی، شرم و حیا کی تمام حدود پھلانگ گئے اور اپنے نبی کے معجزات، پیغام اور انسان ساز دعوت کے انکار میں آخری حد تک چلے گئے۔ بالفاظ دیگر ان سب پر جب حجت تمام ہوگئی تو اس عظیم پیغمبر نے اللہ سے فریاد کی، پالنے والے ان کی طرف سے جھٹلائے جانے کے

خلاف میری مدد فرما۔ (قال رب انصرنی بما کذبون)۔

انہوں نے مجھ پر ہر الزام لگایا اور میرے خلاف جو بھی کر سکتے تھے کر گزرے۔ میری مدد تو فرما۔ اللہ کی طرف سے جواب دیا گیا۔ بہت جلد یہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔ اور جو انہوں نے بویا ہے ضرور کاٹیں گے۔ (قال عما قلیل لیصبحن نادمین)۔

مگر وہ اس وقت پشیمان ہونگے جب وقت گذر چکا ہوگا اور وہ ایسی جگہ پہنچ چکے ہوں گے جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں۔ اور نہ ہی ان کا پچھتاوا ان کو کوئی فائدہ دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوُا۔ اچانک بجا طور پر ایک اندوہناک صیحۂ آسمانی نے انھیں آلیا (فاخذتھم الصیحۃ بالحق)۔

دل دہلا دینے والی مہیب آواز کے ساتھ دہشت ناک بجلی کوندی اور زبردست دھماکہ ہوا۔ ہر جگہ تہ و بالا ہوگئی۔ سب کچھ درہم برہم ہوگیا اور ان کے مردہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ان کی بربادی کچھ ایسی صورت کے ساتھ ہوئی کہ ان کو اپنے گھروں سے بھاگ نکلنے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ گھروں میں ہی دب کے رہ گئے اور آیت کے آخری حصّے میں اس کا خوب نقشہ کھینچا گیا ہے۔" ہم نے ان کو اس طرح کچل کے رکھ دیا جس طرح سیل زندرو کے سامنے بھوسے کے ایک تنکے کی حالت ہوتی ہے (فجعلناھم غثاء)

اور اے ظالم قوم، رحمتِ خدا سے دور ہو۔ (فبعدًا للقوم الظالمین)۔

چند اہم نکات

۱۔ پرتعیش زندگی اور اس کے منحوس نتائج

مذکورہ بالا آیتوں میں اشراف کی پرتعیش زندگی اور قیامت و معاد سے انکار میں ایک خاص ربط نظر آتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ پُرتعیش زندگی بسر کرنے والے عام طور پر مادر پدر آزادی چاہتے ہیں۔ حیوانی لذات اور مادی جذبات کی تسکین کے لیے ہر ہتھکنڈے کو جائز سمجھتے ہیں۔ واضح ہے کہ اللہ کی نگرانی اور قیامت کی عدالت پر ایمان ان کے اس طرز عمل میں زبردست رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

ان کے دل غیر مطمئن رہتے ہیں۔ اور عوام الناس کو ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اسی سبب سے ایسے لوگ مبداء اور اللہ کی طرف بازگشت کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور اس کی بندگی کا جوا زنجیر اپنے گلے سے اتار پھینکتے ہیں۔ اور مذکورہ بالا آیت کے بقول وہ یہ کہتے رہتے ہیں۔ کہ زندگی اسی دُنیا کی زندگی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور جو شخص بھی اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے۔ وہ جھوٹا ہے۔ اس دنیا میں جتنا وقت بھی ملے اس کو غنیمت جانو۔ چار دن کی زندگی ہنسی خوشی گزار دو۔ ہر درخت کا پھل چکھو۔ لذت کا ہر ذریعہ استعمال کرو اور ہر لذت کا لُطف اٹھاؤ ..... وغیرہ وغیرہ۔ یوں وہ اپنی سیاہ کاریوں اور بداعمالیوں کی توجیہہ کرتے رہتے ہیں۔

علاوہ بریں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کے وسائل دوسروں کے حقوق غصب کر کے ہی مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ اور ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ انبیاء کی نبوت اور قیامت کا انکار کیے بغیر طمطراق سے زندگی بسر نہیں ہو سکتی اور یہ وہ مقام ہے جہاں تک پہنچنے والوں کی اکثریت عام مشاہدہ کے مطابق ہر حقیقت سے صرف نظر کرتی نظر آتی ہے اور قابل احترام حقائق کو نہایت

تغیر کے ساتھ رو ندتی چلی جاتی ہے۔ یہ دل کے اندھے اور بہرے، ہوس نفسانی کے چنگل میں پوری طرح جکڑے ہوتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت اور لطف و کرم سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مگر شہوات حیوانی کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ دوسروں کے غلاموں کی بندگی کرتے ہیں۔ یہ لوگ کوتاہ فکر، پست خیال، کورہ ذہن، غلیظ رُوح اور تاریک دل ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا دور کا منظر اور ظاہر شاید بعض لوگوں کے لیے خوش نما اور جاذب نظر ہو۔ مگر قریب کا منظر اور حقیقی حال بڑا وحشت ناک اور گھناؤنا ہوتا ہے۔ کیونکہ ارتکاب گناہ اور جرائم کی وجہ سے برابر مضطرب اور بے چین رہتے ہیں۔ اور تعیش و عیش پرستی کے وسائل چھن جانے اور موت آنے کا خوف ہمہ گیر ان کو مسلسل بے قرار کئے رکھتا ہے۔

۲۔ "تراب" اور "عظام" کا مفہوم "تراب" کا مطلب مٹی اور "عظام" کا معنیٰ ہڈیاں ہے۔ مرنے کے بعد عام طور پر جسدِ خاکی پہلے بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہوتا ہے اور اس کے بعد مٹی بن جاتا ہے لیکن مذکورہ آیت میں "تراب" کو "عظام" پر مقدم کیا گیا ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ شاید آیت میں جسد خاکی کو دو حصے مانا گیا ہو۔ یعنی گوشت اور ہڈیاں، گوشت پہلے ہڈیوں سے الگ ہو کر گر جاتا ہے اور مٹی میں فنا ہو جاتا ہے، ہڈیاں سالوں بعد فنا ہوتی ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ "تراب" سے مراد زمانہ قدیم کے لوگ ہوں، جو بالکل مٹی ہو چکے ہیں اور "عظام" سے ماضی قریب کے اسلاف ہوں، جن کی بوسیدہ ہڈیاں ابھی باقی ہیں۔[1]

۳۔ "غثاء" سے کیا مراد ہے مذکورہ بالا آیت کے مطابق "صیحہ آسمانی" کی وجہ سے قوم ثمود "غثاء" کی طرح ہو گئی۔ "غثاء" کے لغوی معنے "بھوسے" کے ہیں، جو سیلاب کے پانی کے اوپر انتہائی پراگندہ صورت میں نظر آتا ہے۔ اس جھاگ کو بھی "غثاء" کہتے ہیں۔ جو پکتے ہوئے کھانے کی دیگ میں جوش کی صورت میں اوپر آجاتی ہے۔ قوم ثمود کے بے جان لاشوں کو "غثاء" سے تشبیہ دینا دراصل ان کی نہایت کمزور شکستہ، منتشر اور ذلیل و پست کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ سیل تند رو کی طاقت و عظمت کے سامنے حقیر بھوسے کے تنکے کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ سیلاب کے وقت بھوسہ اپنے ارادے اور مرضی سے کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ سیلاب کے بعد اس کا کوئی نام و نشان باقی رہتا ہے۔

"صیحہ آسمانی" کے بارے میں اس تفسیر کی جلد ۵ میں سورۂ ہُود آیت نمبر ۶۷ کی تفسیر کے ذیل میں ہم مفصل بیان کر چکے ہیں۔ البتہ یہ عذاب صرف قوم ثمود پر ہی نازل نہیں ہوا، بلکہ بعض دوسری نافرمان قوموں پر بھی آیا ہے، جنکی تفصیل اپنے مقام پر بیان کر دی گئی ہے۔

۴۔ ایک عمومی انجام دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ آیت کے آخری حصے میں مسئلے کو خصوصی کیفیت سے نکال کر ایک عمومی شکل دی گئی ہے۔ یعنی ایک قاعدہ کُلیہ بنایا گیا ہے کہ

---

[1] تفسیر روح المعانی زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

"ظالم لوگ رحمتِ پروردگار سے دور ہیں"۔

دراصل یہ ان آیات میں بیان شدہ کفر، تکذیب اور معاد و قیامت سے انکار اور نافرمان قوم کے عبرتناک انجام سارے واقعے کا آخری اور حتمی نتیجہ ہے۔ جو کسی خاص اُمّت اور گروہ سے خصوصیت نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام نافرمان لوگ اس میں شامل ہیں۔

۴۲۔ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ؕ

۴۳۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ؕ

۴۴۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۴۲۔ پھر ان کے بعد ہم نے اور قومیں پیدا کیں۔

۴۳۔ کوئی قوم وقت سے پہلے اپنے انجام کو نہیں پہنچتی اور نہ ہی وقت آنے پر اس میں تاخیر ہو سکتی ہے۔

۴۴۔ پھر ہم نے یکے بعد دیگرے بہت سے پیغمبر بھیجے، جب کسی امت کی (ہدایت کے لیے) اس کے پاس نبی بھیجا گیا، اس کو جھٹلایا گیا، پس ہم نے بھی ایک ایک کر کے سب کو ہلاک کر دیا۔ اور ان کو قصہ پارینہ بنا دیا (اور وہ اس طرح مٹ گئیں کہ صرف نام باقی رہ گیا) پس دُور ہو رحمتِ خدا سے اسے بے ایمان قوم!

تفسیر

سرکش اقوام کی یکے بعد دیگرے ہلاکت

زیر بحث آیتوں میں قرآن مجید قوم ثمود کے بعد اور حضرت موسیٰؑ سے پہلے آنے والی اقوام کا ذکر رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ان کے بعد پھر ہم نے دوسری قومیں پیدا کر دیں۔ (ثُمَّ انشأنا من بعدهم قرونًا اٰخرین)۔

کیونکہ اللہ کا طریقہ کار یہ ہے کہ اپنے فیوض و برکات کو منقطع نہیں کرتا۔ بلکہ اگر ایک قوم انسان کے ارتقاء و تکامل کی راہ میں حائل ہو تو اسے ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لے آتا ہے اور یونہی انسانیت کا قافلہ سوئے منزل بڑھتا رہتا ہے۔ البتہ یہ مختلف قومیں اپنے اپنے دور اور معین مدت کے لیے برسر عمل رہیں اور کسی قوم کا اختتام اپنے معینہ وقت سے نہ پہلے ہوتا ہے اور نہ اس میں تاخیر کی جاتی ہے (ما تسبق من امة اجلها وما یستاخرون)۔

جب کسی قوم کے اختتام کا پروانہ صادر کر دیا جاتا ہے تو اس خاص معینہ وقت پر وہ قوم ہلاک ہو جاتی۔ نہ ایک لمحہ پہلے نہ بعد۔ "اجل" سے مراد کسی چیز کی عمر اور مدتِ وجود ہے۔ کبھی یہ لفظ اختتام کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادھار کی اجل اتنی مدت ہے (یعنی اتنی مدت کے بعد ادھار کا وقت ختم ہو جائے گا) البتہ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ کہ "اجل" کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اٹل (۲) مشروط یا معلق۔

کسی چیز، شخص یا قوم کے اختتام کا حتمی اور فیصلہ شدہ وقت جس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہ ہو۔ اسے اٹل اجل کہتے ہیں۔

"اجل مشروط یا معلق" کسی چیز، شخص یا قوم کے اختتام کے لیے جو شرائط ہوں۔ وہ پوری نہ ہوں یا کوئی مانع پیش آ جائے جس کی وجہ سے اس میں کمی و بیشی ممکن ہو جائے اسے اجل مشروط کہتے ہیں، بہر حال اس سلسلے میں ہم اسی تفسیر کی جلد نمبر ۳ میں سورۂ انعام کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔ البتہ زیر بحث آیتوں میں حتمی اجل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بعد کی آیت اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہے کہ انسانی تاریخ میں انبیاءؑ کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا، ارشاد ہوتا ہے "ہم نے یکے بعد دیگرے لگاتار انبیاءؑ بھیجے۔ (ثم ارسلنا رسلنا تترا)۔

"تترا" کا مادہ "وتر" ہے۔ جس کے معنی لگاتار کے ہیں۔ اور اس سے وہ روایت جو لگاتار راویوں سے ہم تک پہنچیں، ان کو "متواتر روایات" (اخبار متواتر) کہا جاتا ہے، جس سے کسی خبر کے صحیح ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

"وتر" کا اصل مطلب کمان کی وہ رسی یا وہ چمڑا ہے جو کمان کے دونوں سروں سے بندھا ہوتا ہے۔ اور تیر لگاتے

وقت دونوں سروں کو قریب لے آتا ہے۔ ساخت کے لحاظ سے لفظ "تترا" دراصل "وترا" تھا اور "واؤ" "ت" میں تبدیل ہوگئی ہے۔

بہرحال آسمانی راہبر ہدایت کے لیے آتے تھے۔ مگر نافرمان اور خودسر اقوام جُوں کی توں کفر اور الحاد پر ڈٹی رہتی تھیں۔ اس طرح سے کہ "جب کوئی رسول کسی اُمت کے پاس آتا تو اُمت اسے جھٹلاتی۔ (کلما جاء امۃ رسولھا کذبوہ)۔

اور جب ان کی سرکشی اور جھٹلانا حد سے بڑھ جاتا اور ہمارے رسول کی طرف سے ہر طرح سے اتمام حجت ہوجاتی۔ تو ہم اس امت کو نابود کر دیتے۔ اس طرح ہم نے کئی قومیں یکے بعد دیگرے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ (فاتبعنا بعضھم بعضاً)۔

قومیں تو مٹ گئیں، البتہ قصّے اور کہانیاں باقی رہ گئیں۔ "بے شک ہم نے ان کو قصّۂ پارینہ بنا دیا۔ (وجعلناھم احادیث)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات بطور مجموعی قوم تو تباہ کر دی جاتی مگر اس کے بعض افراد یا جگہوں کے آثار عبرتناک سبق آموز اور نمایاں کیفیت میں اِدھر اُدھر باقی رہ جاتے یا کبھی اس طرح ہوتا کہ قوم مکمل تباہ ہوجاتی اور صرف تاریخ کے صفحوں یا لوگوں کی باتوں میں ان کا نام رہ جاتا، ہماری نظر میں یہ سرکش قومیں دوسری کیفیت کی مصداق ہیں[1]

آیت کے آخری حصّے میں گذشتہ آیت کی طرح ارشاد ہوتا ہے: دور ہو بے ایمان قوم! رحمتِ خدا سے۔ (فبعداً لقوم لا یؤمنون)۔

بے شک یہ دردناک انجام ان کی بے ایمانی کا نتیجہ تھا، اس بنا پر یہ انجام صرف انہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر بے ایمان، باغی اور ظالم کا یہی مقدر ہوگا اور وہ بھی اس طرح ناپید ہوگا کہ صرف اس کا بُرا نام تاریخ میں یا لوگوں کی زبانوں پر باقی رہ جائے گا۔ یہی نہیں کہ اس قسم کے لوگ صرف دُنیا ہی میں رحمت پروردگار سے محروم ہیں۔ بلکہ آخرت میں بھی اللہ کے لطف و کرم اور مہربانیوں سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ آیت کے مفہوم کے مطابق اس محرومی میں دنیا و آخرت دونوں شامل ہیں۔

---

[1] احادیث "حدیث" کی جمع ہے اور ہماری نظر اس کی مذکورہ بالا تفسیر ہے۔ مگر بعض دوسرے مفسرین کے خیال میں یہ "احدوثہ" کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے "عجیب قصے" جن کے بارے میں لوگ اکثر باتیں کیا کرتے ہیں۔ فخرالدین رازی نے اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں یہ بات لکھی ہے۔

۴۵۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝

۴۶۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝

۴۷۔ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝

۴۸۔ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝

۴۹۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۵۔ پھر ہم نے موسٰی اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور روشن دلیل دے کر بھیجا۔

۴۶۔ فرعون اور اس کے حامی اشراف کی طرف مگر انہوں نے تکبر کا مظاہرہ کیا اور وہ بڑائی کے خواہاں تھے۔

۴۷۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں، حالانکہ ان کی قوم (بنی اسرائیل) ہماری عبادت کرتی ہے (اور ہماری غلام ہے)

۴۸۔ (بالآخر) انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا اور آخرکار وہ سب ہلاک کر

دیئے گئے۔

۴۹۔ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی کہ شاید وہ (بنی اسرائیل) ہدایت پالیں۔

تفسیر

حضرت موسیٰؑ کا قیام اور فرعونیوں کی تباہی

اُب تک حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر سے پہلے کی امتوں کے بارے میں بیان کیا جارہا تھا۔ زیربحث آیتوں میں نہایت اختصار کے ساتھ فرعونیوں کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے قیام اور مغرور قوم کے انجام کے بارے میں ارشاد ہورہا ہے: پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی واضح نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا (ثم ارسلنا موسیٰ واخاہ ہارون بآیاتنا وسلطان مبین)۔

"آیات" اور "سلطان مبین" سے کیا مراد ہے اور ان دونوں کا آپس میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مختلف خیال پائے جاتے ہیں۔

(i) بعض نے کہا 'آیات' سے مراد وہ نو معجزات ہیں جو اللہ نے موسیٰ بن عمران کو دیئے، جبکہ "سلطان مبین" سے مراد فرعونیوں کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کے دندان شکن منطقی دلائل ہیں۔

(ii) بعض دیگر افراد کے خیال میں آیات سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عام معجزات ہیں اور "سلطان مبین" سے مراد بڑے معجزے یعنی "عصا" کا اژدھا بننا اور "ید بیضا" ہے۔ کیونکہ یہ دو بڑے اہم معجزے تھے جو فرعونیوں پر حضرت موسیٰؑ کی واضح کامیابی کا سبب بنے۔

(iii) ایک دوسرے گروہ کے خیال میں "آیات" سے مراد، تورات کی عبادت اور احکام کا بیان اور "سلطان مبین" سے حضرت موسیٰ کے معجزات مراد ہیں۔

لیکن قرآن مجید میں "سلطان مبین" کی اصطلاح کے دیگر استعمال کے پیش نظر، اول الذکر تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اکثر مقام پر لفظ "سلطان" یا "سلطان مبین" واضح دلیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔[1]

---

[1] سورۂ نمل آیت ۲۱۔

لاعذبنه عذابا شديدا او لاذبحنه او ليأتيني بسلطان مبين،

اور سورۂ نجم آیت ۲۳

(بقیہ حاشیہ صفحہ برآئندہ)

بے شک ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو فرعون اور اس کے مغرور وڈیرے حامیوں کی طرف اپنی نشانیوں اور "سلطان مبین" کے ساتھ بھیجا (الیٰ فرعون وملائه)۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے موسیٰ و ہارونؑ کو فرعون اور اس کے مصاحب سرداروں کی طرف بھیجا، یعنی خوشحال اور مراعات یافتہ طبقے کا ذکر ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ مصر کے تمام لوگوں کی طرف بھیجا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت یہ بتانا چاہتی ہے کہ اس وقت کی تمام بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں کی جڑ یہی مراعات یافتہ طبقہ تھا پس سرگردہ ٹھیک ہو جاتے تو باقی لوگوں کا مسئلہ آسان تھا، قطع نظر اس سے کہ وہ وقت کے حاکم اور سیاہ وسفید کے مالک تھے دراصل آیت یہ بتانا چاہتی ہے کہ جب تک کسی ملک کے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ کی اصطلاح نہ ہو، کچھ نہیں ہو سکتا لیکن فرعون اور اس کے مصاحبوں نے تکبر وغرور کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ کی قوت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا (فاستکبروا) اور بنیادی طور پر وہ بڑائی کے خواہاں تھے (وکانوا قوما عالین)۔

"استکبروا" اور "کانوا قوما عالین" کے الفاظ میں فرق ہے۔ اس طرح کہ "استکبروا" سے مراد حضرت موسیٰ کی دعوت کے مقابلے میں ان کا فوری اظہار تکبر ہے۔ جبکہ "کانوا قوما عالین" کا جملہ اس حقیقت کا عکاس ہے کہ تکبر ان کی فکر و ذہنیت کا جزو تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا لفظ ان کے تکبر کا مظہر ہو اور دوسرا ان کے عام پر تعیش اور ٹھاٹھ کے رہن سہن کی طرف اشارہ ہو، جو دراصل ان کے تکبر کی اصل وجہ تھی۔

ان کے تکبر اور غرور کی روشن نشانی ان کا کہا ہوا اگلا جملہ ہے۔ "وہ بولے کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے۔ (فقالوا انؤمن لبشرین مثلنا وقومهما لنا عابدون)۔[1]

یعنی نہ صرف یہ کہ ہم ان کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے، بلکہ انہیں ہماری غلامی کرنی چاہیئے، وہ انبیاء کرام پر الزام لگاتے تھے کہ وہ تسلط طلب اور بڑا بننے کے خواہاں ہیں جب کہ خود بدترین اقتدار پرست اور تسلط طلب تھے۔ یہی بات ان کی اس گفتگو سے واضح ہو رہی ہے۔

بہرحال ان مہمل اور بے ہودہ دلائل کا سہارا لے کر انہوں نے حق کی مخالفت کی اور انہوں نے موسیٰؑ و ہارونؑ کو جھٹلایا اور ہلاک ہونے والوں میں سے قرار پائے۔ (فکذبوهما فکانوا من المهلکین)۔

اور یوں آخرکار بنی اسرائیل کے اصلی دشمن جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی دعوت میں سد راہ تھے، تباہ ہو گئے

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

ان هی الا اسماء سمیتموها انتم وآباؤکم ما انزل الله بها من سلطان۔

دونوں آیتوں میں مثال موجود ہے۔

[1] انسان کو "بشر" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا "بشرہ" یعنی جلد برہنہ حالت میں نظر آتی ہے۔ برخلاف حیوانات کے جن پر قدرتی طور پر بال وغیرہ ہوتے ہیں اور عام طور پر کھال دکھائی نہیں دیتی۔ دراصل وہ بے عقل ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو موسمی تبدیلیوں سے بچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے انہیں طبعی لباس دیا گیا، مگر انسان کو صاحب عقل ہونے کی وجہ سے یوں رکھا گیا ہے۔

اور بنی اسرائیل کی ہدایت اور تعلیم و تربیت کا زمانہ آگیا۔

اس موقع پر اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل کی اور بنی اسرائیل کو خدائی لائحۂ عمل پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی، چنانچہ آخری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی تاکہ اس کے ذریعے بنی اسرائیل ہدایت پائیں۔ (ولقد اٰتینا موسی الکتاب لعلھم یھتدون)۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ گذشتہ آیتوں میں جبکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہ السلام کے فرعونیوں کے ساتھ مقابلے کی بات چل رہی تھی تو جملوں کی تمام ضمیریں تثنیہ کی صورت میں آئی ہیں۔ لیکن نزولِ تورات کا ذکر آیا تو حضرت موسیٰؑ کا نام لیا گیا۔ اور حضرت ہارونؑ کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں شخصیتوں میں سے حضرت موسیٰ ہی صاحب کتاب و شریعت اور اولوا العزم تھے۔ مزید برآں نزولِ تورات کے موقع پر صرف حضرت موسیٰ ہی کوہ طور پر موجود تھے اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بنی اسرائیل کے پاس تھے۔[۱]

---

[۱] حضرت موسیٰؑ کی بعثت، فرعون اور اس کے حواریوں سے آپ کا مقابلہ اور دیگر واقعات کی تفصیل ہم جلد ۴ سورۂ اعراف آیت ۱۰۳ تا ۱۶۲ اور جلد ۷ سورہ طٰہٰ کی آیت ۸ تا ۹۸ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

۵۰۔ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ۝

ترجمہ

۵۰۔ ہم نے عیسیٰ ابن مریم اور ان کی والدہ (مریم) کو اپنی نشانی قرار دیا اور ہم نے انہیں ایک بلند و بالا پرسکون اور چشموں والے علاقے میں جگہ دی۔

تفسیر

اللہ کی ایک اور نشانی

انبیاء کے حالات کی تفصیل کے آخری حصے میں مختصر سا اشارہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کی طرف کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

ہم نے عیسیٰؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کو اپنی عظمت و قدرت کی نشانی قرار دیا (وجعلنا ابن مریم وامہ اٰیۃ)۔

لفظ عیسیٰ کی بجائے "ابن مریم" کہہ کر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ آپ بغیر باپ کے اللہ کے خاص حکم سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یوں پیدا ہونا بجائے خود اللہ کی قدرت کاملہ کی ایک بڑی نشانی تھی۔ مزید برآں چونکہ اس محیر العقول پیدائش کا تعلق ایک طرف حضرت عیسیٰ سے ہے اور دوسری طرف جناب مریم سے لہٰذا دونوں کو الگ الگ نشانی اور آیت شمار کیا گیا ہے۔ البتہ دو مختلف زاویوں سے یہ ایک ہی حقیقت ہے (یعنی بچے کا بغیر باپ کے پیدا ہو جانا اور ایک عورت کا بغیر کسی مرد سے ملاپ کے حاملہ ہو جانا) اس کے بعد ان کو عطا کی گئی چند عظیم نعمتوں اور آسائشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے:

ہم نے ان دونوں کو ایک بلند پُرسکون اور جاری پانی والی جگہ دی۔ (واوینٰھما الیٰ ربوۃ ذات قرار ومعین)۔

"ربوہ" "ربا" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنیٰ زیادہ ہونا اور افزائش ہے اور یہاں بلند اور اونچی جگہ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

"معین"، "معن" (بروزن "شأن") سے ہے اور اس کا مطلب جاری پانی ہے، اس لیے جاری پانی کو "ماء معین" کہتے ہیں۔ بعض نے اس لفظ کو "عین" سے ماخوذ مانا ہے یعنی وہ پانی جو ظاہر ہو اور آنکھوں سے دیکھا جاسکے۔ [1]

بہرحال یہ اس پُرسکون اور پُرآرائش مقام کی طرف ایک مجمل سا اشارہ ہے جو اللہ نے ان دونوں ماں بیٹے کو عطا کیا تھا تاکہ دشمن کی آنکھوں سے اوجھل اطمینان سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ البتہ یہ مقام جغرافیائی لحاظ سے کہاں واقع ہے۔ اس بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔

(i) بعض مفسرین کے خیال کے مطابق شامات کا ایک شہر "ناصرہ" حضرت عیسٰی کی جائے ولادت ہے۔ ان کے بقول جب حضرت عیسٰیؑ پیدا ہوئے تو بعض دشمنوں کو ان کی ولادت اور آئندہ پروگرام کے متعلق اجمالی سی معلومات ملیں اور وہ انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوئے مگر اللہ نے انھیں ایک محفوظ اور پُرآسائش مقام پر پہنچا دیا اور انہیں محفوظ رکھا۔

(ii) دوسروں کے خیال میں یہ مصر کا کوئی علاقہ ہے۔ کیونکہ حضرت عیسٰیؑ اور ان کی والدہ ماجدہ نے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک مدت تک مصر میں قیام کیا تھا۔

(iii) بعض کے خیال میں یہ دمشق کا علاقہ ہے۔

(iv) بعض کے خیال میں یہ "رملہ" (بیت المقدس کے شمال میں ایک شہر ہے) کا علاقہ ہے۔ کیونکہ حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ ماجدہ نے ان دونوں علاقوں میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔

(v) یہ خیال بھی ہے کہ مذکورہ بالا جملے سے مراد بیت المقدس کے گرد و نواح میں وہ جنگل ہو، جہاں آپؑ کی ولادت ہوئی، جہاں ماں بیٹے کے لیے خوشگوار پانی جاری کیا گیا اور تازہ کھجوروں سے ان کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا اور اس جگہ کو ان کے لیے ہر طرح سے محفوظ بھی بنایا گیا۔

بہرحال یہ آیت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اللہ اپنے پیغمبروں اور ان کے اصحاب و انصار کا ہمیشہ حامی و ناصر رہا ہے اور آیت ببانگ دہل کہہ رہی ہے کہ اگر ساری دنیا کا اسلحہ کسی کو تباہ کرنے کے لیے جمع کر لیا جائے۔ لیکن اگر اللہ نہ چاہے تو اس کا بال بھی بیکا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی تنہائی اور یار و انصار کی کمی اس کی شکست کا سبب بن سکتی ہے۔

---

[1] پہلی صورت میں "معین" کی "میم" جزو لفظ ہے اور "فعیل" کے وزن پر ہے۔ دوسری صورت میں "میم" زائدہ ہوگی اور مفعول کے وزن پر "مبیع" کی طرح ہوگی۔

۵۱۔ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝

۵۲۔ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝

۵۳۔ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝

۵۴۔ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝

ترجمہ

۵۱۔ اے رسولو! پاک و پاکیزہ غذا کھاؤ اچھے کام کرو، کیونکہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو، میں اس سے پوری طرح واقف ہوں۔

۵۲۔ تم سب ایک ہی امت ہو اور میں تمہارا پالنے والا ہوں، پس میری نافرمانی سے بچو۔

۵۳۔ پھر لوگوں نے اپنے کام میں اختلاف کر کے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہر کوئی الگ ڈگر پر چل نکلا (تعجب کی بات ہے) ہر کوئی اپنی روش پر خوش ہے۔

۵۴۔ ان کو ان کی غفلت اور جہالت میں رہنے دے، یہاں تک کہ انہیں

موت آجائے (یا وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوجائیں)

تفسیر

سب ایک اُمت ہیں

گذشتہ آیتوں میں انبیاء اور ان کی اُمتوں کی بات چل رہی تھی۔ زیر بحث پہلی آیت میں ان سب سے اس طرح خطاب ہوتا ہے، اے پیغمبرو! پاک و پاکیزہ غذا کھاؤ اور اچھے اچھے کام کرو، کیونکہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، میں پوری طرح سے باخبر ہوں (یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحًا انی بما تعملون علیم)۔

تمہارے اور دوسرے انسانوں میں امتیاز اس لحاظ سے نہیں ہے کہ تم اوصاف بشری نہیں رکھتے یعنی کھاتے پیتے نہیں، بلکہ تمہارا امتیاز یہ ہے کہ تم اپنی خوراک اور غذا کو بھی اپنی ترقی و تکامل کا ایک ذریعہ سمجھتے ہو۔ چنانچہ کھانا کھاتے ہوئے بھی جانچ پڑتال سے کام لیتے ہو اور صرف طیب و طاہر غذا ہی کھاتے ہو۔ جب کہ دوسروں نے صرف کھانے ہی کو اپنا مقصودِ زندگی بنا رکھا ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی حیوانی تشنگی کس غذا سے دور ہوگی اور وہ کبھی خبیث و طیب اور پلید و پاک کی پرواہ نہیں کرتے۔

اگر اس نقطے پر غور کریں کہ خوراک انسانی افکار اور کردار پر اثر رکھتی ہے اور مختلف غذاؤں کے مختلف اخلاقی اثرات ہوتے ہیں تو ان دو جملوں کا آپس میں تعلق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پاک و پاکیزہ خوراک کھاؤ اور نیک اعمال بجالاؤ۔ اکثر روایات میں بھی ہے کہ حرام غذا قبولیت عبادت اور قبولیت دُعا کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث اس کی شاہد ہے۔

ایک شخص رسول اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اُس نے عرض کیا: میں چاہتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو تو آپ نے فرمایا۔

"طھر مأکلتک ولا تدخل بطنک الحرام"۔

اپنی روزی کو پاک بناؤ اور حرام غذا سے پرہیز کرو۔ [1] و [2]

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ "انی بما تعملون علیم" (جو کچھ تم کرتے ہو۔ میں اس سے آگاہ ہوں) کا جملہ انسان کے عمل صالح کا پابند رہنے کا زبردست ضامن ہے۔ کیونکہ جب انسان کو اس بات کا یقین ہو کہ اس کے ہر فعل کی ہمہ وقت نگران ایسی ذات ہے، جس سے کوئی چیز بھی چھپائی نہیں جاسکتی اور جو افعال کی جزئیات پر پوری نگاہ رکھتی ہے۔ تو اس کے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۴ ابواب الدعاء باب نمبر ۶۷ حدیث نمبر ۴

[2] تفسیر نمونہ جلد ۱ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۸ کی تفسیر کے ذیل میں اس موضوع پر کافی بحث کی گئی ہے۔

اعمال و کردار کی درستی پر بلاشبہ اثر پڑے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا آیت میں بیان شدہ مفہوم پاک و پاکیزہ رزق کی نعمت جو اسے نصیب ہوئی ہے، انسان میں شکر گذاری کے احساس کو ابھارتی ہے، اس سے بھی انسان کے افعال و کردار پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس طرح اس آیۂ مجیدہ میں اعمال صالح کے لیے تین مؤثر عوامل کا ذکر کیا گیا ہے۔

(i) پاکیزہ غذا کا دل کے صدق و صفا پر اثر کے لحاظ سے۔

(ii) اس نعمت کے ذریعے انسان میں احساس شکر گزاری کی بیداری کے لحاظ سے۔

(iii) اللہ کے ہمارے اعمال و کردار، پر شاہد و ناظر ہونے کے لحاظ سے۔

"طیب" جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، ہر پاک و پاکیزہ چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور "خبیث" ہر ناپاک کے لیے راغب اپنی کتاب "مفردات" میں رقم طراز ہیں کہ "طیب" کا لغوی معنیٰ لذت بخش چیز ہے، چاہے اس کا تعلق انسان کے جسم سے ہو یا رُوح سے۔ البتہ شرعی اصطلاح میں حلال اور پاک چیز کو طیب کہتے ہیں۔ بہر حال قرآن مجید کی بہت سی بحثیں "طیب" اور "طیبات" کے محور کے گرد گھومتی ہیں، جن میں سے بعض ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:۔

ا۔ انبیاءؑ کو حکم دیا گیا ہے کہ صرف پاکیزہ غذا استعمال کریں۔

ب۔ مومنین سے بھی یہی کہا گیا ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم"

"اے صاحبان ایمان! طیبات میں سے جو روزی ہم نے تمھیں دی ہے کھاؤ۔" (بقرہ ۱۷۲)

ج۔ اللہ کی بارگاہ میں صرف وہ افکار اور اعمال باریابی حاصل کرسکتے ہیں۔ جو طیب و طاہر ہوں۔

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ؛

اچھی اچھی باتیں اس کی بارگاہ تک پہنچتی ہیں اور اعمال صالح کو وہ اوپر لے جاتا ہے۔ (فاطر ۱۰)

د۔ مزید برآں اللہ نے انسان کو جس اعزاز سے نوازا ہے اور جو خوبی اسے دوسرے موجودات سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کا طیبات سے استفادہ کرنا ہے۔

ولقد کرمنا بنی اٰدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علٰی کثیر ممن خلقنا تفضیلًا۔

ہم نے بنی نوع انسان کو عزت دی، خشکی اور پانیوں میں اس کے لیے سواریوں کا انتظام کیا اور پاک و پاکیزہ روزی اسے عطا کی اور اپنی اکثر مخلوق پر اسے فضیلت دی۔ (بنی اسرائیل ۷۰)

رسول اکرمؐ سے بھی ایک چھوٹی سی مگر پُر مغز حدیث روایت کی گئی ہے۔

آپؐ نے فرمایا۔

"یا ایھا الناس ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا"

"اللہ خود پاک اور منزہ ہے اور وہ پاکیزہ عمل کے علاوہ کسی چیز کو شرف قبولیت نہیں بخشتا۔" [1]

اگلی آیت انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو توحید و تقوٰی کی دعوت دیتے ہوئے کہتی ہے۔ تم سب ایک ہی امت ہو (اور تمہارے درمیان اور تمہارے انبیاء کے درمیان موجود فرق ہرگز علیحدگی اور عدمِ یگانگی کی دلیل نہیں) (وان ھٰذہ امتکم امة واحدة)۔

اور میں تمہارا رب ہوں، پس میری مخالفت سے پرہیز کرو۔ (وانا ربکم فاتقون)۔

اس طرح گویا یہ آیت انسانی معاشرے کو وحدت کی اور ہر قسم کے انتشار و پراگندگی کے خاتمے کی دعوت دیتی ہے جیسے وہ ایک اکیلا پروردگار ہے۔ انسان بھی ایک ہی اُمت ہیں۔ لہٰذا انہیں ایک پروگرام اور نظام کے تحت یکجا ہو جانا چاہیئے۔ اسی طرح جیسے ان کے انبیاءٔ ایک ہی دین و آئین کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ وہ دین جس کے اصول ہر دور میں ایک جیسے رہے ہیں۔ اور وہ ہیں توحید و حق شناسی، معاد و قیامت پر ایمان، نوعِ انسانی کے ارتقاء و کمال کی طرف توجہ، طیبات اور پاک چیزوں سے استفادہ کرنا، عمل صالح انجام دینا اور عدالت و اقدارِ انسانی کی حمایت کرنا۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہاں لفظ "امة" کا معنی گروہ و جمعیت نہیں، بلکہ دین و آئین ہے۔ حالانکہ "انا ربکم" میں ضمیر جمع اس پر شاہد ہے کہ اُمت سے مراد انسانوں کی جماعت ہی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ "امة" استعمال ہوا ہے۔ وہاں اس سے مراد جمعیت اور گروہ ہے۔ البتہ بعض استثنائی مواقع ہیں جہاں قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "امت" کو مجازاً مذہب کے معنٰے میں استعمال کیا گیا ہے، مثلاً

"انا وجدنا اٰباءنا علٰی امة وانا علٰی اٰثارھم مقتدون"

ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک مذہب پر پایا اور ہم ان کی پیروی کریں گے۔

(زخرف - ۲۳)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس آیت کا مفہوم سُورۂ انبیاء کی آیت ۹۲ میں بھی موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ان ھٰذہ امتکم امة واحدة وانا ربکم فاعبدون

"یقیناً تمہاری یہ امت امتِ واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس میری ہی بندگی کرو۔"

حالانکہ اس سے پہلے بہت سے انبیاء کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور درحقیقت "ھٰذہ" گذشتہ انبیاء کی امتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو سب اللہ کے نزدیک اُمت واحدہ تھے اور سب کے سب ایک ہی ہدف کے لیے مصروفِ عمل رہے۔

اگلی آیت انسانوں کو انتشار و پراگندگی سے ان الفاظ میں ڈراتی ہے: لیکن لوگوں نے اپنے کاموں میں انتشار و

[1] تفسیر قرطبی جلد ، صـ ۴۱۹ زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

اختلاف پیدا کر دیا اور ہر گروہ اپنی الگ ڈگر پر چل نکلا۔ (فتقطعوا امرھم بینھم زبرًا)۔

اور تعجب کی بات یہ ہے "کہ ان میں سے ہر گروہ اپنی اپنی حالت پر خوش ہے"۔ اور دوسروں سے بیزار ہے۔ (کل حزب بما لدیھم فرحون)۔

"زبر" "زبرة" (بروزن "لقمة") کی جمع ہے۔ یہ جانور کی پشت کے بالوں کے اس ایک حصہ کے معنٰی میں ہے کہ جسے جمع کر کے لقیہ سے الگ کر لیا جائے۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے بولا جانے لگا۔ کہ جو دوسری سے الگ کی گئی ہو۔ لہٰذا "فتقطعوا امرھم بینھم زبرًا" تمام امتوں کے مختلف گروہوں میں منقسم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ "زبر" "زبور" کی جمع ہے، جس کا معنٰی ہے "کتاب"، یعنی ہر گروہ نے کسی ایک آسمانی کتاب کو پکڑ لیا اور باقی خدائی کتب کا انکار کر دیا، حالانکہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ لیکن "کل حزب بما لدیھم فرحون" کا جُملہ پہلی تفسیر کو تقویت دیتا ہے۔

بہرحال یہ آیت ایک اہم نفسیاتی اور اجتماعی حقیقت کو بیان کرتی ہے اور وہ ہے مختلف گروہوں اور جماعتوں کا جاہلانہ تعصب، ہر گروہ نے اپنی ہی ایک ڈگر اپنا رکھی ہے۔ اور اپنا ہی ایک دین بنا رکھا ہے۔ اور ہر دوسری بات کے لیے اپنی فکر کے دریچے بند کر لیے ہیں۔ وہ تیار نہیں کہ کوئی تازہ روشنی اُن کی فکر کو روشن کرے اور تازہ ہوا ان کے سامنے کسی حقیقت کا دروازہ کھولے۔ یہ حالت کہ جس کا سرچشمہ بہت زیادہ خود خواہی، خود پرستی اور خود پسندی ہے، حقائق کے واضح ہونے اور امتوں کے درمیان وحدت قائم ہونے کی سب سے بڑی دُشمن ہے۔ اپنے طور طریقے پر خوش رہنا اور اس کے علاوہ ہر کسی سے نفرت دبے گانگی بعض اوقات انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ دوسرے کی بات تک سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ کہیں اُس کی عادت کے برخلاف کوئی حقیقت اس پر آشکارا نہ ہو جائے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے مشرکین کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم
واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارًا۔

بارِ الہا! جب میں نے انھیں تیری طرف آنے کی دعوت دی تاکہ تُو ان کے گناہ بخش دے، تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر کپڑا ڈال لیا۔ اور اپنی غلط ڈگر پر ڈٹ گئے اور حق کے مقابلہ میں انہوں نے سخت تکبر سے کام لیا۔ (نوح - ۷)

جب تک یہ حالت ختم نہ ہو جائے انسان حق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور ہر شخص اپنے طریقۂ عمل پر ہٹ دھرمی سے قائم رہتا ہے۔

اس لیے تو زیرِ بحث آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: جب یہ صورتِ حال ہے، تو انہیں ان کی جہالت و گمراہی میں

ڈوبا رہنے دو، یہاں تک کہ انھیں موت آجائے۔ یا پھر وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جائیں۔ (فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِينٍ)۔

ہو سکتا ہے لفظ "حِين" وقتِ موت کی طرف یا نزولِ عذاب کے وقت کی طرف اور یا پھر دونوں کی طرف اشارہ ہو۔

لفظ "غَمْرَة" (بروزن "ضَرْبَة") دراصل "غَمْر" سے کسی چیز کا اثر ختم کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ بعد ازاں زیادہ پانی کو "غَمْر" یا "غامِر" کہا جانے لگا جو اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے، پھر اس لفظ کا اطلاق جہالت و تعصب پر بھی ہونے لگا کہ جو انسان کو گھیر لیتی ہے۔ اور زیرِ بحث آیت میں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

۵۵۔ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝

۵۶۔ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

۵۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝

۵۸۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝

۵۹۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝

۶۰۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝

۶۱۔ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۵۔ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انھیں مال و اولاد میں ترقی دے رہے ہیں۔

۵۶۔ تو یہ گویا انھیں ہم بھلائیاں عطا کرنے میں سرگرم ہیں۔ حالانکہ اصل معاملے کا انھیں شعور نہیں ہے۔

۵۷۔ وہ لوگ کہ جو خوفِ پروردگار سے لرزتے ہیں۔

۵۸- اور وہ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں۔

۵۹- اور وہ جو اپنے رب سے شرک نہیں کرتے۔

۶۰- اور وہ لوگ کہ جن سے جس قدر بن پڑتا ہے (راہ خدا میں) صرف کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان کے دل لرزاں ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ جانا ہے۔

۶۱- جی ہاں! یہی لوگ ہیں کہ جو بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں۔

تفسیر

بھلائیوں میں سبقت کرنے والے

گذشتہ آیات میں ان مختلف ہٹ دھرم، متعصب اور خودپسند گروہوں کے بارے میں گفتگو کی گئی تھی کہ جو صرف اپنے عقائد سے چمٹے رہتے ہیں، انہی میں مگن اور خوش رہتے ہیں اور جنہوں نے تحقیق و جستجو کا ہر راستہ اپنی عقل کے لیے بند رکھا ہے۔ زیرِ نظر آیات میں ان کے بعض متکبرانہ خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا اُن کا گمان ہے کہ ہم نے جو انھیں مال و اولاد دی ہے۔ (ایحسبون انما نمدھم بہ من مال و بنین)۔

یہ اس لیے ہے کہ ہم نے بڑی تیزی کے ساتھ ان کے لیے بھلائیوں کے دروازے کھول دیئے ہیں (نسارع لھم فی الخیرات)۔

کیا وہ زیادہ مال و اولاد کو اپنی حقانیت کی دلیل خیال کرتے ہیں اور اسے بارگاہِ الٰہی میں قرب و عظمت کی برہان سمجھتے ہیں؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے "بلکہ وہ نہیں سمجھتے" (بل لا یشعرون)۔

وہ نہیں سمجھتے کہ یہ مال و اولاد کی فراوانی درحقیقت ان کے لیے ایک طرح سے عذاب و سزا کی تمہید ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ خدا چاہتا ہے کہ انہیں ناز و نعمت میں غرق کر دے تاکہ جب عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں تو یہ عذاب برداشت کرنا ان کے لیے اور بھی سخت ہو جائے۔ کیونکہ اگر انسان پر نعمت کے دروازے بند ہوں اور اس میں مشکلات گوارا

کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر سزا اُس کے لیے زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ یعنی اگر کوئی ناز و نعمت کی زندگی گزار رہا ہو اور پھر اُسے کسی تاریک دہشت ناک زنداں میں ڈال دیا جائے تو یہ اُس کے لیے انتہائی سخت مرحلہ ہوگا۔

علاوہ ازیں نعمت کی یہ فراوانی ایسے انسان کی آنکھوں پر غفلت و غرور کے پردوں کو زیادہ ضخیم کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اُسے واپسی کی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ اس چیز کو قرآن میں "استدراج در نعمت" قرار دیا گیا ہے[1]

ضمناً لفظ "نمد" "امداد" اور "مد" کے مادہ سے کسی چیز کے نقصان اور کمی کو پورا کرنے اور اس کے خاتمے کو روکنے کے معنیٰ میں ہے۔

غفلت میں پڑے ہوئے ان خود پسند لوگوں کے خیالات کی نفی کے بعد مومنین اور اچھائیوں میں تیزی کرنے والوں کے بارے میں چند آیات میں ان کے بنیادی اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ کہ جو اپنے پروردگار کے خوف سے لرزاں ہیں (ان الذین ھم من خشیۃ ربھم مشفقون)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "خشیۃ" ہر قسم کے خوف کو نہیں کہتے، بلکہ یہ وہ خوف ہے جس میں تعظیم و احترام شامل ہو۔ "مشفق" "اشفاق" اور "شفق" کے مادہ سے ہے۔ یہ ایسی روشنی کے معنیٰ میں ہے جس میں تاریکی ملی ہوئی ہو، اور اس سے مراد ایسا خوف ہے کہ جس میں محبت و احترام کی آمیزش ہو۔ "خشیۃ" زیادہ تر قلبی اور داخلی پہلو رکھتی ہے جبکہ "اشفاق" عملی پہلو کے لیے ہے۔ آیت میں ان دونوں کا ذکر علت و معلول کے حوالے سے ہے۔ درحقیقت قرآن فرماتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں عظمتِ خدا کی آمیزش رکھنے والا خوف جاگزیں ہے اور اس کے آثار ان کے اعمال میں دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ احکام الٰہی کی پاسداری کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں "اشفاق" "خشیۃ" کا مرحلہ کمال ہے کہ جو عمل پر اپنا اثر مرتب کرتا ہے۔ اور گناہ سے پرہیز کرنے اور ذمہ داریاں انجام دینے پر اُبھارتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا: وہ لوگ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں (والذین ھم بآیات ربھم یؤمنون)۔

آیاتِ پروردگار پر ایمان کے بعد اُسے ہر قسم کی شبیہ و شریک سے پاک سمجھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ کہ جو اپنے رب کے بارے میں شرک نہیں کرتے۔ (والذین ھم بربھم لا یشرکون)۔

درحقیقت شرک کی نفی آیاتِ الٰہی پر ایمان لانے کا نتیجہ ہے، دوسرے لفظوں میں آیاتِ الٰہی پر ایمان اس کی "صفاتِ ثبوتی" کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شرک کی نفی "صفاتِ سلبی" کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال اس جملے میں ہر قسم کے شرک کی نفی موجود ہے۔ چاہے وہ جلی ہو چاہے خفی۔

اس کے بعد قیامت پر ایمان کا ذکر ہے۔ قیامت کے بارے میں سچے مؤمن خاص توجہ رکھتے ہیں، ایسی توجہ کہ جو عمل

[1] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ میں سورۂ اعراف کی آیۂ ۱۰۲ کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

میں انہیں پوری طرح کنٹرول کرتی ہے۔
ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ کہ جو لوگوں کے اور اللہ کے حقوق ادا کرتے ہیں۔اطاعت بجا لانے میں اپنی پوری کوشش
کرتے ہیں اور ان کے دل اس خیال سے ڈرتے رہتے ہیں کہ آخرکار انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ جانا ہے (والذین
یؤتون ما اتوا وقلوبھم وجلة انھم الی ربھم راجعون)۔
یہ لوگ کوتاہ نکر لوگوں کی طرح نہیں ہیں کہ جو ایک چھوٹا سا عمل انجام دے کر اپنے آپ کو مقرب پروردگار سمجھنے لگتے ہیں
اور اپنے مقابلے میں سب لوگوں کو پست اور بے وقعت سمجھنے لگتے ہیں۔جبکہ یہ اہل ایمان ایسے ہیں کہ اگر ایسا عظیم نیک
عمل انجام دیں کہ جو تمام جن وانس کی عبادت کے برابر ہو تو بھی حضرت علی علیہ السلام کی طرح کہتے ہیں۔
آہ من قلة الزاد وبعد السفر
آہ! زادِ راہ کی کمی اور سفر کی طوالت!
یہ چار صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں کہ جو نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں۔ اور دوسروں پر
سبقت حاصل کرتے ہیں۔ (اولٰئک یسارعون فی الخیرات وھم لھا سابقون)۔
درحقیقت حقیقی بھلائی اور سعادت وہ نہیں کہ جو عیش وعشرت میں غرق غافل ومغرور لوگ خیال کرتے ہیں۔حقیقی
خیر وسعادت اور برکت ان مومنین کے لیے ہے جو مندرجہ بالا اعتقادی اور اخلاقی اوصاف کے مالک ہیں۔اور اس کے
ساتھ ساتھ وہ اعمال صالح انجام دینے کے لیے پیش قدمی کرتے ہیں۔
زیرِ بحث آیات میں ان پیش قدم مومنین کی بہت عمدہ، جاذبِ نظر، منطقی، مکمل اور منظم تصویر پیش کی گئی ہے۔
یہ مومنین خدا سے ایسا خوف رکھتے ہیں۔کہ جس میں احترام وتعظیم کی آمیزش ہے، یہ خوف آیاتِ الٰہی پر ایمان لانے کا
سبب بنتا ہے اور ہر قسم کے شرک کی نفی کا ذریعہ قرار پاتا ہے۔ یہ مومنین قیامت وعدالتِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو احساس
ذمہ داری اور نیک کام کی بنیاد بن جاتا ہے۔اس لحاظ سے اہل ایمان کی مجموعی طور پر چار صفات بیان کی گئی ہیں۔اور ایک
نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔ (غور کیجیے گا)
ضمناً "یسارعون" کہ جو باب مفاعلہ سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں تیزی کرنے کے معنی میں ہے
بہت عمدہ اور جاذبِ نظر تعبیر ہے۔یہ تعبیر مومنین کے مثبت مقابلے کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے کہ جو عظیم اور قیمتی مقصد کے
لیے انجام پاتا ہے۔یہ تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ اہل ایمان کس طرح سے اعمال صالح میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے
کی کوشش کرتے ہیں اور بغیر توقف کے جد جہد جاری رکھتے ہیں۔

۶۲۔ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ
يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○
۶۳۔ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ
اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ○
۶۴۔ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ
يَجْئَرُوْنَ ○
۶۵۔ لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ○
۶۶۔ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى
اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ○
۶۷۔ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ○

ترجمہ

۶۲۔ اور ہم کسی شخص کو اس کی توانائی سے زیادہ ذمہ داری نہیں دیتے اور ہمارے
پاس کتاب ہے (کہ جس میں تمام بندوں کے اعمال درج ہیں) اور جو حق
بات کہتی ہے۔ لہٰذا ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔
۶۳۔ بلکہ اُن کے دل اس نامۂ اعمال (اور روز حساب اور آیاتِ قرآن) سے
غفلت میں ہیں اور اس کے علاوہ وہ ایسے (بُرے) اعمال میں مبتلا

ہیں کہ جنہیں وہ ہمیشہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

۶۴۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیاشوں کو گرفتارِ عذاب کریں گے، تو اس وقت وہ بڑی دردناک فریاد کریں گے۔

۶۵۔ (لیکن ان سے کہا جائے گا) بند کرو یہ آہ و فغاں، آج ہماری طرف سے تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔

۶۶۔ (کیا تمھیں یاد نہیں کہ) میری آیتیں تمھیں سنائی جاتی تھیں تو تم منہ پھیر لیتے تھے اور اُلٹے پاؤں بھاگ جاتے تھے۔

۶۷۔ جبکہ ان آیتوں کے مقابلے میں تم غرور کرتے تھے اور راتوں کو اپنی بیٹھکوں میں تم بدگوئی کیا کرتے تھے۔

تفسیر

جہالت میں ڈوبے ہوئے دل

گزشتہ آیات میں مومنین کی نمایاں صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جو ہر نیکی کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسی صفات کا حامل ہو اور ایسے اعمال انجام دے سکے۔

اس سلسلے میں زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: "ہم کسی شخص کو اس کی توانائی سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتے" اور ہر شخص سے اس کی طاقت اور عقل کے مطابق تقاضا کرتے ہیں۔ (ولا نکلف نفسًا الا وسعھا)۔

یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جو فرائض عائد کیے ہیں اور جو احکام دیئے ہیں۔ وہ ان کی توانائی کی حدود میں ہیں اور جن مواقع پر کسی حکم پر عمل کرنا انسان کے بس میں نہ ہو۔ وہاں وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ علمائے اصول کے مطابق یہ کلیہ تمام احکام اسلام پر لاگو ہوتا ہے اور ان پر مقدم ہے۔

ممکن ہے پھر یہ سوال پیدا ہو کہ کیسے ممکن ہے کہ انسانوں کے تمام چھوٹے بڑے اعمال کا حساب اور جانچ پڑتال ہو سکے اس ضمن میں مزید فرمایا گیا ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے کہ حق بات کہتی ہے (اور تمام بندوں کے اعمال اس میں ثبت ہیں)

لہٰذا کسی پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ (ولدینا کتاب ینطق بالحق وھم لا یظلمون)۔

یہ ان اعمال ناموں کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں انسانوں کے تمام اعمال ریکارڈ کیے گئے ہیں اور وہ خدا کے پاس محفوظ ہیں یہ انسانی اعمال کی ایسی ڈائریاں ہیں کہ جو گویا زبان رکھتی ہیں اور حق بات بیان کرتی ہے، اس طرح سے کہ انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ اس کتاب سے مراد کہ جو اللہ کے پاس ہے "لوحِ محفوظ" ہے اور "لدینا" (ہمارے پاس) کی تعبیر اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

بہرحال زیرِ بحث آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انسانی اعمال کا ایک ذرہ بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور تمام اعمال کا بڑی توجہ سے ریکارڈ مرتب ہوگا۔ اس حقیقت پر ایمان نیک لوگوں کو کارِ خیر کا شوق دلاتا ہے۔ اور بُرے کام سے بچاتا ہے۔

"ینطق بالحق" (حق بات بیان کرتی ہے) یہ جُملہ انسانی اعمال کی توصیف ہے۔ فارسی میں بھی ہم کہتے ہیں۔

فلاں نامہ بقدر کافی گویا است

فلاں خط مُنہ بولتا ہے۔

یعنی اس کی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں، گویا خود بولتا ہے، اس کے لیے سر کھپانے کی ضرورت نہیں یہ تو خود سے حقائق واضح کر رہا ہے۔

"وھم لا یظلمون" بھی اس طرف اشارہ ہے کہ اعمال کا ریکارڈ اگر باریک بینی سے مکمل تیار کیا گیا ہے تو پھر ظلم اور زیادتی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن یہ حقائق بیان کرنے کا اثر صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو کچھ بیداری و آگاہی رکھتے ہوں۔ لہٰذا ساتھ ہی مزید فرمایا گیا: لیکن یہ ہٹ دھرم کافر لوگ یوں جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ روزِ حساب پیش ہونے والے اپنے نامۂ اعمال سے اور قرآن کے وعدہ و وعید سے بالکل غافل ہیں۔ (بل قلوبھم فی غمرۃ من ھٰذا)[2]

جہالت کا یہ عالم انہیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ ان واضح حقائق کا مشاہدہ کریں، اپنے اندر جھانکیں اور اللہ کی جانب پلٹ آئیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی وہ ایسے اعمال انجام دیتے رہتے ہیں (ولھم اعمال من دون ذٰلک ھم لھا عاملون)۔

---

[1] نامۂ اعمال کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد نمبر ۶ میں سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۳ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اسی طرح سورۂ کہف آیت نمبر ۴۹ کے ذیل میں بھی کچھ گفتگو کی جا چکی ہے۔

[2] ممکن ہے۔ "ھٰذا" نامۂ اعمال، روزِ جزا، قرآن مجید یا صالحین کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہو کہ جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔

مفسرین نے "لهم اعمال من دون ذٰلك" کے بارے میں مختلف تفسیریں ذکر کی ہیں۔

بعض نے اسے غلط اور قبیح اعمال کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو جہالت و نادانی کی وجہ سے ان سے سرزد ہوتے ہیں (اس بنا پر ذٰلک ان کی جہالت کی طرف اشارہ ہے) اور "اعمال" ایسے گناہوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس راستے میں ان سے سرزد ہوتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ مُراد یہ ہے کہ وہ کافرانہ عقیدے کے حامل ہونے کے علاوہ اعمال بھی بہت قبیح انجام دیتے ہیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کافروں کا طرزِ عمل مومنوں کے طرزِ عمل سے بالکل جُدا ہے۔ اور دونوں کے راستے الگ ہیں۔

نتیجے کے طور پر ان تفسیروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور انہیں ایک مجموعی تفسیر میں یکجا کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس امر کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ ان کے شرمناک اعمال کی بنیاد وہی ان کے دلوں کا جہالت میں ڈوب جاتا ہے۔

لیکن —— وہ اسی طرح عالمِ غفلت میں رہیں گے "یہاں تک کہ وہ دن آپہنچے گا جب ہم مالدار عیش پرستوں کو گرفتارِ عذاب کریں گے۔ اس وقت وہ تلملائیں گے اور بلبلائیں گے" اور اللہ کے شدید عذاب اور دردناک سزا پر فریاد کریں گے۔ (حتّٰی اذا اخذنا مترفيهم بالعذاب اذا هم يجئرون)۔

لیکن اُن سے کہا جائے گا: بند کرو یہ آہ و زاریاں کیونکہ آج کے دن ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے (لا تجئروا اليوم انكم منا لا تنصرون)۔

یہاں پر خصوصیت سے "مترفين" (ناز و نعمت میں غرق افراد) کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب کہ گناہگار صرف وہ نہیں ہوتے یہ اس لیے ہے کہ یہی لوگ گمراہی کے سردار ہیں۔ یا پھر اس لیے ہے کہ انہیں زیادہ دردناک سزا دی جائے گی۔

ضمناً "عذاب" سے یہاں مراد ہوسکتا ہے۔ عذابِ دُنیا، یا عذابِ آخرت ہو یا پھر دونوں ہوں۔ یعنی اس جہان میں یا اُس جہان میں۔ جب عذابِ الٰہی انہیں دامن گیر ہوتا ہے تو وہ بلبلا اُٹھتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں۔ لیکن واضح ہے کہ اُس دم معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے اور واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

اگلی آیت درحقیقت اس منحوس انجام کی علت بیان کر رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: میری آیات مسلسل تمہارے سامنے پڑھی جایا کرتی تھیں، لیکن بجائے اس کے کہ تم اُن سے سبق لیتے اور بیدار ہوتے، تم مُنہ موڑ لیتے تھے اور اُلٹے پاؤں بھاگ جاتے تھے۔ (قد كانت اٰياتي تتلٰى عليكم فكنتم على اعقابكم تنكصون)۔

"تنكصون" "نكوص" کے مادہ سے پیچھے ہٹنے کے معنیٰ میں ہے۔ "اعقاب" "عقب" (بروزن "جهش") کی جمع ہے اور "عقب" پاؤں کی ایڑی کے معنیٰ میں ہے۔ مجموعی طور پر اس جملے سے ایسے افراد مراد ہیں کہ جو نا مرغوب باتیں سُن کر ایسے پریشان ہوتے ہیں۔ کہ ایڑیوں کے بل تیزی سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

آیاتِ الٰہی سُن کر وہ نہ صرف اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بلکہ "غرور" کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

(مستكبرين به)۔ [1]

اس کے علاوہ تم رات کو بیٹھکیں جماتے تھے اور رسول، قرآن اور مومنین کی بدگوئی کرتے تھے۔ (سامرًا تهجرون)۔

"سامرًا" "سمر" (بروزن "ثمر") کے مادہ سے "رات کی باتوں" کے معنیٰ میں ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس مادہ کا اصلی معنیٰ "رات میں چاند کا سایہ" ہے کہ جس میں تاریکی اور روشنی کی آمیزش ہوتی ہے۔ اور رات کی باتیں کبھی کبھی چاند کی روشنی میں ہوتی ہیں۔ مشرکینِ عرب کے بارے میں منقول ہے کہ وہ چاندراتوں میں کعبہ کے گرد جمع ہوجاتے تھے اور رسول اللہؐ کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ یہ لفظ اسی ضمن میں استعمال ہُوا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ گندمی رنگ افراد یا خود گندم کو "سمراء" کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ کہ اس کی سفیدی میں کچھ سیاہی بھی ملی ہوتی ہے۔

"تهجرون" "هجر" (بروزن "فجر") کے مادہ سے جُدائی اختیار کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ بیمار شخص کے ہذیان اور یاوہ گوئی کے معنیٰ میں بھی استعمال ہونے لگا، کیونکہ اس حالت میں وہ نامناسب اور دور کرنے والی باتیں کرتا ہے نیز "هجر" (بروزن "كفر") گالیاں دینے کے معنیٰ میں بھی آیا ہے اور یہ بھی دوری اور جُدائی کا سبب ہے۔

زیرِ بحث آیت میں یہ آخری معنیٰ ہی مراد ہے۔ یعنی راتوں کو دیر تک جاگتے رہتے ہو اور بیماروں کی طرح ہذیان بکتے ہو اور گالیاں دیتے رہتے ہو۔

بے منطق اور کمزور افراد کا یہی طریقہ ہے کہ وہ روزِ روشن میں دلیری کے ساتھ منطق اور دلیل کا سہارا لینے کی بجائے رات کی تاریکی میں جب لوگ سوئے ہوتے ہیں تو اپنے بُرے مقاصد کے پیشِ نظر اور داخلی شکست کی تسکین کے لیے گالیاں بکنا شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ تمہارے بُرے انجام اور تم پر اللہ کے دردناک عذاب کا سبب یہ ہے کہ نہ تو تم جرأت کر کے حق کو قبول کرتے تھے۔ اور نہ انکساری سے آیاتِ الٰہی کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ اور نہ ہی پیغمبرؐ سے تمہارا طرزِ عمل منطقی اور درست تھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تم راہِ حق پالیتے۔

---

[1] اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ "به" کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مسجد الحرام اور حرم مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے تئیں خانہ کعبہ کا متولی سمجھتے ہُوئے تکبر کرتے تھے۔ لیکن یہ احتمال ضعیف ہے۔ کیونکہ گذشتہ آیات میں کعبہ اور حرم کا کوئی ذکر نہیں۔ ظاہری مفہوم کے اعتبار سے ضمیر رسول اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی تم رسول اللہ اور آیات قرآن کے مقابلے میں تکبر کرتے تھے۔ یا پھر اُلٹے پاؤں جانے کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح تم تکبر اور بے اعتنائی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

۶۸۔ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ
اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝
۶۹۔ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝
۷۰۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ
اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝
۷۱۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ
فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ؕ
۷۲۔ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖۗ
وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝
۷۳۔ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝
۷۴۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ
لَنٰكِبُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۸۔ کیا ان لوگوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے لیے ایسی بات آئی ہے کہ جو ان کے بڑوں کے پاس نہ آئی تھی؟

۶۹۔ یا پھر کیا اپنے رسول کو پہچانتے نہیں (اور اس کے ماضی کو نہیں جانتے) اس لیے اس کا انکار کرتے ہیں۔

۷۰۔ یا پھر کیا یہ اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں؟ نہیں بلکہ وہ تو ان کے لیے حق لایا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر کو حق ناگوار ہے۔

۷۱۔ اور اگر حق ان کی پیروی کرنے لگے تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب تباہ ہو جائے۔ لیکن ہم نے انہیں قرآن دیا ہے (کہ جو یاد دہانی ہے اور ان کے لیے باعثِ شرف ہے) لیکن وہ ایسی چیز سے روگرداں ہیں۔

۷۲۔ یا پھر کیا تو اُن سے (اپنی اس دعوت کے بدلے) کوئی مزدوری چاہتا ہے؟ جبکہ تیرے لیے تو تیرے رب کا دیا ہی بہتر ہے، اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

۷۳۔ اور تُو تو یقیناً انھیں صراطِ مستقیم کی دعوت دیتا ہے۔

۷۴۔ اور لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ اس راہ سے منحرف ہیں۔

تفسیر

منکرین کی بہانہ سازیاں

گذشتہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ کافر لوگ پیغمبرِ اسلامؐ سے مُنہ موڑ لیتے تھے اور تکبر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ زیرِ نظر آیات میں اس سلسلے میں ان کے حیلے بہانوں کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔ ضمناً ان کی اس روگردانی کے حقیقی اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے : کیا انہوں نے اس کلام (آیاتِ الٰہی) پر غور و فکر نہیں کیا (افلم یدبروا القول)۔

جی ہاں ! اُن کی بدبختی کا پہلا سبب یہ ہے کہ وہ تیری دعوت پر غور و فکر نہیں کرتے ۔ یہ گروہ اگر وہ غور و فکر کرتے تو ان کی مشکلات حل ہو جاتیں ۔

مزید فرمایا گیا ہے : یا کیا اُن کی طرف ایسی بات آئی ہے جو ان کے آباؤ اجداد کی طرف نہ آئی تھی ۔ (امر جاءھم مالم یأت اٰباءھم الاولین)۔

یعنی اگر توحید و قیامت پر ایمان کی دعوت اور نیکی و پاکیزگی اپنانے کی دعوت صرف تیری طرف سے ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ بہانہ کرے کہ یہ تو نئی باتیں ہیں کہ جنہیں ہم قبول نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ یہ دعوت اگر حق تھی تو خدا نے گذشتہ لوگوں کی طرف کیوں نہ بھیجی جبکہ اس کی نگاہِ لطف تو سب انسانوں پر ہے ۔

لیکن تیری دعوت کے اصول اور بنیادیں بعینہ وہی ہیں ۔ جو تمام انبیاء کی دعوت تھی ۔ لہٰذا یہ تمام بہانہ سازیاں بے معنی ہیں ۔

مزید فرمایا گیا ہے : یا کیا انہوں نے رسول کو پہچانا نہیں ، اس لیے انکار کرتے ہیں (ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون)۔

یعنی اگر یہ دعوت کسی مشکوک شخص کی طرف سے ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ کہتے کہ باتیں تو اس کی حق ہیں ۔ لیکن وہ خود اجنبی شخص ہے ، لہٰذا اس کی ظاہری باتوں سے فریب نہیں کھایا جا سکتا ۔ لیکن یہ تیرے ماضی کو خوب جانتے ہیں تجھے "امین" کہہ کر پکارتے ہیں ۔ تیری عقل و دانش اور امانت داری کے معترف ہیں ، تیرے والدین اور خاندان کو اچھی طرح پہچانتے ہیں ۔ لہٰذا ایسے بہانوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے ، یا کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے (ام یقولون بہ جنۃ)۔

یعنی کیا ان کا کہنا ہے کہ اس کی ذات و شخصیت کو ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں ۔ وہ مشکوک شخصیت نہیں ہے ، کیونکہ اس کے افکار ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور خلاف معمول ہیں اور یہ اس کی دیوانگی کی دلیل ہے ۔

قرآن فوراً اس بہانہ سازی کی نفی کے لیے کہتا ہے : رسول اُن کے لیے حق لے کر آیا ہے ۔ اور اس کی باتیں اس حقیقت پر شاہد ہیں (بل جاءھم بالحق) خرابی یہ ہے کہ "حق انہیں گوارا نہیں ہے" (و اکثرھم للحق کارھون)۔

جی ہاں ! یہ کلام حکیمانہ ہے ۔ البتہ ان لوگوں کی خواہشات ہوس آلود ہیں ۔ اس لیے یہ کلام ان سے ہم آہنگ نہیں لہٰذا یہ اسے جھٹلاتے ہیں اور اسے دیوانگی کی باتیں قرار دیتے ہیں ۔

حالانکہ حق لوگوں کے میلانات کے تابع نہیں ہوا کرتا ، کیونکہ " اگر حق ان کی ہوا و ہوس کی پیروی کرتا اور عالم ہستی ان کی خواہش کے مطابق گردش کرتا تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب درہم برہم ہو جاتا ۔ (ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السماوات والارض ومن فیھن)۔

کیونکہ لوگوں کی خواہشات معیار نہیں ہیں ۔ بلکہ اس سے قطع نظر بہت سے مواقع پر وہ پستیوں اور برائیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اگر عالمِ ہستی کے قوانین ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتے تو نظامِ عالم تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتا ۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے : بلکہ ہم نے انہیں قرآن دیا ہے کہ جو تذکر اور یاد دہانی ہے ۔ اللہ کی طرف توجہ کا ذریعہ ہے اور ان کے لیے شرف و آبرو کا باعث ہے ۔ لیکن انہوں نے اس سے روگردانی کر لی ہے (بل اتیناھم بذکرھم فھم عن ذکرھم معرضون)۔[1]

اس سلسلہ کلام کے آخری مرحلے میں فرمایا گیا ہے : کیا حق سے فرار وہ اس بہانے سے کرتے ہیں کہ تو اُن سے کسی اُجرت کا تقاضا کرتا ہے ۔ جبکہ تیرے رب کا دیا تیرے لیے بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے (ام تسئلھم خرجا فخراج ربک خیر وھو خیر الرازقین)۔[2]

اس میں شک نہیں کہ اگر ایک روحانی رہبر اپنی دعوت پر لوگوں سے مادی اُجرت کا تقاضا کرے تو اس سے بہانہ ساز لوگوں کے ہاتھ ایک بات آجاتی ہے اور ہو سکتا ہے وہ کہیں کہ ہم اس کا معاوضہ ادا نہیں کر سکتے ، اس بناء پر اُس سے دُور رہو جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ الزام عائد کریں کہ یہ مادی مفادات کے حصول کے لیے تبلیغ کرتا ہے ۔

بہر حال قرآن مجید ایک مُنہ بولتے بیان کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ یہ دل کے اندھے حق کو قبول نہیں کرتے اور مخالفت کے لیے جو عذر بہانے تراشتے ہیں ۔ سب بے بنیاد ہیں ۔

مذکورہ بیان سے ایک مجموعی نتیجہ نکالتے ہُوئے اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : یقیناً تو انہیں صراطِ مستقیم کی دعوت دیتا ہے (وانک لتدعوھم الی صراط مستقیم)۔

ایسی راہ مستقیم کہ جس کی نشانیاں نمایاں ہیں اور جو تھوڑے غور و فکر سے پہچانی جاتی ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم ایک ایسا فاصلہ ہے کہ جو مختصر ترین ہوتا ہے اور یہ ایک خط سے زیادہ نہیں ہوتا ۔ جبکہ ادھر اُدھر کے انحرافی راستے اور فاصلے بے شمار ہوتے ہیں ۔

---

[1] "ذکرھم" کا مفہوم ان کی بیداری اور یاد دہانی بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر معاشرے میں ان کی عزت و شرف اور یاد کے معنیٰ میں ہو ۔ البتہ ان دونوں معانی میں کوئی تضاد نہیں ہے ۔ اور ہم نے آیت کی تفسیر میں دونوں معانی سے استفادہ کیا ہے ۔

[2] "خرج" اور "خراج" "خروج" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنیٰ ہے ایسی چیز جو انسان کے مال یا زرعی زمین سے خارج ہو ۔ لیکن "خرج" "خراج" کی نسبت وسیع تر معنیٰ کا حامل ہے ۔ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے ۔

"اس کا اُلٹ "دخل" ہے لیکن عام طور پر "خراج" وہ مالیات یا کرائے کا مال ہے جو زمین کے لیے معین ہوتا ہے ۔

بعض روایات کے مطابق "صراطِ مستقیم" سے مراد ولایتِ علی علیہ السلام ہے[1] البتہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ایسی روایات میں آیات کے بعض واضح مصادیق کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے اس کے دیگر مصادیق ومفاہیم کی نفی ہوجاتی ہے۔ مثلاً قرآن، مبدار، معاد، ایمان، تقویٰ، جہاد اور عدل وغیرہ بھی صراطِ مستقیم کا مصداق ہیں۔

اگلی آیت میں اس کا فطری نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً وہ اس راستے منحرف ہیں (وان الـذین لا یـؤمنـون بالاخـرۃ عن الصـراط لنـاکبـون)۔

"ناکب" "نکب" اور "نکوب" کے مادہ سے راستے سے انحراف کے معنیٰ میں ہے۔

واضح ہے کہ اس آیت میں "صراط" سے وہی مراد ہے کہ جو گذشتہ آیت میں "صراطِ مستقیم" سے ہے۔

یہ بھی مسلم ہے کہ جو شخص اس جہان میں صراطِ مستقیم سے منحرف ہوگا وہ دوسرے جہان میں بھی راہِ جنت سے بھٹک کر دوزخ کے گڑھے میں جا پڑے گا۔ کیونکہ وہاں جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ براہِ راست یہاں کے کاموں کا نتیجہ ہوگا۔ آخرت پر عدم ایمان اور راہِ حق سے انحراف کا باہمی تعلق یہ ہے کہ انسان جب تک قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو اس میں احساسِ ذمہ داری پیدا نہیں ہوتا۔

ایک حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان اللّٰہ جعلنا ابوابہ وصراطہ وسبیلہ والوجہ الذی یؤتی منہ، فمن عدل عن ولایتنا او فضل علینا غیرنا فانھم عن الصراط لناکبون۔

اللہ نے ہم ہادیانِ دین کو اپنی معرفت تک رسائی کے لیے دروازے، راستہ، سبیل اور جہت قرار دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ہماری ولایت سے محروم ہو جائیں یا کسی دوسرے کو ہم پر فضیلت دے کر چن لیں، تو وہ صراطِ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں[2]

چند اہم نکات

۱۔ حق پرستی اور خواہشات پرستی

زیرِ بحث آیات میں خدا پرستی اور خواہشات پرستی کے تضاد کی طرف ایک پُرمعنیٰ اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو نہ صرف زمین اور اہلِ زمین بلکہ آسمان بھی درہم برہم

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۵۴۵۔

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۴۹ بحوالہ اصولِ کافی۔

ہو جائیں۔

اس مسئلے کا تجزیہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، کیونکہ:

① اس میں شک نہیں، کہ لوگوں کی خواہشات ایک جیسی نہیں ہوتیں اور زیادہ تر ایک دوسرے سے تضاد رکھتی ہیں بلکہ یہاں تک کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص کی مختلف خواہشات باہم متضاد ہوتی ہیں۔ ان حالات میں اگر حق ان خواہشات کی پیروی کرے تو نتیجہ پراگندگی و تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

② تضادات سے قطع نظر لوگوں کی بہت سی خواہشات فساد انگیز اور برائی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اگر ان خواہشات کے مطابق نظامِ عالم چلانے کی کوشش کی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فتنہ و فساد اور تباہی اور بربادی ہوگا۔

③ انسان کی نفسانی خواہشات ہمیشہ ایک پہلو کی حامل ہوتی ہیں اور ان کی نگاہ صرف ایک زاویے پر ہوتی ہے۔ یہ خواہشات دیگر پہلوؤں سے غافل ہوتی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ فساد اور تباہی کے عوامل میں سے ایک اہم عامل یہ ہے کہ کسی چیز کے ایک ہی پہلو کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اور اس کے دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

زیرِ بحث آیت کئی حوالوں سے اس آیت سے مشابہت رکھتی ہے۔

لوکان فیھما اٰلھۃ الا اللّٰہ لفسدتا

اگر آسمان و زمین میں اللہ کے علاوہ اور معبود ہوں تو ان میں فساد برپا ہو جائے (انبیاء۔ ۲۲)

واضح ہے۔ کہ "حق" "صراطِ مستقیم" کی طرح ایک ہی ہے۔ یہ تو نفسانی خواہشات ہیں۔ جو خیالی خداؤں کی طرح بہت سی ہیں۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ حق اور نفسانی خواہشات کے تضاد و کشمکش میں کس کی پیروی کی جائے؟ خواہشات کی کہ جو زمین و آسمان اور تمام موجودات کی تباہی کا باعث ہیں یا حق کی کہ جو وحدت و یکتائی اور نظم و ہم آہنگی کا سبب ہے اس تجزیے کا نتیجہ اور اس سوال کا جواب خوب واضح ہے۔

۲۔ رہبر کی صفات:

زیرِ نظر آیات سے ہادیانِ حق کی کچھ صفات واضح ہوتی ہیں، مثلاً

○ وہ ایسے افراد ہیں کہ جو ہمیشہ نیکیوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ غیر معروف اور اجنبی لوگ ہوتے تو اس آیت کے مصداق منافقوں کے ہاتھ بہانہ آجاتا۔

ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون۔

یا کیا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا کہ جو انکار کر رہے ہیں۔

اگر یوں ہوتا تو لوگ ان کی معروف دعوت کو اشخاص کی اجنبیت کی بنیاد پر نظر انداز کر دیتے۔

○ وہ اپنی جد و جہد کے راستے میں لوگوں کی خواہشات کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ جبکہ آج کی دُنیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ لیڈر عام لوگوں کی خواہشات کے خلاف آواز نہیں اُٹھاتے۔ اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ ہادیانِ برحق ہمیشہ مکتبِ حق کی ترویج کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگوں کو یہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔

○ وہ اپنی دعوت کے لیے کوئی مادی اُجرت طلب نہیں کرتے ۔ مشکلوں اور محرومیوں میں وقت گزار لیتے ہیں۔ لیکن کسی پر مادی لحاظ سے انحصار نہیں کرتے، کیونکہ یہ انحصار ان کے ہاتھ پاؤں کے لیے زنجیر اور زبان و فکر کے لیے قفل بن سکتا ہے۔

۲۔ اکثریت حق کی طرف نہیں ہوتی : وہ کونسی "اکثریت" ہے، قرآن نے بہت سی آیات میں اور زیرِ نظر آیات میں بھی جس کی مذمت کی ہے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ آج کی دُنیا میں اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ معاشروں کی اکثریت کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ یہ مسئلہ بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے۔

یہاں ہم ان آیات کے بارے میں بحث نہیں کرتے کہ جو زیادہ تر کفار و مشرکین اور اسی قسم کے لوگوں سے متعلق ہیں۔ ان میں "اکثر" کے ساتھ "ھم" کی ضمیر آتی ہے۔ ہم یہاں ان آیات کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ، جو "اکثر الناس" کا عنوان رکھتی ہیں۔ مثلاً :

ولٰکن اکثر الناس لا یشکرون

لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہیں۔

(بقرۃ - ۲۴۳)

ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون ۔

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۔

(اعراف - ۱۸۷)

ولٰکن اکثر الناس لا یؤمنون

لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

(ھود - ۱۷)

وما اکثر الناس ولو حرصت بمؤمنین

اگرچہ تو کوشش کرے اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے ۔

(یوسف - ۱۰۳)

فَاَبٰی اکثر الناس الا کفورًا

اکثر لوگ کفران اور انکارِ حق کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے ۔

(بنی اسرائیل - ۸۹)

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ

اگر تو رُوئے زمین کے اکثر لوگوں کی اطاعت کرے تو وہ تجھے راہِ حق سے بھٹکا دیں۔

(انعام - ۱۱۶)

دوسری طرف قرآن مجید میں ایسی آیات بھی ہیں کہ جو مومنین کی اکثریت کے طریقے کو ایک صحیح معیار قرار دیتی ہیں۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۱۵ میں ہے۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدٰی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولّہ ما تولّٰی و نصلہ جھنم وساءت مصیرًا۔

جو شخص رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کے راستے کے علاوہ کوئی راہ اپنائے، جس طرف وہ چل رہا ہے ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے اور دوزخ میں جا پہنچائیں گے اور وہ بہت بڑا ٹھکانا ہے۔

روایات میں سے جو باہم متعارض ہوں، وہاں قانون یہ ہے کہ اس روایت کو ترجیح دی جاتی ہے کہ جو آئمہ ہدیٰ کے اصحاب و انصار اور پیروکاروں میں مشہور ہو، جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

ینظر الی ما کان من روایتھما عنا فی ذٰلک الذی حکما بہ المجمع علیہ عند اصحابک فیؤخذ بہ من حکمنا ویترک الشاذ الذی لیس بمشھور عند اصحابک فان المجمع علیہ لاریب فیہ۔

جب دو قاضی اختلافِ روایات کی بنیاد پر اختلاف کریں تو دیکھنا چاہیئے کہ ان دو روایات میں سے کونسی تیرے اصحاب کے ہاں قبول کی جاتی ہے ۔ وہی روایت انتخاب کرنا چاہیئے اور جو روایت اصحاب کے ہاں مشہور نہیں اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیونکہ مشہور روایت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔[1]

نیز نہج البلاغہ میں ہے۔

والزموا السواد الاعظم، فان ید اللہ مع الجماعۃ، وایاکم والفرقہ، فان الشاذ من الناس للشیطان، کما ان الشاذ من الغنم للذئب۔

ہمیشہ بڑے گروہ کے ساتھ رہو۔ کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے ۔ اور انتشار سے بچو کیونکہ اکیلا انسان شیطان کا حصہ ہے ۔ جیسے اکیلی بھیڑ بھیڑیئے کا لقمہ ہے ۔[2]

نہج البلاغہ میں ہے۔

والزموا ما عقد علیہ حبل الجماعۃ

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۷۶ (کتاب القضاء باب ۹ از ابواب صفاتِ قاضی)

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۷

جو جماعت کی رسی سے منسلک ہو اسے نہ چھوڑو۔ [1]

ہوسکتا ہے بعض لوگ یہ سمجھیں کہ ان دو طرح کی آیات و روایات میں کوئی تضاد ہے۔ دوسری طرف یہ بھی خیال ہوسکتا ہے کہ اسلام جمہوری حکومت کے ساتھ نہیں چل سکتا، کیونکہ جمہوریت لوگوں کی کثرت آراء پر مبنی ہے۔ جبکہ قرآن اس کی شدید مذمت کرتا ہے۔

لیکن مذکورہ بالا آیات و روایات میں تھوڑا سا غور و خوض کرنے سے اور ان کا باہمی موازنہ کرنے سے حقیقی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اکثریت اگر مومن، آگاہ اور راہِ حق پر گامزن ہو تو اُن کی آراء اور نظریات محترم ہیں اور اکثر اوقات حقیقت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور ان کی پیروی کی جانا چاہیئے۔

لیکن اکثریت جاہل ناآگاہ افراد پر مشتمل ہو، یا وہ لوگ آگاہ تو ہوں مگر خواہشاتِ نفسانی کے اسیر ہوں تو پھر عموماً ان کے نظریات منحرف ہوں گے اور قرآن کے بقول ان کی پیروی انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

ایک حقیقی اور صحیح جمہوریت کے لیے پہلے کوشش کرنا چاہیئے کہ عام لوگ باخبر اور مومن ہوں۔ اس کے بعد ہی اکثریت کی آراء اجتماعی مقاصد کی پیش رفت کا معیار بن سکتی ہیں۔ ورنہ جو جمہوریت گمراہ اکثریت کے نظریات پر مبنی ہو وہ معاشرے کو جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔

اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق باخبر، رشید اور باایمان اکثریت کے نظریات بھی اسی صورت میں محترم ہیں جب وہ حکم الٰہی اور کتاب و سنت کے برخلاف نہ ہوں۔

بات کہنے کی یہ ہے کہ آج معاشروں کے پاس قانون سازی اور معاشرتی امور کے لیے کثرتِ آراء کے کلیے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں کہ وہ جس کی طرف پناہ لیں، انھوں نے آسمانی کتابوں اور انبیاء الٰہی کے طرزِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ناآگاہی و جہالت کے ساتھ ساتھ مفاد پرستی اور ذاتی اغراض بھی شامل ہوتی ہیں۔ لیڈر حضرات آسانی سے پراپیگنڈے کے ذریعے ایسے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ لہٰذا تعداد کی اکثریت کو معیار قرار دیا گیا ہے تاکہ کسی بھی آواز اور شور و احتجاج کو اکثریت کے نام پر خاموش کیا جا سکے۔ اگر ہم دورِ حاضر میں مختلف ملکوں پر حاکم نظاموں اور قوانین پر غور و فکر کریں تو واضح ہوگا کہ ان کی بہت سی بدبختیاں جاہل و بے علم اکثریت کی آراء کو اپنانے کی وجہ سے ہیں۔

اکثریت کی بنیاد پر ایسے ایسے گندے اور قبیح قوانین بنائے گئے ہیں کہ جن کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے اور آگ کے کتنے شعلے اسی ناآگاہ اکثریت کی وجہ سے بھڑکے ہیں۔ اور کیسے کیسے مظالم کی غیر مومن اکثریت نے تائید کی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۱

۷۵۔ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○

۷۶۔ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ○

۷۷۔ حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ○

۷۸۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ط قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○

۷۹۔ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○

۸۰۔ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۷۵۔ اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور ان کی مشکلات برطرف کردیں تو (نہ صرف وہ بیدار نہیں ہوں گے بلکہ) اپنی سرکشی پر اُڑ جائیں گے اور (اسی وادی میں) بھٹکتے پھریں گے۔

۷۶۔ ہم نے انہیں عذاب وابتلاء میں گرفتار کیا (تاکہ وہ بیدار ہوں) لیکن وہ اپنے رب کے حضور نہ جھکے اور نہ اس کی بارگاہ میں انکساری کی۔

۷۷۔ (یہ کیفیت یونہی رہے گی) یہاں تک کہ ہم عذاب شدید کے دروازے ان پر کھول دیں اور وہ یوں گرفتارِ بلا ہوں کہ بالکل مایوس ہو جائیں۔

۷۸۔ وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہیں کان، آنکھ اور دل (عقل) سے نوازا، لیکن تم اس کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

۷۹۔ وہ وہی ذات ہے، جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا اور پھر تم اس کی جانب لوٹائے جاؤ گے۔

۸۰۔ وہ وہی ہے کہ جو زندگی عطا کرتا ہے اور موت دیتا ہے، گردشِ لیل و نہار اس کے ہاتھ ہے، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

تفسیر

خدا مختلف طریقوں سے بیدار کرتا ہے

گذشتہ آیات میں ان حیلے بہانوں کا ذکر تھا کہ جو منکرینِ حق دعوتِ انبیاء کی مخالفت کرتے ہوئے پیش کرتے تھے۔ زیرِ نظر آیات میں اتمامِ حجت کے لیے اور ان کی بیداری کے لیے مختلف حوالوں سے گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کبھی ہم ان پر اپنی رحمت نازل کرتے ہیں تاکہ وہ بیدار ہو جائیں۔ لیکن "اگر ان کی مشکلات کو دور کر کے ہم ان پر اپنا لطف کریں اور نعمتوں سے نوازیں تو ان کی خرابی اس حد تک جا پہنچی ہے کہ وہ پھر بھی سرکشی پر اڑے رہتے ہیں اور اسی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں (ولو رحمناهم وكشفنا ما بهم من ضر للجوا في طغيانهم يعمهون)۔

اور کبھی سخت حوادث کے ذریعے انہیں ہلایا جاتا ہے، تاکہ اگر وہ رحمت و نعمت کے ذریعے بیدار نہیں ہوئے تو اس راستے سے بیدار ہو جائیں۔ لیکن اس کا بھی ان پر اثر نہیں ہوتا، کیونکہ "ہم نے انہیں گرفتارِ عذاب کیا ہے۔ لیکن وہ نہ تو اپنے پروردگار کے سامنے جھکے ہیں۔ اور نہ انھوں نے کسی انکساری کا اظہار کیا ہے (ولقد اخذناهم بالعذاب فما استكانوا لربهم وما يتضرعون)۔[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "تضرع" بنیادی طور پر "ضرع" سے "پستان کے معنی میں ہے اور "تضرع" کا معنیٰ ہے "اُس نے دودھ دوہا"۔ بعد ازاں یہ لفظ خضوع و انکساری کے ساتھ سرِ تسلیم خم نہیں کرنے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔

یعنی ان دردناک حوادث پر بھی وہ غرور و سرکشی اور خود پرستی کو ترک نہیں کرتے اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔

یہ جو چند ایک روایات میں "تضرع" کا معنیٰ دُعا اور نماز کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا بیان ہوا ہے، درحقیقت یہ اس کے وسیع معنیٰ کا ایک مصداق ہے۔

بہرحال ہم ان بیدار کُن رحمتوں، نعمتوں اور سزاؤں کو جاری رکھیں گے اور وہ بھی اپنی سرکشی اور ہٹ دھرمی کو جاری رکھیں گے۔ "یہاں تک کہ ہم اپنے شدید عذاب کا دروازہ کھول دیں گے اور اس میں ایسے گرفتار ہوں گے کہ آخرکار بالکل مایوس ہو جائیں گے (حتى اذا فتحنا عليهم بابا ذا عذاب شديد اذا هم فيه مبلسون)۔[2]

اللہ تعالیٰ دراصل دو طرح کی سزا دیتا ہے۔ "تربیتی سزا" معاشرے کو پاک کر دینے والی سزا"۔

پہلی قسم کی سزا کا مقصد یہ ہے کہ گنا ہگاروں پر کچھ سختی کی جائے تاکہ انہیں اپنی ناتوانی کا احساس ہو جائے اور وہ غرور و تکبر کا راستہ ترک کر دیں۔

دوسری قسم کی سزا ناقابلِ اصلاح افراد کے لیے ہے۔ یہ سزا ایسے افراد کے لیے ہے جو اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر چکے ہیں کہ انھیں اب اس نظامِ خلقت میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں اور وہ انسانوں کے ارتقاء و کمال کی راہ میں رکاوٹ ہیں

---

[1] "استکانوا" "سکون" کے مادے سے خشوع و خضوع کے عالم میں سکون ہونے کے معنے میں ہے اس صورت میں یہ باب افتعال سے ہوگا۔ اصل میں یہ لفظ "استکنوا" تھا۔ کاف کی فتح کا اشباع ہوا اور وہ الف سے بدل گئی جس کے نتیجے میں "استکانوا" ہوگیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ "کون" کے مادے سے باب "استفعال" میں سے ہے، جس کا معنیٰ ہے "خشوع و خضوع کے ساتھ کسی مکان میں طلب استقرار"۔ بہرحال یہ پروردگار کے سامنے بندے کی حالت انکساری کو ظاہر کرتا ہے اور یہ جو بعض نے اسے "دُعا" کے معنیٰ میں ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دُعا کرنا خشوع و خضوع کا ایک مصداق ہے۔ تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ "کین" (بر وزن "عین") کے مادے سے باب استفعال سے ہے کیونکہ یہ مادہ خضوع کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور یہ تمام معانی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔

[2] "مبلس" "ابلاس" کے مادہ سے ہے۔ یہ ایسے غم و اندوہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے کہ جو کسی شدید واقعے کی بنا پر ہو اور عام طور پر انسان کو حیرت کا مجسمہ بنا دے یا ناامید و مایوس کر دے

اس سزا کے ذریعے معاشرے کو ان کے وجود سے پاک کر دیا جاتا ہے۔

مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ " بابًا ذا عذاب شدید" (دردناک عذاب کا دروازہ) سے کیا مراد ہے۔ ان میں سے بہت سوں نے اس سے موت اور اس کے بعد عذابِ قیامت مراد لی ہے۔ بعض دوسروں نے اسے شدید قحط کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو نبی اکرمؐ کی طرف سے نفرین کے باعث چند سال تک مشرکین کو دامن گیر رہا۔ یہاں تک کہ ان کے ہاں سے اناج بالکل ختم ہو گیا اور وہ ایسی چیزیں کھانے پر مجبور ہوئے کہ جنہیں عام حالات میں کوئی شخص کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بعض نے اسے وہ شدید عذاب سمجھا ہے۔ کہ جو جنگِ بدر میں مسلمانوں کی تلواروں کی ضربوں کی صورت میں مشرکین کو لاحق ہوا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت کسی خاص گروہ کی طرف اشارہ نہ ہو بلکہ عذابِ الٰہی کے بارے میں ایک عمومی قانون بیان کر رہی ہو ــــ جس کا آغاز رحمت ہو، پھر تربیتی سزا اور آخرکار نابود کر دینے والا عذاب [1]

اس بیان کے بعد قرآن ایک اور پہلو سے بات کرتا ہے۔ اب ان کے احساسِ تشکر کو ابھارنے کے لیے نعماتِ الٰہی کا ذکر کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ خدا وہ ہے کہ جس نے تمھیں کان، آنکھ اور دل (عقل) سے نوازا ہے۔ لیکن تم بہت کم ہی اس کا شکر بجا لاتے ہو۔ (وهو الذى انشا لكم السمع والابصار والافئدة قليلاً ما تشكرون)۔

کان، آنکھ اور عقل کا ذکر اس بنا پر ہے کہ پہچان اور معرفت کے لیے انسان کے پاس یہی تین ذرائع ہیں۔ حسی امور انسان عام طور پر آنکھ اور کان کے ذریعے معلوم کرتا ہے۔ جبکہ غیر حسی امور قوتِ عقل کے ذریعے معلوم کرتا ہے۔

ان دو ظاہر حواس یعنی بصارت اور سماعت کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم اس شخص کی حالت کو مدِ نظر رکھیں کہ جو ان سے محروم ہے۔ اس کی دُنیا کتنی محدود اور تاریک ہوتی ہے اور اس کا جہان بیداری اور آگاہی سے کس قدر تہی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان دونوں سے محروم ہونے کی وجہ سے عملی طور پر اپنے بہت سے حواس کھو بیٹھتا ہے، قوتِ گویائی ہمیشہ قوتِ سماعت کے ذریعے کام میں لائی جاتی ہے (مادر زاد بہرے ہمیشہ گونگے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان میں کوئی نقص نہیں ہوتا ہے۔)

اس طرح یہ دو حواس عالمِ محسوسات کی کلید ہیں۔ پھر عقل کی نوبت آتی ہے کہ عالمِ محسوسات اور جہانِ ماوراءِ طبیعت کی کلید ہے۔ علاوہ ازیں وہ امور جو پہلے دونوں حواس کے دائرے میں آتے ہیں ان کے بارے میں تجزیہ کرنے نتیجہ اخذ کرنے، جائزہ لینے اور جمع و تفریق کرنے کا کام بھی عقل کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

جو لوگ کہ شناخت و معرفت کے یہ تین ذرائع دستیاب ہونے پر شکر گزار نہیں کیا وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ ان تین

---

[1] ان آیات سے قبل آنے والی آیت ــــ " اِنّ الذين لا يؤمنون بالآخرة" اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

ذرائع کی باریکیوں پر اگر غور و خوض کیا جائے تو کیا یہ اس امر کے لیے کافی نہیں کہ انسان اپنے خالق سے آشنا ہو جائے۔

آنکھ اور کان کی نعمت کا ذکر زیرِ بحث آیت میں عقل سے پہلے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ماہرین کے بقول سب سے پہلے نومولود کے کان کام شروع کرتے ہیں اور آنکھ ان سے بہت دیر بعد استعمال میں آتی ہے۔ کیونکہ رحمِ مادر کے تاریک ماحول سے نکلنے کے فوری بعد بچے کی آنکھیں روشنی کی شعاعوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ولادت کے بعد بچے کی آنکھیں ایک مدت تک بند رہتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ روشنی سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ جبکہ کانوں کی یہ صورت نہیں ہے، یہاں تک کہ بعض ماہرین کے نظریئے کے مطابق بچہ عالمِ جنین میں بھی سُننے کی قدرت رکھتا ہے اور ماں کے دل کی دھڑکن سُنتا ہے [1]

ان تین نعمتوں کا ذکر درحقیقت ان نعمتوں کے معطی کی معرفت کے لیے ابھارتا ہے اور منعمِ حقیقی کی شناخت کے لیے انسان کو تحریک دیتا ہے (جیسا کہ عُلماءِ عقائد نے شکرِ منعم کی ضرورت کو معرفتِ خدا کے عقلی طور پر واجب ہونے کی بنیاد قرار دیا ہے)۔

اگلی آیت میں اللہ کی نہایت اہم نشانی ــــ یعنی اس خاکی زمین سے انسان کی خلقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا۔ (وهو الذى ذراكم فى الارض) [2]

اور چونکہ تم زمین سے پیدا ہوئے ہو۔ لہٰذا دوبارہ زمین کی طرف ہی پلٹ جاؤ گے۔ اور پھر ایک مرتبہ "تم قبروں سے اُٹھا کر اُس کی طرف محشور کیئے جاؤ گے۔ (واليه تحشرون)۔

اگر تم سوچتے کہ بے وقعت مٹی سے تمھاری خلقت ہوئی ہے تو یہ اس امر کے لیے کافی تھا کہ تم حیات عطا کرنے والے کو پہچان لیتے اور پھر تمھیں معاد بھی ممکن دکھائی دیتا۔

خلقتِ انسان کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد قرآن موت و حیات اور روز و شب کی آمد و شد کا ذکر کرتا ہے کہ جو عظیم آیاتِ الٰہی میں سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وہی ہے کہ جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور لیل و نہار کا آنا جانا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ہو۔ (وهو الذى يحى ويميت وله اختلاف الليل والنهار افلا تعقلون)۔

---

[1] شناخت کے ان تین آلات کے بارے میں چھٹی جلد میں سورۂ نحل کی آیت ۸، کے ذیل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

[2] "ذراکم" "ذرء" (بروزن زرع) کے مادے سے تخلیق، ایجاد اور اظہار کے معنی میں ہے۔ لیکن اگر مادہ "ذرو" (بروزن زرع) ہو تو منتشر کرنے کے معنی میں ہے۔ ان دونوں مادوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ ہماری زیرِ بحث آیت پہلے مادے سے ہے (تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد ص ۳۳۱ پر اس سلسلے میں اشتباہ ہوا ہے، اس پر ہمیں افسوس ہے قارئین کرام وہاں پر اصلاح فرمالیں)۔

ان تین گزشتہ آیات میں معرفت پروردگار کے محرک سے بات شروع کی گئی ہے اور انفس و آفاق کی اہم ترین آیات کے ذکر پر بات ختم کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ابتدائے خلقت سے لے کر موت تک کے انسانی سفر اور پھر اس کی پروردگار کی طرف بازگشت کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے فرمان اور ارادے سے صورت پذیر ہوتا ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ موت و حیات کی خلقت کا ذکر لیل و نہار کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحن عالم ہستی میں نور و ظلمت بالکل موت و حیات کی مانند ہے۔ روشنی کی لہریں جیسے عالم ہستی میں جنبش، خوشی اور حرکت پیدا کرتی ہیں۔ اور تاریکی کے سائے میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ اسی طرح زندہ موجودات نورِ حیات میں اپنی حرکت شروع کرتے ہیں۔ ظلمتِ موت چھا جائے تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور ہر دو تدریجی پہلو رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بیان کیا جا چکا ہے کہ لیل و نہار کے "اختلاف" سے مراد ہو سکتا ہے ان کا آنا جانا ہو۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا "خلف" اور جانشین ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے تدریجی اختلاف اور فرق کی طرف اشارہ ہو کہ جس کے باعث سال کے چار موسم وجود میں آتے ہیں اور یہ فرق عالم نباتات میں ایک نظام دقیق کے تحت گردش حیات کی رہنمائی کرتا ہے۔

بہرحال یہ تمام مسائل معرفت الٰہی کے رہنما بن سکتے ہیں۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"افلا تعقلون"

کیا تم غور و فکر نہیں کرتے اور عقل کو بروئے کار نہیں لاتے؟

۸۱۔ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ○

۸۲۔ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا
لَمَبْعُوْثُوْنَ○

۸۳۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ
اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ○

۸۴۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ○

۸۵۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ○

۸۶۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيْمِ○

۸۷۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ○

۸۸۔ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ
وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○

۸۹۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ○

۹۰۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ○

ترجمہ

۸۱۔ انہوں نے وہی کچھ کہا، جو اُن کے پیش رو کہا کرتے تھے۔

۸۲۔ انہوں نے کہا: کیا جب ہم مرکر مٹی اور (بوسیدہ) ہڈیاں ہو جائیں گے پھر دوبارہ اُٹھیں گے؟

۸۳۔ یہی وعدہ ہم سے اور پہلے ہمارے آباؤ اجداد سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ تو گئے لوگوں کے قصے ہیں۔

۸۴۔ کہو! بھلا یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کے ہاتھ ہے؟ بولو! اگر جانتے ہو تو۔

۸۵۔ (تمھارے جواب میں) کہتے ہیں! سب کچھ اللہ کے ہاتھ ہے، تو کہو: کیا پھر تم متوجہ نہیں ہوتے ہو؟

۸۶۔ کہو: کون ہے، سات آسمانوں اور عرش عظیم کا پروردگار؟

۸۷۔ وہ کہتے ہیں: یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے، تو کہو: کیا پھر تم تقوٰی اختیار نہیں کرتے ہو (اور اللہ سے ڈرتے نہیں ہو)؟

۸۸۔ کہو: اگر سچ کہو تو بتاؤ کہ تمام موجودات کی حکومت کس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور کون ہے کہ جو بے پناہوں کو پناہ دیتا ہے اور پناہ دینے کا وہ محتاج بھی نہیں۔ اگر تم واقعی ان حقائق سے آگاہ ہو۔

۸۹۔ وہ کہتے ہیں: (یہ سب کچھ) اللہ کے ہاتھ ہے۔ تو کہو: اس کے

باوجود (پھر) تم کس طرح کہتے ہو کہ تم پر جادو کیا گیا ہے۔

۹۰۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اُن کے سامنے حق پیش کر دیا ہے اور وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

تفسیر

فیصلہ تمھارا ضمیر کرے

گذشتہ آیات میں توحید پروردگار اور قیامت کے منکرین کو عالم ہستی اور آیات انفس و آفاق میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ زیر بحث آیات میں مزید فرمایا گیا ہے کہ وہ عقل و فکر کو چھوڑ کر اپنے بڑے بوڑھوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ "وہ بس وہی کہتے ہیں جو ان کے پیش رو کہتے تھے۔" (بل قالوا مثل ما قال الاولون)۔ وہ حیرت سے کہتے تھے کہ کیا جب ہم مرکر مٹی اور بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پھر دوبارہ اٹھیں گے۔" (قالوا ءاذا متنا وکنا ترابًا و عظامًا ءانا لمبعوثون)۔[1]

ہمیں تو اس بات پر یقین نہیں آتا۔ یہ تو جھوٹے وعدے ہیں۔ ایسے وعدے ہم سے بھی ہوتے آئے ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد سے بھی کیے جاتے رہے۔ (لقد وعدنا نحن واٰباؤنا ھٰذا من قبل) اور یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں (ان ھٰذا الا اساطیر الاولین)۔

پھر سے خلقت ایک افسانہ ہے، حساب و کتاب بھی افسانہ ہے اور بہشت و دوزخ بھی افسانہ ہیں۔

کفار و مشرکین سب سے زیادہ قیامت کے خیال سے خوف کھاتے تھے۔ اس لیے طرح طرح کے بہانوں اور طعن و طنز سے اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھی معاد و قیامت کے بارے میں تاکیداً اور تفصیلاً گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں زیر بحث آیات میں تین حوالوں سے منکرین قیامت کی فضول منطق کی سرکوبی کی گئی ہے۔ ایک تو وسیع عالم ہستی پر اللہ کی مالکیت کے حوالے سے، دوسرا اس کی ربوبیت کے حوالے سے اور تیسرا سارے عالم پر اُس کی حاکیت کے حوالے سے، قرآن ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے معاد پر قدرت رکھتا ہے اور اُس کی عدالت و حکمت

---

[1] "تراب" مٹی کا ذکر "عظام" (ہڈیوں) سے پہلے اس بنا پر ہے کہ مٹی کا پھر سے پہلی زندگی پانا ہڈیوں کی نسبت عجیب تر ہے یا پھر یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہمارے بڑے بزرگ مٹی ہو گئے ہیں اور باپ بوسیدہ ہڈیاں ہو چکے ہیں۔ یا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پہلے انسان کا گوشت مٹی ہوتا ہے اور پھر ہڈیاں مٹی میں تبدیل ہوتی ہیں۔

کا تقاضا ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک عالم آخرت بھی ہو۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ ہر موقع پر خود مشرکین سے اعتراف کروایا گیا ہے اور انہی کی بات ان کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔
کہو: زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملکیت ہے؟ بتاؤ! اگر تم جانتے ہو۔ (قل لمن الارض ومن فیھا ان کنتم تعلمون)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: فطرت کی پکار اور عالم ہستی کے خالق پر اپنے اعتقاد کی بنا پر وہ کہتے ہیں، زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس کی ملکیت اللہ کے ہاتھ ہے (سیقولون للہ)۔

اب تم ان سے کہو: جب ایسا ہے اور تم خود بھی اعتراف کرتے ہو تو پھر کیوں متوجہ نہیں ہوتے ہو۔ (قل افلا تذکرون)۔

اس واضح اعتراف کے باوجود موت کے بعد انسان کی زندگی کو کیوں بعید سمجھتے ہو اور اسے خدائے عظیم کی وسیع قدرت سے کیوں دور جانتے ہیں؟ خدا پھر حکم دیتا ہے: ان سے پوچھو: سات آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے (قل من رب السماوات السبع ورب العرش العظیم)۔

اس سوال پر بھی وہ فطری پکار اور عالم ہستی کے خالق کے حوالے سے خدا پر اپنے اعتقاد کے باعث کہتے ہیں: یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے"۔ (سیقولون للہ)۔

جب وہ یہ صریح اقرار کرتے ہیں تو کہو: تم خود اس حقیقت کے معترف ہو، تو پھر اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں ہو اور حیاتِ نو کی طرف انسانی بازگشت کا انکار کیوں کرتے ہو (قل افلا تتقون)۔

پھر ان سے آسمانوں اور زمین کی حاکمیت کے بارے میں" سوال کرو کہ کون ہے، جس کے ہاتھ میں تمام موجودات کی حکومت ہے (قل من بیدہ ملکوت کل شیء)۔ کون ہے جو بے سہاروں کو پناہ دیتا ہے اور جو کسی کو پناہ دینے کا محتاج بھی نہیں (وھو یجیر ولا یجار علیہ) اگر تم واقعاً ان حقائق سے آگاہ ہو (ان کنتم تعلمون)۔

وہ پھر اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملکیت، حاکمیت اور پناہ دینا اللہ پر منحصر ہے (سیقولون للہ)۔
کہو: پھر تم کیونکر کہتے ہو کہ رسولؐ نے تم پر جادو کر دیا ہے اور تم مسحور ہوگئے ہو۔ (قل فانی تسحرون)۔

یہ وہ حقائق ہیں کہ جن کا تم ہر مرحلے پر خود اعتراف کرتے ہو۔ اسے مالکِ ہستی جانتے ہو اور اُسے خالقِ ہستی مانتے ہو اور اُسے مدبر و مدبّر اور حاکم و پناہ گاہ شمار کرتے ہو جس ذات کی قدرت کا یہ عالم ہو اور جس کی حکومت کا دامن اتنا وسیع ہو کیا وہ مٹی سے پیدا کیے ہوئے انسان کو دوبارہ مٹی بننے کے بعد لباسِ حیات پہنا کر محشور نہیں کر سکتا؟

تم حقائق سے کیوں منہ موڑتے ہو؟ تم رسولِ اسلامؐ کو جادوگر یا دیوانہ کیوں کہتے ہو؟ جب کہ دل کی گہرائیوں میں تم ان حقائق کے معترف ہو۔

آخر میں ایک مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ جادو ہے نہ دیوانگی" بلکہ ہم ان کے لیے حق لے کر آئے ہیں اور اسے واضح کیا ہے، جبکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں" (بل اتیناھم بالحق وانھم لکاذبون)۔

حقائق بیان کرنے میں ہماری اور ہمارے انبیاءؑ کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ کوتاہی سراسر تمہاری ہے۔ کہ آنکھیں بند کیے غلط راہ پر چل پڑے ہو اور پھر ہٹ دھرمی کے ساتھ اس راستے پر چلتے جا رہے ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ کچھ الفاظ کے معانی "اساطیر" "اسطورہ" کی جمع ہے۔ اہل لغت کے بقول یہ دراصل "سطر" کے مادہ سے "صف" کے معنی میں ہے۔ اس لیے جو الفاظ ایک ہی صف میں آجائیں۔ انھیں "سطر" کہتے ہیں۔

"اسطورہ" ایسی سطروں اور تحریروں کو کہتے ہیں کہ جو دوسروں کی یادگار کے طور پر رہ جائیں۔ گذشتہ لوگوں کی تحریروں میں چونکہ افسانے اور خرافات موجود ہیں اس لیے عام طور پر یہ لفظ جھوٹی اور افسانوی داستانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے
قرآن حکیم میں لفظ" اساطیر" نو مرتبہ آیا ہے۔ ہر مرتبہ بے ایمان کافروں کے حوالے سے آیا ہے وہ انبیاءؑ کی مخالفت کرنے کی توجیہ کے لیے استعمال کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلی جلد میں سورۂ حمد کی تفسیر میں ہم نے کہا ہے" رب" " مالک مصلح" کے معنی ہیں۔ لہٰذا یہ لفظ ہر چیز کے مالک کے لیے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ اُس مالک کو رب کہتے ہیں کہ جو اپنی ملکیت کی اصلاح، حفاظت اور تدبیر کے درپے ہو۔ اس بنا پر بعض اوقات یہ لفظ تربیت و پرورش کرنے والے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"ملکوت" " ملک" (بروزن" حکم") کے مادے سے حکومت و مالکیت کے معنی میں ہے اور" و" اور" ت" کا اضافہ تاکید اور مبالغے کے لیے ہے۔

" عرش" اونچے پاؤں والے تخت کے معنی میں ہے۔ علاوہ ازیں" چھت" انگور کی بیل والی دیوار اور جس پر بیٹھ کر معمار لوگ تعمیر کا کام کرتے ہیں۔ اُس پاڑ کو بھی عرش کہتے ہیں۔ جب یہ لفظ پروردگار کے حوالے سے استعمال ہو تو اس کا معنی ہے" تمام عالم ہستی" اور" پوری کائنات" کہ جو درحقیقت اللہ کا تختِ حکومت شمار ہوتا ہے۔ لیکن کبھی یہ لفظ ماورائے عالم طبیعات کے لیے بولا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں عالم طبیعات کے لیے لفظ "کرسی" استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً" وسع کرسیہ السمٰوات والارض" (بقرہ - ۲۵۵) [1]

۲ - معاد پر ایمان۔ قدرتِ خدا کے حوالے سے: آیاتِ قرآن سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ منکرین معاد کو زیادہ اس امر پر حیرت تھی کہ خاک ہونے کے بعد انسان کس طرح جی اٹھیں گے۔ اسی لیے معاد و قیامت کے بارے میں زیادہ تر آیات میں قدرتِ خدا کا ذکر ہے اور اس سلسلے میں عالم ہستی سے مختلف مثالیں اور نمونے بیان کیے گئے ہیں۔ تاکہ حیات بعد از ممات کے بارے میں ان کا تعجب ختم ہو۔

---

[1] " عرش" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۴ میں سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں ہم نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔

زیرِ بحث آیات میں بھی تین حوالوں سے اس مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے زمین اور زمین پر رہنے والوں کے حوالے سے،

پھر آسمان اور عرشِ عظیم کے حوالے سے،

اور آخر میں عالمِ خلقت کی تدبیر اور کائنات کا نظام چلانے کے حوالے سے۔

اس لحاظ سے یہ تینوں ایک ہی مفہوم کا مصداق ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تینوں مطالب منکرینِ معاد کے ایک ہی نقطۂ نظر کی طرف اشارہ ہوں مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا انکار اس بناء پر ہے کہ خاک شدہ انسان مالکیتِ الٰہی کی قلمرو سے نکل جائیں گے تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ تم خود اللہ کو زمین اور زمین کی ہر شے کا مالک سمجھتے ہو اور اگر تم کہتے ہو کہ مُردوں کو ایک قادر پروردگار ہی زندہ کر سکتا ہے تو تم خود اللہ کو آسمانوں اور عرش کا پروردگار کہہ کر پکارتے ہو اور اگر تمہارا انکار اس بناء پر ہے کہ تمہیں مُردوں کی حیاتِ نو کے بعد تدبیرِ عالم پر اعتراض ہے تو یہ بھی بے جا ہے۔ کیونکہ تم قبول کر چکے ہو۔ تمام عالمِ ہستی پر وہ قادر ہے اور تمام موجودات اُس کی پناہ میں ہیں۔ اس لحاظ سے تمہارے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

تینوں مواقع پر کفار نے "سیقولون للہ" کہا اور جواب کی یہ ہم آہنگی پہلی تفسیر کو تقویت دیتی ہے۔

۲۔ آیات کے آخری حصے کا فرق

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ پہلے سوال و جواب کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔

افلا تذکرون

کیا تم توجہ نہیں کرتے ہو۔

جبکہ دوسرے سوال و جواب کے آخر میں ہے۔

افلا تتقون

کیا اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟

اور تیسرے سوال و جواب کے آخر میں ہے۔

فانّٰی تسحرون

پس تم کیونکر کہتے ہو کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

درحقیقت یہ تنبیہ اور سرزنش ہے کہ جو مرحلہ بمرحلہ شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ منطقی طرزِ تعلیم کا ایک انداز یہ ہے کہ تین دلائل کے ذریعے کسی کو مغلوب کرنا ہو تو پہلے سرزنش کچھ نرم ہوتی ہے پھر کچھ شدید ہو جاتی ہے اور آخر میں زیادہ شدید انداز میں ملامت کی جاتی ہے۔

۹۱۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ

۹۲۔ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۧ

ترجمہ

۹۱۔ اللہ نے ہرگز کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور کوئی دوسرا اُس کے ساتھ معبود نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا تو ان میں سے ہر خدا اپنی مخلوق کا خود نظام چلاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے درپے ہوتے (اور نظامِ کائنات تباہ ہو جاتا) پاک ہے اللہ اس توصیف سے کہ جو یہ کرتے ہیں۔

۹۲۔ وہ ہر پنہاں و آشکار سے آگاہ ہے۔ وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے شریک قرار دیں۔

تفسیر

شرک دنیا کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے

گزشتہ آیات میں معاد اور اللہ کی مالکیت، حاکمیت اور ربوبیت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ زیرِ نظر آیات

ہیں نفی شرک کے مسئلے پر بات ہوئی ہے۔ ان میں مشرکین کے کچھ انحرافات کا جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے ہرگز کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ (ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الٰہ)۔

صرف عیسائی اللہ کی اولاد کا عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ مشرکین کا بھی اس طرح کا عقیدہ تھا۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا حقیقی بیٹا کہتے ہیں۔ جبکہ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے۔ اور شاید عیسائیوں نے بھی یہ عقیدہ پرانے مشرکین ہی سے لیا تھا۔ بہرحال بیٹا چونکہ ذات اور حقیقت کے لحاظ سے باپ کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے وہ لوگ فرشتوں یا حضرت عیسیٰؑ وغیرہ کے لیے الوہیت کے ایک حصہ کے بھی قائل تھے اور یہ واضح طور پر مظاہر شرک میں سے ہے۔

اس کے بعد نفی شرک کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر اللہ کا کوئی شریک ہوتا اور متعدد خدا عالم ہستی پر حکمران ہوتے تو ہر ایک اپنی خاص مخلوق کا نظام خود چلانے کے درپے ہوتا (اور یہ فطری بات ہے کہ پھر کائنات کے مختلف حصوں کا نظام مختلف ہاتھوں میں ہوتا اور یہ بات موجودہ نظام وحدت سے ہم آہنگ نہیں ہے) (اذًا لذھب کل الٰہ بما خلق)۔

علاوہ ازیں ان خداؤں میں سے "ہر ایک اپنی حکومت کو توسیع دینے کی کوشش کرتا اور دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے درپے ہوتا" اور یہ بات بھی نظام عالم کے درہم برہم ہو جانے کا باعث ہوتی (ولعلا بعضھم علٰی بعض)۔

اور آیت کے آخر میں ایک مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پاک ہے اللہ اس سے کہ جو وہ اُس کی توصیف کرتے ہیں (سبحان اللہ عما یصفون)۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اچھی طرح سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ عالم کائنات پر ایک وسیع نظام حکم فرما ہے زمین و آسمان پر ایک جیسے قوانین کی حکمرانی ہے۔ جو قوانین انتہائی چھوٹے سے ذرّے "ایٹم" پر حکم فرما ہیں۔ وہی نظام شمسی اور دیگر نظاموں پر حکم فرما ہیں۔ ماہرین کے بقول اگر ایٹم کو بڑا کر لیا جائے تو وہ نظام شمسی کی شکل دھار لے اور اگر اس کے برعکس نظام شمسی کو چھوٹا کر لیا جائے تو وہ ایک ایٹم کی صورت اختیار کر لے۔

مختلف علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں نے جدید ترین آلات و وسائل کی مدد سے کائنات کی وسعتوں کا جو مطالعہ کیا ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ تمام کائنات وحدتِ نظام کی ترجمان ہے۔

دوسری طرف تعدد کا لازمہ ہمیشہ ایک قسم کا اختلاف اور تفاوت ہے۔ کیونکہ دو چیزیں اگر ہر لحاظ سے ایک ہوں تو وہ ایک چیز ہو جائیں گی۔ اور پھر دو کا کوئی مفہوم نہیں رہ جائے گا۔ لہٰذا اگر اس جہان کے لیے متعدد خدا فرض کیے جائیں تو یہ تعدد مخلوقاتِ عالم اور ان پر حاکم نظام پر اثر انداز ہوگا۔ اور اس کا نتیجہ نظامِ کائنات کی عدم وحدت ہوگا۔

اس سے قطع نظر ہر موجود تکامل و ارتقاء کا خواہاں ہے۔ مگر جو موجود ہر لحاظ سے کامل ہو اس کے لیے تکامل کا کوئی مفہوم نہیں۔ اگر ہم متعدد خدا فرض کریں اور اُن کی مختلف حکومتیں فرض کریں تو ظاہر سی بات ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی کمالِ

مطلق کا مالک نہ ہوگا۔ لہٰذا فطری امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے تکامل کے درپے ہوگا اور چاہے گا کہ تمام عالمِ ہستی کو اپنے احاطۂ اقتدار میں شامل کر لے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ایک دوسرے پر برتری و فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ کائنات کی تباہی ہوگا۔

اس طرح سے مذکورہ بالا آیت کے دونوں جملوں میں سے ہر ایک ایک علیحدہ منطقی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا یہ دلائل منطقی پہلو رکھتے ہیں نہ کہ اقناعی۔[1]

اب یہاں ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے۔ اگر ہم فرض کریں کہ خدا ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اگر وہ حکیم و آگاہ ہوں تو پھر کیا مانع ہے۔ مثلاً وہ شورائی نظام کے تحت بھی کائنات کو چلا سکتے ہیں۔ (اس سوال کا جواب ہم ساتویں جلد میں سورۂ انبیاء کی آیت ۲۲ کے ذیل میں تفصیل سے "برہان تمانع" کے موضوع کے تحت پیش کر چکے ہیں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں۔)

اگلی آیت میں ان بے ہودہ گو مشرکین کو ایک اور جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "اللہ ہر پنہاں و آشکار سے آگاہ ہے"۔ تمھیں جن کے خدا ہونے کا دعویٰ ہے، اگر کوئی خدا ہوتا تو اللہ ضرور اُن سے آگاہ ہوتا۔ جبکہ ایسا نہیں ہے (عالم الغیب والشھادۃ)۔

کیا یہ ممکن ہے کہ عالم میں کوئی اور خدا ہوتا کہ جس سے تم آگاہ ہو۔ لیکن وہ اللہ کہ جو تمھارا خالق ہے اور غیب و شہود کو جانتا ہے۔ اس سے بے خبر ہو؟

یہ بیان درحقیقت سورۂ یونس کی آیت ۱۸ سے ملتا جلتا ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے۔

قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السمٰوٰت ولا فی الارض

"کہو! کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو، جس کے وجود کا اُسے آسمان و زمین میں پتہ نہیں ہے۔"

آخری جملے میں یہ کہہ کر اُن خرافاتی خیالات پر خطِ بطلان کھینچا گیا ہے: اللہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے

---

[1] "ولعلا بعضھم علٰی بعض" کی علامہ طباطبائی مرحوم نے تفسیر المیزان میں ایک اور تفسیر ذکر کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم پر حاکم نظام کبھی تو ایک دوسرے کے متوازی اور عرض میں ہوتے ہیں۔ مثلاً صحرا اور دریا پر حاکم نظام اور کبھی ایک دوسرے کے تسلسل اور طول میں مثلاً نظام شمسی کلی و مجموعی اعتبار سے اور وہ نظام کہ جو کرۂ زمین پر حاکم ہے۔ زمین پر حاکم نظام شمسی کا ایک حصہ ہے دوسری صورت میں ایک نظام کے تحت دوسرا نظام ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک الگ خدا سے وابستہ ہو تو ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔ کہ جو خدا کلی نظام پر حاکم ہے۔ وہ ہر موقع پر اس خدا سے برتر ہے جو ماتحت نظام پر یا جزوی نظام پر حاکم ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں خداؤں کے لیے سلسلۂ مراتب کا قائل ہونا پڑے گا۔ (جیسے کسی ایک ملک میں صدر، وزیر، گورنر اور افسر کا سلسلہ ہوتا ہے اور ان کے مختلف مراتب ہوتے ہیں) جبکہ خدا کے لیے ایسا سلسلۂ مراتب قبول کرنا محال ہے۔

(تفسیر المیزان، ج ۱۵، ص ۹۶)

شریک قرار دیں۔ (فتعالی عما یشرکون)۔

آیت کا یہ حصّہ سورہ یُونس کی آیت ۱۸ کے آخری حصّے سے بالکل مشابہ ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

سبحانہ وتعالی عما یشرکون۔

یہ نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں آیات ایک ہی مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

ضمنی طور پر یہ جملہ مشرکین کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ اللہ اُن کے ظاہر و پنہاں سے آگاہ ہے اور وہ ان تمام باتوں کو جانتا ہے اور موقع آنے پر وہ اپنی عدالت میں ان کا فیصلہ کرے گا۔

۹۳۔ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ

۹۴۔ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

۹۵۔ وَاِنَّا عَلٰٓي اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ○

۹۶۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ
بِمَا يَصِفُوْنَ ○

۹۷۔ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ

۹۸۔ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ○

ترجمہ

۹۳۔ کہہ دو: پروردگارا! جس عذاب کی انھیں دھمکی دی گئی ہے۔ اگر مجھے تو وہ دکھائے

۹۴۔ تو اے میرے رب! (یہ عذاب نازل کرتے ہوئے) مجھے اس ظالم قوم میں سے قرار نہ دینا۔

۹۵۔ اور ہم قادر ہیں کہ تجھے وہ کچھ دکھائیں کہ جس کا ہم نے ان کے لیے وعدہ کیا ہے۔

۹۶۔ برائی کو بہتر طریقے سے دفع کرو (اور برائی کا جواب اچھائی سے دو)۔ جو باتیں وہ کرتے ہیں ہم اُن سے زیادہ آگاہ ہیں۔

۹۷۔ اور کہہ دو: پروردگارا! شیطانوں کے وسوسوں سے میں تیری پناہ

چاہتا ہوں۔

۹۸۔ اور اے میرے رب! میں اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

تفسیر

شیطانی وسوسوں سے پناہ بخدا

گذشتہ آیات میں ہٹ دھرم کافروں اور مشرکوں کو سرزنش کی گئی ہے۔ جبکہ زیرِ نظر آیات میں روئے سخن پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔ لیکن سلسلۂ کلام وہی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اے رسول کہہ دو، پروردگارا! وہ عذاب جس کا تو نے ان سرکش لوگوں کے بارے میں وعدہ کیا ہے۔ اگر تو مجھے دکھائے (قل رب اما تریني ما یوعدون)۔[1]

تو اے میرے رب! یہ عذاب نازل کرتے ہوئے مجھے اس ظالم قوم میں سے قرار نہ دینا (رب فلا تجعلني فی القوم الظالمین)۔ میری دعا ہے کہ جس وقت تیرا قطعی عذاب انہیں دامن گیر ہو تو مجھ پر احسان فرمانا اور مجھے اس کی ہلاکت انگیزیوں سے بچائے رکھنا اور میری دعا ہے کہ اس وقت میں ان ظالموں میں نہ ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اکرمؐ کے عمل میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ بھی عذابِ الٰہی کی زد میں آجاتے اور اس میں بھی شک نہیں، کہ عدالتِ الٰہی سے جاری ہونے والے فرمانِ سزا کی زد میں ہر خشک و تر نہیں آجاتا۔ یہاں تک کہ اگر ایک عظیم مملکت میں صرف ایک شخص خدا پرست اور فرض شناس ہو تو دوسرے لوگوں کو سزا دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس کو بچالے گا۔

لیکن حکمِ خدا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ کافروں اور مشرکوں کے لیے خطرے کا الارم ہو کہ سزا کا معاملہ اس قدر یقینی ہے کہ خود رسولِ عظیم اسلام کو چاہیئے کہ وہ اپنے تئیں خدا کے سپرد کر دیں اور اس سے نجات کی درخواست کریں۔

دوسرا یہ کہ یہ بات اس رسولؐ کے تمام پیروکاروں کے لیے بھی درس ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہرگز عذابِ الٰہی سے مامون نہ سمجھیں اور اپنے آپ کو ہر حالت میں اس کے سپرد کریں۔

---

[1] مندرجہ بالا آیات میں "اما" "ان" شرطیہ اور "ما" زائدہ کا مرکب ہے۔ یہاں یہ لفظ تاکید کے لیے آیا ہے اور عام طور پر اس بنا پر کہ "ان" شرطیہ فعل پر داخل ہو سکے جو کہ "نونِ تاکید" کے ساتھ ہو لفظ "ما" کا فاصلہ ہونا چاہیئے۔

رہا یہ سوال کہ اس عذاب سے کون سا عذاب مراد ہے؟ تو اس سلسلے میں بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مشرکین پر آنے والا وہ دنیاوی عذاب مراد ہے کہ جو جنگِ بدر میں ان کی رسواکن شکست کی صورت میں سامنے آیا۔[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سورۂ مومنون مکّی ہے اور ان دنوں مومنین سخت دباؤ میں تھے۔ یہ آیات ان کے لیے ایک طرح سے دل جوئی اور تسلّیٔ خاطر ہیں (اس کی نظیر سورہ یونس کی آیت ۴۶ بھی ہے)۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت دونوں مراد ہیں۔[2] البتہ پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں مزید تاکید کے لیے، دشمنوں کے ہر قسم کے شک کو دور کرنے کے لیے اور رسول اللہؐ اور مومنین کی دل جوئی کے لیے اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: ہم یقیناً قادر ہیں کہ جس عذاب کا ان کے لیے ہم نے وعدہ کیا ہے وہ تجھے دکھائیں (وانا علی ان نریك ما نعدھم لقادرون)۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ اس تاریخ کے بعد جنگِ بدر میں اور دیگر مواقع پر اللہ کی اس قدرت کے مظاہر دیکھنے میں آئے اور ظاہراً چھوٹا سا کمزور لشکر اللہ کے حکم اور قوتِ ایمان سے دشمنوں کی بڑی تعداد پر کامیاب و کامران ہوا۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کو ان لوگوں کے ساتھ حسنِ کریمی سے پیش آنے کے لیے کہا گیا ہے: اور ان کی برائیوں کو عفو و درگزر اور اچھائی کے ساتھ دور کرو اور ان کی غیر پسندیدہ باتوں کا بہترین منطق کے ساتھ جواب دو (ادفع بالتی ھی احسن السیئة)۔ اس سلسلے میں جلدی نہ کرو اور جان لو کہ جو کچھ باتیں وہ کہتے ہیں ہم اس سے زیادہ آگاہ ہیں (نحن اعلم بما یصفون)۔

ہم جانتے ہیں کہ ان کی ناشائستہ حرکات اور اذیت ناک باتیں تمہارے لیے پریشان کن اور تکلیف دہ ہیں۔ لیکن تمہیں نہیں چاہیئے کہ ان سختیوں اور بدگوئیوں کا ویسا ہی جواب دو تم ان کی برائی کا جواب اچھائی سے دو۔ کیونکہ یہ روش بذاتِ خود غافل اور فریب خوردہ افراد کی بیداری کے لیے نہایت موثر ہے۔

مگر اس کے باوجود اپنے تئیں اللہ کے سپرد کر دو اور کہو: اے میرے رب! میں شیطانی وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں (وقل رب اعوذ بك من ھمزات الشیاطین)۔

نہ صرف ان کے غافل کر دینے والے وسوسوں سے تیری پناہ کا طالب ہوں بلکہ اس سے بھی کہ وہ میرے پاس آئیں (واعوذ بك رب ان یحضرون)۔

وہ میری محفل میں بھی نہ آئیں کیونکہ ان کی موجودگی گمراہ کن اور نقصان دہ ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، المیزان، فی ظلال القرآن، روح المعانی اور تفسیر ابوالفتوح رازی ـــــ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر کبیر از فخر الدین رازی ـــــ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

چند اہم نکات

۱۔ **"ھمزات الشیاطین" کیا ہے؟** "ھمزات" "ھمزہ" کی جمع ہے، جس کا معنیٰ ہے شدت کے ساتھ دفع اور تحریک۔ حرف ہمزہ کو اسی لیے ہمزہ کہتے ہیں کہ وہ گلے کے آخری حصے سے شدت کے ساتھ نکلتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "ھمز" "غمز" اور "رمز" کے ایک ہی معنی ہیں۔ البتہ "رمز" خفیف مرحلے کے لیے ہے، "غمز" شدید تر اور "ھمز" نہایت شدید مرحلے کے لیے ہے [1]

"شیاطین" جمع ہے اور اس کے مفہوم میں جنوں اور انسانوں میں موجود تمام پنہاں و آشکار شیطان شامل ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے کہ امامؑ نے "قل رب اعوذ بک من ھمزات الشیاطین" کی تفسیر میں فرمایا۔

اس سے مراد وہ شیطانی وسوسے ہیں جو تیرے دل میں پڑتے ہیں [2]

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی طرف سے مقام عصمت کے حامل ہونے کے باوجود اس سے یہ دعا کرتے ہیں۔ تو دوسروں کی حالت واضح ہے۔ لہٰذا تمام مومنین کو چاہیئے کہ وہ اپنے مالک و مدبر پروردگار سے دعا کریں کہ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی انہیں اپنے حال پر نہ چھوڑے۔ نہ صرف شیطانی وسوسوں سے بچائے۔ بلکہ ان کی محفلوں کو بھی شیطانی وجود سے پاک رکھے۔ راہِ حق کے تمام راہیوں کو چاہیئے کہ شیطانی وسوسوں سے ڈرتے رہیں۔ اور ہمیشہ اپنے تئیں پناہِ خدا میں دیئے رکھیں۔

۲۔ **بُرائی کا جواب بھلائی سے:** سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں سے مقابلے کا ایک مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے کہ ان کے ضمیر کے اندر ایک ہیجان پیدا ہوگا اور اُن کا ضمیر ہی ان کی برائیوں پر انہیں سخت ملامت کرے گا۔ اور حق و باطل کے موازنے میں ان کا ضمیر حق کا ساتھ دے گا۔ بہت سے مواقع پر یہی امر دشمن کو مائل کر دیتا ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی سیرت اور عملی زندگی میں ہم نے بہت دیکھا ہے کہ انھوں نے ایسے افراد یا گروہوں کا جواب اچھائی کے ساتھ دیا ہے کہ جو بدترین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ان پیشواؤں نے محبت کا سلوک کیا ہے اور یہی امر ان کے روحانی انقلاب اور راہِ حق پر آجانے کا باعث بنا ہے۔

قرآن نے مندرجہ بالا آیات میں اور دیگر کئی ایک مقامات پر مسلمانوں سے تقاضا کیا ہے کہ وہ برائیوں کا اس طریقے سے مقابلہ کریں۔

یہاں تک کہ سورہ "حٰمٓ السجدہ" کی آیت ۳۴ میں فرمایا گیا ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۵۲

فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔

اس کام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہایت سخت دشمن تمہارے گرم جوش دوست بن جائیں گے۔

لیکن — یہ بات بنا کہے واضح ہے کہ یہ حکم خاص مواقع کے لیے ہے۔ ایسے مواقع کہ جہاں دشمن اس سے غلط فائدہ نہ اُٹھائے اور اسے کمزوری پر محمول نہ کرے اور اس کی جرارت و جسارت میں اضافہ نہ ہو۔

نیز اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سازشوں اور شیطانی وسوسوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔

شاید اسی بنا پر مندرجہ بالا حکم کے فوراً بعد قرآن رسول اللہؐ کو حکم دیتا ہے کہ شیطانی وسوسوں اور شیطانوں کے پاس آنے سے خدا کی پناہ مانگو۔

۹۹۔ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ
ارْجِعُوْنِ ۙ
۱۰۰۔ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ
اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ
بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۹۔ (وہ اسی طرح اپنی غلط روش پر گامزن رہتے ہیں) یہاں تک کہ موت ان میں سے کسی کو آگھیرتی ہے تو وہ کہتا ہے: میرے پروردگار مجھے واپس لوٹا دے۔

۱۰۰۔ شاید جو کچھ میں (نے کوتاہی کی ہے) اس کے لیے عملِ صالح انجام دوں (تو اسے کہا جائے گا:) ایسا نہیں ہے، یہ تو وہ بات ہے جو یہ (صرف زبان سے کہتا ہے (اور اگر اسے پلٹا دیا جائے تو بھی اس کا طرزِ عمل وہی پہلے کا سا ہوگا) اور ان کے پیچھے اس دن تک کے لیے برزخ حائل ہے جس دن وہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

تفسیر

ناممکن تقاضا

گذشتہ آیات میں مشرکین کی اپنے راستے پر ہٹ دھرمی کا ذکر تھا۔ زیر بحث آیات میں آستانۂ موت پر ان کی دردناک کیفیت کا تذکرہ ہے۔

وہ اپنی غلط روش پر یونہی گامزن رہیں گے، یہاں تک کہ موت ان میں سے کسی کو آلے (حتّٰی اذا جاء احدھم الموت)۔[1]

اس وقت کہ جب وہ دیکھے گا کہ اس جہان سے اس کا رابطہ کٹ گیا ہے۔ اور اب وہ دوسرے جہان میں ہے تو غرور و غفلت کے پردے اس کی آنکھوں پر سے اُٹھ جائیں گے۔ گویا اپنا دردناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اسے یاد آئے گا کہ اس نے عمر گنوا دی اور اتنا سرمایہ ضائع کر دیا۔ اسے اپنی عمرِ رفتہ کی کوتاہیاں یاد آئیں گی۔ وہ گناہ جو اس نے انجام دیئے تھے۔ اُن کا خیال آئے گا۔ اور اب ان سب کا منحوس انجام وہ اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوگا۔ اس وقت وہ فریاد کرے گا اور پکارے گا: اے میرے رب مجھے واپس بھیج دے۔ (قال رب ارجعون)۔ مجھے پھر دُنیا میں لوٹا دے کہ میں اپنے کیئے کی تلافی کر سکوں اور اپنی کوتاہیوں کو دُور کرنے کے لیے عملِ صالح بجا لاؤں" (لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت)۔

لیکن قانونِ آفرینش کسی نیک یا بد کو واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا اُسے جواب دیا جائے گا۔ کیا! واپسی؟ ہرگز نہیں (کلا)۔ یہ تو ایسی بات ہے جو وہ صرف زبان سے کہتا ہے (انھا کلمۃ ھو قائلھا)۔

یہ بات اس کے دل کی گہرائیوں سے، ارادے اور آزادی کے ساتھ نہیں نکلی۔ یہ تو وہی بات ہے جو ہر گناہگار

---

[1] "حتّٰی" درحقیقت ایک محذوف جملے کی غایت ہے کہ جو گذشتہ عبارتوں سے واضح ہوتا ہے اور وہ تقدیر میں یُوں ہے۔

انھم یستمرون علٰی ھذا الحال حتّٰی اذا جاء احدھم الموت۔

وہ اسی طریقے پر چلتے رہیں گے یہاں تک کہ ان میں کسی ایک کو موت آ جائے۔

اور یہ مفہوم "نحن اعلم بما یصفون" سے بھی سمجھا جا سکتا ہے اور یہ جملہ گذشتہ آیات میں بھی دو مرتبہ آیا ہے (غور کیجیئے گا)۔

اس وقت ... جب ... سزا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اور جب طوفان بلا تھم جاتا ہے۔ تو پھر وہ اپنے طرزِ عمل کو جاری رکھتا ہے

سو... ...یت ۲۸ میں بھی ایسی ہی بات فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

...ردو لعادوا لما نھوا عنہ

...حیاتِ دُنیا کی طرف لوٹ جائیں تو وہی پہلے کا سا طور طریقہ جاری رکھیں۔

آیت ... بزرخ کی اسرار آمیز زندگی کی طرف نہایت معنی خیز اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس روز وہ اُٹھائے ... ...دن تک اُن کے پیچھے برزخ حائل ہے (ومن ورائهم برزخ الی یوم یبعثون)۔

چند نکات

۱۔ "رب ارجعون" میں مخاطب کون ہے؟ یہاں لفظ "رب" "ربی" کا مخفف ہے۔ جو کا معنی ہے: میرے پروردگار۔ لہٰذا اس کا آغاز نشاندہی کرتا ... رب خداوند متعال ہے۔ لیکن "ارجعون" (مجھے آپ واپس لوٹادیں) چونکہ جمع کا صیغہ ہے۔ لہٰذا مخا... ...نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک لفظ مخاطب واحد کے لیے اور دوسرا مخاطب جمع کے لیے ... ...ہے۔؟

بعض ... خیال ہے کہ مخاطب خدا ہی ہے اور جمع کا صیغہ یہاں احترام و تعظیم کے طور پر ہے۔ جیسا کہ ہماری ف... ...میں معمول ہے کہ ہم ایک مخاطب فرد کو احترام کے طور پر "شما" (آپ) کہتے ہیں۔ لیکن گذشتہ زمانے ... زبان میں اس طرح سے رائج نہیں تھا اور قرآن میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے ... جملے کی یہ تفسیر کمزور ہے۔[1]

بعض ... نے کہا ہے کہ مخاطب دراصل موت کے فرشتے ہیں۔ کہ جن کے ذمے روحیں قبض کرنا ہے اور لفظ "رب" ... بارگاہِ خدا میں ایک طرح کی فریاد ہے۔ ہمارے روزمرہ کی گفتگو میں یوں بہت ہوتا ہے کہ جب انسان کسی

---

[1] سورہ ... آیت ۹ میں ہے۔

"ق... ...ی ولک لا تقتلوہ"

یہ ... آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا تم لوگ اسے قتل کرو۔"

یہ بات ... ...بی نے اُس وقت کہی جب دریا سے بہتا ہوا، حضرت موسیٰ کا صندوق لایا گیا۔ اس میں پہلے فرعون مخاطب ہے۔ اور اس کے ... ساتھی کہ جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل پر مامور تھے (غور کیجیے گا)

بحرانی کیفیت سے دوچار ہو تو پہلے بارگاہِ خدا میں فریاد کرتا ہے اور بعد میں لوگوں سے مدد طلب کرتا ہے۔ مثلاً۔

یا اللہ ! یا اللہ

مجھے بچاؤ میری مدد کرو

یہ تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

۲۔ "فیما ترکت" کا مفہوم: مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ کافر لوگ موت کی چوکھٹ پر پہنچ کر خواہش کرتے ہیں کہ انھیں واپس لوٹا دیا جائے تاکہ "انھوں نے جن چیزوں کو ترک کیا ہے" ان کے لیے عملِ صالح بجالائیں۔

بعض کا نظریہ ہے۔ کہ "فیما ترکت" ان اموال کی طرف اشارہ ہے کہ جو ان کی طرف سے باقی رہ گئے ہیں۔ کیونکہ عام طور پر بھی انہیں "ترکۂ میت" کہتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث اسی مفہوم کی موید منقول ہے، آپؑ فرماتے ہیں۔

من منع قیراطًا من الزکٰوۃ فلیس بمؤمن ولا مسلم وھو قولہ تعالیٰ رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت[1]

جو شخص زکوٰۃ کا ایک قیراط[2] نہ دے وہ مومن ہے نہ مسلمان اور اللہ کا یہ فرمان اسی بارے میں ہے: رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت)

بعض دیگر مفسرین اس سے زیادہ وسیع معانی کے قائل ہیں۔ وہ "ما ترکت" کو ان تمام اعمالِ صالح کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جنھیں یہ شخص چھوڑ چکا ہے۔ یعنی خداوندا: مجھے واپس بھیج دے تاکہ جو صالح اعمال میں نے ترک کیے ہیں انھیں بجالاؤں اور پہلی کوتاہیوں کی تلافی کردوں۔

دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ضمناً۔ "لعلی اعمل صالحًا" (شاید عمل صالح انجام دوں) میں "لعل" (شاید) ممکن ہے۔ اس طرف اشارہ ہو کہ یہ غلط کار اور منحرف افراد اپنی آئندہ کیفیت کے بارے میں بھی مطمئن نہیں ہیں۔ اور کم و بیش جانتے ہیں کہ یہ ندامت خاص حالات کی وجہ سے ہے۔ اور موت آجانے کے باعث انھیں پیش آئی ہے۔ ورنہ اگر وہ واپس بھیج دیئے جائیں تو وہی روش باقی رکھیں گے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

۳۔ "کلّا" یہاں کس چیز کی نفی کرتا ہے؟ "کلّا" عربی زبان میں روکنے اور دوسرے کی بات کو باطل کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کی ضد "اِی" (جی ہاں) ہے

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۵۵ بحوالہ کافی،

ثواب الاعمال اور من لا یحضرہ الفقیہ

[2] قیراط کا وزن جَو کے چار دانوں کے برابر ہوتا ہے۔

کہ جو تصدیق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "کلّا" دنیاوی زندگی کی طرف واپسی کے کافروں کے تقاضے کی نفی ہے۔ یعنی واپسی کا راستہ بند ہے اور کسی طرف بھی اب تمہارا دنیاوی زندگی کی طرف لوٹ کے جانا ممکن نہیں۔

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ ان کے اس دعوے کی نفی ہے۔ کہ اگر ہم دنیا کی طرف پلٹ جائیں تو اپنی گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کریں گے۔ اللہ کہتا ہے کہ یہ ایک بے بنیاد اور کھوکھلا دعوٰے ہے اور اگر یہ پلٹ جائیں تو وہی پہلے کا سا طرزِ عمل جاری رکھیں گے۔

البتہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ یہ لفظ دونوں باتوں کی نفی کے لیے ہو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیرِ بحث آیت میں یہ تقاضا اگرچہ مشرکین کی طرف سے کیا گیا ہے اور انہی کو جواب دیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ امر مسلم ہے کہ یہ امر انہی سے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام گناہگاروں، ظالموں اور غلط کاروں کی یہی خواہش ہوگی جب وہ موت کو اپنے آستانے پر دیکھیں گے تو انہیں اپنا دردناک انجام نظر آئے گا۔ وہ اپنے گزشتہ کردار پر پشیمان ہوں گے اور واپسی کا تقاضا کریں گے۔ لیکن ان کی یہ درخواست ٹھکرا دی جائے گی۔

۴۔ عالمِ برزخ کیا ہے؟

عالمِ برزخ کیا ہے، کہاں ہے اور دُنیا و آخرت کے درمیان اس قسم کے جہان کی کیا دلیل ہے؟ نیز کیا برزخ سب کے لیے ہے یا کچھ معین لوگوں کے لیے؟ اور اس عالم میں مومنین صالحین، کفار اور گناہگاروں کی کیا کیفیت ہوگی؟

عالمِ برزخ کے بارے میں اس قسم کے سوالات اُبھرتے ہیں اور آیات و روایات میں ان پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے ضروری ہے کہ یہ تفسیر جس قدر اجازت دیتی ہے۔ ہم ان سوالات کا جواب دیں۔

"برزخ" کا بنیادی معنٰے ہے ایسی چیز کہ جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو۔ بعد ازاں ہر اس چیز کو "برزخ" کہا جانے لگا کہ جو دو چیزوں کے درمیان ہو۔ اسی لیے دُنیا و آخرت کے درمیانی عالم کو "برزخ" کہا جاتا ہے۔

اسی جہان کو عالمِ قبر اور عالمِ ارواح بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں متعدد ایسی قرآنی آیات موجود ہیں کہ جن میں سے کچھ ظاہری طور پر اس عالم کی موجودگی پر دلالت کرتی ہیں اور بعض صراحتًا یہ مفہوم دیتی ہیں۔

زیرِ بحث آیت:

ومن ورائھم برزخ الٰی یوم یبعثون۔

ان کے پیچھے اُٹھنے کے دن تک ان پیچھے برزخ حائل ہے۔

یہ آیت عالمِ برزخ کے بارے میں بالکل ظاہری مفہوم رکھتی ہے۔ اگرچہ بعض نے یہاں برزخ کا معنٰی "اس دُنیا کی طرف واپسی میں رکاوٹ" کیا ہے لیکن یہ معنٰی بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ "الٰی یوم یبعثون" (مبعوث ہونے اور قبروں سے اُٹھنے کے دن تک) اس بات کی دلیل ہے کہ یہ برزخ دنیا اور آخرت کے درمیان ہے نہ کہ انسان اور دُنیا کے درمیان۔

جو آیات صراحتًا اس قسم کے جہاں ثابت کرتی ہیں وہ ہیں کہ جو شہدار کی زندگی سے مربوط ہیں۔

وَلا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتًا بل احیاء عند ربھم یرزقون۔

ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ جو لوگ راہِ خدا میں مارے گئے ہیں۔ وہ مردہ ہیں، وہ تو زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے رزق پاتے ہیں۔

(آل عمران - ۱۶۹)

یہاں تو رُوئے سُخن پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔ جب کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۴ میں تمام مومنین سے خطاب کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون۔

اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو مردہ نہ کہو۔ وہ تو زندہ ہیں۔ تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔

نہ صرف شہدار جیسے بلند مقام مومنین کے لیے عالمِ برزخ موجود ہے۔ بلکہ فرعون اور اس کے حواریوں جیسے سرکشوں کے لیے عالمِ برزخ کا ہونا صراحت سے سُورۂ مومن کی آیت ۴۶ میں آیا ہے۔

النار یعرضون علیھا غدوًّا وعشیًّا ویوم تقوم الساعۃ ادخلوا اٰل فرعون اشد العذاب۔

(فرعون اور اس کے ساتھی) ہر صبح و شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں اور جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو۔

البتہ اس سلسلے میں مفسرین نے اور بھی کئی ایک آیات ذکر کی ہیں کہ جو اتنی صراحت سے عالمِ برزخ کو ثابت نہیں کرتیں جتنی کہ مذکورہ بالا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ صرف زیرِ بحث آیت ایسی ہے کہ جس میں عالمِ برزخ کا ذکر عمومی حوالے سے ہے۔ دیگر آیات میں خصوصی حوالے سے ذکر ہے۔ مثلاً شہداء کے بارے میں یا آلِ فرعون کے بارے میں۔ لیکن واضح ہے کہ مسئلہ صرف آلِ فرعون سے متعلق نہیں، کیونکہ ان جیسے اور بھی بہت سے لوگ دُنیا میں ہیں۔ اور اسی طرح مسئلہ صرف شہداء سے مخصوص نہیں کیونکہ قرآن مجید میں اور بھی لوگوں کو شہداء کے ہم پلہ شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۶۹ میں انبیاءؑ و صدیقینؑ شہدا اور صالحین کو ایک صف میں شمار کیا گیا ہے۔

فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین۔

عالمِ برزخ سب کے لیے ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں ہم انشاء اللہ اس بحث کے آخر میں گفتگو کریں گے رہا روایات کا معاملہ تو اس بارے میں شیعہ اور سُنی کُتب میں بہت زیادہ روایات موجود ہیں۔ روایات میں

اس دور کے لیے مختلف تعبیرات ہیں۔ کہیں اسے عالمِ برزخ کہا گیا ہے، کہیں عالمِ قبر اور کہیں عالمِ ارواح۔ اس ضمن میں روایات میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم ذیل میں چند ایک روایات پیش کرتے ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار میں موجود ہے۔ حضرت علی علیہ السلام جنگِ صفین سے لوٹے تھے۔ واپسی پر کوفہ کے قبرستان کے پاس سے گزرے۔ یہ قبرستان شہر کے دروازے سے باہر تھا۔ آپؑ نے قبروں کی طرف رُخ کیا اور فرمایا۔

یا اهل الدیار الموحشة والمحال المقفرة والقبور المظلمة! یا اهل التربه! یا اهل الغربه! یا اهل الوحده! یا اهل الوحشة انتم لنا فرط سابق ونحن لكم تبع لاحق، اما الدور فقد سكنت، واما الازواج فقد نكحت واما الاموال فقد قسمت! هذا خبر ما عندنا فما خبر ما عندكم؟

ثم التفت الى اصحابه فقال، اما لو اذن لهم فى الكلام لاخبروكم ان خير الزاد التقوى۔

اے وحشت کے گھروں، خالی مکانوں اور تاریک قبروں میں رہنے والو! اے خاک نشینو! اے مسافرو! اے تنہائی میں رہنے والو! اے اہلِ وحشت! تم اس راستے پر ہم سے پہلے چلے گئے ہو۔ ہم بھی تم سے آملیں گے اگر تم دنیا کی خبر پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ تمھارے گھروں میں دوسرے آبسے ہیں، تمھاری بیویاں اوروں سے بیاہی گئی ہیں۔ اور تمھارے مال تقسیم ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کی خبر ہے۔ اب کہو تمھارے ہاں کی کیا خبر ہے؟

پھر آپؑ اپنے اصحاب کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: اگر انہیں بات کرنے کی اجازت ملے تو یقیناً تمہیں بتائیں کہ اس سفر کے لیے بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔[1]

واضح ہے کہ ان سب باتوں کو مجاز اور کنائے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ سب اس حقیقت کی خبر دیتی ہیں۔ کہ موت کے بعد ایک طرح کی برزخی زندگی ہے اور اس دور میں بھی انسان سمجھتا ہے اور ادراک رکھتا ہے اور اگر اسے بات کرنے کی اجازت دی جائے تو وہ بات بھی کرے۔

۲۔ ایک اور حدیث اصبغ بن نباتہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ اصبغ کہتے ہیں۔

ایک روز حضرت علیؑ شہر کوفہ سے باہر نکلے اور "غری" (نجف) کے مقام کے قریب آئے ہم آپ تک پہنچے تو دیکھا کہ آپ زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ قنبر نے کہا: یا امیر المومنینؑ! کیا آپؑ اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنی عبا آپؑ کے پاؤں کے نیچے بچھا دوں؟

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصارہ نمبر ۱۳۰۔

آپؑ نے فرمایا: نہیں، یہ ایسی جگہ ہے کہ جس میں مومنین کی مٹی موجود ہے اور تیرا یہ کام ان کے لیے باعث زحمت ہے۔

میں نے عرض کیا، یا امیر المومنینؑ! میں نے مومن کی مٹی والی بات تو سمجھ لی ہے کہ وہ کیا ہے لیکن ان کے لیے باعثِ زحمت ہونے کا کیا معنی ہے؟

آپؑ نے فرمایا۔

یا بن نباته لو كشف لكم لرأيتم ارواح المؤمنين فى هذا الظهر حلقا، يتزاورون ويتحدثون، ان فى هذا الظهر روح كل مؤمن وبوادى برهوت نسمة كل كافر۔

اے ابنِ نباتہ! اگر تمھاری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے جائیں۔ تو تم لوگ مومنین کی روحوں کو دیکھو کہ وہ حلقے بنائے بیٹھی ہیں، ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہیں۔ یہ مومنین کی جگہ ہے اور وادیٔ برہوت میں کافروں کی روحیں ہیں۔[1]

۳۔ ایک اور حدیث میں امام علی بن الحسین علیہما السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا۔

ان القبر اما روضة من رياض الجنة، او حفرة من حفر النار۔

قبر جنت کے باغوں میں ایک باغ ہے۔ یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔[2]

۴۔ ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے فرمایا:

البرزخ القبر، وهو الثواب والعقاب بين الدنيا والأخرة ...... والله ما نخاف عليكم الا البرزخ۔

برزخ وہی عالمِ قبر ہے کہ جو دُنیا و آخرت کے درمیان ثواب اور عذاب کا دور ہے۔ خدا کی قسم ہمیں تمھارے بارے میں صرف عالمِ برزخ کا خوف ہے۔[3]

۵۔ ایک اور حدیث کہ جو کتاب کافی میں منقول ہے۔ اس میں اس جملے کے بعد ہے کہ راوی نے امام علیہ السلام

[1] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۴۳
[2] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۵۵۳
[3] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۵۵۴

سے پوچھا۔

وما البرزخ؟

برزخ کیا ہے؟

تو امامؑ نے فرمایا۔

القبر منذ حین موتہ الی یوم القیامۃ۔

یہ وہی عالمِ قبر ہے۔ وقتِ موت سے لے کر قیامت تک۔[1]

۶۔ ایک اور حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

ایک شخص نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا: بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعد از موت مومنین کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے سینے میں ہوتی ہیں اور یہ پرندے عرشِ الٰہی کے گرد محوِ پرواز رہتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا:

لا، المؤمن اکرم علی اللہ من ان یجعل روحہ فی حوصلۃ طیر ولکن فی ابدان کابدانھم۔

نہیں ایسا نہیں ہے۔ مومن بارگاہِ الٰہی میں اس سے زیادہ با وقار ہے کہ اس کی روح کسی پرندے کے سینے میں بند کر دی جائے۔ مومنین کی روحیں ان کے بدنوں میں ہوتی ہیں اور وہ ان کے انہی بدنوں کی طرح ہیں۔[2]

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ برزخی بدن ایک خاص قسم کا ہے کہ جو کئی پہلوؤں سے اس مادی جسم کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن ایک قسم کے تجرد برزخی کا حامل ہے۔

۷۔ کافی میں ایک اور حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ سے مومنین کی ارواح کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

فی حجرات فی الجنۃ یأکلون من طعامھا ویشربون من شرابھا ویقولون ربنا اقم لنا الساعۃ وانجز لنا ما وعدتنا۔

وہ جنت کے حجروں میں رہتے ہیں، بہشت کے کھانے کھاتے ہیں اور اسی کے مشروبات پیتے ہیں اور کہتے ہیں، پروردگارا! ہمارے لیے جلدی قیامت قائم فرما اور جو وعدے ہم سے کیے ہیں انہیں پورا فرما۔[3]

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ صـ ۵۵۵

[2] بحار الانوار ج ۶ صـ ۲۶۸ بحوالہ کافی

[3] بحار الانوار ج ۶ صـ ۲۶۹

۸۔ اسی کتاب میں اسی امام بزرگوارؑ سے ایک اور حدیث بھی منقول ہے۔ فرمایا۔

جس وقت کوئی مومن دنیا سے جاتا ہے تو مومنین کی روحیں اسے گھیر لیتی ہیں۔ اور دنیا میں زندہ یا مر جانے والوں کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ اگر وہ کہے کہ فلاں شخص دنیا سے چلا گیا ہے اور وہ انہیں اپنے پاس موجود نہ پائیں تو کہتی ہیں کہ یقیناً وہ سقوط کر گیا ہے (یعنی جہنم میں جا پہنچا ہے)۔[1]

واضح ہے کہ ان روایات میں جنت و دوزخ سے مراد عالمِ برزخ کی جنت و دوزخ ہے نہ کہ عالمِ قیامت کی کیونکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں روایات بہت زیادہ ہیں۔ ان روایات کو مختلف ابواب میں جمع کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض ابواب کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

- بہت سی روایات ہیں کہ جن میں فشارِ قبر اور عذابِ قبر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
- ایسی روایات بھی ہیں کہ جو ارواح کے اپنے گھر والوں سے ملنے اور ان کی حالت دیکھنے سے متعلق گفتگو کرتی ہیں۔
- وہ روایات بھی ہیں کہ جن میں واقعہ معراج کے ضمن میں پیغمبرِ اسلامؐ کی انبیاء و رسلؑ کی روحوں سے ملاقات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
- ایسی روایات بھی ہیں کہ جن میں بتایا گیا ہے کہ انسان اس جہان میں جو اچھے بُرے کام کرتا ہے۔ موت کے بعد ان کا نتیجہ اس تک پہنچتا ہے۔

اسی قسم کی اور بھی بہت سی روایات ہیں۔[2]

برزخ اور عالمِ ارواح سے ارتباط

اگرچہ ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ جو عالمِ ارواح سے ارتباط کا غلط دعوےٰ کرتے ہیں۔ یا ایسے ہی تصورات میں گرفتار ہیں۔ لیکن تحقیقات کے مطابق یہ امر درجۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ عالمِ ارواح سے ارتباط ممکن ہے۔ اور بعض آگاہ اور اہلِ علم افراد نے واقعاً ارواح سے رابطہ پیدا کر کے کچھ حقائق معلوم کیے ہیں۔

یہ امر بذاتِ خود عالمِ برزخ کی حقیقت اور اثبات کے لیے ایک واضح دلیل ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ عالمِ دنیا اور جسم کی موت کے بعد اور قیامِ آخرت سے پہلے ایک اور عالم وجود رکھتا ہے۔[3]

---

[1] بحار الانوار ج ۶ صـ ۲۶۹

[2] مرحوم سید عبد اللہ شبرؒ نے کتاب "تسلیۃ الفؤاد فی بیان الموت والمعاد" میں ایسی تمام روایات کو جمع کیا ہے

[3] ارتباط ارواح کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "عود ارواح و ارتباط با ارواح" اور کتاب "جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع فرمائیں۔

اسی طرح وہ عقلی دلائل کہ جو فنائے جسم کے بعد بقائے رُوح اور تجردِ رُوح کے بارے میں ہیں، عالمِ برزخ کے اثبات کے لیے ایک اور برہان ہیں۔ (غور کیجیئے گا)

عالمِ برزخ کا ایک خاکہ

اگر تفصیلات سے قطع نظر کرلیں۔ تو علمائے اسلام کے درمیان عالمِ برزخ میں عذاب و نعمت کے مسئلے پر اتفاق نظر آتا ہے۔ چند ایک افراد کہ جن کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کے علاوہ تمام شیعہ سُنّی عُلماء اس پر متفق ہیں۔ اس اتفاق کی دلیل بھی واضح ہے۔ کیونکہ عالمِ برزخ اور اس میں نعمت و عذاب کے موجود ہونے کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں صراحت موجود ہے۔

شہداء کے بارے میں قرآن بالصراحت کہتا ہے۔

"یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ اللہ کی راہ میں جان دینے والے مردہ ہیں۔ وہ تو زندہ ہیں۔ اپنے رب کے ہاں سے رزق پاتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا ہے۔ اس سے خوش ہیں اور اپنے پسماندگان کو بشارت دیتے ہیں کہ ہمیں یہاں کوئی غم نہیں۔ (آل عمران - ۱۶۹)

نہ صرف یہ نیک انسان نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ بلکہ بدترین سرکش اور مجرم بھی عذاب میں مبتلا ہیں۔ جیسا کہ ہم بعد از موت قبلِ قیامت آلِ فرعون کے معذب ہونے کے بارے میں اشارہ کر چکے ہیں۔

(سورۂ مومن - آیت ۴۶)

اور اس سلسلے میں روایات بھی حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ لہٰذا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ عالمِ برزخ ہے یا نہیں۔ اہم معاملہ یہ ہے کہ ہم معلوم کریں کہ حیاتِ برزخ کس قسم کی ہے۔ اس سلسلے میں روایات میں برزخ کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان میں زیادہ واضح یہ ہے :

اس زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد انسانی رُوح ایک لطیف جسم میں چلی جاتی ہے۔ یہ جسم اس کثیف مادے کے بہت سے عوارضات سے محفوظ ہے۔ لیکن چونکہ ہر لحاظ سے اسی دنیاوی جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس لیے اسے "قالبِ مثالی" یا "جسمِ مثالی" کہتے ہیں۔ یہ جسم نہ تو پوری طرح مجرد ہے اور نہ ہی پوری طرح مادی بلکہ ایک قسم کے "تجردِ برزخی" کا حامل ہے۔

بعض محققین نے اسے عالمِ خواب میں رُوح کی کیفیت سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں نعمتیں پا کر سچ مچ اسے لذّت محسوس ہو یا ہولناک مناظر دیکھ کر اسے تکلیف پہنچے۔ جیسا کہ ہمارے اس مادی جسم پر بھی ایسے خوابوں کا ردِعمل ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہولناک خواب دیکھے تو وہ چیختا ہے، پیچ و تاب کھاتا ہے اور اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔

یہاں تک کہ بعض کا نظریہ ہے کہ عالمِ خواب میں واقعاً رُوح قالبِ مثالی کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ بعض کا نظریہ

تو اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ یہ کہ قوی ارواح عالتِ بیداری میں بھی تجردِ برزخی حاصل کر سکتی ہیں۔ یعنی جسم مادی سے جُدا ہو کر اپنی مرضی سے یا مقناطیسی خوابوں کے ذریعے اسی قالبِ مثالی میں دُنیا کی سیر کر سکتی ہیں۔ اور مسائل سے آگاہ ہو سکتی ہیں۔[1]

بعض نے تو یہ بھی تصریح کی ہے کہ قالبِ مثالی ہر انسان کے باطن میں موجود ہے۔ البتہ موت کے وقت اور حیاتِ برزخ کے آغاز میں اس سے جُدا ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے، کبھی کبھی مادی زندگی میں بھی اس کا انسان سے جدا ہونا ممکن ہے۔

اب اگر ہم قالبِ مثالی کے لیے یہ تمام باتیں قبول نہ بھی کریں۔ تب بھی اصل مسئلے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بہت سی روایات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور عقلی اعتبار سے بھی اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ جسمِ مثالی کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ تناسخ پر اعتقاد ہے۔ کیونکہ تناسخ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ایک ہی رُوح مختلف جسموں میں منتقل ہو جائے۔ لیکن جو کچھ ہم سطورِ بالا میں جسمِ مثالی کے بارے میں کہہ چکے ہیں۔ اس سے اس اعتراض کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شیخ بہائی مرحوم نے بہت واضح جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

وہ تناسخ کہ جس کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ یہ ہے کہ اس بدن سے نکل کر رُوح اسی دُنیا میں کسی دوسرے بدن میں منتقل ہو جائے۔ جبکہ عالمِ برزخ میں قیامت تک کے لیے جسمِ مثالی سے رُوح کا تعلق اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ جسمِ مثالی سے رُوح پھر حکمِ خُدا سے پہلے والے جسم میں لوٹ آئے گی۔ اس کا نظریۂ تناسخ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تناسخ کا شدّت سے اس لیے انکار کرتے ہیں۔ اور اس کے معتقد کو کافر سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ ارواح کے ازلی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور اس بات کے قائل ہیں۔ کہ وہ ہمیشہ ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اور وہ لوگ دوسرے جہان میں معادِ جسمانی کے بالکل مُنکر ہیں۔[2]

جیسا کہ بعض نے کہا ہے کہ قالبِ مثالی اسی بدنِ مادی کے باطن میں ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر مسئلہ تناسخ کا جواب اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس لحاظ سے روح اپنے قالب سے دوسرے قالب کی طرف منتقل نہیں ہوتی، بلکہ اپنے

---

[1] بحار الانوار میں اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہُوئے علامہ مجلسی مرحوم تصریح کرتے ہیں۔

"بہت سی روایات میں برزخی حالت کو عالمِ خواب کے مشابہ قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ ممکن ہے، قوی اور بلند مرتبہ نفوس متعدد اجسامِ مثالی کے حامل ہوں۔ اس طریقے سے وہ روایات توجیہ و تاویل کی محتاج نہیں رہتیں کہ جن میں ہے کہ ہر شخص کی جان کنی کے وقت آئمہ اُس کے پاس آتے ہیں۔

(بحار الانوار، ج ۶ ص ۲۷۱)

[2] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۷۷)

ایک قالب کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنے دوسرے قالب کے ساتھ حیاتِ برزخ جاری و ساری رکھتی ہے۔

ایک سوال بیاں باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن مجید کی بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے لیے عالمِ برزخ نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ رُوم کی آیت ۵۵ اور ۵۶ میں ہے کہ کچھ مجرمین قیامت برپا ہونے کے بعد قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم گھڑی بھر سے زیادہ عالمِ برزخ میں نہیں رہے لیکن آگاہ مومنین انھیں فوراً کہیں گے کہ تم بحکمِ خدا روزِ قیامت تک ایک طویل مدت کے لیے ٹھہرے رہے ہو اور اب یومِ قیامت آگیا ہے۔

متعدد روایات میں اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ لوگ تین قسم کے ہیں۔

۱۔ خالص مومن

۲۔ خالص کافر

۳۔ درمیانے اور کمزور عقیدوں کے لوگ۔

ان روایات کے مطابق عالمِ برزخ پہلے اور دوسرے گروہ کے لیے مخصوص ہے۔ جبکہ تیسرا گروہ برزخ کا زمانہ ایک طرح کی بے خبری کی کیفیت میں طے کرے گا۔ (ان روایات سے زیادہ آگاہی کے لیے بحار الانوار جلد ۶ میں احوالِ برزخ و قبر کی بحث کی طرف رجوع کریں)

۱۰۱۔ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ○

۱۰۲۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

۱۰۳۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ○

۱۰۴۔ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِیْهَا كٰلِحُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ جس وقت صور پھونکا جائے گا تو ان کے درمیان کسی قسم کا نسب نہیں ہوگا۔ اور وہ ایک دوسرے سے مدد نہیں مانگیں گے۔ (چونکہ کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔)

۱۰۲۔ جن لوگوں کے (اعمال کے) ترازو وزنی ہیں، وہی کامیاب ہیں۔

۱۰۳۔ اور جن کے (اعمال کے) ترازو ہلکے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے وجود کو خسارے میں ڈال دیا ہے۔ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

۱۰۴۔ آگ کے جلا ڈالنے والے شعلے تلوار کی طرح ان کے چہروں پر پڑیں گے۔

اور جہنّم میں ان کے چہرے سکڑے ہوئے ہوں گے۔

تفسیر

بدکرداروں کی سزا کا ایک گوشہ

گذشتہ آیات میں عالم برزخ کے بارے میں گفتگو تھی اب زیر بحث آیات میں قیامت اور اُس جہان میں مجرموں کی حالت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جب صُور پھونکا جائے گا تو ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی نسب باقی نہیں رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ (فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون۔

ہم جانتے ہیں، کہ آیاتِ قرآنی کے مطابق دو مرتبہ صُور پھونکا جائے گا۔ ایک مرتبہ اس عالم کے ختم ہونے کے وقت اس وقت آسمانوں اور زمین کے سب رہنے والے مرجائیں گے اور موت پُورے عالم پر چھا جائے گی۔ جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سردے قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور انسان نئی زندگی پائیں گے۔ پھر ان کے حساب وکتاب اور جزا و سزا کا دور شروع ہوگا۔

"نفخ فی الصور" کا معنٰے ہے "بگل بجانا" لیکن اس کی ایک خاص تفسیر اور مفہوم ہے کہ جو ہم انشاء اللہ سورۂ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

بہر حال زیرِ بحث آیت قیامت کی دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتی ہے پہلی یہ ہے کہ اُس دن تمام نسب بے کار ہوجائیں گے۔ کیونکہ اس جہان میں موجود رشتہ داری کے نظام کے باعث بہت سے مجرم سزاؤں سے بچ جاتے ہیں۔ اسی طرح لوگ اپنی مشکلات کے حل کے لیے رشتہ داروں سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن روزِ قیامت انسان ہوگا اور اُس کے اعمال۔ یہاں تک کہ سگا بھائی بیٹا اور باپ بھی اس کے کام نہ آسکے گا اور اس کی سزا کوئی اپنے ذمہ نہ لے سکے گا۔

دوسری یہ کہ وحشت کا یہ عالم ہوگا کہ حساب اور عذابِ الٰہی کے خوف کی شدت سے لوگ ایک دوسرے سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں گے۔

اس روز ماں اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائے گی۔ بھائی بھائی کو فراموش کردے گا۔ سب مست دکھائی دیں گے۔ لیکن مست نہیں ہوں گے۔ عذابِ خدا بہت شدید ہے۔

جیسا کہ ہم نے سورۂ حج کی ابتدا میں پڑھا ہے:

یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت وتضع

کل ذات حمل حملھا وتری الناس سکاریٰ وما ھم بسکاریٰ ولٰکن عذاب اللہ شدید۔

اس روز تم دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی ہر عورت (وحشت کے مارے) اپنے شیر خوار کو بھول جائے گی۔ (خوف کے مارے) حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہوجائیں گے اور (گھبراہٹ میں) لوگ مستی میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ مستی میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی شدید ہے (کہ جس کے باعث لوگ بدحواس ہو رہے ہوں گے)

"ولا یتساءلون" کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مدد کا تقاضا نہیں کریں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوگا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ نفیِ سوال سے مراد یہ ہے۔ کہ لوگ نسب کے بارے میں پوچھیں گے بھی نہیں اور یہ "فلا انساب بینھم" کی تاکید ہے۔

البتہ پہلی تفسیر زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے اس جملے میں یہ تمام مفاہیم جمع ہوں۔

یہاں مفسرین کا ایک مشہور سوال بھی سامنے آتا ہے کہ متعدد قرآنی آیات سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے۔ کہ روزِ قیامت لوگ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ جیسا کہ سورۂ صافات کی آیت ۲۷ میں ہے کہ جب مجرمین دوزخ کی چوکھٹ پر ہوں گے تو،

واقبل بعضھم علٰی بعض یتساءلون۔

ایک دوسرے کی طرف رُخ کرکے (سرزنش آمیز) سوالات کریں گے۔

نیز اسی سورت کی آیت ۵۰ اہلِ بہشت کے متعلق کہتی ہے کہ وہ بہشت میں ٹھہرتے وقت اپنے اُن دنیا کے دوستوں کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے کہ جو جادۂ حق سے انحراف کے باعث دوزخ میں چلے گئے ہوں گے۔ ارشاد ہوتا ہے: فاقبل بعضھم علٰی بعضٍ یتساءلون۔

اس کی نظیر سورۂ فاطر کی آیت ۲۵ میں بھی ہے۔

تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیرِ بحث آیت تو کہتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے جبکہ مذکورہ بالا آیات سوال کرنے کا ذکر کر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ آیتیں آپس میں کیسے ہم آہنگ ہوسکتی ہیں۔

جواب یہ ہے کہ اگر ہم ان آیات کے معانی و مفاہیم پر کچھ غور و خوض کریں تو مسئلہ واضح ہوجاتا ہے کیونکہ ایک دوسرے سے سوال کرنے کا جن آیات میں آیا ہے۔ ان میں جنت میں جا پہنچنے یا جہنم کی دہلیز پر پہنچ جانے کے موقع کی بات کی گئی ہے۔ جبکہ سوال کی نفی قیامت کے ابتدائی مراحل سے مربوط ہے کہ جب وحشت و اضطراب کا یہ عالم ہوگا کہ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی اور دوسرے کی کوئی خبر نہ ہوگی۔

بالفاظِ دیگر قیامت کے کئی مرحلے ہیں اور ہر مرحلے کا اپنا الگ پروگرام ہے۔ بعض اوقات مختلف مراحل کی وجہ سے

اس قسم کے سوالات پیش آتے ہیں۔

قیام قیامت کے بعد پہلا مرحلہ اعمال کے وزن کا ہے۔ اس روز کے لیے معین ایک خاص میزان کے ذریعے انسان کے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ کچھ لوگوں کے اعمال بہت وزنی ہوں گے کہ جو ترازو کا پلڑا جھکا دیں گے۔ انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے، وہ لوگ کہ میزان میں جن کے اعمال کا وزن بھاری ہوگا۔ وہ فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں۔ (فمن ثقلت موازینہ فاولٰئک ھم المفلحون)۔

"موازین" "میزان" کی جمع ہے کہ جس کے ذریعے اعمال تولے جائیں گے۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہاں کوئی دو پلڑوں والا ایسا ترازو نصب ہوگا۔ کہ جس سے مادی چیزوں کو تولا جاتا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی مناسب ذریعے سے انسانی اعمال کی قدر و قیمت لگائی جائے گی۔

دوسرے لفظوں میں "میزان" کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ جس میں ناپ تول کے تمام ذرائع شامل ہیں۔ جیسا کہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز انسانوں کے اعمال کے ناپ تول کی میزان بلکہ خود انسانوں کی میزان عظیم پیشوا اور وہ انسان ہوں گے کہ جو ماڈل اور نمونہ ہیں۔ ایک حدیث میں ہے۔

امیر المؤمنین والائمة من ذریتہ ھم الموازین۔

امیر المومنین علیؑ اور ان کی ذریت میں سے جو امام ہیں وہی ناپ تول کے لیے میزان ہیں۔[1]

لہٰذا انسانوں اور ان کے اعمال کا موازنہ اس روز عظیم انبیاء اور ان کے اوصیاء کے ساتھ کیا جائے گا اور اس موازنے سے واضح ہو جائے گا۔ کہ لوگوں کے اعمال ان سے کس قدر مشابہت رکھتے ہیں۔

اسی سے صاحبِ وزن اور بے وزن، قیمتی اور بے قیمت افراد اور اعمال کا فرق واضح ہوگا۔

ضمناً "موازین" کو جمع کی صورت میں ذکر کرنے کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ جو عظیم پیشوا میزان اور معیار ہیں۔ وہ متعدد ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ عظیم انبیاء، آئمہ اور اللہ کے خاص بندے اپنی زندگی کے حالات کے لحاظ سے ایک جہت سے یا کئی پہلوؤں سے نمونہ اور ماڈل تھے۔ اس طرح سے ان میں سے ہر ایک اسی حوالے سے میزان ہوگا۔

رہے وہ افراد کہ جن کا پلڑا ایمان اور عمل صالح سے خالی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنا سرمایۂ وجود گنوا بیٹھے ہیں اور جنہوں نے نقصان اٹھایا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے۔ (ومن خفت موازینہ فاولٰئک الذین خسروا انفسھم فی جھنم خالدون)۔

"خسروا انفسھم" (انھوں نے خود اپنے وجود کا نقصان کیا ہے) یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ دنیا کے اس بازارِ تجارت میں اپنی ہستی اور وجود کا عظیم سرمایہ گنوا بیٹھے ہیں۔ اور اس کے بدلے وہ کوئی قیمتی چیز بھی حاصل

---

[1] بحار الانوار ج ۷، صفحہ ۲۵۱ (طبع جدید)

نہیں کر پائے انہیں جو دردناک عذاب ہوگا اگلی آیت میں اس کے ایک حصے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ آگ جلا ڈالنے والے شعلے کی تلوار کی مانند ان کے چہرل پر پڑیں گے (تلفح وجوھھم النار)۔ اور جہنم میں ان کی پریشانی اور عذاب کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ ان کے چہرے سکڑے ہوئے ہوں گے (وھم فیھا کالحون)

"تلفح" "لفح" (بروزن "فتح") کے مادہ سے دراصل "تلوار کی ضرب" کے معنے میں ہے اور چونکہ آگ کے شعلے، سورج کی شدید تیز روشنی اور بادِ سموم تلوار کی مانند انسان کے چہرے پر پڑتی ہیں۔ لہٰذا بطور کنایہ یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"کالح" "کلوح" (بروزن "غروب") کے مادے سے چہرے کے سکڑنے کے معنی میں ہے۔ بہت سے مفسرین نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ آگ کے تیز شعلوں کے باعث ان کے منہ سکڑ جائیں گے اور منہ کھلے کے کھلے رہ جائیں گے۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ **جس روز سب رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی:** انسانوں کی مادی زندگی کی حدود میں جو مفاہیم کارفرما ہیں۔ اُس جہان میں زیادہ تر ختم ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک خاندان اور قبیلے کا تعلق بھی ہے۔ اس دنیا میں یہ تعلق بہت سی مشکلات کے حل کا ذریعہ بنتا ہے اور بعض اوقات یہ تعلق خود ایک ایسا نظام بن جاتا ہے کہ معاشرے کے تمام نظاموں پر حاکم ہو جاتا ہے۔

لیکن آخرت میں زندگی کی قدریں ایمان اور عمل صالح سے ہم آہنگ ہوں گی۔ وہاں فلاں قبیلہ اور فلاں گروہ کا مسئلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہاں تو ایک خاندان کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مشکلات سے نجات دلاتے ہیں۔ مگر قیامت میں ایسا نہ ہوگا۔ وہاں نہ کثرتِ مال کوئی فائدہ پہنچا سکے گی۔ اور نہ اولاد کسی کام آسکے گی جیسا کہ ارشادِ ربّ العزّت ہے۔

یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔

اس روز نہ مال فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔ نجات تو صرف اسے حاصل ہوگی۔ کہ جو بارگاہِ الٰہی میں قلب سلیم لے کر حاضر ہوگا۔ (شعراء - ۸۸، ۸۹)

یہاں تک کہ اگر یہ نسب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جا پہنچے، تب بھی یہی قانون نافذ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰ کی تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں۔ بنی ہاشم کے بعض نہایت قریبی افراد کو ان کے عدم ایمان یا اسلام کے حقیقی راستے سے انحراف کی وجہ سے دھتکار دیا گیا اور ان سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ اگرچہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

---

[1] تفسیر قرطبی، تفسیر فخر الرازی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المیزان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

کل حسب ونسب منقطع یوم القیامة الّا حسبی ونسبی

روزِ قیامت میرے حسب[1] ونسب کے سوا تمام حسب ونسب منقطع ہو جائیں گے[2]

لیکن المیزان میں مرحوم علامہ سید محمد حسین طباطبائی رضوان اللہ علیہ کے بقول ایسا لگتا ہے کہ یہ وہی حدیث ہے جسے اہل سنت کے محدثین نے اپنی کتب میں کبھی عبداللہ بن عمر، کبھی خود عمر ابن خطاب اور کبھی دیگر اصحاب کے حوالے سے روایت کیا ہے جبکہ زیرِ بحث آیت بالکل ظاہری اور عمومی مفہوم رکھتی ہے۔ اور روزِ قیامت تمام انساب کے منقطع ہو جانے کی بات کرتی ہے۔ نیز قرآن حکیم سے جو اصول معلوم ہوتا ہے اور بے ایمان منحرف لوگوں سے رسول اللہؐ کے برتاؤ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ اس لحاظ سے تمام انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث مناقب ابن شہر آشوب میں طاؤس یمانی کی وساطت سے منقول ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

خلق اللہ الجنة لمن اطاع واحسن ولو کان عبداً حبشیاً،
وخلق النار لمن عصاہ ولو کان ولداً قرشیاً۔

اللہ نے بہشت اُس کے لیے پیدا کی ہے کہ جو اس کے حکم کی اطاعت کرے۔ اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو اور جہنم اُس نے اُس شخص کے لیے پیدا کی ہے کہ جو اس کی نافرمانی کرے۔ اگرچہ وہ قریشی ہی کیوں نہ ہو۔[3]

البتہ جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ سادات اور رسول اکرمؐ کی باتقویٰ اولاد کے خاص احترام کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ احترام خود ذاتِ پیغمبرؐ اور اسلام کا احترام ہے اور جو روایات سادات کی نفضیلت اور مقام و منزلت کے بارے میں ہوئی ہیں وہ بھی ظاہراً اسی مفہوم کی حامل ہیں۔

۲۔ "اصمعی" کی ہلا دینے والی داستان :

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصمعی کی وہ داستان نقل کی جائے جسے غزالی نے "بحر المحبة" میں نقل کیا ہے۔ یہ داستان گزشتہ باتوں کی شاہد بھی ہے، اور اس میں متعدد دیگر لطیف نکات بھی ہیں۔

"اصمعی" کہتا ہے :

میں مکہ میں تھا۔ ایک چاندرات تھی۔ میں خانۂ خدا کے گرد طواف کر رہا تھا۔ ایک بڑی دلنشیں اور درد

---

[1] لغت کے لحاظ سے "حسب" اُس اعزاز و افتخار کے معنی میں ہے کہ جو کسی انسان کے بزرگوں اور آباؤ اجداد کو حاصل ہو۔ بعض نے اس کا معنی خود انسان کی اپنی عادت اور اخلاق بھی بیان کیا ہے لیکن یہاں پہلا معنی ہی مراد ہے (کتاب لسان العرب میں مادہ "حسب" کی طرف رجوع کریں۔)

[2] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔ [3] مناقب ابن شہر آشوب (طبق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۵۶۳)۔

غم انگیز آواز سن کر میں متوجہ ہوا۔ میں اُس آواز والے کو تلاش کرنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک خوبصورت اور خوش قامت جوان پر پڑی نیکی کے آثار اُس سے نمایاں تھے۔ اور اُس نے خانہ کعبہ کا غلاف تھام رکھا تھا اور اس طرح سے مناجات کر رہا تھا۔

یا سیدی ومولای نامت العیون وغابت النجوم، وانت ملک حی قیوم، لا تأخذک سنة ولا نوم، غلقت الملوک ابوابھا واقامت علیھا حراسھا وحجابھا وقد خلی کل حبیب بحبیبه، وبابک مفتوح للسائلین، فھا انا سائلک ببابک، مذنب فقیر، خاطیٔ مسکین، جئتک ارجو رحمتک یا رحیم، وان تنظر الی بلطفک یا کریم۔

اے میرے سردار! اے میرے مولا! بندوں کی آنکھیں خوابِ غفلت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ آسمان کے تارے ایک ایک کر کے افقِ مغرب میں اُترتے جاتے ہیں۔ اور آنکھوں سے اوجھل ہوتے جاتے ہیں۔ تو خدائے حیّ و قیوم ہے، نہ تجھے نیند آتی ہے اور نہ اُونگھ تیرے دامنِ کبریائی کو چھو پاتی ہے۔ شب کی اس تاریکی میں، جبکہ بادشاہوں نے اپنے محلّات کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اور دربان ان پر پہرہ دے رہے ہیں۔ اور سب دوست اپنے دوستوں سے محوِ خلوت ہیں۔ ایسے میں ایک ہی گھر ہے، جس کا دروازہ سائلوں کے لیے کھلا ہے۔ اور وہ تیرے گھر کا دروازہ ہے۔

اس وقت میں تیرے دروازے پر آیا ہوں۔ خطاکار اور حاجت مند ہوں۔ اے رحیم تجھ سے رحمت کی امید باندھے میں آگیا ہوں، اے کریم تیرے لطف و کرم کی نظر چاہتا ہوں۔

پھر وہ جوان یہ اشعار پڑھنے لگا۔

یا من یجیب دعاء المضطر فی الظلم
یا کاشف الکرب والبلوی مع السقم
قد نام وفدک حول البیت وانتبھوا
وعین جودک یا قیوم لم تنم
ان کان جودک لا یرجوہ ذو سرف
فمن یجود علی العاصین بالنعم
ھب لی بجودک فضل العفو عن شرف
یا من اشار الیه الخلق فی الحرم

اے وہ کہ جو شب کی تاریکیوں میں مصیبت زدہ کی دعا قبول کرتا ہے۔

اے وہ کہ جو دُکھ درد اور رنج و بلا کو دُور کرتا ہے ؛

- تیرے گھر کے گرد تیرے مہمان سوتے بھی ہیں اور جاگتے بھی ہیں۔
لیکن ، اے قیوم ! تیرے جود و سخا کی آنکھ کبھی خواب آلود نہیں ہوتی۔
- اگر تیرے جود و احسان کی امید صرف ان کے لیے ہوتی، جو تیری بارگاہ میں باشرف ہیں، تو گنہگار کس کے دروازے پر جاتے اور کس سے بخشش کی امید رکھتے۔
- اپنے جود و کرم سے مجھے شرف یاب کر
اے وہ ذات کہ مخلوق حرم میں جس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد اس جوان نے آسمان کی طرف سر بلند کیا اور اس طرح اپنی مناجات جاری رکھیں ؛

الٰھی سیدی و مولای ! ان اطعتک بعلمی و معرفتی فلک الحمد والمنة علی وان عصیتک بجھلی فلک الحجة علی۔

میرے معبود ! میرے سردار ! میرے مولا ! اگر میں نے علم و معرفت کی بناء پر تیری اطاعت کی ہے تو حمد و ثنا تیرے لیے ہی زیبندہ ہے اور میں تیرا مرہونِ منت ہوں۔ اور اگر نادانی کے باعث میں نے تیری نافرمانی کی ہے تو تیری حجت میرے خلاف مکمل ہے۔

پھر آسمان کی طرف سر بلند کیا اور بلند آواز سے کہا :

یاالٰھی وسیدی ومولای ماطابت الدنیا الا بذکرک، وماطابت العقبی الا بعفوک، وماطابت الایام الا بطاعتک؛ وماطابت القلوب الا بمحبتک وماطابت النعیم الا بمغفرتک۔

اے میرے خدا ! اے میرے آقا ! اے میرے مولا ! دُنیا تیرے ذکر کے بغیر پاکیزہ نہیں ہے اور آخرت تیرے عفو کے بغیر شائستہ نہیں ہے، ایام زندگی تیری اطاعت کے بغیر بے قیمت ہیں، دل تیری محبت کے بغیر آلودہ ہیں اور نعمتیں تیری بخشش کے بغیر ناگوار ہیں۔

اصمعی کہتا ہے :

اس جوان نے مناجات کا سلسلہ یونہی جاری رکھا۔ کبھی اُس نے ہلا دینے والے اور دل گداز اشعار پڑھے اور کبھی اسی طرح اللہ کو پکارتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

میں اس کے قریب گیا۔ اس کے چہرے کے نور نے مجھے خیرہ کر دیا۔ چاند کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو متوجہ ہوا کہ وہ تو زین العابدین علی ابن الحسین امام سجاد

(علیہ السلام ہیں)

میں نے ان کا سر اپنے دامن میں رکھا۔ میں ضبط نہ کر سکا، ان کی اس حالت پر میں خوب رویا۔ میرے اشکوں کا ایک قطرہ ان کے چہرے پر جا گرا۔ انھیں ہوش آیا۔ تو آنکھ کھولی اور فرمایا۔

من الذی اشغلنی عن ذکر مولای ؟

کون ہے کہ جو میرے مولا کے ذکر میں حائل ہوا ہے ؟

میں نے عرض کیا میں اصمعی ہوں۔ ، اے میرے سیّد و آقا !

یہ کیسا گریہ اور کیسا اضطراب ؟ آپ تو خاندانِ نبوت ہیں، معدنِ رسالت ہیں۔ کیا آیتِ تطہیر آپ کے حق میں نازل نہیں ہوئی ؟ کیا خداوندِ عالم نے آپ کے بارے میں نہیں فرمایا ؟

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرًا۔

(بس اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ اے اہل بیت ! خدا تم سے رجس و ناپاکی دور رکھے اور تمھیں اس طرح سے پاک رکھے جیسے پاک رکھنے کا حق ہے)۔

امام اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا : اے اصمعی !

ھیھات ! ھیھات ! اللہ نے جنت اطاعت کرنے والوں کے لیے خلق فرمائی ہے چاہے وہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہوں۔ اور جہنم نافرمانوں کے لیے بنائی ہے چاہے وہ سردارِ قریش ہی کیوں نہ ہوں۔ کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا اور اللہ کی گفتگو نہیں سُنی کہ ؛

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون . . . . .

" جب صُور پھونکا جائے گا اور قیامت آ پہنچے گی تو سارے نسب ختم ہو جائیں گے، کوئی کسی سے سوال نہ کرے گا۔ صرف اعمال ہی پر دار و مدار ہو گا۔

اصمعی کہتا ہے ؛

میں نے یہ دیکھا، تو وہاں سے اُٹھا۔ آپ کو وہاں چھوڑا اور خود ایک طرف کو چل پڑا۔ [1]

۴۔ سزا اور گناہ میں مناسبت : ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ کہ قیامت میں بلکہ اس جہان میں بھی عذابِ الٰہی انجام کردہ گناہوں کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ جرم کچھ ہو اور سزا اس کے حسب حال نہ ہو۔

---

[1] بحر المحبۃ از غزالی ص ۱۴۲ تا ۱۴۴ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

۱۰۶۔ وہ کہیں گے : پروردگارا ! ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی اور ہم گمراہ لوگ تھے ۔

۱۰۷۔ پروردگارا ! ہمیں اس سے باہر لے جا ، اگر پھر ہم نے ایسا کیا تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے ۔ (اور عذاب کے مستحق ہوں گے) ۔

۱۰۸۔ (اللہ) کہے گا : دُور ہو جاؤ جہنم میں ، اور مجھ سے بات نہ کرو ۔

۱۰۹۔ (بھول گئے ہو) میرے بندوں میں سے ایک گروہ تھا کہ جو کہا کرتا تھا ! اے ہمارے رب ! ہم ایمان لائے ہیں ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے ۔

۱۱۰۔ لیکن تم نے ان کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ تم میری یاد سے غافل ہو گئے اور تم ان پر ہنستے تھے ۔

۱۱۱۔ مگر آج میں نے انھیں ان کے صبر و استقامت کی بناء پر جزا دی ہے اور وہ کامیاب ہیں ۔

تفسیر

مجھ سے بات نہ کرو

گذشتہ آیات میں اہل جہنم کی سخت سزا کے بارے میں بات کی گئی تھی۔ زیر بحث آیات میں اُن سے پروردگار کی کچھ گفتگو بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالےٰ عتاب آمیز لہجے میں اُن سے کہتا ہے، کیا میری آیات تمہارے سامنے پڑھی نہ جاتی تھیں ۔ جبکہ تم ان کی تکذیب کرتے تھے (الم تکن اٰیاتی تتلٰی علیکم فکنتم بها تکذبون)[1]

[1] اس جملے میں درحقیقت کچھ الفاظ محذوف ہیں اور تقدیر میں یہ جملہ یوں تھا۔ ایقول اللہ تعالیٰ الم تکن . . . .

کیا میں نے کافی واضح آیات اور دلائل اپنے پیغمبروں کے ذریعے تمہارے لیے نہ بھیجے تھے۔ کیا میں نے تم پر حجت تمام نہ کردی تھی۔ لیکن تم نے ہمیشہ انکار اور تکذیب کی راہ اپنائی۔

"تتلٰی" اور "تکذبون" دونوں فعل مضارع ہیں اور تسلسل پر دلالت کرتے ہیں ، ان الفاظ سے خاص طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیہم ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہوتی اور وہ مسلسل ان کی تکذیب کرتے رہے۔

اس سوال کے جواب میں وہ اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں : جی ہاں! ایسا ہی ہے اے ہمارے پروردگار! لیکن ہماری بدبختی ہم پر غالب آئی اور ہم گمراہ لوگ تھے (قالوا ربنا غلبت علینا شقوتنا وکنا قومًا ضالین) ۔

"شقوة" اور "شقاوة" "سعادة" کی ضد ہے اور ابتلا ، سزا اور مصیبت کے اسباب فراہم ہونے کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو دامن گیر ہونے والی آفت اور مصیبت کو "شقاوة" کہتے ہیں۔ جبکہ "سعادت" نعمت اور نیکی کے اسباب فراہم ہونے کے معنے میں ہے۔ بہرحال شقاوت اور سعادت دونوں ہمارے ہی اعمال، نیتوں اور گفتار کے نتیجے کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ عقیدہ ایک تصور کے سوا کچھ نہیں کہ خوش بختی و بدبختی انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے ۔ یہ عقیدہ تمام نبیوں، راہنماؤں اور انسانیت کے معلّموں کی دعوت اور مساعی کے خلاف ہے ۔ یہ عقیدہ ذمہ داریوں سے فرار کا دوسرا نام ہے ۔ یہ تصور درحقیقت غلط کاموں اور تباہ کاریوں کی توجیہ کے لیے بنایا گیا ہے۔ یا جہالت کی توجیہ کے لیے گھڑا گیا ہے۔

اسی بنیاد پر دوزخی گناہ گار صراحت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ خدا کی طرف سے اتمام حجت ہو گیا تھا۔ لیکن ہم نے اپنے ہاتھوں اپنی بدبختی کے وسائل فراہم کیے اور ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم گمراہ لوگ تھے ۔

شاید یہ اعتراف کر کے وہ اللہ کی رحمت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ساتھ ہی کہتے ہیں : "پروردگارا! ہمیں اس آگ سے باہر نکال" اور پھر دنیا کی طرف بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل انجام دے سکیں (ربنا اخرجنا منها) ۔

اگر ہم وہی پہلے سے طرزِ عمل کا مظاہرہ کریں تو پھر ہم یقیناً ظالم ہوں گے اور تیری بخشش کے لائق نہیں ہوں گے۔ (فان عدنا فانا ظالمون ۔

وہ یہ گفتگو ایسے کریں گے۔ کہ گویا وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ دارِ آخرت دارِ جزا ہے نہ کہ دارِ عمل اور دُنیا کی طرف لوٹ کر جانا ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پوری قاطعیت سے جواب دیتا ہے ؛ دُور ہو جاؤ ، یونہی جہنم میں رہو۔ چپ رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو (قال اخسئوا فیها ولا تکلمون)۔

"اخسئوا" فعل امر ہے۔ عام طور پر یہ لفظ کتے کو دھتکارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اگر انسان کے لیے استعمال ہو تو اس کی پستی اور سزا کے مستحق ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس دھتکارنے کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : کیا تم بھول گئے ہو کہ میرے کچھ خاص

بندے کہتے تھے: پروردگارا! ہم ایمان لائے ہیں، ہمیں بخش دے، ہم پر رحم کر اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔ (انہ کان فریق من عبادی یقولون ربنا اٰمنا فاغفرلنا وارحمنا وانت خیر الراحمین)۔

لیکن تم نے ان کا مذاق اڑایا اور اس معاملے میں اتنی ہٹ دھرمی کی کہ اس تمسخربازی نے تمھیں یادِ خدا سے بالکل غافل کردیا (فاتخذتموھم سخریًّا حتّٰی انسوکم ذکری)۔

تم مسلسل ان پر ہنستے رہے اور ان کی باتوں، ان کے عقائد اور ان کے طرزِ عمل پر مسکراتے رہے (وکنتم منھم تضحکون)۔

لیکن آج - اُن کے صبر و استقامت کے باعث، تمھارے تمسخر کے مقابلے میں پامردی کی وجہ سے اور الٰہی پروگراموں پر بغیر ڈگمگائے قائم رہنے کے سبب ہم نے انھیں جزا دی ہے اور وہ کامیاب و کامران ہیں۔ (انی جزیتھم الیوم بما صبروا انھم ھم الفائزون)۔

لیکن تم تو آج بدترین انجام اور دردناک ترین عذاب میں گرفتار ہو اور کوئی تمہاری فریاد کو نہیں پہنچتا اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ تم اسی سزا کے مستحق ہو۔

گویا ان آخری چار آیتوں میں اہلِ جہنم کی بدبختی کا اور اہلِ بہشت کی کامیابی کی اصل وجہ صراحت سے بیان کردی گئی ہے۔

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جنہوں نے اپنی بدبختی اور گمراہی کے اسباب اپنے ہاتھوں فراہم کیے ہیں یہ لوگ حق کے طرف داروں کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے پاکیزہ عقائد کی تحقیر کرتے تھے۔ لہٰذا اس انجام کو پہنچے ہیں کہ وہ اس خطاب کے بھی لائق نہیں کہ جو ایک انسان کو کیا جاتا ہے۔ جی ہاں! انہوں نے مومنین کی تحقیر کی تھی۔ لہٰذا اُنہیں تحقیر و تذلیل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جنہوں نے مغرور، خود پسند اور بے منطق دشمنوں کے مقابلے میں راہِ خدا میں مسلسل پامردی، صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا لہٰذا انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں سب سے بڑی کامیابی حاصل کرلی۔

۱۱۲۔ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ○

۱۱۳۔ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ○

۱۱۴۔ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

۱۱۵۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○

۱۱۶۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ○

ترجمہ

۱۱۲۔ (خدا) کہے گا: تم زمین میں کتنے برس رہے ہو؟

۱۱۳۔ وہ جواب میں کہیں گے: ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ ہم ٹھہرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لے۔

۱۱۴۔ وہ کہے گا (ہاں) تم تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہو، کاش تم یہ جان لیتے۔

۱۱۵۔ لیکن کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تمھیں فضول پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے۔

۱۱۶۔ پس (اس سے کہ تمھیں بے کار پیدا کرے) بزرگ و برتر وہ خدا کہ جو فرماں

روائے حق ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عرشِ کریم کا پروردگار ہے۔

تفسیر

اس دُنیا کی عمر تھوڑی ہے

گذشتہ آیات میں اہلِ جہنم کی سزا کا کچھ ذکر تھا۔ زیرِ نظر آیات میں ایک اور قسم کی سزا کا ذکر ہے۔ یہ نفسیاتی سزا، خدا کی طرف سرزنش کی صورت میں ہے۔ فرمایا گیا ہے: اس روز اللہ انھیں مخاطب کرتے ہُوئے کہے گا۔ کہ تم زمین پر کتنے سال رہے ہو۔ (قال کم لبثتم فی الارض عدد سنین)۔

اس آیت میں لفظ "الارض" کی موجودگی اور دیگر قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ ایامِ آخرت کا موازنہ کرتے ہُوئے دُنیا میں ان کی عُمر کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں عالمِ برزخ میں ان کی مُدتِ قیام کے بارے میں سوال مراد لیا ہے۔ یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے اگرچہ بعض دوسری آیات میں اس سلسلے میں کچھ شواہد ملتے ہیں۔ [1]

---

[1] سورۂ رُوم کی آیت ۵۵ اور ۵۶ میں ہے:

ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون مالبثوا غیر ساعة کذٰلک کانوا یؤفکون وقال الذین اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم فی کتاب اللہ الٰی یوم البعث فھٰذا یوم البعث ولٰکنکم کنتم لا تعلمون۔

جب قیامت برپا ہوگی تو مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک ساعت سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ جی ہاں! وہ اسی طرح دنیا میں بھی جھوٹ بولا کرتے تھے۔ لیکن جو اہلِ علم و ایمان ہیں وہ اُن سے کہیں گے: تمھارے وہاں ٹھہرنے کی مدت کتابِ الٰہی میں ثبت ہے اور تم روزِ قیامت تک وہاں ٹھہرے ہو اور اب قیامت آن پہنچی ہے اور قبروں سے اُٹھنے کا دن ہے۔ مگر تم جانتے نہ تھے۔

آیت نشاندہی کرتی ہے کہ اس میں برزخ میں ٹھہرنے کے بارے میں سوال و جواب ہو رہا ہے اور اگر اسے زیرِ بحث آیات کے لیے قرینہ قرار دیں تو یہاں کا مفہوم بھی برزخ میں ٹھہرنا ہوگا۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، زیرِ بحث آیات میں ایسے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن اس موازنے میں انھیں دنیاوی زندگی اس قدر کم دکھائی دے گی کہ وہ جواب میں کہیں گے، ہم تو صرف ایک دن یا دن کا ایک حصّہ ہی دنیا میں ٹھہرے ہیں۔" (قالوا لبثنا یومًا او بعض یوم)۔

درحقیقت دنیا کی لمبی عمریں بھی حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں ایک زود گزر لحظے کی مانند ہیں۔ کیونکہ وہاں کی نعمتیں بھی جاودانی ہیں اور سزائیں بھی لامحدود۔

اپنی بات پر زور دینے کے لیے یا زیادہ دقیق جواب کے طور پر مزید کہیں گے: خداوندا! اُن سے پُوچھ لے کہ جو اچھی طرح حساب و کتاب کر سکتے ہیں اور اعداد و شمار کا ایک دوسرے سے موازنہ کر سکتے ہیں (فسئل العادین)۔

ہوسکتا ہے "عادین" (شمار کرنے والے)۔ سے مراد فرشتے ہوں کہ جو انسانی عُمر اور اعمال کا بہت باریک بینی سے تفصیلی حساب رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس حساب کو ہر شخص سے بہتر جانتے ہیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ سرزنش کے طور پر فرمائے گا: جی ہاں! تم دُنیا میں بہت کم مُدت ہی ٹھہرے ہو۔ اگر تم جان لیتے (قال ان لبثتم الا قلیلًا لو انکم کنتم تعلمون)۔

واقعًا وہ اسی روز اس حقیقت کو سمجھ سکیں گے کہ دنیاوی زندگی حیاتِ اخروی کے مقابلے میں ایک دن یا ایک گھڑی سے زیادہ نہیں لیکن جب وہ اس جہان میں تھے تو ان کی فکر و نظر پر غفلت و غرور کے ایسے پردے پڑے تھے کہ وہ دُنیا کو جاودانی اور آخرت کا خواب و خیال یا ادھار کا وعدہ خیال کرتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جی ہاں! اگر تم اس حقیقت کو دنیا ہی میں پا لیتے کہ جسے آخرت میں پا لو گے تو اسی دُنیا میں تم بامعرفت ہو جاتے۔ [1]

اگلی آیت میں ان لوگوں سے ایک اور بہت مؤثر سبق آموز اور بیدارکُن حوالے سے بات کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے: کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں فضول پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے (افحسبتم انما خلقناکم عبثًا وانکم الینا لا ترجعون)۔

اس مؤثر اور پُر معنی جملے میں قیامت، حساب و کتاب اور جزائے اعمال کے لیے ایک مضبوط دلیل پیش کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر سچ مچ قیامت نہیں ہے تو دنیاوی زندگی عبث اور فضول ہے۔ کیونکہ اس جہان کی زندگی۔ اپنی تمام تر مشکلات کے ساتھ اور اس کے لیے خدا کی طرف سے بنائے گئے، تمام پروگراموں اور پورے نظام کے ساتھ ——

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) زیادہ قوی قرائن موجود ہیں کہ جو نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں سوال و جواب دنیا میں ٹھہرنے سے مربوط ہے۔

[1] جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس کے مطابق اس آیت میں "لو" شرطیہ ہے اور ایک جملہ مقدر ہے اور مجموعی طور پر جملہ یوں بنتا ہے۔

لو انکم کنتم تعلمون، علمتم انکم مالبثتم الا قلیلا۔

لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "لو" یہاں پر "لیت" کے معنی میں ہے۔ اس لحاظ سے جملے کا یہ معنی ہوگا۔

"اے کاش! تم اس بات کو دُنیا میں جان لیتے۔"

اگر صرف انہی چند دنوں سے ہے تو بہت ہی فضول اور بے معنی ہے۔ اس سلسلے میں "چند اہم نکات" کے زیر عنوان ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔

نیز خلقت کا عبث ۔۔ چونکہ اہم بات ہے اور اس کے لیے محکم دلیل کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: وہ ۔۔ کہ جو فر۔۔ ہے حق ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عرش کریم کا پروردگار ہے اور وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس عا۔۔ بے کار پیدا کرتا۔ (فتعالى الله الملك الحق لا اله الا هو رب العرش الكريم)۔

درحقیقت فضول ۔۔ مقصد کام تو وہ کرتا ہے کہ جو جاہل، ناتواں یا ذاتی طور پر باطل اور فضول ہو لیکن وہ خدا کہ جس میں کمال کی تمام صفات ۔۔ ایسا نہیں کر سکتا۔ "اللہ" وہ خدا ہے کہ جو تمام عالم ہستی کا فرماں روا اور مالک ہے۔

(الملك)

وہ خدا کہ جو حق ہے ا۔۔ سوا جس سے کوئی چیز صادر نہیں ہوتی۔ (الحق)

کیسے ممکن ہے ۔۔ خلقت بے مقصد و عبث ہو۔

اور اگر کسی کو یہ خیال ۔۔ اُسے مقصد تک پہنچنے سے باز رکھ سکتا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ "لا الٰہ الا ھو" اس خیال کی نفی ہے ۔۔ کے سوا خدا ہے ہی نہیں کہ جو اُس کی راہ میں حائل ہو سکے اور "رب العرش الكريم" کہہ کر ربوبیت خدا کے ۔۔ تاکید کی گئی ہے۔ اس کا مفہوم ہے "مالکِ مصلح" اور یہ جملہ عالم ہستی کے بامقصد ہونے کو مشخص کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ۔۔ لفظ الله ۔۔ خدا کی تمام صفات کمال کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ ذکر کرنے کے علاوہ اس آیت میں اس کی چار صفات کو صراحت ۔۔ بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ خدا کی مالکیت و حاکمیت

۲۔ اس کے وجود کی حقانیت

۳۔ اس کا لاشریک ہونا

۴۔ اس کا مقام ربوبیت

اور یہ تمام صفات ا۔۔ ت پر دلالت کرتی ہے کہ وہ کوئی کام بے مقصد نہیں کرتا اور اُس نے دنیا اور انسانوں کو فضول و عبث پیدا نہیں کیا۔

جیسا کہ ہم قبل ازیں کہہ چکے ہیں کہ "عرش" تمام جہانِ ہستی کی طرف اشارہ ہے کہ جو درحقیقت حکومت الٰہی کے ماتحت ہے (کیونکہ باعتبار لغت "عرش" بلند پایوں والے تخت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ خصوصاً صاحب اقتدار کے تختِ حکومت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہ تعبیر یہاں حکومتِ الٰہی کی قلمرو کی طرف اشارہ ہے)

قرآن مجید میں لفظ "عرش" کا مفہوم کیا ہے؟ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۴ میں سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں رجوع کیجیے۔

اب یہ سوال رہ گیا کہ "عرش" کی صفت "کریم" کیوں ذکر ہوئی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل لفظ "کریم" کا معنیٰ ہے شریف، فائدہ مند، عمدہ اور اچھا اور عرش الٰہی چونکہ ان صفات کا حامل ہے۔ اس لیے اسے "کریم" کہا گیا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ لفظ "کریم" ہمیشہ کسی عاقل وجود مثلاً خدا اور انسانوں کے لیے ہی استعمال نہیں، بلکہ عربی زبان میں اس کے علاوہ بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

چنانچہ سورۂ حج کی آیت ۵۰ میں صالح مومنین کے بارے میں بولا گیا ہے۔

لهم مغفرة ورزق كريم

ان کے لیے مغفرت اور رزق کریم (پُربرکت روزی) ہے۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے۔ یہ صفت، کم اہم نیکوں اور خوبیوں کے لیے استعمال نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ نہایت اہم مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

موت زندگی کا خاتمہ نہیں

ہم کہہ چکے ہیں کہ قیامت کی بحث میں ایک دوسرے عالم کے وجود کے لیے ایک دلیل خود اسی عالم کے نظام کا مطالعہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ "نشاۃ اولیٰ" گواہی دیتی ہے کہ اس کے بعد "نشاۃ اُخریٰ" بھی ہے۔

یہاں ہم اس سلسلے میں کچھ مزید وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں، جہاں خلقت بہت عظیم بھی ہے اور منظم بھی، ہر لحاظ سے یہ عالم نہایت پُرشکوہ اور تعجب انگیز ہے۔ اس کائنات کے اسرار اس قدر ہیں کہ عظیم سائنسدان اور دانش ور معترف ہیں کہ انسان کی تمام معلومات ایک ضخیم کتاب کے مقابلے میں ایک چھوٹے سے صفحے کی مانند ہیں۔ بلکہ اس کائنات کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ درحقیقت اس کتاب کی الف ب ہے۔

اس عالم کی ہر ایک عظیم گلیکسی کئی ارب ستاروں پر مشتمل ہے اور ان کہکشاؤں کی تعداد اور ایک دوسرے سے فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ روشنی کی رفتار کی بنیاد پر بھی اس کا حساب بہت مشکل ہے، جبکہ روشنی کی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔

اس جہان کی ایک چھوٹی سے چھوٹی اکائی کی ساخت میں جو نظم اور شعور استعمال ہوا ہے۔ وہی ہے کہ اس جہان کی عظیم اکائی میں نظر آتا ہے۔ انسان کو ہم اس کائنات کے کامل ترین موجود کے طور پر پہچانتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انسان اس جہان کا شاہکار ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں۔ جسے عالم ہستی کا شاہکار سمجھا گیا ہے۔ یعنی انسان اپنی اس مختصر سی عمر میں کس قسم کی پریشانیوں میں پڑا ہوتا ہے۔ ابھی بچپن گزر نہیں پاتا کہ جوانی کا طوفانی اور ہیجان انگیز دور آ پہنچتا ہے اور ابھی جوانی کی بہار قدم

جو انہیں پاتی کہ بڑھاپے کا قابلِ رحم دور آپہنچتا ہے۔

کیا یہ بات قابلِ یقین ہے کہ اتنی بڑی کائنات اور اس کا شاہکار یہ انسان' بس اسی دور کے لیے ہو' بس یہی مقصد ہو کہ یہ انسان اس عالم میں رنج و تکلیف کے یہ تین دور گزارے، کھائے، پیئے، لباس پہنے، سوئے جاگے اور پھر ختم ہو جائے اور سب کچھ اپنے انجام کو پہنچ جائے؟

اگر سچ مچ ایسا ہی ہو تو کیا یہ خلقت مہمل اور فضول نہیں ہے۔ کیا کوئی عاقل اس سارے نظام اور اتنی عظیم کائنات کو اس معمولی سے ہدف کے لیے قائم کر سکتا ہے۔

فرض کریں کئی ملین سال انسان اس دُنیا میں باقی رہے اور کئی نسلیں یکے بعد دیگرے آئیں اور جائیں، سائنسی علوم اس قدر ترقی کریں۔ کہ انسان کو بہترین غذا، لباس، مکان اور دیگر نہایت اعلیٰ سہولیات حاصل ہو جائیں ــــ لیکن کیا یہ کھانا، پینا پہننا سونا اور جاگنا اتنی قدر و قیمت رکھتا ہے کہ اس کے لیے ایسی کائنات پیدا کی جائے؟

لہٰذا اگر اس عظیم کائنات ہی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے یہ دنیا ایک زیادہ وسیع دنیا کے لیے ایک تمہید ہے۔ ایسی وسیع دنیا کہ جو جاودانی و دائمی ہے۔ ایسے عالم کا وجود ہی ہماری زندگی کو کوئی مفہوم عطا کر سکتا ہے اور اسے فضول ہونے سے بچا سکتا ہے۔

لہٰذا کوئی عجیب بات نہیں اگر مادہ پرست فلسفی کہ جو قیامت اور دوسرے جہان پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اس عالم کو بے مقصد سمجھیں اور واقعاً اگر ہم بھی ایسے عالم پر ایمان نہ رکھتے ہوتے تو ہم بھی اُن کے ہم آواز ہوتے ۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر موت ہی انسان کا انجام اور خاتمہ ہوتا تو خلقتِ عالم بے مقصد ہوتی۔ اسی لیے سورۂ واقعہ کی آیت ۶۲ میں ہے۔

ولقد علمتم النشاۃ الاولیٰ فلولا تذکرون

تم نے اس نشاۃ الاولیٰ اور عالم کے اس دور اوّل کو دیکھا تو کیوں متوجہ نہیں ہوتے ہو اور اس کے بعد کے عالم پر ایمان نہیں لاتے ہو۔

۱۱۷۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ○

۱۱۸۔ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۱۷۔ اور جو شخص خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے گا۔ یقیناً اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہ ہوگی۔ اس کا حساب تمہارے رب کے پاس ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ کافر کامیاب نہ ہوں گے۔

۱۱۸۔ اور کہہ دے: پروردگارا! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر کہ تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر

کامیاب اور ناکام

گذشتہ آیتوں میں معاد اور صفاتِ الٰہی کے بارے میں گفتگو تھی۔

اب زیرِ بحث پہلی آیت میں توحید اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی گئی ہے اور مبدا و معاد کا ذکر کر کے جاری بحث کو مکمل کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو شخص خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود کے طور پر پکارتا ہے۔ یقیناً اس کے پاس اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے (ومن یدع مع اللہ الٰھًا اٰخر لا برھان لہ بہٖ فانما حسابہ عند

ربہ) [1]

جی ہاں! مشرکین کا گذارہ صرف دعوے پر ہے ۔ بڑوں کی اندھی تقلید یا ایسی ہی فضول و بے بنیاد باتیں اُن کا سہارا ہیں۔ ان واضح دلائل کے باوجود وہ معاد کا انکار کرتے ہیں ۔لیکن شرک کو باوجود کوئی دلیل نہ ہونے کے قبول کیے ہوئے ہیں ۔ یقیناً خداوند عالم ایسے لوگوں سے حساب ضرور لے گا کہ جنہوں نے حکم عقل کو ٹھکرا دیا ہے اور جان بوجھ کر شرک کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : کافر لوگ کامیاب نہیں ہوں گے ،" اور ان کا انجام اس خدائی حساب سے ہی واضح ہو جائے گا۔ (انہ لا یفلح الکافرون)۔

کیا عمدہ ہے کہ اس سورت کا آغاز " قد افلح المؤمنون" سے ہوا ہے۔ اور اس کی بحث " لا یفلح الکافرون" پر ختم ہو رہی ہے اور یہ ہے مومنین اور کافرین کی زندگی کی اوّل تا آخر منظر کشی ۔

اس سورۂ شریفہ کی آخری آیت میں رُوئے سخن پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے ایک عمومی نتیجہ کے طور پر ارشاد ہوتا ہے ۔ کہہ دے : پروردگارا! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے (وقل رب اغفر وارحم وانت خیر الرّاحمین)۔

اب جب کہ ایک گروہ شرک کی بے راہ روی میں سرگرداں ہے اور ایک جماعت ظلم و ستم میں گرفتار ہے تو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے ، اپنے تئیں اس کے لطف و کرم کی پناہ میں دے دے اور اس سے بخشش طلب کر ۔

یقینی بات ہے کہ خطاب اگرچہ پیغمبرِ اکرمؐ سے ہے ، مگر یہ حکم مومنین کے لیے ہیں۔

ایک روایت میں ہے۔

اس سورت کی ابتدار اور انتہاء عرشِ الٰہی کے خزانوں میں سے ہے ۔ جو شخص اس کی ابتدائی تین آیتوں پر عمل کرے گا اور آخری چار آیتوں سے نصیحت حاصل کرے گا وہ اہلِ نجات و فلاح میں سے ہوگا۔ [2]

بعید نہیں کہ پہلی تینوں آیتوں سے مراد " قد افلح المؤمنون " کے بعد آنے والی آیات ہوں کہ جن میں سے ایک نماز میں خشوع کی دعوت دیتی ہے ، دوسری ہر قسم کے بے ہودہ کام سے پرہیز کی طرف بلاتی ہے ۔ اور تیسری

---

[1] بعض مفسرین " یدع مع اللہ" میں جو شرط ہے ۔ " فانما حسابہ عند ربہ" کو اس کی جزاء سمجھتے ہیں اور لا برھان لہ' بہ کو شرط و جزا کے درمیان جملۂ معترضہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن بعض دیگر مفسرین " لا برھان لہ' بہ" کو جزائے شرط سمجھتے ہیں" انما حسابہ " کو تفریع قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ احتمال عربی زبان کے قواعد سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔ کیونکہ ایسے مواقع پر جزاء پر "فاء" ہونا چاہیئے ۔ یعنی " لا برھان لہ" ہونا چاہیئے ۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ صفت یا حال ہے ۔

لیکن ۔ پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ اگرچہ معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے ۔

[2] تفسیر فخر الدین رازی ، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں ۔

ادائے زکوٰۃ پر ابھارتی ہے ۔ ان میں سے ایک انسان کا خدا سے رابطہ قائم کرتی ہے ، دوسری اسے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرتی ہے اور تیسری اس کا تعلق مخلوقِ خدا سے استوار کرتی ہے ۔ نیز ممکن ہے آخری چار آیتوں سے آیت ۱۱۵ کے بعد کی آیات مراد ہوں کہ جن میں کائنات کے فضول نہ ہونے کا ذکر ہے ، معاد قیامت کا تذکرہ ہے ، توحید کا ذکر ہے اور پھر انقطاع الی اللہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

بارِ الٰہا! ان مومنین کے صدقے کہ جن سے تو نے اس سورۃ میں کامیابی کا وعدہ کیا ہے کہ جن کے سردار رسول اللہؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ ہیں ہمیں ان کی صف میں سے قرار دے اور فلاح کا نام ہمارے نام بھی لکھ دے

خداوندا! ہم پر اپنی مغفرت و رحمت نازل فرما کہ تو ارحم الراحمین ہے ۔

پروردگارا! ہم سب کی عاقبت بخیر فرما اور ہر قسم کی لغزش و انحراف سے محفوظ رکھ ۔

انک علی کل شیء قدیر

سورۂ مومنون اختتام کو پہنچی

۲۵ محرم الحرام ۱۴۰۲ - کی شب

سورۂ نور

۱۔ مدینہ میں نازل ہوئی

۲۔ اس میں ۶۴ آیتیں ہیں

سورۂ نور کی فضیلت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من قرء سورۃ نور اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد کل مؤمنۃ ومؤمن فیما مضیٰ و فیما بقی۔

جو شخص سورۂ نور کو پڑھے (اور اس کے مطالب و احکام کو اپنی زندگی پر منطبق کرے) اللہ اُسے تمام گزشتہ و آئندہ مومنات اور مومنین کی تعداد کے برابر دس نیکیاں بطور اجر دے گا۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

حصنوا اموالکم و فروجکم بتلاوۃ سورۃ نور و حصنوا بھا نساءکم، فان من ادمن قرأتھا فی کل یوم او فی کل لیلۃ لم یزن احد من اھل بیتہ ابداً حتی یموت

سورہ نور کی تلاوت کے ذریعے اپنا مال تلف ہونے سے بچاؤ، اپنا دامن بے عفتی سے آلودہ ہونے سے محفوظ رکھو اور اپنی خواتین کو اس کے احکام کے زیرِ سایہ انحرافات سے بچاؤ کیونکہ جو شخص ہر روز یا ہر شب ہمیشہ اس کی تلاوت کرے گا اس کے خاندان میں سے کوئی شخص آخرِ عمر تک خلافِ عفت کام میں مبتلا نہیں ہوگا۔[1]

اگر ہم سورہ نور کے مضامین پر توجہ رکھیں تو دیکھیں گے کہ وہ طرح طرح کے موثر طریقوں سے راہِ عفت سے انحراف کے عوامل کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ اسی سے مندرجہ بالا حدیث کا اصلی نکتہ اور عملی مفہوم واضح ہوتا ہے۔

سورۂ نور کے مضامین

اس سورت کو درحقیقت پاکدامنی وعفت کی اور جنسی بے راہ رویوں کے خلاف جہاد کی سورت قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں معاشرے کو جنسی انحرافات سے پاک رکھنے کے مختلف طریقوں کے بارے میں، مختلف حوالوں سے گفتگو کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں اس کے مضامین کو مندرجہ ذیل مختلف مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا مرحلہ: یہ مرحلہ زانی عورت اور زانی مرد کی سزا کے بارے میں ہے۔ یہ سزا اس سورت کی دوسری آیت میں بڑی قطعی اور حتمی صورت میں ذکر کی گئی ہے۔

دوسرا مرحلہ: اس مرحلے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس شدید حد کو جاری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اسلام کے قضائی قوانین اور اصولوں کے لحاظ سے اس سزا کے اجراء کے لیے نہایت سخت شرائط معین کی گئی ہیں۔ کوئی غیر مرد کسی عورت پر زنا کا الزام

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۵۶۸ بحوالہ "ثواب الاعمال" از شیخ صدوق اور تفسیر مجمع البیان اسی سورت کے ذیل میں۔

لگائے تو اُس کے لیے چار گواہوں کی شرط ہے اور اگر مرد اپنی بیوی پر الزام لگائے تو اس کے لیے "لعان" کا قانون ہے جس کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے اور اسلامی عدالت میں اپنے اس الزام کو ثابت نہ کر سکے تو خود اسے سخت سزا بھگتنا پڑے گی (اور یہ سزا حدِ زنا کے پانچ میں سے چار حصوں کے برابر ہوگی) یہ اس لیے ہے تاکہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کسی پر الزام لگا کر اسے آسانی سے اسلامی سزا دلوا سکتا ہے بلکہ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر وہ ثابت نہ کر سکا تو اس کے برعکس خود وہ مستوجبِ سزا ہوگا۔

اسی مناسبت سے "افک" کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بیوی پر تہمت کا ہے قرآن نے اس واقعے کو بڑی شدت سے ذکر کیا ہے تاکہ یہ امر پوری طرح واضح ہو جائے کہ پاکباز افراد پر الزام لگانا اور اسے شہرت دینا کتنا بڑا گناہ ہے۔

تیسرا مرحلہ: اس مرحلے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام صرف گناہ گار کو سزا دینے پر قناعت نہیں کر لیتا بلکہ جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لیے کئی طرح کے اقدامات کرتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کو دونوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے آنکھیں نہ لڑائیں۔ اسی سلسلے میں عورتوں کے لیے پردے کا تفصیلی حکم بیان کیا گیا ہے کیونکہ باہم آنکھیں لڑانا اور بے پردگی جنسی انحرافات کے اہم عامل ہیں اور جب تک ان دونوں کا خاتمہ نہ ہو جائے بے حیائی اور بے عفتی معاشرے سے ختم نہیں ہو سکتی۔

چوتھا مرحلہ: اس مرحلے میں عفت کے منافی اعمال سے بچنے کے لیے شادی بیاہ کا آسان حکم صادر کیا گیا ہے تاکہ شرعی طریقے سے انسان کی جنسی ضروریات پوری کر کے اسے غیر شرعی طریقوں سے بچایا جائے۔

پانچواں مرحلہ: اس مرحلے میں اسی حوالے سے کچھ آدابِ معاشرت بیان کیے گئے ہیں اور ماں باپ کے حوالے سے اولاد کے لیے کچھ تربیتی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ خاص اوقات میں کہ جب احتمال ہوتا ہے کہ میاں بیوی باہم خلوت میں ہوں گے، اولاد سے کہا گیا ہے کہ اجازت لیے بغیر ان کے کمرے میں داخل نہ ہوں تاکہ ان کی فکر انحراف کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی مناسبت سے خانگی زندگی کے بارے میں کچھ دیگر آداب کا بھی ذکر ہے اگرچہ وہ جنسی مسائل سے مربوط نہیں ہیں۔

چھٹا مرحلہ: اس مرحلے میں توحید اور مبدا و معاد سے متعلق کچھ مسائل کا ذکر ہے نیز رسول اللہؐ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا ذکر ہے کیونکہ تمام عملی و اخلاقی احکام کی جڑ ہی مبداء و معاد اور حقانیتِ نبوت پر ایمان ہے اور جب تک یہ جڑ نہ ہو شاخ و برگ اور پھل پھول پیدا نہیں ہو سکتے۔

ضمنی طور پر ایمان و عملِ صالح سے مربوط گفتگو کی مناسبت سے نیک کردار مومنین کی عالمی حکومت کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اور اسلام کے کچھ دیگر احکام کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ اس طرح سے یہ سورت مجموعی طور پر ایک جامع اور کامل پروگرام پر مشتمل ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ
تَذَکَّرُوۡنَ ○

۲۔ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪
وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ
وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

۳۔ اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ
اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ یہ وہ سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے اور واجب کیا ہے اور اس میں ہم نے آیاتِ بینات نازل کی ہیں کہ شاید تم سبق لو۔

۲۔ زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو دینِ خدا کے معاملے میں ہرگز ترس (اور جھوٹی محبت) تمہیں دامن گیر نہ ہو اور ان دونوں کی سزا کے وقت کچھ مومنین کو مشاہدے کے لئے ہونا چاہیئے۔

۳۔ زانی مرد صرف زانی یا مشرک عورت سے نکاح کرتا ہے اور زانی عورت صرف زانی یا مشرک مرد سے نکاح کرتی ہے اور یہ کام مومنین پر حرام کیا گیا ہے۔

تفسیر

زانی مرد اور زانی عورت کی سزا

ہم جانتے ہیں کہ آیتِ نور کی وجہ سے اس سورت کا نام سورۂ نور ہے اور یہ آیت نہایت جاذبِ نظر ہے لیکن اس سے قطع نظر اس سورہ کے مضامین و مطالب ایک خاص نورانیت کے حامل ہیں۔ یہ سورت انسانوں کو، انسان کے خاندانوں کو اور عورت و مرد کو پاکدامنی کا نور عطا کرتی ہے، زبان و کلام کو تقویٰ و صداقت کا نور بخشتی ہے، دلوں کو نورِ توحید و خدا پرستی اور قیامت پر ایمان سے منور کرتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نورانی درس دیتی ہے۔

اس سورت کی پہلی آیت درحقیقت اس کے تمام مطالب کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ وہ سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا اور واجب کیا اور اس میں ہم نے آیاتِ بینات نازل کیں کہ شاید تم نصیحت حاصل کرو (سورۃ انزلناھا و فرضناھا وانزلنا فیھا اٰیات بینات لعلکم تذکرون)۔

"سورہ" "سور" کے مادہ سے، کسی عمارت کی بلندی کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ ان بلند دیواروں کے معنی میں استعمال ہونے لگا جو گزشتہ زمانے میں حملہ آوروں سے محفوظ رہنے کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ یہ دیواریں چونکہ شہر کو بیرونی علاقے سے جدا کر دیتی تھیں اس لیے رفتہ رفتہ یہ لفظ کسی چیز کے ٹکڑے اور حصے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح قرآن کے ایک ایسے ٹکڑے اور حصے کو بھی "سورۃ" کہا جاتا ہے کہ جو باقی ماندہ سے جدا ہوتا ہے۔

بعض اہل لغت نے بھی کہا ہے کہ "سورۃ" خوبصورت اور بلند عمارت کو کہا جاتا ہے اور ایک عظیم عمارت کے مختلف حصوں کو بھی "سورۃ" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن کے مختلف حصوں کو جو ایک دوسرے سے جدا ہیں، پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے[1]

بہرحال یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس سورت کے تمام مطالب بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں چاہے وہ عقائد ہوں، آدابِ معاشرت ہوں یا احکام ہوں۔

خصوصاً یہاں لفظ "فرضناھا" (ہم نے اسے فرض قرار دیا ہے) استعمال کیا گیا ہے اور "فرض" کا معنیٰ یقین اور "قطع" ہے۔ اس لفظ سے بھی مذکورہ امر پر تاکید ہوتی ہے۔

"اٰیات بینات" کی تعبیر ہو سکتا ہے توحید، مبداء و معاد اور نبوت جیسے حقائق کی طرف اشارہ ہو کہ جن کا ذکر اس سورت میں آیا ہے جبکہ "فرضنا" ان احکام و قوانین کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایک لفظ عقائد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا احکام کی طرف۔

"لعلکم تذکرون" (شاید تم نصیحت حاصل کرو) ـــــ یہ جملہ ایک بار پھر اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ اسلام کے تمام

---

[1] لسان العرب ج ۴ مادہ "سور"

سچے عقائد اور عملی پروگراموں کی جڑ انسانی فطرت کے اندر موجود ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر ایک قسم کا "تذکر" اور یاد دہانی ہے۔

اس عمومی اور کلی بیان کے بعد زانی عورت اور زانی مرد کے بارے میں پہلا قطعی اور حتمی قانون بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ (الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ)۔

مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس خدائی حد کا اجراء کرتے ہوئے تمہیں ہرگز ترس نہیں آنا چاہیئے، اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو (ولا تاخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاٰخر)۔

اس خدائی سزا سے مکمل نتیجہ حاصل کرنے کے لیے آیت کے اختتام پر ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مومنین کا ایک گروہ حد جاری ہوتے وقت مشاہدے کے لیے موجود ہونا چاہیئے (ولیشھد عذابھما طائفۃ من المؤمنین)۔

یہ آیت دراصل ان تین احکام پر مشتمل ہے:

(۱) زانی عورتوں اور زانی مردوں کی سزا (زنا سے مراد اس مرد اور عورت کا آپس میں جنسی ملاپ ہے کہ جو آپس میں شادی شدہ نہیں کہ جس کے لیے کوئی شرعی جواز موجود نہیں)۔

(۲) اس امر کی تاکید کہ اس سزا کے اجراء کے لیے ہرگز ترس اور بے محل نرمی کے احساسات نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ ایسے ترس اور نرمی کا نتیجہ معاشرے کی آلودگی اور ترویجِ گناہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ البتہ ایسے احساسات کو ختم کرنے کے لیے قرآن نے اللہ اور روزِ جزا پر ایمان کا ذکر کیا ہے کیونکہ مبداء و معاد پر ایمان کی علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کے فرمان کے سامنے کاملاً سرِ تسلیم خم کر لے۔ خدائے حکیم پر ایمان لانا اس امر کا سبب بنتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کے ہر حکم کا کوئی فلسفہ ہے اور اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہے اور وہ بلاوجہ نہیں ہے جبکہ معاد پر ایمان رکھنا سبب بنتا ہے کہ انسان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اپنی غلطیوں کا جواب دینا ہوگا۔

اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک عمدہ حدیث نقل کی گئی ہے اس کی طرف توجہ ضروری ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

یؤتی بوال نقص من الحد سوطاً فیقال لہ لم فعلت ذاک؟

فیقول: رحمۃ لعبادک،

فیقال لہ: انت ارحم بھم منی؟

فیؤمر بہ الی النار، ویؤتی بمن زاد سوط

فیقال لہ: لم فعلت ذلک؟

فیقول: لینتھوا عن معاصیک!

فیقول: انت احکم بہ منی؟

فیؤمر به الی النار

روز قیامت اس حاکم اور قاضی کو جس نے کسی خدائی حد میں سے کم کیا ہوگا میدان محشر میں پیش کیا جائے گا

اور اُس سے کہا جائے گا: تو نے ایسا کیوں کیا؟

وہ کہے گا: تیرے بندوں پر رحم اور مہربانی کرتے ہوئے۔

پروردگار اُس سے کہے گا: کیا تو اُن کے لیے مجھ سے زیادہ مہربان تھا؟

اس کے ساتھ ہی حکم ہوگا کہ اسے آتشِ دوزخ میں ڈال دو۔

اس کے بعد ایک اور کو لایا جائے گا جس نے خدائی حد سے ایک تازیانہ زیادہ کیا ہوگا۔

اس سے کہا جائے گا: تو نے ایسا کیوں کیا؟

وہ جواب میں کہے گا: تاکہ تیرے بندے تیری نافرمانی سے رُک جائیں۔

اللہ فرمائے گا: کیا تو مجھ سے زیادہ آگاہ اور حکیم تھا؟

پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے بھی آتشِ جہنم میں لے جاؤ۔[1]

(۳) تیسرا حکم یہ ہے کہ حد جاری کرتے ہوئے کچھ مومنین موجود ہوں کیونکہ اس سزا کا صرف یہ مقصد نہیں کہ گنہگار کو عبرت حاصل ہو بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی سزا دوسروں کے لیے بھی درسِ عبرت ہو۔

انسانی معاشرے کی تشکیل اور بناوٹ سے یہ بات عیاں ہے کہ اخلاقی برائیاں صرف ایک شخص ہی میں موجود نہیں رہتیں بلکہ معاشرے کی طرف بھی سرایت کرتی ہیں لہٰذا معاشرے کی تطہیر کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح گناہ برملا ہوا ہے سزا بھی برملا ہو۔

اس گفتگو سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ اسلام ایک شخص کی عزت دوسروں کے سامنے برباد ہونے کی اجازت کیوں دیتا ہے کیونکہ جب تک گناہ واضح نہ ہو اور مسئلہ اسلامی عدالت تک نہ پہنچے اللہ کہ جو "ستار العیوب" ہے پردہ دری پر راضی نہیں ہے لیکن جرم ثابت ہو جانے، راز کھل جانے معاشرے کے آلودہ ہو جانے اور گناہ کو معمولی چیز سمجھے جانے کے بعد سزا اسی صورت میں ملنا چاہیئے کہ گناہ کے منفی اثرات مٹ جائیں اور گناہ کی برائی کا احساس اسی طرح لوٹ آئے۔

اصولی طور پر ایک صحیح و سالم معاشرے میں قانون کی خلاف ورزی کو بہت اہم سمجھا جانا چاہیئے۔ مسلم ہے کہ اگر خلاف ورزی کا تکرار ہو تو اس کی اہمیت ختم ہو جائے گی اور اس کی اہمیت کا احساس تبھی اجاگر ہوگا اگر خلاف ورزی کرنے والوں کو کھلے بندوں سزا دی جائے۔

یہ بات بھی ملحوظِ نظر رہے کہ بعض لوگوں کی نظر میں بدنی سزا سے زیادہ اہم ان کی حیثیت و آبرو ہے اور سزا کا کھلے بندوں ہونا ہی ان کی سرکش ہوا و ہوس کے راستے میں بند باندھ دے گا۔

زیرِ بحث آیت میں چونکہ زانی عورت اور زانی مرد کے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے اس لیے اسی مناسبت سے ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی عورتوں سے شادی کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر، از فخر الدین رازی، ج ۲۳ ص۱۴۰

تیسری آیت میں اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: زانی مرد سوائے زانیہ یا مشرک عورت کے شادی نہیں کرتا جیسا کہ زانی عورت سوائے زانی یا مشرک مرد کے کسی سے بیاہ نہیں کرتی (الزانی لاینکح الا زانیة او مشرکة والزانیة لاینکحها الا زان او مشرك)۔ اور یہ کام مومنین پر حرام کیا گیا ہے (وحرم ذٰلك علی المؤمنین)۔

یہ آیت ایک حکم الٰہی بیان کرتی ہے یا یہ ایک خارجی معاملے کی خبر ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ آیت صرف ایک عینی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ آلودہ دامن افراد ہمیشہ ناپاک افراد کے پیچھے ہی جاتے ہیں اور بقول

ع کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

لیکن باایمان اور پاکباز افراد ہرگز آلودہ دامن اور ناپاک افراد کو جیون ساتھی بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور انہیں اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں۔

آیت کا ظاہری مفہوم اسی تفسیر کا شاہد ہے کیونکہ آیت "جملہ خبریہ" کی صورت میں ہے۔

البتہ بعض دیگر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت ایک خدائی اور شرعی حکم بیان کر رہی ہے اور خصوصیت سے اس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان زانی عورتوں اور مردوں سے شادی بیاہ سے اجتناب کریں کیونکہ جسمانی بیماریوں کی طرح عموماً اخلاقی بیماریاں بھی متعدی ہوتی ہیں اور ایک سے دوسرے میں سرایت کر جاتی ہیں جبکہ اس سے قطع نظر ایسے رشتے پاکدامن افراد کے لیے ننگ و عار کا بھی باعث ہیں۔ علاوہ ازیں ایسی اولاد جو مشکوک اور داغدار دامنوں میں پرورش پاتے اس کا مستقبل محفوظ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بناء پر اسلام نے ایسے رشتوں سے منع کیا ہے۔

اس تفسیر کے لیے یہ جملہ شاہد ہے:

وحرم ذٰلك علی المؤمنین

اس میں حرام قرار دیے جانے کی تعبیر موجود ہے۔

اس تفسیر کے لیے دوسرا شاہد وہ بہت سی روایات ہیں جو اس سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومینؑ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مطابق یہ آیت ایک حکم بیان کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض عظیم مفسرین نے اس آیت کے لیے یہ شان نزول بھی لکھی ہے:

> ام مہزول دورِ جاہلیت میں ایک مشہور بدکار عورت تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی علامت اور پہچان کے طور پر اپنے گھر کے دروازے پر ایک جھنڈا بھی گاڑ رکھا تھا۔ ایک مسلمان نے اُس سے شادی کرنے کے لیے رسول اللہ سے اجازت چاہی تو یہ آیت نازل ہوئی، اور اس میں اس کے تقاضے کا جواب دیا گیا۔[1]

ایک اور حدیث امام باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ،

---

[1] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں نیز تفسیر قرطبی میں اسی آیت کے ذیل میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔

یہ آیت ان مردوں اور عورتوں کے بارے میں ہے کہ جو رسول اللہؐ کے زمانے میں زنا سے آلودہ تھے۔
اللہ نے مسلمانوں کو ان سے شادی بیاہ کرنے سے منع کیا نیز یہ حکم آج بھی باقی ہے کہ جو شخص اس عمل کی انجام دہی میں مشہور ہو اس پر اللہ کی حد جاری ہونا چاہیئے اس سے اس وقت تک شادی بیاہ نہیں ہونا چاہیئے جب تک اس کی توبہ ثابت نہ ہو جائے[1]

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ بہت سے احکام "جملہ خبریہ" کی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور ضروری نہیں کہ احکام الٰہی ہمیشہ "امر" اور "نہی" کے جملوں کی صورت میں ہوں۔

ضمناً توجہ رہے کہ مشرکین کا زانیوں پر عطف مطلب کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہے کیونکہ بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ زانی جب اس کام کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ ایمان سے دور ہوتا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مؤمن فانہ اذا فعل ذٰلک خلع عنہ الایمان کخلع القمیص۔

جب کوئی زانی اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور اسی طرح جب کوئی چور چوری کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا کیونکہ اس فعل کے ارتکاب کے وقت اس کے سینے سے ایمان نکال لیا جاتا ہے جیسے لباس بدن سے اتارا جاتا ہے[2]

چند اہم نکات:

۱۔ وہ مواقع جہاں زانی کی سزا "موت" ہے: مذکورہ بالا آیت میں زنا کی حد سے متعلق ایک عام حکم ہے۔ زنا کے بارے میں بعض استثنائی احکام بھی ہیں مثلاً شادی شدہ عورت یا مرد کا زنا کرنا ثابت ہو جانے کی صورت میں اس کی سزا "موت" ہے۔
محصن یا شادی شدہ مرد سے مراد یہ ہے کہ وہ عورت رکھتا ہو اور عورت سے قربت اس کے اختیار میں بھی ہو، محصنہ یا شادی شدہ عورت سے مراد وہ شوہر دار عورت ہے جس کا مرد اس کے پاس رہتا ہو جب بھی کسی کے لیے جنسی تسکین کی شرعی اور قانونی سہولت موجود ہو اگر وہ زنا کا مرتکب ہو تو اس کو سزائے موت دی جائے گی۔ اس حکم کے نفاذ کی جملہ شرائط اور تفصیلات فقہی کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں اس کے علاوہ اپنی محرم اور دوسری عورتوں کے ساتھ زنا کی سزا بھی "موت" ہے اسی طرح زنا بالجبر کی سزا بھی "موت" ہے۔
البتہ بعض حالات ایسے بھی ہیں جن میں کوڑے، جلاوطنی اور دوسری سزاؤں کا حکم سنایا جاتا ہے۔ ان کی تفصیلات فقہی کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ [2] اصول کافی ج ۲ ص ۲۶۷ (مطبعہ اسلامیہ ۱۳۸۸ھ) (جیسا کہ تفسیر نور الثقلین ج ۲ میں ص ۵۷۱ پر مدرج ہے)۔

۲۔ زانی عورت کا ذکر مرد سے پہلے کیوں؟ اس میں شک نہیں کہ فحاشی اور بے حیائی ہر شخص کے لیے باعث ذلت و رسوائی ہے مگر عورتوں کی طرف سے اس قبیح فعل کا ارتکاب زیادہ ذلت آمیز ہے کیونکہ وہ حیاء، شرم اور پردہ داری کی زیادہ حامل ہیں اور با وجود اس کے ان کا دامن عفت کو چاک کر دینا شدید بغاوت و سرکشی کی علامت ہے۔
اس کے علاوہ اس فعل کا انجام گرچہ دونوں کے لیے بُرا ہے مگر عورتوں کے لیے زیادہ رسواکن اور عبرتناک ہے۔
یہ احتمال بھی ہے کہ زنا کے سلسلے میں اکثر تحریک انہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اکثر مواقع پر اس کا اصلی محرک وہی ہوتی ہیں یہ اسباب مجموعی طور پر اس آیت میں مرد سے پہلے عورت کے ذکر کا سبب بنے ہیں۔ مگر صاحبان ایمان اور پاک دامن خواتین و حضرات کا معاملہ ان سے بالکل الگ تھلگ ہے۔

۳۔ سزا لوگوں کی موجودگی میں کیوں؟ زیر بحث آیت کہ جو امر کی صورت میں ہے حد جاری ہوتے وقت کچھ مومنین کو موجودگی کو واجب قرار دیتی ہے لیکن یہ بغیر واضح ہے کہ قرآن نے سزا کے لیے اسے شرط قرار نہیں دیا کہ سزا عام لوگوں کے سامنے ہو بلکہ حالات اور مصلحت کے لحاظ سے تین یا اس سے زیادہ افراد کی موجودگی کافی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قاضی اس امر کا فیصلہ کرے کہ حد جاری کرتے ہوئے کتنے افراد کی موجودگی ضروری ہے[1]
اس حکم کا فلسفہ بھی واضح ہے کیونکہ:
اولاً۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ سزا سب کے لیے درس عبرت اور معاشرے کی تطہیر کا سبب ہے۔
ثانیاً۔ مجرم کی شرمساری اسے آئندہ ارتکاب جرم سے روکے گی۔
ثالثاً۔ جب حد کچھ افراد کے سامنے جاری ہوگی تو قاضی یا حد جاری کرنے والوں پر کسی سازش، رشوت لینے، کوئی ترجیح دینے یا شکنجہ دینے وغیرہ کا الزام نہیں آ سکے گا۔
رابعاً۔ حد جاری ہوتے وقت کچھ لوگوں کی موجودگی افراط اور زیادتی سے اجتناب کا باعث ہوگی۔
خامساً۔ ممکن ہے حد جاری ہونے کے بعد مجرم قاضی اور حد جاری کرنے والوں کے بارے میں غلط پراپیگنڈا کرے اور جھوٹے الزامات لگائے۔ اگر اس موقع پر کچھ لوگ موجود ہوں گے تو وہ حقیقت حال واضح کر کے اس کی تخریبی سرگرمیوں کو روک سکیں گے۔
اس کے علاوہ اور بھی فوائد ہو سکتے ہیں۔

۴۔ اس سے پہلے زانی کے لیے کیا سزا تھی؟ سورہ نساء کی آیت ۱۵ اور ۱۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ نور میں زانی اور بدکار مردوں اور عورتوں کے بارے میں حکم نازل ہونے سے پہلے شادی شدہ عورتوں کے لیے اس گناہ پر عمر قید کی سزا تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفاھن الموت

انہیں گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے۔

---

[1] بعض فقہاء کے نزدیک اجرائے حد کے وقت کچھ مومنین کا موجود ہونا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے حالانکہ ظاہر امر وجوب ہے نہ کہ استحباب۔

لیکن غیر شادی شدہ کی صورت میں سزا اذیت کی صورت میں تھی:

فاذوھما

ان دونوں کو اذیت دو۔

لیکن اس اذیت کی مقدار معین نہ تھی جبکہ زیر بحث آیت میں ایک سو کوڑے سزا مقرر کر دی گئی ہے۔ لہٰذا زیر بحث آیت میں محصنہ کے بارے میں سزائے موت کا حکم عمر قید کی جگہ پر ہے اور سو کوڑوں کا حکم اذیت کی حد معین کرنے کے لیے ہے۔

(مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورہ نساء کی آیت ۱۵ اور ۱۶ کی تفسیر دیکھیے)۔

۵۔ اجرائے حد میں کمی بیشی ممنوع ہے: اس میں شک نہیں کہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہر ممکن کوشش کی جائے کہ کسی بے گناہ شخص کو سزا نہ ملے اور احکام الٰہی جہاں تک اجازت دیتے ہیں عفو و درگزر سے کام لیا جائے لیکن ثبوت جرم کے بعد سزا پر حتمی طور پر عمل کیا جانا چاہیئے اور بے حقیقت احساسات وجذبات سے پرہیز کیا جانا چاہیئے کہ جو نظم معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہیں زیر بحث آیت میں اس کے لیے خاص طور پر "فی دین اللہ" کے الفاظ آئے ہیں یعنی جب حکم خدا کا ہے تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی رحم میں خداوند رحمان ورحیم سے بڑھ جائے۔

آیت میں ترس کھانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اکثر لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور ایسے موقع پر احساسات ترحّم کے غلبے کا امکان زیادہ ہوتا ہے لیکن اس امر کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زیادہ سختی کے حامی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں یہ لوگ بھی حکم الٰہی کے راستے سے منحرف ہوتے ہیں اور انہیں بھی اپنے جذبات پر قابو پانا چاہیئے اور خدا سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے لیے بھی شدید سزا ہے۔

۶۔ زانی کے ساتھ شادی بیاہ کی حرمت کی شرائط: ہم کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ زانی مرد اور زانی عورت سے شادی بیاہ حرام ہے البتہ اسلامی روایات میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکم ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں ہے جو اس کام کے لیے مشہور ہوں اور انہوں نے توبہ نہ کی ہو۔ لہٰذا اگر کوئی اس عمل کے ساتھ مشہور نہ ہو یا اُس نے اپنے گزشتہ اعمال سے کنارہ کشی اختیار کر کے پاکیزہ اور باعفت زندگی گزارنے کا مصمّم ارادہ کر لیا ہو اور اس کی توبہ کے عملی آثار دکھائی دیں تو پھر اس سے شادی بیاہ میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے اس صورت میں وہ زانی یا زانیہ کا مصداق نہیں رہتے اور گویا ایک حالت تھی جو ختم ہو گئی ہے لیکن پہلی صورت میں ممانعت ہے اور آیت کی شان نزول بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

ایک معتبر حدیث کے مطابق مشہور فقیہ زرارہ نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:

"الزانی لا ینکح الا زانیة ......" اس آیت کی کیا تفسیر ہے؟

امامؑ نے فرمایا:

ھن نساء مشھورات بالزنا و رجال مشھورون بالزنا، قد شھروا بالزنا وعرفوا به، والناس الیوم بذٰلك المنزل، فمن اقیم علیه حد الزنا، او شهر بالزنا، لم ینبغ لاحد ان یناکحه حتی یعرف منه توبته

یہ آیت ان عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو زنا میں مشہور تھے اور اس قبیح عمل کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ آج بھی اسی طرح ہیں۔ جس شخص پر زنا کی حد جاری ہو یا جس کی شہرت اس بُرے عمل کے حوالے سے ہو وہ اس لائق نہیں کہ کوئی اس سے شادی کرے جب تک کہ اس کی توبہ ثابت و ظاہر نہ ہو جائے[1]

یہی مضمون دیگر روایات میں بھی موجود ہے۔

۷۔ حرمت زنا کا فلسفہ: ہم نہیں سمجھتے کہ کسی شخص پر اس فعل کے بُرے اور منحوس نتائج مخفی ہوں کہ جو فرد اور معاشرے پر مترتب ہوتے ہیں لیکن اس ضمن میں تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

اس قبیح عمل کا وجود اور پھیلاؤ بلاشبہ خاندانی نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس سے باپ اور بیٹے کا تعلق مبہم اور تاریک ہو جاتا ہے تجربے نے ثابت کیا ہے کہ جو بچے نسب اور نسل کی پہچان سے محروم ہوں وہ خطرناک مجرم بن جاتے ہیں اور معاشرے میں جرائم کے اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

یہ شرمناک عمل ہوس پرستوں کے درمیان طرح طرح کے جھگڑے پیدا کرتا ہے۔

علاوہ ازیں اس سے کئی طرح کی نفسیاتی اور مخلوط بیماریاں پیدا ہوتی ہیں کہ جن کے بُرے اور منحوس نتائج کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

بچوں کا قتل، اسقاط حمل اور اس قسم کے دوسرے جرائم اسی عمل کے قبیح نتائج میں سے ہیں۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۶ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۲ کی تفسیر دیکھیے۔

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۴ ص ۳۳۵

۴۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝
۵۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۴۔ اور وہ لوگ کہ جو پاکدامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں اور پھر (اپنے دعوٰی کے ثبوت کے لیے) چار گواہ پیش نہیں کر سکتے انہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو کہ وہ فاسق ہیں۔

۵۔ مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح و تلافی کریں تو خدا غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

تہمت کی سزا

گزشتہ آیات میں زانی مرد اور زانی عورت کے لیے سخت سزا بیان کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے خود غرض اور بے تقوٰی افراد اس سے غلط فائدہ اُٹھائیں اور پاکدامن افراد پر تہمت لگانا شروع کر دیں اس لیے زانیوں کے لیے شدید سزا بیان کرنے کے ساتھ ہی سوئے استفادہ کرنے والوں اور تہمت لگانے والوں کے لیے سخت سزا بیان کی گئی ہے تاکہ ایسے افراد کے ہاتھوں پاکدامن گھرانوں کی حیثیت اور احترام محفوظ رہے اور کوئی شخص کسی کی عزت و آبرو کو زائل کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو افراد پاک دامن عورتوں پر منافیٔ عفت عمل کا الزام لگاتے ہیں انہیں چاہیئے کہ اس دعوے کے ثبوت کے لیے چار (عادل) گواہ پیش کریں اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو ان میں سے ہر ایک کو اسّی کوڑے لگاؤ (والذین یرمون المحصنات ثم لم یأتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدة)۔

یہ سخت سزا بیان کرنے کے بعد قرآن دو احکام کا اضافہ کرتا ہے۔

اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو (ولا تقبلوا لهم شهادة ابدًا)۔

اور وہ فاسق ہیں (واولئك هم الفاسقون)۔

اس طرح سے ایسے افراد کے لیے نہ صرف سخت سزا مقرر کی گئی ہے بلکہ انہیں گواہی دینے کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا ہے اور ان کی ہر بات کو بے وقعت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ تاکہ پاکدامن افراد کا وقار مجروح نہ کر سکیں۔ علاوہ ازیں قرآن نے ان کے ماتھے پر فسق کی علامت بھی لگا دی ہے اور معاشرے میں انہیں ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔

پاک دامن افراد کی عزت و وقار کے تحفظ کے لیے ایسا سخت اقدام صرف یہیں پر نہیں ہے بلکہ بہت سی دیگر اسلامی تعلیمات میں بھی موجود ہے۔ ان تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں با ایمان اور پاک دامن عورت اور مرد کا عزت و وقار کس قدر اہم ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں:

اذا اتهم المؤمن اخاه انماث الایمان من قلبه کما ینماث الملح فی الماء

اگر کوئی مومن اپنے مومن بھائی پر کسی ایسی چیز کا الزام لگائے کہ جو اس میں نہیں ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح سے گھل جاتا ہے جیسے نمک پانی میں۔[1]

لیکن اسلام کسی پر واپسی کی راہ بند نہیں کرتا بلکہ ہر موقع پر گناہگاروں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنا آلودہ دامن پاک کریں اور گزشتہ خطاؤں کی تلافی کریں للذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا: مگر وہ لوگ جو بعد ازاں توبہ کر لیں اور اصلاح و تلافی کر لیں تو خدا انہیں معاف کر دیتا ہے کیونکہ اللہ غفور و رحیم ہے (الا الذین تابوا من بعد ذٰلك واصلحوا فان الله غفور رحیم)۔

کیا یہ استثناء صرف "اولئك هم الفاسقون" کے لیے یا "ولا تقبلوا لهم شهادة ابدًا" کے لیے بھی ہے ——اس سلسلے میں مفسرین اور علماء کی آرا مختلف ہیں یہ استثناء اگر دونوں جملوں کی طرف لوٹے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی توبہ بھی مقبول ہے اور ہر لحاظ سے فسق کا حکم بھی اُن سے اُٹھا لیا جاتا ہے۔

لیکن اگر یہ استثناء صرف آخری جملے کی طرف لوٹے تو اب وہ فاسق شمار تو نہیں ہوں گے لیکن ان کی گواہی آخرِ عمر تک قابلِ اعتبار نہیں ہوگی۔

البتہ اصولِ فقہ میں جو قواعد تسلیم کیے جا چکے ہیں ان کے مطابق جو استثناء دو یا چند جملوں کے بعد آئے اُس کا تعلق صرف آخری جملے سے ہوتا ہے لیکن اگر کچھ ایسے قرائن موجود ہوں کہ جو بتائیں کہ اس کا تعلق پہلے جملوں سے بھی ہے تو پھر بات دوسری ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث آیت میں اس قسم کا قرینہ موجود ہے کیونکہ اگر توبہ کے ذریعے فسق کا حکم اُٹھ جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ گواہی قابلِ قبول نہ رہے کیونکہ شہادت کی عدم قبولیت فسق کی وجہ سے تھی۔ اب جس شخص نے توبہ کر لی ہے اور نئے سرے سے اس نے ملکۂ عدالت حاصل کر لیا ہے تو فسق اس سے دُور ہو گیا ہے۔

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۹ باب التهمة و سوء الظن

اہل بیت علیہم السلام سے متعدد روایات ایسی منقول ہیں کہ جو اسی مفہوم پر زور دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ امام صادق علیہ السلام اِس تصریح کے بعد کہ جنہوں نے توبہ کرلی ہے ان افراد کی شہادت قابلِ قبول ہے، سوال کرنے والے شخص سے پوچھتے ہیں:

جو فقہا تمہارے قریب رہتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں؟

اُس نے عرض کیا:

وہ کہتے ہیں ان کی توبہ اللہ اور اس کے درمیان تو قبول ہو گی لیکن ان کی شہادت ہمیشہ کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

امامؑ فرماتے ہیں:

بئس ما قالوا کان ابی یقول اذا تاب ولم یعلم منه الاخیر جازت شهادته

انہوں نے بہت بُری بات کہی ہے۔ میرے والد فرمایا کرتے تھے: جو شخص توبہ کرلے اور پھر اُس سے خیر اور اچھائی کے سوا کچھ نہ دیکھا جائے تو اس کی شہادت قبول ہے[1]

متعدد دیگر روایات بھی اسی طرح کی وسائل الشیعہ کے اس باب میں موجود ہیں جس سے ہم نے مذکورہ بالا حدیث درج کی ہے یہ سب روایات ہم آہنگ ہیں، سوائے ایک روایت کے اور اسے بھی تقیہ پر محمول کیا گیا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "لاتقبلوا لهم شهادة ابدًا" میں لفظ "ابدًا" حکم کی عمومیت کی دلیل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہر عمومیت میں استثناء (خصوصاً "متصل" کا استثناء) ہو سکتا ہے اس بناء پر یہ محض اشتباہ ہے کہ "ابدًا" کی تعبیر توبہ سے مانع ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ آیت میں "رمی" کا کیا معنی ہے؟ "رمی" دراصل تیر، پتھر یا کوئی ایسی ہی چیز پھینکنے کے معنی میں ہے۔ فطری سی بات ہے کہ بہت سے مواقع پر ایسی چیز تکلیف پہنچاتی ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ کنائے کے طور پر الزام دینے، گالیاں بکنے اور غلط نسبت دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ باتیں بھی دوسرے کو تیر کی طرح مجروح کر دیتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں اور اسی طرح آئندہ آیات میں یہ لفظ مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً یہ نہیں فرمایا:

والذین یرمون المحصنات بالزنا

جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں۔

کیونکہ "یرمون" کے مفہوم میں، خصوصاً کلام میں موجود قرائن کے حوالے سے لفظ زنا موجود ہے نیز اس مقام پر جبکہ پاکدامن عورتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، یہ لفظ استعمال نہ کرنا ایک طرح کا احترام اور ادب شمار ہوتا ہے۔

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸، کتاب الشہادات باب ۳۷ ص۲۸۲

۲۔ چار گواہ کیوں؟ ہم جانتے کہ اسلام میں حقوق اور جرائم ثابت کرنے کے لیے عموماً دو عادل گواہ کافی ہیں یہاں تک کہ کسی انسان کے قتل کا جُرم ثابت کرنے کے لیے دو عادل گواہ کافی ہیں لیکن زنا کا الزام ثابت کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ چار گواہ ضروری قرار دیے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس مقام پر گواہ اس لیے زیادہ رکھے گئے ہوں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کے الزامات بے مہابا لگاتے ہیں اور سوئے ظن سے یا بغیر اس کے لوگوں کی عزّت و وقار مجروح کرتے ہیں اسلام نے اس طرزِ عمل کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی یہ سختی لوگوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے ہے جبکہ دیگر مسائل یہاں تک کہ کسی کے قتل کے بارے میں بھی لوگ اس طرح کی بے سروپا باتیں نہیں کرتے۔

اس سے قطع نظر درحقیقت قتلِ نفس کا مجرم ایک شخص ہے جبکہ زنا کے مسئلے میں دو افراد کے لیے اثباتِ جُرم ہوتا ہے لہٰذا اگر ہر ایک کے لیے دو گواہ درکار ہوں تو کل چار گواہ ہو جائیں گے۔

یہی بات امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی آئی ہے۔ اہل سنّت کے مشہور فقیہ ابو حنیفہ کا کہنا ہے:

میں نے امام صادق سے پوچھا زنا زیادہ سنگین گناہ ہے یا قتل تو امام نے فرمایا: قتل

میں نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر قتلِ نفس کے لیے دو گواہ کیوں کافی ہیں جبکہ زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہ ضروری ہیں۔

تو امام نے فرمایا: تم اس مسئلے میں کیا کہتے ہو؟

ابو حنیفہ کے پاس کوئی واضح جواب نہ تھا۔

امام نے فرمایا: یہ اس بناء پر ہے کہ زنا کے مسئلے میں دو حدیں ہیں۔ ایک حد مرد پر جاری ہوتی ہے اور دوسری عورت پر لہٰذا چار گواہوں کی ضرورت ہے جبکہ قتلِ نفس میں صرف ایک حد ہے جو قاتل پر جاری ہوتی ہے[1]

البتہ بعض مواقع ایسے بھی ہیں کہ جن میں زنا کے مسئلے میں صرف ایک حد جاری ہوتی ہے (مثلاً زنا بالجبر وغیرہ)۔ لیکن یہ معاملہ استثنائی پہلو رکھتا ہے۔ معمول یہی ہے کہ زنا طرفین کی رضامندی سے صورت پذیر ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر احکام کا فلسفہ غالب اکثریت پر مبنی ہوتا ہے۔

۳۔ قبولیتِ توبہ کی اہم شرط: ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ توبہ صرف یہ نہیں کہ انسان گزشتہ گناہ پر استغفار کرے یا نادم ہو۔ یہاں تک کہ صرف آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ بھی توبہ نہیں ہے بلکہ توبہ میں یہ سب امور شامل ہیں اور ان کے علاوہ ضروری ہے کہ گناہگار گناہ کی تلافی کے درپے ہو۔

اگر کسی نے واقعاً کسی پاکدامن عورت یا مرد کی عزت و وقار کو تہمت کے ذریعے داغدار کیا ہے تو اپنی توبہ کی قبولیت کے لیے اسے چاہیئے کہ ان تمام افراد کے سامنے اپنی باتوں کی تکذیب کرے جنہوں نے اس سے وہ تہمت سُنی ہے۔ دوسرے لفظوں

[1] نور الثقلین ج ۳ ص۵۷۴

میں ان کی حیثیت و عزت بحال کرے۔

لفظ "تابوا" کے بعد "واصلحوا" کا آنا اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد کو اپنے گناہ سے توبہ کرکے
خرابی کی اصلاح بھی کرنا چاہیئے جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک شخص برسرِ عام (یا مطبوعات و نشریات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے) کسی شخص پر جھوٹی تہمت لگائے
اور اس کے بعد خلوت میں جا کر استغفار کرے اور بارگاہِ الٰہی سے معافی چاہے ــــ اللہ تعالیٰ اس قسم کی توبہ ہرگز قبول نہیں کرے

اسی لیے چند احادیث میں آئمہ اسلام سے منقول ہے کہ اُن سے پوچھا گیا:

جو لوگ کسی کی عزت و ناموس پر تہمت لگاتے ہیں کیا حدِ شرعی کے اجراء اور توبہ کے بعد ان کی شہادت قابلِ قبول ہے؟

فرمایا: جی ہاں

اور جب سوال ہوا کہ ایسا شخص کس طرح سے توبہ کرے تو فرمایا:

امام (یا قاضی) کے پاس آئے اور کہے (میں نے فلاں شخص پر تہمت لگائی ہے اور جو کچھ اس سلسلے میں میں نے کہا ہے اب اس سے توبہ کرتا ہوں[1]

۴۔ **احکامِ قذف:** ہمارے ہاں کتابِ حدود میں ایک باب "حدِ قذف" کے عنوان سے ہے۔

"قذف" (بروزن حذف) لغت کے اعتبار سے دور کی جگہ کی طرف چھلانگ لگانے اور پھینکنے کے معنی میں ہے
لیکن ایسے مواقع پر "رمی" کسی کی عزت پر تہمت لگانے کے مفہوم میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے اور دوسرے لفظوں میں فحش
کلامی اور گالیاں دینے کے معنی میں ہے۔

اگر قذف صریح لفظ کے ساتھ ہو اگرچہ کسی بھی زبان اور شکل میں ہو اس کی حد اسّی کوڑے ہے اور اگر صراحت سے نہ ہو تو پھر
اس کے لیے تعزیر ہے (تعزیر ایسے گناہوں کے لیے ہوتی ہے جن کی حد شریعت نے متعین نہیں کی بلکہ حاکم شرع کو اختیار دیا گیا
ہے کہ وہ مجرم کی خصوصیات، جرم کی کیفیت اور دیگر حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک خاص حد تک سزا مقرر کرے)۔

یہاں تک کہ اگر کوئی شخص متعدد افراد پر تہمت لگائے اور انہیں گالی دے اور ان میں ہر ایک کی طرف اس گناہ کی نسبت
دے تو ہر ایک نسبت کے مقابلے میں اس پر حدِ قذف جاری ہوگی لیکن یک مرتبہ مجموعی طور پر ان پر تہمت لگائے اور وہ بھی باہم
اکٹھے ہو کر اس کی سزا کا مطالبہ کریں تو اس پر ایک حد جاری ہوگی لیکن اگر وہ الگ الگ دعویٰ دائر کریں تو ہر ایک کے مقابلے میں
اس پر ایک حد جاری ہوگی۔

یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ اگر کسی پر تہمت لگائی جائے اور وہ فوت ہو جائے تو اس کے وارث دعویٰ دائر کر سکتے ہیں اور
حد جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ حکم چونکہ ایک شخص کے حق کے ساتھ مربوط ہے اس لیے اگر صاحبِ حق مجرم کو معاف

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۲۸۳ (ابواب الشہادات، باب ۳۶ حدیث ۴)۔

ے تو پھر اس کی حد ساقط ہو جائے گی لیکن اگر اس جرم کا اس قدر تکرار ہو کہ معاشرے کی عزت و وقار خطرے میں پڑ جائے تو پھر
ورت اور ہوگی۔

اگر دو افراد ایک دوسرے پر تہمتِ ناموس لگائیں تو اس صورت میں دونوں سے حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن قاضی کے حکم سے
دونوں پر تعزیر جاری ہوگی۔ لہٰذا کسی مسلمان کو حق نہیں کہ گالی کا جواب گالی سے دے بلکہ صرف قاضی کے ذریعے حق حاصل کر سکتا ہے
اور گالی دینے والے کے لیے سزا کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

بہرحال اس اسلامی حکم کا مقصد اولاً انسانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت ہے اور ثانیاً بہت سے ایسے سماجی اور اخلاقی مفاسد
کی روک تھام ہے کہ جو اس کام سے معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر برے اور فاسد افراد کو کھلی چھٹی مل جائے کہ وہ ہر کسی کو
گالیاں دیں اور تہمتیں لگائیں اور پھر انہیں کوئی سزا نہ ملے تو لوگوں کی آبرو اور ناموس ہمیشہ معرضِ خطر میں رہے گی۔ یہاں تک کہ ان تہمتوں
کے باعث بیوی اور شوہر کا ایک دوسرے سے اعتماد اُٹھ جائے گا اور باپ کو اعتبار نہیں رہے گا کہ اُس کا بیٹا اس کی جائز اولاد
ہے۔ مختصر یہ کہ گھرانے کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور اس طرح پورا معاشرہ بدگمانی اور عدمِ اعتبار کی کیفیت سے دوچار ہو جائے گا۔
غلط پراپیگنڈے اور تہمت تراشیوں کا بازار گرم ہوگا اور پاک ذہن اور پاک فکر داغدار ہو کر رہ جائے گی۔

یہ وہ مقام ہے جہاں سخت اور ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے ــــ وہی سختی جو اسلام نے ایسے بدزبان اور آلودہ دھن افراد
کے لیے روا رکھی ہے۔

ہاں ہاں ــــ ایسے افراد کو ایک بدی، تہمت اور گالی پر اسّی کوڑے کھانے چاہئیں تاکہ وہ لوگوں کی عزت و آبرو سے
نہ کھیل سکیں۔

۶۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ
فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○
۷۔ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○
۸۔ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ○
۹۔ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○
۱۰۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

۶۔ جو لوگ اپنی بیویوں پر (منافیِ عفت عمل کا) الزام لگاتے ہیں اور اپنے علاوہ ان کے پاس کوئی گواہ نہیں تو ان میں سے ہر ایک اللہ کے نام کی چار شہادتیں دے کہ وہ سچوں میں سے ہے۔

۷۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر جھوٹوں میں سے ہو۔

۸۔ وہ عورت بھی اپنے تئیں (زنا کی) سزا سے بچا سکتی ہے اگر چار مرتبہ اللہ کو شاہد قرار دے کہ (عورت پر اس الزام میں) وہ مرد جھوٹا ہے۔

۹۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر خدا کا غضب ہو اگر وہ مرد سچوں میں سے ہے۔

۱۰۔ اور اگر خدا کا فضل اور رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی ــــــ اور یہ کہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور حکیم ہے (تو تم میں سے بہت سے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاتے)۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے کہ:

(انصار کے سردار) سعد بن عبادہ رسول اللہؐ کی خدمت میں موجود تھے۔ کچھ اور اصحاب بھی بیٹھے تھے کہ انہوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اس منافیِ عفت عمل کی نسبت کسی کی طرف دینے کی سزا (عدم ثبوت پر) اسّی کوڑے ہے تو اگر میں اپنے گھر میں داخل ہوں، اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ ایک فاسق شخص میری بیوی کے ساتھ مشغولِ بدکاری ہے تو اگر میں اُسے اسی عالم میں چھوڑ کر چار گواہ ڈھونڈنے چلا جاؤں تو واپسی تک وہ اپنا کام کر چکا ہوگا اور اگر قتل کر دوں تو گواہ کے بغیر کوئی میری بات قبول نہیں کرے گا اور مجھ سے قاتل کے طور پر قصاص لیا جائے گا جبکہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ بیان کر دوں تو میری پشت پر اسی کوڑے لگیں گے۔

رسولِ اکرمؐ نے اس گفتگو سے حکمِ الٰہی پر ایک طرح کا اعتراض محسوس کیا۔ آپ نے انصار کی طرف رُخ کر کے شکوے کے انداز میں فرمایا: کیا تم نے سُنا کہ تمہارے سردار نے کیا کہا ہے۔

وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہنے لگے: یارسولؐ اللہ! اسے سرزنش نہ کیجیئے۔ وہ ایک غیور آدمی ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ شدّتِ غیرت کی بناء پر ہے۔

سعد بن عبادہ نے عرض کی: یارسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ یہ حکمِ الٰہی ہے اور حق ہے لیکن اس کے باوجود مجھے اس کی بنیاد پر تعجب ہوتا ہے (اور میں اپنے ذہن میں اس سوال کو حل نہیں کر سکا)۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا: حکم خدا یہی ہے۔

انہوں نے بھی عرض کی: صدق اللہ و رسولہ (اللہ اور اُس کے رسولؐ نے سچ کہا)۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سعد کا چچازاد بھائی ہلال بن امیہ دروازے سے داخل ہوا۔ اُس نے رات کے وقت ایک فاسق شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ شکایت کے لیے رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا تھا۔

اُس نے صراحت سے کہا: میں نے اپنی آنکھ سے یہ کچھ دیکھا ہے اور اپنے کان سے ان کی آواز سنی ہے۔

رسول اللہ اتنے ناراحت ہوئے کہ خشگی کے آثار چہرۂ مبارک پر نمایاں ہو گئے۔

ہلال نے عرض کی: میں آپ کے چہرے پر ناراضی کے آثار دیکھ رہا ہوں لیکن قسم بخدا میں سچ کہہ رہا ہوں اور میں نے کچھ بھی جھوٹ نہیں کہا مجھے امید ہے کہ اللہ اس مشکل کو خود حل فرما دے گا۔

بہرحال رسولؐ اللہ نے ارادہ کیا کہ بلال پر حدِ قذف جاری کریں کیونکہ اس کے پاس اپنے دعویٰ پر گواہ موجود نہ تھے۔

اس موقع پر انصار ایک دوسرے سے کہتے تھے دیکھا! وہی سعد بن عبادہ والی بات پوری ہوگئی تو کیا سچ مچ رسولؐ اللہ بلال کو تازیانے لگائیں گے اور اس کی گواہی رد کردیں گے۔

اس موقع پر رسولؐ اللہ پر وحی نازل ہوئی اور اس کے آثار آنحضرتؐ کے چہرے پر ظاہر ہوئے سب خاموش تھے کہ دیکھیں اللہ کی طرف سے کیا نیا پیغام آیا ہے۔

اس وقت مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں[1]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کے حل کے لیے مسلمانوں کو ایک دقیق راہ بتائی کہ جس کی تفصیل آپ ذیل میں پڑھیں گے۔

تفسیر

بیوی پر تہمت لگانے کی سزا

جیساکہ شانِ نزول سے ظاہر ہے زیرِ نظر آیات حدِ قذف پر تبصرے کے طور پر ایک استثنائی حکم بیان کر رہی ہیں کہ اگر شوہر اپنی بیوی پر منافیٔ عفت عمل کا الزام عائد کرے اور کہے کہ میں نے اسے غیر مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں دیکھا ہے تو اس پر اسی کوڑے کی حدِ قذف جاری نہیں ہوگی لیکن اس کا دعویٰ بغیر دلیل و شاہد کے قبول بھی نہیں کیا جائے گا کیوں اس میں سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال ہے۔

یہاں قرآن نے اس مسئلے کا ایسا حل پیش کیا ہے کہ جو بہترین بھی ہے اور عادلانہ بھی اور وہ یہ کہ شوہر اپنے دعوے میں سچا ہونے کے لیے چار مرتبہ گواہی دے، جیساکہ قرآن فرماتا ہے: جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہیں اور اپنے علاوہ ان کے پاس کوئی گواہ نہیں تو دعویٰ کرنے والوں میں سے ہر شخص چار مرتبہ اللہ کے نام کی شہادت دے کہ وہ سچوں میں سے ہے (والذین یرمون ازواجهم ولم یکن لهم شهداء الا انفسهم فشهادة احدهم اربع شهادات بالله انه لمن الصادقین)۔

اور پانچویں دفعہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو (والخامسة ان لعنة الله علیه ان کان من الکاذبین)۔

یعنی شوہر اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے اور حدِ قذف سے بچنے کے لیے چار مرتبہ یہ جملہ کہے:

اشهد بالله انی لمن الصادقین فیما رمیتها به من الزنا

میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس عورت پر جو الزام لگایا ہے اس میں میں سچا ہوں۔

لعنة الله علی ان کنت من الکاذبین

[1] تفسیر مجمع البیان، فی ظلال، نور الثقلین اور المیزان (کچھ فرق کے ساتھ)۔

اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت

یہاں عورت کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مرد کے الزام کی نفی نہ کرے اور اس کی بات کی تصدیق کردے تو جیساکہ بعد کی آیات میں آئے گا اس کے لیے حدِ زنا ثابت ہوجائے گی۔

دوسرا راستہ زنا کی سزا سے بچنے کا ہے اور وہ یہ کہ وہ چار مرتبہ اللہ کو گواہ قرار دے کر کہے کہ اس مرد نے غلط الزام لگایا ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے (ویدرء عنها العذاب ان تشهد اربع شهادات بالله انه لمن الکاذبین)۔

اور پانچویں مرتبہ کہے: اس پر خدا کا غضب ہو اگر مرد اس الزام میں سچا ہے (والخامسة ان غضب الله علیها ان کان من الصادقین)۔

یعنی مرد نے جو پانچ مرتبہ اس عورت کے خلاف گواہی دی ہے وہ عورت بھی پانچ مرتبہ اس کی نفی کرے۔ پہلے چار مرتبہ یوں کہے:

اشهد بالله انه لمن الکاذبین فیما رمانی به من الزنا

میں خدا کو گواہ بناتی ہوں کہ اس نے میری طرف جو نسبت دی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے۔

اور پانچویں دفعہ یہ کہے:

ان غضب الله علی ان کان من الصادقین

اگر وہ سچ کہتا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں جو لفظ "لعن" آیا ہے اس کی مناسبت سے اس سارے عمل کو "لعان" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس عمل سے چار نتیجے مرتب ہوں گے:

(۱) صیغہ طلاق کی ضرورت کے بغیر ہی فوراً میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے۔

(۲) یہ عورت اور مرد ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے پر حرام ہوجائیں گے۔ یعنی نئے سرے سے ان کی شادی کا امکان ختم ہوجائے گا۔

(۳) قذف کی حد مرد سے اور زنا کی حد عورت سے اٹھ جائے گی (لیکن اگر ان میں سے مرد یہ کام نہ کرے تو اس پر قذف کی حد جاری ہوگی اور عورت یہ کلمات نہ کہے تو اس پر زنا کی حد جاری ہوگی)۔

(۴) اس واقع کے نتیجے میں جو بچہ پیدا ہوگا وہ اس مرد کا نہیں سمجھا جائے گا یعنی اس سے منسوب نہیں ہوگا البتہ عورت سے منسوب رہے گا۔

البتہ ان احکام کی تفصیلات زیرِ بحث آیات میں نہیں ہیں۔ فقط آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی اور وہ توبہ قبول کرنے والا اور حکیم نہ ہوتا تو سب کے سب تباہ ہوجاتے یا سخت سزاؤں میں مبتلا ہوجاتے (ولولا فضل الله علیکم و رحمته وان الله تواب حکیم)۔

یہ آیت درحقیقت مندرجہ احکام پر تاکید کے طور پر ایک اجمالی اشارہ ہے کیونکہ یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ "لعان"

کا عمل اللہ کا ایک فضل و کرم ہے اور وہ اس سلسلے میں میاں بیوی کے ایک مشکل معاملے کو صحیح طریقے سے حل کر دیتا ہے۔

ایک طرف تو وہ شوہر کو مجبور نہیں کرتا کہ اگر اس نے اپنی بیوی کو بدکاری کے عالم میں دیکھا ہے تو وہ خاموش رہے اور فریادرسی کے لیے حاکم شرع کے پاس نہ آئے اور دوسری طرف عورت کو صرف اس الزام پر زنائے محصنہ کی حد جاری نہیں کر دیتا بلکہ اسے صفائی کا حق دیتا ہے جبکہ تیسری طرف شوہر کے لیے ضروری قرار نہیں دیتا کہ اگر اُس نے کوئی ایسا کام دیکھا ہے تو لازماً چار گواہ ڈھونڈے اور اس الناک راز کو عریاں کرے اور چوتھی طرف اس عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتا ہے کیونکہ اب وہ مل جل کر زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہے۔ یہاں تک کہ انہیں آئندہ بھی ایک دوسرے سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اگر الزام سچا ہو تو وہ نفسیاتی طور پر اس ازدواجی زندگی کو جاری نہیں رکھ سکتے اور اگر جھوٹا الزام ہو تو عورت کے جذبات اس طرح سے مجروح ہو چکے ہوں گے کہ اب اس کے لیے مشکل ہو گا کہ وہ یہ زندگی جاری رکھ سکے کیونکہ اس عمل سے نہ صرف سردمہری پیدا ہو جائے گی بلکہ عداوت شروع ہو جائے گی اور پانچویں رُخ سے اس معاملے میں بچے کے بارے میں بھی ذمہ داری واضح کر دی گئی ہے۔

یہ ہے بندوں پر اللہ کا فضل و رحمت اور اس کا توّاب و حکیم ہونا ——— وہ اللہ کہ جس نے اس مسئلے کے نہایت باریک اور عادلانہ حل کی راہ کھول دی ہے اور اگر ہم صحیح طرح سے غور کریں تو چار گواہوں کے لزوم کا اصل حکم بھی کاملاً ختم نہیں ہوا بلکہ مرد اور عورت جو چار چار مرتبہ شہادت دیتے ہیں ان میں سے ہر شہادت ایک گواہ کا قائم مقام ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ حکم قذف صرف بیوی اور شوہر کے لیے کیوں مخصوص ہے؟ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیوی اور شوہر کو کیا خصوصیت حاصل ہے کہ الزام کے موقع پر اُن کے لیے یہ استثنائی حکم صادر ہوا ہے۔

اس سوال کا ایک جواب تو آیت کی شانِ نزول سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر مرد اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھے تو اس کے لیے ممکن نہیں کہ خاموش رہے۔ اس کی غیرت کیونکر اجازت دے سکتی ہے کہ اپنے حریم ناموس میں ایسے تجاوز پر کسی ردّعمل کا اظہار نہ کرے۔ جبکہ وہ قاضی کے پاس جا کر داد و فریاد کرے گا تو فوراً اس پر حدِ قذف جاری ہو جائے گی کیونکہ قاضی کو کیا معلوم کہ وہ سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ نیز اگر وہ چار گواہ تلاش کرنا چاہے تو یہ بھی ہتکِ عزت ہے علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ گواہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ معاملہ ہی ختم ہو جائے۔

اس مسئلے کا ایک رُخ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیر لوگ تو بہت جلد ایک دوسرے پر الزام دھر دیتے ہیں لیکن میاں بیوی بہت کم ایک دوسرے پر الزام عائد کرتے ہیں۔ اسی بناء پر غیر لوگ ہوں تو چار گواہ ضروری ہیں ورنہ حدِ قذف جاری ہو گی لیکن میاں بیوی کے بارے میں ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا حکم مذکور انہیں کے لیے مخصوص ہے۔

۲۔ "لعان" ایک مخصوص عمل: آیات کی تفسیر میں جو وضاحت ہو چکی ہے اس سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں جو مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ چار دفعہ اللہ کو شاہد قرار دے کر کہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ دراصل اپنے اپنے مقام پر ان میں سے ہر شہادت ایک گواہ کی قائم مقام ہے اور پانچویں مرتبہ وہ مزید تاکید کے لیے کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ

کی لعنت ہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان احکام و قوانین کے اجراء کا تعلق عموماً ایک اسلامی ماحول اور مذہبی فضا سے ہے اور جب کوئی یہ دیکھے گا کہ اسے حاکمِ اسلامی کے سامنے اس طرح سے قطعی طور پر اللہ کو گواہی کے لیے بلانا ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجنا ہے تو اکثر اوقات وہ غلط اقدام سے بچے گا اور یہی چیز جھوٹے الزامات کے راستے میں دیوار بن جاتی ہے۔

یہ بات تو مرد کے بارے میں تھی باقی رہا یہ کہ عورت اپنی صفائی کے لیے چار مرتبہ اللہ کو گواہ قرار دیتی ہے تو یہ مرد اور عورت میں برابری برقرار رکھنے کے لیے ہے۔ نیز عورت پر چونکہ الزام عائد کیا گیا ہے اس لیے وہ پانچویں مرحلے میں مرد کی عبارت سے زیادہ شدید الفاظ میں اپنا دفاع کرے گی اور جھوٹی ہونے کی صورت میں وہ اپنے لیے غضبِ خدا خریدے گی۔

اور ہم جانتے ہیں کہ لعنت سے مراد رحمتِ خدا سے دوری ہے لیکن غضب لعنت سے کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ غضب اور سزا و عذاب لازم و ملزوم ہیں کہ جو رحمت سے دوری سے بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ "مغضوب علیہم" "ضالین" سے بدتر ہیں جبکہ مسلّم ہے کہ "ضالین" "رحمتِ خدا سے دُور ہیں۔

۳۔ آیت میں جملۂ شرطیہ کی جزائے محذوف: زیرِ بحث آخری آیت جملۂ شرطیہ کی شکل میں ہے کہ جس کی جزا ذکر نہیں ہوئی صرف اسی قدر فرمایا گیا ہے:

اگر خدا کا فضل و رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ وہ توّاب و حکیم نہ ہوتا

لیکن یہ نہیں فرمایا گیا کہ پھر کیا ہوتا؟

کلام کے قرائن کی طرف توجہ کریں تو اس شرط کی جزا واضح ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حذف اور خاموشی ایک مطلب کو زیادہ اہمیت دے دیتی ہے اور انسان کے ذہن میں بہت سے احتمالات پیدا کر دیتی ہے کہ جن میں سے ہر ایک اس گفتگو کو ایک نیا مفہوم دیتا ہے۔

مثلاً یہاں ممکن ہے شرط کی جزاء یہ ہو کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ تمہارے کاموں سے پردہ اٹھا دیتا تمہارے راز ظاہر ہو جاتے اور تم ذلیل و رسوا ہو جاتے۔

یا ہو سکتا ہے شرط کی جزاء یہ ہو کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہو تو وہ تمہیں فوراً ہی عذاب دیتا اور ہلاک کر دیتا۔

یا ہو سکتا ہے شرط کی جزاء یہ ہو کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ تم انسانوں کیلئے ایسے بچے تلے قوانین مقرر نہ کرتا۔

درحقیقت شرط کی جزاء کا یہ محذوف ہونا سننے والے کے ذہن کو ان تمام امور کی طرف متوجہ کر دیتا ہے[1]

---

[1] تفسیر المیزان میں ایک نہایت جامع جواب شرط نقل کیا گیا ہے۔ از امیں اور بھی کئی تفسیریں آجاتی ہیں۔ بہرحال اس کے مطابق تقدیر کلام اس طرح ہے:

لولا ما انعم اللہ علیکم من نعمة الدین وتوبته لـه یکم وتشریع الشرایع لنظم امور حیاتکم، لزمتکم الشقوة، واهلکتکم المعصیة والخطیئه، واختل نظام حیاتکم بالجهالة

اگر نعمتِ دین کی صورت میں، قبولیتِ توبہ کی صورت میں اور نظامِ زندگی چلانے کے لیے قوانین کی صورت میں اللہ کا تم پر انعام نہ ہوتا تو بدبختی تمہارے لیے لازم ہو جاتی اور معصیت و خطا تمہیں مار ڈالتی اور جہالت کے باعث تمہارا نظامِ حیات درہم برہم ہو جاتا۔

۱۱۔ إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم
بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ
وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○
۱۲۔ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ
خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ○
۱۳۔ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ
فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ○
۱۴۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ
فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○
۱۵۔ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ
وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ○
۱۶۔ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا
سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ○

ترجمہ

۱۱۔ اتنی بڑی تہمت لگانے والا تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ تھا لیکن یہ خیال نہ کرو کہ یہ ماجرا تمہارے لیے بُرا تھا بلکہ اس میں تمہارے لیے خیر ہے۔ جس کسی نے اس میں جس قدر حصہ لیا اس قدر گناہ اس کے ذمے ہے اور جس نے اس کا بڑا حصہ اپنے ذمے لیا اس کے لیے عذابِ عظیم ہے۔

۱۲۔ جس وقت تم نے یہ (تہمت والی) بات سنی تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ نیک گمان کیوں نہیں کیا۔ تم نے کیوں نہیں کہا کہ یہ بہت بڑا اور واضح جھوٹ ہے۔

۱۳۔ ان لوگوں نے چار گواہ کیوں پیش نہیں کیے، اب جب کہ وہ گواہ پیش نہیں کر سکے تو اللہ کے نزدیک وہ جھوٹے ہیں۔

۱۴۔ اور اگر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو تمہارے اس خودکردہ گناہ پر تمہیں سخت عذاب پہنچتا۔

۱۵۔ وہ وقت یاد کرو جب تم اتنے بڑے جھوٹ کے پیچھے چل پڑے اور تمہاری ایک زبان سے یہ جھوٹ دوسری زبان تک پہنچتا چلا گیا اور تم اپنے منہ سے ایسی بات کہتے رہے جس کا تمہیں یقین نہیں تھا اور تم اسے ایک معمولی سا مسئلہ سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔

۱۶۔ تم نے اسے سن کر یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم یہ بات کریں، خداوندا! تو منزہ ہے یہ تو عظیم بہتان ہے۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات کے لیے دو شانِ نزول نقل ہوئی ہیں۔

پہلی شانِ نزول جو زیادہ مشہور ہے اہلِ سنت کی کتب تفاسیر میں نقل ہوئی۔ شیعہ تفاسیر میں بھی بالواسطہ طور پر یہ شانِ نزول نقل ہوئی ہے۔ یہ شانِ نزول زوجہ رسولؐ حضرت عائشہ سے منقول ہے وہ کہتی ہیں:

رسولؐ اللہ جب کسی سفر پر جانے لگتے تو اپنی ازواج کے لیے قرعہ ڈالتے قرعہ جس کے نام نکلتا اُسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک جنگ[1] کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا۔ میں رسولؐ اللہ کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئی۔ اس وقت پردے کی آیت نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے میں ایک محمل پر سوار تھی۔ جنگ ختم

---

[1] جنگ بنی المصطلق، پانچ ہجری

ہوئی اور ہم واپس چل پڑے۔ مدینے کے قریب پہنچے تو رات ہو گئی۔ میں رفع حاجت کے لیے لشکرگاہ سے کچھ دُور چلی گئی۔ جب واپس آئی تو میری نظر پڑی کہ یمنی منکوں والا میرا ہار ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈنے نکل گئی اور مجھے دیر ہو گئی۔ واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ لشکر چلا گیا ہے۔ وہ میرا محمل بھی اونٹ پر رکھ کر لے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس میں موجود ہوں کیونکہ ان دنوں غذا کی کمی کے باعث عورتیں ہلکی پھلکی تھیں علاوہ ازیں میری عمر بھی کم تھی۔ بہر حال میں وہاں تن تنہا رہ گئی۔ میں نے سوچا کہ جب گھر پہنچیں گے اور مجھے نہیں پائیں گے تو میری تلاش میں نکلیں گے۔ رات میں نے اسی بیابان میں بسر کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ لشکر اسلام کا ایک فرد "صفوان" بھی لشکرگاہ سے دُور رہ گیا تھا۔ وہ بھی رات اسی بیابان میں تھا۔ دن چڑھا تو دُور سے اُس نے مجھے دیکھا تو قریب آیا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا۔ اُس نے "انا للہ و انا الیہ راجعون" کہا۔ اس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اُس نے اپنا اونٹ بٹھایا اور میں اس پر سوار ہو گئی۔ اُس نے ناقہ کی مہار پکڑ لی اور چلتا رہا یہاں تک کہ ہم لشکرگاہ میں پہنچ گئے۔

یہ منظر دیکھا تو کچھ لوگ میرے بارے میں پراپیگنڈا کرنے لگے اور اپنے آپ کو (عذاب الٰہی میں گرفتار کر کے) ہلاکت میں ڈالنے لگے۔ اس تہمت طرازی میں عبداللہ بن ابی سلول نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ہم مدینہ میں پہنچے اور یہ پراپیگنڈا شہر میں پھیل گیا جبکہ مجھے اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

اس دوران میں میں بیمار ہو گئی۔ رسول اللہؐ مجھے دیکھنے کے لیے تو آئے لیکن مجھے وہ پہلے سی مہربانی دکھائی نہ دیتی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میری صحت اچھی ہو گئی۔ باہر نکلی تو رفتہ رفتہ مجھے اپنی قریب کی عورتوں سے منافقین کے پراپیگنڈے کا پتہ چلا تو میں سخت بیمار ہو گئی۔

رسول اللہؐ مجھے دیکھنے کے لیے آئے تو میں نے آپ سے اپنے باپ کے گھر جانے کی اجازت چاہی۔

جب میں اپنے باپ کے گھر آئی تو میں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا: غم نہ کرو، جن عورتوں کو امتیاز حاصل ہے اور دوسرے ان سے حسد کرتے ہیں، ان کے بارے میں بہت کچھ باتیں ہوتی رہتی ہیں۔

اس موقع پر رسول اللہؐ نے علیؑ بن ابی طالبؑ اور اسامہ بن زیدؓ سے مشورہ کیا کہ ان باتوں کے بارے میں میں کیا کروں۔

اسامہؓ نے کہا: یا رسول اللہؐ! وہ آپ کی زوجہ ہیں۔ ہم نے اُن سے بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا (لہٰذا لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہ کریں)۔

لیکن علیؑ نے کہا: اللہ نے آپ پر کوئی سختی نہیں کی۔ ان کے علاوہ بھی بہت بیویاں ہیں۔ آپؐ ان کی کنیز سے اس کے بارے میں تحقیق کر لیجئے۔

رسول اللہؐ نے میری کنیز کو بلایا اور اس سے پوچھا: کیا تو نے عائشہ کے بارے میں کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو شک و شبہ پیدا کرے؟ کنیز نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں نے ان سے کوئی غلط کام نہیں دیکھا۔

اس وقت رسول اللہؐ نے ارادہ کیا کہ یہ باتیں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:

اے مسلمانو! اگر کوئی شخص (آپؐ کا اشارہ عبداللہ بن ابی سلول کی طرف تھا) مجھے میری اس بیوی کے معاملے میں رنج پہنچائے جس سے میں نے پاکیزگی کے سوا کچھ نہیں دیکھا تو اگر میں اسے سزا دوں تو مجھے معذور سمجھنا اور اگر کسی ایسے شخص پر تہمت لگائی جائے کہ جس سے میں نے ہرگز کوئی برائی نہیں دیکھی تو مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

سعد بن معاذ انصاری کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی: آپ حق رکھتے ہیں، اگر وہ شخص قبیلۂ اوس سے ہوا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا (سعد بن معاذ قبیلۂ اوس کے سردار تھے) اور اس کا تعلق قبیلۂ خزرج کے ہمارے بھائیوں سے ہے تو آپ حکم دیجئے تاکہ ہم اس پر عمل کریں۔

سعد بن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار تھے وہ ایک صالح شخص تھے لیکن اس موقع پر انہیں قومی تعصب نے آگھیرا (عبداللہ بن ابی سلول جس نے یہ جھوٹا پراپیگنڈا کیا تھا اس کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا)۔ سعد بن عبادہ نے سعد بن معاذ کی طرف رُخ کیا اور کہا: تو جھوٹ کہتا ہے۔ اگر وہ ہمارے قبیلے سے ہوا تو ایسے شخص کو قتل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

اسید بن حضیر سعد بن معاذ کا چچازاد تھا۔ اُس نے سعد بن عبادہ کی طرف رُخ کیا اور کہا: تو غلط کہتا ہے واللہ ہم ایسے شخص کو قتل کر کے رہیں گے، تو منافق ہے اور منافقوں کی حمایت کرتا ہے۔

کوئی کسر نہ رہ گئی تھی کہ اوس و خزرج باہم دست و گریباں ہو جائیں اور ان کے درمیان جنگ چھڑ جائے جبکہ رسول اللہؐ منبر پر بیٹھے تھے۔ آخر کار آنحضرتؐ نے انہیں خاموش کیا۔

معاملہ اسی طرح رہا۔ میں بہت غمزدہ تھی۔ ایک مہینہ گزر گیا کہ رسول اللہ میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ میں جانتی تھی کہ میرا دامن پاک ہے اور آخر کار اللہ اس بات کو واضح کر دے گا۔

بالآخر ایک روز رسول اللہؐ میرے پاس آئے۔ آپ بہت خوش تھے۔ آپ نے آتے ہی یہ فرمایا: تجھے خوشخبری ہو کہ اللہ نے تجھے اس الزام سے بری قرار دیا ہے۔

اس موقع پر ان الذین جاءو بالافک .... کی تمام آیات نازل ہوئیں۔

(اور ان آیات کے نزول کے بعد ان سب افراد پر حدِ قذف جاری کی گئی جنہوں نے یہ جھوٹ پھیلایا تھا)[1]

ایک اور شانِ نزول جو پہلی شانِ نزول کے ساتھ بعض کتب میں مذکور ہے، کچھ اس طرح ہے:

رسول اللہؐ کی زوجہ عائشہ نے آپ کی زوجہ ماریہ قبطیہ پر تہمت لگائی کیونکہ ماریہ قبطیہ کا رسول اللہؐ سے ایک بیٹا تھا۔ ابراہیم ان کا نام تھا۔ وہ دنیا سے چل بسے تو رسول اللہؐ شدید غمگین ہوئے۔

عائشہ نے کہا: آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں، وہ تو درحقیقت آپ کا بیٹا ہی نہ تھا وہ تو جریح قبطی کا بیٹا تھا۔

آنحضرت نے یہ بات سنی تو حضرت علیؑ کو جریح کے قتل پر مامور کیا کہ جو اس قسم کے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔

جب علیؑ برہنہ شمشیر لیے جریح کی تلاش میں نکلے تو اُس کی آپ پر نظر پڑی۔ اُس نے علیؑ کے چہرے پر آثار غضب دیکھے تو بھاگ کھڑا ہوا اور کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔

جب اس نے محسوس کیا کہ ہوسکتا ہے علیؑ اس تک آپہنچیں تو اُس نے درخت سے چھلانگ لگادی۔ اس اثنا میں اس کا لباس اوپر ہوگیا تو معلوم ہوا کہ اُس کا تو آلۂ تناسل بالکل ہے ہی نہیں۔

علیؑ رسول اللہؐ کی خدمت میں واپس آئے اور عرض کی: آپ کے حکم پر قطعی طور پر عمل کروں یا تحقیق کروں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: تحقیق کرلو۔

اس پر علیؑ نے وہ واقعہ رسول اللہؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ اس پر پیغمبرِ خداؐ اللہ کا شکر بجا لائے اور فرمایا: اُس اللہ کا شکر ہے جس نے بدی اور آلودگی کو ہمارے دامن سے دُور رکھا۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس مسئلے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔[2]

[1] جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں ذکر کیا ہے یہی روایت تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اکثر کتبِ تفاسیر میں موجود ہے، ہم نے اسے کچھ اختصار سے ذکر کیا ہے۔
[2] تفسیر المیزان، نور الثقلین اور صافی ——— تلخیص کے ساتھ۔

شانِ نزول کے بارے میں تحقیق

پہلی شانِ نزول جیسا کہ ہم نے کہا ہے بہت سی اسلامی کتب میں موجود ہے لیکن اس میں کئی ایک مبہم نقاط موجود ہیں مثلاً

(۱) اس حدیث میں الفاظ کے اختلاف کے باوجود یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ اس پراپیگنڈا کے زیر اثر آگئے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اس سلسلے میں مشورے اور بات چیت کے لیے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک میٹنگ کی بلکہ عائشہ سے بھی اپنا رویہ تبدیل کرلیا اور طویل عرصے تک ان سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی اور اسی طرح دیگر کئی ایک ایسے اقدامات کیے کہ جو اس امر کی حکایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس پراپیگنڈا کو بہت حد تک قبول کرلیا تھا۔ یہ امر نہ فقط آپؐ کے مقامِ عصمت کے خلاف ہے بلکہ ایک عام باایمان ثابت قدم مسلمان کو بھی اس قسم کے بے دلیل پراپیگنڈا کا اثر قبول نہیں کرنا چاہیے اور اگر فکری طور پر کوئی اس سے متاثر ہو بھی تو عملاً اس کی وجہ سے اپنا طرزِ عمل نہیں بدلنا چاہیے اور اسے تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ ایک معصوم کہ جس کا مقام اور قدر و منزلت واضح ہے۔

اگلی آیتوں میں اس پراپیگنڈا کا اثر قبول کرنے والے مؤمنین کو شدید سرزنش کی گئی ہے کہ انہوں نے چار گواہوں کا مطالبہ کیوں نہیں کیا۔ کیا باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ شدید عتاب اور سرزنش پیغمبر اکرمؐ کے لیے بھی ہو؟ یہ ایک اہم اعتراض ہے کہ جو کم از کم اس شانِ نزول کے بارے میں شک ضرور پیدا کرتا ہے۔

(۲) ظاہرِ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قذف سے مربوط حکم واقعۂ افک سے پہلے نازل ہوا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے باوجود رسول اللہؐ نے عبداللہ بن ابی سلول اور دیگر ان لوگوں پر اسی دن خدائی حد کیوں جاری نہ کی کہ جنہوں نے یہ تہمت لگائی تھی (البتہ اگر آیۂ قذف اور واقعۂ افک سے مربوط آیتیں اکٹھی نازل ہوئی ہوں تو پھر یہ اعتراض ختم ہوجائیگا لیکن پہلا اعتراض اسی شدت سے باقی رہے گا)[1]

رہی دوسری شانِ نزول کی بات تو اسے قبول کرنا تو اور بھی مشکل ہے کیونکہ:

اولاً اس شانِ نزول کے مطابق یہ تہمت صرف ایک خاتون نے لگائی تھی جبکہ آیات صراحت کے ساتھ کہتی ہیں کہ یہ متعدد افراد کا کام تھا اور انہوں نے مل کر یہ پراپیگنڈا کیا تھا اور بات پورے ماحول میں پھیل گئی تھی۔ اسی لیے ان مسلمانوں پر عتاب و سرزنش کے لیے جو ضمیریں استعمال ہوئی ہیں سب جمع کی ہیں اور یہ امر دوسری شانِ نزول سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔

ثانیاً یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اگر یہ تہمت حضرت عائشہ نے لگائی تھی اور بعد ازاں معاملہ اس کے برخلاف ثابت ہوگیا تو پھر رسول اللہؐ نے ان پر حدِ تہمت کیوں جاری نہیں کی؟

ثالثاً کیونکر ممکن ہے کہ صرف ایک عورت کی گواہی پر رسول اللہؐ کسی ملزم کے قتل کا حکم صادر فرمادیں جبکہ سوکنوں میں رقابت و حسد تو معمول کی چیز ہے۔ یہ امر تقاضا کرتا تھا کہ آپؐ کو اس الزام میں حق و عدالت سے انحراف کا احتمال پیدا ہوتا یا کم از کم یہ احتمال

[1] المیزان ج ۱۵ ص ۱۰۱

پیدا ہوتا کہ ہو سکتا ہے اسے اشتباہ ہوا ہو۔

بہرحال ہمارے لیے جو کچھ اہم ہے وہ یہ شانِ نزول نہیں۔ اہم یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ مجموعی طور پر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت ایک بے گناہ شخص پر کچھ لوگوں نے بدکاری کا الزام لگایا تھا اور یہ پراپیگنڈا معاشرے میں پھیل چکا تھا۔ نیز آیت میں موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص پر تہمت لگائی گئی تھی کہ جو اُس معاشرے میں خاص اہمیت کا حامل تھا اور منافقین کہ جو ظاہراً مسلمانوں میں شامل تھے اس سے غلط مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ آیات نازل ہوئیں اور بے مثال قاطعیت کے ساتھ اس حادثے کا مقابلہ کیا۔ ان آیات نے بدزبان منحرفین اور سیاہ دل منافقین کی سازشوں کو بُری طرح سے ناکام بنا دیا۔

واضح ہے کہ شانِ نزول کچھ بھی ہو ان آیات کے مفہوم کو زمان و مکان میں منحصر نہیں کیا جا سکتا اور ان کا حکم ہر معاشرے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔

ان تمام باتوں کے بعد اب ہم تفسیرِ آیات کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ہم دیکھیں کہ قرآن نے کیسی فصاحت و بلاغت سے اس واقعے کو باریکیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ مسئلہ حل ہو گیا اور سچ جھوٹ میں فرق نمایاں ہو گیا۔

تفسیر

ایک بہت بڑی تہمت

زیرِ نظر پہلی آیت واقعہ بیان کیے بغیر کہتی ہے: جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا وہ تمہی میں سے تھے (ان الذین جاءوا بالافك عصبة منكم)۔

بلاغت کے فنون میں سے ایک یہ ہے کہ زیادہ جملوں کو حذف کر کے ایسے الفاظ پر اکتفاء کیا جاتا ہے کہ جو ضروری مفہوم پر دلالت کرتے ہوں۔

لفظ "افك" (بروزن "فکر")، بقولِ راغب ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس کی اصلی و طبیعی حالت بدل جائے۔ مثلاً اپنے اصلی راستے سے ہٹ جانے والی مخالف ہواؤں کو "مؤتفكة" کہتے ہیں۔ بعد ازاں حق سے منحرف اور خلافِ واقعہ ہر گفتگو کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اسی لحاظ سے جھوٹ، تہمت اور بہتان کو بھی "افك" کہا جاتا ہے۔

مجمع البیان میں مرحوم علامہ طبرسی نے کہا ہے کہ ہر جھوٹ کو "افک" نہیں کہتے بلکہ ایسے بڑے جھوٹ کو کہتے ہیں کہ جو معاملے کی اصل صورت ہی بدل دے۔ اس لحاظ سے لفظ "افک" بذاتِ خود تہمت کے اس واقعے کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔

لفظ "عصبة" (بروزن "غصّہ") دراصل "عصب" کے مادے سے ان خاص ریشوں اور رگوں کے معنی میں ہے کہ جو انسانی اعضاء کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ مجموعی طور پر انہیں "اعصاب" کہتے ہیں۔ بعد ازاں یہ لفظ اس گروہ اور جمعیت کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ

جس کے افراد باہم متحد و مربوط ہوں، آپس میں ہم فکر بھی ہوں اور ہم کار بھی۔ خصوصیت سے اس لفظ کا استعمال نشاندہی کرتا ہے کہ واقعۂ افک کا منصوبہ بنانے والے باہم بہت قریب اور مربوط تھے اور انہوں نے اس کے لیے بہت مضبوط جال بُنا تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ عموماً دس تا چالیس افراد کے گروہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔[1]

بہرحال اس جملے کے بعد قرآن اُن مومنین کی دلجوئی کرتا ہے کہ جو ایک پاکدامن شخص پر یہ تہمت لگنے کی وجہ سے شدید ناراحت تھے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ گمان نہ کرو کہ یہ واقعہ تمہارے لیے بُرا ہے بلکہ یہ تمہارے لیے باعثِ خیر ہے (لاتحسبوه شرًّا لكم بل هو خير لكم)۔ کیونکہ اس واقع نے شکست خوردہ دشمنوں اور کوردل منافقوں کے ارادوں سے پردہ اٹھا دیا ہے اور اس نے ان بدسیرت خوش نما افراد کو رُسوا کر دیا ہے۔ نیز یہ بات کتنی اچھی ہے کہ ایک امتحان کی وجہ سے وہ لوگ روسیاہ ہو کر سامنے آجائیں کہ جو دل میں کھوٹ رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو یہ لوگ پہچانے ہی نہ جاتے اور آئندہ کبھی زیادہ خطرناک ضرب لگاتے۔

اس واقعے نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ پراپیگنڈا کرنے والے کی پیروی بہت نقصان دہ ہے لہٰذا اُنہیں چاہیے کہ ایسے طرزِ عمل کے خلاف قیام کریں۔

اس واقعے نے ایک درس مسلمانوں کو یہ بھی دیا کہ واقعات کے صرف ظاہر پر نظر نہ رکھیں کیونکہ بعض اوقات ظاہراً اچھے نہ لگنے والے واقعات باطنی طور پر بہت باعثِ خیر ہوتے ہیں۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ "لکم" کی ضمیر استعمال کر کے اس واقعے میں تمام مسلمانوں کو شریک گردانا گیا ہے اور دراصل ہے بھی ایسا ہی کیونکہ معاشرتی اور اجتماعی حوالے سے مسلمان ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ غموں اور خوشیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

اس آیت کے بعد دو نکتوں کی طرف مزید اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جن لوگوں نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے ان میں سے ہر ایک کے لیے جوابدہی اور سزا کا ایک حصہ ہے (لكل امرء منهم ما اكتسب من الاثم)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس گناہ کی ایک بھاری ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے جو اس کے بانی اور منصوبہ ساز ہیں اور ان کی اس ذمہ داری کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے کے سر کوئی ذمہ داری نہیں آتی بلکہ جو کوئی بھی جس قدر اس کام میں شریک ہے اتنی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔

مزید فرمایا گیا ہے، جس کا اس گناہ میں بڑا حصہ ہے اُس پر عذاب بھی بڑا ہو گا (والذی تولّٰی کبره منهم له عذاب عظیم)۔

مفسرین نے کہا ہے کہ یہ شخص عبداللہ بن ابی سلول تھا۔ یہ شخص اصحابِ افک کا سرغنہ تھا۔ بعض دیگر مفسرین نے مسطح بن اثاثہ اور حسان بن ثابت کو اس کا مصداق قرار دیا ہے۔

بہرحال جو شخص اس واقع کا زیادہ محرک تھا جس نے اس آگ کا پہلا شعلہ بھڑکایا تھا اور ان لوگوں کا لیڈر تھا اُس کا گناہ بڑا ہونے کی مناسبت سے اُس کی سزا بھی بہت زیادہ ہے (بعید نہیں کہ لفظ تولّی یعنی "جو اس کا رہبر بنا" اس واقعے کی رہبری کی طرف

---

[1] تفسیر روح المعانی میں یہ معنی کتاب "صحاح" کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

اشارہ ہوا۔

اس کے بعد روئے سخن ان مسلمانوں کی طرف ہے کہ جو اس واقعے میں دھوکے میں آ گئے۔ چند ایک آیات میں ان کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت تم نے یہ تہمت سنی تو مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے بارے میں اچھا گمان کیوں نہیں کیا (لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرًا)۔ یعنی جب تم نے مومن افراد کے بارے میں منافقین کی باتیں سنیں تو دوسرے مومنین کے بارے میں حسنِ ظن سے کام کیوں نہ لیا کہ جو تمہارے لیے خود ہی جیسے ہیں۔

اور کیوں نہیں کہا کہ یہ ایک بڑا اور سفید جھوٹ ہے (و قالوا ھذا افك مبین)۔ جبکہ تم تو ان منافقین کا بُرا اور رُسوا کن ماضی جانتے تھے۔ اور تم تو ان افراد کی پاک دامنی سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ جن پر بہتان لگایا جا رہا تھا۔ مختلف قرائن کی بنا پر تمہیں تو اطمینان تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ تم تو ان سازشوں سے واقف تھے کہ جو دشمن پیغمبر اکرمؐ کے خلاف کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس قسم کا جھوٹا پراپیگنڈا سن کر تمہارا خاموش رہنا لائقِ ملامت ہے۔ اس طرح تو تم شعوری یا لاشعوری طور پر اس الزام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن گئے ہو

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ آیت نے یہ نہیں کہا کہ جس پر تہمت لگائی گئی تھی تمہیں اُس کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا چاہیئے تھا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ تمہیں اپنے بارے میں حسنِ ظن رکھنا چاہیئے تھا۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین کا وجود ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہے اور سب کے سب گویا ایک ہی وجود ہیں۔ اگر کسی ایک پر تہمت لگے تو گویا سب پر لگی ہے اور اگر کسی ایک حصّے کو تکلیف پہنچے تو باقی حصّے قرار سے نہیں رہ سکتے اور جس طرح کسی ایک شخص پر تہمت لگے تو وہ اس کے دفاع کی کوشش کرتا ہے اسی طرح اُس کے دینی بھائی بہنوں کو بھی اس کا دفاع کرنا چاہیئے۔[1]

قرآن نے ایسے دیگر مواقع پر بھی لفظ "انفس" استعمال کیا ہے۔ سورہ حجرات کی آیت ۱۱ میں ہے:

و لاتلمزوا انفسکم

اپنے آپ کی غیبت نہ کرو۔

نیز یہ جو باایمان مردوں اور عورتوں کا ذکر کیا ہے تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان ایک ایسی صفت ہے کہ جو بدگمانیوں کو روک سکتی ہے۔

یہاں تک تو اخلاقی اور روحانی پہلو سے سرزنش کی گئی تھی اور متوجہ کیا گیا تھا کہ کسی لحاظ سے بھی مناسب نہ تھا کہ ایسی بُری تہمت پر مومنین خاموش رہتے یا کوردل سازشیوں کے آلۂ کار بنتے۔ اس کے بعد فیصلے اور حکم کا مرحلہ آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: انہیں چار گواہ پیش کرنے کے لیے کیوں نہ کہا گیا (لولا جاءو علیه باربعة شھداء)۔

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور تقدیر یوں تھی:

ظن المؤمنون والمؤمنات بانفس بعضھم خیرًا

مومن مرد اور عورتیں اپنے بعض افراد کے بارے میں اچھا گمان کریں۔

یہ احتمال معقول معلوم نہیں ہوتا اور اس سے تو کلام کی لطافت و بلاغت ہی جاتی رہتی ہے۔

اب جبکہ وہ گواہ پیش نہیں کر سکے تو اللہ کے نزدیک وہ جھوٹے ہیں (فاذلم یأتوا بالشھداء فاولئك عند الله ھم الکاذبون)۔

اس مواخذہ اور سرزنش سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار گواہوں کی شہادت اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں حدِ قذف کا حکم آیاتِ افک سے پہلے نازل ہو چکا تھا۔

رہا یہ سوال کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حد جاری کیوں نہ کی، تو اس کا جواب واضح ہے کہ جب تک لوگ ساتھ نہ دیں اس طرح کا اقدام ممکن نہیں کیونکہ بعض اوقات قبائلی تعصب آڑے آ جاتا ہے اور بعض احکام وقتی طور پر ہی سہی نافذ نہیں ہو پاتے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس واقعے میں بھی یہی معاملہ درپیش تھا۔

آخر میں مجموعی طور پر فرمایا گیا ہے: اگر اللہ کا فضل اور رحمت دنیا و آخرت میں تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو تمہیں اس کام کے باعث کہ جس میں تم داخل ہو گئے تھے عذابِ عظیم دامن گیر ہوتا (ولولا فضل الله علیکم و رحمته فی الدنیا والاٰخرة لمسکم فیما افضتم فیه عذاب عظیم)۔

"افضتم" "افاضة" کے مادہ سے زیادہ پانی نکلنے کے معنی میں ہے نیز کبھی یہ لفظ پانی میں داخل ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ اس تعبیر سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ مذکورہ تہمت کی شہرت اس قدر ہو گئی تھی کہ گویا مومنین اس کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

اگلی آیت درحقیقت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ وہ اتنے بڑے گناہ میں کیسے سادگی کے ساتھ اور آرام سے جا پڑے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کا سوچو کہ جب تم اس بڑے جھوٹ کے استقبال کے لیے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کی زبان سے یہ پراپیگنڈا اڑائے لیے جا رہے تھے (اذ تلقونه بالسنتکم)۔ اور اپنے منہ سے تم ایسی باتیں کرتے تھے کہ جن کے بارے میں تمہیں علم و یقین نہ تھا (و تقولون بافواھکم مالیس لکم به علم)۔ اور تمہیں یہ گمان تھا کہ یہ معمولی سا معاملہ ہے حالانکہ خدا کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے (و تحسبونه ھینًا و ھو عند الله عظیم)۔

آیت دراصل ان کے تین عظیم گناہوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

پہلا۔ اس پراپیگنڈا کا استقبال کرنا اور اسے ایک دوسرے کی زبان سے لینا۔ (پراپیگنڈا کو قبول کرنا)۔

دوسرا۔ اس پراپیگنڈا کو ہوا دینا جبکہ وہ اس کے بارے میں علم و یقین نہ رکھتے تھے اور اسے دوسروں تک پہنچانا (پراپیگنڈا کی کسی تحقیق کے بغیر تشہیر کرنا)۔

تیسرا۔ اس عمل کو معمولی سمجھنا حالانکہ اس کا تعلق نہ فقط دو مسلمانوں کی عزت و آبرو اور مقام و منزلت سے تھا بلکہ اس کی زد اسلامی معاشرے کی حیثیت و آبرو پر بھی پڑتی تھی (پراپیگنڈا کو معمولی سمجھنا اور اسے شغل کے طور پر لینا)۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ اس موقع پر لفظ "بالسنتکم" (تمہاری زبانیں) اور "بافواھکم" (تمہارے منہ) استعمال کیے گئے ہیں جبکہ تمام باتیں زبان اور منہ ہی سے کی جاتی ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تم نے اس پراپیگنڈا کو قبول کرنے میں دلیل کا مطالبہ کیا، نہ پھیلانے میں دلیل کا سہارا لیا۔ زبان اور منہ کی ہوائی باتوں کو ہی تم اُڑاتے رہے۔

یہ واقعہ بہت اہم تھا مگر بعض مسلمانوں نے اسے معمولی سمجھ لیا تھا۔ اس لیے ایک مرتبہ پھر انہیں سرزنش کا زوردار تازیانہ لگایا گیا

ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، جب تم نے اتنا بڑا جھوٹ سُنا تو یہ کیوں نہیں کہا کہ ہمیں اجازت نہیں ہے کہ ہم اس کے بارے میں گفتگو کریں کیونکہ یہ ایک بے دلیل تہمت ہے اے پروردگار! تو پاک ہے، یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے (ولولا اذ سمعتموہ قلتم ما یکون لنا ان نتکلم بھذا سبحانك ھذا بھتان عظیم)۔

درحقیقت پہلے تو انہیں اس لیے ملامت کی گئی تھی کہ جن پر تہمت لگائی گئی تھی انہیں حسن ظن کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھا لیکن اب فرمایا گیا ہے حسن ظن کے علاوہ تمہیں نہیں چاہیے تھا کہ اس تہمت کے بارے میں لب کشائی کرتے چہ جائے کہ تم اس کی تشہیر کرنے لگ جاؤ۔ چاہیے تھا کہ اتنی بڑی تہمت پر تم تعجب کرتے اور پروردگار کی پاکیزگی کو یاد کرتے اور ایسی تہمت کی تشہیر کی آلودگی سے خدا کی پناہ چاہتے۔ مگر افسوس کہ تم بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ اس کے قریب سے گزر گئے اور بغیر سوچے سمجھے پراپیگنڈا باز منافقین کے آلۂ کار بن گئے۔

تہمت بازی کے گناہ کی اہمیت، اس کے اسباب اس کے سدِباب کے طریقے کے بارے میں اور اسی طرح کے دیگر موضوعات پر ہم انشاء اللہ آئندہ آیات کے ذیل میں بات کریں گے۔

۱۷۔ یَعِظُکُمُ اللّٰہُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِہٖٓ اَبَدًا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

۱۸۔ وَیُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ ۭ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۝

۱۹۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۭ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

۲۰۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ وَاَنَّ اللّٰہَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝

ترجمہ

۱۷۔ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو ہرگز ایسے کام کا تکرار نہ کرنا۔

۱۸۔ اور اللہ اپنی آیتیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

۱۹۔ جو لوگ اہل ایمان میں بُرائیوں کی اشاعت چاہتے ہیں ان کے لیے دُنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

۲۰۔ اور اگر اللہ کا فضل و رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتا اور یہ خدا مہربان اور رحیم (اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہیں سخت سزا دیتا)۔

تفسیر

برائیوں کی اشاعت ممنوع ہے: زیر نظر آیات میں پھر واقعۂ افک کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ ان

یں غلط پراپیگنڈا کرنے اور نیک افراد پر خلافِ ناموس تہمت لگانے کے بُرے اور سنگین انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ قرآن متعدد بار ضروری سمجھتا ہے کہ مختلف موثر طریقوں سے اس مسئلے کا جائزہ لے اور اس کے بارے میں ایسی سخت باز پرس کرے اور محکم طریقے سے بات کرے کہ آئندہ مسلمانوں کے معاشرے میں ایسے کام کا تکرار نہ ہو۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر (خدا اور روزِ جزا پر) ایمان رکھتے ہو تو ایسے کام کا ہرگز تکرار نہ کرنا (یعظکم اللہ ان تعودوا لمثلہ ابدًا ان کنتم مؤمنین) [1]

یعنی ایمان کی نشانی یہ ہے کہ انسان بڑے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے اور اگر کوئی بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ بے ایمانی کی نشانی ہے یا پھر کمزور ایمان کی۔ یہ جملہ درحقیقت توبہ کے ایک پہلو اور حصے کی نشاندہی کر رہا ہے کیونکہ گزشتہ گناہ پر پشیمانی ہی کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ آئندہ گناہ کا تکرار نہ کرنے کا پختہ عزم کیا جائے تاکہ توبہ ہمہ گیر ہو جائے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے، یہ باتیں معمولی نہیں ہیں بلکہ تمہاری سرنوشت کے لیے حقائق ہیں کہ جو بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ تم سے بیان کیے گئے ہیں اور یہ خدائے علیم و حکیم کی طرف سے ہیں (و یبین اللہ لکم الاٰیات واللہ علیم حکیم)۔ وہ اپنے علم و آگاہی کی بناء پر تمہارے اعمال کی تمام تفصیلات سے باخبر ہے یا دوسرے لفظوں میں اپنے علم کے مطابق وہ تمہاری احتیاجات اور تمہارے خیر و شر کے عوامل سے آگاہ ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اپنے احکام کو ان سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

اس کے بعد بات کا رُخ کچھ تبدیل کیا گیا ہے۔ اب ایک شخصی واقعے سے آگے بڑھ کر ایک عمومی اور جامع قانون کی صورت میں بات کی گئی ہے تاکہ مسئلے پر کچھ اور زور دیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ اہلِ ایمان میں برائیاں شائع کرنا پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے (ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین اٰمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاٰخرۃ)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا گیا کہ جو لوگ برائیوں کو شائع کریں بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ایسا کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ جملہ درحقیقت اس سلسلے میں انتہائی تاکید کا غماز ہے۔

کہیں یہ تصور نہ کیا جائے کہ یہ تاکید اس بنا پر ہے کہ تہمت زوجۂ رسولؐ یا اس پائے کی کسی شخصیت پر لگائی گئی تھی بلکہ کسی بھی باایمان شخص کے بارے میں ایسا معاملہ درپیش ہو تو یہ تاکید اس کے بارے میں صادق آئے گی کیونکہ یہ مسئلہ شخصی یا انفرادی پہلو نہیں رکھتا اگرچہ ممکن ہے کہ کسی موقع کی مناسبت سے اس میں دوسرے پہلوؤں کا بھی اضافہ ہو جائے۔

ضمناً توجہ رہے کہ فحشاء اور برائیوں کی اشاعت فقط یہی نہیں کہ باایمان مرد یا عورت پر لگائی گئی جھوٹی تہمت کی تشہیر کی

---

[1] اس جملے کا درحقیقت ایک لفظ مقدر ہے اور وہ ہے "لا" جملہ یوں ہوگا،

یعظکم اللہ ان لا تعودوا لمثلہ ابدًا

اور اگر یہ لفظ مقدر نہ مانیں تو پھر "یعظکم" کا لفظ "ینھاکم" کے معنی میں ہونا چاہیے خدا تمہیں ایسے کام کے تکرار سے منع کرتا ہے۔

جانے اور ان پر بدکاری کا الزام لگایا جائے۔ یہ تو اس کا ایک مصداق ہے۔ بلکہ یہ تعبیر تو بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے اور اس میں ہر قسم کی برائیوں اور گناہوں کی ترویج و اشاعت اور اس میں مدد دینا شامل ہے۔ البتہ قرآن مجید میں عموماً لفظ "فحشاء" یا "فاحشہ" جنسی انحرافات اور بدکاریوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے لغوی مفہوم کے اعتبار سے "فحش" "فحشاء" اور "فاحشہ" ہر ایسے کام کو کہتے ہیں کہ جس میں بہت زیادہ بُرائی اور قباحت پائی جائے کبھی کبھار قرآن مجید میں بھی یہ لفظ وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش

جو لوگ گناہانِ کبیرہ اور قبیح اعمال سے بچتے ہیں۔ (شوریٰ - ۳۷)

اس سے زیرِ بحث آیت کے مفہوم کی وسعت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ دنیا میں بھی ان کے لیے المناک عذاب ہے، تو اس سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے اس سے شرعی حدود و تعزیرات، معاشرتی ردِ عمل اور انفرادی سطح پر بُرے نتائج مراد ہوں اور یہ ان اعمال کے وہ نتائج ہیں کہ جو ارتکاب کرنے والوں کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے لوگ حقِ شہادت سے محروم ہو جاتے ہیں اور رسوائی الگ ہوتی ہے۔

رہا آخرت کا دردناک عذاب ـــــ تو وہ رحمتِ خدا سے دُوری، غضبِ الٰہی اور آتشِ جہنم ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے و اور خدا جانتا ہے جبکہ تم نہیں جانتے (واللہ یعلم وانتم لا تعلمون)۔

اللہ تعالیٰ ـــــ برائیوں کی اشاعت کے منحوس نتائج اور دنیا و آخرت میں اس کے ہولناک انجام سے اچھی طرح آگاہ ہے لیکن تم اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے باخبر نہیں ہو۔

وہ جانتا ہے کہ اس گناہ کی چاہت کن لوگوں کے دل میں ہے ـــــ جو لوگ پُر فریب ناموں کے پسِ پردہ یہ بُرے عمل انجام دیتے ہیں وہ انہیں پہچانتا ہے لیکن تم نہ جانتے ہو اور نہ پہچانتے ہو اور وہ جانتا ہے کہ ان بُرے اور قبیح کاموں کو روکنے کے لیے کس طرح کے احکام نازل کرے۔ واقعہ افک، اشاعتِ فحشاء سے ممانعت اور پاکدامن اہلِ ایمان پر تہمت بازی سے روکنے کے سلسلے کی آخری آیت میں ایک بار پھر تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے، اگر فضل و رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی اور اللہ تم پر رحیم و مہربان نہ ہوتا تو تمہیں اسی دنیا میں ایسی دردناک سزا دیتا کہ جس سے تمہاری زندگی تاریک اور برباد ہو کر رہ جاتی (ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ وان اللہ رءوف رحیم) [1]

---

[1] اس جملے کی نظیر گزشتہ آیات میں بھی ہے۔ اس میں ایک محذوف ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے:

لولا فضل اللہ علیکم ۔۔۔۔ لمسکم فیما افضتم فیہ عذاب عظیم ۵

اگر فضل و رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو جس راہ میں تم چل نکلے ہو اس پر تمہیں عذابِ عظیم آ پکڑتا۔

چند اہم نکات

۱۔ "فحشاء" کی اشاعت سے کیا مراد ہے؟ انسان کا ایک معاشرتی وجود ہے۔ یہ معاشرہ انسان کے لیے ایک طرح سے اس کے گھر کی مانند ہے۔ اس کی حُرمت اور احترام اس کے اپنے گھر کی حُرمت اور احترام کی طرح ہے۔ معاشرے کی پاکیزگی اس کی اپنی پاکیزگی کے لیے مددگار ہے اور معاشرے کی آلودگی اس کی اپنی آلودگی کی طرح ہے۔ اس اصول کی وجہ سے اسلام نے ہر اس کام کی شدید مخالفت کی ہے کہ جو معاشرے کو غلیظ یا زہر آلود کرنے کا سبب بنے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے غیبت کی شدید مخالفت کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غیبت چھپے ہوئے عیوب کو آشکار کرتی ہے اور اس سے معاشرے کا احترام مجروح ہوتا ہے۔ عیب پوشی کے حکم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ گناہ معاشرے میں نہ پھیل جائے۔ اسلام کے احکام کی نظر میں کھلے بندوں گناہ کی اہمیت مخفی گناہ سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے فرمایا:

المذیع بالسیئة مخذول والمستتر بالسیئة مغفور له

جو شخص گناہ کی تشہیر کرے وہ مردود ہے اور جو گناہ کو مخفی رکھے اس کے لیے اللہ کی مغفرت ہے۔[1]

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ زیرِ بحث آیات میں برائیوں کو پھیلانے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور اس عمل پر شدید ڈانٹ ڈپٹ کی گئی ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔

اصولی طور پر گناہ آگ کی مانند ہے۔ اگر معاشرے میں کسی جگہ یہ بھڑک اُٹھے تو اسے بجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے یا کم از کم یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ یہ پھیلنے نہ پائے ورنہ یہ ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، اور پھر اس پر کنٹرول کرنا کسی کے بس میں نہیں رہے گا اگر لوگوں کی نظر میں گناہ ایک بڑی چیز ہو تو یہ امر بذاتِ خود گناہوں کے راستے میں ایک بڑی دیوار کی مانند ہے لیکن گناہوں اور برائیوں کی نشر و اشاعت اس دیوار کو گرا دیتی ہے اور لوگ گناہوں کو معمولی سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من اذاع فاحشة كان كمبتدئها

بُرے کام کی تشہیر کرنے والا اس کی ابتداء کرنے والے کے برابر ہے۔[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ:

ایک شخص امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کی خدمت میں آیا۔ اُس نے عرض کیا: میں آپ پر قربان، لوگ میرے ایک دینی بھائی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اُس نے ایک ایسا کام انجام دیا ہے کہ جسے میں ناپسند کرتا ہوں۔ میں نے خود اُس سے پوچھا تو اس نے انکار کیا جبکہ متعدد موثق افراد نے اُس

---

[1] اصول کافی، ج ۲، باب ستر الذنوب

[2] 〃 〃 باب التعییر

کے بارے میں یہ بات بتائی ہے۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟

امامؑ نے فرمایا:

كذب سمعك وبصرك عن اخيك وان شهد عندك خمسون قسامة وقال لك قول فصدقه وكذبهم، ولا تذيعن عليه شيئًا تشينه به وتهدم به مروته، فتكون من الذين قال الله عزوجل ان الذين يحبون ان تشيع الفاحشة في الذين أمنوا لهم عذاب اليم في الدنيا والأخرة.

اپنے مومن اور مسلمان بھائی کے مقابلے میں اپنے کان اور آنکھ کو جھٹلا دو۔ یہاں تک کہ اگر پچاس آدمی بھی آکر قسم کھا کر کہیں اُس نے فلاں کام کیا ہے جبکہ وہ کہے کہ میں نے نہیں کیا تو اس بھائی کی تصدیق کرو اور اُن کی بات ہرگز قبول نہ کرو۔ جو چیز ننگ و رسوائی کا باعث ہو اور اس کی شخصیت کو ختم کر دے اسے معاشرے میں نہ پھیلاؤ ورنہ تم اُن لوگوں میں سے شمار ہوگے کہ جن کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

جو لوگ مومنین کی برائیاں معاشرے میں پھیلانا پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔[1] و[2]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ برائیوں کے پھیلاؤ کی مختلف صورتیں ہیں۔

- کبھی جھوٹ اور بہتان کو ہوا دی جاتی ہے اور ہر کسی کو بتایا جاتا ہے۔
- کبھی ایسے مراکز کی بنیاد رکھی جاتی ہے کہ جو برائیاں پھیلنے کا سبب بنتے ہیں۔
- کبھی گناہ کے اسباب فراہم کر کے یا لوگوں کو ترغیب دے کر گناہ پھیلایا جاتا ہے۔
- کبھی بے شرمی اور بے حیائی عام کر کے اور برسرِ عام ارتکابِ گناہ کر کے بُرائی پھیلائی جاتی ہے۔

یہ سب برائیاں پھیلانے کے طریقے ہیں اور اشاعتِ فحشاء کے مصداق ہیں کیونکہ اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ (غور کیجیئے گا)۔

۲۔ غلط پراپیگنڈا ——— ایک بلا: سازشی عناصر کا نفسیاتی جنگ کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ وہ جعلی باتیں گھڑتے ہیں اور پھر اُن کا خوب پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ جو لوگ سامنے آکے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے ہوں تو یہ ہتھکنڈا اختیار کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کی فکر کو مسموم کرتے ہیں۔ انہیں اپنی طرف مشغول رکھنے کے لیے پراپگنڈا کا سہارا لیتے ہیں اور لوگوں کی توجہ حساس اور ضروری

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۵۸۲ بحوالہ کتاب ثواب الاعمال۔

[2] اس مسئلے کے کچھ استثنائی پہلو بھی ہیں۔ مثلاً عدالت میں شہادت دینا یا ایسے مواقع کہ جہاں نہی عن المنکر کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہ جائے کہ کسی شخص کا بُرا کام فاش کر دیا جائے۔

مسائل سے ہٹا دیتے ہیں۔

نیک اور پاک لوگوں کی عزت و وقار کو مجروح کرنے اور عوام کو ان سے دُور کرنے کے لیے پراپیگنڈا اور کردار کشی ایک تباہ کن ہتھیار ہے۔

زیر بحث آیات کی مشہور شانِ نزول کے مطابق منافقین نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیثیت و وقار کو داغدار کرنے کے جعلی پراپیگنڈا کا بزدلانہ طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے کسی موقع سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ کی ایک زوجہ کی پاکدامنی کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس سے ایک اچھی خاصی مدت تک مسلمانوں کے اذہان پریشان رہے۔ یہاں تک کہ ثابت قدم اور سچے مومنین بھی سخت اذیت میں تھے۔ پھر خدا کی وحی ان کی مدد کے لیے آئی اور ایسا پراپیگنڈا کرنے والے منافقوں کی خوب خبر لی کہ جو سب کے لیے باعثِ عبرت بن گئی۔

جن معاشروں میں سیاسی گھٹن ہو وہاں پراپیگنڈا کا ہتھیار بہت مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں سے انتقام لینے، کردار کشی کرنے، اعتماد کی فضا خراب کرنے اور بنیادی مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے پراپیگنڈا کا سہارا لیا جاتا ہے۔

یہ بات کافی نہیں کہ ہم ایسے پراپیگنڈا کے محرکات سے آگاہ ہوں بلکہ اہم تر یہ ہے کہ عوام کو ایسا پراپیگنڈا کرنے والوں کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے اور انہیں اپنے ہاتھوں اپنی نابودی سے روکا جائے اور انہیں سمجھایا جائے کہ ایسی بات جہاں سُنیں وہیں دفن کر دیں ورنہ دشمن کی خوشنودی اور کامیابی کا باعث بن جائیں گے اور اس کے علاوہ دنیا و آخرت میں عذابِ الیم کا مزہ بھی چکھنا ہوگا۔ جیسا کہ زیر بحث آیات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

۴۔ گناہ کو معمولی سمجھنا: زیر بحث آیات میں جہاں برائیاں پھیلانے جیسے گناہ کی مذمت کی گئی ہے وہاں اس گناہ کو معمولی سمجھنے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ واقعاً گناہ کو معمولی اور چھوٹا سمجھنا بذاتِ خود ایک گناہ ہے۔ جو شخص گناہ کرتا ہے۔ پھر اُسے یہ خیال ستاتا ہے کہ اُس سے بہت برا کام ہو گیا اور وہ اپنے کام پر ناراحت ہوتا ہے۔ ایسا شخص ہی توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن جو شخص اپنے گناہ کو معمولی سمجھتا ہے اور اسے اہمیت نہیں دیتا یہاں تک کہ کہہ گزرتا ہے: کیا ہوا اگر میں نے یہ گناہ کیا ہے!

اس شخص نے بہت خطرناک راستہ اختیار کر لیا ہے اور اس خیال کے باعث وہ گویا مسلسل گناہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ اسی بنا پر ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اشد الذنوب ما استهان به صاحبه

سب سے بڑا گناہ وہ ہے کہ جسے انجام دینے والا معمولی سمجھے[1]

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۳۴۸

۲۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ
وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ
وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا
زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○
۲۲۔ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي
الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَ
لْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
۲۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ
لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○
۲۴۔ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ
بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○
۲۵۔ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ
اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ○

ترجمہ

۲۱۔ اے ایمان والو! شیطان کی پیروی نہ کرو۔ جو شخص شیطان کے نقشِ قدم پر چلتا ہے (وہ اُسے

گمراہ کردیتا ہے کیونکہ وہ اسے بدکاری اور بُرائی کا حکم دیتا ہے۔ اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی ہرگز پاک نہ ہوتا لیکن اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲۲۔ جو لوگ (مالی) برتری اور وسعت رکھتے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھالیں کہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور راہِ خدا کے مہاجروں کی مدد نہ کریں گے۔ ان سے درگزر اور صرفِ نظر کرنا چاہیے کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم سے درگزر کرے اور اللہ تو غفور و رحیم ہے۔

۲۳۔ جو لوگ پاکدامن اور (ہر قسم کے گناہ سے) بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں رحمتِ الٰہی سے دُور ہیں اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے۔

۲۴۔ اُس روز کہ جب ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے ان اعمال کے باعث ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

۲۵۔ اس روز اللہ ان کی وہ سزا انہیں بے کم و کاست دے گا کہ جس کے وہ مستحق ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ حقِ مبین ہے۔

تفسیر

جزا و سزا حساب و استحقاق کے مطابق ہو گی

صراحتاً تو یہ آیات واقعۂ افک کے بارے میں نہیں ہیں تاہم انہیں اسی بحث کا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں تمام مومنین کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ بعض اوقات شیطانی افکار و اعمال تدریجی طور پر غیر محسوس طریقے سے اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں ان پر کنٹرول نہ کیا جائے تو پھر انسان اس وقت متوجہ ہوتا ہے جب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ للذا جب گناہوں اور بدکاریوں کے وسوسوں کی ابتداء ہی ہو تو اُن کا مقابلہ کرنا چاہیے تاکہ وہ وسعت اختیار نہ کر جائیں۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں روئے سخن مومنین کی طرف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان لانے والو! شیطان کے نقشِ قدم پر مت

چلو کہ جو کوئی بھی اس کی پیروی کرے گا وہ گمراہی، بدکاری اور نافرمانی کی طرف کھنچتا چلا جائے گا کیونکہ شیطان بدکاری و برائی کی دعوت دیتا ہے (یاایھا الذین اٰمنوا لا تتبعوا خطوات الشیطان ومن یتبع خطوات الشیطان فانہ یأمر بالفحشاء والمنکر)۔[1]

"شیطان" اپنے وسیع تر معنی میں سرکش، تباہ کار، ویران گر اور ضرررساں وجود کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں اس لفظ کو اگر اس معنی میں لیا جائے تو پوری زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے اس تنبیہ کی وسعت واضح ہو جائے گی۔ ایک پاکباز مومن کبھی بھی یک دم برائی کی آغوش میں نہیں جا پڑتا بلکہ قدم بقدم جاتا ہے۔ مثلاً

پہلا قدم: آلودۂ گناہ افراد سے ملنا جلنا اور ان سے دوستی۔
دوسرا قدم: ان کی محفلوں میں شرکت۔
تیسرا قدم: گناہ کے بارے میں سوچنے لگنا۔
چوتھا قدم: مشکوک و مشتبہ کام کرنے لگنا۔
پانچواں قدم: گناہانِ صغیرہ کا ارتکاب۔
اور آخر کار: بدترین گناہوں کا ارتکاب۔

بالکل ایسے جیسے انسان اپنی باگ ڈور کسی گناہ گار مجرم کے حوالے کر دے جو قدم بقدم اسے ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے تاکہ انسان اس میں گر کر فنا ہو جائے۔ جی ہاں! یہ ہیں "خطوات الشیطان"۔[2]

اس کے بعد راہ ہدایت کی طرف انسانوں کی رہبری کی عظیم نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اگر فضل و رحمتِ الٰہی تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہوتا مگر اللہ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور خدا تو سننے والا اور جاننے والا ہے (ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ ما زکی منکم من احد ابدًا ولکن اللہ یزکی من یشاء واللہ سمیع علیم)۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کا فضل و رحمت ہی ہے کہ جو انسانوں کی بُرائیوں، انحرافوں اور گناہوں سے نجات کا سبب ہے۔ کیونکہ ایک تو اُس نے انسان کو نعمتِ عقل سے نوازا ہے اور پھر رسول بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ یہ احکام بھی بطریقِ وحی نازل فرمائے ہیں علاوہ ازیں اُس کی خاص توفیقات اور غیبی امداد بھی ہے کہ جو اہل اور مستحق انسانوں کے شاملِ حال ہوتی ہے — یہ سب پاکیزگی اور تزکیہ کے نہایت اہم عامل ہیں۔

---

[1] "ومن یتبع خطوات الشیطان فانہ یأمر بالفحشاء" یہ جملہ در حقیقت محذوف رکھتا ہے (جزائے شرط) اور اس کی تقدیر یوں ہے:
(ومن یتبع خطوات الشیطان ارتکب الفحشاء والمنکر فانہ یأمر بھما
جو شخص بھی شیطان کی پیروی کرے گا وہ بدکاریوں اور برائیوں کا مرتکب ہو گا کیونکہ وہ انہی چیزوں کا حکم دیتا ہے
(روح المعانی، ج ۱۸، ص ۱۱۲، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں)
توجہ رہے کہ "فانہ یامر بالفحشاء والمنکر" جزائے شرط نہیں ہو سکتا۔

[2] "فحشاء" اور "منکر" کے درمیان فرق کے سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں سورہ نحل کی آیت ۹۰ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بار ہا کہا ہے "من یشاء" کا مطلب بلاوجہ اور بے بنیاد ارادہ نہیں ہے بلکہ جب تک بندوں کی طرف سے کوشش نہ ہو تب تک اللہ کی طرف سے ہدایت و نعمت صورت پذیر نہیں ہوتی۔ جو شخص اس راہ کا طالب ہوتا ہے، اس راستے پر قدم رکھتا ہے اور جہاد کرتا ہے اللہ بھی اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے، اسے شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اللہ کا فضل و رحمت کبھی تشریعی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی تکوینی صورت میں۔ تشریعی صورت میں اس طرح سے کہ وہ انبیاء کو مبعوث کرتا ہے، آسمانی کتابیں نازل کرتا ہے، احکام بیان کرتا ہے اور نذارت و بشارت کی حکمت اختیار کرتا ہے جبکہ روحانی اور غیبی امداد اس کے فضل و رحمت کا تکوینی طریقہ ہے۔

"من یشاء" سے یوں لگتا ہے کہ زیر بحث آیات کا اشارہ دوسرے طریقے کی طرف ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "زکوٰۃ" اور "تزکیۃ" دراصل نشوونما پانے کے معنی میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ پاک ہونے اور پاک کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے دونوں معانی کی بازگشت ایک ہی بنیادی مفہوم کی طرف ہو کیونکہ جب تک کوئی چیز موانع، رکاوٹوں، رذائل اور خرابیوں سے پاک نہیں ہوتی اس کے لیے نشوونما اور رشد و ارتقاء ممکن ہی نہیں۔

بعض مفسرین نے زیر بحث دوسری آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے کہ جس سے اس آیت کا گزشتہ آیات سے تعلق واضح ہوتا ہے۔ مذکورہ شانِ نزول کچھ یوں ہے:

یہ آیت چند صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جنہوں نے واقعۂ افک کے بعد قسم کھائی تھی کہ جو لوگ اس واقع میں ملوث تھے اور اس عظیم تہمت کو پھیلانے میں سرگرم تھے ان میں سے کسی کی مالی امداد نہیں کریں گے۔ اور ان میں سے کسی سے ہمدردی نہ کریں گے۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اس شدت عمل سے سختی سے روک دیا گیا اور عفو و درگزر کا حکم دیا گیا۔

یہ شانِ نزول قرطبی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس اور ضحاک کے حوالے سے نقل کی ہے نیز مرحوم طبرسی نے اسے ابن عباس اور دیگر افراد سے نقل کیا ہے اور یہ شانِ نزول عمومی پہلو رکھتی ہے۔ لیکن کچھ اہل سنت مفسرین کا اصرار ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ واقعہ افک کے بعد انہوں نے مسطح بن اثاثہ کی مالی امداد بند کر دی تھی۔ مسطح ان کی خالہ یا بہن کا بیٹا تھا۔ لیکن آیت میں تمام جمع کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔ جمع کے یہ صیغے نشان دہی کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے اس واقعے کے بعد اس واقعے کے مجرمین کی مالی امداد بند کر دی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے انہیں اس کام سے منع کیا۔ بہرحال ہم جانتے ہیں کہ آیاتِ قرآن شانِ نزول ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان کا دامن وسیع ہے اور ان کا یہ پیغام قیامت تک کے مومنین کے لیے ہے۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے مواقع پر احساسات و جذبات کی اس شدت میں گرفتار نہ ہوں اور گنہ گاروں کی لغزشوں اور غلطیوں پر ایسے سخت فیصلے نہ کریں۔

اس شانِ نزول کی طرف توجہ کے ساتھ ساتھ ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں:

قرآن کہتا ہے: جو لوگ مالی لحاظ سے خوشحال ہیں وہ یہ قسم نہ کھالیں (اور یہ فیصلہ نہ کریں) کہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور

راہِ خدا کے مہاجروں کی امداد نہیں کریں گے (ولا یأتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربیٰ والمساکین والمھاجرین فی سبیل اللّٰہ)

اس آیت کے الفاظ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس واقعے میں ملوث بعض افراد راہِ خدا میں ہجرت کرنے والے بھی تھے کہ جو منافقین کے دھوکے میں آگئے اور ان کے سابقہ کارنامے کی وجہ سے اللہ نے اجازت نہ دی کہ انہیں اسلامی معاشرے سے دھتکار دیا جائے اور ان کے استحقاق سے بڑھ کر ان کے خلاف فیصلہ کیا جائے۔

ضمناً لفظ "یأتل" "الیۃ" (بروزن "عطیۃ") کے مادے سے قسم کھانے کے معنی میں ہے یا پھر "الو" (بروزن "دلو") کے مادے سے کوتاہی کرنے اور ترک کرنے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا پہلے معنی کے اعتبار سے اس آیت میں ایسی امداد روکنے کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے[1]

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس عمل میں کوتاہی اور اسے ترک کرنے سے ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو ایسے نیک کام جاری رکھنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہیں معاف کر دینا چاہیئے اور چشم پوشی کرنا چاہیے (ولیعفوا ولیصفحوا)۔

کیا تمہیں پسند نہیں کہ اللہ تم سے درگزر کرے۔ (الا تحبون ان یغفر اللّٰہ لکم)۔

تو جیسے تم چاہتے ہو کہ اللہ تمہاری لغزشیں معاف کرے ایسے ہی دوسروں کی کوتاہیوں سے بھی صرفِ نظر کر لیا کرو۔

اور اللہ تو غفور و رحیم ہے (واللّٰہ غفور رحیم)۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف تو ایسے تند و تیز لہجے میں واقعہ افک کے ذمہ داروں کی مذمت کی گئی ہے جبکہ دوسری طرف افراط پسند افراد کو حد سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور ایسے تین جملوں کے ذریعے ان کے احساسات و جذبات کو کنٹرول کیا گیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے وسیع تر اور جاذب تر ہے۔

پہلے عفو و درگزر کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ کیا تم خود نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخش دے پس تم بھی بخش دو۔

اور آخر میں اللہ کی دو صفات غفور و رحیم کا ذکر کر کے تاکید مزید کی گئی ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حکم خدا سے بڑھ کر تمہاری تپش نہیں ہو سکتی۔ اللہ کہ جو اس حکم کا اصلی مالک ہے وہ غفور و رحیم ہے۔ وہ حکم دیتا ہے کہ امداد نہ روکو۔ اب تم کیا کہتے ہو۔

اس میں شک نہیں کہ جو مسلمان واقعۂ افک میں ملوث ہو گئے تھے وہ تمام اس کی سازش میں شریک نہ تھے صرف چند مسلمان نما منافقین اس کے بانی تھے اور زیادہ تر مسلمان ان کے دھوکے میں آکر ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب

---

[1] اس صورت میں لفظ "لا" کو "یؤتو" سے مقدر مانا جائے گا اور تقدیر یوں ہوگی: ولا یأتل ۔ ۔ ۔ ۔ ان لا یؤتوا

ذمہ دار اور گنہ گار سمجھتے تاہم ان دونوں گروہوں کے درمیان بہت فرق تھا۔ لہٰذا سب سے ایک جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال ان آیات میں آج اور کل کے مسلمانوں کے لیے بہت بڑا درس ہے کہ اگر کچھ لوگ گناہ و لغزش کا شکار ہو جائیں تو انہیں سزا دیتے ہوئے حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں اسلامی معاشرے سے دھتکار کر باہر نہیں نکال دینا چاہیئے اور نہ امداد کے دروازے ان پر بند کر دینے چاہئیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دشمنوں کے دامن میں جا گریں اور اُن کی صف میں جا شامل ہوں۔

یہ آیات درحقیقت اسلام کی قوتِ جاذبہ اور قوتِ دافعہ کے اعتدال کی عکاسی کرتی ہیں۔ آیات افک پہلے مرحلے میں تو لوگوں کی ناموس پر تہمت لگانے والوں کے لیے سخت سزا کو بیان کرتی ہیں اور اس طرح دافعہ کی عظیم قوت کا مظہر ہیں اور دوسرے مرحلے میں عفو و درگزر اور اللہ کے غفور و رحیم ہونے کا تذکرہ ہے اس مقام پر قوت جاذبہ کا مظہر ہیں۔

اس کے بعد پھر قذف کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور موضوع پھر پاکدامن عورتوں کی ناموس پر تہمت لگانے کی طرف لوٹتا ہے۔ قطعی اور اٹل فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ پاکدامن اور ہر گناہ سے بے خبر مومن عورتوں پر ناروا تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں رحمتِ الٰہی سے دور ہیں اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے (ان الذین یرمون المحصنات الغافلات المؤمنات لعنوا فی الدنیا والاٰخرة و لهم عذاب عظیم)۔

اس آیت میں دراصل عورتوں کی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر صفت اس ظلم کی اہمیت پر ایک دلیل ہے کہ جو ان پر تہمت لگا کر کیا گیا ہے۔

"محصنات" ——— پاکدامن عورتیں

"غافلات" ——— ہر قسم کے گناہ سے دُور ——— اور

"مؤمنات" ——— باایمان عورتیں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی پاکباز عورتوں کی طرف ناروا نسبتیں دینا کس قدر ظالمانہ اور بزدلانہ فعل ہے اور عذاب عظیم کا باعث ہے[1]۔

ضمناً یہ بات بھی کہہ دی جائے کہ "غافلات" ایک جاذب نظر اور عمدہ تعبیر ہے کہ جو ان کی ہر قسم سے انحراف اور بے عفتی سے انتہائی پاکیزگی کی غماز ہے۔ یعنی وہ جنسی قباحتوں سے اس قدر بے اعتنا ہیں کہ گویا انہیں ان کی خبر تک نہیں کیونکہ بعض اوقات گناہوں کے بارے میں انسان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ اصلاً ان کا تصور تک اس کی فکر و نظر سے نکل جاتا ہے اور ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ گویا ایسا کوئی عمل وجود ہی نہیں رکھتا اور یہ تقویٰ کا اعلیٰ مرحلہ ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "غافلات" سے مراد ایسی عورتیں ہیں کہ جنہیں خبر بھی نہیں کہ اُن پر ایسی ناروا تہمتیں لگائی گئی ہیں لہٰذا وہ اپنا دفاع تک نہیں کر سکتیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو زیر بحث آیت ایک نئے مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ گویا یہ ایک اور

---

[1] المیزان، زیر بحث آیات کے ذیل میں، ج ۱۵ ص ۱۲۰

طرف کی تہمت ہے۔ جبکہ گزشتہ آیت میں ایسے تہمت لگانے والوں کا ذکر تھا کہ جو جانے پہچانے تھے اور انہیں سزا دی گئی تھی لیکن اب یہاں ان تہمت ساز افراد کے بارے میں گفتگو ہے کہ جنہوں نے مخفی طور پر یہ حرکت کی اور اپنے آپ کو حدِ شرعی سے بچائے رکھا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اس عمل پر وہ ہمیشہ اللہ کی سزا سے بچے رہیں گے بلکہ خدا اس دنیا میں بھی انہیں اپنی رحمت سے دُور رکھے گا اور آخرت میں بھی ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

یہ آیت اگرچہ واقعہ افک کے بعد آئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس واقعے سے غیر مربوط بھی نہیں لیکن یہ بھی ان تمام آیات کی طرح ہے کہ جو خاص مواقع پر نازل ہوئیں مگر ان کا مفہوم عمومی ہوتا ہے۔ یہ آیتیں معین موقع کے لیے مختص نہیں ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ تفسیر کبیر میں فخر رازی نے اور بعض دیگر مفسرین نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ اس آیت کے مفہوم کو ازواجِ پیغمبرؐ پر تہمت لگانے کے ساتھ محدود سمجھا جائے اور اس گناہ کو سرحدِ کفر میں قرار دیا جائے۔ اس آیت میں جو لفظ "لعن" آیا ہے اسے انہوں نے اپنے اس دعویٰ کے لیے دلیل قرار دیا ہے۔

حالانکہ تہمت لگانا اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر یہ تہمت ازواجِ پیغمبرؐ پر لگائی جائے تو یہ گناہ کہیں بڑا ہو جاتا ہے تاہم تنہا یہ گناہ موجبِ کفر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعے میں ملوث افراد کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وہ سلوک نہیں کیا کہ جو مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے بلکہ بعد والی آیتوں میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ان پر حد سے زیادہ سختی کرنے سے منع فرمایا گیا اور اگر کفر کا مسئلہ ہوتا تو یہ بات اس سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

رہی بات "لعن" (لعنت) کی۔ تو اس سے مراد رحمتِ خدا سے دُوری ہے کہ جو کافروں اور گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں پر صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہی آیات میں کہ جو حدِ قذف کے بارے میں گزری ہیں "لعان" سے مربوط احکام میں دو مرتبہ جھوٹ بولنے والوں کے لیے "لعن" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مشہور حدیث ہے کہ:

لعن اللّٰه فی الخمر عشر طوائف ------

شراب کے بارے میں اللہ نے دس گروہوں پر لعنت کی ہے۔

اگلی آیت میں تہمت لگانے والوں کی بارگاہ الٰہی میں کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس روز اُن پر عذابِ عظیم ہوگا کہ جس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے خلاف گواہی دیں گے (یوم تشهد علیهم السنتهم وایدیهم وارجلهم بما کانوا یعملون)۔

وہ نہیں چاہیں گے مگر اُن کی زبان حرکت میں آجائے گی اور حقائق بیان کرے گی۔ جب قطعی دلائل و شواہد سامنے آجائیں گے تو یہ مجرم نہ چاہتے ہوئے بھی صراحت سے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور خود تمام کاموں کو فاش کر دیں گے اس لیے کہ انہیں انکار کی کوئی گنجائش سجھائی نہ دے گی۔

اُن کے ہاتھ پاؤں بھی بول لیں گے۔ یہاں تک کہ قرآنی آیات کے مطابق ان کے بدن کا چمڑا بھی کلام کرے گا۔ گویا یہ عالم ہو گا

جیسے انسان کی ساری آوازیں ٹیپ پر ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ اس کی ساری زندگی کے گناہوں کی فلم بن چکی ہے —— جی ہاں —— وہ دن کہ جسے "یوم البروز" کہتے ہیں —— جو تمام بھیدوں کے آشکار ہو جانے کا دن ہے —— اس روز یہ سب کچھ آشکار ہو جائے گا۔

بعض قرآنی آیات میں روز قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

اليوم نختم على افواههم و تكلمنا ايديهم وتشهد ارجلهم بما كانوا يكسبون

آج ہم ان کی زبان پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ پاؤں ہم سے گفتگو کریں گے کہ جن کے ذریعے یہ کام کرتے ہیں۔ (یٰس ـ ۶۵)

ایسی آیات زیر بحث آیات کے منافی نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے تو زبان خاموش ہو جائے اور باقی اعضاء گواہی دیں اور جب ہاتھ پاؤں کی گواہی سے حقائق آشکار ہو جائیں تو پھر زبان کو اذنِ کلام مل جائے اور پھر جو کچھ کہنا ہو وہ کہے اور گناہوں کا اعتراف کرے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس دن خدا انہیں بے کم وکاست ان کی حقیقی جزا اُنہیں دے گا (يومئذ يوفيهم الله دينهم الحق)۔

اور اس دن وہ جان لیں گے کہ اللہ حقِ مبین ہے (و يعلمون ان الله هو الحق المبين)۔

اگر آج —— اس دنیا میں انہیں پروردگار کی حقانیت کے بارے میں کوئی شک ہے یا آج لوگوں کو گمراہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں تو اس دن اس کی عظمت، قدرت اور حقانیت کی نشانیاں اتنی واضح ہوں گی کہ سخت ترین ہٹ دھرم افراد بھی اعتراف پر مجبور ہو جائیں گے۔

۲۶۔ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۶۔ خبیث و ناپاک عورتیں خبیث و ناپاک مردوں کے لیے ہیں اور خبیث و ناپاک مرد بھی خبیث و ناپاک عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد بھی پاکیزہ عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ان ناروا تہمتوں سے منزّہ و مبرّا ہیں جو ان پر لگائی جاتی ہیں اور ان کے لیے (اللہ کی) مغفرت و بخشش اور رزقِ کریم ہے۔

تفسیر

"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"

یہ آیت بھی درحقیقت آیاتِ افک اور اس سے پہلے کی آیات کا تسلسل ہے اور انہی کے مفاہیم پر ایک اور تاکید ہے۔ اس میں جہان خلقت میں رائج ایک فطری نظام کا بیان ہے کہ شریعت بھی جس سے ہم آہنگ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: خبیث و ناپاک عورتیں خبیث و ناپاک مردوں کے لیے ہیں جیسا کہ خبیث و ناپاک مردوں کا تعلق خبیث و ناپاک عورتوں سے ہے (الخبيثات للخبيثين والخبيثون للخبيثات)۔

اور اس کے مدِمقابل بھی "طیب و پاک عورتیں طیب و پاک مردوں کے لیے ہیں جیسا کہ طیب و پاک مردوں کا تعلق طیب و پاک عورتوں سے ہے والطيبات للطيبين و الطيبون للطيبات)۔

اور آیت کے آخر میں دوسرے گروہ کے بارے میں مزید فرمایا گیا ہے: وہ ان ناروا تہمتوں سے مبرّا ہیں کہ جو ان پر لگائی جاتی ہیں (اولئك مبرءون مما يقولون)۔

اور اسی بناء پر اللہ کی مغفرت اور اسی طرح پر ارزش رزق ان کے انتظار میں ہے (لهم مغفرة و رزق كريم)۔

چند اہم نکات

۱۔ "خبیثات" اور "خبیثون" کون ہیں ؟ : زیر بحث آیت میں "خبیثات" اور "خبیثین" نیز "طیبات" اور "طیبین" سے کون مراد ہیں، اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف بیانات ہیں۔ مثلاً

(۱) کبھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ناپاک باتیں، تہمت، افتراء اور جھوٹ ہے کہ جن کا تعلق غلط کار اور گندے افراد کے ساتھ ہے اور اس کے برعکس پاکیزہ باتیں پاک و باتقویٰ افراد کے لیے ہیں۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ "خبیثات" "سیئات" کے معنی میں ہے یعنی اس سے مراد مطلق بُرے اور ناپسندیدہ کام ہیں کہ جو ناپاک مرد بجالاتے ہیں اس کے برعکس حسنات پاک لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۳) بعض کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "خبیثات" اور "خبیثون" آلودہ دامن عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ ہے اور اس کے برعکس "طیبات" اور "طیبون" پاکدامن عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ ہے۔ ظاہراً بھی آیت سے یہی مراد ہے کیونکہ ایسے قرائن موجود ہیں کہ جو اس آخری معنی کی تائید کرتے ہیں، مثلاً

(ا) یہ آیات، آیاتِ اِفک کے بعد آئی ہیں اور اسی طرح اس آیت سے پہلے یہ آیت بھی گزر چکی ہے :

الزانی لاینکح الا زانیة اومشرکة والزانیة لاینکحها الازان اومشرك وحرم ذلك علی المؤمنین

اور یہی تیسری تفسیر ان آیات کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

(ب) اس آیت میں یہ جملہ :

اولئك مبرء ون مما یقولون

پاکدامن مردوں اور عورتوں پر جو ناروا تہمتیں لگائی جاتی ہیں وہ اس سے پاک و منزّہ ہیں۔

یہ جملہ بھی مذکورہ بالا تیسری تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

(ج) اصولی طور پر قرینۂ مقابلہ اس بات کی نشانی ہے کہ "خبیثات" سے مراد حقیقی جمع مؤنث ہے اور ناپاک عورتوں کی طرف اشارہ ہے چونکہ اس کے مقابلے میں "خبیثون" ہے کہ جو حقیقی جمع مذکر ہے۔

(د) ان سب باتوں سے قطع نظر امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ :

یہ آیت بھی "الزانی لاینکح الا زانیة او مشرکة" کی طرح ہے کیونکہ کچھ ایسے لوگ تھے کہ جنہوں نے بُری عورتوں سے شادی کا ارادہ کر رکھا تھا تو اللہ نے انہیں اس کام سے منع کیا اور اسے ناپسند فرمایا[1]

(ہ) روایاتِ کتابِ نکاح میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات آئمہؑ کے اصحاب "خبیثات" سے شادی کے بارے

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

میں سوال کرتے تو انہیں ایسا کرنے سے منع کیا جاتا۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ "خبیثات" ناپاک عورتوں کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ناپاک باتوں اور ناپاک اعمال کی طرف[1]۔

اس مقام پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ خبیث یا طیب ہونے سے صرف عفت و ناموس کا پہلو مراد ہے یا ہر قسم کی فکری، عملی اور زبانی ناپاکی یا پاکیزگی ان کے مفہوم میں داخل ہے ؟

اگر اس سلسلے کی آیات و روایات کے سیاق و سباق کو نظر میں رکھا جائے تو اس زیر بحث آیت کا مفہوم محدود ہونا چاہیے یعنی یہاں عفت و ناموس کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن بعض ایسی روایات بھی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر خبیث و طیب کا وسیع معنی ہے اور اس کا مفہوم جنسی آلودگی اور پاکیزگی میں منحصر نہیں ہے۔ اس نظریے کی بنیاد پر بعید نہیں کہ پہلا مفہوم آیت کا خاص معنی ہو لیکن ملاک، فلسفہ اور علت کے لحاظ سے اسے عمومیت اور وسعت دی جا سکتی ہو۔

دوسرے لفظوں میں یہ آیت ہے تو عمومی بیان کے لیے لیکن زیر بحث مسئلے کے اعتبار سے جنسی امور میں آلودگی اور پاکیزگی کی بات کرتی ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ یہ حکم تکوینی ہے یا تشریعی ؟ اس میں شک نہیں کہ "نوری صرف نوریوں کے طالب ہیں" "اور ناری صرف ناریوں کی طرف کھنچتے ہیں" نیز فارسی مثل مشہور ہے۔

ع کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

اسی طرح عربی مثل بھی مشہور ہے کہ :

السنخیة علة الانضمام

یہ سب ضرب الامثال سنتِ تکوینی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جو آسمان و زمین میں کائنات و موجودات کے ذرّے ذرّے پر محیط ہے۔

بہرحال ہر جگہ ہم نوع اپنے ہم نوع کی طرف کھنچتا ہے اور ہر گروہ اپنے ہم مزاج کے ساتھ مُلحق ہے۔ لیکن یہ حقیقت اس سے مانع نہیں کہ زیر بحث آیت "الزانیة لاینکحها الا زان او مشرك" کی طرح ایک شرعی حکم کی طرف اشارہ ہو کہ بُری عورتوں کے ساتھ کم از کم ایسے مواقع پر نکاح ممنوع ہے کہ جب وہ بدکاری میں مشہور و معروف ہوں۔

ویسے بھی کیا سب شرعی احکام کی بنیاد تکوینی نہیں ہے اور کیا شریعت اور تکوین آپس میں ہم آہنگ نہیں ہیں ؟ یقیناً ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر دیکھئے۔

۳۔ ایک سوال کا جواب : یہاں ایک سوال پیش آتا ہے کہ تاریخ میں اور خود اپنی زندگی میں ہم نے ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ جو اس قانون کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ مثال کے طور پر خود قرآن میں آیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں بُری تھیں اور انہوں نے ان انبیاء کرامؑ سے خیانت کی تھی (سورہ تحریم - ۱۰)

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۳۳۷ باب ۱۴ از ابواب "ما یحرم بالمصاهرة و نحوها"

جبکہ اس کے مقابلے میں فرعون کی بیوی با ایمان اور پاک دامن خاتون تھی کہ جو اس بے ایمان جاخوت کے چنگل میں گرفتار تھی۔

(تحریم - ۱۱)

ہادیانِ اسلام کے بارے میں بھی ایسے کئی نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ایک بات تو یہ پیش نظر رہے کہ ہر عمومی قانون کے استثنائی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان دو نکات کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے:

(۱) آیت کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اصولی طور پر خباثت سے مراد جنسی لحاظ سے ناپاکی ہے اور "طیب" ہونا اس کی ضد ہے۔ اس طرح سے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ انبیاءؑ اور آئمہؑ کی ازواج میں سے ہرگز کوئی بھی جنسی اعتبار سے بے راہ رو نہ تھی۔ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کے واقعے میں خیانت سے مراد یہ ہے کہ وہ کافروں کے فائدے میں جاسوسی کرتی تھیں اور یہاں عفت و ناموس کے معاملے میں خیانت مراد نہیں ہے۔

اصولی طور پر یہ عیب قابلِ نفرت عیوب میں شمار ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انبیاء کی ذاتی زندگی کو ایسے اوصاف سے پاک ہونا چاہیئے کہ جو لوگوں کی نفرت کا باعث بنیں تاکہ مقصدِ نبوت کہ جو لوگوں کو دینِ خدا کی طرف جذب کرنا ہے، کو نقصان نہ پہنچے۔

(۲) علاوہ ازیں انبیاء کرامؑ اور ائمہ طاہرینؑ کی بیویاں ابتداء میں کافر اور بے ایمان تک نہ تھیں۔ بعض اوقات وہ بعثتِ نبوت کے بعد گمراہ ہو جاتی تھیں اور یقیناً ان انبیاءؑ کے پہلے کے سے روابط ایسی بیویوں کے ساتھ جاری نہ رہتے تھے۔

فرعون کی بیوی کا بھی ایسا ہی مسئلہ ہے۔ جب اس کی فرعون کے ساتھ شادی ہوئی تھی اس وقت وہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان نہیں لائی تھی۔ اصولاً تو حضرت موسیٰؑ ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث برسالت ہوئے تو وہ ایمان لے آئی۔ البتہ اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ فرعون کے ساتھ اپنی زندگی کو جاری رکھتی۔ لیکن حمایتِ حق میں اس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور انجام کار یہ با ایمان خاتون شہادت کی منزل سے ہمکنار ہوئی۔

۲۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

۲۸۔ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۖ هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ○

۲۹۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ○

ترجمہ

۲۷۔ اے ایمان والو! اپنے گھر کے سوا دوسرے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہونا اور اس گھر والوں کو سلام بھی کرنا۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے شاید کہ تم توجہ کرو۔

۲۸۔ اور اگر اس گھر میں کسی کو نہ پاؤ تو اس میں داخل نہ ہونا جب تک کہ تمہیں اجازت نہ ملے اور اگر کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس آجاؤ کہ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے۔

۲۹۔ جن گھروں میں کسی کی رہائش نہ ہو اور وہاں تمہارا مال و اسباب، پڑا ہو وہاں تمہارے داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے یا چھپاتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔

تفسیر

بغیر اجازت لوگوں کے گھروں میں نہ جاؤ

ان آیات میں اسلام کے چند ایک معاشرتی آداب و احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان کا عفت و پاکدامنی کی حفاظت سے بھی قریبی تعلق ہے۔

ان آیات میں دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے اور داخل ہونے کی اجازت لینے کے آداب بیان ہوئے ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہونا اور اس گھر والوں کو سلام بھی کرنا (اور قبل ازیں اپنی آمد کی انہیں اطلاع دینا اور داخل ہونے کیلئے اجازت حاصل کرنا) (یاایہا الذین اٰمنوا لاتدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتّٰی تستأنسوا و تسلموا علی اھلھا)۔

یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ شاید تم توجہ دو (ذٰلکم خیر لکم لعلکم تذکرون)۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہاں لفظ "تستأنسوا" استعمال ہوا ہے نہ کہ "تستأذنوا" کیونکہ دوسرے لفظ میں صرف اجازت لینے کا مفہوم ہے جبکہ پہلا لفظ مادہ "انس" سے لیا گیا ہے۔ اس سے ایسی اجازت لینا مراد ہے کہ جس میں لطف و محبت، اور صداقت پنہاں ہو یعنی مؤدبانہ طریقے سے اور بغیر کسی درشتی و سختی کے اجازت لی جائے۔

اس لحاظ سے اگر اس جملے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سے آداب اشارتاً بیان کردیے گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شور نہ مچاؤ، دروازہ زور زور سے کھٹکھٹاؤ اور تکلیف دہ خشک الفاظ کے ساتھ اجازت نہ لو اور جب اجازت مل جائے تو بغیر سلام کیے اندر نہ جاؤ۔ ایسا سلام کہ جو صلح و سلامتی اور دوستی و محبت کا پیغامبر ہو۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ حکم جس میں انسانی احساسات کا پہلو نمایاں ہے کے ساتھ ساتھ دو جملے مزید کہے گئے ہیں ایک "ذٰلکم خیر لکم" اور دوسرا "لعلکم تذکرون" یہ جملے اس امر کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے احکام انسانی احساسات اور عقل و شعور کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود ہیں اور اگر انسان ان پر تھوڑا سا غور و فکر کرے تو متوجہ ہوگا کہ اس کی بھلائی انہی احکام پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔

اگلی آیت میں ایک اور جملے کے اضافے سے اس حکم کی تکمیل کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اگر دیکھو کہ اس گھر میں کوئی نہیں ہے تو پھر اس میں مت جاؤ جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے (فان لم تجدوا فیھا احداً فلا تدخلوھا حتّٰی یؤذن لکم)۔

ہوسکتا ہے اس سے یہ مراد ہو کہ بعض اوقات گھر میں کچھ افراد تو ہوتے ہیں لیکن کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا کہ جو صاحب اختیار اور گھر کا مالک ہو اور اجازت دے سکے۔ تو ایسی صورت میں تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ اس گھر میں داخل ہو۔ یا ہوسکتا ہے کہ گھر میں تو کوئی موجود نہ ہو لیکن صاحب خانہ ہمسایوں کے ہاں یا قریب ہی کہیں ہو اور وہ تمہاری یا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنے تو آجائے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دے۔ اس موقع پر تم داخل ہونے کا حق رکھتے ہو۔ بہرحال اصل مسئلہ یہ ہے کہ تم بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو اس بات کو قبول کرتے ہوئے واپس چلے جاؤ کہ یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے (وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکٰی لکم)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تمہیں واپس چلے جانے کے لیے کہا جائے تو تمہیں اس جواب پر ہرگز پریشان اور ناراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات صاحب خانہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اس کے لیے تم سے ملنا پریشانی اور زحمت کا باعث ہوتا ہے یا اس کی اور اس کے گھر کی ایسی حالت نہیں ہوتی کہ وہ مہمان کو گھر بلا سکے۔

بعض لوگوں کو نفی میں جواب ملے تو وہ اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ دروازے کے سوراخوں سے دیکھتے ہیں، کان لگا کر اندر کی آوازیں سنتے ہیں یا کسی ذریعے سے اس گھر کے راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں اسی بات کے پیش نظر قرآن مزید کہتا ہے، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے (واللہ بما تعملون علیم)۔

مسائل کے حل کی معقول صورت پیدا کرنے کے لیے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی استثنائی پہلو ہوتا ہے۔ اس لیے مزید فرمایا گیا ہے، جن گھروں میں کوئی نہ رہتا ہو اور ان میں تمہارا مال و اسباب پڑا ہو تو پھر ان میں داخل ہونے میں تم پر کوئی گناہ نہیں (لیس علیکم جناح ان تدخلوا بیوتاً غیر مسکونۃ فیھا متاع لکم)۔ یہ بھی اضافہ فرمایا گیا ہے: اور جو کچھ تم ظاہر کرتے یا چھپاتے ہو اللہ اسے جانتا ہے (واللہ یعلم ما تبدون و ما تکتمون)۔

شاید یہ اس طرف اشارہ ہو کہ بعض افراد ایسے بھی ہوسکتے ہیں کہ جو اس رعایت سے ناجائز فائدہ اُٹھائیں اور غیر رہائشی گھروں میں داخل ہو کر چیزوں کی ٹوہ لگاتے پھریں یا رہائشی گھروں میں اس بہانے سے چلے جائیں کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہاں کوئی رہتا ہے لیکن اللہ ان تمام امور سے آگاہ ہے اور غلط فائدہ اٹھانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ گھر کی چاردیواری کا تحفظ اور آزادی: اس میں شک نہیں کہ انسانی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔ اسی وجہ سے انسان دو قسم کی زندگی کا حامل ہے۔ ایک خصوصی زندگی اور دوسری عمومی زندگی۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں اور ہر ایک کے لیے کچھ آداب و قوانین ہیں۔

اجتماعی ماحول میں انسان مجبور ہے کہ اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کرے اور اپنی آمد و رفت میں تحمل کرے۔ لیکن واضح ہے کہ شب و روز وہ اپنے تئیں ان پابندیوں میں جکڑے نہیں رکھ سکتا۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ شب و روز میں کچھ مدت آزاد رہے آرام کرے اپنے گھر والوں اور اولاد سے نجی گفتگو کرے اور جتنا ممکن ہو سکے اس آزادی سے فائدہ اُٹھائے۔ اسی لیے وہ ایک اپنا گھر چاہتا ہے اور اس میں پناہ لیتا ہے۔ کچھ دیر اپنے گھر کے دروازے دوسروں پر بند کرکے اپنی زندگی کو معاشرے سے جُدا کرلیتا ہے۔ اور ایسی بہت سی پابندیاں کہ جنہیں معاشرے میں قبول کرنے کے لیے وہ مجبور ہوتا ہے اُن سے گھر میں آزاد ہو جاتا ہے۔

اب اس آزاد ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے واضح ہے کہ انسان کے لیے کچھ تحفظ اور آزادی درکار ہے۔ اگر ہر شخص کو آزادی ہو تو وہ آئے اور گھر میں داخل ہوجائے تو پھر گھر میں آزادی اور آرام و سکون کا مفہوم ختم ہوجائے گا اور وہ کوچہ و بازار کے ماحول میں بدل

جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے درمیان اس سلسلے میں ہمیشہ کچھ خاص قوانین وآداب موجود رہے ہیں اور دنیا کے تمام قوانین میں دو... کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل ہونا ممنوع ہے اور اس کے لیے سزا تک مقرر ہے۔ یہاں تک کہ جہاں تحفظ، امن او... دوسرے حوالوں سے ضروری ہو کہ بلا اجازت داخل ہوا جائے وہاں بھی محدود ومعین طریقے ہیں اور ادارے ہیں کہ جو یہ اجازت دی... کا حق رکھتے ہیں۔

اسلام میں بھی اس سلسلے میں تاکیدی حکم موجود ہے اور اس سلسلے میں جیسے حکیمانہ آداب اسلام میں موجود ہیں ان کی نظیر بہت کم نظر آتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ کے ایک صحابی ابوسعید نے آپؐ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی اور دروازے کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

اجازت لیتے وقت دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہوا کرو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی کسی کے گھر کے دروازے پر آتے تو سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے بلکہ دائیں یا بائیں طرف ہو کر کھڑے ہوتے تھے اور "السلام علیکم" کہہ کر اجازت چاہتے تھے کیونکہ اس زمانے میں ابھی گھر کے دروازے پر پردہ لٹکانے کا معمول نہ تھا۔[1]

روایات میں یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی اپنے ماں باپ کے گھر یا اپنے بیٹے کے گھر بھی جانا چاہے تو پہلے اجازت لے

ایک شخص نے رسول اللہؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! جب میں اپنی ماں کے گھر جانے لگوں تو کیا

وہاں بھی اجازت لوں؟

فرمایا: ہاں۔

اُس نے عرض کیا: میرے علاوہ میری ماں کا کوئی خدمت گزار بھی نہیں ہے تو کیا پھر بھی اجازت لوں؟

فرمایا:

اتحب ان تراها عریانة

کیا تو پسند کرتا ہے کہ تو اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟

اُس نے عرض کیا: نہیں

تو پھر فرمایا:

فاستأذن علیها

جب ایسا ہے تو پھر اُس سے اجازت لے لیا کر۔[2]

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۲۳، صفحہ ۱۹۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۵۸۶

ایک اور روایت میں ہے:

ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ اپنی دختر نیک اختر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر گئے۔ پہلے دروازے پر آکر دروازے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تھوڑا سا پیچھے ہٹایا۔ پھر فرمایا: السلام علیکم۔

جناب فاطمہؑ نے اپنے والد گرامیؐ کے سلام کا جواب دیا۔

پھر آپؐ نے فرمایا: کیا اجازت ہے کہ اندر آجاؤں؟

عرض کیا: تشریف لائیے یا رسول اللہؐ

رسول اللہؐ نے فرمایا: جو میرے ساتھ ہے کیا اُسے بھی اجازت ہے کہ اندر آجائے۔

فاطمہؑ نے عرض کیا: میرے سر پر چادر نہیں ہے۔

پھر گئیں اور چادر لی اور جب باپردہ ہو گئیں تو رسول اللہؐ نے پھر سلام کیا۔

فاطمہؑ نے جواب سلام دیا۔

رسول اللہؐ نے پھر اپنے لیے داخل ہونے کی اجازت چاہی جب انہوں نے اجازت دی تو

پھر آپؐ نے اپنے ساتھ جابر بن عبداللہ کے لیے اجازت لی۔[1]

اس حدیث سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کہ جو تمام مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ اور ماڈل ہیں ان نکات کا کس قدر باریک بینی سے خیال رکھتے تھے۔

بعض روایات میں یہاں تک ہے کہ تین مرتبہ اجازت لینی چاہیے۔

پہلی مرتبہ اس طرح سے کہ گھر والے سُن لیں۔

دوسری مرتبہ وہ اپنے آپ کو آمادہ کر لیں۔

پھر تیسری مرتبہ اجازت طلب کی جائے۔ گھر والے چاہیں تو اجازت دیں اور چاہیں تو نہ دیں۔[2]

بعض نے تو یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ ان تین اجازتوں کے درمیان کچھ وقت کا فاصلہ ہونا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات صاحب خانہ کے بدن پر مناسب لباس نہیں ہوتا اور کبھی وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس حالت میں کوئی اسے دیکھے کبھی گھر کی حالت درہم برہم ہوتی ہے اور کبھی کوئی راز کا ایسا معاملہ ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ گھر سے باہر کسی کو پتہ چلے لہٰذا اسے وقت دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے آپ کو آمادہ کرے اور اگر وہ اجازت نہ دے تو بغیر تھوڑے سے بھی ملال کے واپس چلے جانا چاہیئے۔

۲۔ غیر رہائشی گھروں سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایسی عمارتیں مراد ہیں کہ جو عمومی ہوں۔ مثلاً کارواں سرائے، مہمان خانے، حمام وغیرہ۔ یہ مضمون امام صادق علیہ السلام سے

---

[1] نور الثقلین، ج ۳، ص ۵۸۷

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۱۶۱، ابواب مقدمات النکاح، باب ۱۲۳

مردی ایک حدیث میں بالصراحت آیا ہے۔[1]

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ اس سے مراد خرابے اور کھنڈرات ہیں کہ جن میں کوئی نہ رہتا ہو اور جو چاہتا ہو اس میں داخل ہو جاتا ہو۔ یہ تفسیر بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ کوئی شخص بھی اپنا مال و اسباب ایسی جگہ نہیں رکھ سکتا۔

بعض دیگر مفسرین نے اسے تاجروں کے ایسے اسٹوروں، گوداموں اور دوکانوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جن میں لوگوں کا مال بطورِ امانت رکھا جاتا ہے اور ہر صاحبِ مال حق رکھتا ہے کہ وہ اپنا مال و اسباب لینے کے لیے ان میں داخل ہو جائے۔ یہ تفسیر بھی آیت کے ظاہری مفہوم سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے ایسے گھر مراد ہوں کہ جہاں کوئی نہیں رہتا۔ ایسے گھر میں کسی نے اپنا مال بطور امانت رکھا ہو اور گھر کے مالک سے اُس نے آنے جانے اور مال اُٹھانے کی عمومی اجازت لے لی ہو۔

ان میں سے بعض تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں لیکن پہلی تفسیر آیت کے مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

اس بیان سے ضمناً یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انسان صرف اس بنیاد پر کسی کا گھر بلا اجازت نہیں کھول سکتا کہ اس کا کچھ مال و اسباب اس میں پڑا ہوا ہے چاہے اس میں اس وقت کوئی بھی موجود نہ ہو۔

۳۔ بلا اجازت لوگوں کے گھروں میں جھانکنے کی سزا: فقہ و حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر لوگوں کے گھروں میں تانک جھانک کرے اور عورتوں کے چہرے یا برہنہ بدن کی طرف دیکھے تو پہلی مرتبہ اس گھر والے اُسے منع کر سکتے ہیں۔ اگر وہ نہ رُکے تو پھر پتھر مار کر اسے دُور کریں اور اگر وہ پھر بھی نہ ٹلے تو پھر آلاتِ قتل سے اپنی اور اپنی آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں اور اگر اس جھگڑے میں وہ شخص مارا جائے تو اُس کا خون رائیگاں ہے۔ البتہ اس کام میں مختلف مرحلوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے یعنی اگر آسان طریقے سے معاملہ حل ہو سکتا ہو تو سخت طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۱۶۱

۳۰۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا
فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا
يَصْنَعُوْنَ ۝

۳۱۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ
يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا
ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ
وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ
اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ
اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ
غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ
يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ
لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ
جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۰۔ مومنین سے کہہ دو: اپنی آنکھوں کو (نامحرموں کو دیکھنے سے) بند رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی

حفاظت کریں۔ یہ اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے آگاہ ہے۔

۳۱۔ اور باایمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو (نگاہِ ہوس آلود سے) بند رکھیں اور اپنا دامن محفوظ رکھیں اور سوائے اس حصّے کے کہ جو ظاہر ہے اپنے بناؤ سنگھار کو آشکار نہ کریں اور اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے سینے پر ڈالیں (تاکہ اس سے گردن اور سینہ چھپ جائے)۔ نیز اپنے شوہروں، اپنے آباؤ اجداد، اپنے شوہروں کے آباؤ اجداد، اپنے بیٹوں، اپنے شوہروں کے بیٹوں، اپنے بھائیوں، اپنے بھائیوں کے بیٹوں، اپنی بہنوں کے بیٹوں، اپنی ہم مذہب عورتوں، اپنی مملوک عورتوں اور کنیزوں، کسی عورت کی طرف میلان نہ رکھنے والے مردوں یا ان بچّوں کے، جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے آگاہ نہ ہوں، کے علاوہ کسی کے سامنے اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں۔ وہ اس طرح سے زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں کہ اُن کی چھپی ہوئی زینت ظاہر ہو جائے (اور پازیبوں کی جھنکار لوگوں کو سنائی دے) اور سب اللہ کی طرف لوٹ آؤ تاکہ فلاح پا جاؤ۔

شانِ نزول

زیرِ نظر پہلی آیت کے بارے میں کتاب کافی میں امام باقر علیہ السلام سے یہ شانِ نزول نقل ہوئی ہے:

انصار میں سے ایک نوجوان کا راہ چلتے ہوئے ایک عورت سے سامنا ہوا۔ اس زمانے میں عورتیں اپنی چادر کانوں کے پیچھے رکھتی تھیں (ظاہری بات ہے کہ اس طرح گردن اور سینے کی کچھ مقدار نمایاں ہو جاتی تھی)۔ اس نوجوان کی نظر اُس عورت کے چہرے پر پڑی تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ عورت پاس سے گزر گئی مگر یہ جوان ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ قدم بھی اٹھا رہا تھا اور اس کی طرف دیکھے بھی جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ مڑ مڑ کر عورت کی طرف بھی دیکھے جاتا تھا اچانک اس کا چہرہ ایک دیوار پر لگا کہ جس میں ہڈی کی نوک یا شیشے کا ٹکڑا باہر نکلا ہوا تھا چہرہ اس پر جا لگا۔ عورت دور چلی گئی تو نوجوان کو ہوش آیا۔ اُس نے دیکھا کہ خون اس کے چہرے سے جاری ہے اور اس کے لباس اور سینے پر گر رہا ہے (اُسے بہت افسوس ہوا)۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ بخدا میں رسول اللہؐ کے پاس جاتا ہوں اور یہ ماجرا اُن سے کہتا ہوں۔ جس وقت رسولِ خداؐ کی نگاہ اُس

پر پڑی تو فرمایا: تجھے کیا ہوا؟

اس جوان نے آپؐ سے وہ تمام واقعہ بیان کیا۔ اُس وقت وحیِ خدا کا قاصد جبریل نازل ہوا اور یہ آیت پہنچائی:

قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ...[1]

تفسیر

بے پردگی اور بے حیائی کے خلاف اقدام

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ یہ سورت عفت و پاکدامنی کا درس لیے ہوئے ہے۔ اس میں جنسی بے راہ روی کے خلاف اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے مباحث واضح طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

زیرِ بحث آیات میں غیر محرم کی طرف نگاہ کرنے، ہوسناک نگاہوں سے دیکھنے اور پردے کے بارے میں احکام بیان کیے گئے ہیں۔ ان آیات کا خلافِ ناموس تہمتیں لگانے کی بحث سے ربط کسی سے مخفی نہیں ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: مومنین سے کہہ دو کہ (نامحرموں کی طرف سے اور ہر اس چیز سے کہ جن پر نظر ڈالنا حرام ہے) اپنی آنکھیں بند رکھیں اور اپنے دامن کی حفاظت کریں (قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم و يحفظوا فروجهم)۔

"یغضوا" "غض" (بر وزن "خز") کے مادہ سے دراصل کم کرنے اور نقصان کے معنی میں ہے۔ بہت سے مواقع پر یہ لفظ آواز کو کم اور آہستہ کرنے اور نگاہیں کم یا نیچی کرنے کیلئے بولا جاتا ہے لہٰذا آیت یہ نہیں کہتی کہ مومنین اپنی آنکھیں بند کریں بلکہ کہتی ہے کہ وہ اپنی نگاہیں کم اور نیچی کریں یہ لطیف تعبیر ہے کسی وقت کسی مرد کا کسی نامحرم عورت سے سامنا ہو تو اگر وہ آنکھیں بند کر لے تو اس کے چلنا اور دوسرے کام کرنا ممکن نہ رہے لیکن اگر نظریں اس عورت کے چہرے اور بدن سے ہٹا لے اور نگاہیں نیچی کر لے تو گویا اس نے اپنی نگاہ میں کمی کر دی ہے اور وہ منظر کہ جو اس کے لیے دیکھنا ممنوع ہے، اُسے اُس نے اپنی نگاہوں کی پہنچ سے بالکل حذف کر دیا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ کس چیز سے آنکھیں بند کریں (اصلاح کی زبان میں فعل کے متعلق کو حذف کر دیا گیا ہے) تاکہ یہ حکم عمومیت پیدا کرے یعنی اُن تمام چیزوں کے دیکھنے سے آنکھیں بند کر لیں کہ جن کی طرف نگاہ کرنا حرام ہے۔

لیکن سیاق و سباق ــ بالخصوص اگلی آیت کی طرف دیکھنے سے معاملہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اگلی آیت میں پردے کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ لہٰذا یہاں مراد نامحرم عورتوں کی طرف نگاہ کرنا ہے۔ مذکورہ بالا شانِ نزول بھی اسی مفہوم کی مؤید ہے۔[2]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۴ ص ۱۳۹، تفسیر نور الثقلین، المیزان اور روح المعانی (کچھ فرق کے ساتھ) زیرِ بحث آیت کے ذیل میں

[2] "یغضوا من ابصارهم" میں لفظ "من" سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اسے "تبعیض" کے لیے، بعض نے "زائدہ" اور بعض نے "ابتدائیہ" سمجھا ہے۔ لیکن ظاہراً پہلا معنی ہی صحیح ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مرد عورتوں کے چہرے میں گم نہ رہ جائیں کیونکہ اس سے تو یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ اس ارادے کے بغیر نگاہیں کرنا جائز ہے۔ درحقیقت اس سے مراد ہے کہ عام طور پر دیکھتے ہوئے انسان کی نظر ایک وسیع حصے پر پڑتی ہے اگر ایسے میں اس کی نگاہ کسی نامحرم عورت پر جا پڑے تو چاہیے کہ اس کی طرف نہ دیکھے اور اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لے البتہ اپنے راستے اور اونچ نیچ پر نظر رکھے۔ یہ جو "غض" کا معنی کیا گیا ہے اس سے یہی مراد ہے (غور کیجیئے گا)۔

زیر بحث آیت میں دوسرا حکم حفظِ فروج کے بارے میں ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے "فرج" بنیادی طور پر شگاف اور دو چیزوں کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں لیکن اس قسم کے مواقع پر کنایتاً شرمگاہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ہم نے اس کے کنائی معنی کے لیے لفظ "دامان" انتخاب کیا ہے۔

جیسا کہ روایات میں آیا ہے حفظِ فرج سے مراد اسے دوسروں کی نظروں سے چھپانا ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

کل اٰیة فی القراٰن فیها ذکر الفروج فهی من الزنا الا هٰذه الاٰیة فانها من النظر

قرآن کی ہر آیت کہ جس میں حفظِ فرج کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے وہاں مراد زنا سے محفوظ رہنا ہے مگر اس آیت میں اس سے مراد دوسروں کی نگاہ سے محفوظ رکھنا ہے[1]

بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اس کام سے کیوں منع کیا ہے کہ جو خواہشاتِ دل کا تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ ان کے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے (ذٰلك ازكىٰ لهم)۔

اس کے بعد ان لوگوں کو خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ جو جان بوجھ کر نامحرم عورتوں پر ہوس آلود نگاہیں ڈالتے ہیں اور پھر اسے غیر اختیاری قرار دے دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے یقینی طور پر آگاہ ہے۔ (ان الله خبير بما يصنعون)۔

اگلی آیت میں اس سلسلے میں عورتوں کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے۔ پہلے تو وہ ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں جو مردوں کی ذمہ داریوں جیسی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: باایمان عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی آنکھیں بند رکھیں (اور نامحرم مردوں کی طرف دیکھنے سے بچیں) اور اپنے دامن کی حفاظت کریں (وقل للمؤمنات يغضضن من ابصارهن ويحفظن فروجهن)۔

گویا جیسے مردوں پر ہوس آلود نگاہوں سے عورتوں کی طرف دیکھنا حرام ہے اسی طرح عورتوں پر بھی حرام ہے۔ اسی طرح دوسروں سے اپنی شرمگاہ کو چھپانا جیسے مردوں کے لیے ضروری ہے اسی طرح عورتوں پر بھی واجب ہے۔

اس کے بعد تین جملوں میں مسئلہ حجاب کا ذکر ہے اور حجاب کا مسئلہ خصوصیت سے عورتوں سے متعلق ہے۔ ان تین جملوں

---

[1] نور الثقلین ج ۳، ص ۵۸۶ و ص ۵۸۷ بحوالہ اصولِ کافی اور تفسیر علی بن ابراہیم

کو ہم ذیل میں دیکھتے ہیں:

۱۔ انہیں نہیں چاہیئے کہ اپنا بناؤ سنگھار دکھاتی پھریں سوائے اتنی مقدار کے کہ جتنی فطری طور پر ظاہر ہو جاتی ہے (ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها)۔

جس زینت کا چھپانا عورتوں کے لیے ضروری ہے اور جس کے اظہار کی اجازت دی گئی ہے اس کے مصداق کے بارے میں مفسرین میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

بعض نے زینتِ پنہاں کو عورت کی فطری زینت (اُس کے خوبصورت بدن) کے معنی میں لیا ہے جبکہ لفظ "زینت" اس معنی میں بہت ہی کم بولا جاتا ہے۔

بعض دوسروں نے اسے مقامِ زینت کے معنی میں لیا ہے کیونکہ خود زینت مثلاً گوشوارہ، دست بند اور بازو بند وغیرہ کو ظاہر کرنے میں کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کی ممانعت کی جائے۔ ظاہر کرنے کی ممانعت تو مقامِ زینت کے ساتھ مربوط ہے یعنی کان، گردن، ہاتھ اور بازو۔

کچھ مفسرین نے اسے زینت کی چیزوں کے معنی میں لیا ہے البتہ جس وقت وہ بدن پر ہوں۔ واضح ہے کہ ایسی زینت آشکار ہوگی تو ساتھ بدن کا وہ حصہ بھی ظاہر ہوگا کہ جس پر زینت موجود ہے۔

آخری دو تفاسیر نتیجے کے اعتبار سے یکساں ہیں اگرچہ مسئلہ مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

حق یہ ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم پہلے سے کیے گئے فیصلے کے بغیر اور اس کے ظاہری مفہوم کے مطابق اس کی تفسیر کریں اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے مذکورہ بالا تیسرا معنی ہی درست ہے۔

لہٰذا عورتوں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ زینتیں اور بناؤ سنگھار کہ جو عموماً چھپا ہوتا ہے اُسے ظاہر کریں اگرچہ بدن نہ بھی ظاہر ہو۔ اس لحاظ سے عام چادر یا برقعے کے نیچے جو زینت آمیز لباس ہوتا ہے اُسے ظاہر کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ قرآن نے ایسی زینتوں کے اظہار سے منع کیا ہے۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے جو متعدد روایات نقل ہوئی ہیں اُن میں یہی معنی نظر آتا ہے۔ ان کے مطابق زینت باطن سے مراد گلوبند، بازوبند اور پازیب ہے[1]

متعدد روایات میں زینتِ ظاہر سے انگوٹھی اور سرمہ وغیرہ مراد لیا گیا ہے۔ ان روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھپی ہوئی زینتوں سے بھی زیورات اور بناؤ سنگھار کی وہ چیزیں ہی مراد ہیں کہ جو عموماً چھپی ہوئی ہیں۔ (غور کیجیئے گا)۔

۲۔ اس آیت میں عورتوں کو دوسرا حکم یہ دیا گیا ہے: اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے سینوں پر ڈال لیں (وليضربن بخمرهن على جيوبهن)۔

"خمر" "خمار" (بروزن "حجاب") کی جمع ہے بنیادی طور پر یہ لفظ پردے اور چھپانے والی چیز کے معنی میں

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، زیر بحث آیت کے ذیل میں

ہے لیکن عام طور پر اس چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس سے عورتیں اپنا سر چھپاتی ہیں (دوپٹہ یا چادر وغیرہ)۔

"جیوب" "جیب" (بروزن "غیب") کی جمع ہے جس کا معنی ہے گریبان۔ بعض اوقات یہ لفظ سینے کے اوپر والے حصے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے عورتیں اپنے دوپٹوں اور چادروں کے آنچل شانوں پر یا سر کے پچھلی طرف ڈالتی تھیں۔ اس طرح سے ان کی گردن اور سینے کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ عورتیں اپنی چادر اپنے گریباں کے اوپر ڈال لیں تاکہ گردن اور سینے کا دکھائی دینے والا حصہ چھپ جائے (مذکورہ شانِ نزول سے بھی یہی معنی معلوم ہوتا ہے)

۳۔ تیسرے حکم میں ان افراد کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جن کے سامنے عورتیں پردہ ہٹا سکتی ہیں اور چھپی ہوئی زینت کو ظاہر کر سکتی ہیں ——

بات یوں شروع ہوتی ہے: عورتیں اپنی زینت اور سنگھار ظاہر نہ کریں (ولا یبدین زینتھن) —— سوائے ان بارہ مواقع پر:

۱۔ اپنے شوہروں کے لیے (الا لبعولتھن)۔
۲۔ اپنے آباؤ اجداد کے سامنے (او اٰبائھن)۔
۳۔ اپنے شوہروں کے آباؤ اجداد کے سامنے (او اٰباء بعولتھن)۔
۴۔ اپنے بیٹوں کے سامنے (او ابنائھن)۔
۵۔ اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے (او ابناء بعولتھن)۔
۶۔ اپنے بھائیوں کے سامنے (او اخوانھن)۔
۷۔ اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے (او بنی اخوانھن)۔
۸۔ اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے (او بنی اخواتھن)۔
۹۔ اپنی ہم مذہب عورتوں کے سامنے (او نسائھن)۔
۱۰۔ اپنی مملوک کنیزوں کے سامنے (او ماملکت ایمانھن)۔
۱۱۔ ان زیردست مردوں کے سامنے کہ جو کوئی رغبت نہ رکھتے ہوں (او التابعین غیر اولی الاربہ من الرجال)۔
۱۲۔ یا اُن چھوٹے بچوں کے سامنے کہ جو ابھی عورتوں کے پوشیدہ امور کی تمیز نہیں رکھتے (او الطفل الذین لم یظھروا علی عورات النساء)۔

۴۔ آخر میں چوتھا حکم اس طرح بیان کیا گیا ہے: راہ چلتے اپنے پاؤں زمین پر یوں مار کر نہ چلیں کہ ان کی چھپی ہوئی زینت ظاہر ہو جائے (ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن)۔

وہ اپنی عفت و پاک دامنی کا پاس کریں اور ایسے کام نہ کریں کہ جن سے مردوں کے جذبات کو انگیخت ملتی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جادۂ عفت سے بھٹک جائیں۔ اس سلسلے میں اتنی احتیاط سے کام لیں کہ پازیب کی آواز بھی غیر مردوں کو سنائی نہ دے۔ یہ حکم اس امر کا مظہر ہے کہ اسلام اپنے احکام میں انتہائی باریک بینی سے کام لیتا ہے۔

آخر میں تمام مومنین کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورت خدا کی طرف لوٹ آنے کی اور توبہ کی دعوت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اے ایمان والو! سب خدا کی طرف لوٹ آؤ تاکہ فلاح پا جاؤ (وتوبوا الی اللہ جمیعًا ایھا المؤمنون لعلکم تفلحون)۔

اگر اس سلسلے میں گزشتہ زندگی میں تم نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس وقت جبکہ تمہارے سامنے اسلامی احکام واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں اپنی خطاؤں سے توبہ کرو اور نجات و فلاح کے لیے بارگاہِ الٰہی کا رُخ کرو کیونکہ نجات و فلاح صرف اس کے دروازے سے ملتی ہے اور تمہارے راستے میں لغزش کے بہت خطرناک مقامات ہیں کہ جن سے نجات اُس کے لطف کے بغیر ممکن نہیں۔ اپنے آپ کو اسی کے سپرد کر دو۔

یہ بجا ہے کہ ان احکام کے نزول سے پہلے ان کے بارے میں گناہ کا کوئی مفہوم نہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ جنسی امور سے متعلق بہت سارے مسائل عقلی پہلو رکھتے ہیں اصطلاح کی زبان میں ایسے عقلی مسلمات کو "مستقلات عقلیہ" کہتے ہیں اور یہ وہ مسلمات ہیں کہ جن میں حکمِ عقل ہی ذمہ داری کے لیے کافی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ پردے کا فلسفہ: اس میں شک نہیں کہ ہمارے زمانے میں کہ جسے عریانی اور جنسی آزادی کا زمانہ کہتے ہیں بعض لوگوں کو ہمارا پردے کی بات کرنا سخت ناگوار گزرتا ہے۔ یہ وہی مغرب زدہ بے لگام افراد ہیں کہ جو عورتوں کو زمانے کی آزادی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ کبھی یہ لوگ پردے کو گزشتہ زمانے کی کہانی قرار دیتے ہیں لیکن ان بے لگام آزادیوں نے بے حساب مشکلات اور قباحتوں کو جنم دیا ہے اور روز افزوں مصائب پیدا کیے ہیں یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ پردے کی بات سننے والے کان بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

البتہ اسلامی اور مذہبی ماحول میں —— خصوصاً ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد بہت سے مسائل حل ہو گئے ہیں اور اس قسم کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیے گئے ہیں لیکن پھر بھی موضوع کی اہمیت تقاضا کرتی ہے کہ اس مسئلے پر کھل کر بات کی جائے۔

انتہائی معذرت کے ساتھ —— سوال یہ ہے کہ کیا عورتوں کے بارے میں آزادی ہونی چاہیئے کہ سمع، بصر اور لمس کے حوالے سے رسوائے اختلاطِ جنسی کے سب مرد اُن سے فائدہ اُٹھائیں اور وہ تمام مردوں کے اختیار میں ہوں یا یہ امور ان کے شوہروں کے ساتھ مخصوص ہوں۔

بحث یہ ہے کہ کیا عورتیں ایک ختم نہ ہونے والے مقابلے میں اپنا تن بدن دکھاتی رہیں، تحریکِ شہوات کے کام آتی رہیں اور ناپاک مردوں کی ہوس پرستی میں گرفتار رہیں یا پھر یہ باتیں معاشرے سے ختم ہو جائیں اور ان کا تعلق بیوی اور شوہر کی گھریلو زندگی سے مخصوص ہو جائے —— اسلام دوسرے طرزِ عمل کا حامی ہے اور اسلام کے اس پروگرام کے لیے پردہ ایک اہم عنصر ہے —— جبکہ

اہل مغرب اور مغرب زدہ ہوس باز پہلے طرزِ عمل کے حامی ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ جنسی لذّت سمعی حوالے سے ہو یا بصری حوالے سے یا پھر لمس کے ذریعے ـــــ سب بیوی شوہر کے ساتھ مخصوص ہیں اور اگر کچھ اس کے علاوہ ہو تو گناہ اور معاشرے کی ناپاکی کا سبب ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیات میں ہے کہ :

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ

یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔

پردے کا فلسفہ کوئی راز کی بات نہیں ـــــ کیونکہ :

(۱) عورتوں کی بے پردگی، عریانی اور آرائش مردوں کے لیے ـــ بالخصوص جوانوں کے لیے جنسی تحریک کا باعث ہے اور اگر یہ بے حیائی جاری رہے تو یہ تحریک بھی دائمی ہوگی ـــــ ایسی تحریک کہ جو مردوں کے اعصاب کو شکستہ کر کے رکھ دے گی۔ اس سے اعصابی بیماریاں پیدا ہوں گی۔ یہ کیفیت طبیعت میں ہیجان اور نفسیاتی امراض کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

لیکن آخر انسان کے اعصاب کس قدر ہیجان کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ کیا تمام ماہرینِ نفسیات نہیں کہتے ہیں کہ مستقل جنسی ہیجان بیماری کا سبب ہے۔

خاص طور پر اس مسئلے کی طرف توجہ رہے کہ انسانی جبلت میں جنسی قوت بہت قوی، پہلو دار اور گہری ہے۔ انسانی تاریخ میں اس نے ہولناک حوادث، جرائم اور مظالم کو جنم دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے کہا ہے کہ کوئی اہم حادثہ تاریخِ بشر میں ایسا نہیں ملے گا کہ جس میں عورت کا دخل نہ ہو۔ کیا ایسی قوت و جبلت کو عریانی و فحاشی کے ذریعے ابھارنا اور ہوا دینا آگ سے کھیلنے کے مترادف نہیں ہے؟ کیا یہ عاقلانہ کام ہے؟

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی روحیں پُر سکون ہوں، اعصاب صحیح و سالم ہوں، آنکھ اور کان پاکیزہ ہوں ـــــ اور اس کے لیے پردہ ناگزیر ہے۔

(۲) قطعی اور مستند اعداد و شمار سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ عریانی میں اضافے کی وجہ سے دنیا میں طلاق اور ازدواجی زندگی میں علیحدگی کا تناسب بڑھتا چلا جا رہا ہے چونکہ "جو کچھ آنکھ دیکھے دل اسے یاد رکھتا ہے" اور جب ہوا و ہوس کی آگ سرکش ہو جائے اور آنکھ ہر روز نئے نظارے دیکھے تو دل ہر روز کسی نئے محبوب کے پیچھے لے جاتا ہے اور پہلے کو الوداع کہہ دیتا ہے۔

لیکن جس ماحول میں پردہ ہے (اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر اسلامی شرائط کی بھی پاسداری ہوتی ہے) وہاں بیوی اور شوہر ہی کو ایک دوسرے سے تعلق ہوتا ہے۔ ان کے احساسات، جذبات اور محبتیں ایک دوسرے سے مربوط اور مخصوص ہوتی ہیں ـــ جبکہ عریانی کے آزاد بازار میں کہ جہاں عورت مشترکہ ساز و سامان کی حیثیت رکھتی ہے وہاں ازدواجی عہد و پیمان کا تقدس کوئی مفہوم نہیں رکھتا، وہاں گھرانے تارِ عنکبوت کی طرح تیزی سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور بچے بے سہارا ہو کر سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

(۳) فحاشی کا پھیلاؤ اور ناجائز اولاد کی کثرت بے پردگی کے دردناک ترین نتائج میں سے ہیں اور یہ بات اس قدر آشکار ہے کہ ہمارے خیال میں اعداد و شمار کی محتاج نہیں ہے اور اس کی وجوہ خصوصاً مغربی معاشروں میں پورے طور پر نمایاں ہیں بلکہ اس قدر عیاں ہیں کہ بیان کی ضرورت نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ فحاشی اور ناجائز بچوں کا اصلی عامل بے پردگی ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس میں بے شرم استعمار اور تباہ کن سیاسی مقاصد کارفرما نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک عامل بے پردگی اور عریانی ہے۔

اگر اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے تو اس مسئلے کے خطرناک پہلو زیادہ واضح ہو جاتے ہیں کہ فحاشی اور اس سے بھی بڑھ کر ناجائز بچے انسانی معاشروں میں جرائم کا سرچشمہ تھے اور ہیں۔

اعداد و شمار کے مطابق انگلستان میں ہر سال پانچ لاکھ ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ انگلستان کے محققین اور دانشوروں نے اس سلسلے میں ملک کے اربابِ بسط و کشاد کو اس مسئلے کے سنگین خطرے سے آگاہ کیا ہے۔ ان دانشوروں کے مطابق اخلاقی و مذہبی لحاظ سے نہیں بلکہ اس ناجائز اولاد کا وجود معاشرے کے امن و امان کے لیے شدید خطرہ بن چکا ہے یہاں تک کہ جرائم کی بہت سی فائلوں میں انہی کا نام ہوتا ہے۔

اس بات سے ہم اس مسئلے کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ فحاشی و بدکاری کا مسئلہ اُن لوگوں کے لیے بھی شدید کرب انگیز ہو چکا ہے کہ جو مذہب و اخلاق کی کسی اہمیت کے قائل نہیں۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو انسانی معاشرے میں جنسی بے راہ روی کے پھیلنے کا موجب ہو وہ امن و امان کے لیے خطرہ شمار ہوگی اور ہر لحاظ سے اس کے نتائج معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوں گے۔

تربیتی امور کے محققین کا مطالعہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جن تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم ہے اور جن مراکز میں عورت اور مرد مل کر کام کرتے ہیں اور ان کا میل جول آزاد ہے وہاں کام کی رفتار اور معیار کم ہے اور احساسِ ذمہ داری بھی کم ہے۔

(۴) بے پردگی اور عریانی عورت کے مقام کے زوال کا بھی باعث ہے۔ اگر معاشرہ عورت کو عریاں بدن دیکھنا چاہے گا تو فطری بات ہے کہ ہر روز اُس سے آرائش کا تقاضا بڑھتا جائے گا اور اس کی نمائش میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ جب عورت جنسی کشش کی بناء پر ساز و سامان کی تشہیر کا ذریعہ بن جائے گی، انتظار گاہوں میں دل بہلاوا ہو جائے گی اور سیاحوں کو متوجہ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی تو معاشرے میں اس کی حیثیت ایک کھلونے یا بے قیمت مال و اسباب تک گر جائے گی اور اس کے شایانِ شان انسانی اقدار فراموش ہو جائیں گی اور اس کا اعزاز و افتخار صرف اس کی جوانی، زیبائش اور نمائش تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ اس طرح سے وہ چند ناپاک فریب کار انسان نما درندوں کی سرکش ہوا و ہوس پوری کرنے کے ذریعے میں بدل جائے گی۔

ایسے معاشرے میں ایک عورت اپنی اخلاقی خصوصیات، علم و آگہی اور بصیرت کے مظاہرے کیسے کر سکتی ہے اور کوئی بلند مقام کیسے حاصل کر سکتی ہے؟

واقعاً یہ بات تکلیف دہ ہے کہ مغربی اور مغرب زدہ ممالک میں عورت کا مقام کس قدر گر چکا ہے۔ خود ہمارے ملک ایران میں انقلاب سے پہلے یہ حالت تھی کہ نام، شہرت، دولت اور حیثیت ان چند ناپاک اور بے لگام عورتوں کے لیے تھی کہ جو "فنکارہ" اور آرٹسٹ کے نام سے مشہور تھیں۔ جہاں وہ قدم رکھتی تھیں اُس گندے ماحول کے ذمہ دار اُن کے لیے آنکھیں بچھاتے اور انہیں خوش آمدید کہتے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ایران میں وہ بساط لپیٹ دی گئی اور عورت اپنے اس دور سے نکل آئی ہے جس میں اُسے رسوا کر دیا گیا تھا اور وہ فرنگی کھلونے اور بے روح ساز و سامان بن کر رہ گئی تھی۔ اب اس نے اپنا مقام و وقار دوبارہ حاصل کر لیا ہے اور اپنے آپ کو

پردے سے ڈھانپ لیا ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ گوشہ نشین ہوگئی ہے بلکہ معاشرے کے تمام مفید اور اصلاحی کاموں میں حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں اسی اسلامی پردے کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

پردے کے مخالفین کے اعتراضات

اب ہم کچھ ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں کہ جو پردے کے مخالفین پیش کرتے ہیں:

(۱) اس بنیادی اعتراض پر پردے کے سب معترضین کا اتفاق ہے کہ عورتیں معاشرے کا نصف حصہ ہیں لیکن پردہ معاشرے کی اتنی بڑی آبادی کو گوشہ نشین بناکر رکھ دیتا ہے اور اس طرح سے انہیں فکری، تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے پیچھے دھکیل کر پس ماندہ کر دیتا ہے۔ خصوصاً اس اقتصادی دوڑ کے زمانے میں فعال انسانی قوتوں کی ضرورت زیادہ ہے لیکن پردے کی صورت میں اس اقتصادی دوڑ میں عورتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا جبکہ ثقافتی اور سماجی مراکز میں بھی اُن کی جگہ اس طرح خالی رہے گی۔ اس طرح سے عورتیں معاشرے کا غیر پیداواری حصہ بن کر ایک بوجھ بن جائیں گی۔

لیکن —— یہ اعتراض کرنے والے چند امور سے بالکل غافل ہیں یا جان بوجھ کر تغافل برتتے ہیں۔ کیونکہ،

اولاً کون کہتا ہے کہ اسلامی پردہ عورت کو گوشہ نشین بنا دیتا ہے اور اسے معاشرے کے منظر سے دور پھینک دیتا ہے گزشتہ زمانے میں شاید ضروری تھا کہ اس سلسلے میں ہم استدلال پیش کریں لیکن آج انقلابِ اسلامی کے بعد تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم خود دیکھتے ہیں کہ عورتیں گروہ در گروہ اسلامی پردے کے اندر ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ دفتروں، کارخانوں، سیاسی مظاہروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ہسپتال اور مراکزِ صحت میں خصوصاً جنگ کے زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے اور اسی طرح میدانِ ثقافت میں اور تعلیمی اداروں میں یہاں تک کہ دشمن سے جنگ کے میدان میں ہر کہیں عورتیں موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ —— یہ کیفیت ان تمام اعتراضات کا دنداں شکن جواب ہے۔ انقلاب سے پہلے اگر ہم "امکان" پر بات کرتے تھے تو آج اس کا "وقوع" اور "موجودگی" ہمارے سامنے ہے اور فلاسفہ نے کہا ہے کہ کسی شے کے امکان کی بہترین دلیل اس کا وقوع ہے۔ اور یہ آج ایسا آشکار ہے کہ محتاجِ بیان نہیں۔

ثانیاً کیا گھر کو چلانا، بچوں کی تربیت کرکے انہیں آبرومند بنانا اور ایسے انسان تیار کرنا کہ جو آئندہ اپنے توانا بازوؤں سے معاشرے کے عظیم پہیوں کو چلا سکیں کوئی کام نہیں؟

جو لوگ عورت کی اس عظیم خدمت کو مثبت کام شمار نہیں کرتے وہ اس امر سے بے خبر ہیں کہ ایک خاندان ایک صحیح و سالم اور آباد و متحرک معاشرے کی تعمیر میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔

وہ خیال کرتے ہیں کہ بس یہی صحیح راستہ ہے کہ ہمارے مرد اور عورتیں مغربی مردوں اور عورتوں کی طرح صبح سویرے گھر سے نکلیں بچوں کو پرورش گاہوں کے سپرد کریں یا گھر میں چھوڑ کر دروازے بند کر جائیں اور خود دفتر یا کارخانے کی طرف روانہ ہو جائیں اور اُن اَن کھلی کلیوں کو اسی عمر سے قید خانے کا تلخ ذائقہ چکھنے کے لیے چھوڑ جائیں۔

یہ لوگ اس امر سے غافل ہیں کہ یہ عمل بچوں کی شخصیت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس طرح سے بے روح انسانی احساسات

سے عاری بچے پروان چڑھتے ہیں کہ جو معاشرے کے لیے بوجھ ہی نہیں بلکہ اس کے مستقبل کے لیے خطرہ بھی ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ پردہ ہاتھ پاؤں کو باندھ دینے والا لباس ہے اور بھاگ دوڑ اور کام کاج میں بالخصوص جدید مشینی دور میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ایک عورت آخر اپنی حفاظت کرے، اپنی چادر سنبھالے، بچے کو تھامے یا اپنا کام کاج کرے؟

لیکن یہ اعتراض کرنے والے ایک نکتے سے غافل ہیں اور وہ یہ کہ پردہ ہمیشہ چادر اور بُرقعے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایسا لباس جو پورے جسم کو ڈھانپ دے وہی پردہ ہے۔ اگر چادر سے ہو تو کیا ہی بہتر اور جہاں چادر سے نہ ہو تو مکمل پہناوے پر قناعت ہو جائے گی۔

ہماری کسان اور دیہاتی عورتیں کاشت اور کٹائی کا کام کرتی ہیں۔ دھان کے کھیتوں میں اُن کا کام کچھ زیادہ ہی مشکل ہوتا ہے انہوں نے یہ اہم اور مشکل کام اسلامی پردے کے ساتھ انجام دے کر ان اعتراضات کا جواب دے دیا ہے اور اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ ایک دیہاتی عورت اسلامی پردے کے ساتھ بعض اوقات مردوں سے بھی زیادہ اور بہتر کام کرتی ہے اور اس کام میں اس کا پردہ ہرگز رکاوٹ نہیں بنتا۔

(۳) ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ پردہ عورتوں اور مردوں کے درمیان حائل ہو کر مردوں کو زیادہ حریص بنا دیتا ہے۔ اس سے اُن کے حرص کی آگ بجھنے کی بجائے اور بھڑک اُٹھتی ہے کیونکہ:

الانسان حریص علی ما منع

جس چیز سے انسان کو روکا جائے اُس پر زیادہ حریص ہوتا ہے۔

اس سوال کا جواب یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس مغالطے کا جواب ہمارے آج کا ایرانی معاشرہ ہے۔ آج پردہ بلا استثناء ہمارے تمام معاشرے میں اور تقریباً تمام مراکز میں موجود ہے۔ اس دور کا مقابلہ سابقہ شہنشاہی طاغوتی دور سے کیا جا سکتا ہے جبکہ اُس زمانے میں عورتوں سے پردہ زبردستی اتروایا گیا تھا۔

اُس زمانے میں ہر گلی کوچہ مرکزِ گناہ تھا۔ گھرانوں اور خاندانوں کی عجیب بے لگام زندگی تھی۔ طلاق معاشرے میں انتہائی زیادہ ہو چکی تھی۔ ناجائز بچوں کی شرح پیدائش بہت بڑھ چکی تھی اور اسی طرح کی ہزارہا بدبختیاں تھیں۔

ہم نہیں کہتے کہ ان میں سے ہر چیز بنیاد سے بالکل اُکھڑ گئی ہے لیکن بلاشبہ ان بدبختیوں میں بہت زیادہ کمی آئی ہے اور اعتبار سے سلامتی ہمارے معاشرے میں لوٹ آئی ہے اور انشاء اللہ اگر حالات اسی صورت پر رہے اور بچی کھچی قباحتیں بھی ختم گئیں تو ہمارا معاشرہ خاندانوں کی پاکیزگی اور عورت کی قدر و منزلت کے تحفظ کے لحاظ سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔

۲۔ چہرے اور ہاتھوں کا استثناء: اس سلسلے میں کہ کیا چہرے اور کلائیوں سے نیچے ہاتھوں کے لیے پردے کا حکم ہے یا نہیں، فقہاء میں اختلاف ہے اور اس پر بہت بحث کی گئی ہے۔

بہت سے فقہاء کا نظریہ ہے کہ منہ اور ہاتھوں کا چھپانا پردے کے حکم سے مستثنیٰ ہے جب کہ بعض کا فتویٰ ہے

ان کا چھپانا بھی واجب ہے یا کم از کم احتیاط کے مطابق ہے۔ البتہ جو فقہاء ان دونوں کا چھپانا واجب نہیں سمجھتے وہ بھی یہ شرط لگاتے ہیں کہ جب ان کا نہ چھپانا گناہ و انحراف کا سبب بنتا ہو تو ان کا چھپانا واجب ہے۔

زیرِ بحث آیت میں اس استثناء کے قرائن موجود ہیں کہ جن سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً،

(الف) زیرِ بحث آیت میں زینتِ ظاہر کو مستثنیٰ کیا گیا ہے چاہے یہ مقامِ زینت کے معنی میں ہو یا خود زینت کے معنی میں۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا چھپانا واجب نہیں ہے۔

(ب) زیرِ بحث آیت میں چادر کا ایک پلّو گریبان پر ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام سر، گردن اور سینہ چھپایا جائے۔ اس میں منہ کے چھپانے کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ یہ ہمارے بیان کردہ مفہوم کی تائید کے لیے ایک اور قرینہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جیسا کہ شانِ نزول میں بھی ہم نے بیان کیا ہے کہ اُس زمانے میں عرب عورتیں دوپٹہ یا چادر اوڑھا کرتی تھیں۔ اس کے آنچل وہ دوش پر اور پس گردن ڈال لیتی تھیں۔ اس طرح سے چادر اُن کے کانوں کے پیچھے ہوتی تھی سر اور گردن کی پشت کا حصّہ چھپا ہوتا تھا لیکن گلے کے نیچے کا کچھ حصّہ اور سینے کا کچھ حصّہ جو گریبان کے اُوپر ہوتا تھا وہ نمایاں رہتا تھا۔ اسلام آیا تو اُس نے اس کیفیت کی اصلاح کی۔ اسلام نے حکم دیا کہ عورتیں چادر کا پلّو کان کے نیچے یا سر کے پیچھے سے آگے لے آئیں اور اسے گریبان اور سینے کے اُوپر ڈالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چہرہ کھلا رہ گیا اور باقی سب کچھ چھپ گیا۔

(ج) کتبِ حدیث میں اس سلسلے میں بہت سی روایات موجود ہیں کہ جو ہمارے دعویٰ پر زندہ دلیل ہیں[1] اگرچہ ان کی معارض روایات بھی ہیں مگر ان میں اس حد تک صراحت نہیں ہے۔

ایسی دونوں طرح کی روایات کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ جن روایات میں چہرہ اور ہاتھ چھپانے کی بات ہے انہیں مستحب حکم سمجھا جائے یا اس حکم کو ان مواقع کے لیے سمجھا جائے کہ جہاں گناہ، بُرائی اور انحراف کا اندیشہ ہو۔

تاریخی شواہد بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ صدرِ اسلام میں عورتیں عموماً چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی تھیں (اس مسئلے کی روایات پر نیز اس کے مختلف فقہی پہلوؤں پر تفصیلی بحث کے لیے کتبِ فقہ کا باب نکاح دیکھیے)۔

ہم ایک مرتبہ پھر تاکید کرتے ہیں کہ چہرے اور ہاتھوں کے کھلے رہنے کی اجازت اس صورت میں ہے جب ایسا کرنا سوئے استفادہ اور انحراف کا سبب نہ بنے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے پردے سے استثنیٰ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جائز ہے کہ دوسرے لوگ جان بوجھ کر دیکھتے رہیں بلکہ درحقیقت یہ عورتوں کے لیے امورِ زندگی میں سہولت کی خاطر ہے۔

۳۔ " نسائهن " سے کون مراد ہیں؟ جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں پڑھا ہے کہ نواں گروہ جس کے سامنے عورت کو زینت ظاہر کرنے کی اجازت دی گئی ان عورتوں کا ہے جنہیں "نسائهن" (ان کی عورتیں) کہا گیا ہے۔

---

[1] کتاب وسائل الشیعہ ج ۱۴، ص ۱۴۵ باب ۱۰۹ از ابواب مقدمات نکاح۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمان عورتوں کے سامنے اپنا پردہ اتار سکتی ہیں لیکن غیر مسلم عورتوں کے سامنے انہیں اسلامی پردے میں جانا چاہیئے۔ اس حکم کا فلسفہ جیسا کہ روایات میں آیا ہے یہ ہے کہ ممکن ہے وہ عورتیں واپس جا کر مسلمان عورتوں کے بارے میں جو کچھ انہوں نے دیکھا اس کی تعریف اپنے شوہروں کے سامنے کریں اور یہ بات مسلمان عورتوں کے حق میں درست نہیں ہے۔

کتاب "من لا یحضر" میں ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لا ینبغی للمرأة ان تنکشف بین یدی الیهودیة والنصرانیة، فانهن یصفن ذٰلك لازواجهن

مناسب نہیں ہے کہ مسلمان عورت کسی یہودی اور عیسائی عورت کے سامنے عریاں ہو کیونکہ جو کچھ وہ دیکھیں گی اپنے شوہروں سے بیان کریں گی[1]

۴۔ " او ما ملکت ایمانهن " کی تفسیر: ظاہری الفاظ کے اعتبار سے یہ جملہ وسیع مفہوم رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ عورت اپنے غلام و مملوک کے سامنے بے پردہ آ سکتی ہے لیکن بعض احادیث میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اس سے مراد کنیزوں کے سامنے بے پردہ آنا ہے چاہے وہ غیر مسلم ہی ہوں اور اس کے مفہوم میں غلام شامل نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا ینظر العبد الی شعر مولاته

غلام اپنی آقا عورت کے بال نہیں دیکھ سکتا[2]

البتہ کچھ روایات ایسی بھی ہیں کہ جن سے اس لفظ کی عمومیت معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ عمومیت خلافِ احتیاط ہے۔

۵۔ " اولی الاربة من الرجال " کی تفسیر: "اربه" بنیادی طور پر "ارب" (بر وزن "عَرَب") مفردات میں بقولِ راغب شدّتِ احتیاج کے معنی میں ہے کہ جسے پورا کرنے کے لیے انسان کوشش کرتا ہے اور کبھی یہ لفظ مطلق حاجت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اور " اولی الاربة من الرجال " سے یہاں ایسے مرد مراد ہیں کہ جو جنسی خواہش اور بیوی کی ضرورت رکھتے ہوں۔ لہٰذا " غیر اولی الاربة من الرجال " سے ایسے مرد مراد ہیں کہ جو یہ میلان اور خواہش نہ رکھتے ہوں۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں۔ بعض اس سے وہ بوڑھے افراد مراد لیتے ہیں کہ جن کے جنسی جذبات ختم ہو چکے ہوں۔ جیسے " القواعد من النساء " (ایسی عورتیں جو شادی کے قابل نہیں رہ گئی ہوتیں اور اس لحاظ سے بیٹھ چکی ہوتی ہیں)۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے خُسرے اور خواجہ سرا مراد ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۹۳، بحوالہ " من لا یحضره الفقیه "

[2] وسائل الشیعہ ب ۱۲۴ از مقدمات نکاح، حدیث ۸

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسے افراد ہیں کہ جو آلۂ تناسل نہیں رکھتے۔

لیکن جس معنی پر زیادہ افراد کا اتفاق ہے اور جو امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے چند معتبر احادیث میں نقل ہوا ہے یہ ہے کہ اس سے مراد ایسے بے سمجھ مرد ہیں کہ جو ہرگز احساسِ جنسی نہیں رکھتے اور عام طور پر اُن سے آسان سے کام لیے جاتے ہیں آیت میں "التابعین" کی تعبیر بھی اسی معنی کو تقویت دیتی ہے [1]

البتہ چونکہ یہ وصف یعنی جنسی میلان نہ ہونا بعض بوڑھے افراد پر بھی صادق آتا ہے للذا بعید نہیں کہ آیت کے مفہوم میں ایسے بوڑھے افراد بھی شامل ہوں۔ ایک حدیث میں امام کاظم علیہ السلام نے بھی ایسے بوڑھوں کو اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔

لیکن بہرحال آیت کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے مرد محرموں کی طرح ہیں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ایسے افراد سے سر، ہاتھ یا بازو کا کچھ حصّہ یا جسم کا کوئی ایسا حصّہ چھپانا واجب نہیں ہے۔

۶۔ کون سے بچے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں؟ : ہم پڑھ چکے ہیں کہ بارہواں گروہ جس سے پردہ کرنا واجب نہیں ہے وہ بچے ہیں کہ جنہیں ابھی تک جنسی امور کی تمیز نہیں۔ "لم یظھروا" کا معنی کبھی "لم یطلعوا" (آگاہی نہیں رکھتے) کیا گیا ہے اور کبھی "لم یقدروا" (طاقت نہیں رکھتے) کیا گیا ہے کیونکہ یہ مادہ ان دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی یہ مادہ دونوں مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ کہف کی آیت ۲۰ میں ہے:

ان یظھروا علیکم یرجموکم

اگر اہل شہر کو تمہاری موجودگی کا پتہ چل گیا تو تمہیں سنگسار کردیں گے۔

نیز سورہ توبہ کی آیت ۸ میں ہے:

کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ

تم عہد و پیمان توڑنے والوں سے کیسے جنگ نہیں کرتے ہو حالانکہ اگر وہ تم پر قدرت حاصل کرلیں تو نہ رشتہ داری کا لحاظ رکھیں اور نہ عہد و پیمان کا۔

بہرحال زیرِ بحث آیت میں نتیجے کے لحاظ سے ان دونوں معانی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مراد ایسے بچے ہیں کہ جو جنسی احساس نہ ہونے کی بناء پر نہ توانائی رکھتے ہیں اور نہ آگاہی۔ للذا ایسے بچے کہ جو اس عمر کو پہنچ گئے ہیں کہ ان میں یہ میلان اور توانائی پیدا ہو چکی ہے مسلمان عورتوں کو اُن سے پردہ کرنا چاہیئے۔

۷۔ چچا اور ماموں کو محارم میں کیوں شمار نہیں کیا گیا؟ اس آیت سے جو سوالات اُبھرتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے چچا اور ماموں کو محارم کی فہرست میں شمار نہیں کیا گیا حالانکہ یہ بات مسلّم ہے کہ وہ بھی محرم ہیں اور اُن سے بھی پردہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے جواہر الکلام ج ۲۹ ص ۹۴ کے بعد اور اسی طرح وسائل الشیعہ باب ۱۱۱ از ابواب نکاح (ج ۱۴ ص ۱۴۵) اور اسی طرح تہذیب ج ۷، ص ۴۶۸ کی طرف رجوع کریں۔

ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ قرآن اپنے مطالب کو نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے اور وہ ایک لفظ بھی اضافی استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ بھتیجے اور بھانجے کو مستثنیٰ قرار دینا نشاندہی کرتا ہے کہ پھوپھی، خالہ اور ممانی بھی محرم ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کا چچا اور پھوپھا اور ماموں بھی اس کے محرم ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ محرم ہونے کے دو پہلو ہیں۔ لہٰذا ایک پہلو سے جب بھانجے اور بھتیجے محرم ہیں تو فطری سی بات ہے کہ دوسرے پہلو سے اُن کے باپ بھی محرم ہوں گے (غور کیجیئے گا)۔

۸۔ جنسی جذبات کو تحریک دینے والے تمام عوامل ممنوع ہیں : زیرِ بحث آیت کے حوالے سے آخری گفتگو اس مسئلے کے بارے میں ہے کہ آیت کے آخر میں آیا ہے کہ عورتیں راہ چلتے ہوئے اس طرح سے پاؤں زمین پر نہ ماریں کہ اُن کی پازیبوں کی جھنکار سنائی دے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام عفت و پاکدامنی کے مسئلے میں اس قدر حساس ہے اس قسم کے کام کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بطریق اولیٰ اسلام اُن تمام عوامل کی ممانعت کرتا ہے کہ جوانوں کے جنسی جذبات کو اُبھاریں مثلاً عریاں و فحش تصویروں کی اشاعت، گمراہ کن لٹریچر اور جنسی فلمیں اور ایسی داستانیں وغیرہ کی نشر و اشاعت کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلام اُن تمام چیزوں کا مخالف ہے کہ جو نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو گمراہی، بدکاری اور گناہ کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اسلام خریداری کے مراکز اور بازاروں کو ان چیزوں سے پاک کر دینا چاہتا ہے۔

۳۲۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ
اِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَ
اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝
۳۳۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ڰ وَّاٰتُوْهُمْ
مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ اِنْ
اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ
فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
۳۴۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ
خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ع

ترجمہ

۳۲۔ غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی شادی کردو اور اسی طرح اپنے نیک غلاموں اور کنیزوں کو بھی بیاہ دو، اگر وہ تنگ دست ہوئے تو اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کردے گا، اللہ بہت صاحبِ وسعت اور علیم ہے۔

۳۳۔ اور جن کے پاس شادی کرنے کا موقع اور ذریعہ نہیں انھیں عفت و پاکدامنی اپنانا چاہیے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں بھی غنی کردے اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت (آزادی کے لیے ایک خاص قرارداد) کی درخواست کریں تو ان سے مکاتبت کرلو اگر تم ان میں رشد اور بھلائی محسوس کرو (اور یہ سمجھو کہ آزادی کے بعد وہ استقلال کے ساتھ زندگی گزار سکیں گے) اور اللہ نے تمھیں جو مال دیا ہے

اس میں سے کچھ انھیں دے دو اور متاعِ دنیا کے لیے اپنی کنیزوں کو عصمت فروشی پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہیں اور جو کوئی انھیں اس کام پر مجبور کرے (پھر اس پر پشیمان ہو) تو اس جبر کے بعد اللہ غفور و رحیم ہے (لہٰذا توبہ کرو اور اس شرمناک عمل کو ہمیشہ کے لیے ترک کردو)۔

۳۴۔ ہم نے تمھاری طرف کچھ آیات بھیجی ہیں کہ جو بہت سے حقائق واضح کرتی ہیں اور وہ ان لوگوں کی خبریں ہیں کہ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہیں۔

تفسیر

آسان شادی بیاہ کی ترغیب

اس سورہ کے آغاز سے لے کر یہاں تک جنسی آلودگیوں سے بچنے کے لیے مختلف طریقوں سے نہایت جچے تُلے انداز میں گفتگو کی گئی ہے ان میں سے ہر طریقہ اور حکم ان برائیوں کو روکنے کے لیے اپنے مقام پر مؤثر ہے۔ زیر بحث آیات میں ایک اور اہم حوالے سے فحاشی اور برائی کا قلع قمع کرنے کے لیے اقدام کیا گیا اور وہ شادی بیاہ کا سادہ، آسان اور بے ریا طریقہ۔ یہ بات مسلّم ہے کہ بدکاری اور فحاشی کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ صحیح اور جائز طریقے سے انسان کی فطری ضرورت کو پورا کیا جائے۔

لہٰذا زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی شادی کردو اور اسی طرح نیک غلاموں اور کنیزوں کی بھی (وانکحوا الایامٰی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم)۔

"ایامٰی" "ایم" (بروزن "قیم") کی جمع ہے۔ بنیادی طور پر تو یہ لفظ بے شوہر عورت کے معنی میں تھا لیکن بعد از اں مرد کے لیے بھی استعمال ہونے لگا کہ جو بیوی کے بغیر ہو۔ اس لحاظ سے تمام مجرد عورتیں اور مرد اس آیت کے مفہوم میں داخل کیا چاہے وہ کنوارے ہوں یا نہ ہوں۔

یہاں لفظ "انکحوا" (ان کا نکاح کرو) استعمال کیا گیا ہے حالانکہ شادی ایک اختیاری کام ہے اور طرفین کی رغبت و رضامندی سے وابستہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کی شادی کے لیے راہ ہموار کرو، احتیاج کی صورت میں مالی امداد کرو، مناسب رشتے کی تلاش میں مدد دو اور ایسے مردوں اور عورتوں کو شادی پر آمادہ کرو۔ خلاصہ یہ کہ معاملات اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرو، کیونکہ ایسے کام عموماً دوسروں کی وساطت کے بغیر انجام نہیں پاتے۔ مختصر یہ کہ آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی مدد شامل ہے۔

بلاشبہ تعاون کے بارے میں اسلام کا بنیادی اصول تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان تمام امور میں ایک دوسرے کی مدد کریں لیکن شادی بیاہ کے بارے میں تعاون کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس مسئلے کی اس قدر اہمیت ہے کہ ایک حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں ۔

افضل الشفاعات ان تشفع بین اثنین فی نکاح حتی یجمع اللہ بینھما

بہترین تعاون یہ ہے کہ تو دو افراد کے درمیان شادی کے لیے ملاپ کردے یہاں تک کہ معاملہ تکمیل کو پہنچ جائے[1]

ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم بن جعفر (علیہما السلام) سے مروی ہے کہ :۔

ثلاثة یستظلون بظل عرش اللہ یوم القیٰمة ، یوم لا ظل الا ظله ، رجل زوج اخاہ المسلم او اخدمه ، او کتم له سرًا ۔

قیامت کے دن کہ جب عرشِ الٰہی کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا تین گروہ اس کے سایے میں ہوں گے ۔ ایک وہ کہ جو اپنے مسلمان بھائی کی شادی کے لیے وسائل فراہم کرے گا اور دوسرا وہ کہ جو خدمت کی ضرورت کے وقت اسے خدمت گار مہیا کرے گا اور تیسرا وہ کہ جو اپنے مسلمان بھائی کے راز کو چھپائے رکھے گا[2]

ایک حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے :۔

کان له بکل خطوة خطاها ، او بکل کلمة تکلم بها فی ذٰلك ، عمل سنة قیام لیلها وصیام نهارها

جتنے قدم بھی (کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی بہن کی شادی کی) راہ میں اٹھائے گا اور جتنے لفظ بھی اس مقصد کے لیے ادا کرے گا ہر ایک کے بدلے اسے اس ایک سال کی عبادت کا ثواب ملے گا کہ جس میں رات بھر عبادت کے لیے قیام کیا گیا ہو اور دن کو روزہ رکھا گیا ہو[3]

عموماً شادی نہ کرنے اور اس سے بھاگنے کے لیے تنگ دستی اور غربت کا عذر پیش کیا جاتا ہے اس لیے قرآن اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: "غربت کی وجہ سے پریشان نہ ہونا اور ان کی شادی کی کوشش کرنا کیونکہ اگر وہ تنگدست ہوئے تو اللہ اپنے فضل کے ذریعے انھیں بے نیاز کر دے گا" (ان یکونوا فقرآء یغنهم اللہ من فضله)۔

اور اللہ ایسے کام پر قادر ہے کیونکہ وہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور علیم ہے (واللہ سمیع علیم) اس کی

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۴ صفحہ ۲۷ (باب ۱۲ از ابواب مقدمات نکاح)

[2] ایضاً

[3] ایضاً

درت اتنی وسیع ہے کہ عالمِ ہستی پر محیط ہے اور اس کا علم اتنا وسیع ہے کہ وہ تمام نیتوں سے آگاہ ہے جو پاکدامنی کی حفاظت کے لیے شادی کرتے ہیں ان کی نیتوں کو خوب جانتا ہے اور وہ ان سب پر اپنا فضل و کرم کرے گا ۔

اس سلسلے میں ایک واضح تجزیہ اور متعدد روایات ہم بحث کے آخر میں پیش کریں گے ۔

* * *

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ انسان خود بھی پوری کوشش کرتا ہے اور دوسرے بھی پوری سعی کرتے ہیں لیکن پھر بھی شادی نہیں ہو پاتی اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ محروم رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مرحلے پر کچھ لوگ یہ گمان کرنے لگیں کہ اب ان کیلیے جنسی آلودگی جائز ہے اور ضرورت اس کا تقاضا کرتی ہے لہٰذا ساتھ ہی اگلی آیت میں پاکیزگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے : اور وہ کہ جو شادی نہیں کر پاتے اور ان کے لیے وسیلہ نہیں بن جاتا انھیں عفت و پاکدامنی اختیار کرنا چاہیے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل کے ذریعے انھیں بے نیاز کر دے (ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحًا حتّٰی یغنیهم اللہ من فضله)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس بحرانی مسئلے میں اور خدائی آزمائش کے دور میں برائی کے لیے تیار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو معذور سمجھنے لگو کیونکہ ایسا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہے بلکہ اس موقع پر ایمان اور تقویٰ کی قوت کام آنا چاہیے ۔

* * *

جہاں بھی غلاموں اور کنیزوں کے بارے میں گفتگو ہو، موقع کی مناسبت سے اسلام ان کی آزادی کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے لہٰذا یہاں بھی ان کی شادی کی بات آئی تو ساتھ ہی "مکاتبت" کے طریقے سے ان کی آزادی کا ذکر بھی آگیا ہے ۔ مکاتبت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک قرارداد کے ذریعے غلام کام کرتے ہیں اور قسط وار اپنے مالک کو رقم فراہم کرتے ہیں اور اس طرح آزاد ہو جاتے ہیں ۔

ارشاد ہوتا ہے : جو غلام آزادی کے لیے تم سے مکاتبت کا تقاضا کرتے ہیں ان کے ساتھ معاہدہ طے کر لو ۔ اگر ان میں تم رشد اور بھلائی محسوس کرو ۔ (والذین یبتغون الکتاب مما ملکت ایمانکم فکاتبوهم ان علمتم فیهم خیرًا)۔

" علمتم فیهم خیرًا " کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دیکھو کہ اس معاہدے کے لیے ان میں کافی رشد و ہدایت موجود ہے اور پھر وہ اس پر عمل درآمد کی طاقت بھی رکھتے ہوں اور معاہدے کے مطابق مال ادا کر کے آزادی کی زندگی گزار سکنے کے اہل ہوں اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے اور یہ کام مجموعی طور پر ان کے حق میں نقصان دہ ہو اور نتیجۃً وہ معاشرے کے لیے بوجھ بن رہے ہوں تو پھر یہ معاملہ کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھو کہ جب ان میں یہ صلاحیت اور طاقت ہو ۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ یہ اقساط ادا کرتے ہوئے غلاموں کو زیادہ زحمت و مشقت نہ ہو، قرآن حکیم حکم دیتا ہے : جو مال اللہ نے تمھیں دیا ہے اس میں سے کچھ انھیں دو (واٰتوهم من مال اللہ الذی اٰتاکم)۔

جو مال غلاموں کو دینے کا حکم دیا گیا ہے ، اس سے کون سا مال مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے

زیادہ تر کہتے ہیں کہ مراد زکوٰۃ کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں آیا ہے انھیں دیا جائے تاکہ وہ اپنا قرض ادا کرسکیں اور آزاد ہوجائیں۔

بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ غلام کا مالک چند قسطیں اسے بخش دے یا اگر لے چکا ہے تو اسے واپس کردے تاکہ وہ غلامی سے نجات کے لیے زیادہ توانائی حاصل کرلے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ چونکہ کام کے آغاز میں غلام اس قابل نہ ہوگا کہ مال مہیا کرسکے لہٰذا اخراجات میں اس کی مدد کرنا چاہیے اور کچھ سرمایہ انھیں دینا چاہیے تاکہ وہ کوئی کام کاج شروع کرسکیں، اپنا نظام بھی چلاسکیں اور اپنے قرض کی اقساط بھی ادا کرسکیں۔

البتہ مذکورہ تینوں تفاسیر باہم ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کہ تمام مفہوم آیت میں جمع ہوں۔ حقیقی مقصد یہ ہے کہ مسلمان ان مستضعف محروم افراد کی کچھ اس طرح سے مدد کریں کہ یہ جتنا جلدی ممکن ہوسکے غلامی سے نجات پالیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

تضع عنه من نجومه التی لم تکن ترید ان تنقصه، ولا تزید فوق ما فی نفسك

جس چیز کے لینے کا واقعتاً تیرا خیال ہو تخفیف تجھے اس میں سے کرنا چاہیے۔[1]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض لوگ شرعی حیلے بناتے ہیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ ہم نے قرآن کی اس آیت پر عمل کرتے ہوئے اپنے غلاموں کی مدد کی ہے وہ پہلے ہی سے مکاتبت کی رقم جتنی انھیں لینا ہوتی اس سے زیادہ لکھ لیتے تھے تاکہ تخفیف کرتے وقت زیادہ لکھی ہوئی رقم چھوڑ دیں۔ امام صادق علیہ السلام دراصل اس طرزِ عمل سے منع فرمارہے ہیں۔

بعض لوگ اپنے مملوکوں سے ایک نہایت ہی قبیح کام لیتے تھے۔ زیرِ بحث آیت کے آخر میں اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے: دنیا کے زودگزر مال کی خاطر اپنی کنیزوں کو عصمت فروشی پر مجبور نہ کرو، جبکہ وہ پاک و پاکیزہ رہنا چاہتی ہیں (ولا تکرهوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنًا لتبتغوا عرض الحیٰوة الدنیا)۔

اس جملے کی تفسیر میں بعض مفسرین نے لکھا ہے:

عبداللہ بن ابی کے پاس چھ کنیزیں تھیں، وہ مال کمانے کے لیے انھیں جسم فروشی پر مجبور کرتا تھا جس وقت (اس سورہ میں) اسلام نے منافیٔ عفت عمل کی مخالفت کی اور انھیں ختم کرنے کے لیے اقدام کیا تو وہ کنیزیں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس مسئلے کی شکایت کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کام سے منع کیا گیا۔[2]

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کس قدر اخلاقی پستی میں مبتلا تھے۔ حتیٰ کہ ظہورِ اسلام کے بعد بھی بعض لوگ

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳ ص ۶۰۱

[2] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر قرطبی (کچھ فرق کے ساتھ)

ایسے کام جاری رکھے ہوئے تھے یہاں تک کہ اس آیت نے نازل ہوکر اس شرمناک کیفیت کو ختم کیا۔

لیکن ـــــ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے زمانے میں کہ جسے بعض بیسویں صدی کا زمانہ جاہلیت قرار دیتے ہیں۔ بعض ممالک میں یہ کام بڑے شدومد سے جاری ہے ان میں نام نہاد متمدن اور ترقی یافتہ ملک بھی ہیں اور وہ حقوقِ انسانی کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں۔ زمانہ طاغوت میں یہ کام ہمارے ملک میں بھی وحشت ناک صورت میں موجود تھا معصوم اور سیدھی سادھی لڑکیوں کو فریب دے کر بدکاری کے اڈوں میں لے جاتے تھے اور پھر انھیں بڑے شیطانی پھندوں میں جکڑ کر تن فروشی پر مجبور کرتے تھے، اور ان پھندوں سے نکل بھاگنے کے راستے ان پر ہر طرف سے بند کردیتے تھے۔ اس طریقے سے وہ بے شمار دولت جمع کرتے تھے ـــــ اس داستان کی تفصیل بہت دردناک ہے اور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

اگرچہ ظاہراً غلامی کا پرانا نظام موجود نہیں ہے لیکن آج کی نام نہاد مہذب دنیا میں ایسے ایسے جرائم ہوتے ہیں کہ جو دورِ غلامی سے کہیں زیادہ وحشت ناک ہیں۔ خدا دنیا کے لوگوں کو ان نام نہاد مہذب انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد ہمارے ملک میں ان شرمناک اعمال کا خاتمہ ہوگیا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "ان اردن تحصنًا" (اگر وہ پاک رہنا چاہتی ہیں.....) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر خود وہ عورتیں اس کام کی طرف مائل ہوں تو پھر انھیں مجبور کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس طرح کی تعبیر "منتفی بہ انتفاءِ موضوع" کہلاتی ہے کیونکہ "اکراہ" (مجبور کرنا) عدم رضامندی کی صورت میں صادق آتا ہے ورنہ تن فروشی اور اس کے لیے ابھارنا ہر حالت میں گناہِ عظیم ہے یہ تعبیر اس لیے ہے کہ اگر ان کنیزوں کے مالک تھوڑی سی بھی غیرت رکھتے ہوں تو انھیں ہوش آئے کہ یہ کنیزیں جنھیں ظاہراً کمتر سمجھا جاتا ہے جب وہ اس گناہ کی طرف مائل نہیں ہیں تو تم تو بہت کچھ بنتے ہو ـــــ پھر اس پستی کو کیوں قبول کرتے ہو۔

قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ گناہگاروں کے لیے لوٹ آنے کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور توبہ و اصلاح کی ترغیب دیتا ہے اس سلسلے میں آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور جس کسی نے انھیں اس کام پر مجبور کیا (اور پھر وہ اس پر پشیمان ہوا) تو ان کے جبر کے بعد اللہ غفور و رحیم ہے (ومن یکرههن فان الله من بعد اکراههن غفور رحیم)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہوسکتا ہے یہ جملہ کنیزوں کے مالکوں کی کیفیت کی طرف اشارہ ہو کہ جو اپنے تاریک اور شرمناک ماضی پر پشیمان ہیں اور اب توبہ و اصلاح پر آمادہ ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان عورتوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو جبر کی وجہ سے مجبوراً یہ کام کرواتی تھیں۔

قرآن اپنی روش کے مطابق زیرِ بحث آخری آیت میں گزشتہ مباحث کی طرف مجموعی طور پر اشارہ کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تم پر آیات نازل کیں کہ جو بہت سے حقائق واضح کرتی ہیں (ولقد انزلنا الیکم اٰیات مبینات)۔

نیز ہم نے تم سے گزشتہ لوگوں کی مثالیں اور خبریں بیان کی ہیں (ومثلًا من الذین خلوا من قبلکم)، اور یہ سب پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہیں (وموعظة للمتقین)۔

چند اہم نکات

ا۔ شادی خدائی حکم ہے :۔ موجودہ زمانے میں شادی بیاہ میں اس قدر غلط رسمیں بلکہ خرافات داخل ہوگئی ہیں کہ نوجوانوں کے لیے یہ ایک نہایت پیچیدہ اور دشوار معاملہ بن کر رہ گیا ہے لیکن ان رسموں سے قطع نظر شادی ایک فطری اور قانونِ آفرینش سے ہم آہنگ تقاضا ہے۔ انسانی نسل کی بقاء، جسم و روح کی تسکین اور زندگی کی بہت سی مشکلوں کے حل کے لیے صحیح طریقے سے شادی ناگزیر ہے۔ اسلام کہ جو ہمیشہ فطرت سے ہم آہنگ قدم اٹھاتا ہے اس نے اس سلسلے میں جاذب اور مؤثر باتیں کی ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے :۔

تناکحوا و تناسلوا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یوم القیامة ولو با لسقط

شادی کرو تاکہ تمھاری نسل بڑھے کیونکہ روزِ قیامت میں تمھاری تعداد کی کثرت پر فخر کروں گا، یہاں تک کہ سقط شدہ بچوں پر بھی[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :۔

من تزوج فقد احرز نصف دینه فلیتق الله فی النصف الباقی

جس شخص نے شادی کی اس نے اپنا آدھا دین محفوظ کر لیا جبکہ باقی آدھے دین کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے اور تقویٰ اختیار کرے[2]

یہ اس لیے کہ انسان میں جنسی قوت بہت قوی اور سرکش ہوتی ہے۔ تنہا یہ قوت باقی تو توں اور صلاحیتوں کا مقابلہ کرتی ہے اور اس حوالے سے انسان کا انحراف اس کے آدھے دین و ایمان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں :۔

شرارکم عزابکم

تم میں سے بدترین افراد غیر شادی شدہ اور مجرد ہیں[3]

اسی بنا پر زیرِ بحث آیات میں اور متعدد روایات میں مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ افراد کی شادی کروانے میں ہر قسم کی ممکنہ مدد کریں۔ خصوصاً اسلام نے اولاد کے بارے میں باپ پر سخت ذمّہ داری عائد کی ہے اور جو باپ اس اہم مسئلے کی پرواہ نہیں کرتے انھیں اولاد کی کجروی کے جُرم میں شریک شمار کیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ

[1] سفینۃ البحار، جلد اول ص ۵۶۱ (مادہ زوج)
[2] ایضاً
[3] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں

وآلہ وسلم سے منقول ہے :۔

من ادرك له ولد وعنده ما یزوجه فلم یزوجه ، فاحدث فالاثم بینهما

جس کا بیٹا بالغ ہو جائے اور وہ اس کی شادی کے وسائل رکھتا ہو اور پھر بھی اس کے لیے اقدام نہ کرے اور اس کے نتیجے میں اس کا بیٹا کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو یہ گناہ دونوں کا لکھا جائیگا[1]

اسی بناء پر تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ شادی کے اخراجات سادہ اور آسان ہونا چاہییں چاہے وہ حق مہر کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں تاکہ اخراجات شادی کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ عموماً زیادہ حق مہر کا مسئلہ کم آمدنی والے افراد کی شادی کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے اس سلسلے میں رسول اللہؐ سے ایک حدیث مروی ہے کہ :۔

شوم المرئة غلاء مهرها

منحوس اور بدبخت ہے وہ عورت کہ جس کا حق مہر بھاری ہو[2]

اسی ضمن میں ایک اور حدیث ہے :۔

من شومها شدة مؤنتها

اس کی نحوست کی ایک نشانی اس کی زندگی (یا شادی) کے اخراجات کا زیادہ ہونا ہے[3]

بہت سے مرد اور عورتیں اس الٰہی اور انسانی ذمہ داری کو قبول نہ کرنے کے لیے ایک عذر مالی وسائل نہ ہونے کا پیش کرتے ہیں اس سلسلے میں زیرِ بحث آیات میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ غربت و افلاس شادی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا بلکہ بہت سی شادیاں خوشحالی کا باعث بن جاتی ہیں۔ غور کرنے سے اس کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک آدمی اکیلا اور مجرّد ہو اسے ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا اور وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور استعداد کو پوری طرح بروئے کار نہیں لاتا اور اگر کچھ کماتا ہے تو اسے سنبھال کر رکھنے کی کوشش نہیں کرتا اس لیے غیر شادی شدہ افراد عموماً تہی دست ہوتے ہیں لیکن شادی کے بعد انسان کی شخصیت ایک اجتماعی شخصیت میں بدل جاتی ہے۔ شادی کے بعد مرد شدّت سے محسوس کرتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کی حفاظت کرے اور اس کا نان نفقہ پورا کرے۔ اس میں پھر خاندان کی آبرو کا احساس ہوتا ہے اور وہ ہونے والی اولاد کے لیے وسائلِ زندگی مہیا کرنے کی تگ و دو کرتا ہے اس لیے وہ پورے شعور سے اپنی صلاحیت اور استعداد بروئے کار لاتا ہے اور اپنی آمدنی کی حفاظت اور اس میں قناعت کی کوشش کرتا ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ افلاس پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ بلاوجہ نہیں کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

[1] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔
[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ باب ۵ - از ابواب المہور ص ۱۰
[3] ایضاً

الرزق مع النساء و العیال

روزی بیوی اور بچوں کے ساتھ ساتھ ہے[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ:۔

ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا اس نے آپؐ سے اپنی تہی دستی کی شکایت کی، آپؐ نے فرمایا:۔

تزوج

شادی کر

فتزوج فوسع لہ

اس نے شادی کی تو اس کے رزق میں فراخی آگئی[2]

اس میں شک نہیں کہ تائید ایزدی اور مخفی روحانی قوتیں بھی ایسے افراد کی مدد کرتی ہیں کہ جو انسانی ذمہ داری پوری کرنے اور اپنی پاکدامنی کی حفاظت کے لیے شادی کرتے ہیں، ہر باایمان شخص اس خدائی وعدے پر بھروسہ کرسکتا ہے اس سے دلولہ حاصل کرسکتا ہے اور اس پر ایمان لاسکتا ہے۔

ایک اور حدیث پیغمبر اکرمؐ سے ان الفاظ میں مروی ہے:۔

من ترك التزویج مخافة العیلة فقد ساء ظنه بالله ان الله عز وجل یقول ان یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله

جو شخص غربت کے خوف سے شادی نہ کرے اس نے اللہ کے بارے میں سوئے ظن کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اگر وہ غریب ہوئے تو اللہ انھیں اپنے فضل سے غنی کردے گا"[3]

اسلامی کتب میں اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات ہیں اگر ہم ان سب کو نقل کرنے لگیں تو بات تفسیری حدود سے بڑھ جائے گی۔

۲۔ "والصالحین من عبادکم وامائکم" کی تفسیر:۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں جہاں غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی شادی کرنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے اور ایک عمومی حکم دیا گیا ہے وہاں جب غلاموں اور کنیزوں کی شادی کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ "صالح" ہونے کی شرط عائد کردی جاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۹۵

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ص ۲۵ (باب ۱۱۔ از ابواب عقد باب نکاح)

[3] 〃 〃 ص ۲۴ (باب ۱۰۔ از ابواب عقد باب نکاح)

اس کی کیا وجہ ہے؟

تفسیر المیزان کے مؤلفِ گرامی اور صاحب تفسیر صافی وغیرہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے جو شادی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ———— لیکن اگر معاملہ یونہی ہو تو پھر یہ شرط آزاد عورتوں اور مردوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ اس سے مراد اخلاق واعتقاد کے لحاظ سے صالح ہونا ہے کیونکہ اس سلسلے میں "صالحین" ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں ———— لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر غلاموں کے علاوہ دوسروں کے لیے یہ شرط کیوں عائد نہیں کی گئی۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس سے ایک اور چیز مراد ہے اور وہ یہ کہ اس دور میں تمدنی، ثقافتی اور اخلاقی لحاظ سے غلام اور کنیزیں بہت پست تھیں انھیں مشترک زندگی کی ذمہ داری کا کوئی احساس نہ تھا اگر ایسی صورتِ حال میں ان کی شادی کردی جاتی تو وہ آسانی سے شریکِ حیات کو چھوڑ کر اسے پریشان و سرگرداں چھوڑ دیتے ان کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ اخلاقی صلاحیت رکھتے ہیں تو ان کی شادی کے لیے اقدام کیا جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے ان کی تربیت کی جائے اور ان کا اخلاق صالح کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ ازدواجی زندگی کے اہل ہوسکیں اور پھر ان کی شادی کی جائے۔

۳۔ عقد مکاتبہ:۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام نے غلاموں کی تدریجی آزادی کا پروگرام دیا تھا۔ لہٰذا اسلام نے ہر موقع سے ان کی آزادی کے لیے فائدہ اٹھانے کے لیے اقدام کیا ہے ان میں سے ایک "مکاتبت" کا طریقہ ہے زیر بحث آیت میں ایک حکم کے طور پر اس کا ذکر آیا ہے۔

"مکاتبہ"، "کتابت" کے مادے سے ہے اور کتابت بنیادی طور پر "کتب" (بروزن "کسب") کے مادے سے جمع کرنے کے معنی میں ہے اور یہ جو لکھنے کو "کتابت" کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان حروف اور الفاظ کو ایک عبارت میں جمع کردیتا ہے اور مکاتبت میں چونکہ آقا اور غلام کے درمیان قرارداد لکھی جاتی ہے لہٰذا اسے مکاتبت کہتے ہیں۔

"عقدِ مکاتبہ" ایک قسم کی قرارداد ہے کہ جو دو افراد کے درمیان طے پاتی ہے اس میں غلام ذمہ دار ہوتا ہے کہ آزاد محنت مزدوری کے ذریعے مال مہیا کرے اور اسے قابلِ عمل قسطوں میں اپنے آقا کو ادا کرے اور آزاد ہوجائے۔ آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ یہ ساری قسطیں مل کر غلام کی قیمت سے زیادہ نہیں ہونا چاہییں۔

بعض وجوہ کی بناء پر غلام اگر قسطیں ادا کرنے سے قاصر ہو تو وہ قسطیں بیت المال سے یا زکوٰۃ کے ایک حصے سے ادا کی جائیں گی تاکہ وہ آزاد ہوجائے بعض فقہاء نے یہاں تک تصریح کی ہے کہ اگر زکوٰۃ خود آقا پر واجب الادا ہو تو وہ غلام کے ذمہ اقساط کا حساب زکوٰۃ سے کرلے یہ معاہدہ عقدِ لازم ہے اور طرفین میں سے کوئی بھی اسے توڑنے کا حق نہیں رکھتا۔ واضح ہے کہ اس پروگرام کے تحت بہت سے غلام آزادی حاصل کرسکیں گے اور جس مدت میں انھیں کام کرکے اقساط ادا کرنا ہے اس میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوجائیں گے اور ان مالکوں کا بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا اور غلاموں کی کمی کی وجہ سے وہ کوئی منفی ردعمل بھی ظاہر نہیں کریں گے۔

مکاتبت کے بارے میں بہت سے فروعی احکام بھی ہیں کہ جن کی تفصیل فقہی کتب میں متعلقہ باب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۳۵۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا
مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ
دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ
وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی
نُوْرٍ ؕ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ
۳۶۔ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ
لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ
۳۷۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ
الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ
الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ
۳۸۔ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ؕ
وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

ترجمہ

۳۵۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ نورِ خدا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی (روشن) چراغ کسی طاق میں
رکھا ہو اور وہ چراغ فروزاں ستارے کی طرح کے شفاف اور درخشندہ فانوس میں ہو اور اس چراغ کو روشن
کرنے کے لیے تیل زیتون کے ایسے مبارک درخت سے لیا گیا ہو کہ جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے (اس کا
روغن ایسا صاف اور خالص ہو کہ) اگر چہ آگ اسے چھوئے بھی نہ لیکن وہ روشن ہو جاتا ہو۔ نور کے اوپر نور ہے
اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے اور وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے اور

وہ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے۔
۳۶۔ (یہ روشن چراغ) ایسے گھروں میں ہے کہ جن کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کی دیواریں بلند کی جائیں (تاکہ وہ
شیطانوں اور ہوس پرستوں سے امان میں ہوں) ایسے گھر کہ جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور جن میں صبح و شام
اس کی پاکیزگی بیان ہوتی ہے۔
۳۷۔ ایسے جوانمرد کہ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت یادِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر سکتے وہ اس
دن سے ڈرتے ہیں کہ جب دل اور آنکھیں زیر و زبر ہو جائیں گی۔
۳۸۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ انھیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے اس پر اضافہ بھی کر دے، اور اللہ
جسے چاہتا ہے رزقِ بے حساب دیتا ہے (اور اپنی بے انتہا نعمات سے نوازتا ہے)

تفسیر

آیتِ نور

زیرِ نظر آیات کی تفسیر کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ مسلمان مفسرین، فلاسفہ اور عرفاء میں سے ہر ایک نے اپنے انداز سے بات کی ہے گزشتہ آیات سے ان کا تعلق یہ ہے کہ قبل ازیں عفت و پاکدامنی کے بارے میں مختلف انداز سے مختلف حوالوں سے بات ہوئی ہے۔ فحاشی اور بدکاری کی روک تھام کے لیے احکام دیئے گئے ہیں اور تمام احکامِ الٰہی کے اجراء کا ضامن ایمان ہے۔ ایمان ہی سرکش خواہشات پر کنٹرول کر سکتا ہے۔ انسانی جذبات میں سے قوی ترین جنسی جذبات ہیں اور ان پر کنٹرول ایمان کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا آخر کار زیرِ نظر آیات میں بحث کا رخ ایمان اور اس کے قوی اثرات کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (اللہ نور السماوات والارض)۔

کیسا پیارا، حسین اور جاذب اور قیمتی جملہ ہے ——— جی ہاں! اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے وہ خود نور ہے اور نور رساں بھی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ نور سے یہاں مراد ہے "ہدایت کرنے والا"۔

بعض نے اس کا معنی کیا ہے "روشن کرنے والا"۔

بعض نے مراد لیا ہے "زینت بخشنے والا"۔

یہ سب معانی صحیح ہیں لیکن آیت کا مفہوم ان سے بھی وسیع تر ہے اس کی وضاحت یوں ہے:-

قرآن مجید اور روایات میں لفظ "نور" کا اطلاق مختلف حوالے سے ہوا ہے مثلاً :۔

۱۔ قرآن مجید: سورۂ مائدہ کی آیت ۱۵ میں قرآن مجید کو نور قرار دیا گیا ہے ۔

قد جاءکم من الله نور وکتاب مبین

اللہ کی طرف سے تمھارے لیے نور اور کتاب مبین آئی ہے ۔

اسی طرح سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں ہے :۔

واتبعوا النور الذی انزل معه اولئك هم المفلحون

جو لوگ پیغمبر کے ساتھ نازل ہونے والے نور کی پیروی کرتے ہیں وہی فلاح یافتہ ہیں ۔

۲۔ ایمان :۔ بعض مقامات پر "ایمان" کے لیے لفظ "نور" آیا ہے ۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۷ میں ہے :۔

الله ولی الذین اٰمنوا یخرجهم من الظلمات الی النور

اللہ ان کا ولی ہے کہ جو ایمان لائے ہیں انھیں (کفر و شرک) کی تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کے) نور کی طرف ہدایت کرتا ہے ۔

۳۔ ہدایتِ الٰہی :۔ ہدایت اور روشن بینی کو بھی نور کہا گیا ہے ۔ جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۲۲ میں آیا ہے ۔

اومن کان میتًا فاحیینا وجعلنا له نورًا یمشی به فی الناس کمن مثله فی الظلمات لیس بخارج منها

جو شخص مر چکا تھا اور ہم نے اسے زندہ کیا اس کے لیے نورِ ہدایت قرار دیا کہ جس کے باعث وہ لوگوں کے درمیان چل پھر سکتا ہے ۔ کیا ایسا شخص اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے کہ جو تاریکی میں ہو اور اس سے کبھی نکل نہ سکے ۔

۴۔ دینِ اسلام :۔ دینِ اسلام کو بھی نور قرار دیا گیا ہے سورۂ توبہ کی آیت ۳۲ میں ہے :۔

ویأبی الله الا ان یتم نوره ولو کره الکافرون

اور اللہ سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتا کہ اپنے نور کو تکمیل تک پہنچائے ۔ چاہے کافروں کو ناگوار ہی گزرے ۔

۵۔ پیغمبر اکرمؐ :۔ سورۂ احزاب کی آیت ۴۶ میں رسولِ اکرمؐ کے بارے میں فرمایا گیا ہے :۔

وداعیًا الی الله باذنه وسراجًا منیرًا

ہم نے تجھے اذانِ الٰہی سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ قرار دیا ہے ۔

۶۔ آئمہ معصومین علیہم السلام :۔ زیارت جامعہ میں آیا ہے :۔

خلقکم الله انوارًا فجعلکم بعرشه محدقین

اللہ نے آپ کو انوار خلق کیا اور آپ اس کے عرش کے گرد حلقہ ڈالے ہوئے تھے ۔

نیز اسی زیارت میں :۔

وانتم نور الاخیار و هداة الابرار

آپ بہترین لوگوں کے لیے نور ہیں اور نیک انسانوں کے لیے ہدایت ہیں ۔

۷۔ علم و دانش :۔ مشہور حدیث ہے :۔

العلم نور یقذفه الله فی قلب من یشاء

علم نور ہے اللہ جسے چاہتا ہے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے ۔

ایک طرف تو نور کے یہ مصادیق ہیں اور دوسری طرف نور کے امتیازات جن کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ اجمالی مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ نور کے یہ امتیازات ہیں ۔

۱۔ مادی دنیا میں نور لطیف ترین اور حسین ترین موجودات میں سے ہے ، اور یہ تمام زیبائیوں اور لطافتوں کا سرچشمہ ہے ۔

۲۔ ماہرین میں یہ بات مشہور ہے کہ عالمِ مادہ میں نور اور روشنی کی رفتار سب سے زیادہ ہے اس کی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے گویا نور پلک جھپکنے میں کرۂ زمین کے سات چکر لگا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ عظیم ستاروں کی مسافت روشنی کی رفتار کے ساتھ ناپی جا سکتی ہے اس کا ایک پیمانہ نوری سال ہے یعنی وہ مسافت جسے نور ایک سال میں طے کرتا ہے ۔

۳۔ نور اس جہان میں اجسام کی پہچان کا ذریعہ ہے اسی سے دنیا کے مختلف موجودات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اس کے بغیر کسی چیز کو دیکھا نہیں جا سکتا ۔ لہذا "نور" ظاہر بھی ہے "مظہر" بھی ۔ (یعنی دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے والا بھی ہے)

۴۔ سورج کی روشنی ہماری دنیا کی اہم ترین روشنی ہے یہی روشنی پھولوں ، پھلوں ، کھیتوں اور سبزہ زاروں کی پرورش اور نشوونما کا ذریعہ ہے بلکہ تمام زندہ موجودات کی بقاء اسی روشنی سے ہے اور ممکن نہیں ہے کہ کوئی موجود روشنی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیے بغیر زندہ رہ سکے ۔

۵۔ دورِ حاضر میں ثابت ہو چکا کہ تمام رنگ نورِ آفتاب یا اس سے مشابہ روشنیوں کا نتیجہ ہیں ۔ روشنی کے بغیر سب تاریکی ہی ہے اور مطلق تاریکی میں کسی رنگ کا کوئی تصور ہی نہیں

۶۔ تمام توانائیاں ، جو ہمارے گرد و پیش موجود ہیں ، (اٹیمی توانائی کے سوا) ـــــــ سب کا سرچشمہ سورج کی روشنی ہے ۔ ہواؤں کی رفتار ، بارش کی برسات ، نہروں کی روانی آبشاروں کا گرنا ـــــــ خلاصہ یہ کہ ـــــــ تمام موجودات کی حرکت ـــــــ اگر غور کیا جائے تو روشنی کے دم سے ہے ۔

حرارت کا سرچشمہ سورج کی روشنی ہے اسی کے سبب موجودات کا بستر گرم ہے، درختوں کی لکڑی، پتھر کے کوئلے یا پٹرول وغیرہ سے حاصل ہونے والی تمام حرکات کا اصل مآخذ سورج کی تپش ہے کیونکہ سائنسی تحقیقات کے مطابق یہ تمام چیزیں نباتات اور حیوانات سے حاصل ہوتی ہیں اور نباتات وحیوانات کی بقا کا دارومدار سورج کی روشنی اور تپش پر ہے ——— لہذا گاڑیوں اور مشینوں کی روانی بھی اسی کی برکت سے ہے۔

سورج کی روشنی طرح طرح کے جراثیم اور موذی موجودات کو ختم کرتی ہے اگر سورج کی بابرکت شعاعیں نہ ہوتیں تو کرہ زمین ایک بہت بڑے "بیمارستان" میں بدل جاتا اور اس کے تمام باسی ہمیشہ موت وحیات کی کشمکش میں رہتے۔

خلاصہ یہ کہ اس عالمِ خلقت کی اس عجیب چیز ——— یعنی نور ——— پر جتنا بھی غور و فکر کریں اتنا ہی اس کے گراں بہا آثار اور عظیم برکات ظاہر ہوں گی۔

اس تمہید کو پیشِ نظر رکھیے اور اب سوچیے کہ اس عالم کے حسی موجودات میں سے اگر کوئی چیز تشبیہ وتمثیل کے لیے انتخاب کریں (اگرچہ اس کا مقام باعظمت ہر شبیہ ونظیر سے برتر ہے) تو کیا لفظ "نور" کے علاوہ کسی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

وہ خدا کہ جو تمام عالمِ ہستی کو عالمِ ظہور میں لانے والا ہے۔
جو عالمِ آفرینش کو روشنی عطا کرتا ہے۔
تمام موجودات جس کے فرمان کی برکت سے زندہ ہیں
اور تمام مخلوقات جس کے خوانِ نعمت پر پلتی ہیں۔
وہی خدا ——— کہ اگر لمحہ بھر کے لیے ان موجودات سے اپنی چشمِ الطاف پھیرے تو سب فنا کی تاریکی میں ڈوب جائیں۔ اور یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ موجود اس سے جس قدر ربط رکھتا ہے۔ اسی قدر اس سے نورانیت اور روشنی حاصل کرتا ہے ——— اسی لیے:-

قرآن نور ہے چونکہ اس کا کلام ہے
دین اسلام نور ہے چونکہ اس کا آئین ہے
انبیاء ورسلؑ نور ہیں چونکہ اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔
آئمہ معصومینؑ نور ہیں چونکہ انبیاءؑ کے بعد اس کے دین کے نگہبان ہیں۔
ایمان نور ہے چونکہ اس سے رشتہ جوڑ دیتا ہے۔
علم نور ہے چونکہ اس کی معرفت کا باعث ہے۔
لہذا ——— اللہ نور السماوات والارض ——— ہے

اور اگر لفظ نور کو اس کے وسیع معنی میں لیں تو پھر اللہ کے لیے اس کا استعمال تشبیہ بھی نہیں ہوگا کیونکہ "نور" کا معنی ہے "ایسا وجود جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرنے والا ہو"۔ اس لیے کہ عالمِ خلقت میں کوئی چیز اس سے زیادہ آشکار نہیں اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ اس کے وجود کی برکت سے ظاہر ہے۔

کتاب "توحید" میں ہے کہ کسی نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے "اللہ نور السماوات والارض" کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا:-

ھاد لاھل السماوات وھاد لاھل الارض

وہ ہادی ہے اہلِ آسمان کا اور وہ ہادی ہے اہلِ زمین کا۔

درحقیقت ——— ہدایت ——— نورالٰہی کی ایک خصوصیت ہے لیکن اس کی فقط یہی خصوصیت نہیں، اسی طرح وہ تمام تفاسیر کہ جو اس آیت کے سلسلے میں مذکور ہیں انھیں ہماری مذکورہ بالا تفسیر میں جمع کیا جاسکتا ہے کیونکہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اس بے نظیر نور اور بے مثل روشنی کا ایک رخ ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ دعائے جوشنِ کبیر کے سینتالیسویں حصے میں صفاتِ الٰہی یوں بیان ہوئی ہیں۔

یا نور النور، یا منور النور، یا خالق النور، یا مدبر النور، یا مقدر النور، یا نور کل نور، یا نورًا قبل کل نور، یا نورًا بعد کل نور، یا نورًا فوق کل نور، یا نورًا لیس کمثلہ نور

اے نور کی روشنی، اے روشنیوں کو نور عطا کرنے والے، اے نور کے خالق، اے نور کے ناظم، اے نور کے نظامِ تقدیر چلانے والے، اے سب روشنیوں کے نور، اے نور کہ جو سب روشنیوں سے پہلے ہے، اے نور کہ جو سب روشنیوں کے بعد بھی ہے، اے نور جو سب روشنیوں سے بالا ہے، اے نور کہ جس کی مثال کوئی نور نہیں ہے۔

اس طرح سے تمام عالمِ ہستی کا مرکز وہی ہے اور سب نور اس کی ذاتِ پاک کے نور تک جا پہنچتے ہیں۔

اس بات کے بعد قرآن نورِالٰہی کی کیفیت بیان کرنے کے لیے ایک عمدہ اور دقیق مثال پیش کرتا ہے فرماتا ہے: نورِ خدا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی چراغ طاق میں رکھا ہو اور وہ چراغ ایک فانوس میں ہو اور وہ فانوس فروزاں ستارے کی مانند شفاف و درخشاں ہو (مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانھا کوکب دری)۔

اور یہ چراغ زیتون کے اس مبارک اور بابرکت درخت کے تیل سے جلایا جاتا ہو کہ جو نہ شرقی ہے نہ غربی (یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لاشرقیۃ ولا غربیۃ)۔

اس کا تیل ایسا صاف اور خالص ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر شعلہ زن ہو جاتا ہو (یکاد زیتھا یضیء ولو لم تمسسہ نار)۔

ایک نور ہے کہ جو نور کے اوپر ہے (نور علی نور)۔

اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے (یھدی اللہ لنورہ من یشاء)۔

اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے (ویضرب اللہ الامثال للناس)۔

اور اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے (واللہ بکل شیء علیم)۔

اس مثال کی وضاحت کے لیے ذیل کے چند امور کی طرف توجہ ضروری ہے۔

"مشکوٰۃ" دراصل دیوار میں بنائے گئے سوراخ، طاق اور چھوٹی سی جگہ کے معنی میں ہے کہ جو دیوار میں چراغ رکھنے کے لیے بناتے ہیں تاکہ ہوا اور طوفان سے چراغ محفوظ رہیں کبھی کمرے کے اندر بھی چھوٹا سا طاقچہ بنایا جاتا ہے یہ طاقچہ گھر کے صحن کی جانب بناکر آگے شیشہ لگا دیتے ہیں اس طرح سے کمرے میں بھی روشنی آتی ہے اور صحن میں بھی اور ساتھ ہی آندھی وغیرہ سے بھی محفوظ رہتا ہے اسی طرح شیشے کے بنے ہوئے ایسے مکعب مستطیل کو بھی مشکوٰۃ کہتے ہیں جس کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور اس کے اوپر ہوا کے نکلنے کے لیے سوراخ بھی ہوتا ہے اور اس میں چراغ رکھا جاتا ہے مختصر یہ کہ مشکوٰۃ چراغ کی حفاظت کے لیے بنائی گئی جگہ یا چیز کو کہتے ہیں کہ جو اسے ہوا اور طوفان کے تھپیڑوں سے بچاتی ہے اور چونکہ عام طور پر اسے دیوار میں بناتے ہیں لہٰذا یہ چراغ کی روشنی کو مرکوز اور منعکس کرتی ہے۔

"زجاجۃ" شیشے کو کہتے ہیں دراصل یہ لفظ صاف و شفاف پتھروں کے معنی میں ہے اور شیشہ بھی چونکہ پتھر ہی سے بنایا جاتا ہے اور صاف و شفاف بھی ہوتا ہے لہٰذا اسے بھی "زجاجۃ" کہتے ہیں یہاں یہ لفظ گلاب اور فانوس کے معنی میں ہے کہ جو چراغ کے سامنے یا اوپر رکھتے ہیں تاکہ اس کے شعلے کی بھی حفاظت کرے۔ ہوا کی گردش کو بھی نیچے سے اوپر کی طرف منظم رکھے اور اس کی روشنی میں بھی اضافہ کرے۔

"مصباح" چراغ کو کہتے ہیں۔

"یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ" یہ جملہ خالص اور توانائی کے حامل روغن کی طرف اشارہ ہے کہ جو زیتون کے پُر برکت درخت سے اس چراغ کے لیے لیا جاتا ہے اور جلانے کے لیے ایک بہترین روغن ہے جبکہ اسے ایسے درخت سے حاصل کیا گیا ہے کہ جو نورِ آفتاب میں ہر طرف برابر سے پھلا پھولا اور بڑھا پھیلا ہو۔ یہ درخت نہ باغ کی مشرقی جانب دیوار کے ساتھ ہے اور نہ مغربی جانب کیونکہ اگر اس پر صرف ایک طرف سے روشنی پڑے تو اس کا پھل بھی نیم پکا اور نیم کچا ہوگا لہٰذا اس کا روغن بھی اچھا اور صاف نہیں ہوگا۔

اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صحیح اور اچھی روشنی کے حصول کے چار عوامل ہیں۔

۱۔ ایسا چراغدان یا طاق کہ جو اس کی ہر طرف سے حفاظت کرے۔ اس کی روشنی میں کمی نہ کرے بلکہ اسے زیادہ متمرکز کرنے میں مدد دے۔

۲۔ ایسا گلاب یا فانوس کہ جو گردشِ ہوا کو شعلے کے گرد منظم کرے لیکن ایسا شفاف ہو کہ روشنی کے گزرنے میں حائل نہ ہو۔

۳۔ چراغ کہ جس کی روشنی کا مرکز اس کا فتیلہ یا فیتا ہے۔

۴۔ صاف، خالص، عمدہ اور توانائی کا حامل روغن اور تیل کہ جو جلنے کے لیے ایسا تیار ہو کہ گویا شعلے سے مس ہوئے بغیر ہی بھڑک اُٹھے۔

یہ سب کچھ ان الفاظ کے ظاہری پہلو کا بیان تھا۔ دوسری طرف بزرگ مفسرین نے نور کے لیے بیان کی گئی اس تشبیہ کا معنوی مفہوم بھی بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تفسیریں ہیں۔ مثلاً

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نورِ ہدایت ہے کہ جسے اللہ نے مومنین کے دلوں میں روشن کیا ہے یعنی وہ ایمان ہے کہ جو اللہ نے مومنین کے دلوں میں جاگزیں کر دیا ہے۔

بعض نے خیال کیا ہے کہ اس سے مراد قرآن کا معنیٰ ہے کہ جو انسان کے دل کے اندر نور افگن ہوتا ہے۔

بعض نے اس تشبیہ کو ذاتِ پیغمبرؐ کی طرف اشارہ سمجھا ہے

بعض نے توحید و عدلِ الٰہی کی طرف اشارہ جانا ہے۔

بعض نے سمجھا ہے کہ اس سے مراد روحِ اطاعت و تقویٰ ہے کہ جو ہر خیر و سعادت کا سرچشمہ ہے۔

درحقیقت قرآن اور حدیث میں باطنی نور کے جتنے مصادیق آئے ہیں انھیں تفسیر کے طور پر ذکر کر دیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان سب کی روح ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے نورِ ہدایت کہ جس کا سرچشمہ قرآن وحی اور وجودِ انبیاءؑ ہے۔ دلائلِ توحید سے جس کی حفاظت و تقویت ہوتی ہے جس کا نتیجہ حکمِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور تقویٰ ہے۔

نورِ ایمان جو مومنین کے دل میں ہے انہی چار عوامل کا حامل ہے کہ جو ایک روشن چراغ میں موجود ہیں۔

"مصباح" —— ایمان کا وہ شعلہ ہے کہ جو مومن کے دل میں بھڑکتا ہے اور نورِ ہدایت اس سے ضوفشاں ہوتا ہے۔

"زجاجۃ" —— فانوس مومن کا دل ہے کہ جو ایمان کو اپنے وجود میں منظم کرتا ہے۔

"مشکوٰۃ" —— طاق مومن کا سینہ ہے —— یا دوسرے لفظوں میں اس کا علم، فکر اور آگہی ہے کہ جو اس کے ایمان کو طوفان اور ہوائے تند سے بچاتی ہے۔

"شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ" وحی الٰہی ہے کہ جس کا نچوڑ اور روغن انتہائی صاف و پاک ہے اور اس کے ذریعے مومنین کا ایمان شعلہ ور اور بابرکت ہوتا ہے۔

درحقیقت یہ نور خدا ہی نور ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کو منور کرتا ہے یہ نور قلبِ مومنین سے ضوفشاں ہوتا ہے اور ان کے سارے وجود کو روشن کر دیتا ہے اور جو دلائل انھوں نے عقل و بصیرت سے حاصل کیے ہیں وہ نورِ الٰہی کی آمیزش سے "نور علی نور" کا مصداق بن جاتے ہیں اور یہی وہ منزل ہے کہ جہاں اہل اور تیار دل نورِ الٰہی سے ہدایت پاتے ہیں اور "یھدی اللہ لنورہ من یشاء" اپنی عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

لہٰذا نورِ الٰہی کی ہدایت اور نورِ ہدایت و ایمان کے لیے معارف، آگاہی، خود سازی اور اخلاقِ حسنہ کی ضرورت ہے کہ جو مشکوٰۃ کی طرح اس کی حفاظت کرے اور اس کے لیے دلِ آمادہ کی ضرورت ہے کہ جو "زجاجہ" کی طرح اس پروگرام کو منظم کرے اور وحی کی امداد کی بھی ضرورت ہے کہ جو "شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ" کی طرح اسے توانائی بخشے اور یہ نور وحی شرقی و غربی مادی انحراف اور آلودگی سے دور رہے ورنہ یہ روشنی گہنا جائے گی یہ روغن ایسا صاف اور ہر ملاوٹ اور

خرابی سے پاک ہو کر کسی دوسری چیز کی احتیاج کے بغیر تمام انسانی صلاحیتوں کو جمع کر لے اور " یکاد زیتها یضیء ولو لم تمسسه نار " کا مصداق بنے ۔

ہر قسم کی تفسیر بالرائے، پہلے سے خود کردہ فیصلے، ذاتی پسند و ناپسند، ٹھونسے گئے عقیدے، دائیں بائیں طرف میلان اور ہر قسم کے خرافات کہ جو اس مبارک شجر کے روغن کو آلودہ کریں اس چراغ کی روشنی کم کر دیتے ہیں اور کبھی اسے بالکل بے نور کر دیتے ہیں ۔

یہ ہے وہ مثال کہ جو اللہ نے اس آیت میں اپنے نور کے لیے بیان کی ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے ۔

جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ آئمہ معصومینؑ کی روایات میں اس آیت کی جو تفسیر بیان ہوئی ہے وہ اس کے واضح مصادیق کا بیان ہے نہ کہ مفہوم آیت اس میں منحصر ہے مثلاً روایات آئمہؑ میں " مشکوٰۃ " سے مراد پیغمبر اسلامؐ کا دل، " مصباح " سے نورِ علم، " زجاجہ " سے آپؐ کے وصی حضرت علیؑ اور " شجرہ مبارکہ " سے اس خاندان کے جدِ بزرگوار حضرت ابراہیم خلیل اللہ مراد لیے گئے ہیں۔ اسی طرح " لا شرقیة ولا غربیة " سے یہود و نصاریٰ کی طرف ان کے میلان کی نفی کی گئی ہے ۔ یہ تفسیر بھی درحقیقت اسی نورِ ہدایت و ایمان کا ایک رُخ پیش کرتی ہے اور اس کا ایک واضح مصداق پیش کرتی ہے ۔

اسی طرح بعض مفسرین نے اس نورِ الٰہی سے قرآن ، دلائلِ عقلی یا ذاتِ پیغمبر اسلامؐ مراد لی ہے۔ یہ تفسیر بھی مندرجہ بالا تفسیر سے ہم آہنگ ہے ۔

* * *

یہاں تک تو اس نورِ الٰہی اور نورِ ہدایت و ایمان کی خوبیاں اور امتیازات بیان ہو رہے تھے اسے ایک روشن چراغ کی تشبیہ سے واضح کیا گیا ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ روشن چراغ کہاں ہے اور اس کا مقام کون سا ہے ۔

اس کے لیے اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : یہ مشکوٰۃ ایسے گھروں میں ہے کہ جن کی دیواریں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے (تاکہ دشمنوں، شیطانوں اور ہوس بازنگاہوں سے امان میں ہوں)۔ (فی بیوت اذن الله ان ترفع)۔

" وہ گھر کہ جن میں نامِ خدا کا تذکرہ ہوتا ہے (جن گھروں میں آیاتِ قرآنی کی تلاوت ہوتی ہے اور حقائقِ وحی بیان ہوتے ہیں)۔ (ویذکر فیها اسمه)۔

جیسا کہ ہم نے بھی تفسیر کی ہے بہت سے مفسرین نے اس آیت کو گزشتہ آیت سے مربوط جانا ہے [1] لیکن بعض نے بعد والے جملے سے مربوط سمجھا ہے کہ جو ہرگز صحیح معلوم نہیں ہوتا ۔

[1] آیت کی تقدیر دراصل یوں تھی :

هٰذا المشکوٰة فی بیوت - - - - - -

یا — هٰذه المصباح فی بیوت - - - - - -

یا — هٰذه الشجرة المبارکة فی بیوت - - - - - -

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رہا یہ سوال جو بعض نے کیا ہے کہ یہ روشن چراغ ان گھروں میں ہوں کہ جن کی خصوصیات اس آیت میں بیان ہوئی ہیں تو اس کا فائدہ ہے تو اس کا جواب واضح ہے کیونکہ اگر گھر کی دیواریں بلند ہوں اور مضبوط دل ، بیدار اور ہوشیار مرد اس کی پاسداری کرتے ہوں تو ایسا گھر اس روشن چراغ کی حفاظت کا ضامن ہے ۔ علاوہ ازیں جنھیں ایسے نور کی جستجو ہوگی وہ اس گھر سے آگاہ ہو کر جلدی اس کی جانب لپکیں گے ۔

رہا یہ سوال کہ ان گھروں سے کون سے گھر مراد ہیں تو اس کا جواب آیت میں موجود ہے ، ارشاد ہوتا ہے : (صبح و شام ان گھروں میں تسبیح الٰہی ہوتی ہے) [1] (یسبح له فیها بالغدو والاٰصال)۔

ایسے جوانمرد کہ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت یادِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں رکھ سکتی (رجال لا تلهیهم تجارة ولا بیع عن ذکر الله واقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة)۔ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جب دل اور آنکھیں زیر و زبر ہو جائیں گی (یخافون یوما تتقلب فیه القلوب والابصار)۔

یہ خصوصیات نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ " بیوت " وہی مراکز ہیں کہ جنھوں نے حکمِ خدا سے استحکام پایا ہے اور یادِ الٰہی کا مرکز بنے ہیں اور وہاں سے حقائقِ اسلام اور احکامِ الٰہی کی نشر و اشاعت ہوتی ہے اس وسیع معنی کا مصداق مساجد اور انبیاءؑ و اولیاءؑ کے گھر ہیں۔ بالخصوص پیغمبر اکرمؐ اور امیرالمومنین حضرت علیؑ کا گھر ان گھروں میں شامل ہیں ۔

یہ جو بعض نے انھیں مساجد اور انبیاءؑ کے گھر اور ایسے ہی دوسرے گھروں میں منحصر کیا ہے ان کے پاس اس کی دلیل نہیں ہے البتہ بعض ایسی روایات ہیں کہ جن میں سے بعض خاص گھروں کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ مثلاً

امام باقر علیہ السّلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا : ۔

هی بیوت الانبیاء وبیت علی منها

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) یا — نور الله فی بیوت - - - - - -

جبکہ دوسری تفسیر کے مطابق " فی بیوت " کے بعد کو " یسبح " کے متعلق جانتے ہیں کہ جس سے آیت کا مفہوم یوں ہوگا ۔

ایسے گھروں میں کہ جن کی دیواریں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ، جوانمرد صبح شام اللہ کی تسبیح کرتے ہیں ۔

لیکن لفظ " فیها " کی موجودگی میں یہ تفسیر مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ تکرار شمار ہوگا ۔ علاوہ ازیں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں جو روایات مروی ہیں یہ ان سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے (غور کیجیے گا)

[1] " غدو " (بروزن " علو ") صبح کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب نے کہا ہے کہ " غدو " دن کے ابتدائی حصے کو کہا جاتا ہے اور قرآن میں یہ لفظ " آصال " کے مقابلے میں آیا ہے جبکہ " غداة " " عشی " کے مقابلے میں آیا ہے

" آصال " " اصل " (بروزن " عنق ") کی جمع ہے جبکہ " اصل " بھی " اصیل " کی جمع ہے کہ جس کا معنی ہے " عصر " ۔

رہا یہ سوال کہ " غدو " مفرد کی شکل میں اور " آصال " جمع کی صورت میں کیوں ہے تو فخر رازی کے مطابق " غدو " مصدری پہلو رکھتا ہے اور مصدر کی کبھی جمع نہیں بنائی جاتی

یہ انبیاءؑ کے گھروں کی طرف اشارہ ہے اور علیؑ کا گھر بھی اس زمرے میں آتا ہے[1]

اسی طرح ایک اور حدیث میں پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ:۔

اس آیت کی تلاوت کے وقت آنحضرتؐ سے پوچھا گیا: ان سے کون سے گھر مراد ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:

بیوت الانبیاء

نبیوں کے گھر

ابوبکرؓ نے (علیؑ و فاطمہؑ کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پوچھا: کیا یہ گھر بھی ان میں شامل ہے؟

رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

نعم من افاضلها

ہاں یہ تو اس گھر کے افضل ترین گھروں میں سے ہے[2]

یہ سب روشن اور واضح مصادیق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ روایات کا معمول یہ ہے کہ تفسیر کے موقع پر روشن اور واضح مصادیق کی نشاندہی کرنی ہے۔

جی ہاں جو مرکز حکمِ خدا سے قائم ہوا ہے اور اس میں ذکرِ خدا ہوتا ہے اور اس میں ایسے باایمان جوانمرد ہیں کہ جنھیں مادی زندگی یادِ خدا سے غافل نہیں کر دیتی اور وہ اس گھر میں اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں ایسے گھر انوارِ الٰہی کے چراغدان اور ایمان و ہدایت کے فانوس ہیں درحقیقت ان گھروں کی یہ خصوصیات ہیں:۔

۱۔ ان کی بنیاد حکمِ خدا سے رکھی گئی ہے۔

۲۔ ان کی بنیاد مستحکم اور دیواریں ایسی بلند ہیں ——— کہ شیطان اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

۳۔ وہ یادِ الٰہی کا مرکز ہیں۔

۴۔ ان کی نگہبانی ایسے جواں مرد کرتے ہیں کہ جو صبح و شام تسبیحِ خدا میں مشغول رہتے ہیں اور پُر فریب دنیا کی کشش انھیں حق سے غافل نہیں کرتی۔

ان خصوصیات کے باعث یہ گھر ہدایت و ایمان کا سرچشمہ ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس آیت میں "تجارت" کا ذکر بھی آیا ہے اور "بیع" کا بھی۔ جبکہ ظاہراً دونوں کا معنی ایک ہی ہونا چاہیے لیکن ممکن ہے کہ ان کا فرق اس لحاظ سے ہو کہ تجارت ایک مسلسل کام ہے جبکہ "بیع" ایک وقتی کام ہے۔

اس امر کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ ایسے مرد ہیں کہ جو تجارت اور بیع کی طرف نہیں جاتے بلکہ یہ فرمایا

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۰۷

[2] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

ہے کہ تجارت اور بیع انھیں یادِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی وہ ہمیشہ قیامت اور عدالتِ الٰہی کے خیال سے ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ قیامت کا دن وہ ہے کہ جب دل اور آنکھیں زیر و زبر ہو جائیں گی (توجہ رہے کہ "یخافون" فعل مضارع ہے اور روزِ قیامت سے ان کے مسلسل خوف پر دلالت کرتا ہے۔ ایسا خوف کہ جو انھیں ذمہ داریوں کا احساس دلائے رکھتا ہے)۔

زیرِ بحث آخری آیت میں نورِ ہدایت کے ان پاسداروں اور عاشقانِ حق کا اجر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ اللہ انھیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے ان کے اجر میں اضافہ بھی کرے (لیجزیهم الله احسن ما عملوا و یزید هم من فضله)۔

اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ جو لوگ فیضانِ الٰہی کے لائق ہیں ان کے لیے اللہ کا فیضان محدود نہیں ہے اور خدا جسے چاہتا ہے رزقِ بے حساب دیتا ہے اور اسے اپنی لامتناہی نعمات سے بہرہ مند کرتا ہے (و الله یرزق من یشاء بغیر حساب)۔

اس آیت میں احسن ما عملوا سے کیا مراد ہے؟:۔ اس سلسلے میں:

بعض نے کہا ہے کہ نیک اعمال کی طرف اشارہ ہے چاہے وہ واجبات ہوں یا مستحبات اور چھوٹے ہوں یا بڑے۔

بعض دوسرے معتقد ہیں کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کارِ خیر کا اجر کبھی دس گنا عطا فرماتا ہے کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ ——— جیسا کہ سورۂ انعام کی آیہ ۱۶۰ میں ہے۔

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها

جو شخص نیک کام کے ساتھ بارگاہِ خدا میں پیش ہوگا اسے اس کا دس گنا اجر ملے گا۔

نیز سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۱ میں راہِ خدا میں خرچ کرنے کا اجر سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ ذکر ہوا ہے۔

اس جملے کی تفسیر کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ اللہ ان کے تمام اعمال کی جزاء ان کے بہترین اعمال کے معیار کے مطابق دے گا یہاں تک کہ ان کے کم اہم اور درمیانے درجے کے اعمال بھی اجر کے حساب سے ان کے بہترین اعمال کے ہم پلہ ہوں گے اور یہ فضلِ الٰہی سے بعید بھی نہیں کیونکہ عدل اور اجر میں برابری ضروری نہیں ہے لیکن جس وقت اللہ اپنا فضل کرنے پر آتا ہے تو پھر عنایات بے حساب ہیں کیونکہ اس کی ذات پاک غیر محدود ہے اس کی نعمتیں بھی لامتناہی ہیں اور اس کا کرم بھی سب بے پایاں ہے۔

چند روایات

اس آیت سے متعلقہ ضروری نکات تفسیری بحث میں آچکے ہیں البتہ کچھ روایات ایسی ہیں کہ جن کا ذکر تکمیلِ گفتگو کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انھیں ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ کتاب روضۃ الکافی میں ہے کہ آیتِ نور کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:۔

ان المشکوٰة قلب محمد (ص)، و المصباح النور الذی فیه العلم، والزجاجة

قلب علی او نفسہ

"مشکوٰۃ" قلبِ محمد (ص) ہے، "مصباح" نور علم و ہدایت ہے اور "زجاجۃ"، خود علیؑ ہیں یا ان کا دل کہ رحلت رسولؐ کے بعد وہ "مصباح" قرار پایا[1]

۲۔ ایک حدیث "توحید صدوق" میں امام باقر علیہ السّلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:۔

ان المشکوٰۃ نور العلم فی صدر النبی (ص) والزجاجۃ صدر علی ۔۔۔۔۔۔ ونور علی نور امام موید بنور العلم والحکمۃ فی اثر الامام من اٰل محمد، و ذٰلک من لدن اٰدم الیٰ ان تقوم الساعۃ، فھٰؤلاء الاوصیاء الذین جعلھم اللہ عزوجل خلفاء فی ارضہ وحججہ علی خلقہ، لا تخلوا الارض فی کل عصر من واحد منھم

"مشکوٰۃ" رسول اللہؐ کے سینے میں نورِ علم ہے۔ "زجاجہ" علیؑ کا سینہ ہے اور "نورٌ علیٰ نور" آلِ محمدؐ میں سے آئمہ اطہارؑ ہیں کہ جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور نورِ علم سے ان کی تائید کی گئی ہے اور یہ سلسلہ خلقتِ آدم سے اختتامِ عالم تک جاری ہے یہ وہی اوصیاء ہیں کہ جنھیں اللہ نے زمین میں خلفاء قرار دیا ہے اور بندوں پر انھیں اپنی حجّت بنایا ہے اور زمین نہ کبھی ان کے وجود سے خالی تھی اور نہ کبھی خالی ہوگی[2]

۳۔ ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السّلام نے "مشکوٰۃ" جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا، "مصباح" امام حسن علیہ السلام اور "زجاجہ" امام حسین علیہ السلام کو قرار دیا ہے[3]

البتہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ آیات وسیع مفہوم رکھتی ہیں اور مندرجہ بالا روایات میں سے ہر ایک میں اس کے کسی نہ کسی واضح مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان روایات سے آیت کی عمومیت ختم نہیں ہوتی لہٰذا ان روایات میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے۔

۴۔ ایک روایت میں ہے کہ:۔

امام باقر علیہ السلام بصرہ کے ایک مشہور فقیہ سے بات کر رہے تھے دورانِ گفتگو اس نے اظہارِ تعجب کیا کہ مجلس میں ایک خاص رعب اور دبدبے کی کیفیت ہے۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا:۔ کیا تم جانتے ہو کہ کہاں بیٹھے ہو؟ جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے۔

فی بیوت اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیھا اسمہ یسبح لہ فیھا بالغدو

---

[1] نور الثقلین، زیر بحث آیت کے ذیل میں، ج ۲ ص ۶۰۲ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

[2]، [3] ایضاً \ جلد ۲ ص ۶۰۲، ۶۰۳ (کچھ اختصار کے ساتھ)

والاٰصال رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ

اس کے بعد فرمایا:۔

فانت ثم ونحن اولئک

تو وہی ہے کہ جو تو نے کہا ہے (یعنی بصرہ کا ایک فقیہ) اور ہم یہ ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن نے یہ کہا ہے۔

قتادہ نے جواب میں کہا:۔

صدقت واللہ، جعلنی اللہ فداک، واللہ ماھی بیوت حجارۃ ولا طین

واللہ آپ نے سچ فرمایا، میں آپ پر قربان جاؤں، بخدا اس آیت میں پتھر اور مٹی کے گھر مراد نہیں ہیں (بلکہ وحی، ایمان اور ہدایت کے گھر مراد ہیں)[1]

۵۔ وہ مردانِ خدا کہ جو وحی و ہدایت کے پاسدار ہیں، ان کے بارے میں ایک حدیث میں ہے:۔

ھم التجار الذین لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ، اذا دخل مواقیت الصلوٰۃ ادوا الی اللہ حقہ فیھا

یہ وہ تاجر ہیں کہ جنھیں یادِ خدا سے تجارت اور خرید و فروخت غافل نہیں کرتی جب نماز کا وقت آپہنچتا ہے تو اس کا حق ادا کرتے ہیں[2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اصلاحی اور مثبت اقتصادی امور سرانجام دیتے ہیں لیکن ان کے سارے کام نامِ خدا کے تابع ہیں اور کسی چیز کو اس پر مقدم نہیں کرتے۔

چند نکات

۱۔ زیتون کا درخت:۔ زیر بحث آیات میں زیتون کے درخت کو "شجرۃ مبارکۃ" یعنی مبارک درخت قرار دیا گیا ہے جس وقت قرآن نازل ہوا تھا ہو سکتا ہے اس وقت قرآن کی اس بات کی اہمیت لوگوں پر واضح نہ ہو لیکن آج ہمارے لیے یہ بہت واضح ہے کیونکہ عظیم سائنس دانوں اور ماہرین کہ جنھوں نے اپنی عمر کے سالہا سال نباتات کے خواص کے مطالعے میں صرف کیے ہیں ان کے بقول اس بابرکت درخت سے حاصل ہونے والی سب سے اہم چیز روغنِ زیتون ہی ہے یہ تیل بدن کی سلامتی کے لیے بہت مؤثر ہے۔

ابنِ عباس کہتے ہیں کہ اس درخت کے تمام اجزاء مفید اور نفع بخش ہیں یہاں تک کہ اس کی راکھ بھی مفید ہے اور طوفانِ نوح کے

---

[1]، [2] نور الثقلین، جلد ۲ ص ۶۰۹

بعد سب سے پہلے اگنے والا درخت یہی ہے اور اس درخت کے حق میں انبیاء نے دعائیں کی ہیں۔

۲۔ "نور علی نور" کی تفسیر:۔ بزرگ مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں مختلف باتیں کی ہیں:

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں:۔

یہ ایسے انبیاء کی طرف اشارہ ہے کہ جو یکے بعد دیگرے ایک ہی نسل سے پیدا ہوتے ہیں اور راہِ ہدایت کو دوام بخشتے ہیں۔

فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ نور کی شعاعوں، روشنی کی تہوں اور شعاعوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ مومن کے بارے میں منقول ہے کہ مومن چار حالتوں میں ہوتا ہے اسے نعمت ملے تو شکرِ خدا بجالاتا ہے مصیبت آن پڑے تو صابر و با استقامت ہوتا ہے۔ بات کرتا ہے تو سچ بولتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے تو عدالت کی جستجو کرتا ہے وہ جاہل لوگوں میں ایسے ہوتا ہے جیسے مُردوں میں ایک زندہ۔ وہ پانچ انوار کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔ اس کی گفتگو نور ہے، اس کا عمل نور ہے اس کے آنے کا مقام نور ہے اس کے جانے کی جگہ نور ہے اور اس کا ہدف روزِ قیامت نورِ خدا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ قرآن میں پہلے نُور سے مراد وحی الٰہی کے ذریعے ہدایتِ الٰہی کا نور ہو اور دوسرے نور سے مراد عقل کے ذریعے ہدایتِ الٰہی کا نور ہو۔

یا پہلا نور ہدایتِ تشریعی کا نور ہو اور دوسرا ہدایتِ تکوینی کا نُور ہو۔

اس بنا پر نور ہے نور کے اوپر۔

اسی طرح یہ جملہ کبھی نور کے مختلف سرچشموں (انبیاء) سے تفسیر ہوا ہے اور کبھی نور کی مختلف قسموں سے اور کبھی اس کے مختلف مراحل سے۔

تاہم ممکن ہے کہ یہ سب مفاہیم آیت میں جمع ہوں کہ جس کا مفہوم بہت وسیع ہے (غور کیجیے گا)

۳۹۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ
مَآءًۭ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ
حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۙ
۴۰۔ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ
فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ
لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ع

ترجمہ

۳۹۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں سراب۔ جسے پیاسا شخص دور سے پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو اسے کچھ نہیں ملتا اور اللہ کو وہاں موجود پاتا ہے اور اللہ اس کا حساب چکا دیتا ہے اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔

۴۰۔ یا جیسے کسی گہرے سمندر میں تاریکی ہو، اسے ایک موج نے چھپا رکھا ہو اور اس کے اوپر ایک اور موج ہو، اور اس کے اوپر تاریک بادل۔ تاریکیوں کے اوپر تاریکیاں ہوں، ایسی تاریکیاں کہ اگر کوئی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے دیکھ نہ سکے۔ جسے اللہ نور عطا نہ کرے اس کے لیے کوئی

تفسیر

سراب کی طرح کے اعمال

گزشتہ آیات میں نورِ الٰہی اور نورِ ایمان و ہدایت کے بارے میں گفتگو تھی اب زیرِ نظر آیات میں کفر، جہالت، بے ایمانی گمراہی اور منافقت کی تاریکی کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ مومنین کی زندگی اور ان کے افکار تو "نورٌ علیٰ نور" تھے جبکہ منافقوں اور کافروں کا وجود "ظلمات بعضها فوق بعض" ہے۔ اب ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جو زندگی کے خشک، بے آب اور آگ برساتے صحراء میں پانی کی بجائے سراب کے پیچھے دوڑتے ہیں اور شدتِ پیاس سے

جان دے دیتے ہیں جبکہ مومنین کے سر پر ایمان کا سایہ ہے اور وہ ہدایت کے میٹھے اور شفاف چشمے کے کنارے راحت و آرام سے بیٹھے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے ، جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے اعمال بے آب صحرا میں سراب کی طرح ہیں پیاسا آدمی اسے دُور سے پانی سمجھتا ہے (والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً)۔ لیکن جب اس کے قریب جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا (حتّٰی اذا جاءہ لم یجدہ شیئًا)۔ البتہ اللہ کو اپنے اعمال کے پاس پاتا ہے اور اللہ اس کا حساب چکا دیتا ہے (ووجد اللہ عندہ فوفاہ حسابہ)۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی (واللہ سریع الحساب)۔

"سراب" بنیادی طور پر "سرب" (بروزن "شرف") کے مادے سے اوپر کی طرف جانے کے معنی میں ہے ، اور "سرب" (بروزن "حرب") اوپر جانے والے راستے کے معنی میں ہے۔ اسی مناسبت سے "سراب" بیابانوں میں دُور سے نظر آنے والی چمک کو کہتے ہیں کہ جو پانی معلوم ہوتی ہے جبکہ سورج کی روشنی کے انعکاس کے سوا وہاں کچھ نہیں ہوتا۔[1]

"قیعہ" بعض کے نظریے کے مطابق "قاعہ" کی جمع ہے اور وسیع وعریض بے آب وگیاہ زمین کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں ایسے چٹیل میدان کو "قاعۃ" کہتے ہیں کہ جس میں عام طور پر سراب نظر آتا ہے۔

لیکن بعض مفسرین اور اہلِ لغت "قیعۃ" کو مفرد سمجھتے ہیں کہ جس کی جمع "قیعان" یا "قیعات" ہے۔[2]

البتہ معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن آیت کی مناسبت تقاضا کرتی ہے کہ یہ لفظ مفرد ہو کیونکہ لفظ "سراب" مفرد صورت میں آیا ہے اور ظاہر ہے اس قسم کا سراب ایک ہی بیابان میں ہوگا نہ کہ کئی بیابانوں میں (غور کیجیے گا)

اس کے بعد دوسری مثال بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وسیع سمندر پر چھائے ہوئے اندھیرے ۔ جیسے سمندر ہے اس پر ایک موج چھائی ہوئی ہے اور اس موج کے اوپر ایک اور موج ہے اور اس کے اوپر ایک تاریک بادل ہے (او کظلمات فی بحرلجی یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب)۔ اور اندھیرے ایک دوسرے کے اوپر چھائے ہوئے ہیں (ظلمات بعضھا فوق بعض)۔ حالت یہ ہے کہ اگر ایسے میں کوئی شخص ہو اور وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اسے ہاتھ سجھائی نہ دیگا (اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا)۔

جی ہاں! انسانوں کی زندگی میں نورِ حقیقی صرف نورِ ایمان ہے اور اس کے بغیر فضائے حیات تیرہ و تار ہے، لیکن یہ نورِ ایمان صرف اللہ کی طرف سے ہے اور جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے (ومن لم یجعل اللہ لہ نورًا فمالہ من نور)۔

---

[1] آج کے ماہرین طبیعات کہتے ہیں کہ جب ہوا بہت گرم ہو جاتی ہے تو زمین سے ملحق ہوا کا طبقہ شدتِ گرمی کی وجہ سے بہت پھیل جاتا ہے اور اپنے ملحق حصے سے جدا ہو جاتا ہے ۔ روشنی کی لہریں بھی اس میں ٹوٹ جاتی ہیں اور سراب روشنی کی لہروں کے اسی ٹوٹ جانے کا نام ہے ۔

[2] تفسیر مجمع البیان ، تفسیر روح المعانی ، تفسیر قرطبی ، تفسیر فخر رازی اور مفرداتِ راغب کی طرف رجوع کریں ۔

اس مثال کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ لفظ "لجی" کے معنی کی طرف توجہ کی جائے "لجی" (بروزن "کجی") گہرے اور وسیع سمندر کے معنی میں ہے یہ لفظ بنیادی طور پر "لجاج" کے مادہ سے کسی کام کے پیچھے پڑ جانے کے معنی میں ہے (اور عام طور پر غلط کاموں کے پیچھے لگ جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) رفتہ رفتہ یہ لفظ سمندر کی لہروں کے ایک دوسرے کے پیچھے جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور چونکہ سمندر جتنا زیادہ گہرا اور وسیع ہوگا اس کی موجیں اتنی ہی زیادہ ہوں گی لہٰذا یہ لفظ ہوتے ہوتے وسیع سمندروں کے لیے استعمال ہونے لگا ۔

اب آپ عمیق ، گہرے اور وسیع ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو ذہن میں رکھیں اور ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی کہ جو قوی ترین روشنی ہے اس کی شعاعیں ایک حد تک پانی کے اندر جا سکتی ہیں اس کی تیز ترین شعاعیں تقریبًا سات سو میٹر گہرائی میں جا کر محو ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کی گہرائیوں میں دائمی تاریکی اور شب ِجاوداں ہے وہاں روشنی کا بالکل گزر نہیں ۔

یہ بات بھی ہم جانتے ہیں کہ اگر پانی بالکل صاف وشفاف ہو اور ٹھہرا ہوا ہو تو وہ روشنی کو بہتر منعکس کر سکتا ہے لیکن تلاطم خیز موجیں روشنی کی شعاعوں کو درہم برہم کر دیتی ہیں اور روشنی کی بہت ہی کم مقدار پانی کی گہرائیوں میں منتقل ہو پاتی ہے اب اگر ان ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کے اوپر سیاہ بادل بھی چھائے ہوں تو اس سے پیدا ہونے والی تاریکی کس قدر تہ بہ تہ ہو گی ۔[1]

ایک طرف پانی کی گہرائیوں کی تاریکی ، دوسری طرف چیختی چنگھاڑتی ہوئی تیز موجوں کی تاریکی اور تیسری طرف سیاہ بادلوں کے اندھیرے ۔ یہ سب تہ بہ تہ ظلمتیں ہیں۔ واضح ہے کہ تاریکی کے ایسے عالم میں نزدیک ترین چیز بھی سجھائی نہ دے گی ۔ یہاں تک کہ اگر انسان اپنا ہاتھ بھی اپنی آنکھوں کے پاس لے جائے تو نظر نہیں آئے گا ۔

وہ کافر کہ جو نورِ ایمان سے بے بہرے ہیں ایسے شخص کی مانند ہیں کہ جو اس سے کئی گنا تاریکی میں گرفتار ہو جبکہ ان کے برعکس روشن ضمیر "مومنین" "نورٌ علٰی نور" کے مصداق ہیں ۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ تین قسم کی تاریکیاں کہ جن میں یہ بے ایمان غوطہ زن ہیں یہ ہیں۔

۱۔ غلط اعتقاد کی ظلمت

۲۔ غلط گفتار کی ظلمت اور

۳۔ غلط کردار کی ظلمت

بعض دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ تین قسم کی ظلمتیں ان کی جہالت کے تین مرحلے ہیں۔

پہلا یہ کہ وہ نہیں جانتے

دوسرا یہ کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے

تیسرا یہ کہ اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔

---

[1] جیسا کہ "لسان العرب" میں آیا ہے "سحاب" بارش والے بادل کے معنی میں ہے اور برسنے والے بادل عام طور پر تہ بہ تہ ہوتے ہیں لہٰذا زیادہ سیاہ ہوتے ہیں

اور اسی کو جہلِ مرکب اور کئی گنا جہالت کہتے ہیں۔

بعض دوسروں نے کہا کہ معرفت کے بنیادی عامل دل، آنکھ اور کان ہیں (دل سے یہاں مراد عقل ہے) جیسا کہ سورۂ نحل کی آیہ ۷۸ میں ہے۔

واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئًا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ

اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے ایسی حالت میں پیدا کیا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور پھر تمھیں کان، آنکھیں اور دل دیئے۔

لیکن کافر دل کا نور بھی گنوا بیٹھے ہیں اور سماعت و بصارت کی روشنی بھی اور تاریکیوں میں غوطہ زن ہیں[1]

واضح ہے کہ یہ تینوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے آیت کے مقصود میں سب ہی شامل ہوں بہرحال زیرِ بحث دو آیات کے مضمون سے آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پہلے بے ایمان افراد کے اعمال کو جھوٹی روشنی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو خشک اور آگ برساتے بیابان میں ایک سراب کی حیثیت رکھتی ہے۔ سراب کہ جو نہ صرف تشنہ لبوں کی پیاس نہیں بجھا سکتا بلکہ اس کے پیچھے زیادہ دوڑنے کے باعث شدتِ پیاس میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔

یہ جھوٹی روشنی بے ایمان منافقین کے نظر فریب اعمال ہیں اس کے بعد ان اعمال کی باطنی حیثیت کو بیان کیا گیا ہے ان کا باطن ایسا ہولناک ہے کہ وہاں تمام انسانی حواس معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اور گرد و پیش کی قریب ترین چیزیں بھی اس میں پنہاں ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ آدمی اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا چہ جائیکہ دوسروں کو دیکھے۔ واضح ہے کہ ایسی ہول انگیز تاریکی میں آدمی بالکل تنہا ہو کر رہ جاتا ہے اور مکمل جہالت و بے خبری میں ڈوب جاتا ہے نہ راستہ سجھائی دیتا ہے اور نہ کوئی ہم سفر دکھائی دیتا ہے نہ اسے اپنی جگہ نظر آتی ہے اور نہ یہاں سے نکلنے کا کوئی وسیلہ اس کے پاس ہوتا ہے کیونکہ اس نے منبعِ نور یعنی اللہ سے روشنی حاصل نہیں کی اور خود پرستی و جہالت کے پردوں میں جا پڑا ہے۔

شاید آپ کو یاد ہو کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ نور تمام زیبائیوں، رنگوں، زندگی اور حرکت کا سرچشمہ ہے جبکہ اس کے برعکس تاریکی برائیوں موت اور خاموشی کا منبع ہے۔ وحشت و نفرت کا مرکز تاریکی ہے سرد مہری اور افسردگی ظلمت کے ساتھ ہیں جو لوگ نورِ ایمان کھو کر کفر کی ظلمت میں ڈوب جاتے ہیں ان کی یہی حالت ہوتی ہے۔

[1] تفسیر فخرالدین رازی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

۴۱۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ○

۴۲۔ وَ لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ○

ترجمہ

۴۱۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ سب کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور پرندے بھی جب آسمانوں پر اپنے پَر پھیلائے ہوتے ہیں ان میں سے ہر کوئی اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے واقف ہے۔

۴۲۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور مالکیت اللہ کے لیے ہے اور تمام موجودات کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

تفسیر

سب اس کی تسبیح کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں نورِ خدا یعنی نورِ ہدایت و ایمان اور کفر و ضلالت کی تہ در تہ تاریکیوں کے بارے میں گفتگو تھی زیرِ بحث آیات میں توحید کے دلائل پیش کیے گئے ہیں یہ دلائل انوارِ الٰہی کی نشانیاں اور ہدایت کے اسباب ہیں۔

پہلے روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے، ارشاد ہوتا ہے: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے (الم تران اللہ یسبح لہ من فی السماوات والارض)۔ اور پرندے بھی کہ جب آسمان پر اپنے پَر پھیلائے ہوتے ہیں اس کی تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں (والطیر صافات)۔

وہ سب کے سب اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتے ہیں۔ (کل قد علم صلاتہ و تسبیحہ)۔

اور وہ جو کام بھی کرتے ہیں اللہ ان سے آگاہ ہے (واللہ علیم بما یفعلون)۔

موجودات کی یہ عمومی تسبیحِ الٰہی اس کی خالقیت کی دلیل ہے اور اس کی خالقیت تمام عالمِ ہستی پر اس کی مالکیت کی دلیل ہے

نیز اس بات کی بھی دلیل ہے کہ تمام موجودات لوٹ کر اسی کی طرف جائیں گے۔ اس لیے مزید فرمایا گیا ہے: اور آسمانوں اور زمین کی مالکیت خدا کے لیے ہے اور تمام موجودات کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (و لله ملك السماوات و الارض و الى الله المصير)۔

گذشتہ آیت سے اس آیت کا تعلق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گذشتہ آیت کے آخری جملے میں ہے کہ تمام انسانوں اور تسبیح کرنے والوں کے اعمال علم خدا میں ہیں اور اس آیت میں دوسرے جہان میں اس کی عدالت، تمام آسمانوں اور زمین پر اس کی مالکیت اور اس کے حق عدالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ "الم تر" کا مفہوم:۔ اس کا لفظی معنیٰ ہے "کیا تو نے نہیں دیکھا" بہت سے مفسرین کے بقول اس کا مفہوم ہے "الم تعلم" (کیا تجھے علم نہیں) کیونکہ موجوداتِ عالم کی تسبیح عمومی کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو آنکھ سے دیکھی جائے بلکہ یہ حسی معنیٰ میں بھی ہو اس کا ادراک دل اور عقل کے ذریعے ہوتا ہے لیکن یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ گویا آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا یہاں "الم تر" فرمایا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں اگرچہ مخاطب پیغمبر اسلامؐ ہیں لیکن بعض مفسرین کے بقول اس سے مراد عام لوگ ہیں اور اس کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔

لیکن بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا مشاہدہ پیغمبر اکرمؐ سے مخصوص ہے اس لیے آپ ہی سے خطاب ہے کیونکہ اللہ نے آپ کو ایسی نظر دے رکھی تھی کہ آپ اس عالم کے تمام موجودات کی تسبیح وحمد کا مشاہدہ کرتے تھے اسی طرح اللہ کے خاص بندے کہ جو آنحضرتؐ کے مکتب کے پیرو ہیں وہ بھی شہودِ عینی کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں لیکن عام لوگوں کے لیے شہودِ علمی اور شہودِ عقلی ہے نہ کہ شہودِ عینی[1]

۲۔ موجوداتِ عالم کی تسبیح:۔ قرآن کی مختلف آیتوں میں اس عظیم کائنات کے تمام موجودات کی چار عبادتیں بیان ہوئی ہیں:۔

۱۔ تسبیح

۲۔ حمد

۳۔ سجدہ

۴۔ نماز

---

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

زیر بحث آیت میں نماز اور تسبیح کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

سورۂ رعد کی آیت ۱۵ میں عمومی سجدے کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

و لله يسجد من فى السماوات و الارض

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں تمام موجوداتِ کائنات کی تسبیح اور حمد کا ذکر ہے۔

و ان من شئ الا يسبح بحمده

موجوداتِ عالم کی عمومی تسبیح کی حقیقت اور اس سلسلے میں مختلف تفاسیر کے بارے میں ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں یہاں ہم اس کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ بات کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں دو تفاسیر قابل توجہ ہیں۔

(ا) اس عالم کے تمام ذرات چاہے ہم انھیں عاقل شمار کریں چاہے وہ بے جان و بے عقل سب ایک طرح کا شعور و ادراک رکھتے ہیں وہ اپنے انداز سے اللہ کی تسبیح و حمد کرتے ہیں اگرچہ ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں آیاتِ قرآن سے بھی شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

(اا) تسبیح و حمد سے مراد وہی ہے جسے ہم "زبانِ حال" کہتے ہیں۔ جہانِ ہستی کا نظام اور تمام موجودات میں پنہاں کائنات کے حیرت انگیز اسرار زبانِ بے زبانی سے صراحت کے ساتھ اپنے خالق کی قدرت و عظمت اور لامتناہی علم و حکمت بیان کرتے ہیں کیونکہ کائنات کا ہر موجود بدیع، عمدہ اور تعجب خیز ہے۔

مصوری کا نفیس مرقع اور ایک عمدہ خوبصورت شعر بھی اپنے بنانے والے کی حمد و تسبیح کرتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اس کی عمدہ صفات بیان کرتا ہے (حمد) اور دوسری طرف اس سے عیب و نقص کی نفی کرتا ہے (تسبیح)۔

تو پھر یہ باعظمت جہان، اس کے یہ سب عجائبات اور اس کی بے پایاں تعجب خیز چیزیں ——— کیا اپنے مصور و خالق کی حمد و تسبیح نہیں کرتیں۔

البتہ اگر "يسبح له من فى السماوات و الارض" کو آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کی تسبیح کرنے کے معنی میں لیں اور "مَن" کو ذوی العقول کے لیے محدود رکھیں تو پھر یہاں تسبیح پہلے معنیٰ میں ہو گی کہ جو شعوری اور اختیاری ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم پرندوں کے لیے بھی اس قسم کا شعور تسلیم کریں۔ مندرجہ بالا آیت میں "من فى السماوات" سے مراد پرندے ہیں۔

البتہ ایسا ہونا کوئی عجیب و غریب نہیں ہے کیونکہ بعض دوسری آیات میں بعض پرندوں کے ایسے شعور کی طرف اشارہ موجود ہے۔

(اس بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۳ میں سورۂ انعام کی آیت ۳۸ کے ذیل میں گفتگو کی ہے)

۳۔ پرندوں کی مخصوص تسبیح:۔ زیر بحث آیت میں تمام موجوداتِ عالم میں سے بالخصوص پرندوں کی تسبیح کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اس عالم میں کہ جبکہ وہ آسمان پر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہوں۔

اس میں ایک نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ انتہائی زیادہ تنوع کے علاوہ پرندوں میں بہت سی ایسی خصوصیات موجود ہیں کہ جو ہر عاقل کی آنکھ اور دل کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

کششِ ثقل کے قانون کے برخلاف پرندوں کے بھاری جسم آسمانوں پر بڑی تیز رفتاری سے پرواز کرتے ہیں خصوصاً جب انھوں نے اپنے پروں کو پھیلایا ہوتا ہے اور ہوا کی موجوں پر سوار ہوتے ہیں اور بغیر اپنے آپ کو ہلائے جس طرف چاہیں تیزی کے ساتھ پھر جاتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ہوا شناسی کے امور میں پرندے گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ زمین کے جغرافیائی حالات سے بہت باخبر ہوتے ہیں۔ ایک براعظم سے دوسرے براعظم کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض پرندے قطبِ شمالی سے قطب جنوبی تک جا پہنچتے ہیں۔ عجیب و غریب اور پراسرار نظام انھیں اس طویل سفر میں راہنمائی کرتا ہے یہاں تک کہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہو تب بھی وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ ان کی یہ آگاہی توحید کے حیران کن اور روشن ترین دلائل میں سے ہے۔

چمگادڑوں کے اندر ایک خاص قسم کا راڈار نصب ہوتا ہے اس راڈار کے ذریعے وہ رات کی تاریکی میں اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دیکھ لیتی ہیں۔ یہاں تک وہ کبھی پانی کی موجوں کے اندر مچھلی کا نشانہ باندھتی ہیں اور انھیں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اچک لیتی ہیں۔

بہرحال پرندوں کے اندر بہت سے عجائبات چھپے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے قرآن نے خصوصیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ "کل قد علم صلاته و تسبیحه" کی تفسیر :۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "علم" کی ضمیر "کل" کی طرف لوٹتی ہے۔ اس کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔

آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے۔ اور پرندے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح سے آگاہ ہے۔

لیکن بعض دیگر مفسرین کے مطابق "علم" کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی خدا ان میں سے ہر ایک کی نماز اور تسبیح سے آگاہ ہے۔

البتہ پہلی تفسیر آیت کے معنیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ گویا تسبیح کرنے والا ہر کوئی اپنی "تسبیح" اور اپنی "نماز" کی شرائط و خصوصیات جانتا ہے۔

اگر اس سے مراد شعور کے ساتھ تسبیح ہو تو اس کا مطلب تو واضح ہے۔ لیکن اگر زبانِ حال کے ساتھ ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک کا اپنا خاص نظام ہے کہ جو ایک خاص طریقے سے عظمتِ پروردگار کا ترجمان ہے اور ہر ایک اس کی قدرت و عظمت کا مظہر ہے۔

۵۔ "صلاۃ" سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین مثلاً طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اور آلوسی نے روح البیان میں

اس مقام پر "صلاۃ" کا معنی "دعا" کیا ہے جو کہ اس کا اصل لغوی معنیٰ ہے۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کے موجودات زبانِ حال یا زبانِ مقال سے بارگاہِ خدا میں دعا کرتے ہیں اور اس سے فیض کا تقاضا کرتے ہیں اور وہ بھی چونکہ فیاضِ مطلق ہے انھیں ان کی استعداد کے مطابق عطا کرتا ہے اور نوازنے میں دریغ نہیں کرتا۔ البتہ ان میں سے ہر کوئی اپنے آپ میں جانتا ہے کہ اسے کس چیز کی احتیاج ہے اور اسے کیا مانگنا چاہیے ، اور کیا دعا کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ان آیات کے مطابق کہ جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اس کی بارگاہِ عظمت اور قوانینِ آفرینش کے سامنے وہ سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اپنے تمام وجود کے ساتھ اللہ کی صفاتِ کمال بیان کرتے ہیں اور اسے ہر قسم کے نقص کی نفی کرتے ہیں اور اس طرح ان کی چاروں عبادات حمد، تسبیح ، دعا اور سجود کی تکمیل ہوتی ہے۔

۴۳۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِىْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ
بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ
فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ
يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۚ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ
يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝
۴۴۔ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً
لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ۝
۴۵۔ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ
مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى
رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۚ يَخْلُقُ
اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

۴۳۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر انھیں باہم جوڑ دیتا ہے، پھر انھیں تہ دار بنا دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے کہ اُس سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور آسمانوں میں جو

پہاڑ ہیں، خدا ان سے اولے نازل کرتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے اُن کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے اُن کے نقصان سے بچا لیتا ہے۔ قریب ہے کہ ان (بادلوں کی) بجلی کی چمک آنکھوں (کی بینائی ہی) کو لے جائے۔

۴۴۔ اللہ رات اور دن کو الٹ پھیر کرتا ہے اور اس میں صاحبانِ بصیرت کے لیے عبرت ہے۔

۴۵۔ اور اللہ نے ہر حرکت کرنے والے کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ ان جانداروں میں سے بعض پیٹ کے بل چلتے ہیں، بعض دو پیروں پر چلتے ہیں اور بعض چار پیروں پر۔ خدا جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اُسے پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

کچھ اور عجائباتِ خلقت

ان آیات میں بھی عجائباتِ خلقت اور ان میں پوشیدہ علم و حکمت و عظمت کا ایک گوشہ بیان کیا گیا ہے اور ان میں سب اُس کی ذاتِ پاک کی توحید کے دلائل ہیں۔

ایک دفعہ پھر روئے سخن پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر انھیں ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے اور انھیں تہ در تہ کر دیتا ہے (الم تر ان اللہ یزجی سحابا ثم یؤلف بینہ ثم یجعلہ رکاما)۔

"پھر تو دیکھتا ہے کہ ان بادلوں میں سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں۔ اور کوہ و دشت اور باغ و صحرا پر برستے ہیں۔ (فتری الودق یخرج من خلالہ)۔

"یزجی" "ازجاء" کے مادے سے ہے۔ آہستہ آہستہ اور نرمی کے ساتھ منتشر چیزوں کو ایک دوسرے کے [illegible] لاکہ چلانے کے معنی میں ہے۔ بادلوں کے بارے میں یہ لفظ پوری طرح سے صادق آتا ہے۔ کیونکہ ان کے مختلف ٹکڑے سمندروں کے مختلف گوشوں سے اُٹھتے ہیں۔ پھر اللہ کا دستِ قدرت انہیں ایک دوسرے کی طرف چلاتا ہے اور انہیں [illegible] دوسرے سے جوڑ دیتا ہے اور تہ دار بنا دیتا ہے۔

"رُکام" (بروزن "غلام") ایسی چیزوں کے معنی میں ہے کہ جو ایک دوسرے کے اُوپر چڑھی ہوئی او دو تہ در تہ ہوں۔

"ودق" "شرق" کے وزن پر ہے۔ بہت سے مفسرین کے مطابق یہ بارش کے قطروں کے معنی میں ہے کہ جو بادل سے برستے ہیں۔ مفردات میں راغب کے بقول اس کا ایک اور معنی بھی ہے ——— اور وہ ہے "پانی کے بہت ہی چھوٹے ذرات کہ جو غبار کی صورت میں بارش کے برستے وقت فضا میں بکھر جاتے ہیں۔" یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو چیز عظمت پروردگار کی زیادہ اہم نشانی ہے۔ وہ بارش ہی کے حیات بخش قطرات ہیں۔ نہ کہ پانی کے وہ قطرات کہ جو غبار کی مانند ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن نے جہاں کہیں بھی بادلوں اور آسمانوں سے نزولِ برکات کا ذکر کیا ہے۔ وہاں بارش کی طرف ہی اشارہ ہے۔ جی ہاں! بارش ہی ہے جو مردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے، نباتات کو لباس حیات پہناتی ہے اور انسانوں اور حیوانوں کو سیراب کرتی ہے۔

اس کے بعد آسمان اور بادلوں سے پیدا ہونے والی ایک اور عجیب و غریب چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

اور آسمانوں سے موجود پہاڑوں سے اولے برساتا ہے (وینزل من السماء من جبال فیھا من برد)۔

"اور جسے چاہے ان کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے" درخت، پھل، کھیت اور بعض اوقات انسان حیوان بھی ان سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ (فیصیب بہ من یشاء)۔ اور جسے چاہتا ہے اس کے نقصان سے بچا لیتا ہے (ویصرفہ عن من یشاء)۔

جی ہاں! وہی تو ہے جو کبھی بادل سے حیات بخش بارش برساتا ہے اور کبھی اسے نقصان رساں ژالہ باری میں بدل دیتا ہے اور ژالہ باری جو کبھی ہلاکت آمیز بھی ہوتی ہے اور یہ امر اللہ کی انتہائی قدرت وعظمت کا غماز ہے اس نے انسان کا سود و زیاں اور موت و حیات ایک ہی مقام پر جمع کر دی ہے۔ بلکہ ان چیزوں کو گویا ایک دوسرے کے دل میں رکھ دیا ہے۔

آیت کے آخر میں آسمان پر اُبھرنے والی توحید کی ایک اور نشانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قریب ہے کہ بادل سے کوندنے والی بجلی انسان کی آنکھیں اچک لے (یکاد سنا برقہ یذھب بالابصار)۔

وہ بادل کہ جو درحقیقت پانی کے ذرات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب وہ برقی توانائی کے حامل ہو جاتے ہیں۔ تو اس کے اندر سے آگ اس طرح لپکتی ہے کہ آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے اور اس کی گرج کانوں کو گویا پھاڑے دیتی ہے۔ اور کبھی زمین بھی حل کر رہ جاتی ہے۔ پانی کے لطیف بخارات کے اجتماع میں ایسی چیز کا پیدا ہونا سچ مچ تعجب انگیز ہے۔

ایک سوال کا جواب

سوال یہ ہے کہ آسمان میں کونسا پہاڑ ہے کہ جس سے ژالہ باری ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں، مثلاً:

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ "جبال" (متعدد پہاڑ) کنائے کے طور پر ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں۔ اناج کا پہاڑ یا علم کا پہاڑ لہٰذا یہاں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان پر بادلوں میں پہاڑ کی مانند برف کا عظیم تودہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اولے گویا اُس پہاڑ کے ٹکڑے اور سنگریزے ہیں۔ کچھ کسی شہر میں جا گرتے ہیں۔ کچھ بیابان میں جا پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں کو اُن سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ پہاڑوں سے مراد بادل کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں۔ جو پہاڑوں کی طرح عظیم ہوتے ہیں۔

۳۔ تفسیر "فی ظلال" کے مؤلف نے اس سلسلے میں ایک بات کی ہے۔ یہ بات سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آسمان پر بادل کے ٹکڑے سچ مچ پہاڑ کی طرح کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ نیچے زمین سے ہم دیکھیں تو ہموار دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں کے اُوپر سے سفر کیا، انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بادل بالکل پہاڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں درے، بلندیاں اور پستیاں ہو بہو زمین پر پہاڑوں جیسی ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے بادل پر پہاڑ کا اطلاق بالکل مناسب ہے[1]

اس گفتگو کے ساتھ ہم اس نکتے کا اضافہ کر سکتے ہیں کہ سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق اولے یوں پیدا ہوتے ہیں کہ بارش کے قطرے بادل سے الگ ہوتے ہیں۔ وہ ہوا کے بالائی حصے میں سردی کی شدید لہروں سے ٹکرا کر برف کی گولیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس حصے میں موجود تباہ کن طوفان اور جھکڑ کے باعث بعض اوقات یہ اولے پھر اُوپر کی طرف اچھل کر بادل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس اثناء میں پانی کی ایک اور تہ ان پر چڑھ جاتی ہے۔ بادلوں سے جدا ہوتے وقت وہ پھر برف کی گولیاں بن جاتے ہیں۔ کبھی تو ان گولیوں کے گرنے اور طوفانوں سے ٹکرا کر اوپر بادلوں کی طرف اچھلنے کا عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا ہے اور ہر بار ان پر ایک نئی تہ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ اولے اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ طوفان اور جھکڑ انھیں اب اُوپر نہیں اچھال سکتے۔ لہٰذا وہ زمین پر آ پڑتے ہیں۔ یا پھر طوفان رُک جانے کے باعث وہ کسی رکاوٹ کے بغیر زمین پر آ پڑتے ہیں۔[2]

اس بات کی طرف توجہ کرنے سے لفظ "جبال" میں جو سائنسی نکتہ پوشیدہ ہے۔ زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بھاری اولے تبھی وجود میں آ سکتے ہیں۔ جب بادل تہ دار ہو جائیں تاکہ جس وقت طوفان برف کی گولیوں کو ان کے اندر کی

---

[1] "فی ظلال القرآن" ج ۶ ص ۱۰۹

[2] دائرۃ المعارف فرہنگ نامہ، مادہ "تگرگ"۔

طرف اچھالیں تو یہ پانی کی زیادہ مقدار جذب کر سکیں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب اوپر کی طرف بادل کے ٹکڑے مرتفع اور بلند پہاڑوں کی طرح ہوں۔ (غور کیجئے گا) [1]

بعض مؤلفین نے اس موقع پر ایک اور بحث بھی کی ہے جس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"زیر بحث آیات میں بلند بادل صریحاً برف کے پہاڑوں کی طرف اشارہ ہے اور یا دوسرے الفاظ میں ان سے وہ پہاڑ مراد ہیں کہ جن میں ایک طرح کی برف ہوتی ہے۔ اور یہ بہت جاذب نظر ہے۔ کیونکہ ہوائی جہازوں کے وجود میں آنے کے بعد اور بلند پروازوں کے ممکن ہو جانے کے بعد انسانی علم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ سائنسدانوں نے ایسے بادل دریافت کیے ہیں۔ کہ جو برف کے ذرات سے بنے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ کہ جن پر برف، موسلا دھار طوفانی بارشوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے بار بار برف کے پہاڑ یا برف سے بنے ہوئے پہاڑ کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ واقعاً آسمان میں برف کے پہاڑ موجود ہیں۔ [2]

اگلی آیت میں رات اور دن کی خلقت اور ان کی خصوصیات کے حوالے سے عظمتِ الٰہی کی ایک اور نشانی بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ رات اور دن کو اُلٹ پھیر کرلاتا ہے۔ اور اس میں اہلِ بصیرت کے لیے عبرت ہے۔ (یقلب اللہ اللیل والنھار ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار)۔

یہ کہ اس تغیر اور اُلٹ پھیر سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں علماء نے مختلف تفسیریں کی ہیں، مثلاً:

بعض نے کہا کہ اس سے مراد رات اور دن کی آمد و رفت ہے۔ کیونکہ رات آتی ہے تو دن کو محو کر دیتی ہے۔ اور دن آتا ہے۔ تو رات کو محو کر دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے ایک تدریجی طور پر چھوٹا ہوتا ہے تو دوسرا بڑھ جاتا ہے۔ اور اسی سے مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں۔

بعض نے اسے رات اور دن میں پیدا ہونے والے مختلف تغیرات، مثلاً گرمی اور سردی وغیرہ کے معنی میں

---

[1] "ینزل من السماء من جبال من برد" میں تین مرتبہ لفظ "من" آیا ہے۔ عربی ادب کے لحاظ سے ان میں سے پہلا "من" "ابتدائیہ" ہے، دوسرا بھی "ابتدائیہ" کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ البتہ تیسرے "من" کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ "بیانیہ" ہے اور اس لحاظ سے جملے کا مفہوم یہ ہو گا کہ "اللہ آسمان سے اولوں کے پہاڑوں سے اولے بھیجتا ہے"۔ اس قول کی بناء پر "ینزل" کا مفعول محذوف ہے "البرد" کہ جو قرینۂ کلام سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری اور تیسری تفسیر کہ جسے ہم نے انتخاب کیا ہے، کی بناء پر یہ "من" "زائدہ" ہوگا، جیسا کہ زمخشری نے رُوح المعانی میں لکھا ہے۔ یا پھر یہ "تبعیضیہ" ہے۔ (غور کیجئے گا)

[2] باد و باران در قرآن ص۱۴۰ و ص۱۴۱ (مزید توضیح کے لیے مذکورہ کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔)

کیا ہے۔ [1]

لیکن بغیر کہے واضح ہے کہ یہ تفسیریں باہم ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ اور ہو سکتا ہے یہ سب "یقلب" کے مفہوم میں جمع ہوں۔

بلاشبہ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ رات اور دن کا آنا جانا اور ان کے تدریجی تغیرات انسانی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اور "اولی الابصار" اور اہلِ نظر کے لیے درسِ عبرت ہیں۔ اگر سورج ایک ہی طرح چمکتا رہے اور دھوپ مسلسل پڑتی رہے تو ہوا کا درجہ حرارت بہت بڑھ جائے اور جاندار چیزیں جل جائیں اور اعصاب بہت تھک جائیں۔ لیکن اس تپش اور چمک کے درمیان اگر رات کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو ان چیزوں کو اعتدال میں رکھتے ہیں۔

شب و روز میں پیدا ہونے والی تدریجی تبدیلیاں چار موسموں کی پیدائش کا باعث بنتی ہے اور یہ نباتات کے بار آور ہونے کے لیے بہت ہی مؤثر ہیں۔ اس طرح یہ تبدیلیاں جانداروں کی زندگی، بارش برسنے اور زمینوں میں پانی کے ذخائر جمع ہونے کے لیے بھی بہت مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ [2]

زیرِ نظر آخری آیت چہرۂ آفرینش کے ایک اور رُخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ بھی توحیدِ الٰہی کے لیے ایک واضح دلیل ہے اور یہ ہے مختلف صورتوں میں زندگی کا وجود۔ ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے ہر چلنے پھرنے والے کو پانی سے پیدا کیا ہے (واللہ خلق کل دابۃ من ماء)۔

اگرچہ ان سب کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی عجیب مختلف قسم کے جاندار پیدا ہوتے ہیں۔ "کچھ ان میں سے پیٹ کے بل چلتے ہیں (فمنھم من یمشی علیٰ بطنہ)۔

اور کچھ ہیں کہ جو دو پاؤں پر چلتے ہیں (انسان اور پرندے) اور کچھ ہیں کہ جو چار پاؤں پر چلتے ہیں (چوپائے) (ومنھم من یمشی علیٰ رجلین ومنھم من یمشی علیٰ اربع)۔

اور پھر یہی نہیں۔ زندگی کے اور بھی مظاہر ہیں۔ ان میں سے وہ بھی جاندار ہیں کہ جو پانی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح حشرات الارض بھی ہزاروں قسم کے ہیں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے پیدا کرتا ہے (یخلق اللہ ما یشاء)۔ کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر)۔

چند اہم نکات

۱۔ آیت میں "ماء" سے کیا مراد ہے؟

لفظ "ماء" (پانی) سے یہاں کون سے پانی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ ان آراء کو تین

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر روح المعانی

[2] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ ج ۸ میں سورۂ یونس کی آیت ۶ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

تفسیروں میں جمع کیا جا سکتا ہے :

۱۔ اس سے مراد نطفے کا پانی ہے۔ بہت سے مفسرین نے اس تفسیر کو انتخاب کیا ہے۔ بعض روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اس تفسیر میں یہ مشکل درپیش ہے کہ تمام چلنے پھرنے والے جاندار نطفے سے پیدا نہیں ہوتے۔ ایسے بھی جاندار ہیں کہ جو ایک خلیے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے بھی رینگنے والے جاندار ہیں کہ جو " دابۃ " کا مصداق ہیں اور خلیوں کی تقسیم سے وجود میں آتے ہیں۔ نہ کہ نطفے سے۔

ہاں البتہ یہ کہا جائے کہ آیت نوعی پہلو رکھتی ہے۔ کلی نہیں، پھر بات ٹھیک ہو سکتی ہے

۲۔ اس سے مراد پہلے موجود کی پیدائش ہے۔ کیونکہ بعض روایات کے مطابق سب سے پہلے اللہ نے پانی پیدا کیا اور اس کے بعد انسانوں کو پانی سے پیدا کیا۔ جدید سائنسی مفروضے کی بنا پر بھی زندگی کی پہلی کونپل دریاؤں میں ظاہر اور پانیوں میں پیدا ہونے والا یہ پہلا موجود سب سے پہلے انہی پانیوں کی گہرائیوں پر یا ان کے کناروں پر حکمران ہوا۔

البتہ وہ قوت کہ جس نے ان تمام پیچیدگیوں کے ساتھ پہلے مرحلے میں موجودِ زندہ کو وجود بخشا اور پھر بعد کے مراحل میں ہدایت کی وہ ایک مافوقِ طبیعیات قوت تھی — یعنی ارادۂ الٰہی۔

۳۔ اس سے مراد یہ ہے کہ موجودہ حالت میں موجودات کی بقار کا دارومدار پانی پر ہی ہے اور ان کی ساخت کا اہم حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ اور کوئی جاندار پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی تو نہیں۔ لیکن پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔[1]

۲۔ ایک سوال کا جواب :

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہاں جانوروں کو ان تین قسموں ہی میں کیوں تقسیم کیا گیا ہے،

۱۔ پیٹ کے بل رینگنے والے۔
۲۔ دو پاؤں والے
۳۔ چوپائے

جبکہ چلنے پھرنے والے جانور بہت سے ایسے ہیں کہ جو چار سے زیادہ ٹانگیں رکھتے ہیں۔
اس سوال کا جواب خود آیت میں پوشیدہ ہے کیونکہ۔ اس جملے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

---

[1] تکامل انواع کے بعض طرف داروں نے اپنے مفروضے کے اثبات کے لیے اس آیت کا سہارا لیا ہے۔ لیکن ہم نے جلد نمبر ۱۱ میں سورۂ حجر کی آیت نمبر ۲۶ کے ذیل میں اس مفروضے کے ثابت نہ ہونے کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اصولاً آیاتِ قرآن کو مفروضوں پر منطبق نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ آیاتِ قرآنی حقیقت ثابت رکھتی ہیں۔ جبکہ مفروضے بدلتے رہتے ہیں۔

"یخلق اللہ ما یشاء"

" خدا جو کچھ چاہتا ہے خلق کرتا ہے "

علاوہ ازیں وہ اہم ترین جانور کہ جن سے زیادہ تر انسان کا واسطہ ہے۔ وہ انہی تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ جن جانوروں کی ٹانگیں چار سے زیادہ ہیں ان کا بھی اصل دارومدار چار ٹانگوں پر ہی ہے اور باقی ٹانگیں معاون ٹانگیں شمار ہوتی ہیں۔

۳۔ زندگی مختلف صورتوں میں :

اس میں شک نہیں کہ کائنات میں ظاہر ہونے والی عجیب ترین چیز زندگی ہے۔ زندگی وہ معمہ ہے جو ابھی تک دانشور اور سائنسدان حل نہیں کر سکے سب کہتے ہیں کہ یہ جاندار اس کائنات کے بے جان مادے سے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ حتماً کن شرائط اور حالات کے تحت زندگی وجود میں آجاتی ہے۔ کیونکہ ابھی تک مشاہدے اور تجربے میں نہیں آسکا کہ کسی لیبارٹری میں کسی بے جان چیز سے زندگی وجود میں آگئی ہو۔ اگرچہ اس سلسلے میں ہزارہا ماہرین اور سائنس دان سالہا سال سے غور و فکر اور تجربات کر رہے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں سائنس والوں کے سامنے ——— ایک دھندلی سی تصویر ابھری ہے۔ لیکن یہ تصور ابھی بہت خام ہے۔ جو کچھ مسلم ہے وہ یہ کہ زندگی کے اسرار اس قدر پیچیدہ ہیں، کہ انسانی علوم اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود ابھی تک اسے سمجھنے سے عاجز ہیں۔

عالم کے موجودہ حالات میں جاندار صرف جاندار ہی سے وجود میں آتے ہیں۔ اور کوئی جاندار کسی بے جان سے وجود نہیں پاتا۔ لیکن مسلماً آغازِ حیات میں یوں نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں کرۂ زمین پر حیات کی پیدائش ایک تاریخ رکھتی ہے۔ لیکن وہ تاریخ ابھی تک ایک ایسا معمہ ہے۔ جو کسی پر واضح نہیں ہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر زندگی کا تنوع اور اختلاف۔ مختلف جانداروں میں زندگی کی صورت مختلف ہے۔ صرف مائیکروسکوپ سے نظر آنے والے ایک سیل سے پیدا ہونے والے جاندار بھی ہیں۔ اور کوہ پیکر ویل مچھلی بھی کہ جس کی لمبائی بعض اوقات تیس گز سے زیادہ ہوتی ہے اور جو گوشت کا تیرنے والا ایک پہاڑ ہے۔ حشرات الارض کی لاکھوں قسمیں ہیں۔ اور ہزاروں طرح کے پرندے ہیں۔ اور پھر ان میں سے بھی ہر کسی کے اسرار کی اپنی دنیا ہے۔

بیالوجی کی کتب آج کے دور میں کتب خانوں کا ایک عظیم حصہ ہیں۔ یہ کتابیں جانداروں کے اسرار کا صرف ایک گوشہ بیان کرتی ہیں۔

---

[1] تفسیر قرطبی اور تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] ادبی لحاظ سے اس نقطے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ " منھم " کی ضمیر عموماً جمع کے لیے اور ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ تاہم اس آیت میں غیر ذوی العقول کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ اور اسی طرح لفظ " من " بھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ الفاظ غیر ذوی العقول کے لیے بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔

ان جانداروں میں دریائی جانور تو خصوصاً عجائبات کی ایک دنیا لیے ہُوئے ہیں اور ان کے بارے میں آج بھی بہت معلومات کے باوجود انسان بہت ہی کم جانتا ہے۔

واقعاً کتنا عظیم ہے وہ اللہ کہ جس نے ان جانداروں کو اس وسیع تنوع کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور ہر ایک کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ اسے عطا کی ہے اور کتنا عظیم ہے اُس کا علم اور کتنی عظیم ہے اس کی قدرت کہ اُس نے ہر ایک کو اُس کے حالات اور ضروریات کے مطابق رکھا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سب کی ابتداء ایک ہی ہے اور وہ ہے پانی — زمین کا کچھ مادہ۔

۴۶۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِیْ
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○
۴۷۔ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا
ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ
اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ○
۴۸۔ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ
اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○
۴۹۔ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ؕ
۵۰۔ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ
يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۴۶۔ ہم نے حقیقت واضح کرنے والی آیات نازل کیں اور اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

۴۷۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے ہیں اور اطاعت گزار ہیں۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ان میں سے ایک گروہ روگردانی

کرتا ہے (درحقیقت) وہ مومن ہی نہیں ہیں۔

۴۸۔ اور جب انھیں پکارا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف آئیں، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو اُن میں سے ایک گروہ مُنہ پھیر لیتا ہے۔

۴۹۔ لیکن اگر (فیصلہ ان کے فائدے میں ہو اور) حق انہیں مل جائے، تو بڑی عاجزی سے رسول کے پاس آجاتے ہیں۔

۵۰۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں مبتلا ہیں یا انھیں خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ وہ خود ظالم ہیں۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کے کچھ حصے کے لیے دو شان نزول ذکر کی ہیں، جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ کسی منافق کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا۔ یہودی نے مسلمان نما منافق سے کہا چلو پیغمبر اسلام کے پاس چلتے ہیں۔ اور ان سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ لیکن منافق نے یہ بات نہ مانی۔ اُس نے کہا کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں۔ کعب یہودی تھا۔ (بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ اس نے کہا، ہو سکتا ہے محمد ہمارے ساتھ انصاف نہ کرے۔)

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور ایسے شخص کی سخت مذمت کی گئی۔

۲۔ امیر المومنین حضرت علیؑ اور حضرت عثمان کے درمیان ایک مسئلہ پیدا ہوگیا (ایک روایت میں، حضرت عثمان کی بجائے مغیرہ بن وائل کا نام لکھا ہے) مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے حضرت علیؑ سے کچھ زمین خریدی تھی۔ اس زمین میں کچھ پتھر نکل آئے۔ خریدار نے چاہا کہ اس زمین کو معیوب قرار دے کر سودا منسوخ کر دیا جائے۔ اس پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا چلو رسول اللہ کے پاس چلتے ہیں اور اُن سے فیصلہ لیتے ہیں۔ لیکن حکم بن العاص کہ جو منافقین میں سے تھا، اُس نے خریدار سے کہا ایسا نہ کرنا

کیونکہ اگر تو اس کے چچا زاد بھائی (یعنی رسول اللہؐ) کے پاس فیصلہ لے گیا تو یقیناً وہ اس کے حق میں فیصلہ دیں گے۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور اس کی سخت مذمت کی گئی۔[1]

تفسیر

ایمان اور خدا کے فیصلے پر سر تسلیم خم

گذشتہ آیات میں اللہ پر ایمان لانے کے بارے میں گفتگو تھی، توحیدِ الٰہی دلائل پیش کیے گئے تھے۔ اور اللہ کی نشانیوں کا ذکر تھا۔ اب زیرِ نظر آیات میں ایمان کے آثار کے بارے میں بات کی گئی ہے، توحید پر ایمان کے تقاضوں کا بیان ہے اور حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ــــ واضح کرنے والی آیات نازل کیں (لقد انزلنا اٰیات مبینات)۔

ایسی آیات کہ جو دلوں کو نورِ ایمان و توحید سے منور کرتی ہیں، افکارِ انسانی کو جلا بخشتی ہیں اور زندگی کے تاریک ماحول کو بدل دیتی ہیں۔ یہ آیاتِ بینات ایمان کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں لیکن حقیقی تاثیر تو ہدایت الٰہی سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ "اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔" (واللّٰہ یھدی من یشاء الٰی صراط مستقیم)۔

اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیّت بے بنیاد نہیں ہے۔ نورِ ایمان سے وہ ایسے دلوں کو روشن کرتا ہے جو اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں اور اس کے اہل ہوں۔ یعنی جنھوں نے خود مجاہدہ کی ابتداء کی ہو اس کی طرف قدم بڑھائے ہوں۔

اس کے بعد منافقین کی مذمت کی گئی ہے کہ جو ایمان کا دم تو بھرتے ہیں، لیکن ایمان اُن کے دلوں میں نہیں اُترا۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ان کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ان میں سے ایک گروہ مُنہ پھیر لیتا ہے۔ درحقیقت وہ مومنین ہی نہیں ہیں۔ (ویقولون اٰمنا باللّٰہ و بالرسول و اطعنا ثم یتولٰی فریق منھم من بعد ذٰلک وما اولٰٓئک بالمؤمنین)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، رُوح المعانی، تبیان، تفسیر قرطبی، تفسیر فخر رازی، تفسیر صافی اور نور الثقلین۔ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔

یہ کیسا ایمان ہے کہ جو فقط ان کی زبانوں تک محدود ہے۔ اور ان کے اعمال میں ظاہر نہیں ہوتا؟

اس کے بعد اُن کی بے ایمانی کی دلیل کے طور پر فرمایا گیا ہے: جب انھیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف آئیں تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ رُخ موڑ لیتا ہے (واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینهم اذا فریق منهم معرضون)۔

مزید تاکید کے لیے اور ان کے شرک اور دُنیا پرستی کو مزید واضح کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: لیکن اگر یہ فیصلہ ان کے فائدے میں جاتا ہو تو بڑی عاجزی کے ساتھ رسول کی طرف آجاتے ہیں۔ (وان یکن لهم الحق یأتوا الیه مذعنین)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ عبارت میں اللہ اور رسول دونوں کی طرف دعوت کا ذکر ہے۔ لیکن بعد والی عبارت میں "لیحکم" مفرد کی شکل میں آیا ہے کہ جو صرف رسول اللہ کے فیصلے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ رسول اللہ کا فیصلہ اللہ کے فیصلے سے جدا نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ "الیہ" کی ضمیر رسول اللہ یا ان کے فیصلے کی طرف لوٹتی ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے کہ مندرجہ بالا آیات میں رسول اللہ کے فیصلے سے اعراض اور مُنہ پھیرنے کا ذکر منافقین کے صرف ایک گروہ کے لیے ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دوسرا گروہ اس حد تک بے حیا اور جسارت کرنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ نفاق بھی ایمان کی طرح مختلف درجات رکھتا ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت میں رسول اللہ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کے اصل اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے (افی قلوبهم مرض)۔

منافقین کی ایک صفت اد ہے کہ وہ اظہارِ ایمان تو کرتے ہیں۔ لیکن اللہ اور رسولؐ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے دل توحید سے منحرف ہیں۔

اور اگر ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری نہیں ہے تو پھر یچ مچ وہ "شک میں مبتلا ہیں" (ام ارتابوا)۔

اور فطری بات ہے کہ جو شخص کسی دین کو قبول کرنے میں متردّد ہو وہ اس کے لوازم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا۔

اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں اور وہ مومن ہیں" تو کیا وہ واقعاً ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا" (ام یخافون ان یحیف اللہ علیهم ورسولہ)۔

حالانکہ یہ واضح تضاد ہے۔ جو شخص رسول اسلامؐ کو اللہ کا بھیجا ہوا رسول اور اُس کا پیغام برسمجھتا ہے اور اُس کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتا ہے ممکن نہیں ہے کہ اُسے احتمال ہو کہ وہ ظلم کریں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ کسی پر ظلم کرے؟ کیا ظلم، جہالت، احتیاج یا خود غرضی کی پیداوار نہیں؟ جب کہ ذاتِ مقدس پروردگار ان سب چیزوں سے پاک ہے۔" بات دراصل یہ ہے کہ وہ خود ظالم ہے۔ (بل اُولئک هم الظالمون)۔

وہ نہیں چاہتے کہ اپنے حق پر قناعت کریں اور چونکہ وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ ایسی کوئی چیز انہیں نہیں دیں گے کہ جس پر کسی دوسرے کا حق ہو، للذا وہ آپ کا فیصلہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

تفسیر "فی ظلال القرآن" کے مؤلف کے بقول ان تینوں تعبیروں میں سے ہر ایک ایک خاص پہلو کی حامل ہے۔

پہلی اثبات کے لیے ہے۔

دوسری تعجب کے لیے ہے۔

تیسری انکار کے لیے ہے۔

پہلے جُملے میں قرآن حقیقی وجہ بیان کرنا چاہتا ہے اور وہ ہے نفاق کی بیماری۔

دوسرے جُملے میں عدالتِ رسولؐ میں ان کے شک پر تعجب کا اظہار مقصود ہے۔ نیز رسول اللہؐ کے فیصلے کی صحت کا اعلان ہے۔ جبکہ وہ ایمان کا دعوٰے کرتے ہیں۔

تیسرے جُملے میں اُن کے واضح تضاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے ایمان کے دعوے سے ان کا عمل ہم آہنگ نہیں ہے۔[1]

مفسرِ مذکور کی بات پر صرف یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انہوں نے "ام ارتابوا" کو عدالت رسولؐ اور فیصلے کی صحت پر شک کے معنیٰ میں لیا ہے۔ حالانکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ خود نبوت میں شک کو بیان کرتا ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے اس امر کو قبول کیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ نفاق کی بیماری: یہ وہ مقام نہیں کہ جہاں قرآن مجید نے نفاق کو ایک "مرض" قرار دیا ہے۔ بلکہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ کی ابتدا میں منافقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فی قلوبهم مرض فزادهم اللہ مرضًا۔

ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور اللہ ان کی بیماری بڑھا دیتا ہے۔

جیسا کہ پہلی جلد میں ہم اس آیت کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ نفاق درحقیقت ایک بیماری اور انحراف ہے۔ جو انسان صحیح اور صحت مند ہو اُس کا ایک ہی چہرہ ہوتا ہے۔ اس کی رُوح اُس کا جسم آپس میں ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اگر وہ مومن ہے تو اس کے تمام وجود سے ایمان کی صدا بلند ہوتی ہے اور اگر وہ منحرف ہے تو اس کا ظاہر و باطن انحراف کا مظہر ہے۔ لیکن جس کا ظاہر ایمان ہے اور باطن کُفر کی لو دیتا ہے۔ یہ تو ایک قسم کی بیماری ہے اور ایسے لوگ چونکہ اپنی ہٹ دھرمی

[1] تفسیر فی ظلال القرآن، ج ۶ ص ۱۱۵

اور ڈھٹائی کی وجہ سے لطف وہدایتِ الٰہی کے مستحق نہیں ہیں۔ لہٰذا خداوندِ عالم انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ ان کی بیماری میں اضافہ ہو۔

واقعاً کسی معاشرے کے خطرناک ترین افراد یہی منافقین ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بارے میں انسان پر اپنی شرعی ذمہ داری واضح نہیں ہوتی۔ نہ وہ حقیقی دوست ہوتے ہیں اور نہ ظاہراً دشمن۔ مومنین کے وسائل سے استفادہ کرتے ہیں اور کفّار کے عقاب سے بھی مامون ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اعمال کفار سے بدتر ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ ظاہر و باطن کی ناہم آہنگی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر کار پردے ہٹ جاتے ہیں اور ان کی بد باطنی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم زیرِ بحث آیات اور ان کی شانِ نزول میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ ایک مسئلہ پیش آنے سے ان کی قلعی کھل گئی اور اُن کا خبثِ باطن ظاہر ہو گیا۔[1]

۲۔ عادلانہ فیصلہ صرف خدا کا ہوتا ہے :

اس میں شک نہیں کہ انسان کو اپنے آپ کو محبت و نفرت، خود خواہی اور ذاتی اغراض سے الگ کرنا چاہیئے جو لاشعوری طور پر ان امور کے زیرِ اثر آجاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ معصوم ہو اور پروردگار کی طرف سے محفوظ ہو۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ حقیقی قانون گزار صرف خدا ہی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بے پایاں علم کی وجہ سے انسان کی تمام ضروریات کو بھی جانتا ہے اور ان ضروریات کو پورا کرنے کا راستہ بھی جانتا ہے۔ خود اس کی اپنی کوئی احتیاجات بھی نہیں اور محبت و نفرت کی بنا پر وہ کبھی انحراف اور کجی کا بھی شکار نہیں ہوتا۔ لہٰذا عادلانہ ترین فیصلہ خدا، نبی اور امام معصوم ہی کا ہو سکتا ہے اور ان کے بعد ایسے افراد کا کہ جو ان کی راہ پر چلتے ہیں، اور ان سے مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ خود غرض انسان ایسے عادلانہ فیصلوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور عادلانہ قوانین کے توسیع اور نفاذ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایسے قانون اور فیصلے کا متمنی ہوتا ہے کہ جو اس کی خواہش اور حرص کو زیادہ سے زیادہ پورا کرے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ :

اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔

حقیقی ظالم یہی لوگ ہیں۔

نیز حقیقی عادلانہ فیصلے ہر انسان کے معیارِ ایمان کی بھی کسوٹی ہوتے ہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ قرآن ایک مقام پر کہتا ہے کہ اے رسول! حقیقی مومنین نہ صرف تیرے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں، بلکہ دل میں بھی تیرے فیصلوں پر بوجھ اور ناراحتی محسوس نہیں کرتے۔ اگرچہ ظاہراً اُن کے نقصان میں ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

[1] منافقین کی صفات کے متعلق مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ ج ۱ میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں رجوع کریں۔

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

تیرے رب کی قسم! کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا، جب تک اپنے جھگڑوں میں تجھے قاضی اور فیصل قرار نہ دے۔ نیز تیرے فیصلے کے بعد ضروری ہے کہ اپنے دل میں کوئی بوجھ اور ناراحتی بھی محسوس نہ کرے اور ظاہر و باطن میں حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔

(نساء - ۶۵)

لیکن وہ لوگ کہ جو اللہ اور رسول کا حکم اس صورت میں مانتے ہیں کہ جب اُن کا فائدہ ہو، حقیقت میں وہ مشرک ہیں کہ اپنے مفادات کے بندے ہیں۔ اگرچہ وہ ایمان کا دم بھرتے ہوں اور مومنین کی صفوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہوں

۵۱۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ
بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ○
۵۲۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ○
۵۳۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ
قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ○
۵۴۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ
تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

ترجمہ

۵۱۔ جب مومنین کو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

۵۲۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں، اللہ سے ڈریں اور اُس کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کریں ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

۵۳۔ اُنہوں نے بڑی بڑی قسمیں کھا کر کہا کہ اگر تو انہیں حکم دے تو وہ (اپنے گھر اور مال کو)

چھوڑ دیں گے (اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ ہوں گے)۔ ان سے کہہ دے: قسمیں نہ کھاؤ۔ صدق و خلوص سے اطاعت کرو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

۵۴۔ کہہ دے: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر تم نے نافرمانی کی تو رسول اپنے اعمال کا مسئول ہے اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو لیکن اگر تم نے اطاعت کی تو ہدایت پاؤ گے اور پیغمبر کے ذمہ تو صرف کھلی تبلیغ کرنا ہے۔

تفسیر

حق پر ایمان اور تسلیمِ کامل

گذشتہ آیات میں سیاہ دل منافقین کا حال بتایا گیا تھا کہ جو تہ در تہ اندھیروں میں ہیں اور "بعضها فوق بعض" کا مصداق ہیں اور ہم نے دیکھا کہ اللہ اور اس کے رسول کے منصفانہ فیصلے سے کیسے روگردانی کرتے ہیں گویا انہیں خوف ہے کہ اللہ اور رسول ان کے حق کو پامال کر دیں گے۔

زیر نظر آیات منافقین کے مقابلے میں مومنین کی کیفیت بیان کر رہی ہیں کہ خدائی فیصلے پر اُن کا ردّ عمل کیا ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے، جب مومنین کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ صرف ایک ہی بات کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی (انما كان قول المؤمنين اذا دعوا الى الله ورسوله ليحكم بينهم ان يقولوا سمعنا واطعنا)۔

کیا عمدہ بات ہے ـــــ "سمعنا واطعنا" (ہم نے سُنا اور اطاعت کی)۔ مختصر اور معنی خیز انداز ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ یہاں لفظ "انما" استعمال ہوا ہے کہ جو حصر کے لیے ہے۔ یعنی اس کے علاوہ ان کی کوئی بات ہی نہیں اور سرتاپا اُن کی یہی کیفیت ہے اور سچ مچ حقیقتِ ایمان یہی ہے کہ "سمعنا واطعنا"۔

جو شخص یہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ ہر چیز کا عالم ہے، وہ ہر شخص سے بے نیاز ہے اور تمام بندوں کے لیے رحیم اور مہربان ہے تو وہ اللہ کے فیصلے پر کسی اور کے فیصلے کو کیسے ترجیح دے سکتا ہے اور کیونکر ممکن ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر اس کے سوا کچھ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ یہ کیسی عظیم آزمائش اور مومنین کی کامیابی کا کیا ہی عمدہ راستہ ہے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، حقیقتاً فلاح یافتہ اور کامیاب یہی لوگ ہیں (واولٰئك هم المفلحون)۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنی باگ ڈور اللہ کے حوالے کر دے، اسے حاکم اور جج مان لے وہ ہر چیز میں کامیاب ہے

مادی زندگی میں بھی اور روحانی زندگی میں بھی۔

دوسری آیت میں اسی حقیقت کو عمومی شکل دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اللہ سے ڈریں اور تقویٰ کو اپنا کر اپنا شعار بنائیں وہی نجات پانے والے اور کامیاب ہیں (ومن یطع اللہ و رسولہ ویخش اللہ و یتقہ فاولئک ھم الفائزون)۔ [1]

اس آیت میں فرماں بردار اور پرہیزگار افراد کو "فائزون" کہا گیا ہے جبکہ گزشتہ آیت میں اللہ اور رسول کا فیصلہ ماننے والوں کو "مفلحون" کہا گیا ہے۔ لغت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "فوز" اور "فلاح" تقریباً ہم معنیٰ ہیں مفردات میں راغب نے کہا ہے:

"فوز" کا معنیٰ ہے سلامتی کے ساتھ کامیابی اور اچھے انجام تک پہنچانا اور "فلاح" کا معنیٰ ہے کامیابی اور مقصود تک پہنچنا۔

البتہ بنیادی طور پر "فلاح" چیرنے کے معنیٰ میں ہے۔ کامیاب افراد چونکہ رکاوٹوں کو چیر کر آگے بڑھ جاتے ہیں لہٰذا "فلاح" کامیابی کے معنیٰ میں بھی استعمال ہونے لگا۔

بعد والی آیت میں مطلق فرماں برداری کے بارے میں بات کی گئی ہے اور پہلی آیت میں خدائی فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے ایک لفظ عمومی اور کلّی مفہوم کا حامل ہے جبکہ دوسرا لفظ مخصوص معنیٰ کے لیے اس لحاظ سے دونوں کا نتیجہ بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ بعد والی آیت میں "فائزون" کے تین اوصاف ذکر ہوئے ہیں:

(۱) اللہ اور رسول کی اطاعت

(۲) خوفِ خدا

(۳) تقویٰ

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اطاعت کلی مفہوم میں ہے، خوفِ خدا اس کی داخلی کیفیت ہے اور تقویٰ اس کا خارجی مظہر ہے اس لیے پہلے مجموعی طور پر اطاعت کا ذکر ہے اور بعد میں اُس کی اندرونی و بیرونی کیفیت کی بات ہوئی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ایک روایت میں "واولئک ھم المفلحون" کی تفسیر کے بارے میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

ان المعنی بالآیۃ امیر المؤمنین

اس آیت کے مصداق امیر المؤمنین علیؑ ہیں [2]

[1] "یتقہ" میں قاف ساکن ہے اور "ہ" کے نیچے زیر ہے۔ یہ دراصل "یتقیہ" تھا۔ شرط کا کردار ادا کرنے کی وجہ سے اس کی "ی" حذف ہوگئی ہے۔ چونکہ یکے بعد دیگرے "دو" زیریں ثقیل تھیں، اس لیے اُن میں سے ایک حذف ہوگئی ہے اور لفظ نے یہ شکل اختیار کرلی ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۶۱۶

اس میں شک نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اس آیت کے واضح ترین مصداق ہیں اور مذکورہ روایت کی مراد بھی یہی ہے اور اس سے آیت کی عمومیت ہرگز ختم نہیں ہوتی۔

اس سے اگلی آیت کا لب و لہجہ ظاہر کرتا ہے اور بعض تفاسیر میں مذکور اس کی شانِ نزول بھی نشاندہی کرتی ہے کہ گزشتہ آیات کہ جن میں منافقین کی شدید مذمت کی گئی ہے کے نزول کے بعد کچھ منافقین اپنی حالت پر سخت پریشان تھے۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ ہم آپ کے فرماں بردار ہیں۔ قرآن نے اس کا نوٹس لیا اور بڑے فیصلہ کن انداز میں فرمایا انہوں نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ دیں گے (اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں گے) ان سے کہیے قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اطاعت اختیار کرکے عملی طور پر اپنے صدق و خلوص کا ثبوت دو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے (واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن امرتھم لیخرجن قل لا تقسموا طاعۃ معروفۃ ان اللہ خبیر بما تعملون)۔

بہت سے مفسرین نے "لیخرجن" میں "خروج" سے مراد جہاد کے لیے نکلنا لیا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے گھر بار سے نکلنے یا پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ہر جگہ جانے اور ان کی خدمت میں رہنا مراد لیا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں لفظ "خروج" اور اس کے مشتقات میدانِ جہاد کے طرف جانے کے معنیٰ میں بھی آئے ہیں۔ اور گھر بار اور وطن چھوڑنے کے معنیٰ میں بھی۔ لیکن گزشتہ آیات میں اختلافی مسائل کے لیے پیغمبر اکرمؐ کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے اُس کی مناسبت تقاضا کرتی ہے کہ ہم دوسری تفسیر کو قبول کریں اور اس سے یہ مراد لیں کہ وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قسم کھا کر کہا کہ مال کا ایک حصہ تو معمولی سی بات ہے آپ حکم کریں تو ہم اپنا سب کچھ چھوڑ دیں۔ تاہم اس کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ دونوں باتیں آیت کے مفہوم میں جمع ہوں یعنی ہم اس کے لیے بھی حاضر ہیں کہ آپ کے حکم پر مال و منال اور گھر بار چھوڑ دیں اور اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جہاد کی طرف چلے جائیں۔

لیکن منافق لوگ کبھی حالات نامساعد ہوں تو اپنا چہرہ بدل لیتے ہیں اور بڑی بڑی قسمیں کھانے لگتے ہیں اور کبھی اُن کی قسمیں خود اُن کے جھوٹ کی دلیل ہوتی ہیں اس لیے قرآن صراحت کے ساتھ انہیں جواب دیتا ہے کہ قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں عمل سے اپنی بات کا ثبوت پیش کرو لیکن اللہ تمہارے دل کی گہرائیوں سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ تم جھوٹی قسمیں کھا رہے ہو یا واقعاً اپنا طرزِ عمل بدلنے کا ارادہ رکھتے ہو۔

اس لیے زیرِ بحث آخری آیت میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ان سے کہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں (قل اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اس فرمان پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں "اگر تم منہ موڑ لو اور منحرف ہو جاؤ تو رسول اپنے اعمال کا جواب دہ ہے (اور اُس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے) اور تم بھی اپنے اعمال کے جواب دہ ہو (فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم)۔ لیکن اگر تم اس کی فرماں برداری کرو تو ہدایت پاؤ گے (وان تطیعوہ تھتدوا) کیونکہ وہ ایسا رہبر ہے کہ جو اللہ اور حق کے راستے کے علاوہ کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔ بہر حال رسول پر کھلی تبلیغ کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں (وما علی الرسول

الا البلاغ المبین)۔ اُس کی ذمہ داری ہے کہ سب تک واضح طور پر حکمِ خدا پہنچا دے چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ اور اس دعوت کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا فائدہ یا نقصان بھی انہی کو ہوگا جو قبول کریں یا نہ کریں۔ رسول کی یہ ہرگز ذمہ داری نہیں کہ وہ لوگوں کو ہدایت اور دعوت قبول کرنے پر مجبور کرے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس آیت میں ذمہ داری اور مسئولیت کو بوجھ سے تعبیر کیا گیا ہے اور در حقیقت ہے بھی ایسا ہی۔ رسول اللہؐ کی رسالت بھی اور اُن کی دعوت پر صدق و خلوص سے اطاعت بھی دوش پر ایک بوجھ ہے کہ جسے منزل تک پہنچانا چاہیئے اور سوائے مخلص لوگوں کے کوئی اسے اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

> یامعاشر قراء القرآن اتقوا اللہ عزوجل فیما حملکم من کتابہ فانی مسئول وانتم مسئولون: انی مسئول عن تبلیغ الرسالۃ، واما انتم فتسئلون عما حملتم من کتاب اللہ و سنتی
>
> اے قرآن پڑھنے والو! خدائے عظیم سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو اُس کی کتاب کے بارے میں کہ جس کا بوجھ اُس نے تمہارے کندھوں پر ڈال دیا ہے کیونکہ میں جواب دہ ہوں اور تم بھی جواب دہ ہو۔ میں تبلیغ رسالت کے بارے میں جواب دہ ہوں اور تم کتابِ خدا اور میری سنّت کے بارے میں جواب دہ ہو کہ جس کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ڈال دیا گیا ہے۔

۵۵۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۵۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اعمال صالح انجام دیتے ہیں اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناً اُنہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسے اُس نے اُن سے پہلے لوگوں کو خلافت بخشی تھی اور اُس نے جو دین ان کے لیے پسند کیا ہے اُسے مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دے گا اس طرح سے کہ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک قرار نہیں دیں گے اور اس کے بعد جو لوگ کافر ہو جائیں وہ فاسق ہیں۔

شانِ نزول

سیوطی نے اسباب النزول میں، طبرسی نے مجمع البیان میں، سید قطب نے فی ظلال میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح دیگر کئی ایک مفسرین نے (تھوڑے سے فرق کے ساتھ) اس آیت کی یہ شانِ نزول نقل کی ہے:

> جب رسول اللہؐ اور مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی، اور انصار نے خندہ پیشانی سے اُنہیں خوش آمدید کہا تو تمام عرب اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ مسلمان مجبور ہو گئے کہ ہر وقت اسلحہ اپنے ساتھ رکھیں رات کو اسلحہ پاس رکھ کر سوئیں، صبح اُٹھیں تو اسلحہ ساتھ لے کر اُٹھیں،

اور ہر وقت مستعد رہیں۔ اس حالت کو جاری رکھنا مسلمانوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ بعض نے تو کھلے بندوں اس بات کا اظہار کیا کہ آخر یہ کیفیت کب تک باقی رہے گی کیا ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم رات ہی کو چین کا سانس لے سکیں اور اللہ کے علاوہ ہم کسی سے نہ ڈریں۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں بشارت دی گئی کہ ہاں ایسا زمانہ آئے گا۔[1]

تفسیر

مستضعفین کی عالمی حکومت

گزشتہ آیات میں اللہ اور اُس کے رسولؐ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب زیرِ بحث آیت میں بھی وہی موضوعِ سخن جاری رکھتے ہوئے اس اطاعت کا نتیجہ عالمی حکومت کا قیام بیان کیا گیا ہے۔ آیت زور دیتے ہوئے کہتی ہے: جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں اللہ کا اُن سے وعدہ ہے کہ یقیناً انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلافت بخشی ہے (وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم)۔ اور جو دین اُن کے لیے پسند کیا ہے اُسے مضبوط بنیادوں زمین پر قائم کرے گا (ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم)۔ اور ان کے خوف کو امن و سکون میں بدل دے گا (ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنًا)۔ اور یہ عالم ہو جائے گا کہ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک قرار نہیں دیں گے (یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا)۔

مسلم ہے کہ حکومتِ توحید کے قیام، دینِ الٰہی کے استحکام اور ہر قسم کے اضطراب، بدامنی اور شرک کے خاتمے کے بعد بھی "جو لوگ پھر کافر ہو جائیں گے وہ فاسق ہیں" (و من کفر بعد ذٰلک فاولٰئک ھم الفاسقون)۔

بہرحال اس آیت سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا اُن مسلمانوں کو تین خوشخبریاں دیتا ہے کہ جو صاحبِ ایمان ہیں اور اعمالِ صالح بجا لاتے ہیں۔ خوشخبریاں یہ ہیں:

(۱) روئے زمین پر حکمرانی۔

(۲) ہر جگہ مستحکم بنیادوں پر دینِ حق کی اشاعت (یہ بات لفظ "تمکین" سے ظاہر ہوتی ہے)۔

(۳) تمام اسبابِ خوف و بدامنی کا خاتمہ۔

ان امور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بڑی آزادی سے اللہ کی پرستش کر سکیں، اس کے احکام بجا لائیں گے اور اس کے لیے کسی شریک کے قائل نہ ہوں اور توحیدِ خالص کو ہر جگہ پھیلا دیں۔

---

[1] اسباب النزول ص۱۹۳، مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر فی ظلال، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں

یہ وعدۂ الٰہی پورا ہوا یا نہیں —— اس سلسلے میں ہم ذیل کے نکات میں بحث کریں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ "کما استخلف الذین من قبلھم" کی تفسیر: مسلمانوں سے پہلے جن لوگوں کو خلافت ملی وہ کون تھے —— اس سلسلے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں، مثلاً:

بعض نے اسے حضرت آدمؑ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ قرآن سورہ بقرہ آیت ۳۰ میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

انی جاعل فی الارض خلیفۃ

میں زمین میں اُسے خلیفہ بنانا چاہتا ہوں

سورہ ص کی آیت ۲۶ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ہے:

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض

اے داؤد! ہم نے تجھے زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔

اسی طرح سورہ نمل کی آیت ۱۶ کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام حکومتِ داؤدؑ کے وارث تھے لہٰذا وہ بھی خلیفہ ہوئے۔

بعض دوسرے حضرات مثلاً مفسرِ عالی قدر علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں اس معنی کو بعید قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے "الذین من قبلھم" کے الفاظ کو انبیاء کے شایانِ شان نہیں سمجھا کیونکہ اس طرح کے الفاظ قرآن میں انبیاء کے بارے میں استعمال نہیں ہوئے۔ لہٰذا علامہ طباطبائی اسے گزشتہ اُمتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو ایمان و عمل صالح کی حامل تھیں اور اُنہیں زمین پر حکمرانی حاصل ہوئی۔

لیکن بعض دیگر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے اقتدار کی تباہی کے بعد وہ حکمران ہوئے، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت ۱۳۷ میں فرمایا گیا ہے:

واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض و مغاربھا التی بارکنا فیھا

ہم نے (مومنینِ بنی اسرائیل کے) کمزور کردہ لوگوں کو اس زمین کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا کہ جسے ہم نے پُر برکت بنایا ہے۔

نیز اُنہی کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

ونمکن لھم فی الارض

ہم نے ارادہ کیا کہ اس مستضعف قوم کو زمین پر اقتدار دیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بھی غلط اور فاسق بلکہ بعض اوقات کافر لوگ بھی تھے لیکن حکومت بہرحال صالح مومنین کے ہاتھ میں تھی (اس لحاظ سے اس تفسیر کے بارے میں بعض مفسرین نے جو اعتراض کیا ہے وہ دُور ہو جاتا ہے)

یہ تیسری تفسیر ہمیں مفہوم کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ اللہ کا یہ وعدہ کن سے ہے؟

آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے زمین پر حکمرانی، دینی اقتدار اور مکمل امن وسکون کا
وعدہ اُن سے کیا ہے جو ایمان اور عملِ صالح کے حامل ہیں۔ اس کے مصداق کون لوگ ہیں اس سلسلے میں مفسرین کے نظریات مختلف ہیں
★ بعض نے اسے اصحابِ رسولؐ کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے کہ اسلام کی کامیابی کے باعث وہ زمانہ رسولؐ میں صاحبِ حکومت
ہو گئے (البتہ اس تفسیر کے مطابق زمین سے مراد تمام روئے زمین نہیں بلکہ زمین کا ایک خطہ مراد ہے)۔
★ بعض نے پہلے چار خلفاء کی حکومت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔
★ بعض نے اس کے مفہوم کو اتنا وسیع لیا ہے کہ سب ایسے مسلمانوں کو اس کا مصداق قرار دیا ہے کہ جن میں یہ صفات موجود ہوں۔
★ بعض نے اسے حکومتِ حضرتِ مہدی علیہ السلام کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ عالم کے مشرق ومغرب جن کے زیرِ نگین ہوں گے،
دینِ حق ہر جگہ حکم فرما ہوگا، بدامنی، خوف وہراس اور جنگ جدل کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام لوگ شرک سے پاک عبادت بجا لائیں گے۔
اس میں شک نہیں کہ یہ آیت ابتدائی مسلمانوں کے بارے میں ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت
بھی اس آیت کا مصداقِ کامل ہے۔ تمام مسلمان چاہے شیعہ ہوں یا سُنی اس بات کے معتقد ہیں کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت جب
دنیا ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی اُسے عدل وانصاف سے معمور کردے گی۔ تاہم اس کے باوجود اس میں کوئی مانع نہیں کہ آیت عمومیت کی
حامل ہو۔

مختصر یہ کہ جس زمانے میں بھی مسلمانوں کے درمیان ایمان اور عمل صالح کی بنیادیں مستحکم ہوں گی وہ ایک مؤثر حکومت کے مالک
بن جائیں گے۔

بعض کہتے ہیں کہ لفظ "ارض" مطلق ہے اور اس سے ساری زمین مراد ہے اور یہ امر منحصراً حضرت مہدی علیہ السلام (ارواحنا
لہ الفدا) کی حکومت سے مربوط ہے۔ یہ دعویٰ "کما استخلف ....." کے جملے سے مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ گزشتہ مومنین کی
حکومت مسلماً ساری دنیا پر محیط نہ تھی۔ علاوہ ازیں آیت کی شانِ نزول بھی نشاندہی کرتی ہے کہ چاہے رسول اللہؐ کی عمر کے آخری
زمانے میں ہی سہی مسلمانوں کے لیے اس حکومت کا ایک نمونہ معرضِ وجود میں ضرور آیا ہے۔

بہرحال ہم اس بات کی تکرار کرتے ہیں کہ انبیاء کی تمام زحمتوں اور مسلسل تبلیغات کا ماحصل اور کامل نمونہ ایک عالمی حکومت کی صورت
میں ظاہر ہوگا جس میں توحید کی حاکمیت ہوگی، ہر طرف امن وسکون ہوگا اور شرک سے پاک عبادت ہوگی۔ یہ حضرت مہدی علیہ السلام
کا زمانہ ہوگا۔ وہی مہدیؑ کہ جو سلالۂ انبیاءؑ اور فرزندِ رسولِ اسلامؐ ہیں۔ اس زمانے کے بارے میں تمام مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی ہے:

لولم یبق من الدنیا الا یوم لطول اللہ ذلک الیوم حتی یلی رجل من عترتی، اسمہ اسمی، یملا
الارض عدلًا وقسطًا کما ملئت ظلمًا وجورًا

اگر دنیا کی زندگی کا صرف ایک دن بھی رہ جائے گا تو اللہ اسے اتنا طویل کردے گا کہ اس
میں میری عترت میں سے ایک فرد زمین پر حاکم ہوگا۔ اُس کا نام میرا نام ہوگا۔ جیسے زمین ظلم وجور

سے بھر چکی ہوگی وہ ایسے ہی اسے عدل وانصاف سے معمور کردے گا۔[1]

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس آیت کے ذیل میں مرحوم طبرسی کہتے ہیں کہ اہل بیتِ رسولؐ سے یہ حدیث منقول ہے:

انہا فی المھدی من اٰل محمد

یہ آیت مہدیؑ کے بارے میں ہے کہ جو آلِ محمدؐ میں سے ہوں گے۔[2]

تفسیر روح المعانی اور بہت سی شیعہ تفاسیر میں امام سجاد علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:

ھم واللہ شیعتنا اھل البیت، یفعل اللہ ذلک بھم علی یدی رجل منا، وھو مھدی ھذہ
الامۃ، یملا الارض عدلا وقسطا کما ملئت ظلمًا وجورًا، وھو الذی قال رسول اللہ (ص)
لولم یبق من الدنیا الا یوم ....

اللہ کی قسم وہ ہمارے شیعہ ہیں۔ اللہ اُن کے لیے یہ حکومت ہم میں سے ایک مرد کے ہاتھ سے قائم کریگا
کہ جو اس اُمت کا مہدی ہے۔ وہ زمین کو اس طرح سے عدل وانصاف سے بھردے گا جس طرح
وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔ یہ بزرگوار وہی ہیں کہ جن کے بارے میں رسول اللہ (ص) نے فرمایا ہے
کہ اگر دنیا کی زندگی کا ایک دن بھی باقی رہ گیا ....

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ان تفاسیر کا یہ مطلب نہیں کہ مفہومِ آیت انہی میں منحصر ہے بلکہ یہ مصداقِ کامل کا بیان ہے۔ البتہ
روح المعانی کے مفسر آلوسی اور چند دیگر مفسرین کہ جنہوں نے اس نکتے کی طرف توجہ نہیں کی ان احادیث کو مشکوک قرار دیا ہے۔

اہل سنت کے مشہور مفسر قرطبی نے مقداد بن اسود سے نقل کیا ہے:

میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا:

ما علی ظھر الارض بیت حجر ولا مدر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام

روئے زمین پر پتھر یا مٹی کا کوئی ایسا گھر نہیں رہے گا کہ جس میں اسلام داخل نہ ہوگا (اور ساری
دنیا پر ایمان اور توحید پرستی کی حکومت ہوگی)۔[3]

حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت کے سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ ج ۴ میں سورہ توبہ کی آیت ۳۳ کے ذیل
میں رجوع کیجیے۔ وہاں ہم نے شیعہ اور سنی علماء کی کتب سے مفصل مدارک اور دلائل درج کیے ہیں۔

۳۔ اصلی ہدف ــــ شرک سے پاک عبادت:

"یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا" یہ جملہ ادبی لحاظ

---

[1] کتاب "منتخب الاثر" میں اس مضمون کی ایک سو تیئس احادیث نقل کی گئی ہیں۔ یہ احادیث زیادہ تر اہل سنت کی کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ قارئین اسی کتاب کے صفحہ ۲۴۷ سے بعد کے صفحات کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] قرطبی، ج ، صفحہ ۴۲۹۲

سے حال ہو یا غایت[1] اس کا مفہوم یہ ہے حکومتِ عدل کے قیام، دینِ حق کے استحکام اور امن و امان کے حصول کا اصلی مقصد عبادت اور توحید پرستی کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہے۔ قرآن کی ایک اور آیت میں مقصدِ تخلیق بھی یہی بیان ہوا ہے،

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

"میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے (ذاریات - ۵۶)

وہ عبادت جو انسانوں کی تربیت کرتی ہے اور اُن کی پرورشِ روح کے لیے بہت اعلیٰ مکتب ہے۔ وہ عبادت جس سے اللہ بے نیاز ہے اور بندے کمال اور ارتقاء کے لیے جس کے بہت محتاج ہیں۔

یہ اسلامی نظریہ ہے جبکہ مادی نظریے اس کے برخلاف ہیں۔ ان کا ہدف خوشحالی کے لحاظ سے بلند سطح کی مادی زندگی ہے جبکہ اسلام کبھی ایسی چیز کو اپنا ہدف قرار نہیں دے سکتا اس کی نظر میں تو مادی زندگی کی تبھی کوئی اہمیت ہے جب وہ ایسے روحانی ہدف کے حصول کا ذریعہ ہو۔

البتہ اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ شرک سے پاک عبادت، غیر الٰہی قانون کی نفی اور ذاتیات و خواہشات کی حکمرانی کا خاتمہ ایک حکومتِ عدل کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ حکومت کے بغیر مسلسل تعلیم، تربیت اور تبلیغ کے ذریعے کچھ لوگوں کو حق کی طرف متوجہ کیا جائے لیکن معاشرے میں اسے رواج دینا یا ایمان صالحین کی حکومت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے انبیاء سب سے زیادہ کوشش و محنت اسی قسم کی حکومت کے قیام کے لیے کرتے تھے۔ خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کو جونہی موقع ملا ہجرتِ مدینہ کے موقع پر نمونے کے طور پر ——— ایسی حکومت قائم کر دی۔

یہاں سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی حکومت صلح کرے یا جنگ، نیز تعلیم، ثقافت، اقتصاد اور فوج غرض اس کے تمام شعبوں کے پروگرام اور سرگرمیاں اللہ کی عبادت کے راستے میں ہوتی ہیں ـــ ایسی عبادت کہ جو ہر قسم کے شرک سے خالی ہو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صالحین کی حکومت کے قیام، دینِ حق کے استحکام اور شرک سے پاک عبادت کی ترویج کا یہ معنیٰ نہیں کہ اس قسم کے معاشرے میں کوئی گنہ گار اور منحرف نہیں ہوگا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ حکومت صالح مومنین کے ہاتھ میں ہے اور معاشرہ مجموعی اور عمومی طور پر شرک سے پاک ہے ورنہ جب تک انسان ارادے کی آزادی کا حامل ہے بہترین الٰہی اور انسانی معاشروں میں بھی منحرف افراد کا وجود ممکن ہے (غور کیجیئے گا)۔

[1] پہلی صورت میں گزشتہ آیات میں آنے والی ضمیر "ہم" سے ہم آہنگ ہو کر حالیہ ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت میں لام مقدر ہے اور اصل میں "لیعبدوننی" ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے یہ جملہ استینافیہ ہے لیکن یہ بہت کمزور احتمال ہے۔

۵۶۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

۵۷۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۵۶۔ اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور (اللہ کے) رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر اُس کی رحمت ہو۔

۵۷۔ یہ گمان نہ کرو کہ کافر عذابِ الٰہی سے زمین میں کہیں بھاگ سکتے ہیں اُن کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ کیسی بُری جگہ ہے۔

تفسیر

عذابِ الٰہی سے فرار ممکن نہیں

گزشتہ آیت میں صالح مومنین سے زمین پر حکمرانی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر دو آیتوں میں اس حکومت کی بنیادیں رکھنے کے لیے لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عظیم رکاوٹیں دُور کرنے کی ذمہ داری بھی خدا خود لے رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: نماز قائم کرو (واقیموا الصلوٰة)۔

وہی نماز جو مخلوق کا خالق سے رشتہ قائم کر دیتی ہے، اللہ سے بندوں کے مسلسل ارتباط کی ضامن ہے اور انسانوں کو برائیوں اور نافرمانیوں سے بچا لیتی ہے۔

اور زکوٰۃ ادا کرو (واٰتوا الزکوٰة)۔

وہی زکوٰۃ کہ جو انسانوں کو مخلوقِ خدا سے مربوط کر دیتی ہے، ان کے باہمی فاصلوں کو کم کرنے کے لیے نہایت مؤثر ہے اور جذبات و احساسات کے رشتوں کو مستحکم کرتی ہے۔

اور مجموعی طور پر "ہر چیز میں حکم رسول کے فرماں بردار رہو" (واطیعوا الرسول)

وہ اطاعت کہ جو تمہیں صالح مومنین کے راستے پر لے جائے گی اور زمین پر حکمرانی کے اہل افراد میں شامل کردے گی۔

"تاکہ تم ان احکام پر عمل پیرا ہو کر رحمتِ خدا کے زیرِ سایہ آجاؤ (لعلکم ترحمون)۔ اور حق و عدالت کی حکومت کے علمبرداری کے لائق ہو جاؤ۔

اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ طاقتور ہٹ دھرم دشمن اس راستے میں روڑے اٹکائیں گے اور وعدۂ الٰہی کی تکمیل میں رکاوٹ بنیں گے تو ایسا ہر گز ممکن نہیں ہے کیونکہ اللہ کی قدرت کے سامنے اُن کی طاقت کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا "یہ گمان نہ کرو کہ کافر لوگ اللہ کی سزا سے بھاگ کر اس وسیع زمین میں کہیں فرار کر جائیں گے (لاتحسبن الذین کفروا معجزین فی الارض)۔ یہ لوگ نہ صرف اس دنیا میں خدائی سزا سے محفوظ نہیں ہیں بلکہ آخرت میں "اُن کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ کیسی بُری جگہ ہے" (ومأواھم النار ولبئس المصیر)۔

"معجزین" "معجز" کی جمع ہے جو "اعجاز" کے مادے سے عاجز کرنے کے معنیٰ میں ہے بعض اوقات انسان کسی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس سے بھاگ نکلتا ہے۔ یہ جتنی بھی کوشش کرتا ہے وہ ہاتھ نہیں لگتا یہاں تک کہ وہ اس کی دسترس سے باہر نکل جاتا ہے۔ زیرِ نظر آیت کا یہی مفہوم ہے کہ تم اللہ کے اقتدار قدرت سے باہر نہیں جا سکتے۔

۵۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ
وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۚ مِّن
قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ
الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ۚ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ ۚ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّافُونَ
عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ
الْآيَاتِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

۵۹۔ وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا
اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ
آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

۶۰۔ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ
عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَن يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ
بِزِينَةٍ ۖ وَأَن يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ○

ترجمہ

۵۸۔ اے ایمان والو! جو تمہارے مملوک ہیں اور تمہارے وہ بچے جو ابھی سن بلوغت تک نہیں

پہنچے انہیں تین وقت تمہارے پاس اجازت لے کر آنا چاہیئے۔ نمازِ فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت جب تم اپنا (معمول کا) لباس اُتار دیتے ہو اور نمازِ عشاء کے بعد۔ یہ تین تمہارے خصوصی اوقات ہیں لیکن ان تین اوقات کے علاوہ تمہارے لیے اور ان کے لیے کوئی ہرج نہیں کہ (بلا اجازت آجائیں اور) ایک دوسرے کے گرد جمع ہوں (اور خلوص و محبت سے ایک دوسرے کی خدمت کریں) اللہ اپنی آیات اسی طرح تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

۵۹۔ اور جب تمہارے بچے بالغ ہو جائیں تو انہیں اجازت لینا چاہیئے جیسے اُن سے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں اور اللہ اپنی آیات اسی طرح تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

۶۰۔ اور جو عورتیں جوانی گزار بیٹھی ہوں اور اب نکاح کی امیدوار نہ ہوں اگر وہ اپنی چادریں اُتار رکھیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ لوگوں کے سامنے خود آرائی نہ کریں لیکن اگر وہ پردہ ہی کریں تو اُن کے لیے بہتر ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

والدین کے کمرے میں آنے کے آداب

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ میں سب سے زیادہ زور عفت و پاکدامنی پر دیا گیا ہے اور ہر قسم کی بدکاری اور بے حیائی سے روکا گیا ہے۔ اس موضوع پر مختلف حوالوں اور پہلوؤں سے بات کی گئی ہے۔ زیرِ بحث آیات کا بھی عنوانِ گفتگو یہی ہے۔ ان آیات میں میاں بیوی کے خصوصی کمرے یا خلوت گاہ میں بالغ اور نابالغ بچوں کے داخلے کے آداب بیان کیے گئے ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان لانے والو! جو تمہارے مملوک (اور غلام) ہیں اور اسی طرح تمہارے وہ بچے جو ابھی حدِ بلوغ کو نہیں پہنچے انہیں چاہیئے کہ تین اوقات میں تم سے اجازت لیا کریں (یا ایها الذین اٰمنوا لیستأذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین

لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات)۔

نمازِ فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت جبکہ تم اپنا معمول کا لباس اُتار دیتے ہو اور نمازِ عشاء کے بعد (من قبل صلوٰۃ الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظهیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشاء)۔

" ظهیرۃ " جیسا کہ راغب نے مفردات میں اور فیروز آبادی نے قاموس میں کہا ہے، دوپہر اور حدودِ ظہر کے معنیٰ میں ہے جس وقت عموماً لوگ اپنے اُوپر والے لباس اُتار دیتے ہیں اور بعض اوقات میاں بیوی آپس میں خلوت کرتے ہیں۔

یہ تین اوقات تمہارے لیے پردے کے اور خصوصیت کے اوقات ہیں (ثلاث عورات لکم)۔

"عورہ" "عار" کے مادے "عیب" کے معنی میں ہے اور آلہ جنسی کا ظاہر ہونا چونکہ عیب، شرم اور عار کا باعث ہے اس لیے عربی زبان میں اسے "عورۃ" کہتے ہیں۔

لفظ "عورۃ" بعض اوقات دیوار یا لباس وغیرہ کے سوراخ کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور کبھی مطلق عیب کے معنیٰ ہیں۔

بہرحال ان تین اوقات پر اس لفظ کا اطلاق اس لیے ہوا کہ لوگ ان اوقات میں اپنے آپ کو چھپانے کا باقی اوقات کی طرح اہتمام نہیں کرتے اور ایک خاص حالت میں ہوتے ہیں۔

واضح ہے کہ یہ حکم بچوں کے سرپرستوں کے لیے ہے کہ وہ انہیں ایسا کرنے کے لیے کہیں کیونکہ وہ ابھی بالغ ہی نہیں ہوئے لہٰذا اُن پر شرعی اور الٰہی ذمہ داریاں ابھی عاید نہیں ہوتیں لہٰذا یہاں اُن کے والدین اور سرپرستوں سے خطاب ہے۔

ضمناً واضح رہے کہ آیت کا اطلاق لڑکوں اور لڑکیوں دونوں پر ہوتا ہے۔ آیت میں جمع مذکر کا صیغہ "الذین" آیت کے مفہوم کی عمومیت میں مانع نہیں ہے کیونکہ بہت سے مواقع پر تغلیب کی وجہ سے یہ لفظ سب کے لیے یکساں بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ وجوبِ روزہ والی آیت میں لفظ "الذین" استعمال ہوا ہے جس سے سب مسلمان مراد ہیں (بقرہ۔ ۱۸۳)

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آیت ان بچوں کے بارے میں بات کر رہی ہے جو حدِ تمیز کو پہنچ گئے ہوں اور جنسی امور اور شرم گاہ کے بارے میں کچھ سُوجھ بُوجھ رکھتے ہوں کیونکہ اجازت لینے کا حکم خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس قدر سمجھتے ہیں کہ اجازت لینے کے کیا معنیٰ ہیں اور "ثلاث عورات" کی تعبیر بھی اس مفہوم کے لیے ایک شاہد ہے۔

اب ہم مملوک اور غلاموں کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ کیا یہ حکم اُن میں سے مردوں کے لیے مخصوص ہے یا کنیزوں کے لیے بھی ہے؟ اس سلسلے میں مختلف روایات وارد ہوئی ہیں۔ آیت کا ظاہری مفہوم تو عام ہے اور اس میں دونوں شامل ہیں لہٰذا ہم اُن روایات کو ترجیح دے سکتے ہیں کہ جو ظاہرِ آیت سے مطابقت رکھتی ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تم پر اور اُن پر کوئی گناہ نہیں کہ ان اوقات کے بعد اجازت لیے بغیر آئیں، ایک دوسرے کی خدمت کریں اور (خلوص و محبت کے ساتھ) ایک دوسرے کے پاس جمع ہوں۔ (لیس علیکم ولا علیهم جناح بعدهن طوافون علیکم بعضکم علی بعض)۔

جی ہاں! اللہ اسی طرح اپنی آیتیں تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے (کذٰلك یبین الله لکم الاٰیات والله علیم حکیم)۔

لفظ " طوافون " اصل میں "طواف " کے مادے سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کا گردش کرنا۔ یہاں یہ لفظ چونکہ مبالغے کے صیغے میں آیا ہے اسی لیے اس میں کثرت سے گردش کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد " بعضکم علی بعض " آیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے عبارت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان تین اوقات کے علاوہ تمہیں اجازت ہے کہ ایک دوسرے کے گرد پھرو، آؤ جاؤ اور ایک دوسرے کی خدمت بجالاؤ۔

" کنز العمال " میں فاضل مقداد کے بقول یہ تعبیر درحقیقت باقی اوقات میں اجازت نہ لینے کی دلیل بیان کر رہی ہے کیونکہ اگر ہر وقت آنا جانا ہو اور ہر وقت اجازت لینے کا مسئلہ درپیش ہو تو معاملہ بہت مشکل ہو جائے[1]

اگلی آیت میں بالغوں کے بارے میں حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب تمہارے بچے بالغ ہو جائیں تو ہر وقت اجازت لیا کریں جیسے کہ ان سے بڑے لوگ اجازت لیا کرتے تھے (واذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلھم)۔

لفظ " حلم " (بروزن " کُتُب ") عقل کے معنیٰ میں آیا ہے اور بلوغ کے لیے کنایہ ہے کیونکہ بلوغت کے ساتھ عموماً انسان کو عقلی اور فکری تحرک بھی ملتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ " حلم " خواب دیکھنے کے معنیٰ میں ہے اور چونکہ نوجوان بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے خواب دیکھتے ہیں کہ جو ان کے احتلام کا سبب بنتے ہیں لہٰذا یہ لفظ کنائے کے طور پر بلوغ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

بہرحال اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بالغوں کا حکم نابالغوں سے مختلف ہے کیونکہ گزشتہ آیت کے مطابق نابالغ بچوں کے ذمہ صرف تین اوقات میں اجازت لینا ہے کیونکہ ان کی زندگی اور بود و باش ہی ایسی ہوتی ہے کہ ان کا ماں باپ کے پاس بہت آنا جانا ہوتا ہے اگر ہر وقت وہ اجازت لیں تو مشکل ہو جائے۔ علاوہ ازیں ان کے جنسی احساسات ابھی پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوئے ہوتے لیکن اس سے بعد والی آیت میں بالغ بچوں کے لیے مطلق طور پر اجازت لینا واجب قرار دیا گیا ہے۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر حالت میں ماں باپ کے پاس آتے وقت اجازت لیں۔

یہ حکم اس جگہ اور کمرے کے لیے مخصوص ہے کہ جس میں ماں باپ آرام کر رہے ہوں ورنہ عمومی کمرے میں جہاں دوسرے لوگ بھی ہوں اور کوئی رکاوٹ یا ممانعت بھی نہ ہو، اجازت لینا ضروری نہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ " کما استأذن الذین من قبلھم " کا جملہ ان بڑے افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر وقت ماں باپ کے پاس ان کے کمرے میں جاتے ہوئے اجازت لینے کے ذمہ دار ہیں۔ اس آیت میں جو ابھی نئے سن بلوغ میں داخل ہوئے انہیں ان بڑوں کی طرح اجازت لینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت کے آخر میں بطور تاکید اور مزید توجہ دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے: اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں واضح کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے (کذٰلک یبین اللہ لکم اٰیاتہ واللہ علیم حکیم)۔

یہ تقریباً وہی جملہ ہے جو گزشتہ آیت کے آخر میں بھی آیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں " الاٰیات " تھا اور اس میں

[1] کنز العرفان، ج ۲ ص ۲۲۵

" اٰیاتہ " آیا ہے کہ معنی کے لحاظ سے جس میں کوئی خاص فرق نہیں۔

اس حکم کی خصوصیات اور اس کے فلسفے کے بارے میں ہم " چند اہم نکات " کے ذیل میں بات کریں گے۔

زیر بحث آخری آیت میں عورتوں کے لیے پردے کے حکم میں ایک استثناء بیان کیا گیا ہے۔ عمر رسیدہ بوڑھی عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو عورتیں جوانی گزار بیٹھی ہیں اور شادی کی امیدوار نہیں ہیں ان کے لیے کوئی گناہ نہیں اگر چادر اُتار رکھیں جبکہ لوگوں کے سامنے خود آرائی نہ کریں (والقواعد من النساء الّٰتی لا یرجون نکاحًا فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجات بزینۃ)۔

اس استثناء کے لیے درحقیقت دو شرطیں ہیں:

پہلی یہ کہ وہ اس عمر کو پہنچ جائیں گے اب شادی بیاہ کی امید اور آرزو نہ رکھتی ہوں، دوسرے لفظوں میں ان کے جنسی جذبات بالکل ختم ہو چکے ہوں۔

دوسرا یہ کہ پردہ اُٹھا رکھنے کے بعد بناؤ سنگھار نہ کریں۔

واضح ہے کہ ان دو شرطوں کی موجودگی میں اگر پردہ نہ ہو تو اس میں کوئی برائی نہیں اسی لیے اسلام نے ایسی خواتین کے لیے یہ گنجائش رکھی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ یہاں مراد یہ نہیں کہ انہیں عریاں ہونے کی اجازت مل گئی ہے اور وہ سارا لباس اُتار سکتی ہیں بلکہ صرف اُوپر کا لباس مراد ہے جسے بعض روایات میں برقعے، چادر اور دوپٹے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ روایت کے الفاظ میں:

الجلباب والخمار

یعنی۔ چادر اور دوپٹہ

ایک حدیث میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

الخمار والجلباب، قلت بین یدی من کان؟

قال: بین یدی من کان غیر متبرجۃ بزینۃ

مراد دوپٹہ اور برقعہ ہے۔

راوی کہتا ہے، میں نے پوچھا جس شخص کے سامنے بھی ہو؟

فرمایا: جس کسی کے بھی سامنے ہو البتہ خود نمائی اور بناؤ سنگھار نہ کرے[1]

اس مضمون کی اور اس سے ملتی جلتی متعدد روایات ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں[2]

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اس سب کے باوجود اگر پاکدامنی اختیار کریں اور پردہ کیے رہیں تو ان کے لیے زیادہ بہتر

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۴، کتاب النکاح، ص ۱۴۷ باب ۱۱۰

[2] روایات کے تفصیلی مطالعے کے لیے وسائل الشیعہ کے محررہ بالا باب کی طرف رجوع کریں۔

ہے (وان یستعففن خیر لہن) کیونکہ عورت جس قدر بھی عفت وحجاب کو ملحوظ رکھے اسلام کی نظر میں اسی قدر پسندیدہ ہے
تقویٰ سے اسی قدر قریب ہے۔

ممکن ہے بعض سن رسیدہ عورتیں اس سوچی سمجھی اور جائز آزادی سے غلط فائدہ اٹھائیں اور بعض اوقات مردوں سے غیر مناسب باتوں میں مشغول ہو جائیں یا طرفین کے دل میں گندے خیالات پیدا ہوں لہٰذا آیت کے آخر میں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے (واللہ سمیع علیم)۔ جو کچھ تم کہتے ہو وہ سنتا ہے اور جو کچھ تمہارے دل میں یا دماغ میں ہے اسے جانتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **اجازت لینے کا فلسفہ:** برائی اور بدکاری کی روک تھام اور خاتمے کے لیے صرف مجرموں کو کوڑے لگانا کافی نہیں ہے۔ کسی بھی معاشرتی مسئلے میں اس قسم کا طریقۂ کار مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ فکری تربیت کا اہتمام ہو، اچھی ثقافت کی تعلیم ہو، اخلاقی آداب سکھائے جائیں۔ صحیح اسلامی تعلیمات عام کی جائیں اور ایک پاک صاف صحت مند معاشرہ اور ماحول پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد سزا، حدود اور تعزیرات کو ان عوامل کے ساتھ ایک عامل کی حیثیت سے انتخاب کیا جائے۔

سورہ نور میں اسی لیے یہی روش اختیار کی گئی ہے۔ پہلے تو اس میں زانی عورتوں اور مردوں کی سزا کا ذکر ہے اور پھر اس کے بعد صحیح طریقے سے شادی کے وسائل فراہم کرنے کا حکم ہے، پردے کا بیان ہے، نظر بازی سے منع کیا گیا ہے، تہمت کی ممانعت کی گئی ہے اور آخر میں ماں باپ کی خلوت میں جاتے وقت اولاد کے لیے اجازت لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے مجموعی طور پر یہ عفت و پاکدامنی کی سورت ہے۔

اس قدر تفصیلات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام نے اس مسئلے سے مربوط چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھی غفلت نہیں برتی۔
خدمت گاروں کی ذمہ داری ہے کہ جس کمرے میں بیوی اور شوہر موجود ہیں اُس میں داخل ہوتے وقت اجازت لیں۔
بالغ بچوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بلا اجازت اندر نہ جائیں یہاں تک کہ نابالغ بچے بھی کہ جو ہمیشہ ماں باپ کے پاس ہوتے ہیں کم از کم تین اوقات میں ان سے اجازت لیے بغیر اُن کے کمرے میں نہ جائیں (نمازِ صبح سے پہلے، نمازِ عشاء سے بعد اور دوپہر کے وقت کہ جب ماں باپ آرام کر رہے ہوں)۔

یہ اسلامی آداب ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے میں ان کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا ہے حالانکہ قرآن نے اس سلسلے میں بڑی صراحت سے کام لیا ہے۔

تحریروں، تقریروں اور بیانِ احکام کے وقت بھی بہت کم دیکھا گیا ہے کہ اس اسلامی حکم اور اس کے فلسفے کے بارے میں بات ہوتی ہو۔ معلوم نہیں کہ اس قطعی قرآنی حکم سے کس وجہ سے غفلت برتی جا رہی ہے۔ اگرچہ آیت ظاہراً اعتبار سے اس حکم کا واجب ہونا ظاہر کر رہی ہے لیکن بالفرض اسے مستحب بھی کہا جائے تب بھی اس کے بارے میں گفتگو ہونا چاہیئے اور اس کی تفصیلات پر بات ہونا چاہیئے۔

اس کے برخلاف یہ ہے کہ بعض سادہ لوح افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ چھوٹے بچے ایسے مسائل کی طرف توجہ نہیں دیتے اور خادم وغیرہ بھی ان امور میں نہیں پڑتے لیکن یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ چھوٹے بچے (چہ جائیکہ بڑے) اس مسئلے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔
بعض اوقات ماں باپ غفلت برتتے ہیں اور سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور بچوں کے سامنے ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ جو نہیں کرنا چاہئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بعض اوقات اخلاقی بے راہ روی کا یا نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہم خود ایسے افراد سے ملے ہیں کہ جنہوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس امر سے ماں باپ کی بے توجہی کی وجہ سے اور ماں باپ کو حالتِ خلوت میں مشغول دیکھنے کی بنا پر بچوں میں جنسی جذبات بھڑک اُٹھے یا پھر اُن کے اندر اس قدر شدید نفسیاتی کیفیت اور ماں باپ سے نفرت پیدا ہوئی کہ وہ انہیں قتل کرنے تک پر تل گئے اور بعض اوقات خود بھی خودکشی تک جا پہنچے۔

ایسے ہی مقامات پر اس حکم اسلامی کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے۔ وہ مسائل کہ جن تک آج ماہرین اور دانشور پہنچے ہیں اسلام چودہ سو سال پہلے اپنے احکام میں ان کے بارے میں اپنا مؤقف واضح کر چکا ہے۔

اس مقام پر ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو نصیحت کریں کہ ان آداب و احکام کو سنجیدگی سے اپنائیں اور اپنی اولاد کو اپنے کمرے میں آنے کے لیے اجازت لینے کا عادی بنائیں۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ دوسرے امور کے علاوہ عورت اور مرد کا اس کمرے میں سونا بھی بچوں میں تحریک کا سبب بنتا ہے جس میں تمیز بچے سوئے ہوئے ہوں۔

اس سلسلے میں جتنا ممکن ہو پرہیز کرنا چاہیئے اور یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیئے کہ تربیتی امور میں ان احکام و آداب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ایاکم وان یجامع الرجل امرئتہ والصبی فی المھد ینظر الیھما

جب بچہ گہوارے میں پڑا دیکھ رہا ہو اُس وقت مباشرت نہ کرو[1]

۲۔ **سن رسیدہ عورتوں کے لیے پردے کا حکم:** علماء اسلام کے درمیان اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ عمر رسیدہ عورتیں پردے کے حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ قرآن نے اس سلسلے میں واضح حکم دیا ہے۔ البتہ اس استثنیٰ کی تفصیلات میں اختلاف موجود ہے مثلاً:

ان عورتوں کی عمر کیا ہے اور یہ کہ کس حد تک پہنچ جائیں تو "قواعد" کا لفظ اُن پر صادق آتا ہے، اس میں اختلاف ہے۔
بعض اسلامی روایات میں ان کے لیے لفظ "مسنہ" (سن رسیدہ) استعمال ہوا ہے[2]
جبکہ بعض دوسری روایات میں "قعود از نکاح" کی تعبیر آئی ہے یعنی وہ شادی کے قابل نہ رہی ہوں[3]

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۰۳، صفحہ ۲۹۵

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۴ کتاب النکاح باب ۱۱۰، حدیث ۴

[3] وسائل الشیعہ ج ۱۴ کتاب النکاح باب ۱۱۰ حدیث ۵

لیکن بعض فقہاء اور مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ماہواری کا خاتمہ، بچہ جننے کے قابل نہ رہنا اور کسی کا اس سے نکاح کی خواہش نہ کرنا ہے[1]

لیکن ظاہراً یہ سب تعبیرات ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ کہ عورتیں اس عمر کو پہنچ جائیں کہ جس میں عموماً کوئی عورت شادی نہیں کرتی اگرچہ ممکن ہے شاذونادر ایسا ہو جائے۔

ایسی عورتوں کے لیے کس قدر بدن ظاہر کرنا جائز ہے اس سلسلے میں بھی روایات مختلف ہیں جبکہ قرآن میں اجمالی طور پر فرمایا گیا ہے کہ کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنا لباس اُتار دیں البتہ یہ بات واضح ہے کہ اس سے اوپر والا لباس مراد ہے۔

بعض روایات میں اس سوال کے جواب میں کہ وہ کونسا لباس اُتار سکتی ہیں، امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجلباب

چادر اور برقعہ۔[2]

جبکہ ایک اور روایت میں "جلباب وخمار"[3] کے الفاظ ہیں ("خمار" دوپٹے کو یا اس رومال کو کہتے ہیں جو عورتیں سر پر باندھتی ہیں)۔

ظاہراً ایسی احادیث ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنا سر کھلا رکھیں اور اپنے بال گردن اور چہرہ نہ چھپائیں۔ بعض احادیث اور کلماتِ فقہاء میں ان کی کلائی کو بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے لیکن اس سے زیادہ کے بارے میں استثناء کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

بہرحال یہ سب اس صورت میں ہے کہ وہ خودآرائی نہ کریں (غیر متبرجات بزینة) اور اپنی پنہاں زینتوں کو دوسری عورتوں کی طرح چھپائیں اسی طرح زیب وزینت کے لباس بھی نہ پہنیں۔

دوسرے لفظوں میں اُن کے لیے جائز ہے کہ وہ چادر اور دوپٹے کے بغیر سادہ لباس میں بغیر آرائش کے گھر سے باہر آئیں۔

لیکن اس کے باوجود ایسا کرنا اُن کے لیے ضروری نہیں بلکہ اگر وہ دوسری عورتوں کی طرح پردے کی پابندی کریں تو یہ بہتر ہے جیسا کہ زیر بحث آیت میں بھی اس سلسلے میں صراحت موجود ہے کیونکہ اگرچہ شاذونادر ہی ہو لغزش کا امکان یہاں بھی موجود ہے۔

---

[1] جواہر ج ۲۹ ص۸۵ اور کنز العرفان ج ۲ ص۲۲۶

[2] وسائل الشیعہ کتاب النکاح باب ۱۱۰ حدیث ۱

[3] وسائل الشیعہ کتاب النکاح باب ۱۱۰ حدیث ۲ و ۴

٦١۔ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا
عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن
بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ
بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ
أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا ۚ فَإِذَا دَخَلْتُم
بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ
مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُونَ ○

ترجمہ

۶۱۔ اندھے، لنگڑے اور بیمار شخص کے لیے کوئی حرج نہیں ہے (کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھالے) اور تمہارے لیے بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے گھروں سے (کہ جن میں تمہاری اولاد یا بیویاں رہتی ہیں اور جو تمہارے گھر شمار ہوتے ہیں بغیر خصوصی اجازت کے) کھانا کھالو، اسی طرح تم اپنے باپ دادا یا اپنی ماؤں یا اپنے بھائیوں یا اپنی بہنوں یا اپنے چچاؤں یا اپنی پھوپھیوں یا اپنے ماموؤں یا اپنی خالاؤں کے گھر سے یا اُن گھروں سے کہ جن کی چابی تمہارے پاس ہے

یا اپنے دوستوں کے گھر سے کھا سکتے ہو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم مل جل کر کھاؤ یا علیحدہ علیحدہ اور جب کسی کے گھر میں جاؤ تو اپنے اوپر سلام کرو۔ اللہ کی طرف سے سلام و تحیت، سلام و تحیت کہ جو مبارک پاک و پاکیزہ ہے۔ اللہ تم سے اپنی آیات اس طرح سے بیان کرتا ہے۔ شاید تم سمجھو اور غور و فکر کرو۔

تفسیر

جن گھروں میں جا کر کھانا کھانا جائز ہے

گزشتہ آیات میں معین اوقات میں یا مطلق طور پر ماں باپ کے خصوصی کمرے میں داخل ہوتے وقت اجازت لینے کے بارے میں بات کی گئی تھی۔ زیر بحث آیات میں درحقیقت ایک استثنائی پہلو پر بات کی گئی ہے۔ اس میں ان رشتے داروں اور دیگر لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جن کے ہاں خاص حالات میں جایا جا سکتا ہے اور اجازت لیے بغیر کھانا کھایا جا سکتا ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: اندھے، لنگڑے اور بیمار اشخاص کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر کھا پی لیں (لیس علی الاعمٰی حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج)۔

بعض روایات میں ہے کہ قبولِ اسلام سے پہلے اہلِ مدینہ اندھے، لنگڑے اور بیمار افراد کو اپنے دستر خوان پر بیٹھنے سے منع کرتے تھے اور ان کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ انہیں اس کام سے نفرت تھی۔ ظہور اسلام کے بعد کچھ لوگ ایسے افراد کو الگ کھانا کھلاتے تھے البتہ اس بنا پر نہیں کہ ان کے ساتھ کھانا کھانے سے نفرت کرتے تھے بلکہ اس بنا پر کہ شاید نابینا شخص کھانے کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے اور یہ خود تو کھا لیں مگر وہ نہ کھا سکے اور اسے وہ خلافِ اخلاق و مروت سمجھتے تھے۔ اسی طرح لنگڑے اور بیمار افراد کے بارے میں اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے وہ کھانا کھانے میں پیچھے رہ جائیں اور جو لوگ صحیح سالم ہیں وہ کھا پی لیں بہرحال جو بھی وجہ تھی ان کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس بنا پر، اندھے، لنگڑے اور بیمار افراد بھی اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھتے تھے اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے وہ دوسروں کے لیے باعثِ زحمت ہوں اور اس زحمت دینے کو وہ اپنے لیئے گناہ تصور کرتے تھے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ سے سوال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اور یہ واضح کیا گیا کہ اگر یہ افراد تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھائیں تو کوئی حرج نہیں۔[1]

---

[1] تفسیر در المنثور، تفسیر نور الثقلین زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ ان کے علاوہ بھی بعض مفسرین نے اپنی تفسیر میں یہ روایت درج کی ہے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، مرحوم فیض نے تفسیر صافی میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں شیخ طوسی نے تبیان میں اسے درج کیا ہے۔

البتہ اس جملے کی تفسیر میں مفسرین نے دیگر تفسیریں بھی ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ افراد حکمِ جہاد سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ تمہیں اجازت ہے کہ ایسے معذور اور ناتواں افراد کو اپنے ساتھ ان گیارہ گھروں میں لے جاؤ کہ جن کا ذکر آیت میں آیا ہے اور یہ کہ وہ بھی وہاں سے کھانا کھائیں۔

لیکن یہ دونوں تفسیریں بہت بعید معلوم ہوتی ہیں اور آیت کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ (غور کیجیئے گا)۔

اس کے بعد قرآن مجید مزید کہتا ہے: تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اپنے گھروں سے جہاں تمہاری اولاد یا بیویاں رہتی ہیں کہ جو تمہارے اپنے گھر شمار ہوتے ہیں کھا پی لو (ولا علیٰ انفسکم ان تأکلوا من بیوتکم)۔

یا اپنے باپ دادا کے گھر سے (او بیوت اٰبائکم)۔

یا اپنی ماؤں کے گھر سے (او بیوت امھاتکم)۔

یا اپنے بھائیوں کے گھر سے (او بیوت اخوانکم)۔

یا اپنی بہنوں کے گھر سے (او بیوت اخواتکم)۔

یا اپنے چچوں کے گھر سے (او بیوت اعمامکم)۔

یا اپنی پھوپھیوں کے گھر سے (او بیوت عماتکم)۔

یا اپنے ماموؤں کے گھر سے (او بیوت اخوالکم)۔

یا اپنی خالاؤں کے گھر سے (او بیوت خالاتکم)۔

یا ان گھروں سے جن کی چابی تمہارے پاس ہے (او ما ملکتم مفاتحہ)۔

یا اپنے دوستوں کے گھر سے (او صدیقکم)۔

البتہ اس حکم کی کچھ شرائط اور توضیحات ہیں جنہیں ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارے لیے کوئی مضائقہ نہیں کہ مل کر کھاؤ یا الگ سے (لیس علیکم جناح ان تأکلوا جمیعًا او اشتاتًا)۔

گویا بعض مسلمان ابتدائے اسلام میں علیحدہ کھانا کھانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اگر انہیں کوئی ساتھ مل کر کھانا کھانے والا نہ ملتا تو بعض اوقات عرصے تک بھوکے رہتے۔ قرآن انہیں تعلیم دیتا ہے کہ اجتماعی صورت میں بھی اور الگ سے بھی ہر دو طرح سے کھانا کھانا جائز ہے۔[1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بعض عربوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ وہ مہمان کا کھانا احترام کے طور پر الگ سے کر جاتے تھے اور خود اس کے ساتھ مل کر نہیں کھاتے تھے (تاکہ کہیں وہ شرمندگی محسوس نہ کرے اور آزادی سے نہ کھا سکے)۔ آیت نے ان پابندیوں کو

---

[1] تفسیر تبیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ختم کردیا اور انہیں تعلیم دی کہ یہ کوئی اچھی رسم نہیں ہے[1]

بعض نے کہا ہے کہ کچھ مالدار ایسے تھے کہ جو غریب لوگوں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے اور طبقاتی فاصلہ دسترخوان تک پر ملحوظ رکھتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں اس ظالمانہ روش کی نفی کی ہے[2]

لیکن کوئی حرج نہیں کہ آیت کے پیش نظر یہ تمام امور ہوں۔

اس کے بعد معاشرتی اخلاق کے بارے میں ایک اور حکم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اپنے اوپر سلام کرو۔ اللہ کی طرف سے مبارک پاک و پاکیزہ سلام و تحیت (فاذا دخلتم بیوتا فسلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ)۔

آیت اس جملے پر ختم ہوتی ہے: تمہارے لیے اللہ اس طرح سے اپنی آیات واضح کرتا ہے شاید تم عقل و فکر سے کام لو (کذلک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تعقلون)۔

ان "بیوت" سے کون سے گھر مراد ہیں؟ بعض مفسرین مذکورہ بالا گیارہ گھروں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین نے "بیوت" سے مسجدیں مراد لیا ہے۔

لیکن واضح ہے کہ آیت مطلق ہے اور اس سے تمام گھر مراد ہو سکتے ہیں چاہے وہ مذکورہ گیارہ گھر ہوں کہ جن میں آدمی کھانے کے لیے جاتا ہے یا دیگر رشتے داروں اور دوستوں کے گھر کیونکہ آیت کے وسیع مفہوم کو محدود کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ اپنے اوپر سلام کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بھی متعدد تفاسیر نظر آتی ہیں:

★ بعض نے کہا ہے کہ اس سے کچھ افراد کا دوسروں کو سلام کرنا مراد ہے جیسا کہ سورہ بقرہ آیت ۵۴ کے مطابق بنی اسرائیل کے واقعے میں ہے:

فاقتلوا انفسکم

تم ایک دوسرے کو سزا کے طور پر قتل کرو۔

★ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد بیوی بچوں اور اہل خانہ کو سلام کرنا ہے کیونکہ وہ انسان کی اپنی ذات ہی کی طرح ہیں اس لیے انہیں "انفس" کہا گیا ہے آیت مباہلہ (کہ جو آل عمران کی اکسٹھویں آیت ہے) میں بھی یہ تعبیر دکھائی دیتی ہے اور اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ بعض اوقات ایک شخص دوسرے سے اس قدر نزدیک ہو جاتا ہے گویا خود اس کا نفس ہو گیا یعنی وہی ہو گیا ہو جیسے حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی قریب تھے اور ان کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا۔

★ بعض نے کہا ہے اس سے مراد وہ گھر ہیں کہ جن میں کوئی نہیں رہتا تو انسان کو چاہیئے کہ ان میں داخل ہوتے وقت اپنے آپ کو ان الفاظ میں سلام کرے:

السلام علینا من قبل ربنا

ہم پر ہمارے پروردگار کی طرف سے سلام ہو۔

---

[1] و [2] تفسیر تبیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

یا ان الفاظ میں سلام کرے:

السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین

ہم پر سلام ہو اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ان تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ ہر گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا چاہیئے۔ اہل خانہ ایک دوسرے کو سلام کریں۔ مومنین ایک دوسرے کو سلام کریں اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو پھر اپنے اوپر سلام کریں۔ کیونکہ ہر سلام کا نتیجہ درحقیقت اپنے اوپر ہی سلام ہے۔

اسی لیے امام باقر علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے کہ اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آپؑ سے سوال کیا گیا تو فرمایا:

ھو تسلیم الرجل علی اھل البیت حین یدخل ثم یردون علیہ فھو سلامکم علی انفسکم

اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کسی گھر میں داخل ہو تو اہل خانہ کو سلام کرے۔ وہ جواب سلام دیں گے اور اس پر سلام کریں گے اور یہ گویا تمہارا خود اپنے اوپر سلام کرنا ہے[1]

امام باقر علیہ السلام ہی سے مروی ہے کہ فرمایا

اذا دخل الرجل منکم بیتہ فان کان فیہ احد یسلم علیہ، وان لم یکن فیہ احد فلیقل السلام علینا من عند ربنا یقول اللہ عز وجل تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ

تم میں سے جب کوئی اپنے گھر میں داخل ہو، اگر اس میں کوئی موجود ہے تو اس پر سلام کرے اور اگر کوئی نہ ہو تو کہے: ہم پہ ہمارے پروردگار کی طرف سے سلام۔ جیسا کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے: اللہ کی طرف سے مبارک و پاکیزہ تحیت و سلام[2]

چند اہم نکات

۱۔ کیا کسی کے ہاں سے کھانا کھانے کے لیے اجازت شرط نہیں؟ زیر بحث آیت میں ہم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اجازت دی ہے کہ وہ نزدیکی رشتے داروں اور بعض دوستوں کے ہاں سے کھا پی لے۔ ایسے گیارہ قسم کے گھر گنوائے گئے ہیں۔ آیت میں ان سے اجازت حاصل کرنے کی شرط بھی عائد نہیں کی۔ ویسے بھی یہ بات مسلم ہے کہ یہ اجازت کے ساتھ مشروط نہیں ہے کیونکہ اجازت سے تو پھر کسی کے ہاں سے بھی کھایا جا سکتا ہے اس میں پھر ان گیارہ گھروں کی کیا خصوصیت رہ جائے گی۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا باطنی رضامندی بھی ضروری نہیں کیونکہ ظاہراً معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحب خانہ دل سے راضی ہے

---

[1] و [2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۶۲۶

یا نہیں کیونکہ آدمی کو اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

آیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے جس طرح سے مطلق ہے اس سے تو اس شرط کی بھی نفی ہوتی ہے۔ یہی احتمال کافی ہے
صاحب خانہ راضی ہے۔

لیکن اگر طرفین کے باہمی تعلقات یا کیفیت اس طرح کی ہے کہ راضی نہ ہونے کا یقین ہو تو پھر بعید نہیں کہ ایسے موقع پر حکم
گنجائش ہو خصوصاً جبکہ ایسے مواقع شاذ و نادر ہوتے ہیں اور عموماً مطلق حکم میں ایسے شاذ و نادر امور کا استثنا ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ آیت ایک خاص حد تک ان آیات و روایات کی تخصیص کرتی ہے کہ جن میں دوسروں کے مال میں تصرف کرنے کو ان
کی رضامندی سے مشروط قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہم پھر یہ کہیں گے کہ اس اجازت کی بھی ایک معین حد ہے یعنی ضرورت کے مطابق کھانا کھا
اور اسے ضائع نہ کرنا اور اسراف سے پرہیز کرنا

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے وہ ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور ہے۔ اس کا کچھ حصہ صراحت کے ساتھ روایات میں بھی
آیا ہے۔ ایک معتبر روایت کے مطابق امام صادق علیہ السلام سے "او صدیقکم" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

هو والله الرجل يدخل بيت صديقه فيأكل بغير اذنه

واللہ مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے دوست کے گھر داخل ہو اور بغیر اجازت کے کھانا کھائے[1]

اس سلسلے میں اور بھی متعدد روایات ہیں کہ جن میں فرمایا گیا ہے کہ اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

البتہ فقہاء کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر صراحت سے منع کر دیا جائے یا ناپسندیدگی اور عدم رضامندی
کا علم اور یقین ہو تو پھر جائز نہیں ہے اور ایسے مواقع پر حکم آیت لاگو نہیں ہوتا۔

کھانا کھاتے ہوئے ضائع، خراب اور اسراف نہ کرنے کے بارے میں بعض روایات میں تصریح موجود ہے[2]

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ خاص قسم کی غذا کھانے کی اجازت ہے نہ کہ ہر غذا کو کھایا پیا جا سکتا ہے لیکن فقہاء نے اس
روایت سے اعراض کیا ہے اس لیے اس سے استناد معتبر نہیں ہے۔

بعض فقہاء نے ان اچھے اور بڑھیا کھانوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ جو صاحب خانہ نے کسی خاص مہمان کے لیے یا خاص
موقع کے لیے رکھے ہوں اور آیت کے حکم میں یہ استثنا بعید نہیں ہے[3]

۲۔ اس حکم اسلامی کا فلسفہ: یہ ہو سکتا ہے غصب کے بارے میں اسلام کے واضح اور شدید احکام سے اس
حکم کا موازنہ کیا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ اسلام نے دوسروں کے مال میں تصرف کے بارے میں اتنا سخت مؤقف اختیار کرنے کے
باوجود اس امر کو کیسے جائز شمار کیا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۶ ص۴۳۴ کتاب الاطعمہ والاشربہ، ابواب آداب المائدۃ باب ۲۴ حدیث ۱

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 حدیث ۴

[3] مزید وضاحت کے لیے جواہر الکلام ج ۳۶ ص۴۰۶ (کتاب الاطعمہ والاشربہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ سوال سو فی صد مادی امور پر نظر رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا۔ یہ سوال اس معاشرے سے متعلق ہے جو آج
کے مغربی ممالک کے ماحول کی طرح ہو کہ جہاں اپنی حقیقی اولاد کو کچھ بڑا ہو جانے پر گھر سے نکال دیا جاتا ہے اور ان کے کسی حق کا
احترام نہیں کیا جاتا اور نہ ان سے کوئی اظہار محبت کیا جاتا ہے کیونکہ وہاں تمام مسائل مادی اور اقتصادی محور کے گرد چکر لگاتے ہیں اور
انسانی احساسات کا وہاں نام و نشان تک نہیں ہے لیکن مغربی تہذیب کی جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر ایسا ہونا کوئی باعث تعجب
نہیں لیکن اسلامی تہذیب اور سماجی نظام میں انسانی احساسات کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ خاص طور پر قریبی رشتہ داروں اور خاص
دوستوں کے بارے میں اسلام بہت حساس ہے اسلام کی نظر میں قرابت داری اور دوستی کے رشتے ان مادی حوالوں سے بہت بلند ہیں
یہ رشتے اسلام کی نظر میں بہت مقدس ہیں۔ اسلام تنگ نظری، خود غرضی اور خود پرستی سے معاشرے کو پاک کر دینا چاہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غصب کے بارے میں اسلامی احکام ان حدود سے باہر ہیں۔ اسلام نے ان خاص حالات میں انسانی
رشتوں اور احساسات کو غصب کے احکام پر مقدم شمار کیا ہے۔

۳۔ "صدیق" سے کون مراد ہے؟ اس میں شک نہیں کہ دوستی کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ یہاں "صدیق" سے مراد
خاص اور قریبی دوست ہیں۔ جن کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہے۔ جن کے درمیان قریبی تعلقات اور روابط کا تقاضا ہے کہ
وہ ایک دوسرے کے ہاں آئیں جائیں اور ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھائیں۔ یہاں تک کہ اس میں اجازت شرط نہیں ہے صرف
اتنا کافی ہے کہ یقین ہو کہ اس پر ان کی عدم رضامندی نہیں ہے۔

اسی لیے اس جملے کے ذیل میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد ایسا دوست ہے کہ جو اپنی دوستی میں مخلص اور سچا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا دوست ہے کہ جو آپ سے ظاہر و باطن میں ایک جیسا ہو۔

ظاہراً ان سب تفسیروں کا ایک ہی مفہوم نکلتا ہے۔

مناسب ہے کہ اس مقام پر دوستی کے مفہوم اور اس کی مکمل شرائط امام صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھیں۔ آپؑ
فرماتے ہیں:

لا تكون الصداقة الا بحدودها، فمن كانت فيه هذه الحدود او شيء منها فانسبه
الى الصداقة ومن لم يكن فيه شيء منها فلا تنسبه الى شيء من الصداقة.

فاولها ان تكون سريرته وعلانيته لك واحدة

والثاني ان يرى زينك زينه و شينك شينه

والثالثة ان لا تغيره عليك ولاية ولا مال،

والرابعة ان لا تمنعك شيئاً تناله مقدرته

والخامسة وهي تجمع هذه الخصال ان لا يسلمك عند النكبات۔

دوستی کی کچھ حدود و شرائط ہیں جن کے بغیر دوستی کا کوئی مفہوم نہیں۔ جس شخص میں یہ شرائط یا ان کا کچھ
حصہ ہو اسے دوست سمجھو اور جس میں ان شرائط اور خصوصیات میں سے کوئی بھی نہ ہو اس میں دوستی والی کوئی

بات نہیں۔

دوستی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تیرے وقار اور آبرو کو اپنا وقار اور آبرو سمجھے۔ اور تیری برائی اور نقصان
کو اپنی برائی اور نقصان سمجھے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ مقام و منصب اور مال و دولت کی وجہ سے وہ تجھ سے برتاؤ میں تبدیلی
نہ کرے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ جو کچھ اُس کے اختیار میں ہو اس میں تیرے لیے دریغ نہ کرے۔

اور پانچویں شرط کہ جس میں یہ تمام شرطیں جمع ہیں یہ ہے کہ جب زمانہ تجھ سے منہ موڑلے وہ
تجھے تنہا نہ چھوڑے[1]

۴۔ **مَا مَلَکْتُم مَّفَاتِحَہٗ کی تفسیر:** متعدد شان ہائے نزول میں آیا ہے کہ صدرِ اسلام میں جب مسلمان جہاد پر جاتے تھے تو کبھی کبھار اپنے گھر کی چابی ایسے افراد کو سونپ جاتے تھے جو معذور ہونے کے باعث جہاد پر نہیں جا سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنہیں یہ اجازت بھی دے جاتے کہ گھر میں موجود غذا بھی وہ کھا سکتے ہیں اور لیکن وہ کبھی اس خوف سے کہ کہیں گناہ نہ ہو کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔

ان روایات کے مطابق "مَا مَلَکْتُم مَّفَاتِحَہٗ" (وہ گھر کہ جن کی چابیوں کے تم مالک ہوئے ہو) سے یہی مراد ہے۔[2]
ابن عباس سے بھی منقول ہے کہ اس سے مراد انسان کا وکیل اور نمائندہ ہے اور یہ وکالت پانی، جائداد، زراعت اور پالتو جانوروں میں ہوتی ہے۔ اس نمائندے کو اجازت دی گئی ہے کہ باغ کے پھلوں میں سے ضرورت کے مطابق کھائے اور جانوروں کا دودھ پی لے۔

بعض نے اس سے گودام کا نگران مراد لیا ہے کہ جو حق رکھتا ہے کہ وہ غذا میں سے کھا لے۔
لیکن جن لوگوں کے نام اس آیت میں لیے گئے ہیں انہیں نظر میں رکھیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ افراد ہیں کہ جنہیں ان کے قریبی عزیز اعتماد اور تعلق کی بناء پر اپنے گھر کی چابی سپرد کر دیتے ہیں۔ یہ قریبی ربط و تعلق اس بات کا سبب بنا کہ رشتہ داروں اور دوستوں کی فہرست میں انہیں بھی شمار کیا جائے۔
بعض روایات کے مطابق اس سے مراد وہ وکیل ہے کہ جسے اموال کی سرپرستی سونپی جاتی ہے۔ یہ تفسیر درحقیقت اس جملے کا ایک مصداق ہے۔

۵۔ **سلام و تحیّت:** جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "تحیۃ" بنیادی طور پر "حیات" کے مادہ سے ہے۔ یہ لفظ

---

[1] اصولِ کافی، ج ۲ ص ۶۳۹

[2] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں (وسائل الشیعہ ج ۱۶ ص ۴۳۶ باب ۲۴ از ابواب مائدۃ میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث موجود ہے)۔

سلامتی کے لیے اور دوسری زندگی کے لیے دُعا کرنے کا مفہوم رکھتا ہے۔ چاہے یہ دعا "سلام علیکم" یا "السلام علینا" کی شکل میں ہو چاہے "حیاک اللہ" کی صورت میں لیکن عام طور پر ہر قسم کے اس اظہار محبت کو "تحیت" کہتے ہیں کہ جو ابتدائے ملاقات میں لوگ ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

"تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ" سے مراد یہ ہے کہ "تحیۃ" کا ایک طرح سے اللہ سے رابطہ ہونا چاہیئے یعنی "سلام علیکم" سے مراد یہ کہ "اللہ کا تم پر سلام ہو" "اللہ تمہیں سلامت رکھے" کیونکہ کوئی مؤحد اور خدا پرست جب بھی کوئی دُعا مانگتا ہے تو آخر کار وہ اللہ ہی سے ہوتی ہے اور اسی سے درخواست ہوتی ہے۔ فطری بات ہے کہ جو دعا ایسی ہو وہ مبارک بھی ہے اور پاک و طیب بھی۔

(سلام اور اس کی اہمیت اور ہر قسم کے سلام و تحیت کے جواب کے وجوب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد دوم میں سورہ نساء کی آیت ۸۶ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں)۔

۶۲- اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا
كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى
يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ
شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
۶۳- لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ
بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ
لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ
تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝
۶۴- اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ
مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ
فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۶۲- حقیقی مومن وہ ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہوں اور جس وقت کسی اہم کام میں اُس کے ساتھ ہوں تو اس کی اجازت کے بغیر کہیں نہ جائیں۔ (اے رسول!) جو

لوگ تجھ سے اجازت لیتے ہیں وہ سچ مچ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔ للذا اس صورت میں جب وہ تجھ سے اپنے بعض کاموں کے لیے اجازت مانگیں تو ان میں سے جسے تو چاہے (اور مصلحت دیکھے) اجازت دے دے اور ان کے لیے استغفار کر کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

۶۳- اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کی طرح نہ سمجھو۔ اللہ تم میں سے ان افراد کو جانتا ہے کہ جو ایک دوسرے کی آڑ لے کر یکے بعد دیگرے بھاگ جاتے ہیں۔ جو لوگ اس کے فرمان کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیئے کہ کہیں انہیں کوئی فتنہ نہ آئے یا انہیں دردناک عذاب نہ آپہنچے۔

۶۴- آگاہ رہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کے لیے ہیں۔ وہ تمہاری ہر روش کو جانتا ہے۔ جس روز وہ اللہ کی طرف لوٹ کر جائیں گے وہ انہیں ان کے انجام کردہ افعال بتائے گا اور اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول :

زیر نظر پہلی آیت کے بارے میں مفسرین نے مختلف شان ہائے نزول نقل کی ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت حنظلہ بن ابی عیاش کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس رات شادی کرنا چاہتے تھے اُس سے اگلے دن جنگ اُحد برپا ہوئی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے جنگ کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے کہ وہ آپؐ کے پاس آئے اور عرض کی کہ اگر رسول اللہ اجازت دیں تو یہ رات میں اپنی بیوی کے ساتھ گزار لوں۔ آنحضرتؐ نے انہیں اجازت دے دی۔

صبح کے وقت انہیں جہاد میں شرکت کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ وہ غسل بھی نہ کر سکے۔ اسی حالت میں معرکۂ کارزار میں شریک ہو گئے اور بالآخر جامِ شہادت نوش کیا۔

رسول اللہؐ نے اُن کے بارے میں ارشاد فرمایا :

میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔

اسی لیے انہیں "حنظلۃ" کو "غسل الملائکہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[1]

ایک اور شان نزول یں ہے کہ یہ آیت جنگ خندق کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

پیغمبر اکرمؐ تمام مسلمانوں کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ مدینے کے اطراف میں خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ کچھ منافقین کہ جو ظاہراً مسلمانوں کی صف میں تھے بہت آہستہ آہستہ کام کر رہے تھے۔ وہ لوگ جب دیکھتے کہ مسلمان متوجہ نہیں ہیں تو رسول اللہؐ سے اجازت لیے بغیر چپکے سے اپنے گھروں کو چلے جاتے لیکن اگر حقیقی مسلمانوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں آکر اجازت لیتے اور کام انجام دے کر فوراً واپس آجاتے اور خندق کھودنے میں مشغول ہو جاتے تاکہ اس کار خیر میں وہ پیچھے نہ رہ جائیں۔

یہ آیت پہلے گروہ کی مذمت اور دوسرے کی تعریف کر رہی ہے[2]

تفسیر

رسول اللہؐ کو تنہا نہ چھوڑو

ان آیات کا گزشتہ آیات سے کیا ربط ہے؟ اس سلسلے میں طبرسی نے مجمع البیان میں اور سید قطب نے تفسیر فی ظلال میں اور بعض دیگر مفسرین نے کہا کہ گزشتہ آیات میں دوستوں اور رشتے داروں سے معاشرت کے بارے میں احکام تھے اور ان آیات میں رسول اکرمؐ سے مسلمانوں کی معاشرت کے بارے میں احکام ہیں۔ ان میں مسلمانوں کو اس سلسلے میں نظم و ضبط کی پابندی کرنے کے لیے کہا گیا ہے تاکہ وہ تمام امور میں رسول اللہؐ کی طرف توجہ رکھیں اور اہم کاموں میں ضرورت اور اجازت کے بغیر الگ نہ ہوں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ چند پہلی آیتوں میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے لازمی ہونے کے بارے میں گفتگو تھی اور اطاعت کے تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی اجازت اور حکم کے بغیر کوئی کام نہ کیا جائے لہٰذا زیر بحث آیات میں اس کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

بہرحال زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: حقیقی مومن تو وہ ہیں کہ جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور جب کسی اہم کام میں ان کے ساتھ ہوں تو اجازت لیے بغیر کہیں نہیں جاتے (انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللہ و رسولہ و اذا کانوا معہ علٰی امر جامع لم یذھبوا حتّٰی یستاذنوہ)۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم کے حوالے سے نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۶۲۵ پر یہ شان نزول نقل کی گئی ہے۔

[2] تفسیر فی ظلال، ج ۶ صفحہ ۱۲۶، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

"امر جامع" سے مراد ایسا اہم کام ہے کہ جس میں لوگوں کا جمع ہونا ضروری ہو اور اس میں تعاون اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کی ضرورت ہو۔ چاہے کسی اہم مسئلے پر غور و خوض اور مشاورت کا مسئلہ ہو چاہے جہاد اور دشمنوں سے جنگ کا مسئلہ ہو یا اہم حالات میں نماز جمعہ کا اجتماع ہو یا ایسا ہی کوئی اور اہم کام۔ لہٰذا یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مفسرین نے اس سے مراد کوئی اہم مشورہ لیا ہے بعض نے جہاد، بعض نے نماز جمعہ اور بعض نے نماز عید تو یہ سب آیت کا ایک مصداق ہیں اور مذکورہ بالا شان ہائے نزول بھی اس کلی حکم کا مصداق ہیں۔

درحقیقت یہ نظم و ضبط اور ڈسپلن کے بارے میں ایک حکم ہے اس سے کوئی منظم جماعت بے اعتنائی نہیں کر سکتی کیونکہ ایسے مواقع پر بعض اوقات ایک فرد کا بھی غائب ہو جانا بہت گراں اور نقصان دہ ہوتا ہے اور اصل مقصد کو نقصان پہنچتا ہے خصوصاً اگر جماعت کا رہبر فرستادۂ خدا اور اللہ کا رسول اور روحانی رہبر ہو کہ جس کا حکم واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اجازت لینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ جس شخص کو بھی کوئی کام ہو وہ بس ایک ظاہری سی اجازت لے لے اور اپنے کام کے پیچھے چل پڑے بلکہ مراد یہ ہے کہ واقعاً اجازت لے یعنی اگر رہبر اس کی عدم موجودگی کو نقصان دہ نہ سمجھے اور اسے اجازت دے تو وہ جائے ورنہ وہیں رہے اپنے ذاتی کام کو بڑے مقصد پر قربان کر دے۔

لہٰذا اس جملے کے بعد فوراً فرمایا گیا ہے: "جو لوگ تجھ سے اجازت چاہتے ہیں اور سچ مچ اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں" اور ان کا ایمان صرف زبانی نہیں ہے بلکہ دل و جان سے تیرے فرماں بردار ہیں (ان الذین یستاْذنونک اولٰئک الذین یؤمنون باللہ و رسولہ)۔ تو اس صورت میں اُن میں سے تو جس شخص کو چاہے (اور مصلحت دیکھے) اجازت دے دے (فاذا استاْذنوک لبعض شاْنھم فاْذن لمن شئت منھم)۔

واضح ہے کہ ایسے باایمان افراد اس امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ وہ ایک اہم کام کے لیے جمع ہوئے ہیں لہٰذا وہ کسی معمولی سے کام کے لیے اجازت طلب نہیں کرتے اور "شاْنھم" سے مراد ضروری اور اہم کام ہی ہے۔

دوسری طرف رسولؐ کے چاہنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ حالات کو تمام پہلوؤں سے مدّنظر رکھے بغیر لوگوں کی موجودگی اور عدم موجودگی کے اثرات کو دیکھے بغیر اجازت دے دیں بلکہ یہ لفظ اس بات کا غماز ہے کہ رہبر کو اختیار ہے کہ جب وہ محسوس کرے کہ لوگوں کا حاضر رہنا ضروری ہے تو وہ انہیں اجازت نہ دے۔

اس بات کی گواہ سورہ توبہ کی آیت ۴۳ ہے جس میں بعض افراد کو اجازت دینے پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتّٰی یتبین لک الذین صدقوا و تعلم الکاذبین

اللہ نے اس بات سے صرف نظر کیا ہے کہ تو نے انہیں بغیر سچوں اور جھوٹوں میں تمیز کیے ہوئے کیوں اجازت دی۔

یہ آیت نشان دہی کرتی ہے کہ رسول کو بھی لوگوں کو اجازت دیتے وقت غور و خوض کرنا چاہیے اور معاملے کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے اور اس سلسلے میں اُن پر اللہ کی طرف سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جب تو انہیں اجازت دیتا ہے تو ان کے لیے استغفار کر کہ اللہ غفور و رحیم ہے"

(واستغفر لهم الله ان الله غفور رحیم)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ استغفار کس لیے ہے؟ کیا وہ پیغمبر اکرمؐ سے اجازت لینے کے باوجود گنہگار ہیں جس کی وجہ سے استغفار کے محتاج ہیں؟

اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے۔

(۱) اگرچہ وہ چلے جانے کے مجاز ہیں پھر بھی انھوں نے اپنے ذاتی کام کو مسلمانوں کے اجتماعی کام پر ترجیح دی ہے۔ ایسا کرنا ترک اولیٰ تو ضرور ہے[1] اسی لیے وہ استغفار کے محتاج ہیں (جیسے ایک مکروہ کام پر استغفار کی جاتی ہے)۔

ضمناً یہ تعبیر نشان دہی کرتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اجازت طلب کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے اور ایثار و قربانی سے کام لینا چاہیئے اور انہیں ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اجازت لینے کے بعد بھی ان کا عمل ترک اولیٰ ہے اور یہ امر اس لیے بھی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جزوی اور ذاتی امور میں لوگ اہم کاموں کو ترک کرنے کے لیے اجازت کو بہانہ ہی بنا لیں۔

(۲) وہ اپنے رہبر کے حضور آداب کو ملحوظ رکھنے کی بناء پر لطف الٰہی کے حق دار ہیں اور رسول اللہ کا اُن کے لیے استغفار کرنا ایک طرح سے اظہارِ تحسین و تشکر ہے[2]

البتہ یہ دونوں جواب آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں مراد ہوں۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ نظم و ضبط کے بارے میں یہ اہم حکم صرف رسول اکرمؐ اور ان کے اصحاب کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام ہادیانِ الٰہی کے بارے میں یہی حکم ہے۔ چاہے وہ نبی ہوں، امام ہوں یا ایسے علماء کہ جو اُن کے جانشین ہیں۔ کیونکہ اس حکم میں اسلامی معاشرے کے نظام کا تحفظ مضمر ہے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید کے حکم کے علاوہ عقل و منطق کا بھی یہی تقاضا ہے کیونکہ اصلی طور پر کوئی بھی نظام اس اصول کے احترام کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور صحیح نظام اور ادارہ سازی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض مشہور علماء اہل سنت نے اس آیت کو جوازِ اجتہاد اور حکم کو مجتہد کی رائے پر چھوڑنے کی دلیل سمجھا ہے لیکن کہے بغیر واضح ہے کہ اصول و فقہ میں جو اجتہاد کیا جاتا ہے وہ احکام شریعت کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ موضوعات کے ساتھ۔ موضوعات میں اجتہاد کرنا قابلِ انکار نہیں ہے۔ ہر لشکر کا کمانڈر، ماہر ادارے کا سربراہ اور ہر گروہ کا سرپرست احکام کے اجراء کے موقع پر اور موضوعات خارجی میں رائے دے سکتا ہے اور اس کی یہ رائے محترم ہے لیکن یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ شریعت کے کلی احکام میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ مصلحت کے نام پر حکم وضعی یا حکم تکلیفی کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد اتباع پیغمبرؐ سے مربوط ایک اور حکم دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے پیغمبر کی پکار اور بلانے کو تم ایسا نہ سمجھو جیسے

---

[1] تفسیر فخر رازی، روح المعانی اور تفسیر قرطبی۔ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو (لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضًا)۔ وہ کسی مسئلے میں جب تمہیں بلائیں تو یقیناً یہ ایک اہم الٰہی اور دینی مسئلہ ہے لہٰذا اسے اہمیت دو اور سنجیدگی سے اُنؐ کے حکم پر ڈٹ جاؤ۔ اُن کی پکار کو معمولی نہ سمجھو کیونکہ ان کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اور ان کی دعوت پروردگار کی دعوت ہے۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے: جو لوگ رسول کے اہم کاموں سے الگ ہو کر ایک دوسرے کی اوٹ لے کر یکے بعد دیگرے بھاگ جاتے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے اور انہیں دیکھتا ہے (قد یعلم الله الذین یتسللون منکم لواذًا)۔ لیکن جو لوگ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیئے کہ کہیں فتنے میں گرفتار ہو جائیں یا دردناک عذاب انہیں آ لے (فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنة او یصیبھم عذاب الیم)۔

"یتسللون" "تسلل" کے مادے سے ہے۔ اس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو اس کی جگہ سے الگ کرنا۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

سل السیف من الغمد

اس نے تلوار نیام سے نکالی

جو لوگ چپکے سے کسی جگہ سے بھاگ جائیں عموماً انہیں "متسللون" کہا جاتا ہے۔

"لواذًا" "ملاوذہ" سے چھپنے کے معنیٰ میں ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کے عمل کے معنیٰ میں ہے جو ایک دوسرے کے پیچھے یا کسی دیوار کی اوٹ میں چھپتے ہیں۔ گویا دوسرے کو غفلت میں پا کر بھاگ جاتے ہیں۔ یہ وہ کام تھا کہ جو منافقین انجام دیتے تھے جبکہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کو جہاد یا کسی اور اہم کام کے لیے بلاتے تھے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ تمہارا یہ قبیح اور منافقانہ عمل اگر لوگوں کی نظر سے چھپا بھی رہ جائے تو خدا سے مخفی نہیں رہتا اور پیغمبرِ خدا کے حکم سے تمہاری ان سرتابیوں کی دنیا و آخرت میں دردناک سزا ہے۔

یہ کہ یہاں "فتنة" سے کیا مراد ہے۔ بعض مفسرین اسے قتل کے معنیٰ میں لیتے ہیں، بعض گمراہی کے اور بعض ظالم و جابر حکمران کے تسلط کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد نفاق کی مصیبت ہے کہ جو آدمی کے دل میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فتنة" سے مراد اجتماعی فتنے، مصیبتیں، شکستیں اور آفتیں ہوں کہ جو حکمِ رہبر کی مخالفت کے باعث معاشرے کو دامن گیر ہوتی ہیں۔

بہرحال "فتنة" کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ جس میں یہ تمام امور بھی شامل ہیں اور ان کے علاوہ بھی۔

اسی طرح "عذاب الیم" ممکن ہے عذابِ دنیا کی طرف اشارہ ہو یا عذابِ آخرت کی طرف یا دونوں کی طرف۔

یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیت کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کے علاوہ بھی دو احتمال ذکر ہوئے ہیں:

پہلا یہ کہ "لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضًا" سے مراد یہ ہے کہ جس وقت تم رسول کو پکارتے ہو تو ادب و احترام کے ساتھ اور اُن کے شایانِ شان انداز سے پکارو نہ کہ اس طرح جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ یہ اس لیے فرمایا گیا کیونکہ بعض ایسے لوگ جو اسلامی آداب سے ناآشنا تھے وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں آتے تو لوگوں کے سامنے یا تنہائی میں "یا محمد" "یا محمد" کہتے اور یہ اندازِ تخاطب ایک عظیم الٰہی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھا۔

مقصد یہ ہے کہ آنحضرت کو "یا رسول اللہ" اور "یا نبی اللہ" جیسے الفاظ کے ساتھ اور معقول اور مؤدبانہ لہجے میں پکارا جا
بعض روایات میں بھی یہ تفسیر موجود ہے لیکن گزشتہ آیت اور خود اس آیت میں ایسی تعبیرات ہیں کہ جو دعوت پیغمبرؐ کو قبول کر
اور اُن کے پاس سے بلا اجازت غائب نہ ہو جانے کی بابت گفتگو کرتی ہیں، اس لحاظ سے یہ تفسیر ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں
ہے۔ ہاں البتہ یہ تفسیر جب ممکن ہے کہ ہم کہیں کہ یہ دونوں مطالب آیت کے مفہوم میں جمع ہیں۔

دوسرا احتمال بھی ہے کہ جو بہت ضعیف معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ کی دعا یا بددعا کو آپس میں ایک دوسرے کی دعا اور
بددعا کی طرح نہ سمجھو[1] کیونکہ آپؐ کی دعا اور بددعا بہت سوچی سمجھی اور کسی صحیح بنیاد پر ہوگی اور خدائی پروگرام کے مطابق ہوگی اور مسلماً
پوری بھی ہوگی۔

لیکن یہ تفسیر آیت کے مطالب و معانی سے مطابقت نہیں رکھتی اور اس کے بارے میں کوئی روایت بھی نہیں — لہٰذا
قابلِ قبول نہیں ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ علماء اصول نے "فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ..." سے یہ بھی استفادہ کیا ہے کہ
رسول اللہؐ کے اوامر اور احکام واجب ہیں۔

لیکن اس استدلال پر بہت سے اشکالات ہوتے ہیں کہ جن کی طرف علمِ اصول میں اشارہ ہوا ہے۔

زیر بحث آخری آیت سورۂ نور کی بھی آخری آیت ہے۔ یہ آیت مبداء اور معاد کی طرف ایک لطیف اور معنی خیز اشارہ ہے
کہ جو تمام الٰہی احکام کی بنیاد ہیں۔ یہی عقائد درحقیقت تمام اوامر و نواہی کے اجراء کے ضامن ہیں اور ان میں وہ اوامر و نواہی بھی شامل ہیں کہ
جو اس سورہ میں اوّل تا آخر آئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: آگاہ رہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کچھ اللہ کے لیے ہے (الا ان للّٰہ ما فی السماوات والارض)۔
وہ خدا کہ جس کا علم پورے عالم پر محیط ہے اور "جس میں تم ہو وہ اسے جانتا ہے" (تمہاری روش، تمہارے اعمال، تمہارے
عقیدے اور تمہاری نیتیں سب اس پر آشکار ہیں) (قد یعلم ما انتم علیہ)۔
اور جو کام بھی تم انجام دیتے ہو اس کے صفحۂ علم پر ثبت ہیں "اور جس روز سب انسان اس کی طرف لوٹ جائیں گے اس روز وہ
انہیں ان کے انجام دیے ہوئے اعمال سے آگاہ کرے گا" اور ان کا نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ انہیں دے گا (و یوم یرجعون الیہ
فینبئھم بما عملوا)۔ اور اللہ ہر چیز کا عالم اور ہر امر سے آگاہ ہے (واللّٰہ بکل شیء علیم)۔
یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں تین مرتبہ یہ بات آئی ہے کہ انسانوں کے اعمال خدا کے علم میں ہیں اور یہ اس لیے
ہے کہ جب انسان کو احساس ہو کہ ہر وقت کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے اور اس کے ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ اس سے مخفی نہیں ہے

---

[1] لفظ "دعاء" کے بعد اگر لفظ "لام" ہو تو کسی کے حق میں دعائے خیر کے معنی میں ہے اور اگر "علیٰ" ہو تو نفرین اور بددعا کے معنی میں ہے
اور اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو پھر دونوں کا احتمال ہے۔

تو یہ اعتقاد اُس کی تربیت کے لیے بہت پُر تاثیر ہوگا اور اسے گناہوں سے بچائے رکھے گا۔

بارالٰہا! ہمارے دلوں کو چراغ علم و ایمان کے نور سے منوّر فرما دے اور ہمارے وجود کی "مشکوٰۃ" کو حفظِ ایمان کے لیے تقویت دے تاکہ تیرے انبیاء کے "صراطِ مستقیم" پر چلتے ہوئے ہم تیری رضا کی طرف روانہ ہوں اور "لا شرقیۃ و لا غربیۃ" کا مصداق بن کر ہم تیرے لطف و کرم کے زیر سایہ ہر قسم کے انحراف اور کج روی سے محفوظ رہیں۔
پروردگارا! ہماری آنکھ کو نورِ عفت سے، ہمارے دل کو نورِ معرفت سے، ہماری روح کو نورِ تقویٰ سے اور ہمارے سارے وجود کو نورِ ہدایت سے منوّر فرما دے اور ہمیں بے راہ روی، غفلت اور شیطانی وسوسوں کے چنگل میں گرفتار ہونے سے محفوظ رکھ۔
خداوندا! اپنے احکام کے اجراء کے لیے حکومتِ عدلِ اسلامی کی بنیادوں کو مستحکم کر دے اور ہمارے معاشرے کو بُرائیوں اور غلاظتوں کے گڑھے میں گرنے سے محفوظ رکھ۔

انک علیٰ کل شیءٍ قدیر

سورہ نور کی تفسیر اور تفسیر نمونہ کی
چودھویں جلد کا اختتام
۲۷ ربیع الاوّل ۱۴۰۳ھ

حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر گارسنگ روڈ پرسٹن لنکا شائر انگلستان کے دفتر میں تفسیر نمونہ جلد ۱۴ کا ترجمہ ۸ شعبان المعظم ۱۴۰۵ ہجری بمطابق ۹ مئی ۱۹۸۵ء جمعرات کو صبح آٹھ بجے ختم ہوا
البتہ ترجمہ کا زیادہ حصہ سیٹھ نوازش علی کے مکان ۱۸ راوی ماڈل ٹاؤن لاہور میں مکمل ہوا اور کچھ حصہ ایڈنبرا یو کے کے نواح میں موصوف ہی کے فارم پر اس حقیر پُر تقصیر سید صفدر حسین فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوا۔
والحمد للّٰہ اوّلاً و آخراً والصلوٰۃ علیٰ محمد و آلہ سرمداً دائماً
سید صفدر حسین

سُورۂ فرقان

مکّہ میں نازل ہوئی

اس میں ۷۷ آیتیں ہیں

سُورۂ فرقان کے مضامین

یہ سورت مکّی ہے [۱] لہٰذا اس کی زیادہ تر بحث مبداء و معاد اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں ہے اس کے علاوہ یہ شرک و مشرکین کے ساتھ نبرد آزمائی کرتی ہے اور کفر و بُت پرستی اور گناہوں کے خطرناک انجام سے ڈراتی ہے۔

یہ سورت درحقیقت تین حصّوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصّہ جو اس کے آغاز پر مشتمل ہے مشرکین کے دلائل کی سختی کے ساتھ سرکوبی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حیلہ سازیوں کو بیان کرتا اور پھر ان کا جواب بھی دیتا ہے اور انھیں خدا کے عذاب، قیامت کے حساب وکتاب اور جہنم کی دردناک سزا سے ڈراتا ہے اور اس کے بعد گزشتہ اقوام کی سرگزشت کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ انبیاء کی دعوت کی مخالفت کر کے زبردست عذاب اور بلا میں گرفتار ہوئے اور ان کی داستانیں، حق کے دشمن اور ہٹ دھرم مشرکین کے لیے کس طرح درس عبرت ہیں۔

دوسرے حصّے میں مندرجہ بالا مباحث کی تکمیل کی صورت میں توحید کے کچھ دلائل اور عالمِ آفرینش میں عظمتِ خداوندی کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ان نشانیوں میں سورج کی روشنی، رات کی تاریکی، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا، زمین اور آسمانوں کا چھ دوروں میں پیدا ہونا، سورج اور چاند کی خلقت، ان کی آسمانی بُرجوں میں منظم گردش اور اس قسم کی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ درحقیقت پہلا حصّہ "لَآ اِلٰہَ" اور دوسرا "اِلَّا اللہ" کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔

تیسرے حصّے میں عباد الرحمٰن خدا کے خاص بندوں اور سچے مومنین کے اوصافِ حمیدہ کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا گیا اور پہلے حصّے میں ذکر شدہ متعصب، بہانہ جو اور گناہوں سے آلودہ کفار کے ساتھ ان کا موازنہ کیا گیا اور دونوں گروہوں کے مقام انجام کو ایک دوسرے سے جُدا کر کے نمایاں کیا گیا ہے۔ نیز جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ مومنین کی یہ صفات ان کے اعتقادات صالح، خواہشاتِ نفسانی کے خلاف ان کے جہاد، ان کے علم و آگہی اور اجتماعی حوالے سے ان کے احساسِ ذمہ داری کا مجموعہ ہیں۔

اس سورہ کا نام "فرقان" اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ نام اسی سُورت کی پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے۔ جس کا معنی حق کو باطل سے جُدا کرنے والا۔

---

[۱] بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ اس سورت کی تین آیتیں (۶۸ تا ۷۰) مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں شاید اس لیے کہ ان میں قتلِ نفس اور زنا کی احکام کا تذکرہ ہے لیکن اگر ان کے سیاق و سباق پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ خدا کے خاص بندوں (عباد الرحمٰن) اور کے ایک سلسلۂ بیان سے متصل اور متعلق ہیں۔ لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ یہ ساری سُورت مکہ میں نازل ہوئی۔

سورۂ فرقان کی فضیلت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

من قرء سورۃ الفرقان بعث یوم القیامۃ و ھو مؤمن ان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیھا، و ان اللہ یبعث من فی القبور

جو شخص سورہ فرقان کی تلاوت کرے (اس کے مضامین میں غور و فکر کرے اور اعتقاد و عمل میں اس سے ہدایت لے) تو وہ قیامت کے دن قیامت پر ایمان رکھنے والوں کی صف میں ہوگا اور اس کا حشر و نشر ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جنھیں یقین ہے کہ قیامت آکر رہے گی اور خدا مُردوں کو نئی زندگی کے ساتھ مبعوث کرے گا۔[1]

ایک اور حدیث میں "اسحاق بن عمار" نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کی ہے:

لاتدع قرائۃ سورۃ تبارك الذی نزل الفرقان علی عبدہ فان من قرأھا فی کل لیلۃ لم یعذبہ ابداً ولم یحاسبہ وکان منزلہ فی الفردوس الاعلیٰ۔

سورہ تبارک الذی (فرقان) کی تلاوت ترک نہ کرو کیونکہ جو شخص ہر رات اس کی تلاوت کرے گا خداوندِ عالم ہرگز اسے عذاب نہیں دے گا اور نہ ہی اس سے حساب لے گا اور اس کی قیام گاہ بہشت بریں ہوگی۔[2]

جیسا کہ آگے چل کر اس سورہ کی تفسیر سے معلوم ہوگا کہ خدا کے خالص بندوں کی صفات کی اس طرح تشریح کی گئی ہے کہ جو شخص صدقِ دل کے ساتھ اسے پڑھے اور اپنی سیرت و کردار کو اس کے مندرجات کے مطابق ڈھال لے تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہی میں ہوگا جس کا نام "فردوسِ اعلیٰ" ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔

[2] ثواب الاعمال صدوق منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲ ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ تَبٰرَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾

۲۔ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡكٌ فِی الۡمُلۡكِ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ وہ عالمین کو ڈرائے (اور انھیں عذابِ الٰہی کی تہدید کرے)

۲۔ وہ خدا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور مالکیت اسی کی ہے اور اس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا اور حکومت و مالکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے سب چیزوں کو پیدا کیا ہے اور ہر ایک کا صحیح صحیح اندازہ لگایا ہے۔

تفسیر

معرفت کا بہترین معیار

یہ سورت "تبارک" کے مبارک کلمہ سے شروع ہوئی ہے جس کا مادہ برکت ہے اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ کسی چیز کے بابرکت ہونے کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ اس میں دوام و پائیداری، خیر اور ہر طرح سے نفع پایا جاتا ہے۔[1]

فرمایا گیا ہے، بابرکت اور لازوال ہے وہ خدا جس نے "فرقان" کو اپنے بندے پر نازل کیا ہے تاکہ وہ تمام جہان والوں کو ڈرائے (تبارك الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیراً)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پروردگارِ عالم کے مبارک ہونے کی تعریف "فرقان" کے ذریعہ بیان کی گئی ہے یعنی وہ قرآن جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والا ہے اور یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سب سے برتر خیر و برکت یہ ہے کہ انسان کے پاس حق و باطل میں امتیاز کا وسیلہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "فرقان" کا معنیٰ کبھی "قرآن" ہوتا ہے اور کبھی وہ معجزات جو حق اور باطل میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں سورہ اعراف کی آیت نمبر ۹۶ کے ذیل میں "برکت" کا مفہوم ذکر کیا گیا ہے۔

کبھی یہ لفظ "تورات" کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن اس آیت میں اور بعد کی دوسری آیات میں لفظ "فرقان" سے مراد "قرآن" ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "قرآن" اور "فرقان" میں کیا فرق ہے تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

قرآن اس آسمانی کتاب کے مجموعے کا نام ہے اور فرقان آیات محکمات کی طرف اشارہ ہے [1]

آپ کے اس فرمان میں اور تمام قرآنی آیات کے "فرقان" ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیات محکمات حق اور باطل میں تمیز کرنے کے حوالے سے فرقان کا روشن تر، آشکار تر اور واضح تر مصداق شمار ہوتی ہیں۔

فرقان اور شناخت کی نعمت اتنی اہم ہے کہ قرآن مجید نے اسے متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لیے بہت بڑے اجر کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

یاایها الذین اٰمنوا ان تتقوا الله یجعل لکم فرقانًا

اے ایمان والو! اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو خداوند عالم تمھیں فرقان عطا فرمائے گا [2]

یقیناً تقویٰ کے بغیر حق اور باطل میں امتیاز کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ محبت و نفرت اور گناہ حق کے چہرے پر ضخیم پردے ڈال دیتے ہیں اور انسان کے ادراک و نگاہ کو اندھا کر دیتے ہیں۔

بہرحال قرآن مجید تمام فرقانوں کا فرقان ہے۔

انسان کے تمام نظامِ زندگی میں حق اور باطل کی پہچان کا بہترین وسیلہ ہے۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حق و باطل میں تمیز کا ذریعہ اور افکار و عقائد، قوانین و احکام اور اخلاق و آداب کے سلسلے میں ایک بہترین معیار اور بہترین کسوٹی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: "اس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا۔" جی ہاں مقامِ عبودیت اور خالص بندگی ہی وہ چیزیں ہیں جو فرقان کے نزول کی لیاقت اور حق و باطل کی پہچان کے معیار کو وجود بخشتی ہیں۔

آیت کے آخر میں وہ آخری نکتہ پیش کیا گیا ہے جو فرقان کا اصل مقصد اور اس کا منتہائے مقصود ہے اور وہ ہے عالمین کا انذار کہ جس کا نتیجہ انسان میں ذمہ داری کے احساس کا ابھرنا ہے۔ "للعالمین" کی تعبیر اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے جو کسی خاص علاقے، قوم اور قبیلے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کلمہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختمِ نبوت پر بھی دلیل قائم کی ہے۔ کیونکہ "عالمین" نہ صرف یہ کہ مکانی لحاظ سے محدود نہیں ہے بلکہ زمانی لحاظ سے بھی کسی قید و شرط کا پابند نہیں ہے اور تمام آنے والے ادوار اور افراد اس میں شامل ہیں (غور کیجئے گا)۔

دوسری آیت میں فرقان کے نازل کرنے والے خدا کی چار صفات بیان کی گئی ہیں ان میں درحقیقت ایک تو اصل اور جڑ ہے

[1] تفسیر برہان جلد ۳ ص ۱۵۵

[2] سورۂ انفال آیہ ۲۹

اور باقی تین اس کی شاخیں ہیں۔

پہلے تو کہتا ہے: وہ خدا ایسا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حکومت صرف اسی کے لیے ہے (الذی له ملك السماوات والارض)[1]

یقیناً وہی تو تمام عالمِ ہستی اور زمین و آسمان کا حاکم ہے۔ اس کی قلمروِ حکومت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ آیت میں مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "له" کو "ملك السماوات ....." پر اس لیے مقدم کیا گیا ہے کیونکہ عربی ادب کے مطابق یہ صورت "حصر" پر دلالت کرتی ہے۔ جس سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی واقعی اور حقیقی حکومت اور فرمانروائی صرف اور صرف اس کی ذات میں منحصر ہے کیونکہ اس کی حکومت کلی، جاودانی اور حقیقی ہے بلکہ اس کے غیر کی حکومت کہ جو محدود اور ناپائیدار ہوتی ہے پھر بھی خدا ہی سے وابستہ ہوتی ہے۔

پھر یکے بعد دیگرے مشرکین کے عقائد کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ وہ خدا جس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا: (ولم یتخذ ولدًا)[2]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں اصولی طور پر بیٹے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ کام کاج میں اس کی طاقت سے فائدہ اٹھایا جائے یا کمزوری، بڑھاپے اور ناتوانی کے دنوں میں اسی سے امداد لی جائے یا تنہائی میں اسے اپنا انیس و جلیس بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی پاک ذات کو ان تینوں میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اس طرح سے نصاریٰ کے عقیدے کی نفی ہوتی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا جانتے ہیں اور یہود کے عقیدے کی بھی نفی ہوتی ہے کیونکہ وہ جناب عزیر علیہ السلام کو خدا کا فرزند جانتے ہیں۔ اسی طرح مشرکینِ عرب کے عقیدے کی بھی نفی ہوجاتی ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: عالمِ ہستی پر مالکیت اور حاکمیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے (ولم یکن له شریك فی الملك)۔

مشرکینِ عرب خدا کے لیے ایک یا کئی شریکوں کا عقیدہ رکھتے تھے انھیں عبادت میں بھی خدا کا شریک گردانتے تھے، شفاعت میں ان سے متوسل ہوتے تھے اور اپنی حاجات میں ان سے مدد طلب کرتے تھے یہاں تک کہ حج کے موقع پر لبیک کہتے وقت بڑی صراحت کے ساتھ درجِ ذیل جملہ اور اس قسم کے دوسرے مشرکانہ جملے زبان پر جاری کرتے تھے۔

"لبیك لا شریك لك، الا شریكًا هو لك، تملكه و ما ملك"

ہم نے تیری دعوت کو قبول کیا اے خدا! جو سوائے ایک شریک کے کوئی اور شریک نہیں رکھتا اور وہ شریک بھی اپنے تمام مملوک سمیت تیری ملکیت میں ہے۔

[1] لفظ "ملک" (بروزن "گرگ") کے بارے میں "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ یہ کوئی چیز اختیار میں لینے اور اس پر حاکمیت کے معنی میں ہے جبکہ "مِلک" (بروزن "سلک") ہمیشہ اور ہر موقع پر حاکمیت اور مالکانہ تصرف کی دلیل نہیں ہے گویا ہر مُلک، مِلک ہے لیکن ہر مِلک، مُلک نہیں ہے۔

[2] بیٹے کی نفی کے بارے میں دلائل تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۶ کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

غرض قرآن مجید ان تمام موہوم چیزوں کی نفی اور مذمت کرتا ہے ۔

اور اس آیت کے آخری جملے میں کہتا ہے: اس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے، نہ صرف پیدا کیا ہے بلکہ ان کا صحیح صحیح اندازہ بھی مقرر کیا ہے (وخلق کل شیء فقدرہ تقدیرا)۔

ثنویہ کے عقیدے کی مانند نہیں جو موجوداتِ عالم کی کچھ چیزوں کا خالق "یزدان" کو اور کچھ کا خالق "اہرمن" کو سمجھتے ہیں اور اس طرح سے وہ تخلیق کائنات کو یزدان اور اہرمن میں تقسیم کر دیتے ہیں کیونکہ وہ دنیا کو "خیر" اور "شر" یا نیکی اور بدی کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ ایک سچے موحّد کے نزدیک عالمِ ہستی میں خیر کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں اور اگر کہیں ہمیں برائی نظر بھی آتی ہے تو یا تو اس کی نسبی حیثیت ہے یا وہ عدمی چیز ہے اور یا پھر ہمارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے (خوب غور کیجیے گا)۔

موجوداتِ عالم کا صحیح اندازہ

نہ صرف عالمِ ہستی کا جچا تلا اور پختہ منظام، خدا کی توحید اور اس کی معرفت کے محکم دلائل میں سے ایک دلیل ہے بلکہ اس کا صحیح صحیح اندازہ بھی اس کی وحدانیت کی ایک اور واضح دلیل ہے ہم کسی بھی صورت میں اس کائنات کی مختلف چیزوں کے اندازے، مقدار اور تعداد کو "اتفاق" کا نتیجہ نہیں مان سکتے کہ یہ کائنات اور اس میں موجود اشیاء بس اتفاقیہ طور پر معرضِ وجود میں آگئی ہیں نہیں اور ہرگز نہیں، کیونکہ یہ چیز تو "احتمالات کے قاعدہ" سے بھی میل نہیں کھاتی ۔

ماہرین نے اس سلسلے میں بہت مطالعہ کیا ہے اور کئی اسرار و رموز کا انکشاف کیا ہے جس سے انسان ورطۂ حیرت میں پڑجاتا ہے اور زبان سے بے ساختہ اپنے پروردگار کی قدرت وعظمت کے گیت گانے لگتا ہے ۔ ملاحظہ ہو ان تحقیقات کے نتائج کا ایک گوشہ۔

جیالوجی (علم ارضیات) کے ماہرین کا کہنا ہے کہ زمین کی یہ ظاہری سطح اگر موجودہ حالت سے دس فٹ مزید بلند اور موٹی ہوتی تو زندگی کا اصل مواد یعنی آکسیجن گیس کا وجود ہی عمل میں نہ آتا یا اگر سمندروں کی گہرائی موجودہ حالت سے بیشتر اور کئی گنا ہوتی تو زمین کی تمام آکسیجن (Oxygen) اور کاربن (Carbon) گیسیں جذب ہو کر رہ جاتیں اور زمین کی سطح پر کسی حیوانی اور نباتی زندگی کے قطعاً کوئی امکانات نہ ہوتے اور قوی احتمال یہ ہے کہ موجودہ تمام آکسیجن کو زمین کی سطح اور سمندروں کا پانی جذب کر لیتے اور انسان کو اپنی نشوونما کے لیے نباتات کے اگنے اور پروان چڑھنے کا انتظار کرنا پڑتا تاکہ وہ آکسیجن خارج کریں اور انسان اس سے استفادہ کرے ۔

صحیح صحیح حساب وکتاب کے بعد اور تحقیقات کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تنفس کو بحال رکھنے کے لیے آکسیجن ازحد ضروری ہے اور وہ مختلف ذرائع سے حاصل ہوتی ہے لیکن جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تنفس کے لیے آکسیجن کی ضروری اور لازمی مقدار اس فضا میں موجود ہے ۔

اگر زمین کی ہوا موجودہ حالت سے مزید ہلکی ہوتی تو آسمان سے تعلق رکھنے والے اجرامِ فلکی اور شہابیے جو روزانہ کروڑوں کی تعداد میں ہوا سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں مسلسل زمین پر گرتے رہتے جس سے یقیناً بے حد وحساب نقصان ہوتا ۔

یہ شہاب ثاقب چھ سے چالیس میل فی سیکنڈ کے حساب سے حرکت کرتے رہتے ہیں اور جس چیز سے ٹکراتے ہیں وہیں پر دھماکہ کے ساتھ پھٹ کر آگ لگا دیتے ہیں چنانچہ ان اجرام کی رفتار موجودہ رفتار سے کم ہوتی مثلاً ایک گولی کی رفتار کے مطابق ہوتی تو وہ سب کے سب زمین پر آگرتے اور اس کے نتیجے میں جو تباہی پھیلتی اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے ۔

اگر خود انسان ان اجرامِ فلکی میں سے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جرم کی راہ میں ہوتا تو اس کی زبردست حرارت اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی جبکہ اس کی رفتار گولی کی رفتار سے نوّے گنا زیادہ ہوتی ہے ۔

زمین کی فضا میں ہوا کا دباؤ اس حد تک مناسب اور موزوں ہے کہ یہ ہوا سورج کی شعاعوں کو صرف اسی مقدار میں زمین تک آنے دیتی ہے جو نباتات کی نشوونما کے لیے ضروری ہوتی ہے اور ضرر رساں جراثیموں کو اسی فضا میں نیست و نابود کر دیتی ہے اور مفید وٹامن پیدا کرتی ہے ۔

زمین کی گہرائیوں سے صدیوں سے اٹھنے والے مختلف بخارات فضا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں سے اکثر زہریلی گیسیں ہیں اس کے باوجود زمین کی فضا میں کسی قسم کی آلودگی پیدا نہیں ہوتی اور یہ فضا ہمیشہ متوازن اور موزوں رہتی ہے تاکہ انسانی زندگی کے لیے مناسب ماحول مہیا رہے ۔

جس مشینری نے اس عجیب وغریب توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا ہوا ہے وہ سمندر ہی تو ہیں جو خوراک، بارش، اعتدال ہوا، حیاتِ نباتات بلکہ خود انسان کے وجود کا منبع فیض ہیں۔ جو شخص ان مطالب کا ادراک کرتا ہے وہ سمندروں کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے اور ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرتا ہے ۔

"آکسیجن" اور "کاربن ڈائی آکسائڈ" کے درمیان عجیب تناسب اور صحیح توازن برقرار رکھا گیا ہے تاکہ حیوانات اور نباتات کی زندگی وجود پذیر ہو اور باقی رہے ۔۔۔ اسی چیز نے تمام مفکرین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی ہے اور انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے ۔

لیکن ابھی تک "کاربن ڈائی آکسائڈ" کی اہمیت بہت سے لوگوں پر مخفی ہے یاد رہے کاربن ڈائی آکسائڈ وہ گیس ہے جس سے گیس والے مشروبات تیار کیے جاتے ہیں ۔

کاربن ڈائی آکسائڈ ایک بھاری اور بوجھل گیس ہوتی ہے جو خوش قسمتی سے زمین کی سطح کے بہت ہی نزدیک موجود رہتی ہے اور اسے آکسیجن سے بڑی مشکل کے ساتھ جدا کیا جا سکتا ہے۔ جب لکڑی سے آگ جلائی جاتی ہے تو لکڑی پر کیمیکل عمل ہوتا ہے خود لکڑی آکسیجن، کاربن اور ہائیڈروجن کے مجموعے کا نام ہے ۔ چنانچہ حرارت کی وجہ سے جب اس کا کیمیکل تجزیہ ہوتا ہے تو کاربن فوراً ہی آکسیجن سے مل کر کاربن ڈائی آکسائڈ بن جاتی ہے اور اسی تیزی سے ہائیڈروجن بھی آکسیجن کے ساتھ مل کر بخارات کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ دھواں درحقیقت خالص اور غیر مرکب کاربن ہوتا ہے ۔

جب انسان سانس لیتا ہے تو اس سے کچھ مقدار آکسیجن اس کے اندر چلی جاتی ہے جو جا کر خون کو بدن کے تمام حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور یہی آکسیجن غذا کو بدن کے مختلف خلیوں میں بھیج کر آہستہ آہستہ اور مدھم سی حرارت کے ساتھ اسے جلا دیتی ہے اور اس سے کاربن ڈائی آکسائڈ اور بخارات خارج ہوتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو مذاق میں کہا جاتا ہے کہ وہ "تنور" کی مانند

آئیں بھر رہا ہے تو یہ ایک حقیقت ہوتی ہے۔

بدن کے مختلف خلیوں میں غذا کے جلنے سے کاربن ڈائی آکسائڈ پیدا ہوتی ہے اور سیدھی پھیپھڑوں میں چلی جاتی ہے اور بعد والی سانسوں کے ذریعے پھیپھڑوں سے خارج ہو کر بیرونی فضا میں چلی جاتی ہے۔ اسی ترتیب کے ساتھ تمام ذی روح چیزیں آکسیجن لیتی اور کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتی ہیں۔

اس کائنات میں توازن اور کنٹرول کا یہ طریقہ کار کس قدر تعجب خیز ہے؟ اسی توازن کا نتیجہ ہے کہ فطرت نے حیوانات اور درندوں کو اس دنیا پر مسلّط ہونے سے روک رکھا ہے اگرچہ وہ جسم و جثّے اور طاقت کے لحاظ سے بہت ہی عظیم ہیں اور یہ صرف انسان ہی ہے جو فطرت کے توازن کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے اور حیوانات اور نباتات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا رہتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی اس ستم ظریفی کا بہت جلد مزہ بھی چکھ لیتا ہے کیونکہ نباتاتی آفات اور حیوانی بیماریاں اسے ایسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہیں کہ اسے اس کا مدتوں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

ذیل میں ہم ایک دلچسپ واقعہ پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی بقاء کے لیے کیوں اس توازن و کنٹرول کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ آسٹریلیا میں "جیدار" (Cactus)[1] نامی پودے کی کھیتوں کی باڑوں پر کاشت کی گئی اور چونکہ اس وقت اس پودے کا مخالف کیڑا آسٹریلیا میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا یہ پودا خوب پھلا پھولا اور پروان چڑھا اور تھوڑی سی مدت میں اس نے جزیرۂ انگلستان کی سرزمین کے برابر کے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لوگوں کو مجبوراً دیہات اور قصبات چھوڑنے پڑے کھیتی باڑی ختم ہو کر رہ گئی۔

لوگوں نے اس کے خاتمہ کے لیے ہر قسم کی چارہ جوئی کی لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا بلکہ پورے آسٹریلیا کو اس سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس پودے کا خاموش اور ضدی لشکر کسی نہ کسی دن سارے برّاعظم پر اپنا تسلط قائم کرلے گا۔ تمام ماہرین اور دانشوروں نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی تدبیریں سوچنا شروع کردیں۔ ساری دنیا کی خاک چھان ماری آخرکار انھیں ایک ایسا کیڑا مل گیا جس کی خوراک صرف اور صرف "جیدار" کے پتے اور ٹہنیاں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کوئی خوراک نہیں کھاتا۔ اس پر ہی اپنی نسل بڑھاتا ہے اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن بھی نہیں۔

اس طرح سے حیوان نے نبات پر غلبہ پالیا اور آج پورے برّاعظم میں "جیدار" کا خطرہ مکمل طور پر ٹل چکا ہے اور اس نبات کے خاتمے کے ساتھ ہی کیڑوں کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے صرف چند ایک کیڑے زندہ بچے ہوئے ہیں جو اس نبات کی نشوونما کو کنٹرول کیے ہوئے ہیں۔ قدرت نے فطرت میں اس توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا ہوا ہے اور یہ نہایت مفید بھی ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ ملیریا کے مچھر نے روئے زمین کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا اور نہ ہی نسلِ انسانی کو تباہی سے ہمکنار کیا ہے جبکہ قطبی علاقوں تک میں عام مچھر بہت بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔

[1] یہ ایک طرح کا تنے دار پودا ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک رنگ برنگے پھولوں والی قسم ہے جسے باغیچوں وغیرہ میں لگایا جاتا ہے اور دوسری قسم بڑی اور درخت کی سی ہوتی ہے۔

یا کیا وجہ ہے کہ تپ زرد (Yellow Fever) کے مچھر نے جو ایک موقع پر نیویارک کے قریبی علاقوں میں آیا تھا اس دنیا کو تباہی کے خطرے سے دوچار نہیں کیا یا خواب آور مکھی نے جو زندہ ہی صرف استوائی گرم علاقوں میں رہ سکتی ہے، انسانی ... کو روئے زمین سے ختم نہیں کیا؟ (ان سب کا تدارک صرف اور صرف ایک صحیح اور نپے تُلے نظام اور کنٹرول کے ذریعے کیا ہے۔)

اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انسانیت اپنی تاریخ کے دورانیے میں کیسی کیسی آفات و امراض سے دوچار رہی ہے اور کل تک ... کے پاس اپنی مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور حفظانِ صحت کے کسی اصول سے باخبر بھی نہیں تھی۔ جب ان تمام باتوں پر غور کیا ... ئے تو پتہ چلے گا کہ ہمارا وجود کس حیرت انگیز حد تک محفوظ و مامون رہا ہے۔[1]

[1] "رازِ آفرینشِ انسان" نامی کتاب کے ص ۲۳ تا ۲۶، ۳۹ تا ۴۱، ۴۹ تا ۱۵۲ سے خلاصہ کیا گیا۔

۳۔ وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ
وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا
حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ○

۴۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ
اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ○

۵۔ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ
اَصِيْلًا ○

۶۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

ترجمہ

۳۔ ان لوگوں نے خدا کے علاوہ دوسروں کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ ایسے معبود جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں نہ تو وہ اپنے نقصان اور نفع کے مالک ہیں اور نہ ہی موت و حیات اور قیامت کے دن جی اٹھنے کے۔

۴۔ اور کافروں نے کہا یہ تو اس نے جھوٹ گھڑا ہے اور کچھ لوگوں نے اس کام پر اس کی مدد کی ہے۔ یہ کہہ کر وہ ظلم اور بہت بڑے جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

۵۔ اور انھوں نے کہا: یہ تو وہی گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جنھیں اس نے قلم بند کیا ہے اور صبح و شام اسے لکھوایا جاتا ہے۔

۶۔ کہہ دو: اسے تو اس نے نازل کیا ہے جس کے پاس آسمانوں اور زمین کے اسرار ہیں اور خدا غفور و رحیم تھا اور ہے بھی۔

تفسیر

طرح طرح کی تہمتیں

یہ آیات درحقیقت گزشتہ آیات میں ہونے والی گفتگو کا تتمہ ہیں جس میں شرک اور بُت پرستی کے خلاف دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اسی طرح بتوں کے بارے میں بت پرستوں کے بے بنیاد دعووں ــــــــــ اور قرآن مجید اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر جو جو تہمتیں لگائی ہیں ان سب کی قلعی کھولی گئی ہے۔

پہلی آیت درحقیقت مشرکین پر فردِ جرم عاید کر رہی ہے اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے واضح، آسان اور قاطع دلائل کے ساتھ اُن سے مخاطب ہے۔ ان لوگوں نے اس خدا کے علاوہ جس کے اوصاف ابھی بیان ہو چکے ہیں، دوسروں کو خُدا بنالیا ہے وہ تو قطعاً کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں (واتخذوا من دونہ الہۃ لا یخلقون شیئًا وھم یخلقون)۔

معبودِ حقیقی عالمِ ہستی کا خالق ہے جبکہ بُت پرستوں کا اپنے خداؤں کے بارے میں اعتراف ہے کہ وہ کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ وہ انھیں خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں۔

جب صورتِ حال ایسی ہو تو پھر کس بناء پر وہ بُت پرستی کرتے ہیں۔ وہ بت جو اپنے نفع و نقصان، موت و حیات اور قیامت کے دن جی اٹھنے تک کے مالک نہیں، وہ دوسروں کو کیا دیں گے (و لا یملکون لانفسھم ضرًّا و لا نفعًا ولا یملکون موتًا ولا حیٰوۃ ولا نشورًا)۔

جو اصول کسی انسان کے لیے زبردست اہمیت کے حامل ہیں، یہی پانچ امور تو ہیں۔ نفع، نقصان، موت، زندگی اور دوبارہ جی اٹھنا۔

سچی بات یہ ہے کہ جو ہماری ان پانچ چیزوں کا اصل مالک ہے وہی ہماری عبادت کے لائق ہے تو آیا یہ بُت کسی بھی صورت میں خود اپنے ان پانچ امور کے مالک ہیں؟ چہ جائیکہ اپنے عبادت گزاروں کے ان امور کے مالک بنیں؟ یعنی جب یہ اپنے امور کے مالک نہیں ہیں وہ اپنے پوجنے والوں کے کس طرح مالک بن سکتے ہیں؟

یہ کیسی رذیلانہ حرکت ہے کہ انسان ایسی چیزوں کے پیچھے بھاگتا پھرے اور ان کے سنگِ آستاں پر جبہ سائی کرے جو خود اپنے لیے کچھ نہیں رکھتیں چہ جائیکہ دوسروں کے لیے ان کے پاس کچھ ہو؟

یہ بت تو دنیا میں اپنے پوجنے والوں کی کسی مشکل کو حل نہیں کر سکتے قیامت کے دن کسی کی مشکل کیا حل کریں گے؟

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین کا یہ گروہ جو ان آیات میں مخاطب ہے کسی حد تک معاد (روحانی نہ کہ جسمانی) کا قائل ضرور تھا یا پھر یہ بات ہے کہ باوجود ان کے قیامت پر ایمان نہ ہونے کے قرآن مجید نے اس بات کو مسلّم بنا کر ذکر کیا ہے اور دو ٹوک الفاظ میں ان کے ساتھ مخاطب ہے، عموماً طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی انسان کو کسی چیز کے منکر سے گفتگو کرنی پڑتی ہے

تو وہ اس کے افکار کی پرواہ کیے بغیر اپنے مدعا کو دو ٹوک الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔

پھر اس آیت میں تو ضمنی طور پر معاد پر ایک دلیل بھی بیان کی گئی ہے کیونکہ جب خالق کسی مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور سود و زیاں اور موت و حیات کا مالک ہوتا ہے تو اس تخلیق کا مقصد بھی اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور جب تک قیامت کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ اگر انسان کی موت کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو جائے تو یہ زندگی بے فائدہ اور بے مقصد ہو گی اور اس بات کی دلیل ہو گی کہ انسان کا خالق صاحبِ حکمت نہیں ہے۔

آیت میں لفظ "ضرر" "نفع" سے پہلے اس لیے ہے کہ انسان سب سے پہلے ضرر ہی سے خوف کھاتا ہے اور عقلاء کا فیصلہ ہے کہ "ضرر کا دور کرنا نفع کے حصول سے بہتر ہے"۔

نیز اگر "ضرر"، "نفع"، "موت"، "حیات" اور "نشور" کے الفاظ نکرہ کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بُت تو ایک مرتبہ بھی یہ کام نہیں کر سکتے تمام دنیا کے بارے میں وہ کیا کریں گے؟

اور اگر "لایملکون" اور "لایخلقون" کو ذوی العقول کے لیے استعمال ہونے والے جمع مذکر کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے (جبکہ لکڑی اور پتھر کے بُت تو ذرہ بھر بھی عقل و شعور نہیں رکھتے) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس گفتگو سے مُراد صرف لکڑی اور پتھر کے بُت ہی نہیں بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو فرشتوں یا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پرستش کرتے ہیں اور چونکہ اس جملے کے معنی میں عاقل اور غیر عاقل اکٹھے ذکر ہوئے ہیں لہٰذا سب کو عاقل کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ادبی اصطلاح میں اسے تغلیب کا نام دیا جاتا ہے۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدِمقابل کے عقیدے کے مطابق بات کی جا رہی ہو اور اس طرح سے ان بتوں کی عاجزی و ناتوانی کو اجاگر کیا جانا مقصود ہو کہ جن چیزوں کو تم صاحبِ عقل و شعور سمجھتے ہو وہ اپنے سے ضرر کو دُور کیوں نہیں کر سکتیں اور منفعت کو کیوں حاصل نہیں کر سکتیں۔

بعد والی آیت میں کفار کے تجزیہ و تحلیل یا بہتر الفاظ میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتِ اسلام کے جواب میں ان کے حیلے بہانوں کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: کافروں نے کہا یہ تو صرف اس کا خود ساختہ جھوٹ ہے اور کچھ لوگوں نے اس بارے میں اس کی مدد کی ہے (و قال الذین کفروا ان ھٰذا الا افك إفترٰىه واعانه علیه قوم اٰخرون)۔

درحقیقت انھوں نے اطاعتِ حق سے جان چھڑانے کے لیے یہ بات کی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح تاریخ کے مطابق پہلے لوگ خدائی رہبروں کی اطاعت سے جان چھڑانے کے لیے ان کی مخالفت کرتے تھے۔ پہلے تو انھوں نے آنحضرتؐ پر جھوٹ کی تہمت لگائی اور خاص کر قرآنِ مجید کی توہین کے لیے "ھٰذا" یعنی "یہ" کا کلمہ استعمال کیا۔

پھر اپنے اس دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہ وہ تنہا ایسا کام نہیں کر سکتے کیونکہ مطالب سے بھرپور الفاظ کے لیے ایک زبردست علمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس پر آمادہ نہیں تھے کہ اس بات کا کھلم کھلا اعتراف کریں کہ یہ ایک باقاعدہ سیاسی پروگرام ہے لہٰذا کہنے لگے کہ: وہ تنہا ایسا کام نہیں کر سکتا بلکہ کچھ لوگوں نے اس سلسلے میں اس کی مدد کی ہے اور یہ ایک باقاعدہ اور سوچی سمجھی سازش ہے جس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "قوم اٰخرون" (دوسری قوم سے) ان کی مراد یہودیوں کا ایک گروہ تھا بعض کہتے ہیں کہ مراد اہلِ کتاب کے تین افراد تھے جن کا نام "عداس"، "یسار" اور "حبر" (یا جبر) ہے۔

بہرصورت چونکہ مشرکینِ مکہ اس قسم کی باتوں سے ناآشنا تھے اور انبیاءِ ماسلف کی کچھ تاریخی داستانیں اور اس قسم کے کئی دوسرے قصے یہود اور اہلِ کتاب کے پاس موجود تھے۔ لہٰذا اس بہتان تراشی میں انھوں نے زبردستی اہلِ کتاب کو بھی ملوث کر دیا تاکہ اس طرح سے وہ لوگوں کے اس تاثر کو ختم کر سکیں جو وہ قرآنی آیات سننے سے لیتے تھے۔

لیکن قرآن مجید نے ان اتہامات کا جواب صرف ایک ہی جملے میں دے دیا ہے اور وہ یہ ہے: یہ کہہ کر وہ (کافر) ظلم اور بڑے جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں (فقد جاءو ظلمًا و زورًا)[1]۔

"ظلم" اس لحاظ سے کہ انھوں نے ایک امین، پاکیزہ، مقدس اور حق و صداقت کے پُتلے پر تہمت لگائی ہے (پیغمبرِ اسلامؐ پر) کہ وہ (نعوذ باللہ) اہلِ کتاب کے ایک ٹولے کی مدد سے خدا پر افترا پردازی اور جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اس طرح کا الزام لگا کر انھوں نے لوگوں پر بھی ظلم کیا اور اپنے اوپر بھی۔ "زور" یعنی جھوٹ اور باطل اس بناء پر کہ ان کی باتیں بالکل بے بنیاد تھیں کیونکہ پیغمبرِ اسلامؐ نے انھیں ایک نہیں کئی بار چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ اپنے دعووں میں سچے ہیں تو اس قرآن جیسی کوئی کتاب یا اس کی سورتوں اور آیات جیسی کچھ سورتیں یا آیتیں لے آئیں لیکن وہ ایسا کرنے سے عاجز آ گئے تھے اور کچھ بھی پیش نہ کر سکے تھے۔

اس طرح سے واضح ہو گیا کہ یہ آیات کسی انسانی فکر کی اختراع نہیں بلکہ رب العالمین کا کلام ہیں کیونکہ اگر یہ انسان کا کلام ہوتا تو وہ بھی یہودیوں اور اہلِ کتاب کی مدد سے اس طرح کی کتاب تیار کر لاتے۔ بنابریں ان کا عجز ان کے جھوٹ کی اور ان کا جھوٹ ان کے ظلم کی دلیل ہے۔

لہٰذا "فقد جاءو ظلمًا و زورًا" ایک ایسا جامع اور مانع جواب ہے جو ان کے دعووں کو باطل کر دیتا ہے۔

"زور" (بروزن "کور") اصل میں "زَور" (بروزن "غور") سینے کا بالائی حصّہ کے معنیٰ سے لیا گیا ہے پھر اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہونے لگا جو حدِ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔ چونکہ جھوٹ حق سے ہٹ کر باطل کی طرف گیا ہوتا ہے لہٰذا اسے بھی "زُور" کہتے ہیں۔

بعد والی آیت میں قرآن کے بارے میں کفار و مشرکین کی ایک اور رائے اور بے ہودہ بہانے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

انھوں نے کہا یہ تو وہی گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جسے اس نے قلمبند کیا ہے (و قالوا اساطیر الاولین

---

[1] "جاءو" "مجیئ" کے مادہ سے ہے جو عام طور پر "آنے" کے معنی میں ہوتا ہے لیکن یہاں پر "لانے" کے معنی میں ہے جیسا کہ سُورہ یونس کی آیت ۸۱ میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے فرمایا:

ماجئتم به السحر

جو کچھ تم لائے ہو وہ جادُو ہے۔

اکتتبھا)۔

وہ کہتے ہیں پیغمبر کے پاس اپنی طرف سے کچھ نہیں ہے خواہ وہ علم ہو یا دانش، ایجاد ہو یا اختراع، تو پھر وحی اور نبوت اس کے پاس کہاں سے آ گئے۔ اس نے تو کچھ لوگوں کی مدد سے چند قصے کہانیوں کو اکٹھا کر کے اس کا نام وحی یا آسمانی کتاب رکھ دیا ہے۔

وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر روز دوسرے لوگوں سے مدد حاصل کرتا ہے اور یہ کلمات صبح و شام اسے لکھوائے جاتے ہیں (فھی تملی علیہ بکرۃ و اصیلًا)۔

یعنی وہ ہر صبح و شام جبکہ لوگ بہت کم اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہیں اپنے مقصد کو پانے کے لیے لوگوں سے مدد حاصل کرتا ہے اس قسم کے کلمات درحقیقت گزشتہ آیت میں ان کے بیان شدہ اتہامات کی توضیح اور تشریح ہیں۔

اس طرح سے انھوں نے چند مختصر سے جملوں میں کچھ خامیاں اور کمزوریاں قرآنِ مجید کے سر منڈھ دی ہیں:

۱۔ قرآن میں کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ صرف گزشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

۲۔ پیغمبر اسلامؐ ایک دن بھی دوسرے لوگوں کی مدد کے بغیر اپنا کام انجام نہیں دے سکتے بلکہ صبح و شام کچھ باتیں انھیں لکھوا دی جاتی ہیں۔

۳۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لہٰذا اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی سے سبق نہیں پڑھا تو خلافِ حقیقت کہتے ہیں۔

درحقیقت وہ اس قسم کی دروغ گوئی اور ظاہری اتہامات کے ذریعے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے ہٹانا چاہتے تھے جبکہ تمام صاحبانِ عقل اور اس ماحول کے رہنے والوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپؐ نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کہ آپ کو نہ تو یہود سے کوئی سروکار تھا اور نہ کسی اور اہلِ کتاب سے۔ اگر واقعًا آپ صبح و شام کسی سے کچھ حاصل کرتے تھے تو کیونکر ممکن تھا کہ کسی پر یہ بات مخفی رہتی؟ ان سب باتوں سے ہٹ کر قرآنی آیات تو سفر و حضر اور مجمع عام اور تنہائی میں آپؐ پر نازل ہوتی تھیں۔

ان سب سے قطع نظر قرآنِ مجید صرف انبیاءِ ماسلف کی داستانوں پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس میں اعتقادی تعلیمات، عملی احکام قوانینِ الٰہی اور کچھ انبیاءِ عظام کی سرگزشت بھی موجود ہے اور پھر گزشتہ اقوام کی جو جو داستانیں قرآن مجید میں موجود ہیں وہ عہدین (تحریف شدہ تورات اور انجیل) اور عربوں کے افسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ وہ تو خرافات اور فضول باتوں سے بھرپور تھے جبکہ قرآن مجید ان تمام خرافات سے بالکل پاک و پاکیزہ ہے۔ اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اگر دونوں کا باہمی موازنہ اور تقابل کیا جائے تو حقیقتِ امر بخوبی واضح ہو جائے گی[۱]

[۱] بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "اکتتبھا" سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے دوسرے لوگوں کو فرمایا کہ وہ یہ آیات آپ کو لکھ کر دیں اور اسی طرح "تملی علیہ" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ آپؐ کے سامنے پڑھتے اور آپؐ یاد کر لیتے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ہم ان دونوں جملوں کی ظاہر کے خلاف تفسیر کریں لہٰذا جو تفسیر اوپر متن میں بیان کی گئی ہے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ یہ چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کو اس طرح سے متہم کر سکیں (باقی اگلے صفحہ پر)

اسی بناء پر اس سلسلے کی آخری آیت میں ان بے بنیاد الزامات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہہ دیجیے اسے تو اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف ہے (قل انزلہ الذی یعلم السر فی السماوات و الارض)۔

آیت کا یہ حصہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتابِ الٰہی کے مضامین اور مختلف اسرار و رموز جن میں علم و دانش بھی ہے اور گزشتہ قوموں کی تاریخ بھی، انسانی ضروریات کی راہنمائی اور قوانین حتیٰ کہ عالمِ فطرت کے اسرار و رموز اور آئندہ کی خبریں بھی، یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ نہ تو یہ انسانی ذہن کی اختراع ہے اور نہ ہی کسی ایرے غیرے کے تعاون سے اسے مرتب کیا گیا ہے بلکہ یہ تو اس ذات کے علم کا نتیجہ ہے جس کے پاس آسمان و زمین کے اسرار موجود ہیں اور جس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔

ان کج اندیش مطلب کے بندوں اور جھوٹے دغابازوں کی تمام خیانتوں اور الزام تراشیوں کے باوجود اللہ نے ان کے لیے توبہ کی راہ کھلی رکھی ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ توبہ اور بازگشت کی راہیں ان سب پر کھلی ہوئی ہیں کیونکہ خدا ہر دور میں غفور و رحیم ہے (انہ کان غفورًا رحیمًا)۔

اس نے اپنی رحمت کی وجہ سے انبیاءِ عظام علیہم السلام کو مبعوث کیا اور آسمانی کتابوں کو نازل فرمایا ہے اور اپنے غفور ہونے کی بناء پر انسان کے ایمان اور توبہ کے پرتو میں اس کے بے شمار گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا)

کہ وہ تو پڑھے لکھے ہیں اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو ان پڑھ بتاتے ہیں۔

۷۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ○

۸۔ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ○

۹۔ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ○ ع

۱۰۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ○

ترجمہ

۷۔ اور انھوں نے کہا یہ رسولؐ کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے، (یہ نہ تو فرشتوں کا طریقہ کار ہے اور نہ ہی بادشاہوں کا انداز) کیوں اس پر کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ مل کر وہ لوگوں کو ڈرائے؟ (اور اس کی دعوت کی صداقت پر گواہی دے)

۸۔ یا آسمان سے اس کی طرف کوئی خزانہ بھیجا جائے یا اس کا کوئی باغ ہو جس (کے پھلوں) کو کھائے (اور زندگی گزارے) اور ظالموں نے کہا تم تو ایک دیوانے شخص کی پیروی کرتے ہو۔

۹۔ ذرا دیکھ! انھوں نے تیرے لیے کیسی کیسی مثالیں بیان کی ہیں اور اس قدر گمراہ ہو چکے ہیں کہ اب وہ راستہ تلاش کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے۔

۱۰۔ بابرکت اور باعظمت ہے وہ خدا، اگر وہ چاہے تو اس سے بھی بہتر عطا کر سکتا ہے ایسے ایسے باغات جن کے نیچے نہریں چل رہی ہوں اور اگر چاہے تو تیرے لیے عظیم الشان محلات بنا دے۔

شانِ نزول

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

میں نے اپنے والد (حضرت امام علی نقی علیہ السلام) سے پوچھا کہ آیا یہود اور مشرکین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کٹ حجتی اور کج بحثی کرتے تھے تو آپؐ بھی ان کے ساتھ کوئی استدلالی گفتگو فرماتے تھے یا نہیں؟

تو انھوں نے فرمایا ضرور فرماتے تھے اور کئی بار ایسا ہوا بھی ہے چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دن آپؐ خانہ خدا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ عبداللہ بن ابی مخزومی آپؐ کے سامنے آکر کہنے لگا:

اے محمد! تم نے بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اور بہت خطرناک باتیں کرتے ہو اس طرح سے تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم پروردگارِ عالم کے رسول ہو۔ لیکن مناسب نہیں کہ مخلوقات کا خالق اور عالمین کا پروردگار تم جیسے ایک عام آدمی کو رسول بنا کر بھیجے۔ تم بھی ہماری طرح کھانا کھاتے اور ہماری مانند بازار میں چلتے پھرتے ہو۔

یہ سن کر اللہ کے رسولؐ نے (بارگاہِ ایزدی میں) عرض کی:۔

بارِ الٰہا! تو سب باتوں کو سنتا ہے اور ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے اور تیرے بندے جو کچھ کہتے ہیں تو انھیں بھی جانتا ہے (تو خود ہی ان کے اعتراضات کا جواب عنایت فرما)

تو اس موقع پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کے اعتراضات کے جواب دیئے[1]

تفسیر

خزانے اور باغات کیوں نہیں؟

جہاں تک گزشتہ آیات کی بات ہے ان میں قرآنِ مجید کے بارے میں کافروں کے کچھ اعتراضات کا تذکرہ ہے اور ان کا جواب بھی دے دیا گیا ہے۔ رہی زیرِ بحث آیات کی بات تو ان میں خود پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر اعتراضات کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

خدا فرماتا ہے: انھوں نے کہا کیوں یہ رسول کھانا کھاتا ہے اور کیوں بازار میں چلتا ہے (وقالوا مال ھذا الرسول

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۶۔

یأکل الطعام و یمشی فی الاسواق)۔
یہ کیسا پیغمبر ہے جسے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور لین دین یا اشیائے ضرورت کی خریداری کے لیے بازار میں آنا جانا
ہے؟ یہ نہ تو انبیاء کا طریقہ کار رہا ہے اور نہ ہی بادشاہوں کا شیوہ! اس کے باوجود وہ خدائی احکام کی تبلیغ اور سب پر حکومت بھی
کرنا چاہتا ہے۔
اصولی طور پر ان کا نظریہ یہ تھا کہ باحیثیت اور معزز افراد اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے خود بازار نہ جایا کریں بلکہ ایسے
کاموں کے لیے اپنے نوکروں چاکروں کو بھیج دیا کریں۔
وہ یہ بھی کہتے: اس پر فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا تاکہ وہ اس کی دعوت کی صداقت پر گواہ ہوتا اور اس کے ساتھ مل کر لوگوں
کو ڈراتا (لولا انزل الیہ ملك فیکون معہ نذیرًا)۔
چلو مان لیا کہ خدا کا رسول انسان بھی ہو سکتا ہے لیکن تہی دست اور نادار انسان ہی رسول کیوں ہو؟ آخر اللہ نے اس کے
لیے آسمان سے کوئی خزانہ کیوں نہیں بھیجا یا کم از کم اس کا کوئی باغ کیوں نہیں ہے کہ جس سے وہ (پھل) کھاتا (او یلقٰی الیہ
کنز او تکون لہ جنۃ یأکل منھا)۔
پھر انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک غلط نتیجہ نکالتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنون کی تہمت
دی جیسا کہ آیت کے آخر میں ہے اور ظالموں نے کہا: اے اس پر ایمان لانے والو! تم ایک دیوانے اور سحر زدہ شخص کی پیروی
کر رہے ہو (و قال الظالمون ان تتبعون الا رجلًا مسحورًا)۔
کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ جادوگر لوگ انسان کے ہوش و حواس اور عقل کو اپنے قابو میں لے سکتے ہیں اور اس کی عقل
سلب کر سکتے ہیں۔
اوپر کی تمام آیات کو ملا کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر چند بے بنیاد
اعتراض تھے جن سے وہ قدم بقدم پیچھے ہٹتے گئے۔
ان کا پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ رسول کو فرشتہ ہی ہونا چاہیے یہ جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے یقیناً
فرشتہ نہیں ہے۔
پھر کہا: چلو مان لیا فرشتہ نہ سہی خدا کم از کم کوئی فرشتہ اس کی اعانت کے لیے بھیج دیتا۔
کچھ اور پیچھے ہٹے اور کہا: یہ بھی نہ سہی کم از کم اسے ایک غریب آدمی تو نہیں ہونا چاہیے تھا ایک خوشحال زمیندار ہوا اس کے
پاس ایک باغ ہو جس سے اپنی گزر اوقات کرے۔
لیکن افسوس یہ چیز بھی اس کے پاس نہیں ہے اور پھر دعویٰ یہ کہ پیغمبر ہے!!
آخر میں وہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکالتے تھے کہ ان حالات میں اس کا اتنا بڑا دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی
عقل ٹھیک نہیں (نعوذ باللہ)۔
بعد والی آیت ان سب کا جواب ان الفاظ میں دیتی ہے: دیکھ تو سہی کہ انھوں نے تیرے لیے کس طرح کی مثالیں بیان

کی ہیں۔ اب وہ اس حد تک گمراہ ہو چکے ہیں کہ انھیں تو راستہ بھی سجھائی نہیں دیتا (انظر کیف ضربوا لك الامثال فضلوا
فلا یستطیعون سبیلًا)۔
یہ جملہ اس حقیقت کی واضح تعبیر ہے کہ انھوں نے دعوتِ حق اور اس قرآن کے مقابلے میں چند بے بنیاد اور فضول باتیں
گھڑلی ہیں جبکہ قرآن کے مضامین خدا کے ساتھ تعلق اور ارتباط کے ناطق گواہ ہیں اس طرح سے وہ حقیقت کے چہرے پر پردہ
ڈالنا چاہتے ہیں اِدھر اُدھر کی کھوکھلی بے بنیاد باتیں کرتے ہیں اور منطقی دلیل کا جواب ایسی بے سروپا باتوں کے ذریعے دینا
چاہتے ہیں کیونکہ:
۱۔ آخر پیغمبر کو فرشتوں کی جنس سے کیوں ہونا چاہیے؟ جبکہ اس کے بالکل برعکس عقل اور دانش کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کا
رہبر انسان ہی کو ہونا چاہیے تاکہ وہ ان کے تمام دُکھ درد، مشکلات، تکالیف، ضروریاتِ زندگی اور مسائلِ حیات کو اچھی طرح سمجھ سکے
تمام مسائل میں ان کے لیے عملی نمونہ بن سکے اور لوگ ہر ہر قدم پر اس کی تاسی کر سکیں۔ فرشتہ نازل ہوتا تو یقیناً یہ مقصد پورا نہ ہوتا کیونکہ
اگر وہ زہد اور دنیا سے بے نیازی کی باتیں کرتا تو وہ تو خود فرشتہ ہے اور ان چیزوں سے بے نیاز ہے اگر عفت اور پاکدامنی کی تبلیغ کرتا
تو فرشتہ ہونے کی بنا پر قوتِ جنسی کے طوفان سے بے خبر ہوتا اسی طرح کے بیسیوں "اگر" پیدا ہو جاتے۔
۲۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ اس کے ہمراہ فرشتہ آتا؟ کیا قرآن جیسے عظیم معجزے کے باوجود بھی اس کی ضرورت باقی رہ
گئی تھی اور حقائق کے ادراک کے لیے قرآن ناکافی تھا؟
۳۔ دوسرے لوگوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے تو اس طرح سے لوگوں کے ساتھ اس کے مراسم
پیدا ہوتے ہیں، میل جول بڑھتا ہے اور ان کے دل کی گہرائیوں اور زندگی کی تہ تک پہنچتا ہے اور اپنا پیغام بہتر طور پر ان تک پہنچا
سکتا ہے یہ بات اس کے لیے مضر نہیں بلکہ مفید اور معاون ہے۔
۴۔ پیغمبر کی عظمت اور ان کی شخصیت نہ تو خزانوں کی مرہونِ منت ہے اور نہ ہی سرسبز اور شاداب باغوں اور پھلوں
یہ تو کفار کی گمراہ کن منطق ہے کہ وہ کسی کی شخصیت بلکہ تقربِ خدا کا دارومدار سرمایہ داری پر ہی سمجھتے ہیں جبکہ انبیاء علیہم السلام مبعوث
ہی اس لیے ہوئے ہیں تاکہ انسان کو یہ بتائیں کہ اے انسان! تیرے وجود کی عظمت مادی چیزوں کے ساتھ نہیں بلکہ علم و ایمان
اور تقویٰ کے ساتھ ہے۔
۵۔ وہ کس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "مسحور" اور "مجنون" سمجھتے تھے حالانکہ آپؐ کی تاریخِ زندگی بتاتی
ہے کہ آپؐ کی عقل کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ یہ آپؐ ہی کی عقل تھی جس کی وجہ سے دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا اور ایک نئے
تمدن کی بنیاد ڈالی گئی پھر کیونکر ممکن ہے کہ آپؐ کو ناروا اتہامات کے ساتھ متہم کیا جائے ہاں البتہ چونکہ آپؐ نے بت شکنی کا
انجام دیا اور گزشتہ لوگوں کی اندھادھند پیروی نہیں کی لہٰذا آپؐ کو "مجنون" کہا گیا۔
اس گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں پر "امثال" سے مراد (خاص کر آیۃ میں موجود قرائن کی وجہ سے) کمزور اور بے
باتیں ہیں۔ انھیں "امثال" سے شاید اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ ایسی بودی اور بے بنیاد باتوں کو حق کا جامہ پہنا کر اور
مدلل صورت میں تبدیل کر کے پیش کرتے جبکہ حقیقت کچھ اور ہوتی تھی[1]

نوٹ: حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ شکریہ

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ آپ کے دشمن کبھی آپؐ کو "ساحر" کہتے تھے یعنی جادوگر اور کبھی "مسحور" یعنی جس پر جادو کیا گیا ہو اگرچہ بعض
مفسرین کا خیال ہے کہ "مسحور" بمعنی "ساحر" کے ہوگا (کیونکہ کبھی کبھی اسم مفعول، اسم فاعل کے معنی میں بھی آجاتا ہے) لیکن ظاہر
یہ ہے کہ ان دونوں کا آپس میں فرق ہے۔

اگر آپؐ کو ساحر کہا جاتا تھا تو اس لیے کہ آپؐ کے کلام میں بہت زیادہ تاثیر تھی جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی اور چونکہ وہ
اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا آپ پر جادوگر ہونے کی تہمت لگاتے تھے۔

لیکن "مسحور" کے معنی ہیں ایسا شخص جس کی عقل پر جادوگروں نے قبضہ کرکے اس کے حواس مختل کر دیئے ہوں یہ تہمت آپؐ
پر اس لیے لگائی جاتی تھی کہ آپؐ نے غلط رسومات، ناجائز عادات اور خود غرضیوں کے خلاف قدم اٹھایا۔

ان سب الزامات کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ خدا نے یہ کیوں فرمایا ہے" فضلوا فلا یستطیعون سبیلًا " یعنی وہ اس حد تک
گمراہ ہو چکے ہیں کہ راہِ حق کی تلاش نہیں کر سکتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان اس وقت راہِ حق کو تلاش کر پائے گا جب حق کا خواہش مند اور طلبگار ہوگا لیکن اگر کوئی شخص
اپنی جہالت، ہٹ دھرمی اور دشمنی کی بناء پر اپنے غلط اور گمراہ کن اندازوں کے تحت فیصلے کرے تو نہ صرف یہ کہ وہ راہِ حق کو
تلاش نہیں کر سکے گا بلکہ حق کے مقابلے میں ڈٹ بھی جائے گا۔

سابقہ آیت کی طرح آخری آیت میں بھی خداوندِ عالم روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف فرماتے ہوئے اور
کفار و مشرکین کی باتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اور انھیں ناقابلِ اعتناء سمجھتے ہوئے کہتا ہے: بزرگ اور بابرکت
ہے وہ خدا کہ جو چاہے تو تجھے اس سے بھی بہتر چیزیں عطا فرما دے جو یہ لوگ کہتے ہیں، ایسے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں
اور ایسے محلات کہ جو عظیم ہوں (تبارك الذی ان شاء جعل لك خیرًا من ذٰلك جنات تجری من تحتها
الانهار و یجعل لك قصورًا)۔

تو کیا دوسرے لوگوں کو خدا کے علاوہ کسی اور نے باغات اور محلات عطا فرمائے ہیں۔

اور کیا اس کائنات اور اس کی نعمتوں اور زیبائشوں کو سوائے پروردگار کے کسی اور نے تخلیق فرمایا ہے؟ نہیں ہرگز
نہیں تو پھر کیا ان صفات کے مالک خدا کے لیے کوئی مشکل بات ہے کہ تجھے ان سے بہتر چیزیں عطا فرمائے؟ یقیناً وہ ایسا کر سکتا ہے

(حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) بہت سے مفسرین نے یہاں پر "امثال" کو "تشبیہات" کے معنی میں لیا ہے لیکن اس کی وضاحت نہیں کی کہ یہاں پر مشرکین نے
کون سی تشبیہ دی ہے بعض نے "امثال" کا معنی "صفات" کیا ہے کیونکہ "مفردات راغب" میں "مثل" کا ایک معنی "توصیف" بھی کیا گیا ہے اگر یہاں پر "امثال" سے
مراد "صفات" ہوں تو بھی بے بنیاد اور بے پایہ صفات ہی ہوں گی۔ کیونکہ آیت کی ابتداء اور انتہا میں کچھ ایسے قرائن پائے جاتے ہیں جو اسی بات پر
دلالت کرتے ہیں ایک طرف تو بطور تعجب کہتا ہے کہ ذرا دیکھیے تو سہی کہ وہ کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں اور دوسری طرف فرماتا ہے " ایسی توصیفات جو ان کی گمراہی کا
سبب بن گئی ہیں اور وہ پھر پلٹ جانے کے قابل بھی نہیں رہے "۔

لیکن اس لیے ایسا نہیں کرتا کہ لوگ تیری شخصیت کو مال و دولت اور محلات و باغات کا مرہونِ منت سمجھ کر تیری حقیقی شخصیت سے
غافل نہ ہو جائیں خدا چاہتا ہے کہ تیری زندگی بھی عوام الناس، مستضعف اور محروم و مظلوم لوگوں کی سی ہو تاکہ تو ایسے لوگوں کے لیے
جائے پناہ بن سکے۔

خدا یہ کیوں فرماتا ہے کہ اس کے پاس ایسے باغات اور محلات ہیں جو ان چیزوں سے بہتر ہیں جو کفار چاہتے ہیں کیونکہ خزانے بذاتہٖ
مشکلات کو آسان نہیں کرتے بلکہ وہ بہت محنت اور زبردست کوشش کے بعد باغات اور محلات میں تبدیل ہوتے ہیں اس کے
علاوہ وہ یہ کہتے تھے کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک باغ ہوتا جس سے وہ اپنی گزر اوقات کرتے لیکن قرآن کہتا ہے کہ خداوندِ عالم اپنے
رسول کو باغات بھی عطا فرما سکتا ہے اور محلات بھی دے سکتا ہے لیکن ان کی بعثت اور رسالت کا مقصد کچھ اور ہے۔

نہج البلاغہ کے "خطبہ قاصعہ" میں اس بارے میں ایک نہایت عمدہ بیان آیا ہے۔ امام علی بن ابی طالب علیہ السلام
فرماتے ہیں:

> موسیٰ اپنے بھائی (ہارون) کے ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچے دونوں کے بدن پر اونی لباس
> اور ہاتھوں میں عصا تھا اس حالت میں انھوں نے شرط پیش کی کہ اگر فرمانِ الٰہی کے سامنے جھک
> جائے تو اس کی حکومت اور ملک باقی اور اقتدار قائم و برقرار رہے گا۔ لیکن فرعون نے حاضرین
> سے کہا:
> تمہیں ان کی باتوں پر تعجب نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ شرط لگا رہے ہیں کہ میرے ملک کی بقا اور
> میری عزت کا دوام ان کی مرضی کے ساتھ وابستہ ہے جبکہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ فقر و تنگدستی ان کی
> حالت اور صورت سے ٹپک رہی ہے (اگر یہ سچ کہتے ہیں تو) خود انھیں طلائی کنگن کیوں
> نہیں دیئے گئے؟

فرعون نے یہ سب باتیں اس لیے کیں کہ وہ سونا اور اس کی جمع آوری کو عظمت کی اور اونی لباس پہننے کو حقارت کی
علامت سمجھتا تھا۔

لیکن اگر خدا اپنے انبیاء کو مبعوث کرتے وقت خزانوں کے اور سونے چاندی کی کانوں کے دروازے ان کے لیے کھ
چاہتا اور سرسبز و شاداب باغات ان کی ملکیت میں دینا چاہتا تو دے سکتا تھا اگر آسمان کے پرندے اور زمین کے وحشی جانور ان
ساتھ بھیجنا چاہتا تو بھیج سکتا تھا لیکن ایسا کرنے سے امتحان اور آزمائش کا وجود ختم ہو جاتا۔ سزا اور جزا کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ خدا
وعدے اور وعید بے اثر ہوتے۔ حق قبول کرنے والوں کے لیے آزمائے ہو ئے لوگوں کا سا اجر نہ ہوتا۔ مومنین نیکوکاروں کے سے ثواب
مستحق نہ ہوتے اور الفاظ اپنا معنیٰ اور مفہوم کھو دیتے۔

لیکن خداوندِ عالم نے اپنے انبیاء کو عزم و ارادہ کے لحاظ سے قوی اور ظاہری لحاظ سے غریب اور کمزور بنا کر بھیجا۔ ان کی غ
میں دل کی امیری اور آنکھوں کی قناعت شامل ہوتی ہے ہر چند کہ ظاہری تنگ دستی سے ان کی آنکھوں اور کانوں کو تکلیف ہ
ہوتی ہے۔

اگر انبیاء کے پاس بظاہر ایسی طاقت ہوتی جس سے کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوتی ان کے پاس اس قدر غلبہ ہوتا کہ کسی سے بھی مغلوب نہ ہوتے اور ایسی حکومت اور شان و شوکت کے مالک ہوتے کہ تمام دنیا کی آنکھیں انھی کی طرف لگی ہوتیں اور لوگ دور دراز سے رختِ سفر باندھ کر ان کی طرف کھنچے چلے آتے تو ان کی قدر و قیمت عام لوگوں کے لیے تو بہت ہوتی اور متکبرین ان کے آگے سرِ تعظیم جھکا دیتے اور اپنے ایمان کا اظہار کرتے لیکن ان کا یہ ایمان مقصد سے پیار اور دلچسپی کی بنا پر نہ ہوتا بلکہ اس خوف کی وجہ سے ہوتا جو ان پر غالب آتا یا مادیت سے محبت کی وجہ سے ہوتا ایسی صورت میں ان کی نیت ہرگز خالص نہ ہوتی بلکہ ان کے اعمال میں غیر خدا کی شرکت بھی ہوتی [1]

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ باغات اور محلات سے مراد آخرت کے باغات اور محل ہیں لیکن یہ تفسیر کسی بھی صورت میں آیت کے ظاہری مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی [2]

---

[1] خطبہ ۱۹۲ نہج البلاغہ (خطبہ قاصعہ)۔

[2] اسی طرح کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس سے مراد دنیا کے محل اور آخرت کے باغات ہیں آیت میں فعل ماضی اور مضارع (جعل اور یجعل) کو ایسے توہمات کا سبب نہیں بننا چاہیے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ عربی ادب کے قواعد کے تحت جب افعال جملہ شرطیہ میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کا زمانی مفہوم ختم ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا ۝

۱۲۔ إِذَا رَأَتْهُمْ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ۝

۱۳۔ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ۝

۱۴۔ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ۝

۱۵۔ قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَمَصِيرًا ۝

۱۶۔ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُولًا ۝

ترجمہ

۱۱۔ (یہ تو سب بہانے ہیں) بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلایا ہے اور ہم نے قیامت کو جھٹلانے والے لوگوں کے لیے جلانے والی آگ مہیا کر رکھی ہے۔

۱۲۔ جب یہ آگ انھیں دُور سے دیکھے گی تو اس کی وحشت ناک آواز کو سنیں گے جس میں جوش و خروش شامل ہوگا۔

۱۳۔ جب وہ طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے جہنم کی تنگ جگہ میں ڈالے جائیں گے تو واویلا کریں گے۔

۱۴۔ آج ایک مرتبہ واویلا نہ کرو بلکہ کئی مرتبہ واویلا کرو۔

۱۵۔ کہہ دے کہ آیا یہ بہتر ہے یا بہشتِ جاودانی جس کا پرہیزگاروں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے؟ ایسی بہشت جو اُن کے اعمال کی جزا اور ان کی رہائش گاہ ہے۔

۱۶۔ وہ جو کچھ بھی چاہیں گے ان کے لیے وہاں موجود ہے اور اس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے یہ ایک مسلّم اور حتمی وعدہ ہے جو تمھارے پروردگار نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے۔

تفسیر

بہشت اور دوزخ کا موازنہ

گزشتہ آیات میں توحید اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے کفار کے انحراف کے بارے میں گفتگو

تھی۔ ان آیات میں ان کے انحرافات اور انکار کے ایک اور حصے کو بیان کیا گیا ہے جو قیامت اور معاد کے بارے میں ہے۔ دراصل اس حصے کو بیان کرنے کے ساتھ یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ تمام اصولِ دین میں تزلزل اور انحراف کا شکار تھے، خواہ توحید ہو یا نبوت یا معاد اور قیامت ہو۔ گزشتہ آیات میں تو توحید اور نبوت کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے اب تیسرے حصے کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلایا ہے (بل کذبوا بالساعة)۔

کلمہ "بَلْ" کا ذکر جو اصطلاح میں "اضراب" کے لیے آتا ہے، اس لیے ہے کہ کفار توحید اور نبوت کی نفی میں جو کچھ کہتے ہیں وہ درحقیقت معاد کے انکار کی وجہ سے پیدا ہونے والے بہانے ہوتے ہیں کیونکہ جو شخص خدا کی اس قدر عظیم عدالت ثواب و جزا پر ایمان رکھتا ہے وہ اس طرح بے پرواہ ہو کر حقائق کا منہ نہیں چڑاتا اور جس پیغمبر کی نبوت کے دلائل روزِ روشن کی طرح آشکار ہیں محض چند فضول اور بے بنیاد حیلے بہانوں کی وجہ سے اس کی دعوت کا انکار نہیں کرتا اور جن بتوں کو اپنے ہاتھوں سے بنایا سنوارا ہے ان کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

البتہ اس مقام پر قرآنِ مجید نے استدلالی جواب پیش نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ نہ تو اہلِ منطق تھے اور نہ قابلِ استدلال، بلکہ انھیں دل ہلا دینے والی تنبیہ کے ساتھ ان کے نحس اور دردناک مستقبل کو ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم کرتا ہے کیونکہ اس طرح کے لوگوں کے لیے ایسی ہی منطق کارگر ہوتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: جو لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں ہم نے ان کے لیے جلا دینے والی آگ مہیا کر رکھی ہے (واعتدنا لمن کذب بالساعة سعیرًا)۔[1]

پھر اس آتشِ سوزاں کی عجیب و غریب صفات بیان کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: جب یہ آتش انھیں دُور سے دیکھے گی تو اس طرح طیش میں آجائے گی کہ وہ اس کی وحشت ناک اور خشم آلود آواز کو سنیں گے جس میں جوش و خروش شامل ہوگا (اذا رأتھم من مکان بعید سمعوا لھا تغیظًا و زفیرًا)۔

اس آیت میں کچھ ایسی منہ بولتی تعبیریں ہیں جو خدا کے اس عذاب کی شدت کی خبر دیتی ہیں۔

۱۔ خدا یہ نہیں فرماتا کہ جہنمی لوگ جہنم کی آگ کو دُور سے دیکھیں گے بلکہ فرماتا ہے کہ آگ انھیں دُور سے دیکھے گی گویا اس کی آنکھیں اور کان ہیں اور وہ ان گنہ گاروں کی چشم براہ ہے۔

۲۔ اسے اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ لوگ اس کے نزدیک ہوں اور وہ طیش میں آئے بلکہ بعض روایات کے مطابق ایک سال کی راہ کے فاصلے سے انھیں دیکھے گی اور غضبناک ہو جائے گی۔

۳۔ اس جلا دینے والی آگ کی توصیف "تغیظ" کے کلمہ کے ساتھ ہوئی ہے اور "تغیظ" غصے کی اس حالت کو کہتے ہیں جسے انسان زور زور سے چیخ و پکار کر کے ظاہر کرتا ہے۔

---

[1] سعیرًا "سعر" (بروزن "قعر") کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں آگ کا بھڑک اٹھنا اسی بنا پر "سعیر" اس آگ کو کہتے ہیں جس میں شعلے بھی ہوں، وسعت بھی ہو، زبردست حرارت بھی۔

۴۔ دوزخ کی آگ کے لیے "زفیر" کا لفظ بیان فرمایا گیا ہے اور "زفیر" اس حالت کو کہتے ہیں جب انسان اپنی سانس اندر کی طرف لے جاتا ہے اور پسلیاں اوپر کو اٹھتی ہیں۔ یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب انسان سخت غصے کی حالت میں ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ حالات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جہنم کی آتشِ سوزاں اس بھوکے درندے کی مانند ہے جو اپنے شکار کے انتظار میں ہوتا ہے جہنم بھی ایسے کافروں کے انتظار میں منہ کھولے ہوئے ہے (خدا کی پناہ)۔

یہ تو تھی دوزخ کی وہ کیفیت جب وہ انھیں دُور سے دیکھے گی لیکن خود جہنمیوں کی کیا کیفیت ہو گی جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے؟ تو فرماتا ہے: جب وہ طوق اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے آتشِ جہنم کی تنگ جگہ میں ڈالے جائیں گے تو ان کے واویلا کی چیخیں بلند ہوں گی (و اذا القوا منھا مکانًا ضیقًا مقرنین دعوا ھنالك ثبورًا)۔[1]

یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ جہنم کی جگہ بہت کم ہے کیونکہ سورہ "ق" کی آیت ۳۰ کے مطابق:

یوم نقول لجھنم ھل امتلأت و تقول ھل من مزید

بروزِ قیامت ہم جتنا بھی جہنم سے کہیں گے کہ کیا تو بھر گئی ہے تو وہ کہے گی کچھ اور ہے؟

بنابریں جہنم تو وسیع ہو گی لیکن انھیں اس وسیع و عریض جگہ میں اس قدر تنگ کر دیا جائے گا کہ بعض روایات کی تصریح کے مطابق جیسے دیوار میں میخ گاڑی جاتی ہے۔[2]

یہاں پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ "ثبور" کا لفظ دراصل "ہلاکت" اور "گل سڑ جانے" کے معنی میں ہے۔ جب انسان کو کسی بھیانک اور مہلک چیز کے سامنے لایا جاتا ہے تو بسا اوقات "واثبورا" کہہ کر چیخ مارتا ہے جس کا معنی ہے "ہائے میں مر گیا"۔ لیکن فوراً انھیں کہا جائے گا: آج صرف ایک مرتبہ "واثبورا" نہ کہو بلکہ کئی مرتبہ واثبورا کی آوازیں بلند کرو (لا تدعوا الیوم ثبورًا واحدًا وادعوا ثبورًا کثیرًا)۔

بہرحال تمھاری یہ چیخ و پکار قطعاً کارگر ثابت نہیں ہو گی اور تمھیں ہرگز موت نہیں آئے گی بلکہ تمھیں وہاں پر زندہ رہ کر ہی عذاب کا مزہ چکھنا ہو گا۔

درحقیقت یہ آیت بالکل سُورۂ طور کی آیت ۱۶ کی مانند ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

اصلوھا فاصبروا او لا تصبروا سواء علیکم انما تجزون ما کنتم تعملون

یعنی جہنم کی آگ میں جلتے رہو خواہ صبر کرو یا نہ کرو، تمھارے لیے دونوں صورتیں یکساں ہیں، تم

---

[1] "مقرنین" "قرن" کے مادے سے ہے جس کا معنیٰ ہے دو یا چند چیزوں کا باہمی اجتماع۔ جس رسی سے کئی چیزوں کو باندھتے ہیں اسے بھی قرن کہتے ہیں لیکن جس شخص کو طوق اور زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے اسے بھی ——— اسی مناسبت سے ——— "مقرن" کہتے ہیں (اس لغت کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد سورۂ ابراہیم کی آیت ۴۹ کی طرف رجوع فرمائیں)

[2] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

اپنے کیئے کی جزا پا رہے ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کافروں سے یہ باتیں کون کرے گا؟ تو قرآن یہ بتاتے ہیں کہ عذاب کے فرشتے ہی ہوں گے کیونکہ ان کے ساتھ فرشتے ہی سروکار رکھیں گے۔

انھیں کس لیے کہا جائے گا کہ "واثبورا" صرف ایک مرتبہ نہ کہو بلکہ کئی بار کہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس لیے ہو کہ ان کے لیے دردناک عذاب عارضی اور محدود نہیں ہوگا کہ ایک بار واثبورا کہہ دینے سے ختم ہوجائے بلکہ وہ ہمیشہ اسی جملے کو دہراتے رہیں اور پھر کہ ان ظالموں کو خداوند عالم مختلف انداز میں عذاب دیتا رہے گا اور وہ ہر نئے عذاب کے موقع پر اپنی موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور واویلا کریں گے گویا وہ بار بار مارے اور جلائے جاتے رہیں گے۔

پھر روئے سخن رسول اللہؐ کی طرف کرکے آنحضرتؐ کے ذریعے کفار کو ایک بات کے فیصلے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے: اے پیغمبر! کہہ دیجیے کہ یہ دردناک انجام بہتر ہے یا وہ بہشت بریں جس کا پرہیزگار لوگوں سے وعدہ کیا جا چکا ہے، جو ان کے اعمال کی جزا بھی ہے اور رہائش گاہ بھی (قل اذالك خير ام جنة الخلد التي وعد المتقون كانت لهم جزاء ومصيرًا)۔

وہی بہشت کہ جس میں ہر وہ چیز مہیا ہے جس کی وہ خواہش کریں گے (لهم فيها ما يشاءون)۔

وہی بہشت کہ جس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے (خالدين)۔

"تمھارے پروردگار کا یہ حتمی اور مسلّم وعدہ ہے جسے اس نے اپنے ذمّے لے لیا ہے (كان على ربك وعدًا مسئولًا)۔

انھیں فیصلے کی دعوت اس لیے نہیں ہے کہ اس میں کسی کو کوئی شک و شبہ ہے اور نہ ہی اس دردناک اور وحشت ناک عذاب کا ان بے نظیر نعمتوں سے کوئی مقابلہ اور موازنہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس طرح کے سوالات اور فیصلہ جات کی دعوت صرف ان کے سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کرنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ اس طرح سے وہ بیدار ہو کر کسی واضح امر اور ایک دوراہے پر آکھڑے ہوں۔

اگر تو وہ کہتے ہیں کہ وہی نعمتیں بہتر اور برتر ہیں (اور یقیناً کہنا بھی چاہیے) تو خود اپنے خلاف فیصلہ دیں گے کیونکہ ان کے عمل اس کے برعکس ہیں اور اگر کہتے ہیں کہ نعمتوں سے عذاب بہتر ہے تو اپنی حماقت اور بے عقلی پر مہرِ تصدیق ثبت کردیں گے۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہوگا کہ جیسے ہم کسی سکول یا کالج سے بھاگنے والے طالب علم کو خبردار کرتے ہوئے کہیں کہ دیکھو! جو لوگ علم کے حصول سے فرار کرتے ہیں یقیناً وہ تباہ و برباد ہوجاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا زندان ہوتا ہے تم یا جیل بہتر ہے یا اعلیٰ منصب؟

چند ایک نکات

۱۔ اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیات میں ایک مقام پر تو "خلد" اور ہمیشگی کو بہشت کی صفات کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے اور دوسری جگہ اہلِ بہشت کے "خالد" اور ہمیشہ رہنے کی حالت بیان کی گئی ہے اور یہ دونوں

[چی]زیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ بہشت بھی ہمیشہ کے لیے ہے اور اس میں رہنے والے بھی وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

۲۔ "لهم فيها ما يشاءون" (جو کچھ وہ چاہیں گے بہشت میں موجود ہوگا) کا جملہ جہنمیوں کے بارے میں [آ]نے والے اس جملہ کے ٹھیک مقابل میں ہے؛

وحيل بينهم وبين ما يشتهون

جہنمیوں اور ان کی مطلوبہ چیزوں کے درمیان رکاوٹ کھڑی کردی گئی ہے۔ (سبا — ۵۴)

۳۔ بہشت کے بارے میں "مصير" (ٹھکانا، لوٹ آنے کی جگہ) کو "جزاء" کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ درحقیقت جزا کے مفہوم میں جو کچھ آسکتا ہے یہ اسی کی تاکید ہے اور جہنمیوں کے ٹھکانے اور ان کی سزا کا متقابل نقطہ ہے جو سابقہ آیات میں ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوں گے اور خود ایک تنگ جگہ میں مقید ہوں گے۔

۴۔ "كان على ربك وعدًا مسئولًا" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین اپنی دعاؤں میں تمام نعمتوں سمیت بہشت کی درخواست کرتے ہیں گویا وہ "سائل" ہیں اور خداوندِ عالم "مسئول عنہ" ہے جیسا کہ خداوندِ عالم سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۹۴ میں مومنین کا قول بیان کرتا ہے:

ربنا واتنا ما وعدتنا على رسلك

"اے ہمارے پروردگار! جو کچھ تو نے ہمارے بارے میں اپنے رسولوں سے وعدہ فرمایا ہے وہ ہمیں عنایت فرما۔"

نیز زبانِ حال سے یہ درخواست تمام مومنین کی ہے کیونکہ جو شخص بھی اس کے فرمان کی اطاعت کرتا ہے زبانِ حال کے ساتھ اس کی یہی درخواست ہے۔

اسی طرح فرشتے بھی مومنین کے بارے میں خدا سے یہی درخواست کرتے ہیں جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۸ میں ہے:

ربنا وادخلهم جنات عدن التي وعدتهم

"اے ہمارے پروردگار! تو نے مومنین کے ساتھ بہشت کے جن جاودانی باغات کا وعدہ فرمایا تھا ان میں انھیں داخل فرما۔"

یہاں پر ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ "مسئولا" کا کلمہ خداوندِ عالم کے حتمی وعدے کی تاکید ہے یعنی یہ وعدہ اس قدر حتمی، قطعی اور یقینی ہے کہ مومنین اس کا مطالبہ خدا سے کر سکتے ہیں۔ یہ بعینہٖ ایسے ہے جیسے ہم کسی سے کوئی وعدہ کریں اور اسے یہ حق بھی دے دیں کہ جب چاہے ہم سے اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

البتہ اگر ان تمام معنی کو "مسئولا" کے وسیع مفہوم میں جمع کردیں تو کوئی حرج نہیں۔

۵۔ "لهم فيها ما يشاءون" (جو کچھ وہ چاہیں گے وہاں موجود ہوگا) کے جملے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کچھ لوگوں کے لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جملے کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مثلاً اگر بہشتی لوگ انبیاء اور اولیاء کے مقام کی بھی خواہش کریں تو وہ انھیں مل جائے گا یا اگر اپنے گناہ گار دوستوں اور رشتہ داروں کی نجات کی خواہش کریں تو وہ بھی پوری

ہو جائے گی یا اس قسم کے دوسرے سوالات ۔

لیکن اگر ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا وہ یہ کہ اہل بہشت کی آنکھوں کے سامنے سے تمام پردوں کو ہٹا دیا جائے گا، وہ حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیں گے اور باہمی تناسب ان کے لیے مکمل طور پر واضح ہو جائے گا ۔ وہ کبھی اس بارے میں سوچیں گے بھی نہیں کہ خدا سے ایسی چیزوں کی درخواست کریں جیسے ہم دنیا میں اس بات کا تقاضا نہیں کر سکتے کہ پرائمری کلاس کا ایک طالب علم یونیورسٹی کا پروفیسر بن جائے ۔ آیا اس طرح کی باتیں دنیا میں کسی عقل مند کے ذہن میں آسکتی ہیں ؟ اگر یہاں پر ایسا نہیں ہے تو وہاں پر بھی ایسا نہیں ہو سکتا ۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر ان کی خواہشات خداوند عالم کی مرضی کے تابع ہوں گی ۔ وہ وہی کچھ چاہیں گے جو خدا چاہے گا ۔

۱۷۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ
عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝
۱۸۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ
اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا
قَوْمًا بُوْرًا ۝
۱۹۔ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ
يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۷۔ اس دن کا سوچو جب خدا ان سب کو اور ان معبودوں کو جن کی یہ خدا کے علاوہ پرستش کرتے ہیں اکٹھا کرے گا اور ان سے کہے گا : کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا ہے یا وہ خود گمراہ ہوئے ہیں ؟

۱۸۔ تو وہ (جواب میں) کہیں گے تو پاک و منزہ ہے ہمارے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ ہم تیرے علاوہ اور لوگوں کو اپنا ولی بناتے، لیکن تو نے انھیں اور ان کے آباؤ اجداد کو نعمتوں سے نوازا ۔ یہاں تک کہ انھوں نے (شکر نعمت کی بجائے) تیرے ذکر کو فراموش کر دیا اور ہلاک ہو گئے ۔

۱۹۔ (خداوند عالم ان سے فرمائے گا دیکھو) جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ تمھاری تکذیب کر چکے ہیں اب نہ تو تم عذاب خدا کو برطرف کر سکتے ہو اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکتے ہو اور تم میں سے جو شخص بھی ظلم کرے گا ہم اسے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے ۔

تفسیر

معبودوں اور گمراہ پجاریوں کا مقدمہ

گزشتہ آیات میں قیامت کے دن مومنین اور مشرکین کے انجام کی بابت بات ہو رہی تھی ۔ زیر بحث آیات اسی موضوع کو

ایک اورصورت میں پیش کررہی ہیں خداوندِعالم بروزِقیامت "مشرکین کے معبودوں" سے جوسوال کرے گا اسے اوروہ جوجواب دیں گے اسے بھی ایک تنبیہ کی صُورت میں بیان فرمارہا ہے۔

پہلے توفرماتا ہے: اس دن کاسوچوجب خدا ان سب کواوران کے معبودوں کوکہ جن کی اللہ کےعلاوہ یہ لوگ عبادت کرتے ہیں جمع اورمحشورکرے گا(ویوم یحشرھم و مایعبدون من دون اللہ)۔

اوران سے سوال کرے گا" آیاتم نے میرے ان بندوں کوگمراہ کیاہے یایہ خودگمراہ ہوگئےہیں (فیقول ءانتم اضللتم عبادی ھٰؤلاء ام ھم ضلوا السبیل)۔

لیکن وہ جواب دیں گے پروردگارا! توپاک ومنزہ ہے ہمارے لیے یہ مناسب نہیں تھاکہ تجھے چھوڑکر دوسروں کو اپناولی بناتے (قالوا سبحانک ما کان ینبغی لنا ان نتخذ من دونک من اولیاء)۔

نہ صرف یہ کہ ہم نے انھیں اپنی طرف دعوت نہیں دی بلکہ ہم توتیری ولایت اورعبودیت کے معترف بھی تھے اورتیرے علاوہ کسی اورکو نہ تواپنا معبود سمجھا اورنہ ہی دوسروں کا۔

ان کی گمراہی کاسبب یہ تھاکہ تونے انھیں اوران کے آباؤاجداد کودنیاوی نعمتوں سے نوازا (اوروہ تیری ان نعمتوں کاشکر اداکرنے کی بجائے عیش وعشرت اوردنیاوی لذات میں کھوگئے) اورسب تجھے بھلادیا (ولکن متعتھم واٰباءھم حتّٰی نسوا الذکر)۔

اسی وجہ سے وہ تباہ وبرباد ہوگئے (وکانوا قومًا بورًا)۔

اب خداکاروئے سخن مشرکین کی طرف ہے اورفرماتا ہے: تمھارے یہ معبود توتمھاری تکذیب کررہے ہیں (اوریہ جوتم کہتے تھے کہ انھوں نے تمھیں گمراہ کیاہے اوراپنی عبادت کی طرف دعوت دی ہے اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہ تمھیں جھٹلارہے ہیں) (فقد کذبوکم بما تقولون)۔

جب صورتِ حال یہ ہے اورتم خود ہی گمراہ ہوئے ہوتواب تم عذابِ الٰہی کواپنے سے برطرف نہیں کرسکتے اورنہ تم اپنی مدد آپ کرسکتے ہواورنہ ہی کسی دوسرے سے مدد طلب کرسکتے ہو(فما تستطیعون صرفًا ولانصرًا)۔

اورجوشخص بھی تم میں سے ظلم کاارتکاب کرے گاہم اسے بڑے سخت عذاب کامزہ چکھائیں گے (ومن یظلم منکم نذقہ عذابًا کبیرًا)۔

اس میں شک نہیں کہ ظلم کاایک وسیع مفہوم ہے اگرچہ اس آیت میں موضوعِ بحث "شرک" ہےلیکن یہ بھی ظلم کاایک واضح ترین مصداق ہے اس طرح سے مفہوم آیت کے کلی ہونے پرکوئی اثرنہیں پڑتا۔

قابلِ غوربات یہ ہے کہ "من یظلم" فعل مضارع کی صُورت میں آیا ہے اوراس بات کی نشاندہی کررہا ہے کہ بحث کاابتدائی حصّہ اگرچہ قیامت سے متعلق ہے لیکن آخری جملہ انھیں دنیا میں خطاب کی صورت میں آیاہے۔ گویا قیامت کے دن گمراہ کاروں اورمعبودوں کی گفتگوسن کرمشرکین کے دل اثرحاصل کرنے کے لیے تیار ہوچکے ہیں، لہذا روئے سخن آخرت سے دنیا کی طرف کرلیا اورفرمایا: تم میں سے جوشخص بھی ظلم کامرتکب ہوگاہم اسے بڑے سخت

عذاب کامزہ چکھائیں گے [1]

چنداہم نکات

۱۔ معبود سے کیامراد ہے؟ اس سوال کے جواب میں مفسّرین کے درمیان دوتفسیریں مشہور ہیں:

پہلی تفسیرتویہ ہے کہ ان سے مراد انسانی معبود(جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام) یاشیطانی معبود(جیسے جنات) یافرشتے ہیں ان میں سے ہرایک کومشرکین کے مختلف گروہوں نے انتخاب کیاہواتھا۔

چونکہ یہ صاحبانِ عقل وشعور ہیں لہذا ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی کیونکہ مشرکین کہتے ہیں کہ ان معبودوں ہی نے ہمیں اپنی عبادت کی طرف بلایا ہے لہذا اتمامِ حُجّت کے طورپران سے پوچھا جائے گا کہ آیا ان کی یہ بات صحیح ہے تووہ بڑی صراحت کے ساتھ اس کی تردید کریں گے۔

دوسری تفسیرجسے کچھ اورمفسرین نے ذکرکیاہے یہ ہے کہ بروزِقیامت خداوندِعالم "بتوں" کوایک طرح کی زندگی، ادراک اورشعورعطا فرمائے گا تاکہ ان سے جوبازپرس کی جائے تووہ اس کابہترطریقے پرجواب دے سکیں کہ خداوندا! ہم نے انھیں گمراہ نہیں کیابلکہ وہ خودہی خواہشاتِ نفسانی اورکبروغرور کی وجہ سے گمراہ ہوچکے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ تمام معبودوں کے لیے ہوخواہ وہ صاحبانِ عقل وشعورہیں اورجواپنی زبان سے حقائق اورواقعات بیان کریں گے خواہ عقل وشعور سے عاری خدا کی مخلوق ہے اورجوزبانِ حال سے حقائق کوبیان کرے گی۔

لیکن آیت میں پائے جانے والے قرائن پہلی تفسیرسے زیادہ ہم آہنگ ہیں کیونکہ افعال اورضمائر بتارہے ہیں کہ یہاں صاحبان عقل وشعور کے بارے میں گفتگوہورہی ہے اوریہ حضرت عیسیٰؑ اورفرشتوں جیسے معبودوں کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

اس کے علاوہ "فقد کذبوکم" (انھوں نے تمھیں جھٹلایا) کے جملے سے ایسامعلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے پہلے یہ دعویٰ کیاکہ ان معبودوں نے ہمیں گمراہ کیاہے اوراپنی عبادت کی دعوت دی ہے اوریہ بعید ہے کہ وہ ایسادعویٰ پتھراورلکڑی کے بنے ہوئے بتوں کے بارے میں کریں کیونکہ ——— جیساکہ ابراہیم علیہ السّلام کی داستان میں مذکورہے کہ ——— انھیں اچھی طرح یقین ہے کہ بُت بولانہیں کرتے "لقد علمت ما ھٰؤلاء ینطقون" (سُورۂ انبیاء ——— ۶۵)

جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں ہے کہ خداعیسیٰؑ سے دریافت فرمائے گا:

"ءانت قلت للناس اتخذونی و امی الٰھین من دون اللہ"

آیاتم نے لوگوں سے کہاہے کہ خداکوچھوڑکرمجھے اورمیری ماں کومعبود بناؤ؟ (مائدہ ——— ۱۱۶)

---

[1] ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ آخری جملہ شاید قیامت میں مشرکین کے ساتھ گفتگوکاایک حصّہ ہے اورفعل مضارع ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتاکیونکہ "ومن یظلم ......" کاجملہ ایک کلیہ قاعدہ کی صُورت میں آیاہے جوکہ "جملہ شرطیہ" کی صورت میں ہے اہلِ علم جانتے ہیں کہ جملہ شرطیہ میں افعال کاتعلق صرف شرط اورجزا کی حد تک ہوتاہے زمانے کامفہوم ختم ہوجاتاہے۔

معبودوں کی نوعیت خواہ کچھ ہو، یہ بات مسلّم ہے کہ مشرکین اور بُت پرستوں کے دعوے بے بنیاد اور فضول ہیں اور کسی معبود نے انھیں اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی ۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ معبود جواب میں یہ نہیں کہیں گے کہ خدایا ہم نے انھیں اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی بلکہ یہ کہیں گے کہ ہم نے تو اپنی عبادت کے لیے تیری ہی ذات کا انتخاب کیا تھا ۔ یعنی جب ہم خود تیری عبادت کرتے ہیں تو دوسروں کو تو بطریقِ اولیٰ تیرے غیر کی طرف راہنمائی نہیں کی، خاص کر یہ بات "سبحانك " (تو پاک ہے) اور "ما کان ینبغی لنا " (ہمارے لیے زیبا نہیں تھا) کے جملوں سے مربوط ہے جو ان کے ادب اور توحید کے اعتراف کو نمایاں کرتی ہے ۔

۲۔ توحید سے انحراف کیوں ؟ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ یہ معبود مشرک لوگوں کے انحراف کی وجہ ان کی آسودہ اور خوشحال زندگی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خداوندا ! تو نے انھیں اور ان کے آباؤ اجداد کو اس زندگی کی نعمتوں سے نوازا جس کی وجہ سے انھوں نے تجھے بھلا دیا وہ نعمت عطا کرنے والے کی معرفت حاصل کرنے، اس کا شکر ادا کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کی بجائے غفلت اور غرور کے چکر میں پھنس کر بیٹھے اور روزِ قیامت کو بھول گئے یہی بات ہے کہ جن لوگوں کا ظرف چھوٹا اور ایمان کی بنیادیں کمزور ہیں ان کے لیے خوش حال زندگی ایک تو "غرور آفرین" ہے کیونکہ جب انھیں بے پناہ نعمتیں مل جاتی ہیں تو وہ اپنے قابو میں نہیں رہتے اور خدا کو بھلا دیتے ہیں حتیٰ کہ کبھی کبھی تو فرعون کی مانند "انا اللہ " (میں خدا ہوں) کا نعرہ لگانا بھی شروع کر دیتے ہیں ۔

دوسرے یہ چاہتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ بے لگام اور آزاد ہوں اور ان کی عیش و عشرت اور خواہشات کی تکمیل کے آگے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز نامی چیزیں انھیں اپنے مقصد تک پہنچنے سے نہ روکیں، یہی وجہ ہے کہ وہ شرعی قوانین اور روزِ جزا کو تسلیم کرنے سے کنی کتراتے ہیں ۔

اب بھی آسودہ حال لوگوں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو خدا کے دین اور انبیاء کی تعلیمات کے طرفدار ہوں یہ تو مستضعف اور غریب لوگ ہی ہوتے ہیں جو دین و مذہب کے طرفدار اور ایثار پیشہ و وفاشعار ہوتے ہیں ۔

البتہ استثناء تو دونوں طبقوں میں ہوتا ہی ہے لیکن بات اکثریت کی ہو رہی ہے اور اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ابھی بتایا جا چکا ہے ۔

یہ بھی یاد رہے کہ آیتِ بالا میں صرف ان لوگوں کی امارت اور خوشحالی تک ہی بات محدود نہیں ہے بلکہ ان کے آباؤ اجداد کی خوشحالی کا ذکر بھی ہے کیونکہ انسان جب بچپن ہی سے ناز و نعمت کی زندگی میں پرورش پائے گا تو فطری بات ہے کہ وہ عموماً اپنے اور دوسرے میں فرق محسوس کرے گا اور آسانی کے ساتھ خوشحال زندگی کو خیرباد کہنے کے لیے تیار نہیں ہوگا ۔

اس کے برعکس خدائی احکام کی بجا آوری اور مذہبی مسائل کی پابندی کے لیے ایثار، ہجرت، جہاد بلکہ بعض اوقات شہادت تک کو قبول کرنا پڑتا ہے انواع و اقسام کی نعمتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے اور دشمن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرنا پڑتا اور یہ بات امراء طبقہ کے مزاج کے بالکل خلاف ہے البتہ جن لوگوں کی شخصیت مادیت کے بندھنوں سے بالکل آزاد ہے اگر کبھی کچھ پاس ہوتا ہے تو خدا کا شکر بجا لاتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو گھبرا نہیں جاتے دوسرے لفظوں میں وہ اپنی مادی زندگی پر حاکم ہوتے ہیں نہ کہ محکوم ۔

اس وضاحت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ " نسوا الذکر " کے جملے سے مراد یادِ خدا کو فراموش کر دینا ہے جیسا کہ

سورہ حشر آیہ ۱۹ میں اس جملے کی بجائے "ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ " آیا ہے یا ذکر کی فراموشی سے مراد یوم قیامت اور عدلِ الٰہی کی فراموشی ہے جیسا کہ سورہ ص کی آیہ ۲۶ میں ہے :

لهم عذاب شديد بما نسوا يوم الحساب

روزِ حساب کو فراموش کر دینے کی وجہ سے ان کے لیے سخت عذاب ہے ۔

اور یا خدا اور قیامت دونوں کو فراموش کرنا مراد ہے ۔

۳۔ "بور" کیا ہے ؟

"بور" کا لفظ "بوار" سے لیا گیا ہے جو اصل میں کسی چیز کی سخت کساد بازاری کے معنی میں ہے اور چونکہ کساد بازاری کی شدت اس کے فاسد ہونے کا سبب بن جاتی ہے جیسا کہ عربوں کی ضرب المثل ہے "کسد حتیٰ فسد " لہٰذا یہ کلمہ فاسد ہونے اور ہلاک ہو جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اس بنجر زمین کو "بائر" کہتے ہیں جو درختوں، پھولوں اور سبزے سے خالی ہوتی ہے کیونکہ درحقیقت وہ مردہ اور فاسد ہو چکی ہوتی ہے ۔

بنا بریں "کانوا قوما بورا " اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امراء کا یہ گروہ خوشحال اور مادی زندگی میں مستغرق ہو کر خدا اور قیامت کو فراموش کر چکا ہے اور اسی وجہ سے وہ فساد اور ہلاکت کا شکار ہو چکا ہے اور ان کے دل بنجر زمین کی مانند خشک ہو چکے ہیں اب ان سے نہ تو انسانیت کی سربلندی کے لیے قیمتی پھولوں کی توقع ہے اور نہ ہی معنوی زندگی اور فضیلت کے میووں کی ۔

ان قوموں کے حالات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے جو آج ناز و نعمت میں غرق خدا اور خلقِ خدا سے بے خبر ہیں تو آیت کے عمیق معانی کا پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کس طرح اخلاقی فساد کے سمندر میں غرق ہو چکی ہیں اور فضائلِ انسانی کے میوے ان کی بنجر زمین سے کس طرح ناپید ہو چکے ہیں [1]

---

[1] بعض لوگ "بور" کو مصدر سمجھتے ہیں جو کبھی کبھار اسم کے فاعل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور واحد تثنیہ اور جمع کے صیغے کے لیے یکساں ہوتا ہے جبکہ بعض نے اسے "بائر" کی جمع مانا ہے ۔

۲۰۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمۡ لَيَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَيَمۡشُوۡنَ فِى الۡاَسۡوَاقِ‌ؕ وَجَعَلۡنَا بَعۡضَكُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَةً ؕ اَتَصۡبِرُوۡنَ‌ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيۡرًا ۝

ترجمہ

۲۰۔ ہم نے تجھ سے پہلے رسولوں کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ بھی کھانا کھاتے اور بازار میں چلتے پھرتے تھے اور تم میں سے بعض کو دوسرے بعض لوگوں کے لیے آزمائش کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ آیا صبر کرتے ہو؟ (اور امتحان سے عہدہ برآ ہوتے ہو؟) اور تیرا پروردگار بصیر اور دیکھنے والا ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ مشرکین کے کچھ سرغنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر کہنے لگے اے محمدؐ! تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اگر حکومت کی ضرورت ہے تو ہم تجھے اپنا حاکم اور سرپرست بناتے ہیں اگر مال چاہتے ہو تو ہم تجھے مال دیئے دیتے ہیں وغیرہ۔ لیکن جب آپؐ نے ان کی کسی پیش کش کو بھی قبول نہ کیا اور نہ ہی ان کی خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تو لگے وہ مختلف قسم کی الزام تراشی کرنے اور کہنے لگے کہ تو خدا کا رسول کیسے ہو سکتا ہے جبکہ تو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازار میں بھی آتا جاتا ہے؟

وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانا کھانے پر مطعون کرنے لگے کیونکہ ان کے خیال میں پیغمبر کو فرشتہ ہونا چاہیے تھا وہ آپؐ کو بازار آنے جانے پر ملامت کرنے لگے کیونکہ وہ کسریٰ وقیصر اور دوسرے جابر بادشاہوں کے بارے میں جانتے تھے کہ انھوں نے کبھی بھی بازار میں قدم نہیں رکھا جبکہ آنحضرتؐ کا عام لوگوں کے ساتھ بازار میں میل ملاپ اور اٹھنا بیٹھنا تھا۔ جس سے وہ لوگوں کو خدا کے امر و نہی کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے چنانچہ مکار لوگوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ وہ ہم پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے جبکہ اس کی روش اور طریقہ کار بادشاہوں کے برعکس ہے تو ایسے موقع پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت سابقہ انبیاء جیسی ہے[۱]

---

[۱] اگرچہ روایت بالا کا مضمون بہت سی تفاسیر میں آیا ہے لیکن ہم نے جو کچھ اوپر ذکر کیا ہے اس روایت کے مطابق ہے جسے قرطبی نے اپنی تفسیر کی جلد ۷، ص ۴۷۲۴ پر درج کیا ہے۔

تمام پیغمبر ایسے تھے

گزشتہ چند آیات میں مشرکین کی مکاری اور اعتراضات کا ذکر ہے کہ پیغمبر کیوں کھانا کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں آتا جاتا ہے؟ پھر ان اعتراضات کا مجمل اور مختصر سا جواب بھی دیا گیا ہے لیکن اس آیت میں مندرجہ بالا اعتراضات کا واضح اور صریح تر جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے پہلے ہم نے کسی بھی رسول کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان سب کا تعلق نوعِ انسانی سے تھا وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی آیا جایا کرتے تھے (اور لوگوں سے بھی ان کا میل ملاپ تھا) (و ما ارسلنا قبلك من المرسلين الا انهم ليأكلون الطعام ويمشون فى الاسواق)۔

اس کے ساتھ ساتھ "ہم نے تم میں سے بعض کو دوسرے بعض لوگوں کے لیے آزمائش و امتحان کا ذریعہ قرار دیا" (وجعلنا بعضكم لبعض فتنة)۔

یہ آزمائش ممکن ہے کہ اس وجہ سے ہو کہ انبیاء کا انتخاب نوعِ انسانی سے کیا گیا ہے اور وہ بھی ان انسانوں سے جن کا تعلق معاشرے کے غریب اور محروم طبقے سے ہے اور یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہے کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ہم نوع افراد کا کہنا ماننے سے گھبراتے ہیں خاص کر ان لوگوں کا جو مالی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور ان کا اپنا تعلق معاشرتی لحاظ سے اونچے گھرانوں سے ہوتا ہے یا ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے یا معاشرے میں خوب جانے پہچانے ہوتے ہیں۔

آزمائش سے متعلق یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عام لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے آزمانا ہے کیونکہ جو افراد کام کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، بیمار، یتیم اور مصیبت زدہ ہوتے ہیں وہ تندرست، قوی اور صحیح سالم لوگوں کے لیے آزمائش ہوتے ہیں اور جو صحیح سالم، تندرست اور طاقت ور ہوتے ہیں وہ ضعیف و ناتواں افراد کے لیے آزمائش ہوتے ہیں کہ اول الذکر اپنے انسانی فریضے کو دوسرے گروہ کے ساتھ کیسے پورا کرتا ہے اور ثانی الذکر خدا کی رضا پر کیونکر راضی ہوتا ہے۔

جہاں تک ان دونوں تفاسیر کا تعلق ہے ان کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں تفسیریں آیت کے وسیع مفہوم میں جمع کی جائیں اور وہ مفہوم ہے لوگوں کی ایک دوسرے کے ذریعے آزمائش۔ اسی کے ساتھ ساتھ قرآن سب کو خطاب کرتے ہوئے سوال فرماتا ہے: آیا صبر کرو گے (اتصبرون)۔

کیونکہ ایسی تمام آزمائشوں میں کامیابی کا اہم ترین عنصر صبر و شکیبائی ہے۔ ایسی سرکش خواہشات کا مقابلہ بھی صبر و استقامت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو قبولِ حق میں مانع ہوتی ہیں اور صبر و استقامت، کے ذریعے ان مشکلات کا سامنا کیا جا سکتا ہے جو فرض کی ادائیگی میں حائل ہوتی ہیں۔ اسی طرح صبر ہی کے ذریعے ان مصائب اور سخت حوادث کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے جو قدم قدم پر ان کو درپیش ہوتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ صبر ہی کے ذریعے اس عظیم امتحان میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے[۱]

---

[۱] خدائی آزمائش کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کی تشریح۔

آخر میں تنبیہ کی صورت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: تمھارا پروردگار ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے بصیر اور دیکھنے والا ہے (وکان ربك بصیرًا)۔

مبادا وہ یہ تصور کریں کہ خدائی آزمائش کے سلسلے میں کوئی چیز اس کی دیدۂ بینا اور علم مطلق سے پوشیدہ رہ گئی ہے نہیں نہیں وہ ہر ایک چیز کو اچھے طریقے سے جانتا اور دیکھتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر ایک سوال پیش آتا ہے کہ آیات بالا میں قرآن مجید نے انبیاء کے بارے میں مشرکین کے جن اعتراضات کا یہ جواب دیا ہے کہ وہ سب نوع انسانی میں سے تھے اس سے نہ صرف مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اشکال اور بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ اس طرح سے وہ اپنے اعتراض کو پیغمبر اسلامؐ کی ذات تک محدود رکھنے کی بجائے تمام دوسرے انبیاء پر بھی یہی اعتراض کر سکتے ہیں (کہ وہ کیسے پیغمبر تھے کہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی آتے جاتے تھے)۔

قرآنی آیات کی رُو سے ان کا اعتراض صرف پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی تک ہی محدود تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ آپ نے یہ روش اور طریقہ کار اپنا رکھا ہے لہٰذا وہ کہتے تھے۔

مال هذا الرسول ....

یہ رسول اس طرح کیوں ہے؟

قرآن ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ "یہ صرف تجھی پر منحصر نہیں کہ تو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازار میں بھی آتا جاتا ہے بلکہ انبیاء ماسلف بھی یونہی کیا کرتے تھے بالفرض اگر وہ اپنے اعتراضات کا دائرہ تمام انبیاء علیہم السلام تک وسیع کرتے ہیں تو قرآن اس کا بھی جواب دے رہا ہے اور وہ یہ کہ:

ولو جعلناه ملكًا لجعلناه رجلا (الانعام ـــــ ۹)

فرض کر لیا کہ پیغمبر اسلام کو ہم فرشتہ بناتے تو پھر بھی ناگزیر تھا کہ ہم اسے انسانی صورت میں بھیجتے (تاکہ وہ تمام حالات میں بنی نوع انسان کے لیے ایک نمونہ عمل ہوتا)۔

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کی رہبری اور پیشوائی صرف انسان ہی کر سکتا ہے جو ان کی ہر قسم کی ضروریات، مشکلات اور مسائل سے آگاہ ہوتا ہے۔

۲۱۔ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيرًا ○

۲۲۔ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا ○

۲۳۔ وَقَدِمْنَآ إِلٰى مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُورًا ○

۲۴۔ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّأَحْسَنُ مَقِيلًا ○

ترجمہ

۲۱۔ اور وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے (اور قیامت کا انکار کرتے ہیں) کہتے ہیں: ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں ہوتے؟ یا ہم اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے؟ انھوں نے اپنے بارے میں تکبر کیا اور بہت بڑی سرکشی کے مرتکب ہوئے۔

۲۲۔ (وہ اپنی آرزوؤں کو پہنچ جائیں گے لیکن) جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ دن مجرمین کی خوشخبری کا نہیں ہوگا (بلکہ ان کی سزا اور عذاب کا دن ہوگا) اور وہ کہیں گے ہمیں امان دو، ہمیں معاف کر دو۔

۲۳۔ اور ہم ان کے ان اعمال کی طرف آگے بڑھیں گے جو وہ انجام دے چکے ہیں اور ان اعمال کو غبار کے ذرّوں کی مانند بکھیر دیں گے۔

۲۴۔ اس دن بہشتیوں کا ٹھکانا سب سے بہتر اور ان کی رہائش گاہ سب سے عمدہ ہوگی۔

تفسیر

بہت بڑے دعوے

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ توحید اور قیامت پر عقیدہ رکھنے کے نتیجے میں انسان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اور اسے جو ذمہ داریاں نبھانا پڑتی ہیں ان سے جان چھڑانے کے لیے ہٹ دھرم مشرکین نے پیغمبر خدا کی ذات پر مختلف قسم کے اعتراضات شروع کر

جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ پیغمبر ہماری طرح کھاتا پیتا کیوں ہے اور کیوں ہماری طرح بازار میں آتا جاتا ہے ؟ اس کا جواب ہم ابھی ابھی پڑھ چکے ہیں ۔

ان آیات میں ان مشرکین کے دو اور اعتراضات کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی ان کا جواب بھی پیش کیا گیا ہے ۔

پہلے تو فرمایا گیا ہے : جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے (اور قیامت کا انکار کرتے ہیں) کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے نازل کیوں نہیں ہوتے یا اپنے پروردگار کو ہم اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ پاتے (و قال الذین لا یرجون لقائنا لولا انزل علینا الملائکة او نری ربنا)۔

بالفرض مان لیا کہ پیغمبر بھی ہماری طرح عمومی زندگی گزار سکتے ہیں لیکن یہ بات تو ماننے کے قابل نہیں ہے کہ وحی کا فرشتہ ان کے پاس آئے اور ہم نہ دیکھ پائیں اگر فرشتہ ظاہری طور پر ہمیں نظر آئے اور آپ کی نبوّت کی تصدیق کرے یا وحی کا کچھ حصہ ہمارے سامنے بیان کرے تو اس میں کیا حرج ہے ؟

یا اگر ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو ہمارے لیے شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے ۔ یہی باتیں بار بار سوال کی صورت میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں اور محمدؐ کی دعوت کو قبول کرنے سے روکتی رہتی ہیں ۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایسے معترضین کو " لا یرجون لقائنا " کے عنوان سے موصوف کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان بے بنیاد باتوں کا سرچشمہ آخرت پر ایمان سے انکار اور خدا کی طرف سے عائد ہونے والی ذمّہ داریوں سے فرار ہے ۔

سورۂ حجر کی آیت ، میں بھی اسی سے ملتی جلتی گفتگو موجود ہے ، کفار کہتے ہیں :

لو ما تأتینا بالملائکة ان کنت من الصادقین

اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لاتا تاکہ وہ آکر تیری تصدیق کریں ۔

اسی سورہ فرقان کے آغاز میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے : ۔

لولا انزل الیه ملك فیکون معه نذیرًا

تیرے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں کیا گیا تاکہ وہ بھی لوگوں کو ڈراتا ۔

جبکہ ایک حق طلب انسان کسی بات کے ثبوت کے لیے صرف دلیل ہی طلب کرتا ہے اس دلیل کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو ، جب اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ نے قرآن سمیت متعدد معجزات پیش کر کے اپنی دعوت کی حقانیت اور صداقت کو روز روشن کی طرح ثابت کر دکھایا تو پھر ان بے بنیاد باتوں اور حیلے بہانوں کا کیا معنیٰ ؟

پھر یہ کہ وہ لوگ نبوت کی تحقیق اور ثبوت کے بارے میں آپ سے ایسی باتیں نہیں کرتے تھے اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ انھوں نے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کر کے اسے ایک قابلِ رویت جسم کی حد تک گرا دیا ۔ وہی بے بنیاد مطالبہ جو بنی اسرائیل کے مجرم لوگوں نے کیا تھا اور اس کا شافی جواب بھی سن لیا تھا اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۳ میں گزر چکی ہے ۔

لہٰذا قرآن مجید ایسے مطالبات کا جواب زیرِ بحث آیت میں دے رہا ہے : انھوں نے اپنے بارے میں تکبّر سے کام لیا ہے اور غرور و تکبر اور خود پسندی کا شکار ہو گئے ہیں (لقد استکبروا فی انفسهم)۔

انھوں نے طغیان اور سرکشی کی ، بہت بڑی سرکشی (وعتوا عتوًا کبیرًا)۔

" عتو " (" غلو " کے وزن پر ہے) جس کا معنیٰ ہے اطاعت سے ایسی روگردانی اور حکم کی خلاف ورزی کہ جس کے ساتھ دشمنی اور ہٹ دھرمی بھی شامل ہو ۔

" فی انفسهم " کی تعبیر ممکن ہے اس معنیٰ میں ہو کہ وہ خود اپنے بارے میں تکبّر اور خود پسندی کا شکار ہیں یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تکبر اور غرور کو تو اپنے دل میں چھپاتے ہیں اور اس قسم کے حیلے بہانوں کو آشکار کرتے ہیں ۔

ہمارے اس دور میں بھی کئی ایسے لوگ موجود ہیں جو اس زمانے کے مشرکین کی منطق کو دہرا رہے ہیں کہ جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے اور روح کو آپریشن کے ذریعے نہ دیکھ لیں اس وقت تک نہیں مانیں گے ۔ دونوں کے خیالات کا ایک ہی سرچشمہ ہے اور وہ ہے تکبّر اور سرکشی ۔

اصولی طور پر جو لوگ شناخت کا معیار صرف حس اور تجربے ہی کو جانتے ہیں تقریبًا ایسی ہی باتیں کرتے رہتے ہیں ۔ تمام مادہ پرست افراد (Melerialists) اسی گروہ میں شامل ہیں ۔ حالانکہ ہماری حس تو اس کائنات کے مادے کے صرف تھوڑے سے حصے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔

اس کے بعد قرآن دھمکی کی صورت میں فرماتا ہے کہ یہ جو فرشتوں کے دیکھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں آخر کار انھیں دیکھ ہی لیں گے لیکن اس دن دیکھیں گے کہ جس دن مجرمین کے لیے خوشخبری نہیں ہو گی (کیونکہ وہ دن ان کے اعمال کی سخت سزا کا دن ہو گا) (یوم یرون الملائکة لا بشرٰی یومئذ للمجرمین)[1]

یقینًا اس دن فرشتوں کو دیکھ کر وہ خوش تو نہیں ہوں گے بلکہ جونہی وہ ان فرشتوں کے ہمراہ عذاب کی علامات دیکھیں گے تو اس قدر وحشت زدہ ہو جائیں گے کہ ایسے جملے زبان پر لائیں گے جو خطرناک مواقع پر لوگوں کو دیکھ کر کہا کرتے تھے چنانچہ وہ کہیں گے ہمیں امان دو ، ہمیں معاف کر دو (و یقولون حجرًا محجورًا)۔

لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ انھیں اپنے حتمی برُے انجام سے نہ تو یہ جملہ بچا سکے گا اور نہ ہی کوئی دوسرا جملہ کیونکہ جو آگ انھوں نے خود بھڑکائی ہے وہ انھیں ہر صورت میں اپنی طرف کھینچ لے گی اور جن برائیوں کا وہ دنیا میں ارتکاب کر چکے ہیں وہ مجسم ہو کر ان کے سامنے آجائیں گی اور خود کردہ را علاجے نیست ۔

" حِجر " (بر وزن " قشر ") اس علاقے کو کہا جاتا ہے جس کے ارد گرد پتھر چن دیئے جائیں اور اس طرح سے اس کی حد بندی کر دی جائے کہ اس حدود میں کوئی شخص داخل نہ ہو سکے ۔ " حجر اسماعیل " کو اس لیے حجر کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ارد گرد دیوار بنا کر باقی جگہ سے اسے علیحدہ کر دیا گیا ہے ۔ عقل کو بھی حجر کہتے ہیں کیونکہ انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے اسی لیے سورۂ فجر کی آیت ۵ میں ہے : ۔

---

[1] ممکن ہے کہ اس جگہ " لا " نفی کے معنی میں ہو جیسا کہ بہت سے مفسرین کہتے ہیں ۔ یہ احتمال بھی ہے کہ شاید یہ نفرین کے لیے استعمال ہوا تو ایسی صورت میں اس جملے کا معنیٰ یہ ہو گا کہ " اس دن مجرمین کے لیے خوشخبری نہ ہو "

هل فی ذٰلك قسم لذی حجر

آیا ان باتوں میں صاحبانِ عقل کے لیے قانع کرنے والی قسم ہے۔

نیز قوم صالح کو "اصحاب حجر" کہا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی سُورۂ حجر آیت ۸۰ میں ہے کیونکہ وہ پہاڑوں کے اندر اپنی رہائش کے لیے پتھروں کے بہت ہی پختہ مکانات تراش کر ان میں محفوظ ہو جایا کرتے تھے۔

یہ تو تھا لفظ "حجر" کے بارے میں، رہا "حجرًا محجورًا" کے بارے میں تو یہ عربوں کی ایک اصطلاح ہے کہ جب ان کا کسی ایسے شخص سے سامنا ہو جائے جس سے وہ ڈرتے ہوں تو امان حاصل کرنے کے لیے یہ جملہ کہتے ہیں۔

خصوصاً عربوں میں یہ رسم تھی کہ جن حرمت والے مہینوں میں جنگ ممنوع ہوتی تھی اگر کسی شخص کا سامنا کسی ایسے شخص سے ہو جاتا جس کے متعلق یہ احتمال ہوتا کہ شاید یہ شخص حرمت کی پابندی کو توڑ کر جنگ کا آغاز کرے گا اور اس طرح سے دوسرے فریق کو صدمہ ہوگا تو دوسرا فریق یہی جملہ زبان پر لاتا تو اسے امان دے دی جاتی۔ اس طرح سے ہر قسم کی وحشت و پریشانی اور اضطراب دور ہو جاتا۔ بنابریں "حجرًا محجورًا" کا یہ معنیٰ ہوگا "میں ایسی امان چاہتا ہوں جس میں کوئی تبدیلی نہ ہو"۔[1]

جو کچھ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "حجرًا محجورًا" کا یہ جملہ کہنے والے گناہ گار جہنمی لوگ ہوں گے۔ آیت میں موجود افعال کی مناسبت، جملے کا تاریخی سفر اور عربوں میں اس کا استعمال بھی اسی بات کا متقاضی ہے ہر چند کہ بعض لوگوں نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ایسا کہنے والے فرشتے ہوں گے جن کا مقصد "مشرکین کو رحمتِ الٰہی سے محروم کرنا" ہوگا۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بات کہنے والے مجرم لوگ ہی ہوں گے جو ایک دوسرے سے حجرًا محجورًا کہیں گے لیکن بہتر اور ظاہر وہی پہلا معنیٰ ہے جسے بہت سے مفسرین نے بھی اختیار کیا ہے یا پھر اسے اوّلین تفسیر کے نام سے یاد کیا ہے۔[2]

رہی یہ بات کہ مجرمین کس دن فرشتوں سے ایسی ملاقات کریں گے تو مفسرین نے اس بارے میں دو احتمال ظاہر کیے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ موت کا دن ہے جب وہ موت کے فرشتے کو دیکھیں گے جیسا کہ سورۂ الانعام کی آیت ۹۳ میں ہے:۔

ولو ترٰی اذ الظالمون فی غمرات الموت والملائکة باسطوا ایدیهم اخرجوا انفسکم۔

اگر تم ظالموں کو دیکھو کہ جب وہ موت کی موجوں میں پھنسے ہوئے ہوں اور موت کے فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ان سے کہہ رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں ......

بعض مفسرین نے اس دن سے قیامت کا دن مراد لیا ہے کیونکہ اس دن مجرم اور گناہ گار لوگ عذاب کے فرشتوں کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کریں گے۔

آیات میں قیامت کے ذکر کے پیشِ نظر اور خاص کر "یومئذٍ" کے جملے کو مدِ نظر رکھ کر یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دن سے

---

[1] ادبی نکتہ نظر سے "حجرًا" فعل مقدر کا مفعول ہے اور "محجورًا" اس مفعول کی تاکید کے طور پر ہے اس جملے کی اصل یوں ہوگی:

اطلب منك منعًا لاسبیل الی رفعه و دفعه

[2] اسی آیت کے ذیل میں ملاحظہ ہو تفسیر المیزان، تفسیر فخر رازی، تفسیر فی ظلال القرآن اور تفسیر ابوالفتوح رازی۔

مراد قیامت کا دن آیت کے مفہوم سے زیادہ نزدیک ہے۔

بعد والی آیت آخرت میں مجرمین کے اعمال کی کیفیت کو مجسّم کر کے کہتی ہے: ہم ان کے ان اعمال کی طرف آگے بڑھیں گے جو وہ انجام دے چکے ہوں گے اور ان اعمال کو غبار کے ذرّوں کی مانند ہواؤں میں بکھیر دیں گے (و قدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناه هباء منثورًا)۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ "عمل" سے مراد ہر وہ کام ہے جو ارادے کے ساتھ انجام دیا جائے لیکن "فعل" کا معنیٰ عام ہے خواہ وہ ارادے سے انجام دیا جائے یا بغیر ارادے کے۔ یعنی عمل ارادی کاموں کا نام ہے اور فعل ارادی اور غیر ارادی دونوں کا نام ہے۔[1]

"قدمنا" "قدوم" سے ہے جس کا معنیٰ "وارد ہونا" یا "کسی چیز کی تلاش میں نکلنا" ہے یہاں پر موضوع کے یقینی اور تاکیدی ہونے پر دلیل ہے یعنی یہ بات مسلّم اور یقینی ہے کہ انھوں نے جو اعمال بھی اپنے ارادے اور اختیار سے انجام دیئے ہیں خواہ وہ ظاہرًا کارِ خیر ہی کیوں نہ ہوں، ان کے کفر اور شرک کی وجہ سے ہم ان کے ان تمام اعمال کو غبار کے ذرّوں کی مانند ہواؤں میں بکھیر کر نیست و نابود کر دیں گے۔

اعمالِ صالح کی تباہی

لفظ "هباء" کا معنیٰ غبار کے وہ نہایت ہی باریک ذرات ہیں جو عام حالات میں دیکھنے میں نہیں آتے لیکن جب سورج کی روشنی بند کمرے کے سوراخ سے کمرے کے اندر آتی ہے تو اس میں یہی ذرات تیرتے نظر آتے ہیں۔

اس تعبیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کفار و مشرکین کے اعمال اس قدر بے قیمت اور بے اثر ہوں گے کہ گویا ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہوگا خواہ وہ اپنے ان اعمال کے لیے سالہا سال تک کوشش ہی کیوں نہ کرتے رہے ہوں۔

یہ آیت سورہ ابراہیم کی آیت ۱۸ کی مانند ہے جس میں خدا فرماتا ہے:۔

مثل الذین کفروا برّبهم اعمالهم کرماد اشتدت به الریح فی یوم عاصف

جن لوگوں نے پروردگار کا انکار کیا ہے ان کے اعمال کی سزا ایسی ہے جیسے کسی طوفانی دن میں تیز ہوا کے سامنے راکھ کا ڈھیر۔

اس کی منطقی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ جو چیز انسان کے اعمال کو شکل و صورت، حیثیت اور قدر و منزلت عطا کرتی ہے وہ ہے انسان کی نیّت اور اس کا قصد و ارادہ، کیونکہ مومنین کے اعمال میں رضائے خدا، توحید، پاکیزہ مقصد اور صحیح و سالم منصوبہ بندی پیشِ نظر ہوتی ہے جبکہ بے ایمان افراد کے پیشِ نظر ظاہر داری، ریاکاری، جھوٹ، فریب اور ذاتی مفادات ہوتے ہیں جن کی

---

[1] راغب نے یہ فرق "عمل" کے مادہ میں ذکر کیا ہے جبکہ "فعل" کے مادہ میں اس کے برعکس کہا ہے لیکن ان دونوں کلموں کے استعمال کے پیشِ نظر یہ فرق صحیح معلوم ہوتا ہے البتہ ممکن ہے کہ کچھ استثنائی موارد بھی ہوں جیسا کہ کام کرنے والے بیلوں کو "عوامل" کہا جاتا ہے۔

وجہ سے ان کے اعمالِ صالح بھی اپنی قدر و منزلت کھو دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم ایسی مساجد کو بھی جانتے ہیں جو صدیوں پرانی ہیں۔ سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود بھی ان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا جبکہ اس کے برعکس ایسے گھروں کو بھی جانتے ہیں جو ایک ماہ یا ایک سال گزر جانے کے بعد خراب ہونا شروع ہو گئے ہیں اور ان میں کوئی نہ کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مساجد کی تعمیر کے سلسلے میں خدا کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے لہٰذا انھیں ہر لحاظ سے پختہ اور تمام حوادث کو پیشِ نظر رکھ کر بہترین میٹریل کے ساتھ تعمیر کیا گیا، جبکہ رہائشی مکانوں کے سلسلے میں ظاہرداری اور فریب کاری کے ذریعے مال و دولت کا جمع کرنا مقصود تھا صرف ان کی ظاہری آب و تاب اور نقش و نگار کی طرف توجہ دی گئی۔[1]

اصولی طور پر اسلامی منطق کی رُو سے اعمالِ صالح کے لیے کچھ آفتیں ہیں جن کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے کہ کبھی تو وہ اپنے آغاز ہی سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں جیسے وہ اعمال جو "ریا" کے طور پر انجام دیے جائیں۔

کبھی ان اعمال کی انجام دہی کے دوران ہی انسان غرور، تکبر اور خود پسندی کا شکار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اعمال کی قدر و قیمت ضائع ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اعمالِ خیر کی ادائیگی کے بعد انسان سے ایسے نامناسب کام سرزد ہو جاتے ہیں جن سے ان اعمال کا اثر بالکل ختم ہو جاتا ہے مثلاً راہِ خدا میں خرچ کرنے کے بعد احسان جتانا اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے یا جن نیک اعمال کی انجام دہی کے بعد انسان کافر یا مرتد ہو جائے۔

حتیٰ کہ بعض اسلامی روایات کے مطابق بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی انجام دہی سے پہلے کے گناہوں کی وجہ سے ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ جس طرح شراب خور کے بارے میں ہے کہ اس کے اعمال چالیس روز تک بارگاہِ ایزدی میں قبول نہیں ہوتے۔[2]

بہرحال اسلام کے نزدیک عملِ صالح کا ایک جچا تلا اور منظم معیار ہے۔

ایک روایت میں جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

قیامت کے دن خداوندِ عالم ایک ایسے گروہ کو مبعوث فرمائے گا جن کے سامنے سفید لباس کی مانند روشنی چمک رہی ہوگی (یہ روشنی ان کے اپنے اعمال ہوں گے) پھر خدا ان اعمال کو حکم دے گا کہ ذرات میں تبدیل ہو جاؤ (تو وہ سب ذرات میں تبدیل ہو جائیں گے)۔

وہ کون لوگ ہوں گے اس بارے میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

انہم کانوا یصومون و یصلون و لکن کانوا اذا عرض لہم شیء من الحرام اخذوہ واذا ...

---

[1] اس سلسلے میں ہم اس سے زیادہ مفصل طریقے پر تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۶ سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۸ کے ضمن میں بحث کر چکے ہیں۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۲۲، مادہ "خمر"

ذکر لہم شیء من فضل امیر المؤمنین انکروہ۔

وہ لوگ نماز و روزہ کی بھی ادائیگی کیا کرتے تھے لیکن جب کوئی حرام چیز ان کے سامنے آجاتی تو وہ اس سے بھی چمٹ جاتے اور جب علی امیر المومنین کی کوئی فضیلت ان کے سامنے بیان کی جاتی تو وہ اس کا انکار کرتے۔[1]

جہاں تک قرآنِ مجید کا طریقہ کار ہے تو وہ نیک اور بد کو ایک ساتھ بیان فرماتا ہے تاکہ دونوں کا آپس میں موازنہ کر کے ہر ایک کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھا جا سکے چنانچہ بعد والی آیت دوزخیوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ خدا فرماتا ہے: اس دن بہشتیوں کا ٹھکانا سب سے بہتر اور ان کی رہائش گاہ سب سے عمدہ ہوگی (اصحاب الجنۃ یومئذ خیر مستقرا واحسن مقیلا)۔

اس بات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دوزخیوں کی حالت اچھی ہوگی اور بہشتیوں کی حالت ان سے زیادہ اچھی ہوگی، کیونکہ "افعل التفضیل" کا لفظ بعض اوقات ایسے مواقع پر بھی استعمال ہوتا ہے جن میں ایک فریق میں ایسی صفات پائی جاتی ہیں دوسرا فریق جن سے بالکل عاری ہوتا ہے جس طرح سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۴۰ میں ہے:

افمن یلقی فی النار خیر ام من یاتی امنا یوم القیٰمۃ

آیا جو شخص جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا وہ بہتر ہے یا جو شخص بروزِ قیامت مطمئن ہو کر عرصۂ محشر میں آئے گا۔

"مستقر" کے معنیٰ قرارگاہ اور ٹھکانا کے ہیں اور "مقیل" کا معنیٰ دوپہر کے وقت آرام کرنے کی جگہ ہے ("قیلولہ" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے دوپہر کی نیند)۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم۔ منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹

۲۵۔ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيلًا ○
۲۶۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ○

ترجمہ

۲۵۔ اس دن کا سوچو! جب آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتے نازل ہوں گے۔
۲۶۔ اس دن حکومت صرف خداوندِ رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں کے لیے بہت سخت ہوگا۔

تفسیر

آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا

ان آیات میں قیامت اور روزِ قیامت گناہ گاروں کے انجام کے بارے میں گفتگو کو آگے بڑھایا گیا ہے، پہلے فرمایا گیا ہے گناہ گاروں کے مصائب اور رنج و غم کا دن وہ ہوگا کہ جب آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتے پے در پے اترنا شروع ہوں گے (ویوم تشقق السماء بالغمام و نزل الملائکة تنزیلًا)[1]۔

"غمام" "غم" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کا چھپانا چونکہ بادل آسمان کو چھپا دیتے ہیں لہٰذا انھیں "غمام" کہتے ہیں۔ اسی طرح رنج و اندوہ کو "غم" کہتے ہیں کیونکہ وہ دل کو چھپا دیتے ہیں۔

یہ آیت درحقیقت مشرکین کے ایک مطالبے اور ایک اور بہانے کا جواب ہے وہ اپنے افسانوں کے مطابق اس بات کے منتظر تھے کہ خدا اور اس کے فرشتے بادلوں میں بیٹھ کر آئیں اور انھیں حق کی دعوت دیں اسی طرح یہودیوں کے قصے کہانیوں میں بھی ہے کہ کبھی کبھی خدا بادلوں کے درمیان سے ظاہر ہوجاتا ہے[2]۔

قرآن مجید انھیں اسی چیز کا جواب دے رہا ہے کہ ہاں (خدا تو نہیں البتہ) فرشتے ایک دن ان کے پاس ضرور آئیں گے لیکن کس دن؟ جس دن ان کے عذاب اور سزا کا موقع آجائے گا اور آکر ان کی بے ہودہ باتوں کو ختم کر دے گا۔

اب دیکھتے ہیں کہ بادلوں سمیت آسمان کے پھٹ جانے سے کیا مراد ہے؟ جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے اطراف میں آسمان

---

[1] "یوم تشقق السماء" درحقیقت "یوم یرون الملائکة" کے گزشتہ جملے پر عطف ہے۔ بنابریں اس جملے میں بھی "یوم" کا تعلق اسی جیسند سے ہوگا جس سے گزشتہ آیت میں تھا یعنی "لابشری یومئذٍ" والی آیت میں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا تعلق "اذکر" فعل مقدر سے ہے پھر "بالغمام" میں یا تو "ملابست" کے معنی میں ہے اور یا پھر "سببیت" کے لیے ہے جو آیات بالا کی تفسیر میں منعکس ہوچکی ہے۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۶ ص ۱۵۴ (اسی آیت کے ذیل میں)۔

م کی ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو پھٹ جانے کے قابل ہو۔

علامہ طباطبائیؒ (رضوان اللہ علیہ) تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں:

آسمان کے شگافتہ ہونے اور پھٹ جانے سے مراد عالمِ شہود ہے اور جہالت اور نادانی کے حجابوں کا ہٹ جانا اور عالمِ غیب کا ظاہر ہوجانا ہے یعنی اس دن انسان کے اندر اس قدر فہم اور بینائی پیدا ہوجائے گی جو آج کے دن سے بہت مختلف ہوگی، سب پردے ہٹ جائیں گے اور لوگ فرشتوں کو عالمِ بالا سے اترتا ہوا دیکھیں گے۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ "سماء" سے مراد آسمانی کُرّے ہیں جو پے در پے پھٹ جائیں گے اور تباہ ہوتے جائیں گے، ان دھماکوں سے اٹھنے والا اور پہاڑوں کے تباہ و برباد ہونے سے بلند ہونے والا دھواں صفحۂ آسمانی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

بنابریں آسمانی کُرات پھٹ جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ ان سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل بھی[3]

قرآنِ مجید کی بہت سی آیتیں خاص کر آخری پارے کی چھوٹی چھوٹی سورتوں کی آیات اس حقیقت کی وضاحت کررہی ہیں کہ قیامت سے پہلے عالمِ ہستی میں عجیب وغریب تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح فضا میں پھیل جائیں گے سورج بے نور ہو جائے گا ستارے ماند پڑ جائیں گے حتیٰ کہ چاند اور سورج کے فاصلے سمٹ جائیں گے ساری زمین پر سخت زلزلہ آئے گا۔

ہاں تو اس دن آسمان کا تباہ ہوجانا یعنی آسمانی کُرّوں کا گہرے بادلوں کی وجہ سے صفحۂ آسمانی سے پوشیدہ ہوجانا ایک فطری امر ہوگا۔

اسی تفسیر کو ایک اور صورت میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ:

کواکب اور سیاروں کے دھماکوں اور زبردست تبدیلیوں کی وجہ سے آسمان گہرے بادلوں سے ڈھک جائے گا لیکن چونکہ ان بادلوں میں کبھی کبھار کوئی شگاف پڑ جاتا ہے اور آسمان کو صحیح صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بنابریں یہ آسمان جو ان آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے ان پھٹے ہوئے عظیم بادلوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جدا ہوجائے گا[4]

اس آیت کی اور بھی بہت سی تفاسیر بیان ہوئی ہیں جو علمی اور منطقی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں جبکہ مندرجہ بالا تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے ممکن ہے کہ اس مادی کائنات کے پردے انسان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیئے جائیں اور وہ عالمِ طبیعت کا مشاہدہ کرے۔ دوسری طرف آسمانی کُرّے دھماکوں کے ساتھ تباہ و برباد ہوجائیں اور ان دھماکوں سے دھوئیں کے بادل اٹھیں گے ان بادلوں کے درمیان کہیں کہیں شگاف پڑ جائیں گے یہی دن اس جہان کا آخری اور اس دوسرے جہان کا پہلا دن ہوگا جو بے ایمان گناہ گار مجرمین اور ہٹ دھرم ظالموں کیلئے نہایت ہی دردناک ہوگا۔

---

[3] ادبی نقطہ نظر سے اس صورت میں "با" ملابست کے لیے ہوگی۔

[4] اس صورت میں "بالغمام" میں "با" "سببیت" کے معنیٰ میں ہے۔

اس کے بعد اس دن کی اور نمایاں خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اس دن حکومت خداوند رحمٰن ہی کی ہوگی (الملك يومئذٍ الحق للرحمٰن) ۔

حتیٰ کہ اس دنیا کی مجازی ، فانی ، محدود اور جلد ختم ہوجانے والی حکومتوں کے تختے اُلٹ دیئے جائیں گے اور ہر لحاظ سے اور تمام جہات سے حاکمیت صرف اور صرف خداوند متعال ہی کی ہوگی ۔ اسی بناء پر وہ دن " کافروں کے لیے بہت ہی سخت ہوگا "

(و كان يومًا على الكافرين عسيرًا) ۔

جی ہاں اس دن تمام خیالی اور تصوّراتی طاقتیں بالکل ختم ہوجائیں گی ۔ حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ صرف اور صرف خدا ہی کے لیے ہوگا ، کافروں کی تمام پناہ گاہیں ملیامیٹ ہوجائیں گی اور تمام طاغوتی طاقتیں نابود ہوجائیں گی ۔

اگرچہ اس جہان میں بھی ان طاقتوں کی خدا کے ارادہ ومشیت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پھر بھی ظاہری طمطراق اور جھوٹا وقار تو ہے چونکہ عرصۂ محشر میں صرف حقائق ہی نمایاں ہوں گے اور مجازی ، خیالی اور تصوّراتی امور کی حیثیت ختم ہوجائے گی ۔ خداوندِ عالم کے عذاب سے بے ایمان افراد کو کوئی چیز نہیں بچا سکے گی لہٰذا وہ دن کفار کے لیے انتہائی سخت ہوگا جبکہ مومنین کے لیے بہت سہل اور نہایت آسان ہوگا ۔

ایک حدیث میں ابوسعید خدری سے منقول ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی " فی يوم كان مقداره خمسين الف سنة " یعنی قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا تو میں نے عرض کیا جناب ! یہ دن کس قدر لمبا اور عجیب ہوگا ؟ تو آپ نے فرمایا :-

والذی نفسی بيده انه ليخفف عن المؤمن حتّٰی يكون اخف عليه من صلوٰة مكتوبة يصليها فی الدنيا

اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ دن مومنین کے لیے اس قدر آسان ہوگا کہ جتنی دیر وہ دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے میں لگا دیتا ہے اس سے بھی زیادہ آسان [1]

قرآن میں دوسری آیات میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا دن کافروں پر سخت ہوگا ۔ کیونکہ کہیں پر تو ہے :-

و تقطعت بهم الاسباب (بقرہ : ۱۶۶)

اس دن تمام دنیاوی اسباب اور وسائل منقطع ہوجائیں گے ۔

کسی جگہ ہے :

ما اغنٰی عنه ماله و ما كسب (تبّت : ۲)

انھیں نہ تو ان کا مال اور نہ ہی انھوں نے جو کچھ کمایا ہے کوئی فائدہ پہنچائے گا ۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ، ص ۴،۲۹

کسی مقام پر ہے :

يوم لا يغنی مولًی عن مولًی شيئًا (دُخان : ۴۱)

وہاں کوئی کسی کی داد و فریاد کو نہیں پہنچے گا ۔

حتیٰ کہ شفاعت بھی جو کہ گناہ گاروں کے لیے تنہا راہِ نجات ہے صرف ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کا خدا اور اس کے دوستوں کے ساتھ تعلق ہوگا ۔

من ذا الذی يشفع عنده الا باذنه (بقرہ : ۲۵۵)

نیز اس روز کسی کو عذر خواہی کی بھی اجازت نہیں ہوگی چہ جائیکہ کسی کے غیر معقول عذر کو قبول کیا جائے :

ولا يؤذن لهم فيعتذرون (مرسلات : ۳۶)

۲۷ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝

۲۸۔ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝

۲۹۔ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۝

ترجمہ

۲۷۔ اس دن کو یاد کیجیے جب سخت حسرت کی وجہ سے ظالم اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا: اے کاش! میں نے رسول کے ساتھ ہی راستہ اختیار کیا ہوتا۔

۲۸۔ مجھ پر افسوس ہے کہ میں نے فلاں (گمراہ شخص) کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔

۲۹۔ اس نے مجھے یادِ حق سے جھٹکا دیا جب کہ میرے پاس آگاہی پہنچ چکی تھی اور شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو چھوڑ دینے والا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کی جو شانِ نزول بیان کی ہے، مختصراً یوں ہے:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مشرکین میں "عقبہ" اور "ابی" نامی دو شخص رہتے تھے جو ایک دوسرے کے دوست تھے جب بھی عقبہ کسی سفر سے گھر واپس لوٹتا تو اپنی قوم کے سرداروں کو کھانے کی دعوت دیتا۔ اگرچہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں بھی حاضر ہو۔

حسب معمول ایک دن جب سفر سے واپس آیا تو کھانے کا انتظام کیا اور دوستوں کو دعوت دی اور ساتھ ہی حضرت پیغمبر اسلامؐ کو بھی کھانے پر بلالیا۔

جب دسترخوان بچھا دیا گیا اور کھانا لایا گیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا میں تمھارا کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک تم کلمہ شہادتین (اقرار توحید و رسالت) زبان پر جاری نہیں کرو گے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

یہ خبر جب اس کے دوست "ابی" تک پہنچی تو اس نے کہا: "عقبہ! کیا تم اپنے دین سے پھر گئے ہو"؟ عقبہ نے جواب دیا: "بخدا میں دین سے تو منحرف نہیں ہوا لیکن چونکہ ایک ایسا شخص میرا مہمان تھا جو میرے شہادتین کے اقرار کیے بغیر کھانا کھانے

کے لیے تیار نہیں تھا اور چونکہ مجھے اس بات سے شرم آتی تھی کہ وہ کھانا کھائے بغیر میرے دسترخوان سے اٹھ کر چلا جائے لہٰذا مجھے یہ کہنا پڑا۔"

ابی نے کہا: "میں اس وقت تک تم سے راضی نہیں ہوں گا جب تک کہ اس (پیغمبر اسلامؐ) کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی زبردست توہین نہ کرو"۔ چنانچہ عقبہ نے ایسا ہی کیا اور مرتد ہو گیا اور انجام کار جنگِ بدر میں کفار کی صف میں مارا گیا اسی طرح اس کا دوست "ابی" بھی جنگِ احد میں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔[1]

مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان میں ایسے شخص کا انجام بیان کیا گیا جو اس دنیا میں اپنے گمراہ دوست کی دوستی کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے۔

ہم کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ اگرچہ آیات کی شانِ نزول خاص ہوتی ہے لیکن اس سے آیات کا مفہوم ہرگز محدود نہیں ہوتا بلکہ ان کے کلیے اور قاعدے اس قسم کے تمام افراد کے لیے ہوتے ہیں۔

تفسیر

بُرے دوست نے گمراہ کیا

قیامت کے مناظر بھی عجیب و غریب ہوں گے جن کا کچھ حصہ ابھی گزشتہ آیات کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے اور ان آیات میں ان مناظر کا ایک اور پہلو اجاگر کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظالم لوگ بروزِ قیامت اپنے گزشتہ کردار پر حد سے زیادہ حسرت اور افسوس کریں گے، چنانچہ خدا فرماتا ہے:

"اس دن کو یاد کیجیے جب ظالم حسرت کی وجہ سے اپنے ہاتھ اپنے دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا اے کاش! میں نے رسول اللہ کا راستہ اپنایا ہوتا (ویوم یعض الظالم علٰی یدیہ یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلًا)۔[2]

"یعض" "عض" (بروزن "سد") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ دانتوں سے کاٹنا ہے۔ عموماً یہ تعبیر ان لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو افسوس اور حسرت کی وجہ سے سخت پریشان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فارسی میں بھی ضرب المثل ہے کہ "فلاں شخص حسرت کی وجہ سے اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ رہا ہے" (لیکن عربی میں انگلی کے بجائے ہاتھ کا لفظ بولا جاتا ہے اور شاید یہ زیادہ فصیح بھی ہے کیونکہ انسان عموماً ایسی حالت میں انگلیوں کو ہی نہیں کاٹتا بلکہ ہاتھ کی پشت کو بھی کاٹتا ہے) خصوصاً عربی زبان میں ایسے مواقع پر لفظ "یدیہ" (دونوں ہاتھ) استعمال کیا جاتا ہے جو حسرت، یاس، ناکامی اور افسوس

---

[1] مجمع البیان انھی آیات کے ذیل میں۔

[2] "یوم یعض" کا جملہ ادبی لحاظ سے "یوم یرون" پر عطف ہے جو سابق میں گزر چکا ہے بعض مفسرین نے "اذکر" کو مقدر سمجھا ہے اور اسے اس کا متعلق قرار دیا ہے۔

زیادہ بہتر صورت میں بیان کرتا ہے)[۱]

یہ شاید اس لیے کہ اس قماش کے لوگ جب اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو خود کو قصور دار ٹھہراتے ہیں اور اس قصور کا انتقام بھی خود سے لینے کی ٹھان لیتے ہیں تاکہ وہ اس طرح سے قدرے اطمینان حاصل کر سکیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس دن کو "یوم الحسرۃ" کہنا چاہیے جیسا کہ خود قرآن نے بھی اسے اس نام سے یاد کیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ مریم آیت ۳۹ کیونکہ مجرم اور گناہ گار لوگ اپنے آپ کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور پائیں گے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوگی جبکہ وہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں صبر و شکیبائی، خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت، جہاد بالنفس اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کر کے ہمیشہ کی عزت و افتخار اور سعادت کی زندگی حاصل کر سکتے تھے۔

حتیٰ کہ قیامت کا دن نیک لوگوں کے لیے بھی حسرت اور ندامت کا دن ہوگا کیونکہ وہ اس بات کا افسوس کریں گے کہ انھوں نے دنیا میں اس سے زیادہ نیکی کیوں نہیں کی۔

قرآن آگے فرماتا ہے کہ یہ ظالم بڑے افسوس کے ساتھ کہے گا: "پھٹکار ہو مجھ پر کاش کہ میں نے فلاں گمراہ شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا (یاویلتٰی لیتنی لم اتخذ فلانًا خلیلًا)[۲]۔

ظاہر ہے کہ "فلاں" سے مراد وہ شخص ہے جو اسے گمراہی کی طرف کھینچ لایا تھا خواہ وہ شیطان تھا یا بُرا دوست اور گمراہ رشتہ دار یا "عقبہ" جیسے لوگوں کے لیے "ابی" جیسے دوست احباب۔

درحقیقت یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت نفی اور اثبات کی دو مختلف حالتیں بیان کر رہی ہیں ایک جگہ کہتا ہے اے کاش! میں نے پیغمبر کا رستہ اختیار کیا ہوتا اور دوسری جگہ کہتا ہے: اے کاش! میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ گویا وہ یہ کہنا چاہے گا کہ میری تمام بدبختی پیغمبر سے رابطہ ترک کرنے اور اس گمراہ دوست سے دوستی کی وجہ سے ہے۔

سلسلہ کلام جاری ہے آگے فرماتا ہے کہ وہ کہے گا: بیداری اور علم و آگہی میرے پاس آچکی تھی (سعادت اور خوش بختی نے میرا دروازہ بھی کھٹکھٹایا تھا) لیکن اس بے ایمان دوست نے مجھے گمراہ کیا (لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی)۔

اگر ایمان اور سعادتِ ابدی سے زیادہ دور ہوتا پھر تو افسوس کی ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن میں اس سعادتِ جاودانی کی سرحد کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا صرف ایک قدم کا فاصلہ باقی تھا کہ اس ہٹ دھرم متعصب اور دل کے اندھے شخص نے مجھے چشمۂ آبِ حیات کے کنارے سے پیاسا پلٹا کر بدبختی اور گمراہی کے دلدل میں ہمیشہ کے لیے پھنسا دیا۔

---

[۱] البتہ فارسی میں کبھی ہاتھ کو دانتوں سے کاٹنا بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے ایک شعر میں اسی محاورے کو استعمال کیا ہے۔ سہ

حذر کن ز آنچہ دشمن گوید آن کن | کہ بر دندان گزی دست تغابن

(جو کچھ دشمن کہتا ہے اس کے کرنے سے بچو ورنہ نقصان کے وقت ہاتھ کو دانتوں سے کاٹو گے)۔

[۲] "خلیل" اس خاص اور جگری دوست کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے مشوروں میں شریک کرتا ہے البتہ خلیل کے اور بھی بہت سے معانی ہیں جن کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد چہارم (سورۂ نساء کی آیت ۱۲۵) میں گزر چکی ہے۔

مندرجہ بالا جملے میں مذکورہ لفظ "ذکر" کے وسیع معنی ہیں اور آسمانی کتابوں کی تمام آیات خداوندی اس کے مفہوم میں شامل ہیں بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کی بیداری اور آگہی کا سبب بنتی ہے اس میں آجاتی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو چھوڑتا آرہا ہے (وکان الشیطان للانسان خذولًا)۔ کیونکہ وہ انسان کو کھینچ تان کر غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور خطرناک مقام پر پہنچا کر اسے حیران و سرگرداں چھوڑ کر اپنی راہ لیتا ہے۔

توجہ رہے کہ "خذول" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے بار بار چھوڑنے والا۔ "خذلان" کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی امداد کے لیے عہد کرے لیکن نہایت ہی حساس لمحات میں اس کی امداد سے ہاتھ اٹھا لے۔

آیا اس آیت کا یہ آخری جملہ "وکان الشیطان للانسان خذولا" قولِ خداوندی ہے جو کہ تمام ظالموں اور گمراہ لوگوں کو تنبیہ کی صورت میں بیان ہوا ہے یا بروزِ قیامت ان حسرت زدہ لوگوں کے قول کا ایک حصہ ہے جو تتمہ کے طور پر بیان ہوا ہے اس بارے میں مفسرین نے دو طرح کی تفسیریں بیان کی ہیں اور دونوں ہی آیت سے مناسبت رکھتی ہیں۔ لیکن قولِ خدا ہونا زیادہ مناسب ہے۔

دوستی کا اثر

اس میں شک نہیں کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کے تعمیری عوامل میں اس کے اپنے ارادے منشا اور خواہش کے بعد اور بھی بہت مختلف امور شامل ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم اور مؤثر عامل اس کا دوست اور ہم نشین ہوتا ہے کیونکہ انسان چار و ناچار اس کا اثر ضرور قبول کرتا ہے نیز اپنے اکثر و بیشتر افکار اور اخلاقی صفات اپنے دوستوں اور ہم نشینوں سے حاصل کرتا ہے اور یہ حقیقت علمی تجرباتی اور مشاہداتی طور پر پایہ ثبوت تک بھی پہنچ چکی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دوستی کے اثر کی اہمیت تو اس حد تک ہے کہ اسلامی روایات میں خدا کے نبی جناب سلیمان علیہ السلام سے یوں منقول ہے:

لا تحکموا علی رجل بشیءٍ حتی تنظروا الی من یصاحب، فانما یعرف الرجل باشکالہ واقرانہ وینسب الی اصحابہ واخدانہ

جب تک کسی انسان کے دوستوں کو اچھی طرح نہ دیکھ لو تو اس وقت تک اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرو کیونکہ انسان اپنے دوست و احباب اور یار و انصار سے پہچانا جاتا ہے[۱]

امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا ایک فصیح و بلیغ ارشاد ہے:

ومن اشتبہ علیکم امرہ ولم تعرفوا دینہ، فانظروا الی خلطائہ فان کانوا اہل دین اللہ فہو علی دین اللہ، وان کانوا علی غیر دین اللہ فلا حظ لہ من دین اللہ

جب تک کسی شخص کی کیفیت اور حقیقتِ حال کو نہ پہچان سکو اور اس کے دین کے متعلق بھی تمھیں معلوم نہ ہو سکے تو اس کے

---

[۱] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۲۷ (مادہ "صدق")۔

دوست اور احباب کو دیکھ لیا کرو اگر تو وہ خدا کے دین کے پابند ہیں تو وہ بھی دینِ الٰہی کا پیروکار ہوگا اور اگر وہ اہلِ دین نہیں ہیں تو اس کا بھی دین میں کوئی حصہ نہیں ہے[۱]

حقیقت بھی یہی ہے کہ بسا اوقات کسی شخص کی نیک بختی یا بدبختی کے لیے اس کے دوست کی دوستی سب عوامل سے موثر عامل ہوتی ہے یا تو یہ دوستی اسے فنا کی سرحدوں تک لے جاتی ہے اور یا پھر اعزاز و افتخار کی بلندیوں تک جا پہنچاتی ہے۔

مذکورہ بالا آیات اور ان کی شانِ نزول سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کیونکر سعادت اور خوش بختی کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے لیکن ایک دوست کی طرف سے صرف ایک شیطانی وسوسہ کس طرح رجعت قہقری میں مبتلا کر کے اسے ہلاکت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈال دیتا ہے کہ جس پر وہ حسرت کرے گا اور بروزِ قیامت اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹے گا اور "یا ویلتیٰ" کی فریادیں بلند کرے گا۔

"کتاب العشرۃ" (آدابِ معاشرت) میں اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں جو بتاتی ہیں کہ اسلام نے دوست کے انتخاب کے سلسلے میں کس قدر سخت شرائط اور کڑی پابندیاں لگائی ہیں۔

اس مختصر سی بحث کو دو حدیثیں بیان کر کے ہم ختم کرتے ہیں جو احباب بیشتر تفصیل کے خواہش مند ہیں وہ بحار الانوار جلد ۴، کتاب العشرۃ کا مطالعہ فرمائیں۔

اسلام کے نویں عظیم الشان پیشوا حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

ایاک ومصاحبۃ الشریر فانہ کالسیف المسلول یحسن منظرہ ویقبح اثرہ

بُرے شخص کی ہم نشینی سے بچو کیونکہ وہ شمشیر برہنہ کی مانند ہوتا ہے جس کا ظاہر خوبصورت اور اثر بہت خطرناک ہوتا ہے۔[۲]

پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اربع یمتن القلب، الذنب علی الذنب ... ومجالسۃ الموتیٰ، وقیل لہ یا رسول اللہ وما الموتیٰ؟ قال کل غنی مترف

چار چیزیں انسانی دل کو مردہ کر دیتی ہیں، گناہ کا تکرار ... (یہاں تک کہ فرمایا) مُردوں کے ساتھ ہم نشینی، کسی نے پوچھا حضور! وہ مردے کون ہیں؟ فرمایا وہ دولتمند جو اپنی دولت کے نشے میں بدمست ہوتے ہیں۔[۳]

---

۱ بحار الانوار جلد ۴، ص ۱۹۷۔

۲ بحار جلد ۴، ص ۱۹۸۔

۳ فضائل صدوق (منقول از بحار الانوار جلد ۴، ص ۱۹۵)۔

۳۰۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝
۳۱۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝
۳۲۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝
۳۳۔ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝ۭ
۳۴۔ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ۧ

ترجمہ

۳۰۔ اور رسول نے عرض کیا: خداوندا! میری اس قوم نے قرآن سے دُوری اختیار کر لی ہے۔

۳۱۔ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرم لوگوں میں سے دشمن بنا دیئے ہیں لیکن اسی قدر کافی ہے کہ خدا تیرا ہادی اور مددگار ہے۔

۳۲۔ اور کافروں نے کہا کہ آخر قرآن اس پر ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ اور یہ صرف اس بناء پر ہے تاکہ ہم تیرا دل محکم اور استوار رکھیں اور ہم نے اسے تجھ پر تدریجاً پڑھا ہے۔

۳۲۔ وہ تیرے لیے کوئی مثل نہیں لاتے مگر یہ کہ ہم تیرے لیے حق اور بہتر تفسیر لے آتے ہیں (اور دندان شکن جواب تاکہ وہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔)

۳۴۔ جو لوگ منہ کے بل جہنم کی طرف محشور کیے جائیں گے ان کا بدترین ٹھکانا ہوگا اور وہ خود گمراہ ترین لوگ ہوں گے۔

تفسیر

خداوندا! لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا

چونکہ گزشتہ آیات میں ہٹ دھرم مشرکین اور بے ایمان لوگوں کے مختلف الزامات اور اعتراضات بیان ہوئے ہیں لہٰذا ان آیات میں سے پہلی آیت میں پیغمبر اسلامؐ کی اس پریشانی اور شکایت کا تذکرہ ہے، جو لوگوں نے قرآن کے ساتھ رویہ اختیار کیا ہوا تھا انھوں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا خداوندا! میری اس قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور اس سے دوری اختیار کرلی ہے (وقال الرسول یارب ان قومی اتخذ وا ھذا القراٰن مھجورًا)[1]

رسول اللہؐ کی یہ گفتگو اور شکایت آج بھی اسی طرح فضا میں گونج رہی ہے گویا آپؐ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ کے خلاف بارگاہِ ایزدی میں استغاثہ کررہے ہیں: خدایا! ان لوگوں نے قرآن کو بالکل بھلا دیا ہے جو قرآن زندگی کی علامت اور نجات کا ذریعہ ہے، جو قرآن فتح و کامرانی، تحرک اور ترقی کا عامل ہے، جو قرآن ہر شعبہ زندگی کے لیے راہنما اصول رکھتا ہے۔ اسی قرآن کو ان لوگوں نے چھوڑ دیا ہے حتیٰ کہ انھوں نے اپنے دیوانی اور فوجداری قوانین تک کے لیے دوسروں کی طرف گدائی کا ہاتھ پھیلایا ہوا ہے۔

اب بھی اگر ہم اکثر و بیشتر اسلامی ملکوں خاص کر ان ممالک کی طرف نظر کریں جو مشرقی یا مغربی کلچر اور ثقافت کے زیر تسلط ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں پر قرآن مجید کو تکلفاً ایک مقدس کتاب کا درجہ دیا گیا ہے اس کے صرف الفاظ کو خوبصورت آواز میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے نشریاتی اداروں سے نشر کردیا جاتا ہے یا آیاتِ قرآنی کو فنِ تعمیر کے عنوان سے مسجدوں کی کاشی کاری میں جگہ دی جاتی ہے۔ نئے مکان کے افتتاح کے موقع پر یا مسافر کی جان کی حفاظت کے لیے یا بیماروں کی صحت یابی کے لیے یا زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب کی غرض سے اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔

اگر کبھی قرآنِ مجید سے کسی چیز کا استدلال بھی کیا جاتا ہے تو اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اپنے پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں کی تائید میں تفسیر بالرائے کی جائے۔

بہت سے اسلامی ملکوں میں "حفظِ قرآن" کے نام سے لمبے چوڑے مدارس دیکھنے میں آتے ہیں جن میں لڑکے اور لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد قرآن حفظ کرنے میں مصروف ہے جبکہ ان ملکوں کے آئین اور قوانین اسلام سے بےخبر ممالک سے درآمد شدہ

---

[1] "قال" ظاہراً فعل ماضی ہے اور اس بات کی نشاندہی کررہا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے یہ بات اسی دنیا میں شکایت کے طور پر کہی ہے اور اکثر مفسرین کا بھی یہی نظریہ ہے لیکن بعض دوسرے مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی مرحوم نے "المیزان" میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اس بات کا تعلق قیامت کے ساتھ ہے اور فعل ماضی یہاں پر فعل مضارع کے معنی میں ہے علامہ طبرسی مرحوم نے بھی مجمع البیان میں اسی چیز کو احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے لیکن بعد والی آیت جو آپؐ کی دلجوئی کررہی ہے اس بات کی دلیل ہے کہ مشہور تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

ہیں اور ان کے افکار و نظریات یا تو مشرق سے لیے گئے ہیں یا مغرب سے اور اپنی ان غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے انھوں نے قرآن کا سہارا لیا ہوا ہے۔

ہاں ہاں اب بھی پیغمبر اکرمؐ فریاد کررہے ہیں: خداوندا! میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔

قرآن کی روح اور مطالب کو، اس کے طرزِ تفکر کو اور اس کے تعمیری منصوبوں پر عمل درآمد چھوڑ دیا ہے۔

چونکہ حضرت رسولِ گرامی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو دشمنوں کے اس قسم کے معاندانہ سلوک کا سامنا تھا۔ لہٰذا خداوندِ عالم ان کی دلجوئی کے لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: اسی طرح کے گناہ گار اور مجرم دشمن ہم نے ہر پیغمبر کے لیے قرار دیئے ہیں (وکذلک جعلنا لکل نبی عدوًا من المجرمین)۔

تو ہی نہیں کہ جسے اس قسم کے سخت دشمنوں کا سامنا ہے بلکہ سب انبیاء کا یہی حال تھا۔ مجرمین کا کوئی نہ کوئی ٹولہ ان کی مخالفت کرتا رہتا ہے اور ان کے ساتھ دشمنی پر ہمیشہ کمر باندھے رہتا ہے۔

لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تو بے یار و مددگار نہیں" یہی بات کافی ہے کہ خداوندِ عالم تیرا ہادی، راہنما اور یار و یاور ہے (وکفٰی بربک ھادیًا ونصیرًا)۔

چونکہ تیرا ہادی خداوندِ عالم ذوالجلال ہے لہٰذا ان کے وسوسے تجھ پر اثر انداز نہیں ہوسکتے اور چونکہ تیرا ناصر و مددگار خدا ہے لہٰذا ان کی ہر طرح کی سازشیں تیرا بال تک بیکا نہیں کرسکتیں کیونکہ اس کا علم تمام علوم سے برتر اور اس کی قدرت تمام قدرتوں اور طاقتوں سے بالاتر ہے۔ مختصر یہ کہ بلا جھجک کہہ دے:

ہزار دشمنم از می کنند قصد ہلاک   تو ام چو دوستی از دشمنان ندارم باک

اگر میرے ہزاروں دشمن مجھے ہلاک کرنا چاہیں (تو وہ ایسا نہیں کرسکتے) کیونکہ جب تک تو میرا دوست ہے مجھے دشمن کی قطعًا کوئی پرواہ نہیں۔

بعد والی آیت میں ان مجرموں کی ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کافروں نے کہا کہ اس پر قرآن ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں ہوتا (وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القراٰن جملۃ واحدۃ)۔

آیا یہ سب کا سب خدا کی طرف سے نہیں ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اوّل سے لے کر آخر تک اپنے تمام مضامین سمیت ایک ہی مرتبہ یہ کتاب نازل ہوجاتی تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس کی عظمت سے باخبر ہوں آخر کیا وجہ ہے کہ یہ آیات بتدریج وقفے وقفے کے بعد نازل ہوتی رہتی ہیں؟

سطحی فکر رکھنے والے افراد خاص کر جب وہ کسی بہانے کی تلاش میں بھی ہوں ان کے لیے نزولِ قرآن کی کیفیت کے میں یہ اشکال پیدا ہوگا کہ دنیا جہان کی اس قدر عظیم آسمانی کتاب بیک وقت کیوں نازل نہیں ہوئی جبکہ یہ مسلمانوں کے تمام امور سرمایہ اور ان کی بنیاد ہے اور اس میں تمام سیاسی، اجتماعی، معاشرتی اور عبادی قوانین موجود ہیں اس طرح سے لوگ ہمیشہ اسے اوّل آخر تک پڑھتے اور اس کے مضامین سے آگاہی حاصل کرتے۔

بہتر یہی ہے کہ خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم بھی اس سے مجموعی طور پر باخبر ہوتے تاکہ جب بھی آپؐ سے لوگ کو

سوال کرتے تو اس کا فوری طور پر جواب دے دیتے ۔

لیکن اسی آیت میں انھیں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے :

ہم نے قرآن کو تدریجی طور پر نازل کیا ہے تاکہ تیرے دل کو محکم و استوار رکھیں اور اسے جدا گانہ آیات کی صورت میں آہستہ آہستہ لیکن بطور مسلسل تجھ پر وحی کیا ہے (کذلک لنثبت بہ فؤادک و رتلناہ ترتیلاً) ۔

چونکہ وہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں لہٰذا اس قسم کے اعتراضات کرتے ہیں ۔

البتہ قرآن کے تدریجی نزول کا پیغمبر اسلامؐ اور مومنین کے دل کی تقویت کے ساتھ کیا رابطہ ہے ؟ یہ ایک مفصل اور دلچسپ گفتگو ہے جو انھی آیات کے آخر میں نکات کی بحث میں پیش کی جائے گی ۔

پھر مندرجہ بالا جواب کو مزید پختہ کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے : وہ تیرے لیے کوئی مثل نہیں لاتے اور تیری دعوت کو کمزور کرنے کے لیے کوئی بھی بات نہیں کرتے مگر یہ کہ ہم ایسی حق بات تجھے عطا کر دیتے ہیں جو دو ٹوک انداز میں ان کے بودے دلائل کو ناکام کر کے رکھ دیتی ہے اور بہتر تفسیر اور دلچسپ بیان تجھے عطا کرتے ہیں (ولا یأتونک بمثل الا جئناک بالحق واحسن تفسیرًا) ۔

ان کینہ پرور دشمنوں اور متعصب اور ہٹ دھرم مشرکوں نے اپنے چند اعتراضات کے ذریعے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ ان اوصاف اس کتاب اور ان پروگراموں کی وجہ سے (نعوذ باللہ) محمد اور اس کے ساتھی غلط لوگ ہیں اور کیونکہ ایسی بے ہودہ سوچ اور گفتگو کا اسی انداز میں ذکر کرنا قرآن جیسی فصیح و بلیغ کتاب کے شایانِ شان نہیں تھا لہٰذا اس آخری آیت میں ان کی گفتگو کو ذکر کیے بغیر خداوندِ عالم اس کا جواب یوں دیتا ہے ۔

جو لوگ منہ کے بل محشور کیے جائیں گے اور اسی حالت میں انھیں جہنم میں ڈالا جائے گا وہی ان کا بدترین ٹھکانا ہوگا اور وہ خود گمراہ ترین افراد ہوں گے (الذین یحشرون علی وجوھھم الی جھنم اولٰئک شر مکانًا واضل سبیلًا) ۔

سچ بات تو یہ ہے کہ انسان کے منصوبوں کا نتیجہ تو وہاں جا کر واضح ہوگا کچھ لوگ وہ ہوں گے جو سرو قامت اور چاند ایسے نورانی چہرے کے مالک ہوں گے اور تیز تیز قدموں کے ساتھ بہشت میں داخل ہوں گے ۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہوں گے جن کے منہ پر خاک پڑی ہوگی اور عذاب کے فرشتے انھیں کشاں کشاں جہنم میں لے جائیں گے ۔ یہ دو متضاد اور مختلف انجام ہی بتائیں گے کہ کون لوگ گمراہ اور شریر تھے اور کون نیک بخت اور ہدایت یافتہ ۔

چند اہم نکات

۱۔ "جعلنا لکل نبی عدوًا" کی تفسیر : ہو سکتا ہے مندرجہ بالا جملے سے یہ بات سمجھی جائے کہ خداوندِ عالم پیغمبرِ اسلامؐ کی دلجوئی اور تسلیِ خاطر کی غرض سے یہ فرما رہا ہے کہ "اے میرے حبیب ! صرف تیرے ہی دشمن نہیں ہیں بلکہ ہماری طرف سے ہر پیغمبر کے دشمن بنائے گئے ہیں یہاں پر دشمن بنانے کی نسبت خداوندِ عالم کی طرف ہے جو نہ تو حکمتِ خداوندی سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ ہی انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی سے مناسبت رکھتی ہے ۔

مفسرین نے اس سوال کے کئی جواب دیئے ہیں ۔

لیکن ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ تمام انسانوں کے اعمال ایک لحاظ سے خدا کی ذات کی طرف منسوب ہیں کیونکہ ہمارا سب کچھ ہماری قدرت، ہماری طاقت، ہماری عقل و فکر حتیٰ کہ ہماری آزادی اور ارادہ و اختیار بھی اسی کی طرف سے ہیں ۔ بنا بریں انبیاء کے دشمنوں کو بھی اس نظریہ کے تحت خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور اس طرح سے نہ تو جبر کا مسئلہ پیش آتا ہے اور نہ ہی بے اختیاری کا جیسے انبیاء کے کاموں کی ذمہ داری بھی مخدوش نہیں ہوتی (خوب غور کیجیے گا) ۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ان زبردست دشمنوں کا وجود اور انبیائے کرام سے ان کی مخالفت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ مومنین اپنے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور زیادہ پائیداری اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور اس ذریعہ سے سب لوگوں کے بارے میں خدا کی آزمائش بھی ہوتی رہتی ہے ۔

درحقیقت یہ آیت بھی سورۂ انعام کی آیت ۱۱۲ کی مانند ہے جس میں خدا فرماتا ہے :

وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوًا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورًا

اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو بنایا ہے جو بے بنیاد اور دھوکے پر مبنی باتیں ایک دوسرے سے مخفی طور پر بیان کرتے ہیں ۔

جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور جہاں نیک لوگ ہوتے ہیں وہاں بدکار بھی ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنا اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "جعلنا" (ہم نے بنایا ہے) سے مراد انبیاء کے اوامر، نواہی اور دوسرے تعمیری پروگرام ہیں جن سے چار و ناچار کچھ لوگوں کو دشمنی ہو جاتی ہے اور وہ گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اگر اس کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تو اس لیے ہے کہ یہ اوامر اور نواہی خدا کی طرف سے ہیں ۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ کچھ متعصب لوگ بھی ہیں جو اپنے تعصب، گناہوں پر اصرار اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے راہِ راست سے اس قدر بھٹک چکے ہیں کہ خداوندِ عالم نے ان کے دل پر مہر لگا دی ہے ان کی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کر دیا ہے جس کی وجہ وہ انبیاء کے دشمن ہو جاتے ہیں لیکن اس دشمنی کے اسباب انھوں نے خود ہی فراہم کیے ہوتے ہیں ۔

ان تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور ان تینوں تفاسیر کو آیت کے ایک مفہوم میں جمع کیا جا سکتا ہے ۔

۲۔ **قرآن کا تدریجی نزول کیوں ؟** یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات (بلکہ بعض آیات کے ظاہر) کے مطابق قرآن دو مرتبہ نازل ہوا ہے ، ایک "دفعی نزول" کی صورت میں جو کہ شب قدر میں یک وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "قلب مبارک پر نازل ہوا اور دوسرا "تدریجی نزول" کی صورت میں ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوتا رہا ۔ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جس نزول نے قبولیت کی سند حاصل کی ہے اور پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے لوگوں کو جس سے واسطہ رہا ہے وہ یہی "تدریجی نزول" ہے ۔ یہی نزول حیلہ ساز دشمنوں کے اعتراض کا موجب بنا ہوا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن یکبارگی نازل نہیں ہوتا اور ایک ہی

مرتبہ لوگوں کے پاس کیوں نہیں پہنچ جاتا تاکہ لوگوں کو مکمل آگاہی حاصل ہو اور ان کے لیے کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے

لیکن جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن مجید نے "کذلک لنثبت بہ فؤادک" کہہ کر انھیں ایک مختصر مگر جامع جواب دیا ہے اس پر جتنا غور وفکر کیا جائے قرآن کے تدریجی نزول کے اثرات بیشتر واضح ہوتے جائیں گے۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ "وحی کی وصولی" اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے لحاظ سے اگر مطالبِ قرآنی تدریجی طور پر اور ضرورت کے مطابق نازل ہوں اور ہر مطلب کے لیے اس کا شاہد اور مصداقِ عینی پایا جائے تو نہایت ہی مؤثر ہوگا۔

تربیت کے اصول بھی اسی بات کے متقاضی ہیں کہ زیرِ تربیت افراد کو قدم بقدم آگے بڑھانا چاہیے اور ان کے لیے ہر روز کا علیحدہ پروگرام مرتب کیا جانا چاہیے تاکہ وہ نچلے درجے سے شروع کرکے اعلیٰ مدارج تک جا پہنچیں اس طرح کا جو پروگرام تشکیل دیا جاتا ہے وہ بولنے والے کے لیے بھی بہت دلچسپ اور عمیق ہوتا ہے اور سننے والے کے لیے بھی۔

۲۔ اصولی طور پر جو لوگ قرآن پر اس قسم کا اعتراض کرتے تھے وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ قرآن کوئی کلاسکی کتاب نہیں ہے جو کسی ایک موضوع یا کسی خاص علم کے بارے میں گفتگو کرے بلکہ وہ تو ایک انقلابی قوم کا ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

بہت سی قرآنی آیات تاریخی مناسبت کے لحاظ سے نازل ہوتی رہیں۔ بدر، اُحد، احزاب اور حنین وغیرہ کی جنگوں کے موقع پر ایسا ہی ہوا ہے۔ ان مواقع پر نازل ہونے والی آیتوں میں جنگی دستور العمل یا ان کے نتائج کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ تو کیا کوئی تک بنتا ہے کہ ایسی آیات بھی ایک جگہ لکھ کر لوگوں کو پیش کر دی جائیں۔

بالفاظ دیگر قرآن مجید، اوامر ونواہی، احکام وقوانین، تاریخ وموعظہ اور امتِ مسلمہ کو مختلف حالات میں پیش آنے والے حربی و غیر حربی حوادث کے اسٹریٹیجک اور جنگی دستور العمل کا مجموعہ ہے۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے تمام امور حتیٰ کہ کلیہ قواعد کو موقع محل کی مناسبت سے بیان کرتی اور اس پر عمل درآمد کرنے کا حکم دیتی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے سے مرتب اور مدون ہو کر نازل ہو یہ تو ایسے ہی ہوگا کہ اپنے انقلاب کو کامیاب کرنے کے لیے ایک عظیم انقلابی لیڈر اپنے تمام اعلانات، بیانات، اوامر اور نواہی کو ایک ہی دن پیش کر دے جبکہ انھیں مختلف موقعوں کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔

تو کیا ایسی صورت میں کوئی شخص ایسے عاقلانہ اقدام تصور کر سکتا ہے؟

۳۔ قرآن کا تدریجی نزول درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وحی کے رابطے کا ایک ذریعہ تھا اس مسلسل رابطے نے آپؐ کے دل کو قوی اور ارادے کو محکم واستوار بنا رکھا تھا جس کا اثر آپؐ کے تربیتی پروگراموں میں بہت نمایاں اور ناقابلِ انکار تھا۔

۴۔ وحی کا تسلسل آنحضرتؐ کی رسالت اور سفارت کے تسلسل کو بیان کرتا ہے جس سے دشمنوں کے لیے یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ اللہ نے انھیں ایک دن مبعوث کر دیا ہے اور اب ان کی بات بھی نہیں پوچھتا جیسا کہ تاریخ اسلام میں درج ہے کہ اوائلِ بعثت میں ایک مرتبہ وحی کے نزول میں دیر ہو گئی تو مخالف حلقوں میں مختلف چہ میگوئیاں ہونے لگیں جن کی تردید میں

سورۃ "والضحیٰ" نازل ہوئی۔

۵۔ مان لیا کہ تمام قرآن کو یکجا نازل ہو جانا چاہیے تھا تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس پر یکجا عملدرآمد بھی ہونا چاہیے تھا ورنہ کوئی فائدہ نہ تھا اور نہ ہی اس کی کوئی اہمیت تھی اور اگر تمام احکام پر عملدرآمد کیا جاتا خواہ وہ نماز ہو یا زکوٰۃ، جہاد ہو یا دوسرا کوئی واجب یا تمام محرمات سے یکدم پرہیز کیا جانا خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے تو نہایت ہی مشکل کام تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اسلام کو خیرباد کہہ جاتے۔

لہٰذا کیا ہی اچھی بات ہے کہ وہ تدریجی طور پر نازل ہو اور اس پر رفتہ رفتہ عمل درآمد کیا گیا۔

چاہیے کہ ایسے پروگرام آہستہ آہستہ عملی جامہ پہنتے جائیں اور لوگوں کے لیے قابلِ قبول بنتے جائیں اور اس بارے میں کوئی سوال یا بحث ہو تو وہ بھی پیش ہو اور اس پر گفتگو کی جائے اور اس کا جواب بھی دے دیا جائے۔

۶۔ تدریجی نزول کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قرآن کی عظمت اور اس کا اعجاز روز بروز روشن تر ہو گئے کیونکہ جب کبھی بھی کسی موقع پر کوئی آیت نازل ہوئی تو یہ بذاتِ خود قرآن کی عظمت اور اعجاز پر دلیل تھی اور جوں جوں ایسے واقعات کا تکرار ہوتا گیا قرآن کی عظمت اور اعجاز کو چار چاند لگتے گئے اور لوگوں کے دلوں میں اس کا اثر اور بڑھتا گیا۔

۲۔ ترتیلِ قرآن کا معنیٰ: "ترتیل" کا لفظ "رتل" (بروزن "قمر") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ منظم اور مرتب ہونا ہے یہی وجہ ہے کہ جس شخص کے دانت خوب منظم اور مرتب ہوتے ہیں اہلِ عرب اسے "رتل الاسنان" کہتے ہیں۔ اسی بناء پر پے در پے اور ترتیب سے کی جانے والی گفتگو یا تنظیم اور ترتیب کے ساتھ آنے والی آیات پر بھی ترتیل کا لفظ بولا جاتا ہے۔

لہٰذا "ورتلناہ ترتیلا" کا جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ قرآن مجید تدریجی طور پر ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوتا رہا لیکن یہ تدریجی نزول ایک باقاعدہ حساب وکتاب اور نظم وترتیب کے تحت تھا کہ وہ دل ودماغ میں پہنچ کر انھیں اپنا والہ وشیدا بنا دیتا تھا۔

کلمہ "ترتیل" کی تفسیر میں دلچسپ روایات ذکر ہوئی ہیں جن میں سے ہم بعض کو ذیل میں نقل کئے دیتے ہیں۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن عباس سے فرمایا:۔

اذا قرأت القراٰن فرتلہ ترتیلا

جب قرآن کی تلاوت کیا کرو تو اسے ترتیل کے ساتھ پڑھا کرو۔

ابن عباس کہتے ہیں "میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ترتیل کیا ہوتی ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا:

بینہ تبییناً، ولا تنثرہ نثر الدقل (الرمل) ولا تھذہ ھذا الشعر، قفوا عند عجائبہ، وحرکوا بہ القلوب، ولا یکونن ھم احدکم اٰخر السورۃ

حروف اور کلمات کو صحیح طریقے پر ظاہر کرو، خشک کھجوروں (یا ریت کے ذرّوں) کی مانند اسے منتشر نہ کرو اور نہ ہی اشعار کی مانند اسے فرفر اور جلدی جلدی پڑھا کرو جب اس میں عجائبات کا تذکرہ آ جائے تو

وہاں پر ٹھہر جاؤ اور غور و فکر کرو، دلوں کو اس کے ذریعے متحرک کرو، ہرگز تمھاری نیت یہ نہیں ہونی چاہیے کہ جلدی سے سورت کو ختم کرنا ہے (بلکہ اہم مقصد قرآن میں غور و فکر اور اس سے استفادہ کرنا ہے)[1]

بعینہ یہی چیز "اصول کافی" میں حضرت امیر المومنین سے منقول ہے[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی اس طرح کی حدیث نقل ہوئی:

الترتیل ان تتمکث به و تحسن به صوتك، واذا مررت بآية فيها ذكر النار فتعوذ بالله من النار واذا مررت بآية فيها ذكر الجنة فاسئل الله الجنة

ترتیل یہ ہے کہ آیات کو ٹھہر ٹھہر کر اور اچھی آواز کے ساتھ پڑھو جب کسی ایسی آیت پر پہنچو جس میں جہنم کا تذکرہ ہے تو خدا کی پناہ مانگو اور جب کبھی ایسی آیت پڑھو جس میں بہشت کا ذکر ہے تو خدا سے بہشت کی دعا مانگو (خود کو بہشتیوں کے اوصاف سے متصف کرو اور جہنمیوں کی صفات سے بچاؤ)[3]

۴۔ "یحشرون علی وجوھھم الی جھنم" کی تفسیر: "گناہ گار ٹولے کا منہ کے بل محشور ہونے" کا کیا مقصد ہے؟

اس بارے میں مفسرین نے بہت کچھ گفتگو کی ہے کچھ مفسرین نے تو اسے اس کے حقیقی معنیٰ سے تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ مجرم ٹولہ منہ کے بل گرا ہوا ہوگا اور فرشتے انھیں کشاں کشاں جہنم میں لے جائیں گے ان کا یہ عذاب ایک طرف سے تو ان کی ذلت و رسوائی کی علامت ہوگا کیونکہ وہ دنیا میں انتہائی مغرور، متکبر اور خود پسند تھے دوسری طرف سے ان کی گمراہی مجسم ہو کر سامنے آجائے گی کیونکہ جس شخص کو ایسی حالت میں گھسیٹ کر لے جائیں گے وہ کسی بھی صورت میں اپنے سامنے نہیں دیکھ سکے گا اور نہ ہی وہ اپنے اطراف میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر ہوگا۔

لیکن بعض مفسرین نے اس جملے کو کنایہ کے معنیٰ میں لیا ہے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ جملہ ان گناہ گاروں کے دنیا کے ساتھ قلبی تعلق کیلئے کنایہ ہے یعنی کیونکہ ان کے دل اب بھی دنیا سے لو لگائے ہوئے ہونگے لہٰذا وہ جہنم کی طرف گھسیٹے جائیں گے[4]

اور کچھ نے کہا ہے کہ یہ کنایہ اس مخصوص تعبیر کی مانند ہے جو ادبیاتِ عرب میں استعمال ہوتی ہے کہ:

فلان مر علی وجهه

فلاں شخص کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کنایہ کے معنیٰ پر کوئی دلیل موجود نہ ہو وہی پہلے یعنی حقیقی معنی والی تفسیر مناسب ہوگی۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] اصولِ کافی جلد ۲ ص ۴۴۹ (باب ترتیل القرآن بالصوت الحسن)۔

[3] مجمع البحرین مادہ "رتل"۔

[4] اس تفسیر کی رو سے "علی وجوھھم" کی تعبیر نے درحقیقت علت کی جگہ لی ہے اور اس جملے کا مفہوم یوں ہوگا:

یحشرون الی جھنم لتعلق وجوہ قلوبھم الی الدنیا

۳۵۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۝

۳۶۔ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ

تَدْمِيْرًا ۝ؕ

۳۷۔ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

۳۸۔ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ

كَثِيْرًا ۝

۳۹۔ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۟ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝

۴۰۔ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا

يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝

ترجمہ

۳۵۔ ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی اور ان کے بھائی ہارون کو مدد کے لیے ان کے ہمراہ کر دیا۔

۳۶۔ اور ہم نے کہا کہ اس قوم کی طرف جائیے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے (چونکہ اس قوم نے ہماری مخالفت پر کمر باندھ لی تھی لہٰذا) ہم نے اس کی ایسی سرکوبی کی کہ وہ نیست و نابود ہوگئی۔

۳۷۔ اور چونکہ قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا لہٰذا اسے غرق کر دیا اور اسے دوسرے لوگوں کے لیے درسِ عبرت بنا دیا اور ہم نے ستم گروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۳۸۔ (اسی طرح) قومِ عاد و ثمود، اصحاب الرس (جو درخت صنوبر کی پرستش کیا کرتے تھے) اور بہت سی دوسری قوموں کو جو ان میں موجود تھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔

۳۹۔ اور ان میں سے ہر ایک کے لیے مثالیں بیان کیں (کیونکہ ان مثالوں سے انھوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا لہٰذ

ان میں سے ہر ایک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

۴۰۔ وہ (قوم لُوط کے) اس شہر کے پاس سے گزرے جس پر بُری بارش ہوئی (آسمان سے پتھر برسے) آیا انھوں نے اسے نہیں دیکھا؟ (ضرور دیکھا) لیکن وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

تفسیر

درسِ عبرت سے لاپروائی

ان آیات میں خداوند عالم ایک تو اپنے پیغمبرؐ اور مؤمنین کی تسلّی اور دلجوئی کے لیے دوسرے ان حیلہ ساز مشرکین کی تنبیہ کے لیے جن کی باتیں ابھی بیان ہو چکی ہیں، گزشتہ اقوام کی تاریخ اور ان کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور گزشتہ اقوام میں سے چھ قوموں کا خاص طور پر تذکرہ فرما رہا ہے (یعنی قوم فرعون، قوم نوح، قوم عاد، ثمود، اصحاب الرس اور قوم لُوط) اور ان اقوام کے انجام کو بطور درسِ عبرت پیش فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی اور ان کے بھائی ہارون کو مدد کے لیے ان کے ہمراہ کر دیا (ولقد اٰتینا موسی الکتاب وجعلنا معہ اخاہ ھارون وزیرًا)۔

کیونکہ انھوں نے فرعون کے ساتھ مقابلے کی عظیم ذمّہ داری اٹھا رکھی تھی لہٰذا اس انقلابی کام کو انھیں مل جل کر سرانجام دینا تھا تاکہ وہ اس انقلابی تحریک کو ساحلِ کامرانی تک پہنچا سکیں۔

"ہم نے (ان دونوں بھائیوں سے خطاب کرتے ہوئے) کہا: اس قوم کی طرف جائیے جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے" (فقلنا اذھبا الی القوم الذین کذبوا بایاتنا)۔

انھوں نے ایک تو آفاق و انفس اور کائنات میں موجود آیاتِ خداوندی کی عملاً تکذیب کی اور شرک و بت پرستی کی راہ اپنائی اور دوسرے انبیائے ماسبق کی تعلیمات کو نظر انداز ہی نہیں کر دیا بلکہ ان کی تکذیب بھی کی۔

لیکن جناب موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے باوجود اور عظیم اور روشن معجزات کے بعد بھی انھوں نے کفر اور انکار کا راستہ اپنایا" لہٰذا ہم نے انھیں ایسے سرکوب کیا کہ وہ نیست و نابود ہو گئے (فدمرناھم تدمیرًا)۔

"تدمیر" کا لفظ "دمار" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے تعجب خیز ہلاکت اور سچی بات ہے کہ دریائے نیل کی متلاطم موجوں میں قوم فرعون کی ایسے انداز میں تباہی تاریخ بشریت کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔

اسی طرح جب قوم نوح نے پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے اسے بھی غرق کر دیا اور اس کے انجام کو عام لوگوں کے لیے ایک واضح اور روشن نشانی قرار دیا اور تمام ظالموں کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے (و قوم نوح لما کذبوا الرسل اغرقناھم وجعلناھم للناس اٰیۃ و اعتدنا للظّلمین عذابًا الیمًا)۔

اور یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا (صرف ایک رسول کو نہیں بلکہ کئی رسولوں کو جھٹلایا)

کیونکہ خدا کے انبیاء اور رسولوں کے دعوتی اصولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا ایک کی تکذیب گویا سب کی تکذیب ہے اور پھر یہ کہ اصولی طور پر قوم نوح کو تمام انبیاء کی دعوت سے مخالفت تھی اور وہ تمام ادیان کے منکر تھے۔

اسی طرح "ہم نے قوم عاد و ثمود، اصحابِ رس اور دوسری بہت سی قومیں جو ان میں موجود تھیں کو ہلاک کر دیا (و عادًا و ثمودًا واصحاب الرس و قرونًا بین ذٰلک کثیرًا)۔[۱]

قوم عاد وہی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ہے حضرت ہودؑ کو اللہ نے احقاف (یا یمن) میں مبعوث فرمایا اور قوم ثمود اللہ کے پیارے نبی جناب صالح علیہ السّلام کی قوم ہے حضرت صالحؑ کو خدا نے وادی القریٰ (مدینہ اور شام کے علاقے) میں مبعوث فرمایا۔ البتہ اصحاب الرس کے بارے میں ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے۔

"قرون" "قرن" کی جمع ہے جو اصل میں ایسی جماعت اور گروہ کے بارے میں بولا جاتا ہے، جس کے افراد ایک ہی زمانے میں باہم زندگی بسر کرتے ہوں۔ پھر ایک لمبے زمانے (مثلاً چالیس سال یا سو سال) پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔

البتہ ہم نے انھیں غافل کر کے سزا نہیں دی بلکہ "ہم نے ان میں سے ہر ایک کے لیے مثالیں بیان کیں" (و کلًّا ضربنا لہ الامثال)۔

جس قسم کے اعتراضات یہ لوگ آپؐ پر کرتے ہیں اور ہم ان کا جواب دیتے ہیں، اسی طرح کے اعتراض لوگوں نے ان پر بھی کیے تھے۔ اور ہم نے ان کا جواب بھی دیا۔ ان کے لیے احکامِ الٰہی کو واضح طور پر پیش کیا اور دینی حقائق کو ان کے سامنے کھول کر بیان کیا۔

انھیں خبردار کیا، ڈرایا اور سابق لوگوں کی داستانیں بیان کیں۔

لیکن جب کوئی چیز بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تو" ہم نے ان میں سے ہر ایک کی شدت کے ساتھ سرکوبی کی اور انھیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا" (و کلًّا تبرنا تتبیرًا)۔[۲]

انجامِ کار اس سلسلے کی آخری آیت میں قوم لُوط کے شہروں کے کھنڈرات اور ویرانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو حجاز سے شام جانے والے لوگوں کی راہ میں پائے جاتے ہیں اور شرک و گناہ سے آلودہ لوگوں کی دردناک تباہی و بربادی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں، خدا فرماتا ہے: وہ لوگ اس شہر کے پاس سے گزرے جس پر برائی اور بدبختی (ہلاک کر دینے والے پتھروں) کی بارش ہوئی، تو کیا انھوں نے (اپنے سفرِ شام کے دوران میں) ایسی صورتِ حال کو نہیں دیکھا اور ان کے انجام سے درس حاصل نہیں کیا (و لقد اتوا علی القریۃ التی امطرت مطر السوء افلم یکونوا یرونھا)۔

انھوں نے اس کیفیت کو دیکھا تو ضرور ہے لیکن اس سے درسِ عبرت حاصل نہیں کیا کیونکہ وہ روز قیامت پر نہ تو ایمان

---

[۱] "عاد اور ثمود" کے کلمہ کا عطف "دمرناھم" میں موجود "ھم" کی ضمیر پر ہے بعض مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ "جعلناھم" میں "ھم" کی ضمیر پر ہو سکتا ہے یا پھر "الظالمین" پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

[۲] "تتبیر" "تبر" (بروزن "ضرر" یا "صبر") ہلاک ہونے یا تباہ و برباد ہونے کے معنیٰ میں ہے۔

رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی امید (بل کانوا لایرجون نشورًا)۔

وہ لوگ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں اور اگر دوسرے جہان کی زندگی کے بارے میں ان کا کچھ عقیدہ ہے بھی تو نہایت ہی کمزور اور بے بنیاد۔ جس طرح یہ عقیدہ ان کی روح میں مؤثر اور کارگر ثابت نہیں ہوسکتا ان کی معمول کی زندگی میں تو بطریق اولیٰ غیر مؤثر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں اور چند روزہ زندگی کی ہوا و ہوس کے سوا کچھ سوچتے نہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ "اصحاب الرس" کون ہیں؟ "رس" کا لفظ دراصل مختصر اور تھوڑے سے اثر کے معنیٰ میں ہے جیسے کہتے ہیں "رس الحدیث فی نفسی" (مجھے اس کی تھوڑی سی بات یاد ہے) یا کہا جاتا ہے "وجد رسًا من حمی" (اس نے اپنے اندر بخار کا تھوڑا سا اثر پایا)[1]

کچھ مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "رس" کا معنیٰ "کنواں" ہے۔

معنی خواہ کچھ بھی ہو اس قوم کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اب تھوڑا سا اثر یا بہت ہی کم نام اور نشان باقی رہ گیا ہے یا اس وجہ سے انھیں "اصحاب الرس" کہتے ہیں کہ وہ بہت سے کنوؤں کے مالک تھے یا کنوؤں کا پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو گئے۔

یہ کون لوگ تھے؟ مؤرخین اور مفسرین کی اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔

(۱) بہت سے لوگوں کا نظریہ تو یہ ہے کہ اصحاب الرس "یمامہ" کے علاقے میں ایک قبیلہ تھا جس کے لیے حضرت "حنظلہ" نامی پیغمبر کو مبعوث کیا گیا ان لوگوں نے خدا کے اس نبی کی تکذیب کی اور انھیں کنوئیں میں ڈال دیا بلکہ بعض نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے اس کنوئیں کو نیزوں سے بھر دیا اور اس کا منہ پتھروں سے بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ کے نبی جناب حنظلہ وہیں پر شہید ہو گئے[2]

(۲) کچھ مؤرخین کا نظریہ یہ ہے کہ "اصحاب الرس" حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو بت پرست تھے ان کے بڑی تعداد میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہوتے تھے اور بہت سے کنوئیں بھی اور "رس" نامی کنواں بہت بڑا تھا اس کا پانی خشک ہو گیا اور اس علاقے کے لوگوں کو بھی تباہی نے آن لیا۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ سرزمین "یمامہ" میں "رس" نامی ایک گاؤں تھا، جہاں قوم ثمود کے بچے کھچے لوگ رہ رہے تھے اور اپنی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کے کچھ عرب تھے جو شام اور حجاز کے درمیان رہتے تھے[3]

---

[1] مفردات راغب۔

[2] اعلام القرآن ص ۱۴۹۔

[3] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۰ ص ۹۴۔

(۵) بعض تفسیریں عاد و ثمود کے بچے کھچے لوگوں کو "اصحاب الرس" کے نام سے موسوم کرتی ہیں اور سورۂ حج کی آیت ۴۵ "وبئر معطلة و قصر مشید" کا تعلق انھی لوگوں سے بتاتی ہیں اور "حضرموت" کا علاقہ ان کی جائے سکونت بتاتی ہیں چنانچہ "ثعلبی" نے "عرائس التیجان" میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

کچھ اور مفسرین جو "ارس" کے نام سے آشنا ہوئے ہیں انھوں نے "رس" کو "ارس" پر منطبق کیا ہے (جو آذربائیجان کے شمال کا علاقہ ہے)۔

(۶) مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں، فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے روح المعانی میں جو احتمالات نقل کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ لوگ شام کے علاقے انطاکیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نبی کا نام "حبیب نجار" تھا۔

(۷) عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام کے ذریعے امیر المومنین علی علیہ السلام سے اصحاب الرس کے بارے میں ایک طویل گفتگو نقل ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

"وہ ایسے لوگ تھے جو صنوبر درخت کی پوجا کرتے تھے اور اسے "درختوں کا بادشاہ" کہتے تھے یہ وہ درخت تھا جسے جناب نوحؑ کے بیٹے "یافث" نے طوفانِ نوح کے بعد "روشن آب" کے کنارے کاشت کیا تھا "رس" نامی نہر کے کنارے انھوں نے بارہ شہر آباد کر رکھے تھے جن کے نام یہ ہیں: آبان، آذر، دی، بہمن، اسفندار، فروردین، اردیبہشت، خرداد، تیر، مرداد، شہریور اور مہر۔ ایرانیوں نے اپنے کیلنڈر کے بارہ مہینوں کے نام انھی شہروں کے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔

چونکہ وہ درخت صنوبر کا احترام کرتے تھے لہٰذا انھوں نے اس کے بیج کو دوسرے علاقوں میں بھی کاشت کیا اور آبپاشی کے لیے ایک نہر کو مختص کر دیا انھوں نے اس نہر کا پانی لوگوں کے لیے پینا ممنوع قرار دے دیا تھا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس سے پی لیتا تو اسے قتل کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کیونکہ یہ ہمارے خداؤں کا سرمایہ حیات ہے لہٰذا مناسب نہیں ہے کہ کوئی اس سے ایک گھونٹ پانی کم کر دے۔

وہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر ماہ ایک ایک شہر میں ایک دن کے لیے عید منایا کرتے تھے اور شہر سے باہر صنوبر کے درخت کے پاس چلے جاتے اس کے لیے قربانی کرتے اور جانوروں کو آگ میں ڈال دیتے جب اس سے دھواں اٹھتا تو وہ درخت کے آگے سجدے میں گر پڑتے اور خوب گریہ کیا کرتے تھے۔

ہر مہینے ان کا یہی طریقہ کار تھا چنانچہ جب "اسفندار" کی باری آتی تو تمام بارہ شہروں کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور مسلسل بارہ دن تک وہاں عید منایا کرتے کیونکہ یہ ان کے بادشاہوں کا دار الحکومت تھا یہیں پر وہ مقدور بھر قربانی بھی کیا کرتے اور درخت کے آگے سجدہ بھی کیا کرتے۔

جب وہ کفر اور بت پرستی کی انتہا کو پہنچ گئے تو خداوند عالم نے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی

ان کی طرف بھیجا تاکہ وہ انھیں شرک سے روکے اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی دعوت دے
لیکن وہ اس نبی پر ایمان نہ لائے اب اس نبی نے فساد اور بت پرستی کی اصل جڑ یعنی اس درخت کے
قلع قمع کرنے کی خدا سے دعا کی اور بڑا درخت خشک ہو گیا جب ان لوگوں نے یہ صورت حال دیکھی
تو سخت پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ اس شخص نے ہمارے خداؤں پر جادو کر دیا ہے کچھ کہنے لگے
کہ ہمارے خدا اس شخص کی وجہ سے ہم پر ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ وہ ہمیں کفر کی دعوت دیتا ہے۔
اس بحث مباحثے کے بعد سب لوگوں نے اللہ کے اس نبی کو قتل کرنے کی ٹھان لی اور گہرا
کنواں کھودا جس میں اسے ڈال دیا اور کنوئیں کا منہ بند کر کے اس کے اوپر بیٹھ گئے اور اس کے نالہ و
فریاد کی آواز سنتے رہے یہاں تک کہ اس نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ خداوندِ عالم نے انھیں
ان برائیوں اور ظلم و ستم کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کر کے نیست و نابود کر دیا۔[1]
بہت سے قرائن اس حدیث کی تائید کرتے ہیں کیونکہ عاد و ثمود کے ذکر کے باوجود "اصحاب الرس" کا تذکرہ اس احتمال کی تردید
کرتا ہے کہ یہ عاد اور ثمود کی قوم کے بچے کھچے لوگ تھے اور یہ بات بعید بھی معلوم ہوتی ہے۔
اسی طرح یہ احتمال بھی بعید معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جزیرۃ العرب، شام اور ان علاقوں کے گرد و نواح میں رہتے تھے کیونکہ تاریخ عرب
میں قاعدۃً ان کا ذکر بھی ہونا چاہیے جبکہ ایسا بہت کم دکھائی دیتا ہے۔
اس سے قطعِ نظر مندرجہ بالا حدیث بعض دوسری تفسیروں سے کسی حد تک مطابقت بھی رکھتی ہے، مثلاً "رس" ایک کنوئیں کا نام
تھا (جس میں انھوں نے اللہ کے نبی کو ڈال دیا تھا) یا یہ کہ وہ زراعت پیشہ اور گلہ بان تھے وغیرہ۔
نیز امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں یہ جو ہے کہ "ان کی عورتیں بے راہ روی کا شکار تھیں اور ہم جنس بازی کیا کرتی تھیں"
یہ بھی مندرجہ بالا حدیث کے منافی نہیں ہے۔[2]
البتہ نہج البلاغہ (کے خطبہ نمبر ۱۸۰) کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس صرف ایک نبی نہیں آیا کیونکہ امام علی
علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

این اصحاب مدائن الرس الذین قتلوا النبیین و اطفأ واسنن المرسلین واحیوا
سنن الجبارین

کہاں ہیں رس کے شہروں والے! جنھوں نے انبیاء کو قتل کر ڈالا، خدا کے رسولوں کی سنت کو
مٹا کر جباروں کے رسم و رواج کو فروغ دیا۔
اس تعبیر سے بھی روایت بالا کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ ممکن ہے کہ روایت میں ان کی تاریخ کے صرف اس ایک حصے کی طرف

---

[1] "عیون اخبار الرضاؑ" (منقول و ملخص از تفسیر المیزان جلد ۱۵ ص ۲۲۷)۔
[2] کافی (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۹)۔

اشارہ ہو جس میں پیغمبر بھیجا گیا تھا۔
۲۔ کچھ لرزا دینے والے درس: آیات بالا میں جن چھ گروہوں کا نام لیا گیا ہے یہ ہیں:
فرعون کی قوم، نوحؑ کی متعصب قوم، عادؑ اور ثمودؑ کے زور آور لوگ، گناہوں سے آلودہ اصحاب الرس اور قوم لوطؑ۔
ان میں سے ہر ایک قوم کسی نہ کسی فکری یا اخلاقی بے راہ روی کا شکار تھی جس کی وجہ سے اسے بدبختی کا سامنا کرنا پڑا۔
فرعونی لوگ ظالم، ستمگر، سامراجی، استعماری اور خود غرض تھے۔
جیسا کہ ہم جانتے ہیں قوم نوح بھی سخت جھگڑالو، متکبر اور احساسِ برتری کا شکار تھی۔
قوم عاد و ثمود کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔
اصحاب الرس جنسی بے راہ روی کا شکار تھے خصوصاً ان کی عورتیں ہم جنس بازی کی مریض تھیں جبکہ قوم لوط لواطت ایسے فعلِ
شنیع کی مرتکب تھی ان میں ہر ایک قوم جادۂ توحید سے منحرف اور بے راہروی میں سرگرداں تھی۔
قرآن مجید حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے مشرکین بلکہ ہر عصر کے لوگوں کو خبردار کر رہا ہے کہ خواہ تم جس قدر
بھی طاقت کے مالک بن جاؤ اور کتنا ہی اقتدار تمھارے ہاتھ میں کیوں نہ ہو جس قدر بھی مال و دولت اور خوشحال زندگی کے حامل
کیوں نہ ہو جاؤ، تمھاری شرک، ظلم اور فساد و گناہ سے آلودگی آخر کار تمھاری زندگی کا خاتمہ کر کے رکھ دے گی تمھاری کامیابی کے
اسباب درحقیقت تمھاری موت کے اسباب بن جائیں گے۔
فرعون کے ماننے والے اور حضرت نوحؑ کی قوم کے لوگ پانی کے ذریعے ہلاک ہوئے جو تمام ذی حیات چیزوں کی زندگی
کا سرمایہ ہے، قوم عاد بھی طوفان اور آندھی کے ذریعے ہلاک ہوئی جو خاص صورتوں میں سرمایۂ زندگی ہے۔ قوم ثمود کی تباہی بجلی گرانے
والے بادل سے ہوئی اور قوم لوطؑ کی ہلاکت پتھروں سے ہوئی جو آسمان سے برسے یا بقول بعض مفسرین آتش فشاں پہاڑ
ان پر گرے اور قوم رس، اسی مندرجہ بالا روایت کے مطابق اس آگ کے ذریعے لقمہ اجل بنی جو زمین سے اٹھی اور آسمان سے
ایک شعلہ زمین پر گرا تاکہ یہ مغرور انسان سنبھل کر خدا، عدالت اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو جائے۔

۴۱۔ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ○

۴۲۔ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ○

۴۳۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ○

۴۴۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ○

ترجمہ

۴۱۔ جب بھی وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو (کوئی منطقی بات کرنے کے بجائے) مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں (اور کہتے ہیں) آیا یہی وہ شخص ہے جسے خدا نے رسُول بنا کر بھیجا ہے؟

۴۲۔ اگر ہم اپنے خداؤں کی پرستش پر قائم نہ رہیں تو اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کر ڈالے لیکن جب وہ عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ کون گمراہ تھا؟

۴۳۔ آیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟ تو کیا تو اسے ہدایت کر سکتا ہے یا اس کا دفاع کر سکتا ہے؟

۴۴۔ آیا تو سمجھتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ وہ تو صرف چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں۔

تفسیر

جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے اس سورت میں مشرکین کی باتوں کو ایک جگہ بیان نہیں کیا بلکہ پہلے کچھ حصہ بیان کیا

پھر اس کا جواب دیا اور وعظ و نصیحت کی پھر دوسرا حصہ بیان کیا اسی طرح یہ سلسلہ چل رہا ہے۔

زیرِ نظر آیات میں مشرکین کی منطق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے سلوک اور دعوتِ اسلام کے مقابلے میں ان کا ردِ عمل بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جب بھی وہ تجھے دیکھتے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ انجام دیتے ہیں کہ آپ کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ وہی شخص ہے جسے خدا نے پیغمبر کے طور پر مبعوث کیا ہے (واذا راوك ان يتخذونك الا هزوًا أهذا الذی بعث الله رسولا)۔[1]

کتنا بڑا دعویٰ کر رہا ہے؟ کیا عجیب باتیں کر رہا ہے؟ واقعاً مضحکہ خیز باتیں کر رہا ہے؟

یہ بات قطعاً فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی تو ہیں جو قبل از اعلانِ رسالت چالیس سال تک ان میں رہ چکے ہیں، اس دوران میں آپؐ کی امانت، صداقت اور عقل و شعور کے ڈنکے بجتے تھے لیکن جب کفر کے سرداروں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے تو انھوں نے آپؐ کی تمام خوبیاں بھلا دیں اور ٹھٹھا مذاق شروع کر دیا۔ آنحضرتؐ کی دعوتِ اسلامی کا شواہد اور دلائل کے باوجود ہنسی مذاق کے ذریعے انکار کرنے لگے یہاں تک کہ خود سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنون کی تہمت سے متہم کرنے لگ گئے۔

قرآن مجید مشرکین کی بات کو ان کی اپنی زبانی آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے: اگر ہم اپنے خداؤں کی پرستش پر ڈٹے نہ رہیں تو اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کر ڈالے اور ہمارا رابطہ ان سے منقطع کر دے (ان كاد ليضلنا عن الهتنا لولا ان صبرنا عليها)۔[2]

لیکن قرآن اس بات کا کئی طریقوں سے جواب دیتا ہے پہلے تو اس غیر منطقی ٹولے کو یوں سر توڑ جواب دیتا ہے: جب وہ عذابِ الٰہی کو دیکھیں گے تو انھیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ کون گمراہ تھا (وسوف يعلمون حين يرون العذاب من اضل سبيلا)۔

ہو سکتا ہے اس عذاب سے مراد قیامت کا عذاب ہو جیسا کہ طبرسی مرحوم کی مانند کئی مفسرین اسی بات کے قائل ہیں اور طبرسیؒ نے مجمع البیان میں یہی لکھا ہے یا دنیاوی عذاب ہو جیسا کہ بدر وغیرہ کے دن کی عبرتناک اور دردناک شکست جیسا کہ قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر میں بیان کیا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر دو کی طرف اشارہ ہو۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ گمراہ لوگ اپنی گفتگو میں متضاد باتیں کر رہے ہیں ایک طرف تو پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کی اسلامی دعوت کو حقیر سمجھ کر ان کا مذاق اڑا رہے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت

---

[1] "هزوًا" مصدر ہے اور یہاں مفعول کے معنیٰ میں آیا ہے نیز یہ احتمال بھی ہے کہ تقدیری طور پر مضاف کا مضاف الیہ ہو یعنی "موضع هزو" اور "هذا" کی تعبیر کفار کی طرف سے آنحضرتؐ کی حقارت اور توہین کی طرف اشارہ ہے۔

[2] "ان کاد لیضلنا" میں "ان" مخففہ اور تاکید کے لیے ہے اور تقدیر میں "انه کاد" تھا اور اس کی ضمیر شان ہے۔

اور مشن کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے دوسری طرف وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر اپنے باپ دادا کے طریقے پر مضبوطی سے کاربند نہ رہیں
تو ممکن ہے کہ رسول اللہؐ کی باتیں انھیں اس راہ سے بھٹکا دیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کی باتوں کو اہمیت دیتے تھے
اور آپؐ کے کام کو نہایت ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہم اقدام تصور کرتے تھے اور اس طرح کی پریشان خیالی اور تضاد گوئی
اس سرپھرے اور ہٹ دھرم گروہ سے بعید بھی نہیں ہے۔

پھر عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ حق کے دشمنوں کو جب خدائی رہبروں کی منطق کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ہنسی مذاق میں اس کو
ٹال جاتے ہیں جو ان کی ایک قسم کی حکمت عملی ہوتی ہے تاکہ وہ اس طرح سے اسے حقیر اور ناقابلِ توجہ ظاہر کریں جبکہ درپردہ اس سے
خائف ہوتے ہیں یا پھر اسے حقیقی خطرہ سمجھ کر کھلم کھلا اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔
ان کی گفتگو کا دوسرا جواب بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے
ایک تو ان کی دلجوئی کی گئی ہے اور دوسرے مشرکین کی دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
آیا تو نے اسے دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اپنا معبود بنا لیا ہے (ارأیت من اتخذ الٰهه هواه)۔
تو کیا ایسی حالت میں تو اسے ہدایت کر سکتا ہے یا اس کا دفاع کر سکتا ہے (افانت تکون علیه وکیلا)۔
یعنی اگر انھوں نے آپؐ کی دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں استہزا، انکار اور ہنسی مذاق کی پالیسی اپنا رکھی ہے تو اس لیے
نہیں کہ آپؐ کی منطق کمزور اور دلائل قانع کنندہ نہیں یا آپؐ کے دین و آئین میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے بلکہ اس وجہ سے ہے
کہ وہ عقلی اور منطقی بات کی پیروی نہیں کرتے ان کا معبود ان کی نفسانی خواہشات ہوتی ہیں تو کیا ایسے لوگوں سے اس بات کی
امید کی جا سکتی ہے کہ وہ آپؐ کی دعوت کو قبول کریں یا آپؐ ان پر کوئی اثر و رسوخ استعمال کر سکیں۔
"ارأیت من اتخذ الٰهه هواه" کے بارے میں بعض بزرگ مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔
کچھ مفسرین تو یہ کہتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ان کا ایک بت ہے جسے خواہشاتِ نفسانی کہا جاتا ہے اور ان کے
تمام کام اسی کے حکم سے انجام پاتے ہیں۔
جبکہ کچھ مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کافر لوگ پرستش کے لیے بت کے انتخاب تک میں بھی عقل و خرد سے
کام نہیں لیتے اور کسی منطقی دلیل کو مدنظر نہیں رکھتے بلکہ جب بھی ان کی نگاہ کسی پتھر یا اچھے سے درخت پر جا پڑتی ہے یا کسی ایسی
چیز کو دیکھ لیتے جو دل لبھانے والی ہوتی ہے تو اسے اپنا معبود بنا لیتے ہیں ان کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے ہیں، قربانیاں
پیش کرتے ہیں اور ان سے اپنی مشکل کشائی کی درخواست کرتے ہیں۔
اتفاق سے اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین نے ایک روایت بیان کی ہے جو ہمارے اس مدعا کی
تائید کرتی ہے روایت یہ ہے:
ایک مرتبہ قریشِ مکہ پر سخت قحط سالی کا دور آیا اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے کچھ لوگ ایسے تھے جو کسی خوبصورت پتھر یا کسی
اچھے سے درخت کو دیکھ لیتے اس کی پوجا پاٹ شروع کر دیتے اگر وہ پتھر ہوتا تو اسے "سعادت کی چٹان" کا نام دیتے اس کے
لیے قربانی کرکے، قربانی کے خون سے اسے رنگین کر دیتے حتیٰ کہ اپنے جانوروں کی بیماری کے لیے دوا بھی اسی سے طلب کرتے۔

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ ایک عربی اپنے اونٹ اس پتھر کے ساتھ مس کرنے اور برکت حاصل کرنے کی غرض سے لے آیا
لیکن اونٹ بھاگ کر جنگل کو چلے گئے اور اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اس نے کچھ اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا:

میں "سعادت کی چٹان" کے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ وہ ہمارے اندر موجود انتشار کو دور کرے
لیکن اس نے تو ہمارے اجتماع میں انتشار ڈال دیا ہے۔ سعادت کا یہ پتھر کیا ہے؟ زمین کی
طرح کا پتھر کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے جو نہ تو انسان کو گمراہی کی طرف لے جا سکتا ہے اور نہ ہی
ہدایت کی جانب۔

ایک اور عرب نے دیکھا کہ اس پتھر پر لومڑی پیشاب کر رہی ہے تو اس نے یہ شعر پڑھا:

أرب يبول الثعلبان برأسه ✽ لقد ذل من بالت عليه الثعالب

آیا وہ چیز بھی معبود ہو سکتی ہے جس پر لومڑی پیشاب کرے؟ یقیناً وہ چیز ذلیل ہے جس پر
لومڑیاں پیشاب کریں [1]

اوپر والی دونوں تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ بت پرستی پیداوار ہی خرافات کی ہے جو خواہشاتِ نفسانی کی ایک
قسم ہے کسی دلیل و منطق کے بغیر مختلف بتوں کا انتخاب بھی خواہشات کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔
"ہوا و ہوس" کے سلسلے میں نکات کی بحث میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ انشاء اللہ۔
آخر میں قرآن مجید اس گمراہ گروہ کے اعتراض کا تیسرا جواب یوں دے رہا ہے:
آیا تو سمجھتا ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے یا سمجھتے ہیں (ام تحسب ان اکثرهم یسمعون او یعقلون)
وہ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں (ان هم الا کالانعام بل هم اضل سبیلا)۔
یعنی اے پیغمبرؐ! آپؐ ان کے ٹھٹھا، غیر منطقی اور ناگوار باتوں سے ہرگز پریشان نہ ہوں کیونکہ یا تو انسان کے پاس اپنی عقل
ہونی چاہیے جس سے وہ سوچ سکے اور "یعقلون" کا مصداق بنے اگر اس کے پاس اپنی عقل نہیں تو دانشوروں اور صاحبانِ عقل
کی باتوں کو سنے اور "یسمعون" کا مصداق قرار پائے۔ لیکن یہ لوگ نہ تو پہلے زمرے میں آتے ہیں اور نہ ہی دوسرے میں اس
ان میں اور چوپایوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور چوپایوں سے سوائے چیخنے چلانے، لاتیں مارنے اور غیر معقول کام کے اور تو
ہی کیا کی جا سکتی ہے؟
بلکہ یہ ان جانوروں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ جانوروں سے عقل و اندیشہ کی تو توقع نہیں رکھی جا سکتی جبکہ ان میں عقل بھی ہے
شعور بھی لیکن وہ اس سے کام نہیں لیتے لہٰذا انھیں یہ دن دیکھنا پڑے۔
پھر قابلِ غور یہ بات بھی ہے کہ قرآن نے یہاں پر "اکثرهم" کا لفظ استعمال کیا ہے اور حکم کو عمومیت نہیں دی
کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ فریب خوردہ لوگ بھی ہوں جب حق ان کے سامنے آ جائے تو ان کی آنکھوں کے آگے سے غفلت

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۰)۔

غلط فہمی کے پردے ہٹ جائیں اور وہ حق کو قبول کرلیں اور یہ بات قرآن کی بحثوں میں اصول عدل مدنظر رکھنے پر ایک واضح دلیل ہے۔

چند نکات

۱۔ ہوس پرستی اور اس کا دردناک انجام: اس میں شک نہیں کہ انسان کے اندر مختلف قسم کی خواہشات اور طرح طرح کی جبلتیں موجود ہیں جو سب کی سب اس کی زندگی کے لیے ضروری ہیں غیظ وغضب، اپنے آپ سے محبت، مال اور مادی زندگی سے پیار وغیرہ۔ اس میں بھی شک نہیں خلاقِ عالم نے ان سب چیزوں کو انسانی کمال کے لیے ودیعت فرمایا ہے۔

جو چیز زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ چیزیں حد سے تجاوز کر جاتی ہیں اور عقل کے لیے ایک مطیع خدمتگار کی بجائے اسے قید وبند میں ڈال کر بغاوت اور سرکشی پر اتر آتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے سارے وجود پر حاکم ہو کر زمام اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہیں۔

اسی صورتِ حال کو ہوس پرستی کہتے ہیں جو بُت پرستی کی تمام اقسام سے زیادہ خطرناک ہے بلکہ بُت پرستی بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "ہوا وہوس کے بُت" کو سب سے بڑا اور سب سے بُرا بُت شمار کیا ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

ما تحت ظل السماء من الٰـه يعبد من دون الله اعظم عند الله من هوى متبع

آسمان کے نیچے کوئی بُت اللہ کے نزدیک ہوا وہوس کے بُت سے بڑا نہیں ہے جس کی پرستش کی جاتی ہو[1]

ایک اور حدیث میں کسی پیشوائے اسلام کا ارشادِ گرامی ہے:

ابغض اله عبد على وجه الارض الهوٰى

سب سے بڑھ کر قابلِ نفرت بُت جس کی روئے زمین پر پرستش کی جاتی ہے خواہشات کا بت ہے۔

اگر اس بارے میں مزید غور وفکر سے کام لیں تو اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو جائیں گے کیونکہ ہوس پرستی غفلت اور بے خبری کا پیش خیمہ اور سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے:

ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه

اس شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے تابع ہے۔ (کہف — ۲۸)

ہوس پرستی کفر اور بے ایمانی کا سرچشمہ بھی ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۵ ص ۲۵۷ بحوالہ تفسیر درمنثور، اسی آیت کے ذیل میں۔

"فلا يصدنك عنها من لا يؤمن بها واتبع هواه

تمھیں قیامت پر ایمان لانے سے وہ شخص نہ روکے جو خود اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی ہوا وہوس کا پیروکار ہے۔ (طٰہٰ — ۱۶)

تیسری بات یہ ہے کہ ہوا وہوس پرستی بدترین گمراہی بھی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ومن اضل ممن اتبع هواه بغير هدى من الله

اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا ہے اور خدا کا ہدایت یافتہ نہیں ہے۔ (قصص — ۵۰)

چوتھی بات یہ ہے کہ ہوس پرستی، حق طلبی کے مقابلے میں ہے اور انسان کو راہِ راست سے ہٹا دیتی ہے جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ ص آیت ۲۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوٰى فيضلك عن سبيل الله

لوگوں کے درمیان حق اور انصاف کا فیصلہ کرو اور خواہشات کی پیروی مت کرو کیونکہ یہ تمھیں راہِ خدا سے ہٹا دے گی۔

پانچویں بات یہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی اتباع عدل وانصاف سے روک دیتی ہے، قرآن فرماتا ہے:

فلا تتبعوا الهوٰى ان تعدلوا

خواہشاتِ نفسانی کی اتباع تمھیں عدل وانصاف سے نہ روک دے۔ (نساء — ۱۳۵)

چھٹی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر زمین وآسمان کا نظام انسانوں کی خواہشات کے محور پر گردش کرنے لگ جائے تو ساری کائنات فساد کی لپیٹ میں آجائے، ارشاد ہوتا ہے:

ولو اتبع الحق اهواءهم لفسدت السماوات والارض ومن فيهن

اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے لگ جائے تو آسمان وزمین اور ان میں رہنے والے سب کے سب فاسد ہو جائیں — (مؤمنون — ۷۱)

اسلامی روایات میں بھی اس سلسلے میں ہلا دینے والی تعبیرات ملتی ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الشقى من انخدع لهواه وغروره

بدبخت ہے وہ انسان جو خواہشات اور غرور سے دھوکا کھا جائے[1]

ایک اور روایت میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ:

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۸۶۔

الھویٰ عدو العقل

خواہشاتِ نفسانی عقل کی دشمن ہوتی ہیں۔[1]

آپؑ ہی فرماتے ہیں :۔

الھویٰ اس المحن

ہوا و ہوس تمام رنج و غم کی بنیاد ہیں[2]

حضرت امیر علیہ السلام ہی فرماتے ہیں :۔

لا دین مع ھویٰ [3]

اور

ولا عقل مع ھویٰ [4]

کبھی بھی دین اور خواہشاتِ نفسانی، اور عقل اور خواہشاتِ نفسانی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جہاں خواہشاتِ نفسانی اور ہوا و ہوس ہیں وہاں پر دین ہے نہ عقل، وہاں پر بدبختی، رنج و غم اور بلائیں ہیں اور بس، وہاں پر یا بے چارگی ہے یا شقاوت اور فساد۔

ہماری اپنی اور دوسروں کی زندگی اور زندگی کے دوران جو تلخ تجربے حاصل ہوئے ہیں وہ ہوا و ہوس پرستی اور خواہشاتِ نفسانی کے بارے میں وارد ہونے والی آیات و روایات کے تمام نکات کا زندہ ثبوت ہیں۔

ہم ایسے افراد کو بھی جانتے ہیں جنھوں نے ایک گھڑی کے لیے ہوائے نفس کی اتباع کی اور ساری عمر اس کا خمیازہ بھگتے رہے۔ ایسے نوجوانوں کو بھی دیکھا ہے جو ہوائے نفس کی پیروی میں ایسی خطرناک عادتوں اور جنسی اور اخلاقی بے راہروی کا شکار ہو گئے جن کی وجہ سے اب وہ معاشرے اور خاندان والوں کے لیے وبالِ جان بن گئے ہیں اور اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے ہیں۔ اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں گنوا چکے ہیں۔

معاصر اور گزشتہ زمانے کی تاریخ میں ہمیں ایسے لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے نام کو ہمیشہ کے لیے داخلِ دشنام کر دیا۔

یہ ایک اٹل اصول ہے اس میں استثناء کی کوئی گنجائش نہیں حتیٰ کہ عابد اور زاہد لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ جیسا کہ "بلعم باعورا" جیسے لوگوں نے جب اپنی خواہشات کی اتباع کی تو عظمتِ انسانی کی بلندیوں سے یوں گرے کہ قرآن نے انھیں ہمیشہ

---

[1] غرر الحکم جملہ ۲۶۵۔

[2] غرر الحکم جملہ ۱۰۴۸۔

[3] غرر الحکم جلد ۱۰۵۲۱۔

[4] غرر الحکم جلد ۱۰۵۴۱۔

بھونکنے والے نجس کُتّے کے ساتھ تشبیہ دی (ملاحظہ ہو اعراف ۱۷۶)۔

بنا بریں باعثِ تعجب نہیں ہوگا کہ جب پیغمبر اکرمؐ اور حضرت علیؑ ایسی بات فرمائیں کہ :

ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان اتباع الھوٰی وطول الامل۔ اما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق واما طول الامل فینسی الاٰخرۃ [1]

تمھاری سعادت کی راہ میں جو سب سے زیادہ خطرناک لغزش کا مقام ہے، وہ ہوائے نفس کی اتباع اور لمبی لمبی آرزوئیں ہیں کیونکہ ہوائے نفس کی تکمیل تمھیں حق سے روک دے گی اور لمبی آرزوئیں تمھیں آخرت سے بے خبر کر دیں گی۔

ہوائے نفس کے مدِ مقابل یعنی ترکِ خواہشات کے بارے میں قرآن و حدیث میں جو تعبیرات وارد ہوئی ہیں اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلے کی گہرائی اور گیرائی کو بخوبی واضح کرتی ہیں یہاں تک کہ خوفِ خدا اور نفس کی مخالفت کو جنت کی کنجی قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوٰی فان الجنۃ ھی المأوٰی

جو شخص اپنے پروردگار کی عظمت سے ڈرے اور اپنے آپ کو خواہشاتِ نفسانی سے روکے یقیناً بہشت اس کا ٹھکانا ہے۔ (نازعات ــــ ۴۰، ۴۱)

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :۔

اشجع الناس من غلب ھواہ

شجاع ترین آدمی وہ ہے جو اپنی خواہشات پر غالب آجائے۔[2]

اللہ کے نیک بندوں، خدا کے دوستوں، علماء اور بزرگانِ دین کے بارے میں ایسے ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس قدر عظیم اور بلند مرتبہ صرف خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت کی وجہ سے حاصل ہوا ہے جس کا حصول عام طریقوں سے ناممکن ہے۔

۲۔ جانوروں سے بڑھ کر گمراہ کیوں؟ مندرجہ بالا آیات میں مطلب کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

جن لوگوں کا معبود خواہشِ نفسانی ہیں وہ چوپایوں کی مانند ہیں۔

پھر اس سے بھی بڑھ کر فرمایا گیا ہے :

بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۲۸، (مادہ ہویٰ کے ذیل میں) اور نہج البلاغہ خطبہ ۲۸، ۴۲۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۶۸۹ (مادہ شجع)۔

اس جیسی ایک تعبیر سورۂ اعراف کی آیت ۲۷۹ میں بھی آئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اہل جہنم آنکھ، کان اور عقل و خرد سے کام نہ لینے کی وجہ سے، اس طرح کے انجام سے دوچار ہوں گے:

اولئك كالانعام بل هم اضل

وہ لوگ چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر گمراہ ہیں۔

اگرچہ اجمالی طور پر ان کا چوپایوں سے بھی بڑھ کر گمراہ ہونا واضح ہے لیکن اس بارے میں مفسرین نے دلچسپ وضاحت کی ہے جسے تجزیہ و تحلیل اور کچھ اضافوں کے ساتھ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) اگر چوپائے کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے، گوش شنوا اور چشم بینا نہیں رکھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں یہ استعداد نہیں ہے لیکن کتنا بدبخت ہے انسان کہ جس میں تمام سعادتوں کی صلاحیت مخفی ہے اور خدا نے اسے اس قدر استعداد بخشی ہے کہ وہ زمین میں خدا کا نمائندہ اور خلیفۃ اللہ بن سکتا ہے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ خود کو اس قدر پست کر دیتا ہے کہ اپنے آپ ایک جانور کی حد تک گرا دیتا ہے اپنی تمام لیاقتوں کو ضائع کر دیتا ہے خود کو مسجود الملائکہ ہونے کی سربلندی سے گرا کر شیاطین کے ذلت آمیز گڑھوں میں ڈال دیتا ہے۔ کتنے درد کی بات ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا گمراہی ہو سکتی ہے۔

(۲) جانوروں سے تقریباً حساب و کتاب نہیں لیا جائے گا نہ ہی وہ کسی سزا اور جزا کے مستحق ہوں گے لیکن انسانوں کا حساب و کتاب بھی ہو گا اور گمراہ لوگوں کو اپنے گناہوں کا بوجھ خود اپنے شانوں پر اٹھانا ہو گا اور بغیر کسی کمی بیشی کے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہو گی۔

(۳) چوپائے، انسان کی بہت خدمت کرتے ہیں اور مختلف کام انجام دیتے ہیں لیکن سرکش اور باغی انسان نہ صرف کوئی کام نہیں کرتے بلکہ طرح طرح کے مصائب و آلام اور خطرات بھی پیدا کرتے رہتے ہیں۔

(۴) چوپایے کسی کے لیے خطرہ نہیں بنتے اگر بنیں بھی تو ان کا خطرہ محدود ہوتا ہے لیکن افسوس ہے بے ایمان متکبر اور ہوس پرست انسان پر جو کبھی جنگ کی ایسی آگ بھڑکا دیتا ہے کہ جس میں ہزاروں، لاکھوں انسان جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔

(۵) اگرچہ جانوروں کا کوئی آئین اور قانون نہیں ہے لیکن فطرت نے جبلت کی صورت میں ان کے لیے جو راستہ مقرر کر دیا ہے وہ اس پر گامزن ہیں، لیکن سرکش اور متکبر انسان نہ تو تکوینی قوانین کو کوئی اہمیت دیتا ہے اور نہ ہی تشریعی کو، بلکہ اپنی خواہشات کو سب چیزوں پر حاکم سمجھتا ہے۔

(۶) چوپایوں نے کبھی اپنے کاموں کی توجیہ پیش نہیں کی اگر خلاف قانون کرتے ہیں تو بھی اور اگر قانون کے مطابق کرتے ہیں تو بھی وہ اپنی مستی میں مست اور مگن چلے جا رہے ہیں لیکن خود پرست ہوائے نفسانی کا پیروکار اور خونخوار انسان اپنے جرائم کی یوں توجیہ کرتا ہے گویا اس نے خدائی فریضے کی تکمیل اور شرعی ذمہ داری پر عمل درآمد کیا ہے۔

اس لحاظ سے دنیا کی کوئی چیز ہوا و ہوس کے پیروکار، بے ایمان اور سرکش انسان سے بڑھ کر خطرناک اور نقصان دہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ایسے انسان کو سورۂ انفال کی آیت ۲۲ میں "شر الدواب" (ہر چلنے والی چیز سے بدتر) کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ کیا ہی عمدہ تعبیر ہے۔

۴۵۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ
جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ○
۴۶۔ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا○
۴۷۔ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ
نُشُوْرًا○
۴۸۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ○
۴۹۔ لِّنُحْـِۧيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا
وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا○
۵۰۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ
اِلَّا كُفُوْرًا○

ترجمہ

۴۵۔ آیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے کس طرح سایے کو پھیلایا ہے؟ اگر چاہتا تو اسے ساکن بنا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا ہے۔

۴۶۔ پھر ہم اسے آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں۔

۴۷۔ اور خدا تو وہ ہے جس نے رات کو تمہارے لئے لباس بنایا ہے نیند کو راحت اور دن کو تمہاری حرکت اور زندگی کا سبب

۴۸۔ اور وہ وہی ہے جس نے ہواؤں کو رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی نازل کیا۔

۴۹۔ تاکہ ہم اس کے ذریعے سے مُردہ زمینوں کو زندہ کریں اور اسے اپنی مخلوق جس میں بہت سے چوپائے او

اور انسان شامل ہیں کے اختیار میں دے دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے سیراب ہوں۔

۵۰۔ ہم نے ان آیات کو طرح طرح سے ان کے درمیان بیان کیا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں لیکن اکثر لوگوں نے انکار اور کفر کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں کیا۔

تفسیر

سائے کی حرکت

ان آیات میں نعمتِ الٰہی کے بہت سے اہم حصّوں کو توحید اور خداشناسی کے اسرار کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے جن میں غور و فکر ہمیں اپنے خالق سے بیشتر آشنا اور نزدیک سے نزدیک تر کر دیتا ہے۔ گزشتہ آیات میں زیادہ تر گفتگو مشرکین کے بارے میں رہی ہے لہٰذا ان آیات کا گزشتہ آیات سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

ان آیات میں سایے کی نعمت، پھر رات کے اثرات اور برکات، نیند اور آرام، دن کی روشنی، ہواؤں کے چلنے، بارش کے نازل ہونے، مردہ زمینوں کے زندہ ہونے اور جانوروں اور انسانوں کے سیراب ہونے کی سی نعمتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: آیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے سائے کو کیونکر پھیلایا ہے (الم تر الی ربك کیف مد الظل)۔

اگر چاہتا تو اسے روکے رکھتا (ہمیشہ سایہ ہی سایہ ہوتا) (و لو شاء لجعله ساکنًا)۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا یہ حصّہ متحرک اور پھیلنے والے سایے جیسی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ سایہ ہمیشہ ایک حالت پر باقی نہیں رہتا بلکہ متحرک رہتا ہے اور نقل مکانی کرتا رہتا ہے اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے مراد کون سا سایہ ہے؟ مفسّرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔

بعض مفسّرین کہتے ہیں کہ پھیلنے والے اس سایے سے مراد وہ سایہ ہے جو صبح صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیانی وقت میں ہوتا ہے کیونکہ سب سے زیادہ سرور اس سایے میں ہوتا ہے اور سب سے زیادہ کیف کی وہی گھڑی ہوتی ہے۔ پھیکے رنگ کا سایہ ڈالنے والا یہ نور صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور طلوعِ آفتاب تک چلا جاتا ہے پھر اس کے بعد دن کی روشنی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

بعض مفسّرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد تمام رات کا سایہ ہے جو غروبِ آفتاب سے شروع ہو کر طلوعِ آفتاب پر جا ختم ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ رات درحقیقت زمین کے نصف کرّے کا سایہ ہوتی ہے جو آفتاب کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ سایہ مخروطی شکل کا ہوتا ہے جو فضا کو ڈھانپے رہتا ہے اور ہمیشہ چلتا پھرتا رہتا ہے جو طلوعِ آفتاب کے ساتھ اگر ایک علاقہ میں ختم ہوتا ہے تو دوسرے علاقہ میں جا ظاہر ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں اس سے مراد وہ سایہ ہے جو زوالِ آفتاب کے بعد اشیاء کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے۔

البتہ اگر بعد والے جملے نہ ہوتے تو ہم اس کا وسیع مفہوم سمجھتے جو تمام معانی کا جامع ہوتا لیکن جو قرائن اس کے بعد ذکر ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے:

پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا ہے (ثم جعلنا الشمس علیه دلیلًا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر سورج نہ ہوتا، سائے کا مفہوم کبھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اصولی طور پر سایہ، آفتاب کی پرچھائیں کا نام ہے کیونکہ عموماً پھیکی اور کم رنگ تاریکی کو "سایہ" کہتے ہیں جو اجسام سے پیدا ہوتا ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب روشنی ایسے اجسام پر پڑے جن سے عبور نہ کر سکتی ہو تو روشنی کی مقابل طرف کو سایہ کہتے ہیں بنابریں نہ صرف "تعرف الاشیاء باضدادها" (ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے) کے قاعدہ کے تحت سایے کو نور سے جدا کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا وجود بھی درحقیقت نور کا مرہونِ منت ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے: پھر ہم اسے آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں (ثم قبضناه الینا قبضًا یسیرًا)۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو سایہ بھی آہستہ آہستہ سمٹنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دوپہر کے وقت بعض مقامات پر بالکل معدوم ہی ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت سورج ٹھیک ہر چیز کے سر پر ہوتا ہے اور دوسرے مقامات پر اپنی کم سے کم مقدار کو جا پہنچتا ہے اس طرح سے سایہ نہ تو ایک ہی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے اور نہ ایک ہی دفعہ سمیٹ لیا جاتا ہے یہ کام بجائے خود پروردگارِ عالم کی ایک حکمت ہے کیونکہ اگر یکدم سائے سے روشنی پیدا ہوتی یا روشنی سے سایہ پیدا ہوتا تو موجوداتِ عالم کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ لیکن حالتِ انتقالی کا یہ تدریجی نظام اس قدر حکمت پر مبنی ہے کہ کسی چیز کو ضرر پہنچائے بغیر زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے۔

"یسیرًا" کی تعبیر سایے کے آہستہ آہستہ سمٹنے کی طرف اشارہ ہے یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نور اور ظلمت کا خصوصی نظام خداوندِ عالم کی قدرت کے لیے ایک سادہ اور آسان سی بات ہے "الینا" بھی اسی قدرتِ خداوندی کی تاکید ہے۔ بات خواہ جو بھی ہو یہ یقینی ہے کہ جس طرح انسان اپنی زندگی کے لیے "نور" کا محتاج ہے اسی طرح توازن کو برقرار رکھنے اور شدتِ نور کی مُدّت کے دوران اسے سایے کی بھی ضرورت ہے۔

نور کی یکساں تابندگی بھی زندگی کو اسی طرح درہم برہم کر دیتی ہے جس طرح سائے کی ہمیشگی موت کا پیغام بن جاتی ہے کیونکہ پہلی صورت میں تمام موجودات جل کر بھسم ہو جائیں جبکہ دوسری صورت میں کائنات کی ہر چیز منجمد ہو کر رہ جائے۔ "نور" اور "سایہ" کی باری باری آمد و رفت نے انسان کے لیے زندگی کو آسان اور خوشگوار بنایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کی دوسری آیات میں رات اور دن کو جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں خدا کی عظیم نعمت میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ قصص آیہ ۷۱ میں فرمایا گیا ہے:

قل ارأیتم ان جعل الله علیکم اللیل سرمدًا الی یوم القیامة من الله

غیر الله یأتیکم بضیاء افلا تسمعون

اے پیغمبرؐ! کہہ دیجیے کہ اگر خداوندِ عالم رات کو قیامت تک تمھارے لیے باقی رکھنا چاہتا تو سوائے خداوندِ عالم کے کوئی اور معبود ہے جو تمھارے لیے نور کی شعاع لے آتا؟ کیا سن نہیں رہے ہو؟

اور اس کے ساتھ ہی فوراً کہتا ہے:

قل ارأیتم ان جعل الله علیکم النهار سرمداً الی یوم القیامة من اله غیر الله یأتیکم بلیل تسکنون فیه افلا تبصرون

کہہ دیجیے! کہ اگر خداوندِ عالم دن کو تمھارے لیے قیامت تک باقی رکھنا چاہتا تو سوائے خداوندِ متعال کے کوئی معبود ہے جو تمھارے لیے رات لے آتا جس میں تم آرام کر سکتے؟ کیا دیکھ نہیں رہے ہو؟ (قصص ——— ۷۲)

اس کے ساتھ ہی آیت ۲، میں نتیجے کے طور پر فرمایا گیا ہے:

ومن رحمته جعل لکم اللیل والنهار لتسکنوا فیه ولتبتغوا من فضله ولعلکم تشکرون

یہ خدا کی رحمت ہی تو ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے ہیں جن میں تم آرام بھی کر سکو اور حصولِ معاش کے لیے اس سے استفادہ بھی کر سکو شاید کہ اس کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم نے "ظل ممدود" (پھیلے ہوئے سایے) کو بہشت کی نعمتوں میں شمار کیا ہے کیونکہ نہ تو اس قدر روشنی ہوتی ہے جس سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور تھک جائیں اور نہ ہی تاریکی ہوتی ہے جس سے کسی کو وحشت محسوس ہو۔

سائے جیسی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد قرآن دو اور نعمتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتا ہے جو اس کے ساتھ مکمل طور پر مناسبت رکھتی ہیں ان دو نعمتوں کے ذکر کے ساتھ نظامِ ہستی کے کچھ اور اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے جو وجودِ خدا پر دلالت کر رہی ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اور خدا تو وہ ہے جس نے رات کو تمھارے لیے لباس بنایا ہے (وهو الذی جعل لکم اللیل لباساً)۔ "رات کو لباس بنایا ہے"...... کیسی دلچسپ تعبیر ہے یہ تاریک پردہ صرف انسانوں ہی کو نہیں بلکہ روئے زمین پر موجود تمام چیزوں کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے اور انھیں لباس کی مانند محفوظ کر لیتا ہے جیسا کہ انسان سوتے وقت تاریکی اور آرام و استراحت کے لیے پردے سے کام لیتا ہے اسی طرح یہ تمام چیزوں کے لیے تاریکی اور پردے کا کام دیتی ہے۔

پھر نیند جیسی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس نے نیند کو تمھارے لیے آرام کا ذریعہ بنایا ہے (والنوم سباتاً)۔

"سباتا" "سبت" (بروزن "وقت") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے "کاٹ دینا"، پھر آرام کی غرض سے کام کاج کو روک دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور ہفتہ کے دن کو عربی میں "یوم السبت" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ

اس نام کا انتخاب یہودیوں کے طرزِ عمل سے کیا گیا ہے کیونکہ ہفتے کا دن ان کی چھٹی اور آرام کا دن ہوتا ہے۔

درحقیقت یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب نیند آجاتی ہے تو تمام جسمانی سرگرمیاں معطل ہو جاتی ہیں کیونکہ اس بدن کے ایک اہم حصے کی سرگرمیاں بالکل رُک جاتی ہیں اور دوسرے حصے کی سرگرمیاں کم ہو جاتی ہیں تاکہ تھکاوٹ دور ہو جائے اعضاء کو از سرِ نو تازگی مل جائے اس دوران میں دل کے دھڑکنے اور سانس لینے کا عمل جاری رہتا ہے۔

بروقت اور مناسب مقدار کی نیند سے بدن کی طاقتیں بحال ہو جاتی ہیں جسم کو تازگی مل جاتی ہے صرف شدہ قوت لوٹ آتی ہے نیند اعصاب کے سکون کا بہترین ذریعہ ہے اس کے برعکس نیند کا نہ آنا خاص طور پر ایک لمبے عرصے کی بے خوابی بہت ہی نقصان دہ اور موت کا سبب بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو تشدّد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور سختی کی جاتی ہے تو جو اہم ترین حربے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہی بے خوابی ہے جس سے انسان کی قوتِ مدافعت ختم کر دی جاتی ہے۔

آیت کے آخر میں "دن" جیسی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور خداوندِ عالم نے دن کو تحرّک زندگی کا سبب بنایا ہے (وجعل النهار نشوراً)۔

"نشور" "نشر" کے مادہ سے ہے اور کھولنے کے معنی میں ہے جو "لپیٹنے" کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ یہ تعبیر ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ بیداری کے وقت روح، تمام بدن میں پھیل جاتی ہے جو تقریباً مرنے کے بعد اٹھنے کے مشابہ ہے یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں کے پھیل جانے کی طرف اشارہ ہو جب وہ اجتماعی اور انفرادی صورت میں پھیل جاتے ہیں اور زندگی کے مختلف کاموں کے لیے روئے زمین پر ادھر اُدھر چلنے لگ جاتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز صبح کے وقت یہ جملہ ادا فرمایا کرتے تھے:۔

الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا والیه النشور

حمد اس خدا کے لیے مخصوص ہے جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا اور نئی زندگی بخشی اور انجام کار ہم نے اسی کی طرف محشور ہونا ہے[1]

سچی بات تو یہ ہے کہ انسانی جسم اور روح کے لیے دن کی روشنی تحریک بخش ہے جبکہ تاریکی نیند لاتی ہے اور آرام عطا کرتی ہے۔

اس دنیا کی بھی یہی حالت ہے کہ جب سورج کی پہلی کرن زمین پر پڑتی ہے تو زندہ اور جاندار چیزوں میں عجیب تحرک پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں ایک نئی زندگی مل جاتی ہے ہر چیز اپنے کام کاج میں مشغول ہو جاتی ہے یہاں تک کہ نباتات بھی سورج کی روشنی میں جلدی جلدی سانس لینا، غذا حاصل کرنا اور نشو و نما پانا شروع کر دیتے ہیں جبکہ غروبِ آفتاب کے ساتھ گویا سکوت کا ناقوس بج جاتا ہے جس سے پرندے تک اپنے گھونسلوں میں جا چھپتے ہیں اور ہر جاندار چیز آرام اور نیند کا رُخ کرتی

---

[1] تفسیر قرطبی جلد، ص ۴۴۵۵۔

بناتات بھی ایک طرح کی نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

عظیم نعمتوں کے ذکر کے بعد جو تمام انسانوں کی سب سے بنیادی اور اہم ضرورت ہیں ایک اور اہم نعمت کو بیان فرماتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خدا تو وہ ہے جس نے ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا نازل پانی کیا (وھو الذی ارسل الریح بشرًا بین یدی رحمته وانزلنا من السماء ماءً طھورًا)۔

رحمتِ الٰہی کے نزول سے پہلے ہواؤں کے "مقدمۃ المطر" کی حیثیت سے ہر شخص آگاہ ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوں تو کسی خشک سرزمین پر بارش کا ایک بھی قطرہ نہ برسے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورج کی گرمی سمندروں کے پانی کو بخارات میں تبدیل کرکے اوپر کو بھیجتی ہے اور یہی بخارات سرد فضا میں جا کر اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور بارش برسانے والے بادلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اگر یہ ہوائیں ان بھرے ہوئے بادلوں کو سمندروں سے خشک زمینوں کی طرف ہانک کر نہ لے جائیں تو وہی بادل سمندروں پر ہی برسنا شروع کر دیں۔

گویا رحمت کی خوشخبری دینے والی ہواؤں کا وجود جو ہمیشہ زمین کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف چلتی رہتی ہیں زمین کی تشنگی دور کرنے کا سبب بن جاتا ہے کیونکہ انہی سے حیات بخش بارشوں کا نزول ہوتا ہے جس سے دریا اور چشمے وجود میں آتے ہیں، کنوئیں پانی سے بھر جاتے ہیں اور مختلف نباتات کی نشوونما ہوتی ہے۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ان ہواؤں کا ایک حصہ بادلوں کے آگے آگے چلتا رہتا ہے جن میں ملائم سی نمی کی آمیزش ہوتی ہے اسی حصے سے نسیم روح افزاء وجود میں آتی ہے، جس کے اندر سے بارش کی سوندھی سوندھی خوشبو مشام تک پہنچتی ہے۔ اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کسی محبوب مسافر کے آنے کی خوشخبری لاتا ہے۔

"ریاح" (ہواؤں) کو جمع کی صورت میں بیان کرنے کا مقصد شاید ان کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہو کیونکہ کچھ شمالی ہوائیں ہوتی ہیں، کچھ جنوبی، کچھ مشرقی ہوتی ہیں اور کچھ مغربی اور طبیعی طور پر روئے زمین کے ہر حصے تک بادلوں کے پھیل جانے کا سبب بن جاتی ہیں ۱؎

قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ یہاں پر "ماء" (پانی) کی صفت "طہور" بیان کی گئی ہے جو طہارت (یعنی پاکیزگی) کا مبالغے کا صیغہ ہے اور اسی معنی کے لحاظ سے اس کا مفہوم پاک ہونا بھی ہے اور پاک کرنا بھی۔ یعنی پانی ذاتی طور پر بھی پاک ہے اور نجس چیزوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ جبکہ پانی کے علاوہ بہت سی چیزیں ذاتی طور پر تو پاک ہیں لیکن نجس چیزوں کو پاک نہیں کر سکتیں۔

بہرصورت پانی میں زندہ رکھنے کے علاوہ ایک اور اہم خاصیت پائی جاتی ہے اور وہ ہے پاک کرنے کی خاصیت گویا پانی نہ ہوتا تو ہمارا جسم اور جان بلکہ تمام زندگی ایک ہی دن میں غلیظ اور متعفن ہو کر رہ جاتی اگرچہ وہ بذاتِ خود جراثیم کش نہیں ہے

۱؎ متوجہ رہنا چاہیے کہ "بُشْرًا" (شین کے سکون کے ساتھ) "بُشُرًا" (شین کے ضمہ کے ساتھ) کا مخفف ہے اور "بشور" (بروزن "قبول") کی جمع ہے جو مُبَشِّر یعنی بشارت دینے والے کے معنی میں ہے۔

لیکن چونکہ اس میں حل کرنے کی زبردست خاصیت پائی جاتی ہے لہٰذا انہیں اپنے اندر حل کرکے دھوڈالتا ہے اور ہمیشہ ختم کر دیتا ہے اس لحاظ سے وہ انسان کی سلامتی اور مختلف بیماریوں کے خلاف نبرد آزمائی میں بہت مؤثر طریقے پر معاونت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ روحانی اور باطنی طہارت جیسے غسل اور وضو وغیرہ میں بھی پانی ہی کام آتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ پانی صرف ظاہری نجاستوں کو دور نہیں کرتا بلکہ باطنی نجاستوں کو بھی دور کرتا ہے۔

اگرچہ پاک کرنے کی یہ خاصیت زبردست اہمیت کی حامل ہے لیکن اسے دوسرا درجہ حاصل ہے لہٰذا بعد والی آ ارشاد فرمایا گیا ہے: ہمارے بارش برسانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے مُردہ زمینوں کو زندہ کریں (لنحیی به ... میتًا) ۱؎

نیز ہم اس زندگی بخش پانی کو پینے کے لئے اپنی مخلوق یعنی بہت سے چوپایوں اور انسانوں کے اختیار میں دے ... ہیں (ونسقیه مما خلقنا انعامًا واناسی کثیرًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **بہت سے چوپائے اور انسان:** یہاں چوپایوں اور بہت سے انسانوں کا ذکر آیا ہے بر... حیوان اور انسان بارش کے پانی سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہ اس لیے ہے کہ یہاں پر ان خانہ بدوش لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں جن ... مطلقاً کوئی بھی پانی نہیں ہوتا اور وہ براہِ راست بارش کے پانی سے استفادہ کرتے ہیں۔ خدا کی یہ عظیم نعمت انہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے جب کہ آسمان پر کوئی بادل ظاہر ہوتا ہے، موسلادھار بارش برساتا ہے، گڑھے اور چشمے آ... آبِ زلال سے بھر جاتے ہیں ان کے جانور اور خود وہ اس پانی سے سیراب ہوتے ہیں زندگی کی روانی اپنے اور اپنے اندر بخوبی محسوس کرتے ہیں۔

۲۔ **"نسقیه" کا مفہوم:** یہ "اسقاء" کے مادہ سے ہے "اسقاء" اور "سقی" میں فرق ہے جیسا ... مفردات میں اور کچھ دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ "اسقاء" کا معنیٰ پانی تیار رکھنا اور اسے کسی کے اختیار میں ... کہ جب بھی انسان چاہے اس سے پی لے جبکہ "سقی" کا معنیٰ یہ ہے کہ پانی کا برتن کسی کے ہاتھ میں دیا جائے پیئے۔ دوسرے لفظوں میں "اسقاء" کا ایک وسیع اور عام معنی ہے۔

۳۔ **پہلے زمینوں کا ذکر:** اس آیت میں پہلے مُردہ زمینوں کا ذکر آیا ہے پھر جانوروں کا اور آخر میں ان...

۱؎ توجہ رہے کہ یہاں پر "بلدة" بیابان اور صحرا کے معنیٰ میں ہے۔ اگرچہ مؤنث کا صیغہ ہے لیکن اس کی صفت مذکر کے ساتھ لائی گئی ہے۔ کیونکہ "بلدة" مکان کے معنیٰ میں ہے اور مکان مذکر ہے۔

اس لیے ہے کہ جب تک زمین بارش کی وجہ سے زندہ نہ ہوں جانوروں کو خوراک نہیں ملے گی اور جب تک جانوروں میں جان نہیں
آئے گی انسان اس سے خوراک حاصل نہیں کر سکے گا۔

۴۔ پانی کا پہلا فائدہ : پانی کے زندگی بخش ہونے کو اس کے پاک کرنے کے مسئلہ کے بعد ذکر کیا گیا ہے اور شاید یہ اس
طرف اشارہ ہو کہ ان دونوں کا نزدیکی تعلق ہے (پانی کے زندگی بخش ہونے کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۷ میں سورۂ انبیاء کی
آیت ۳۰ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں)۔

زیر بحث آخری آیت میں قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے ان آیات کو گوناگوں صورتوں میں ان سے
بیان کیا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں لیکن اکثر لوگوں نے انکار اور کفر کے سوا کچھ نہیں کیا (ولقد صرفناہ بینھم لیذکروا
فابٰی اکثر الناس الا کفورًا)۔

اگرچہ بہت سے مفسرین جیسے مرحوم طبرسی اور شیخ طوسی نے تفسیر تبیان میں، علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں اور بعض دوسرے
مفسرین نے "صرفناہ" میں "ہ" کی ضمیر کو بارش کی طرف پلٹایا ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا "ہم بارش کے قطروں کو زمین کی
مختلف سمتوں اور علاقوں میں بھیجتے ہیں اور اسے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ وہ خدا کی اس عظیم نعمت کو یاد رکھیں"۔
لیکن حق یہ ہے کہ یہ ضمیر قرآن اور قرآنی آیات کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ یہ تعبیر (فعل ماضی اور مضارع کی صورت میں) قرآن مجید
کے دس مقامات پر آئی ہے جن میں سے نو جگہوں پر تو واضح طور پر قرآنی آیات اور بیانات کی طرف لوٹ رہی ہے اور بہت سے
مقامات پر "لیذکروا" یا اس قسم کا لفظ اس کے فوراً بعد آیا ہے۔ بنا بریں یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک مقام پر اس تعبیر کا
دوسرا مفہوم ہو۔

اصولی طور پر "تصریف" کا مادہ تبدیل کرنے اور الٹ پھیر کرنے کے معنی میں آتا ہے جس کی بارش کے پانی سے چنداں
مناسبت نہیں ہے جبکہ آیات قرآنی سے یہ زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ یہ مختلف انداز میں بیان ہوئی ہیں، کبھی وعدے کی صورت
میں، کہیں وعید کی حالت میں، کہیں پر امر ہے کہیں پر نہی ہے اور کسی مقام پر گزشتہ دنوں کی سرگزشت کی صورت میں۔

۵۱۔ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝
۵۲۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝
۵۳۔ وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ
وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝
۵۴۔ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ
رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝
۵۵۔ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ
الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ۝

ترجمہ

۵۱۔ اگر ہم چاہتے تو ہر شہر اور بستی میں ایک پیغمبر بھیج دیتے۔
۵۲۔ بنا بریں تو کافروں کی اطاعت نہ کر اور قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ بڑا جہاد کر۔
۵۳۔ وہ تو وہ ہے جس نے دو سمندروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہے اور ان میں سے ایک تو خوشگوار اور
میٹھا ہے اور دوسرا شورا اور کڑوا اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ بنائی ہے تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں
(گویا وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں) دور رہو اور نزدیک نہ آؤ۔
۵۴۔ وہ تو وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو خلق فرمایا اور اس کو نسب اور سبب قرار دیا (اور ان دو طریقوں سے
اس کی نسل کو عام کیا) اور تیرا پروردگار تو ہمیشہ قادر ہے۔
۵۵۔ وہ لوگ خدا کے بجائے ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انھیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہی نقصان اور
کافر لوگ خدا کے مقابلے میں (کفر کی راہ میں) ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔

تفسیر

دو مختلف سمندر ساتھ ساتھ

پہلی آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام کی عظمت کے بارے میں ہے، ارشاد ہوتا ہے ، اگر ہم چاہتے تو ہر
شہر اور گاؤں میں پیغمبر بھیج دیتے (لیکن ایسا نہیں کیا اور تمام جہان والوں کی ہدایت کی ذمہ داری تیرے شانوں پر ڈال دی)
(ولو شئنا لبعثنا فی کل قریة نذیرًا)

درحقیقت ——— گزشتہ آیات کے مطابق ——— جس طرح خدا اس بات پر قادر ہے کہ بارش کے حیات بخش
قطرات کو مردہ زمینوں پر بھیج دیتا ہے ۔ وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ ہر شہر و دیار میں کسی پیغمبر پر وحی و نبوت نازل کرے اور ہر
گروہ کے لیے "بشیر و نذیر" بھیجے لیکن خداوند کریم بندوں کی بہتری کے لیے ہی سب کچھ کرتا ہے کیونکہ ایک شخص کے اندر نبوت کا
تمرکز دنیا کے لوگوں کی وحدت اور اتحاد کا سبب بنتا ہے اور اس سے ہر قسم کے اختلاف و انتشار کا سدباب ہو جاتا ہے۔
یہ احتمال بھی ہے کہ بعض مشرکین دوسرے حیلے بہانوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ آیا بہتر نہیں تھا کہ خداوند عالم
ہر شہر اور بستی میں علیحدہ علیحدہ پیغمبر بھیج دیتا؟ قرآن نے ان کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے : اگر خدا چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا، لیکن
اقوام و ملل کی بہتری انتشار میں نہیں تھی ۔

بہرحال یہ آیت بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام معظم پر ایک بین دلیل ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے
کہ رہبر ایک ہی ہونا چاہیے اور اس کی ذمہ داری بھی بہت بڑی ہوتی ہے ۔
اسی بناء پر بعد والی آیت میں انبیاء کے دو اساسی فرائض کے پیش نظر خداوند عالم دو اہم احکام جاری فرماتا ہے اور سب
سے پہلے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرکے کہتا ہے: پس تو کافروں کی اطاعت نہ کر (فلا
تطع الکافرین) ۔
کسی بھی صورت میں ان کی بے راہروی کے سلسلے میں ان سے سودے بازی نہ کر کیونکہ گمراہ لوگوں کے ساتھ سودے بازی
تبلیغ راہ خدا اور دعوت حق کے لیے بہت بڑی آفت ہے بلکہ ان کے مقابلے میں ڈٹ جا اور ان کی اصلاح کر اور ان کی خواہشات
کے سامنے ہرگز نہ جھکنا ۔

رہا دوسرا حکم تو وہ یہ ہے کہ قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ عظیم جہاد کر (وجاھدھم بہ جھادًا کبیرًا)۔
جس قدر تیری رسالت اور منصب عظیم ہے جہاد بھی اتنا عظیم ہونا چاہیے جیسے انبیاء ماسبق کا عظیم جہاد رہا ہے یعنی ایسا عظیم جہاد
جو لوگوں کی تمام روحانی و فکری اور مادی و معنوی پہلوؤں پر محیط ہو ۔
اس میں بھی شک نہیں کہ اس جہاد سے فکری، ثقافتی اور تبلیغی جہاد مراد ہے مسلح جہاد مراد نہیں ہے کیونکہ یہ سورہ مکی ہے اور
ہر ایک کو معلوم ہے کہ مسلح جہاد کا حکم مکہ میں نازل نہیں ہوا تھا ۔

مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ آیت گمراہ لوگوں کے وسوسوں اور دشمنانِ حق کے مقابلے میں فکری اور
تبلیغی جہاد کی عظمت کے لیے بہت بڑی دلیل ہے حتیٰ کہ پیغمبر اسلامؐ کی یہ مشہور و معروف حدیث :

رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر

ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہیں

اسی جہاد اور تبلیغ دین میں علماء کے کارناموں کی عظمت کی طرف اشارہ ہو سکتی ہے ۔
یہ تعبیر قرآن کے مقامِ عظمت کو بھی بیان کر رہی ہے کیونکہ وہ اسی "جہادِ کبیر" کا ایک ذریعہ اور نہایت ہی مؤثر ہتھیار ہے کہ
جس کے بیان کی قدرت اور استدلال کی تاثیر اور جاذبیت انسانی قدرت اور تصور سے ماوراء ہے ۔
یہ قرآن روزِ روشن کی طرح چمکتا، شب تاریک کی مانند تسکین دہ ، ہواؤں کی مانند متحرک، ابر کی مانند عظیم، بارش کے قطروں کی
مانند حیات بخش ہتھیار ہے جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے ۔
ایک مختصر سے فاصلے کے بعد قرآن مجید نے کائنات کے تخلیقی نظام میں خداوندِ عالم کی نعمتوں کا ایک بار پھر تذکرہ شروع کیا
ہے اور گزشتہ آیات میں بارش کے حیات بخش قطرات کی مناسبت سے ان آیات میں پہلے دو مختلف سمندروں کا ذکر کرتے ہوئے
ارشاد فرمایا گیا ہے : وہ خدا ایسا ہے جس نے دو مختلف سمندروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہے ایک خوش گوار اور شیریں ہے جبکہ
دوسرا شور اور کڑوا ہے اور ان کے درمیان ایک آڑ مقرر کر دی ہے (تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں گویا وہ ایک دوسرے سے کہہ
رہے ہیں) دُور رہو اور نزدیک نہ آؤ (و ھو الذی مرج البحرین ھٰذا عذب فرات و ھٰذا ملح اجاج وجعل بینھما
برزخًا و حجرًا محجورًا)۔
"مَرَجَ" "مرج" (بروزن "فَلَجَ") کے مادہ سے مخلوط کرنے اور ملا دینے کے معنی میں ہے یا کھلا چھوڑ دینے
کے معنی میں اور اس جگہ پر دو سمندروں کا پہلو بہ پہلو اور ساتھ ساتھ رہنا مراد ہے ۔
"عذب" کا معنی خوش گوار، پاک و پاکیزہ اور ٹھنڈا ہے ۔ "فرات" کا معنی مزیدار اور میٹھا ہے ۔ جبکہ "ملح" کا
معنی نمکین اور شور اور "اجاج" کا معنی کڑوا اور گرم ہے (بنابریں ملح اور اجاج ، عذب اور فرات کے الٹ ہیں ۔)
"برزخ" کا معنی "پردہ" ہے اور دو چیزوں کے درمیان حائل آڑ کو کہتے ہیں ۔
جیسا کہ ہم پہلے (اسی سورت کی آیت ۲۲ کے ضمن میں) بتا چکے ہیں کہ "حجرًا محجورًا" اس بات کی طرف اشارہ
ہوتا ہے کہ جب عربوں میں دو شخص آپس میں روبرو ہوتے ہیں ایک کو دوسرے سے خوف ہوتا ہے تو وہ حصولِ امان کے طور پر
"حجرًا محجورًا" کہتا یعنی ہمیں امان دے دیں اور معاف کر دیں اور ہم سے دُور رہیں ۔
بہرحال یہ آیت کائنات میں قدرتِ خداوندی کے ایک عجیب و غریب شاہکار کی نقشہ کشی کر رہی ہے کہ کس طرح ایک
ان دیکھا اور غیر مرئی حجاب دو میٹھے اور کڑوے سمندروں کے درمیان موجود ہے جو دونوں کو آپس میں مخلوط ہو جانے سے
روک رہا ہوتا ہے ۔
البتہ آج ہمیں یہی سمجھ آ رہا ہے کہ یہ دکھائی نہ دینے والی آڑ درحقیقت میٹھے اور کڑوے پانی کا ہلکے اور بھاری پن کا تفاوت

اصطلاح میں جسے " دزان مخصوص کا فرق " کہتے ہیں جس کی وجہ سے دو مختلف نوعیتوں کے پانی ایک لمبے عرصے تک ایک دوسرے
میں مخلوط نہیں ہوسکتے ۔

اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس قسم کے سمندروں کی تلاش میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے کہ دنیا کے کس خطے میں میٹھے ا
کڑدے دونوں سمندر آپس میں مل رہے ہیں اور ایک دوسرے میں مخلوط بھی نہیں ہوتے لیکن آج کے دور میں یہ مشکل ہمارے لیے
حل ہوچکی ہے کیونکہ جہاں پر میٹھے پانی کے بڑے بڑے دریا سمندر میں گر رہے ہوتے ہیں تو وہیں ساحل پر ہی میٹھے پانی کا ایک سمندر
بن رہا ہوتا ہے اور سمندر کے کڑوے پانی کو دور دھکیل کر دور دور تک آگے چلا جاتا ہے اور اپنے ہلکے اور بھاری پن کی وجہ سے وہ ایک
دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہوپاتے گویا ایک دوسرے کو " حجرًا محجورًا " کہہ رہے ہوتے ہیں ۔

پھر مزیدار بات یہ ہے کہ سمندر کا پانی مد و جزر کی وجہ سے چوبیس گھنٹوں میں دو مرتبہ بڑی مقدار میں گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے،
اسی مقدار سے میٹھے پانی کا یہ سمندر بھی جب بڑھتا ہے تو پیچھے کو ہٹتا ہے اور خشکی پر پھیل جاتا ہے چنانچہ قدیم زمانے سے انسان نے فطرت
کے اس عمل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے بہت سی نہریں نکالی ہیں جن سے بہت سے رقبے کی آبپاشی کی جاتی ہے ۔

اب بھی جنوبی ایران میں ساحلِ سمندر پر کھجور کے لاکھوں درخت ایسے ہیں جو اس میٹھے پانی سے سیراب ہوتے ہیں جن میں سے
بہت سے درختوں کو ہم نے بھی بچشم خود ملاحظہ کیا ہے اور ان درختوں کی صرف اسی طریقے سے آبپاشی کی جاتی ہے اور وہ ساحلِ سمندر
سے بہت فاصلے پر ہیں ۔ جس سال بارش کم ہوتی ہے اور ان دریاؤں کا پانی کم ہوجاتا ہے تو بعض اوقات کڑوا اور نمکین پانی آب شیریں
پر غالب آجاتا ہے تو اس علاقے کے کسانوں کو پریشانی اور سخت خطرے کا سامنا کرنا پڑجاتا ہے کیونکہ شور پانی ان کی زراعت
کے لیے مضر ہوتا ہے ۔

لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا اور یہ " عذب و فرات پانی " جس کے پہلو میں " ملح و اجاج پانی " ہوتا ہے اور اس میں
مخلوط نہیں ہوتا ان کے لیے ایک عظیم نعمت شمار ہوتا ہے ۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ اس قسم کے مسائل میں فطری اسباب کا وجود ان کی عظمت کو کبھی نہیں گھٹا سکتا، کیونکہ آخر فطرت کیا
چیز ہے؟ کیا خدا کے فعل، ارادے اور مشیت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے ؟ اور خدا کے علاوہ کسی اور نے اشیائے عالم کو یہ
خاصیتیں عطا فرمائی ہیں ۔

یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ جب انسان ہوائی جہاز کے ذریعے ایسے علاقوں کے اوپر سے گزرتا ہے تو آپس میں ملنے والے
ان دونوں پانیوں کا منظر دلچسپ، دلکش اور عجیب ہوتا ہے جبکہ یہ دونوں اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ شانہ بشانہ سمندر میں بہ رہے ہوتے
ہیں تو انسان فورًا قرآن کے اس نکتے کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے ۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی بیان کرتے جائیں کہ اس آیت کا " ایمان " اور " کفر " سے متعلق آیات کے درمیان واقع ہونا ممکن
ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ ایک قسم کی تشبیہ ہے کفر اور ایمان کے لیے کہ بعض اوقات ایک معاشرے، ایک شہر حتیٰ کہ ایک
ہی خاندان کے مختلف افراد میں صاحبانِ ایمان لوگ " عذب و فرات " کی مانند " ملح و اجاج " جیسے بے ایمان اور کافر لوگوں کے ساتھ
ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں جن کی طرزِ فکر الگ، عقیدہ الگ، پاک اور ناپاک عمل کی نوعیت الگ ہوتی ہے اس کے باوجود وہ ایک دوسرے میں

یں ہو پاتے ۔

بعد والی آیت میں بارش کے نزول اور اسی طرح میٹھے اور کڑوے پانی کی بحث کے پیشِ نظر انسان کی پانی سے تخلیق کے
میں گفتگو کی گئی ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے : خدا تو وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا (وھو الذی خلق
الماء بشرًا) ۔

سچ بات تو یہ ہے کہ پانی میں صورت کی تخلیق اور محیر العقول نقش و نگاری پروردگارِ عالم کی بے انتہا قدرتِ کاملہ کی دلیل ہے
شتہ آیات میں پانی سے نباتات کی آبپاشی کا تذکرہ تھا ۔ اس آیت میں اس سے اعلیٰ ترین مرحلے یعنی پانی سے انسان کی
ق سے متعلق گفتگو ہے ۔

اب یہاں پر پانی سے کون سا پانی مراد ہے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔

بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ " بشر " سے مراد سب سے پہلا انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ ان کی آفرینش مٹی
ور پانی کے مجموعے سے ہوئی ۔ اس کے علاوہ بعض اسلامی روایات کے مطابق اللہ کی سب سے پہلی مخلوق پانی ہے اور انسان کو اسی
انی سے خلق فرمایا گیا ہے اور " بشرًا " کا نکرہ ہونا اسی بات کی دلیل ہے ۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ " ماء " سے مراد نطفے کا پانی ہے ۔ قدرت پروردگار کے مطابق تمام انسان جس سے
رض وجود میں آتے ہیں اور مرد کے نطفے (Sperm) اور عورت کے نطفے (Ovlim) کی باہمی آمیزش سے
سانی زندگی کے خاص خلیے وجود میں آتے ہیں ۔

اگر کوئی شخص انعقادِ نطفہ کے مراحل کو آغاز سے اختتام تک مدنظر رکھے اور اس پر غور و فکر کرے تو اسے عظمتِ حق کی آیات اور
خالقِ اکبر کی قدرت اس قدر واضح طور پر نظر آئے گی جو اس کی ذاتِ پاک کی معرفت کے لیے کافی ہوگی ۔

اس بات کا گواہ وہ جملہ ہے جو آیت کے آخر میں آیا ہے اور جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے یعنی " فجعلہ
نسبًا وصھرًا " ۔

ان سب باتوں سے ہٹ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی وجود کا بیشتر حصہ پانی سے تشکیل پاتا ہے دوسرے لفظوں میں
یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان کے وجود کا اصلی جوہر آب ہی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان، پیاس کا زیادہ عرصے تک مقابلہ نہیں کرسکتا
جبکہ بھوک کا مقابلہ کئی روز تو کیا کئی ہفتوں تک بھی کرسکتا ہے ۔

البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں جمع ہوں یعنی سب سے پہلا انسان بھی پانی سے پیدا کیا گیا ہے تمام
انسان بھی پانی کے نطفہ سے خلق کیے گئے ہیں اور پانی ہی سے انسانی وجود کا بیشتر حصہ بھی تشکیل پاتا ہے ۔

جو پانی کائنات کی سادہ ترین چیز شمار ہوتا ہے ، وہ اس قدر حیرت انگیز مخلوق کا مبداء کیونکر بن گیا ؟ یہ خدا کی قدرت کی
نہایت روشن دلیل ہے ۔

انسان کی تخلیق کے فورًا بعد نسلِ انسانی کے بڑھنے، پھیلنے اور پھولنے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : خداوند عالم نے اسی
ن کی دو طریقوں سے افزائش کی ایک نسب اور دوسرے صہر سے (فجعلہ نسبًا و صھرًا) ۔

"نسب" سے مراد وہ پیوند ہے جو اولاد کے ذریعہ لگتا ہے جیسے باپ اور اولاد کا یا بھائیوں کا باہمی رشتہ اور "صہر" جو "داماد" کے معنی میں ہے وہ پیوند ہوتا ہے جو دامادی کے ذریعے دو قوموں یا دو قبیلوں کے درمیان وجود میں آتا ہے۔ یعنی کسی کا سسرال والوں سے رشتہ اور یہ دونوں (نسب اور صہر) وہی ہیں جنھیں فقہائے اسلام نکاح کی مباحث میں "نسب" اور "سبب" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی سورۂ نساء کے سات مقامات پر ان محارم کا ذکر ہے جو نسب کی وجہ سے معرضِ وجود میں آتے ہیں یعنی ماں، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی۔ چار مقامات پر ان محارم کا تذکرہ ہے جو سبب اور صہر کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں یعنی بیوی کی بیٹی، ساس، بیٹے کی بیوی اور باپ کی بیوی۔

البتہ اس جملے کی تفسیر میں اور بھی بہت سے نظریات کا ذکر ملتا ہے جو دوسرے مفسرین کی طرف سے بیان کیے گئے ہیں لیکن زیادہ واضح اور قوی وہی نظریے ہیں جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

منجملہ ان نظریات کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے "نسب" کا معنیٰ بیٹے کی اولاد اور "صہر" کا معنیٰ بیٹی کی اولاد کیا ہے کیونکہ نسبی رشتوں کا دار و مدار باپ پر ہوتا ہے نہ کہ ماں پر۔

لیکن جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی دوسری جلد سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۱ کے ذیل میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو زمانۂ جاہلیت کی رسومات میں سے ہے کہ نسب کو صرف باپ کی طرف سے شمار کرتے تھے اور ماں کا اس میں کچھ بھی حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا جبکہ اسلامی فقہ میں تمام مسلم دانشوروں کے درمیان مسلّم ہے کہ محرم نسبی باپ اور ماں دونوں کی طرف سے ہوتا ہے (مزید تشریح کے لیے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد مذکورہ آیت کے ذیل میں دیکھیے)۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس مقام پر ہمیں ایک مشہور حدیث ملتی ہے جسے شیعہ اور سنی کتب میں نقل کیا گیا ہے کہ جس کے مطابق مندرجہ بالا آیت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ آنحضرتؐ نے اپنی دختر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا عقد حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ کر دیا تھا اس طرح سے حضرت علیؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی تو تھے ہی آپؐ کے داماد بھی بن گئے اور یہی معنی ہے "نسبًا و صهرًا" کا۔[1]

لیکن جیسا کہ ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی روایات، آیت کا روشن مصداق ہوا کرتی ہیں جو آیت کے عمومی مفہوم سے مانع نہیں ہوتیں یہ آیت بھی ہر قسم کی اس رشتہ داری پر محیط ہوگی جو نسب اور دامادی کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جس کا ایک روشن مصداق حضرت علیؑ کی دو طرح سے حضرت رسولِ پاکؐ سے رشتہ داری ہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے: تمھارا پروردگار تو ہمیشہ قادر ہی ہے (و کان ربك قديرًا)

آخرکار آخری زیرِ بحث آیت میں مشرکین کے اصل توحید سے انکار اور انحراف کو بیان فرمایا گیا ہے اور بتوں کی قدرت کا

---

[1] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر روح المعانی، اسی آیت کے ذیل میں۔

قدرت و طاقت سے موازنہ کیا گیا ہے جس کے کچھ نمونے گزشتہ آیات میں بیان ہو چکے ہیں فرماتا ہے: وہ لوگ خدا کے علاوہ ایسے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ تو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان (و يعبدون من دون الله ما لا ينفعهم ولا يضرهم)۔

یہ بات بھی مسلّم ہے کہ صرف نفع اور نقصان ہی عبادت کا معیار نہیں لیکن یہ کہہ کر قرآن مجید نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے پاس بتوں کی عبادت کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ بتوں میں قطعاً کسی کام کی کوئی خاصیت نہیں پائی جاتی اور ہر طرح کی مثبت یا منفی تاثیر سے خالی ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور کافر لوگ (اپنے کفر کی راہ میں) خدا سے مقابلے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں (وكان الكافر على ربه ظهيرًا)۔

وہ اپنی گمراہی میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ بڑے دھڑلے کے ساتھ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں جن طاقتوں کو راہ خدا میں خرچ کرنا چاہیے تھا انھیں وہ خدا، پیغمبر اور سچے مومنین کے خلاف خرچ کرتے ہیں۔

اگر اس موقع پر کسی تفسیر میں ہمیں "کافر" کا لفظ صرف "ابوجہل" کے بارے میں دکھائی دیتا ہے تو یہ اس کا ایک واضح مصداق ہے ورنہ "کافر" کا ہر جگہ وسیع معنیٰ ہے جو تمام کفار کے لیے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **صرف ایک قیادت:** زیر نظر پہلی آیت میں خداوندِ عالم کا فرمان ہے کہ "اگر ہم چاہتے تو ہر شہر اور دیار میں ڈرانے والا پیغمبر بھیج دیتے" لیکن ایسا نہیں کیا۔

یقیناً یہ صرف اس لیے ہے کہ انبیاء امتوں کے راہبر اور راہنما ہوا کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ کسی قوم کے مسئلہ قیادت میں تفرقہ اور انتشار اس قوم کی کمزوری کا سبب بن جاتا ہے خاص کر جب مسئلہ ختم نبوت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کی حیثیت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ایسی قیادت کو تو تا قیامِ قیامت برقرار رہنا ہے۔

ایک قائد اور رہبر تمام منتشر طاقتوں کو یکجا کرتا ہے انھیں وحدت اور اتحاد کا سبق دیتا ہے درحقیقت قیادت اور رہبری کی وحدت انسانی معاشرے میں توحید کی حقیقت کو منعکس کرتی ہے، جو ایک طرح سے شرک، تفرقہ اور نفاق کے برعکس ہے۔

سورۂ فاطر کی آیت ۲۴ میں ہے:

وان من امة الا خلا فيها نذير

ہر امت میں ایک ڈرانے والا نبی گزرا ہے۔

یہ مندرجہ بالا بحث کے قطعاً متضاد نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں ہر امت کی بات ہو رہی ہے ہر شہر اور دیار کی نہیں۔

اگر انبیاء کے بارے میں صرف نظر کر کے نچلے درجے کی طرف نگاہ کریں تو وہاں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے جو قومیں اپنے لیڈر کے لحاظ سے تشتت اور افتراق کا شکار ہوئی ہیں وہ اپنی طاقت اور توانائی کھو دینے کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں میں

انتشار کا شکار ہو چکی ہیں۔

۲۔ قرآن ـــــ ذریعہ جہاد ہے

"جہاد کبیر" کا لفظ ایک الٰہی تعمیری جدوجہد اور نبرد آزمائی کے لیے واضح تعبیر ہے جو اس کی اہمیت کو اجاگر کر رہی ہے
لائق توجہ بات یہ ہے کہ آیاتِ بالا میں یہ عنوان قرآن مجید کو دیا گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں ان لوگوں کو یہ عنوان دیا گیا
ہے جو قرآن کے ذریعے ہر قسم کی لغزش، گمراہی، جرائم اور معاشرتی برائیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

یہ تعبیر ایک طرف تو منطقی اور عقیدتی جدوجہد اور نبرد آزمائی کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور دوسری طرف قرآن کی عظمت کو
بعض روایتوں میں ہے کہ ایک شب ابوسفیان، ابوجہل اور مشرکین کے بہت سے دوسرے سردار جداگانہ طور پر اور ایک
دوسرے سے چھُپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سننے کے لیے آ گئے آپؐ اس وقت نماز پڑھنے میں مشغول تھے اور
ہر ایک، ایک دوسرے سے بالکل بے خبر علیحدہ علیحدہ مقامات پر چھپ کر بیٹھ گیا چنانچہ وہ رات گئے تک قرآن سنتے رہے اور جب
واپس پلٹنے لگے تو اس وقت صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ اتفاق سے سب نے واپسی کے لیے ایک ہی راستے کا انتخاب کیا
اور ان کی اچانک ایک دوسرے سے ملاقات ہو گئی اور ان کا بھانڈا وہیں پر پھوٹ گیا انھوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور
اس بات پر زور دیا کہ آئندہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے اگر نا سمجھ لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ شک وشبہ میں پڑ جائیں گے۔

دوسری اور تیسری رات بھی ایسا ہی اتفاق ہوا اور پھر وہی باتیں دہرائی گئیں اور آخری رات تو انھوں نے کہا جب تک اس
بات پر پختہ عہد نہ کر لیں اپنی جگہ سے ہلیں نہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور پھر ہر ایک نے اپنی راہ لی۔

اسی رات کی صبح اخنس بن شریق نامی ایک مشرک اپنا عصا لے کر سیدھا ابوسفیان کے گھر پہنچا اور اسے کہا:

تم نے جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

اس نے کہا:

خدا کی قسم! کچھ مطالب ایسے سنے ہیں جن کا معنیٰ بخوبی سمجھ سکا ہوں اور کچھ مسائل کے مراد اور معنیٰ کو
نہیں سمجھ سکا۔

اخنس وہاں سے سیدھا ابوجہل کے پاس پہنچا اس سے بھی وہی سوال کیا کہ:

تم نے جو کچھ محمد (ص) سے سنا ہے اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

ابوجہل نے کہا:

سنا کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری اور اولادِ عبدمناف کی قدیم زمانے سے رقابت چلی آ رہی
ہے انھوں نے بھوکوں کو کھانا کھلایا، ہم نے بھی کھلایا، انھوں نے پیدل لوگوں کو سواریاں دیں ہم
نے بھی دیں، انھوں نے لوگوں پر خرچ کیا سو ہم نے بھی کیا۔ گویا ہم دوش بدوش آگے بڑھتے
رہے۔ اب جب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے پاس وحی آسمانی بھی آتی ہے تو اس بارے میں

ہم ان کے ساتھ کس طرح برابری کر سکتے ہیں؟ اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو خدا کی قسم! ہم نہ تو کبھی
اس پر ایمان لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے۔

اخنس نے جب یہ بات سنی تو وہاں سے اٹھ کر چلا گیا[1]

جی ہاں! قرآن کی کشش نے ان پر اس قدر اثر کر دیا کہ وہ سپیدۂ صبح تک اس الٰہی کشش میں گم رہے لیکن خود خواہی،
تعصب اور مادی فوائد ان پر اس قدر غالب آ چکے تھے کہ انھوں نے حق قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس نورِ الٰہی میں اس قدر طاقت ہے کہ ہر آمادہ دل کو وہ جہاں بھی ہو، اپنی طرف جذب کر لیتا ہے یہی
وجہ ہے کہ اس (قرآن) کا ان آیات میں "جہاد کبیر" کہہ کر تعارف کروایا گیا ہے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۳۳۷ اور تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۶ ص ۱۷۲۔

۵۶۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ○

۵۷۔ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○

۵۸۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ○

۵۹۔ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ○

ترجمہ

۵۶۔ ہم نے تو تجھے صرف خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۵۷۔ (ان سے) کہہ دے: میں اس (دین کی تبلیغ) کے بدلے میں تم سے کسی اُجرت کا مطالبہ نہیں کرتا میری اجرت تو صرف یہی ہے کہ جو لوگ چاہیں اپنے پروردگار کا راستہ اختیار کرلیں۔

۵۸۔ اس خدا پر بھروسہ رکھ کہ جو کبھی نہیں مرے گا اور اس کی تسبیح اور حمد بجالا اور یہ کافی ہے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہے۔

۵۹۔ وہ خدا تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (چھ مرحلوں) میں پیدا کیا اور پھر عرش قدرت پر جلوہ فرما ہوا (اور کائنات کا نظام چلانے لگا) وہ خدائے رحمان ہے اسی سے طلب کرو کیونکہ وہی ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

میری اُجرت تمھاری ہدایت ہے

جیسا کہ سابقہ آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوچکا ہے کہ بُت پرستوں کا ان بتوں کی پرستش پر اصرار رہا ہے جو نہ تو کسی قسم کا نفع پہنچا

سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ لہٰذا زیرِ بحث آیات میں خداوندِ عالم ان ہٹ دھرم اور متعصب لوگوں کے مقابلے میں پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے خدائی فریضے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے تو تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے[1] (وما ارسلناك الا مبشرًا و نذیرًا)۔

اگر ان لوگوں نے تیری دعوتِ اسلام کو قبول نہ کیا تو تیرا کوئی قصور نہیں کیونکہ تو نے اپنا بشارت اور نذارت کا فریضہ انجام دے دیا ہے اور آمادہ دلوں کو خدا کی طرف دعوت دے دی ہے۔

یہ فرمان ایک تو رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے خدائی فریضے کو نمایاں کر رہا ہے اور دوسرے آنحضرتؐ کے دل کو تسلّی دے رہا ہے اور ساتھ ہی گمراہ لوگوں کو ایک طرح کی تنبیہ بھی کی جارہی ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو حکم دیا جارہا ہے کہ ان سے کہہ دے کہ میں اس قرآن اور تبلیغ دین کے بدلے میں کسی اُجرت کا مطالبہ نہیں کرتا (قل ما اسئلکم علیه من اجر)۔

قرآن مزید فرماتا ہے: جو اجرت میں ان سے چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگ خدا کا راستہ اختیار کریں (الا من شاء ان یتخذ الی ربه سبیلًا)۔

یعنی اگر تم ہدایت پا جاؤ تو بس میری یہی اُجرت ہے اور یہ ہدایت بھی اپنے ارادے اور مرضی کے ساتھ نہ کہ کسی کے مجبور کرنے سے[2]۔ یہ ایک دلچسپ تعبیر ہے جو آنحضرتؐ کی اپنے پیروکاروں کے ساتھ دوستی اور محبت کی انتہا کو واضح کررہی ہے کہ وہ اپنی اجرت اور مزدوری امت کی سعادت اور خوش بختی میں سمجھتے ہیں[1]۔

ظاہر ہے کہ اُمّت کی ہدایت، پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بہت بڑے معنوی اجر کا سبب بنتی ہے کیونکہ "الدال علی الخیر کفاعله" یعنی جو شخص نیکی کی ہدایت کرتا ہے گویا وہ خود نیکی کررہا ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں اور بھی بہت سے احتمال ذکر کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے مفسّرین کا نظریہ ہے کہ آیت کا معنیٰ یوں ہے:

"میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی کے مطابق اپنے اموال راہِ خدا میں ضرورت مندوں پر خرچ کرو[3]"

لیکن پہلی تفسیر آیت کے معنیٰ کے زیادہ نزدیک ہے۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ "علیه" کی ضمیر قرآن اور دینِ اسلام کی تبلیغ کی طرف لوٹ رہی ہے

---

[1] بعض مفسرین کے نزدیک "نذیر" مبالغے کا صیغہ ہے جبکہ "مبشّر" صرف اسم فاعل ہے۔ تعبیر کے اختلاف کا مقصد شاید یہ ہو کہ پیغمبر اکرمؐ کو ایسے لوگوں کا سامنا تھا جو اپنی گمراہی پر سخت ڈٹے ہوئے تھے فطری طور پر آپؐ کو انھیں ڈرانا ہی چاہیے تھا (تفسیر روح المعانی اسی آیت کے ذیل میں)۔

[2] بنا بریں اس آیت میں "استثنائے متصل" ہے ہر چند کہ بادی النظر میں منقطع دکھائی دیتا ہے۔

[3] ایسی صورت میں یہ "استثنائے منقطع" ہوگا۔

کیونکہ یہاں دعوت کی اُجرت و مزدوری کے بارے میں گفتگو ہورہی ہے ۔

یہ جملہ جہاں پر مشرکین کے بہانوں کا توڑ پیش کررہا ہے وہاں پر یہ بھی واضح کررہا ہے کہ اس دعوتِ الٰہی کی قبولیت نہایت سادہ و آسان اور ہر شخص کے لیے بغیر کسی تکلیف اور خرچے کے ممکن الحصول ہے ۔

یہ بجائے خود آنحضرتؐ کی دعوت کی سچائی اور پاکیزگیٔ فکر کے لیے شاہدِ ناطق ہے ۔ کیونکہ جھوٹے مدعی یہ کام براہِ راست یا بالواسطہ اجر کے بغیر انجام نہیں دیتے ۔

اس کے بعد والی آیت آنحضرتؐ کی حقیقی پناہ گاہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتی ہے: تو اس خدا پر توکّل کیے رکھ جو زندہ ہے اور جسے کبھی موت نہیں آئے گی (و توکل علی الحی الذی لایموت) ۔

گویا جب آپ کی پناہ گاہ اور والی و سرپرست ایسی ذات ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور زندہ رہے گی تو پھر نہ تو آپ کو کسی قسم کی اُجرت کی ضرورت ہے اور نہ ہی دشمن کے نقصان پہنچانے اور ان کی چالوں سے خوف کھانے کی ۔

اور جب صورتِ حال یہ ہے تو" اس کی تسبیح اور حمد بجالا" اور اسے ہر قسم کے عیب و نقص سے مبرّا اور منزّہ سمجھ اور تمام کمالات پر اس کی حمد و ستائش کر (و سبح بحمدہ) ۔

درحقیقت اس جملے کو پہلے کی علّت سمجھنا چاہیے کیونکہ جب وہ ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک اور ہر حسن و کمال سے آراستہ ہے تو وہی اس قابل ہے کہ اس پر توکّل کیا جائے ۔

پھر فرمایا گیا ہے: دشمنوں کی تخریب کاری اور سازشوں سے گھبرا نہیں کیونکہ یہ بات کوئی کم نہیں کہ خداوندِ عالم اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہے اور جب بھی چاہے گا ان کی پکڑ کرے گا (وکفیٰ بہ بذنوب عبادہ خبیرًا) ۔

بعد والی آیت کائنات میں پروردگارِ عالم کی قدرت اور اس قابلِ اعتماد پناہ گاہ کی ایک اور صفت بیان کررہی : وہ خدا وہ ہے جس نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے ان سب کو چھ دنوں (مرحلوں) میں پیدا کیا ہے : (الذی خلق السماوات والارض وما بینھما فی ستۃ ایام) ۔

پھر وہ عرشِ قدرت پر متمکن ہوا اور کائنات کا نظام چلانے لگا (ثم استوٰی علی العرش) ۔

جو ذات اس وسیع قدرت کی مالک ہے وہ اپنے اوپر توکّل کرنے والوں کو ہر خطرے اور ہر حادثے میں ہر طرح کی گزند سے محفوظ رکھ سکتی ہے ۔ کیونکہ کائنات کی ہر چیز اسی نے پیدا کی ہے اور کائنات کا ہر قسم کا نظام بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔

ضمنی طور پر اس بات کی وضاحت بھی کرتے چلیں کہ کائنات کی مرحلہ وار تخلیق اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خداوندِ عالم کسی بھی کام میں جلدی نہیں کرتا ۔ اگر تیرے دشمنوں کو فوراً سزا نہیں دیتا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انھیں مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لیں اور پھر یہ کہ عجلت تو وہ کرے جسے کسی چیز کے ضائع ہوجانے اور ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہو اور یہ بات خدائے قادر و متعال کے لیے فرض بھی نہیں کی جاسکتی ۔

کائنات کی چھ دنوں میں تخلیق اور یہ کہ ایسے مقامات پر "دن" سے مراد "مرحلہ" ہے اور ممکن ہے یہ مرحلہ لاکھوں اور کروڑوں سال پر مشتمل ہو اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ کی تفسیر کے ذیل میں عربی اور دوسری زبانوں کے

ادب کی رُو سے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ان چھ مراحل کو بھی واضح کیا ہے ۔

نیز "عرش" کا معنیٰ اور "استوٰی علی العرش" کا مفہوم بھی وہاں بیان ہوچکا ہے ۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : وہ خدا رحمان ہے (الرحمٰن) ۔

وہ وہ خدا ہے جس کی رحمتِ عامہ تمام کائنات پر محیط ہے اور فرماں بردار اور نافرمان ، مومن اور کافر سب خوانِ نعمت سے بہرہ ور ہورہے ہیں ۔

اب جبکہ تیرا خدا وہ ہے جو بخشنے والا، قدرت مند اور توانا ہے" اگر مانگنا چاہتا ہے تو اسی سے مانگ کیونکہ وہ اپنے کو جانتا ہے" (فاسئل بہ خبیرًا) ۔

درحقیقت یہ جملہ گزشتہ آیات کا ایک نتیجہ ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اے رسول ! تو انھیں بتادے کہ نہیں مانگتا اور اس خدا پر بھروسہ رکھ جو ان تمام صفات کا جامع ہے ۔ وہ قادر بھی ہے اور رحمان بھی ، علیم بھی ہے اور خـ ان صفات کا مالک ہے اسی خدا سے سب کچھ طلب کر ۔

مفسّرین نے اس جملے کی کچھ اور تفسیریں بھی کی ہیں اور یہاں پر سوال کرنے کو پوچھنے کے معنیٰ میں لیا ہے نہ کہ ما کرنے کے معنیٰ میں ۔ ان کے کہنے کے مطابق اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا " اگر تخلیق کائنات اور قدرتِ پروردگار کے بار چاہتے ہو تو خود اسی سے پوچھو کیونکہ وہ ہر چیز سے باخبر ہے" ۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ سوال کا معنیٰ پوچھنا ہے اور " خبیر " سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں یا حضرت محمّ وآلہ وسلم ہیں یعنی اگر خدا کی صفات کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو تو جبرئیل سے پوچھو یا حضرت رسالت مآبؐ سے ۔

البتہ یہ آخری تفسیر بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے اور اس سے پہلے والی تفسیر بھی گزشتہ آیات سے چنداں مناسبت نہ پہلی تفسیر یعنی سوال سے مراد خدا سے مانگنے اور اس سے درخواست کرنے کے ہیں ، یہی زیادہ مناسب ہے [1]

چند اہم نکات

۱۔ **اجرِ رسالت :** ہم قرآنِ مجید کی بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں کہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاءِ کرامؑ بڑی صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ہم اپنی رسالت و نبوت کا اجر کسی سے نہیں چاہتے بلکہ ہما ہے چنانچہ سورۂ شعراء کی آیات ۱۰۹، ۱۲۷ ، ۱۴۵ ، ۱۶۴ اور ۱۸۰ اور اسی طرح سورۂ ہود کی آیات ۲۹ کی آیت ۲۷، اور سورۂ سبا کی آیت ۴۷ اس بات کی شاہد ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کا اس طرح کا مطالبہ نہ کرنا الزام اور اتہام سے بری قرار دیتا ہے اور پھر یہ کہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے ہر قسم کے فرائضِ منصبی کو ادا کرسکتے ہ پیشِ نظر ممکن ہے کہ ان کی زبان نہ کھل سکتی ہو اس طرح سے یہ بات بھی ختم ہوجائے گی ۔

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "بہ" میں "ب" زائدہ ہے ۔ لیکن دوسری تفاسیر کے مطابق "ب" "عن" کے معنیٰ میں ہے ۔

لیکن یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ اس بارے میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تین تعبیریں نظر آتی ہیں۔

پہلی تعبیر تو وہ ہے جو آیاتِ بالا میں بیان ہوئی ہے کہ:

تمھاری ہدایت ہی میری اُجرت ہے۔

یہ نہایت ہی قیمتی بامعنیٰ اور پُرکشش تعبیر ہے۔

دوسری تعبیر وہ ہے جو سُورہ شوریٰ کی آیت ۲۲ میں بیان ہوئی ہے کہ:

قل لااسئلکم علیہ اجرًا الا المودۃ فی القربیٰ

میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا مگر یہ کہ تم میرے قریبیوں سے محبت رکھو۔

تیسری تعبیر وہ ہے جو سورہ سبا کی آیت ۴۷ میں بیان ہوئی ہے:

قل ما سئلتکم من اجر فھو لکم ان اجری الا علی اللہ

آپ ان سے کہہ دیجیے! میں نے جو اجرِ رسالت طلب کیا ہے وہ تمھارے ہی فائدے میں ہے میرا اجر تو صرف خدا پر ہے۔

اگر ان تینوں تعبیروں کو باہم ملایا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ اگر رسالت آپؐ کے بارے میں ذوی القربیٰ کی مودت اجرِ رسالت قرار پائی ہے تو ایک تو اس کا مفاد خود مؤمنین کو ہی پہنچتا ہے نہ کہ پیغمبر کو اور دوسرے یہ محبت ان کی ہدایت کا سبب بنتی ہے۔

بنا بریں یہ تمام آیات مجموعی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ رسولِ خدا کے ذوی القربیٰ کی محبت درحقیقت آنحضرتؐ کی رسالت اور رہبری کا تسلسل ہے دوسرے لفظوں میں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور آپؐ کی ہدایت اور راہبری کو دوام بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ آپؐ کے ذوی القربیٰ کا دامن مضبوطی سے پکڑا جائے اور ان کی راہبری سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور یہی وہ چیز ہے جس کی شیعہ حضرات مسئلہ امامت میں طرفداری کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ بعد از پیغمبر اکرمؐ رہبری کا سلسلہ تاقیامت جاری ہے البتہ نبوت کی شکل میں نہیں بلکہ امامت کے عنوان سے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اتباع اور پیروی کے لیے محبت ایک اہم اور مؤثر عامل ہے جیسا کہ سُورۂ آلِ عمران کی آیت ۳۱ میں ہے:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی

"اے پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجیے کہ اگر خدا کو دوست رکھنا چاہتے تو میری اتباع کرو"۔

اس لیے کہ میں اس کے فرمان تم تک پہنچاتا ہوں۔

اصولی طور پر کسی شخص کے ساتھ محبت، انسان کو اس کے محبوب کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور محبت کا رشتہ جتنا قوی ہوگا یہ کشش بھی اسی قدر محکم ہوگی۔ خاص کر جس محبت کا سبب محبوب یہ کمال اس بات کا باعث ہوگا کہ انسان کوشش کرکے خود کو کمال کے

اس مبداء تک پہنچائے گا اور محبوب کی ہر تمنا پوری کرکے خود کو اس کے زیادہ سے زیادہ نزدیک کر دے گا[۱]۔

۲۔ کس پر بھروسہ کرنا چاہیے؟ آیاتِ بالا میں جہاں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو دوسری تمام مخلوقات سے منہ پھیر کر صرف خدا کی ذات پر توکل کرنے کا حکم دے رہا ہے وہاں پر اس پاک ذات کی صفات کا بھی ذکر فرما رہا ہے جو دراصل اس ذات کی بنیادی شرائط ہیں جو انسانوں کے لیے حقیقی اور قابلِ اطمینان پناہ گاہ بن سکتی ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ زندہ ہو، کیونکہ بتوں کی مانند مردہ چیز کسی کے لیے جائے پناہ نہیں ہو سکتی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کی یہ حیات جاودانی ہو تاکہ اس کی موت کا احتمال توکل کرنے والوں کے ذہن میں تزلزل پیدا نہ کر دے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہو تاکہ وہ توکل کرنے والوں کی ضروریات سے باخبر رہے اور دشمنوں کی چالوں اور سازشوں سے بھی مطلع رہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہو تاکہ اس طرح سے کسی قسم کے عجز اور ناتوانی کا امکان باقی نہ رہے کیونکہ اس سے توکل کرنے والوں کے دل متزلزل ہو جاتے ہیں۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ کائنات کی حاکمیت اور نظامِ امور اس کے قبضۂ قدرت میں ہو۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ صفات صرف اور صرف خداوندِ عالم کی ذاتِ والاصفات ہی میں جمع ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر طوفانِ حوادث کے مقابلے میں قابلِ اطمینان اور غیر متزلزل جائے پناہ اور تکیہ گاہ صرف اور صرف اس کی ذات ہے۔

۱۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد دوم سُورۂ آلِ عمران آیت ۳۱ کے ذیل میں رجوع کریں۔

۶۰۔ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ اَنَسۡجُدُ
لِمَا تَاۡمُرُنَا وَزَادَهُمۡ نُفُوۡرًا ۞ ع السجدة
۶۱۔ تَبٰرَكَ الَّذِىۡ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّجَعَلَ فِيۡهَا سِرٰجًا وَّ
قَمَرًا مُّنِيۡرًا ۞
۶۲۔ وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ خِلۡفَةً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يَّذَّكَّرَ اَوۡ
اَرَادَ شُكُوۡرًا ۞

ترجمہ

۶۰۔ اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ خداوندِ رحمٰن کے لیے سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے؟ (ہم رحمان کو نہیں
پہچانتے) کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے (یہ بات کرتے ہیں) اور ان کی نفرت میں
اضافہ ہوجاتا ہے۔

۶۱۔ بابرکت اور جاوید ہے وہ خدا جس نے آسمانوں میں بُرج بنائے ہیں اور ان کے درمیان روشن چراغ اور ضیاپاش
چاند بنایا ہے۔

۶۲۔ اور وہ وہ ذات ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین قرار دیا ہے (یہ عجائبِ قدرت) ان لوگوں
کے لیے ہیں جو خدا کو یاد کریں یا اس کا شکر ادا کریں۔

تفسیر

آسمانی بُرج

چونکہ گزشتہ آیات میں خداوندِ عالم کی عظمت، قدرت اور وسعتِ رحمت کے بارے میں گفتگو تھی لہٰذا زیرِ نظر آیات میں فرمایا گیا ہے: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس رحمٰن خدا کو سجدہ کرو جس کی رحمت نے تمھارے سارے وجود کو ڈھانپا ہوا ہے تو وہ تکبر اور غرور یا ٹھٹھا مذاق سے کہتے ہیں رحمٰن کیا چیز ہے؟ (و اذا قيل لهم اسجدوا للرحمٰن قالوا و ما الرحمٰن)۔

"رحمان" کو قطعاً نہیں پہچانتے اس کلمہ کا مفہوم ہمارے لیے واضح نہیں ہے۔

"کیا ہم ایسی چیز کو سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے" (انسجد لما تأمرنا)۔

ہم کسی کا حکم نہیں مانیں گے اور کسی ایسے ویسے کی اطاعت نہیں کریں گے۔

"وہ یہ بات کرتے ہیں اور خداوندِ عالم سے ان کی نفرت اور دُوری میں اضافہ ہوجاتا ہے" (و زادهم نفورًا)۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کے حضور خشوع و خضوع کے اظہار اور سجدہ کی ادائیگی کی دعوت کے لیے خدا کے ناموں میں سے بہترین اور پرکشش نام "رحمان" ہے، جس میں رحمت کا معنیٰ اپنے جامع اور وسیع مفہوم کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن یہ دل کے اندھے اور متعصب بجائے اس کے کہ اس دعوت کا کوئی مثبت جواب دیتے الٹا اس دعوت کا مذاق اڑانے لگے اور حقارت کے ساتھ کہنے لگے کہ رحمان کیا چیز ہے؟ جس طرح فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں کہا تھا" وما رب العالمين "کہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ (سورۂ شعراء آیت ۲۳) ایسے لوگ اتنا بھی نہیں کرتے کہ کہیں" وہ کون ہے؟"

اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ "رحمان" بھی خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے چنانچہ جب انھوں نے یہ نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے سنا تو تعجب سے کہنے لگے کہ "ہم کسی کو رحمٰن کے نام سے نہیں پہچانتے ہاں البتہ یمامہ میں ایک شخص رہتا ہے جس کا نام رحمان ہے۔ (ان کی مراد نبوت کا جھوٹا مدعی مسیلمہ کذاب تھا جسے لوگ "رحمان" کہتے تھے)۔

لیکن یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کیونکہ اس نام کا مادہ اور صیغہ دونوں عربی ہیں اور حضرت رسالتمآبؐ ان کے سامنے ہر صورت کے آغاز میں" بسم الله الرحمٰن الرحيم "کہا کرتے تھے اور یہ کلمہ ان کے لیے کوئی اجنبی نہیں تھا لہٰذا ان کا مقصد بہانہ طرازی اور مذاق اڑانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

بعد والا جملہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں: کیا ہم تیری اطاعت کریں اور تیرے کہنے کے مطابق سجدہ کریں (انسجد لما تأمرنا)۔

لیکن چونکہ خدائی رہبروں کی تبلیغ صرف آمادہ دلوں پر ہی اثر کرتی ہے اور دل کے اندھے اور متعصب لوگ اس سے نہ صرف یہ کہ بہرہ اندوز نہیں ہوتے بلکہ ان کی نفرت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ آیاتِ قرآنی بھی بارانِ نعمت کی طرح ہوتی ہیں: باغ میں تو سبزہ اور پھولوں کی افزائش کا سبب بنتی ہے اور شورہ زار زمین میں خس و خاشاک کی روئیدگی کا[1]

بعد والی آیت درحقیقت ان کے اس سوال کا جواب ہے جو وہ کہتے تھے" رحمان کیا چیز ہے؟" اگرچہ انھوں نے یہ بات تمسخر کے طور پر کہی تھی لیکن قرآن اس کا سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہتا ہے، بابرکت اور صاحبِ عظمت ہے وہ خدا جس نے آسمانوں میں بُرج بنائے ہیں (تبارك الذى جعل فى السماء بروجًا)۔

---

[1] بنابریں "زاد" کا فاعل وہی سجدے کا حکم دینا ہے جس نے دل کے ان بیماروں پر الٹا اثر کیا ہے ہرچند کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ اور مومنین نے سجدہ کیا یہ بات ان کی مزید دوری کا سبب بن گئی اس لیے "زاد" کا فاعل سجدہ ہے لیکن پہلا معنیٰ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

"بروج" "برج" کی جمع ہے جو ظہور یعنی ظاہر ہونے کے معنی میں ہے لہٰذا شہر کی چار دیواری یا فوجی مرکز کے اطراف کی
دیوار میں جو جگہ سب سے بلند اور نمایاں ہوتی ہے اسے "بُرج" کہتے ہیں اسی بنا پر جب عورت اپنی زینت اور آرائش کو نمایاں کرتی ہے
تو اس وقت "تبرجت المرأة" کہتے ہیں۔
اور یہی کلمہ بلند و بالا محلات کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔
بہرحال آسمانی بروج، فلک کی مخصوص صورتوں کی طرف اشارہ ہے کہ سال کے ہر موسم اور ہر موقع پر چاند اور سورج ان میں سے
کسی نہ کسی کے مقابل ہوتے ہیں مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ سورج بُرج حمل میں ہوتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ مذکورہ بُرج کی
صُورت فلکی کے برابر میں واقع ہے یا جب کہتے ہیں کہ قمر در عقرب ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کُرّہ ماہ عقرب کی صورت فلکی کے
سامنے ہے (فلکی صورتیں ستاروں کے ان مجموعوں کو کہتے ہیں جو ہمیں خاص صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں)۔
اس طرح سے یہ آیت چاند اور سورج کی آسمانی منزلوں کی طرف اشارہ کر رہی اور اس کے بعد کہتی ہے: اور ان برجوں میں
روشن چراغ اور ضیا پاش چاند بنایا ہے (وجعل فیها سراجًا و قمرًا منیرًا)[1]
یہ آیت درحقیقت آسمان میں چاند اور سورج کی صحیح صحیح رفتار اور ان کے نپے تُلے نظام کو واضح کر رہی ہے (البتہ ہماری نگاہ
میں یہ تبدیلیاں درحقیقت سورج کے گرد زمین کے چکر لگانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں) اور یہ نظام اس قدر صحیح اور منظّم ہے جو لاکھوں
کروڑوں سال سے کسی کم و کاست کے بغیر اس کائنات پر حکم فرما ہے حتیٰ کہ باخبر منجمین آج سے سینکڑوں سال بعد تک کی سورج
اور چاند کی حرکت کے بارے میں ایک مقررہ دن اور مقررہ ساعت کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں ان عظیم آسمانی کردں پر حکم فرما یہ نظام پروردگار
عالم کے مدبّر، عالم اور صاحبِ حکمت ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔
آیا ان واضح نشانیوں اور چاند اور سورج کی حیرت انگیز منازل کے باوجود بھی اسے نہیں پہچانتے اور کہتے ہو
"وما الرحمان"؟

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورج کو "سراج" سے کیوں موسوم کیا گیا ہے اور چاند کو "منیر"
کی صفت سے کیوں موصوف کیا گیا ہے؟ ممکن ہے کہ اس کی دلیل یہ ہو کہ "سراج" ایسے چراغ کے معنی میں ہوتا ہے
جس کی روشنی خود اس کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور یہ تعریف سورج کی کیفیت سے مطابقت رکھتی ہے۔ کیونکہ سائنسی
تحقیقات کے مطابق سورج کا نور اس کے اپنے وجود سے ہے، برخلاف چاند کے، کیونکہ اس کا نور سورج کی بدولت
ہے، لہٰذا قمر کو منیر (روشنی دینے والا) کی صفت سے موصوف کیا گیا ہے ہر چند کہ اس کا نور دوسرے کا مرہونِ منت
ہے۔ (اس بارے میں تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد میں سُورۂ یونس کی پانچویں اور چھٹی آیت کے ذیل میں تفصیل سے
گفتگو کی جا چکی ہے)۔

---

[1] تفسیر بالا کے مطابق "فیها" کی ضمیر "سماء" کی طرف لوٹ رہی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ اہم موضوع تو ایک مخصوص نظام کے
تحت بروج میں سورج اور چاند کی گردش ہے، نہ کہ صرف آسمان میں برجوں کی موجودگی۔

زیرِ نظر آخری آیت میں ایک بار پھر خداوندِ عالم کی صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور نظامِ کائنات کے
ایک اور حصے کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:
"خدا تو وہ ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین مقرر فرمایا ہے یہ ان لوگوں
کے لیے جو اللہ کو یاد کرنا چاہتے ہیں یا شکر بجا لانا چاہتے ہیں" (وھو الذی جعل الیل والنهار
خلفة لمن اراد ان یذکر او اراد شکورًا)۔
شب و روز پر حاکم یہ عجیب اور حیرت انگیز نظام کہ ہمیشہ رات اور دن ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے رہتے ہیں لاکھوں
کروڑوں سال سے چلا آرہا ہے اگر یہ نظم و نسق نہ ہوتا تو نور اور حرارت یا تاریکی اور ظلمت کی وجہ سے انسانی زندگی تباہ اور برباد
ہو کر رہ جاتی، جو لوگ خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ ایک اچھی اور عمدہ دلیل ہے۔
ہم جانتے ہیں کہ سورج کے گرد زمین کی گردش کرنے کی وجہ سے رات اور دن پیدا ہوتے رہتے ہیں اور یہ تدریجی اور
منظّم تبدیلی کہ جس سے دائماً ایک میں کمی اور دوسرے میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد
اپنے مدار پر گھومتی رہتی ہے جس سے چار موسم پیدا ہوتے ہیں۔
اگر ہماری زمین کا کرہ اپنی موجودہ حرکت سے زیادہ تیز یا آہستہ حرکت کرتا تو پہلی صُورت میں راتیں لمبی ہوتیں جس سے دنیا کی
ہر چیز منجمد ہو کر رہ جاتی اور دن اس قدر طویل ہوتے کہ سورج کی چمک تمام چیزوں کو جلا کر رکھ دیتی اور دوسری صورت میں
شب و روز کا مختصر فاصلہ ان کی تمام تاثیر کو بے اثر بنا دیتا۔ اس کے علاوہ مرکز سے گریز کی طاقت میں اس قدر اضافہ ہو جاتا کہ وہ
روئے زمین پر موجود تمام چیزوں کو کُرّہ ارضی سے باہر پھینک دیتی۔
خلاصہ کلام یہ کہ اس نظام کا مطالعہ ایک تو انسان کے اندر خداشناسی کی فطرت کو بیدار کرتا ہے (شاید "یادِ خدا" کا اشارہ
بھی اس حقیقت کی طرف ہے) دوسرے اس کے اندر شکرگزاری کی روح کو زندہ کرتا ہے جس کی طرف "او اراد شکورًا"
کے جملے سے اشارہ کیا گیا ہے۔
یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہار علیہم السلام
سے کچھ روایات ذکر ہوئی ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:
رات اور دن کا ایک دوسرے کا جانشین ہونا، اس لیے ہے کہ اگر انسان
ان میں سے کسی ایک میں اپنے عبادتِ الٰہی جیسے فریضے میں کوتاہی کرے تو دوسرے
میں اس کی تلافی یا قضا کرلے۔
ممکن ہے کہ یہ آیت کی دوسری تفسیر ہو چونکہ قرآنی آیات کے کئی باطنی مفاہیم ہوتے ہیں لہٰذا اس کا پہلے
معنیٰ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

" جو عبادت یا اطاعت تم سے رات کو چھوٹ جائے اس کی دن میں قضا کر لیا کرو، کیونکہ خداوندِ عالم فرماتا ہے: وھوالذی جعل الیل والنھار خلفة لمن اراد ان یذکر او اراد شکورًا یعنی انسان اپنے رات کے چھوٹے ہوئے فرائض کو دن میں اور دن کے چھوٹے ہوئے فرائض کو رات کے وقت بجا لائے [1]

اسی طرح کی روایت فخرالدین رازی نے بھی حضرتِ رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے نقل کی ہے۔

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۴ اسی آیت کے ذیل میں بحوالہ "من لا یحضرہ الفقیہ"۔

۶۳۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○

۶۴۔ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ○

۶۵۔ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَھَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَھَا کَانَ غَرَامًا ○

۶۶۔ اِنَّھَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ○

۶۷۔ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ○

ترجمہ

۶۳۔ خداوندِ رحمان کے خاص بندے وہ ہیں جو آرام سے اور بغیر تکبّر کے زمین پر چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ انھیں مخاطب کرتے ہیں تو وہ انھیں سلام کہتے ہیں (اور بے پرواہی اور بے نیازی کے ساتھ گزر جاتے ہیں)۔

۶۴۔ وہ، وہ لوگ ہیں جو رات کے وقت اپنے پروردگار کے حضور سجدہ اور قیام کرتے ہیں۔

۶۵۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے پروردگار! ہم سے عذابِ جہنم کو دور فرما، کیونکہ اس کا عذاب سخت اور دائمی ہے۔

۶۶۔ وہ بُرا ٹھکانا اور بُری قیام گاہ ہے۔

۶۷۔ (خدا کے خاص بندے) وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی تنگ دلی بلکہ ان دونوں کے درمیان حدِ اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

تفسیر

خدا کے خاص بندوں کی صفات

ان آیات کے بعد" عباد الرحمٰن "کے عنوان کے تحت خداوندِ عالم کے خاص بندوں کی خاص خاص صفات کے بارے میں دلچسپ اور جامع گفتگو کی جارہی ہے۔ جو درحقیقت گزشتہ آیات کی تکمیل کر رہی ہے کہ جب ہٹ دھرم مشرکین کے سامنے خداوند رحمان کا نام لیا جاتا تو وہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے کہ" رحمان کیا چیز ہے"؟ اور ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآن مجید نے دو آیات میں انھیں خداوند رحمان کا تعارف کروایا ہے۔

اس مقام پر خداوند رحمان کے خاص بندوں کا ذکر ہے اور رحمان کے ان خاص بندوں کا تعارف کروایا جارہا ہے اور جب اس کے بندے اس قدر عالی اور باعظمت مقام کے مالک ہیں تو خدائے رحمٰن کس قدر عظمت کا مالک ہوگا؟ اس طرح سے اس کی عظمت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ آیات ان کی بارہ صفات بیان کر رہی ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق تو عقائد سے ہے اور کچھ کا اخلاق سے۔ بعض کا تعلق معاشرتی صفات سے ہے اور بعض کا انفرادی سے۔ غرضیکہ مجموعی طور پر وہ اعلیٰ انسانی خصوصیات کا پیکر ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خدا کے خاص بندے وہ ہیں جو آرام سے اور تکبر کے بغیر زمین پر چلتے ہیں (وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونًا)[1]

"عباد الرحمٰن" کی یہ جو سب سے پہلی صفت بیان کی گئی ہے درحقیقت وہ انسان کے تمام اعمال و کردار میں تکبر، غرور اور خود خواہی کی نفی ہے حتیٰ کہ زمین پر چلنے میں بھی یہ ناپسندیدہ صفات ان سے ظاہر نہیں ہوتیں۔ کیونکہ اخلاقی صفات خود بخود انسان کے اعمال، گفتار اور حرکات سے ظاہر ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ کسی شخص کی چال ڈھال سے اس کی بہت سی اخلاقی صفات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جی ہاں! وہ متواضع ہیں اور تواضع و انکساری ایمان کی چابی ہے جبکہ غرور اور تکبر کفر کی چابی ہوتی ہے ہم نے روزمرہ کی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قرآنی آیات میں متعدد بار پڑھا ہے کہ مغرور اور متکبر لوگ اس بات کے بھی روادار نہیں تھے کہ خدائی رہبروں کی باتوں کو سن ہی لیں وہ حقائق کا منہ چڑا کر ان کا تمسخر اڑاتے۔ جو لوگ صرف خود کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں ان کے لیے ایمان لانا ممکن نہیں۔

لیکن یہ خدائے رحمٰن کے مومن بندے ہی ہیں جن کی بندگی کی سب سے پہلی علامت تواضع اور فروتنی ہے وہ اس قدر متواضع ہیں

[1] "ھون" مصدر ہے جس کا معنی ہے نرمی، آہستگی اور تکبر نہ کرنا اور یہاں پر مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں تاکید کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی رحمٰن کے بندے ایسے ہیں گویا بذاتِ خود وہ نرمی اور تکبر کی نفی ہیں۔

کہ تواضع ان کے بدن کے ہر حصے میں رچ بس چکی ہے یہاں تک کہ ان کے چلنے پھرنے میں بھی انکساری پائی جاتی ہے۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم ذیل کا اہم حکم اپنے پیغمبر کو دیتا ہے تو صرف اس لیے کہ تواضع ایمان کی جان ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

ولا تمش فی الارض مرحًا انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولًا

زمین پر اکڑ کر اور غرور و تکبر کے ساتھ مت چلو کیونکہ نہ تو زمین کو تم شگافتہ کر سکتے ہو اور نہ ہی تمھارے قد کی لمبائی پہاڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔ (بنی اسرائیل ——— ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان اپنے اور کائنات کے بارے میں تھوڑی سی بھی معلومات رکھتا ہو تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ اس قدر عظیم کائنات کے مقابلے میں کس قدر حقیر اور ناچیز ہے؟ حتیٰ کہ اگر اس کی گردن پہاڑوں جتنی اونچی ہو جائے پھر بھی وہ زمین کے برابر نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا کے اونچے سے اونچے پہاڑ بھی زمین کی عظمت کے سامنے ایسے ہیں جیسے مالٹے کی نسبت اس کا چھلکا ہوتا ہے جبکہ اس عظیم کہکشاں کے مقابلے میں زمین کی حیثیت ایک ناچیز ذرے کی سی ہے۔

تو کیا اس حالت میں انسان کا تکبر اور غرور اس کی مطلق جہالت اور نادانی کی دلیل نہیں؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک لائق توجہ حدیث ہے کہ آنحضرتؐ ایک کوچہ سے گزر رہے تھے آپؐ نے دیکھا کہ ایک جگہ کچھ لوگ اکٹھے ہیں آپؐ نے ان سے اس اجتماع کا سبب دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کی جناب! یہاں ایک دیوانہ ہے جس نے اپنی دیوانگی اور مجنونانہ حرکات سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے تو آپؐ نے سب لوگوں کو اپنی طرف بلا کر ارشاد فرمایا: کیا چاہتے ہو کہ میں تمھیں حقیقی دیوانے سے متعارف کراؤں؟" سب لوگ خاموش ہو گئے اور ہمہ تن گوش ہو کر آپؐ کا ارشاد سننے لگے، آپؐ نے فرمایا:۔

المتبختر فی مشیه، الناظر فی عطفیه، المحرك جنبیه بمنکبیه الذی لا یرجی خیره ولا یؤمن شره، فذلك المجنون وهذا مبتلی

جو غرور کی بناء پر مٹک مٹک کر چلتا ہے بار بار دائیں بائیں دیکھتا ہے پہلو اور کولہوں کو مٹکا مٹکا کر قدم اٹھاتا ہے (اپنے علاوہ کسی پر اس کی نگاہ نہیں اٹھتی، اپنے سوا کسی کے بارے میں سوچتا نہیں) لوگوں کو جس سے خیر کی امید نہ ہو، اس کی برائی سے محفوظ نہ ہوں، وہ ہوتا ہے حقیقی دیوانہ۔ رہا یہ شخص تو یہ بیچارہ بیمار ہے (دیوانہ نہیں)۔

"عباد الرحمٰن" کی دوسری صفت حلم اور بردباری ہے جیسا کہ قرآنِ مجید اسی آیت میں آگے چل کر کہتا ہے: جب جاہل لوگ انھیں مخاطب کرتے ہیں اور اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے ناشائستہ باتیں کرتے ہیں تو وہ جواب میں انھیں "سلام" کہتے ہیں۔ (واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلامًا)۔

ایسا سلام جو بے پروائی اور بزرگواری پر مشتمل ہوتا ہے نہ کہ کمزوری پر۔

ایسا سلام جو جاہلوں اور نادانوں کے ساتھ عدم مقابلہ کی دلیل ہوتا ہے۔

ایسا سلام جو ان کی بے مقصد باتوں کے جواب میں خاموشی پر مبنی ہوتا ہے۔

ایسا سلام نہیں جو محبّت اور دوستی کی علامت ہوتا ہے۔

المختصر ایسا سلام جو حلم و بردباری اور عظمت و بزرگواری کی علامت ہوتا ہے۔

ہاں تو ان کی باعظمت روحانی صفات میں سے ایک صفت تحمّل اور حوصلہ ہے جس کے بغیر کوئی بھی انسان خداوند عالم کی عبودیت اور بندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل دشوار گزار راستہ طے نہیں کرسکتا۔ خاص کر ایسے معاشروں میں جہاں فاسد اور مفسد، جاہل اور نادان افراد کی فراوانی ہو۔

دوسری آیت میں ان "عباد الرحمٰن" کی تیسری صفت بیان کی گئی ہے اور وہ ہے خداوندِ عالم کی خالص عبادت، ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو رات کے وقت اپنے پروردگار کے حضور سجدہ اور قیام کرتے ہیں (والذین یبیتون لربھم سجدًا و قیامًا)۔

رات کی تاریکی میں جبکہ غافلوں کی آنکھیں سوئی ہوتی ہیں ظاہرداری اور ریاکاری کا کوئی موقع نہیں ہوتا میٹھی نیند کو اپنے اوپر حرام کرکے اس سے بھی شیریں چیز یعنی ذکرِ خدا، قیام اور اس کی باعظمت بارگاہ میں سجدہ کرنے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ رات کا کچھ حصّہ اپنے محبوب کے ساتھ راز و نیاز اور مناجات میں گزار دیتے ہیں اور اپنے قلب و روح کو اس کی یاد اور نام سے منوّر کرتے ہیں۔

اگرچہ "یبیتون" کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ساری رات سجدے اور قیام میں گزار دیتے ہیں لیکن واضح ہے کہ اس سے مراد رات کا ایک بڑا حصہ ہے اور اگر تمام رات مراد ہو تو ایسا اتفاق کبھی ہوجاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی بتاتے چلیں کہ "سجود" کو "قیام" پر مقدّم کرنے کی وجہ اس کی اہمیّت ہے اگرچہ نماز میں عملی طور پر قیام مقدّم ہوتا ہے[1]

ان بندگانِ خدا کی چوتھی صفت عذابِ الٰہی سے خوف ہے" وہ ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ کہتے رہتے ہیں پروردگارا! ہم سے جہنم کا عذاب دُور رکھ کیونکہ اس کا عذاب سخت اور دائمی ہے" (والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غرامًا)۔

"کیونکہ جہنم بُرا ٹھکانا اور بدترین اقامت گاہ ہے" (انھا ساءت مستقرًا و مقامًا)۔

باوجودیکہ وہ لوگ رات کو عبادتِ خدا میں مشغول ہوتے ہیں اور دن کے وقت اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں پھر بھی ان کے دل احساسِ ذمّہ داری کی بناء پر خوفِ خدا سے معمور رہتے ہیں اور یہ خوف ایسا ہوتا ہے جس سے فریضے کی ادائگی بہتر اور مؤثر انداز میں ہوتی ہے۔

وہ ایسا خوف ہوتا ہے جو ایک طاقتور پولیس کی مانند باطن سے انسان کو کنٹرول کرتا ہے چنانچہ اس خوف کی وجہ سے انسان کسی نگران کے بغیر اپنے فرائض احسن طور پر انجام دیتا رہتا ہے اور پھر بھی اپنے آپ کو بارگاہِ ربّ العزت میں قصوروار سمجھتا ہے۔

"غرام" دراصل ایسی مصیبت اور سخت پریشانی کے معنی میں آتا ہے جس سے چھٹکارا مشکل ہوتا ہے اگر قرض خواہ کو

---

[1] توجّہ رہے کہ "سُجّد" "ساجد" کی جمع ہے اور "قیام" "قائم" کی۔

"غریم"[1] کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ مقروض سے چمٹا رہتا ہے اس عشق اور قلبی تعلق کو بھی "غرام" کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی کام یا کسی چیز کے پیچھے لگا رہتا ہے اور جہنم کے لیے اس لفظ کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ اس کا عذاب سخت، مسلسل اور دائمی ہوتا ہے۔

"مستقر" اور "مقام" کا فرق شاید اس وجہ سے ہے کہ جہنم کفّار کے لیے ہمیشہ کی اقامت گاہ (مقام) ہے اور مومنین کے لیے محدود عرصے کے لیے رہائش گاہ (مستقر) ہے۔ اس طرح سے دونوں قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو جہنم میں وارد ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ دوزخ بُرا ٹھکانا اور بدترین اقامت گاہ ہے، کہاں جلانے والی آگ اور کہاں آرام و اطمینان اور سکون؟ کہاں قاتل شعلے اور کہاں آرام و آسائش؟

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ "مستقر" اور "مقام" دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہو جو دوزخ کے عذاب کے دوام اور ہمیشگی پر تاکیدی حیثیت رکھتا ہے ٹھیک بہشت کے مقابل جس کے بارے میں ہم انھی آیات میں پڑھیں گے کہ:

خالدین فیھا حسنت مستقرًا و مقامًا

مومنین ہمیشہ بہشتی محلات میں رہیں گے کیا بہترین ٹھکانا اور کیسی شاندار اقامت گاہ ہوگی۔

(فرقان — ۶۷)

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں "عباد الرحمٰن" کی پانچویں صفت بتائی جارہی ہے جو اعتدال پر مبنی اور ہر کام میں ہر قسم کے افراط و تفریط سے دُوری ہے خاص کر خرچ کرنے کے معاملے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے وقت نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی سختی سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں حالتوں کے درمیان حدِ اعتدال قائم کرتے ہیں (والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذٰلک قوامًا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن بذاتہٖ خرچ کرنے کو تسلیم کرتا ہے اور تسلیم بھی اس حد تک کہ اس کے ذکر کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ انفاق ہر انسان کا حتمی فریضہ ہے لہٰذا گفتگو میں خدا کے بندوں کے انفاق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کا انفاق بھی اعتدال کی حد تک ہوتا ہے جس میں نہ تو فضول خرچی ہوتی ہے اور نہ سخت گیری۔ نہ تو اس قدر خرچ کر ڈالتے ہیں کہ خود ان کے بیوی بچے بھوکے رہ جاتے ہوں اور نہ ہی اس قدر سختی سے کام لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کی بخشش سے محروم رہ جاتے ہوں۔

"اسراف" اور "اقتار" جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ان سب کی بحث کا نتیجہ نکلتا ہے کہ "اسراف" یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو حد سے زیادہ اور ناحق و بے جا خرچ کیا جائے اور "اقتار" یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اپنے حق اور ضروری مقدار سے کم خرچ کیا جائے۔

---

[1] "غریم" قرض خواہ کو بھی کہتے ہیں اور مقروض کو بھی۔ ("لسان العرب" مادہ "غرم")۔

ایک روایت میں اسراف، اقتار اور اعتدال کے لیے بہترین اور دلکش تشبیہ بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ:

ایک مرتبہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور زمین سے ایک مٹھی میں سنگریزے لیے اور پھر مٹھی کو خوب بند کر لیا اور فرمایا یہ "اقتار" ہے پھر ایک اور مٹھی میں سنگریزے لیے اور ہاتھ کو اس قدر کھول دیا کہ تمام سنگریزے ہاتھ سے جاتے رہے فرمایا: اسے اسراف کہتے ہیں اور تیسری مرتبہ مٹھی میں سنگریزے لیے اور تھوڑا سا اسے کھولا جس سے کچھ تو زمین پر آگرے اور کچھ ہاتھ میں باقی رہ گئے، فرمایا یہ "قوام" ہے [1]

"قوام" ("عوام" کے وزن پر) کا لفظ لغت میں عدالت، استقامت اور کسی چیز کی حدِ وسط کے معنی میں ہے اور "قوام" ("کتاب" کے وزن پر) کا لفظ اس چیز کے معنی میں ہے جو قیام اور استقرار کی وجہ بنتی ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ مؤمنین کی رفتار: مندرجہ بالا آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ خدا کے خاص بندوں کی علامات میں سے ایک علامت "تواضع" بھی ہے ایسی تواضع جو ان کی روح پر بھی حکمران ہوتی کہ چلتے وقت ان کی رفتار سے بھی ظاہر ہو ایسی تواضع جو انھیں حق کے سامنے سر جھکا دینے پر آمادہ کرے۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر تواضع کو کمزوری، ناتوانی، سستی اور کاہلی سے تعبیر کریں جو یقیناً خطرناک طرزِ فکر ہو گی۔

چلنے میں تواضع کا مقصد یہ نہیں کہ قدم ڈھیلے اور سست اٹھائے جائیں بلکہ تواضع کے ساتھ اس انداز سے محکم قدم اٹھائے جائیں کہ جس سے مستقل مزاجی اور طاقت کا اظہار ہوتا ہو۔ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح میں ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں:

ما رأیت احدا اسرع فی مشیته من رسول الله کانما الارض تطوی له وانا لنجهد انفسنا وانه لغیر مکترث

میں نے چلنے میں پیغمبرِ خدا سے زیادہ تیز رفتار نہیں دیکھا گویا زمین آپ کے قدموں میں لپٹی جاتی تھی اور ہم مشکل سے اپنے آپ کو آنحضرتؐ کے ساتھ چلاتے تھے حالانکہ آنجناب کو اس کی قطعاً پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی [2]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام "الذین یمشون علی الارض هونا" کی تفسیر کے بارے میں فرماتے ہیں:

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۹ بحوالہ اصولِ کافی۔

[2] "فی ظلال القرآن" مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں۔ تفسیر قرطبی میں بھی اس بارے میں ایک اور روایت مذکور ہے جو اسی روایت کے مشابہ ہے۔

والرجل یمشی بسجیته التی جبل علیها، لا یتکلف ولا یتبختر

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان فطری طریقے پر قدم اٹھائے جس میں نہ تو تکلیف ہو اور نہ ہی تکبر [1]

سرکار رسالتمآبؐ کے حالات میں ہے کہ:

قد کان یتکفأ فی مشیه کانما یمشی فی صبب

جب آپ چلتے تھے تو جلد بازی کے اظہار کے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتے اس طرح سے کہ گویا ڈھلوان کی طرف جا رہے ہوں [2]

بہرحال جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ فقط چلنے کی کیفیت کے بارے میں بحث نہیں ہے بلکہ اس سے کسی انسان کے حالاتِ زندگی پر بہت حد تک روشنی پڑتی ہے اور یہ آیت درحقیقت عبادِ رحمٰن کی روح اور بدن میں تواضع اور فروتنی کی تاثیر کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ بخل اور فضول خرچی: اس میں شک نہیں کہ بخل اور فضول خرچی قرآن اور اسلام کی رُو سے ایک نہایت مذموم عمل ہے جس کی آیات اور روایات میں زبردست مذمت کی گئی ہے کیونکہ "اسراف" ایک فرعونی طرزِ عمل ہے، قرآن کہتا ہے:

وان فرعون لعال فی الارض وانه لمن المسرفین (یونس: ۸۳)

اسراف کرنے والے جہنمی ہیں، ملاحظہ ہو:

وان المسرفین هم اصحاب النار (مؤمن: ۴۳)

آجکل کی تحقیقات سے جو بات ثابت ہو چکی ہے اگر اسے مدِنظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ زمین کے وسائل انسانی آبادی کی نسبت اس قدر زیادہ نہیں ہیں کہ انھیں اللّوں تللّوں میں ضائع کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کا اثر دوسرے بے گناہ لوگوں پر پڑتا ہے اور ساتھ ہی اسراف میں عموماً خود خواہی، خود پسندی اور خلقِ خدا سے بیگانگی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے۔

جبکہ بخل اور خسیس پن بھی اسی قدر بُری اور ناپسندیدہ عادت ہے۔ اصولی طور پر اگر توحیدی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر چیز کا اصلی مالک خداوندِ متعال ہے اور ہم سب صرف اس کی دی ہوئی امانت کے امین ہیں اور اس کی اجازت کے بغیر ہمیں کسی قسم کے تصرف اور عمل دخل کا کوئی حق حاصل نہیں اور معلوم ہو کہ اس نے نہ تو فضول خرچی کی اجازت دی ہے اور نہ ہی بخل اور کنجوسی کی۔

[1] تفسیر مجمع البیان، مندرجہ بالا آیت کے ضمن میں۔

[2] تفسیر روح المعانی اسی آیت کے ذیل میں۔

۶۸۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ
يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝
۶۹ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝
۷۰۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ
حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝
۷۱۔ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝

ترجمہ

۶۸۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور جس کا خون اللہ نے حرام کردیا ہے اس انسان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا بھی دیکھ لے گا۔
۶۹۔ ایسے شخص کا عذاب قیامت میں دگنا ہوگا اور اس میں ذلّت اور خواری کے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔
۷۰۔ لیکن جو شخص توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے تو خداوند عالم ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے گا اور خداوندِ عالم بخشنے والا اور مہربان ہے۔
۷۱۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل بجالائے تو اس کی بازگشت خدا کی طرف ہوگی (اور وہ اپنی جزا اسی سے پائے گا)۔

تفسیر

"عبادالرحمٰن" کی کچھ اور صفات

"عبادالرحمٰن" کی چھٹی خصوصی صفت توحید پر ان کا خالص ایمان ہے جو انھیں دو یا کئی چیزوں کی پرستش پر مبنی شرک سے دُور رکھتا ہے، چنانچہ قرآن فرماتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے (والذین لا

یدعون مع اللہ الٰھًا اٰخر)۔
توحید نے ان کے قلب اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو روشن کررکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے روح و فکر کے آسمان سے شرک کی ہر قسم کی تاریکی کافور ہوچکی ہے۔
ساتویں صفت یہ ہے کہ عبادالرحمٰن بے گناہوں کے خون میں اپنے ہاتھ نہیں رنگتے اور کسی ایسے انسان کو ناحق قتل نہیں کرتے جس کا خون اللہ تعالیٰ نے حرام کردیا ہے (ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق)[1]۔
اس آیت سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ بنیادی طور پر تمام انسانی نفوس قابلِ احترام ہیں اور ان کا خون بہانا ممنوع ہے مگر یہ کہ کچھ ایسے عوامل پیدا ہوجائیں جن سے یہ احترام ثانوی حیثیت اختیار کرجائے اور خون بہانا جائز ہوجائے۔
ان کی آٹھویں صفت یہ ہے کہ ان کا دامان عفت گناہ سے آلودہ نہیں ہوتا اور وہ زنا نہیں کرتے (ولا یزنون)۔
اگر وہ کفر و ایمان کے دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں تو ایمان کا انتخاب کرتے ہیں اور اگر جانوں کے لیے امن اور بدامنی کا سوال درپیش ہو تو امن کا انتخاب کرتے ہیں اگر پاکیزگی اور آلودگی کی بات ہو تو پاکیزگی اختیار کرتے ہیں وہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جو ہر قسم کے شرک، بدامنی، بے عفتی اور آلودگی سے صاف اور پاک ہوتا ہے۔
اسی آیت کے ذیل میں اس بات پر زور دے کر فرمایا گیا ہے: جو شخص ان امور میں سے کسی ایک کو انجام دے تو وہ اپنی اور انجام دیکھ لے گا (ومن یفعل ذلک یلق اثامًا)۔
"اثم" اور "اثام" دراصل ان اعمال کو کہتے ہیں جو انسان کو ثواب تک پہنچنے نہیں دیتے۔ بعد ازاں اس لفظ کا ہر قسم کے گناہ پر اطلاق ہونے لگا لیکن اس مقام پر گناہ کی سزا کے معنی میں ہے۔
بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "اثم" کا معنی ہے "گناہ" اور "اثام" کا معنی ہے "گناہ کی سزا"۔[2]
اگر بعض مفسرین نے اس کا معنی جہنم میں بیابان یا پہاڑ یا کنوئیں کیا ہے تو یہ اس کا ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے۔
زنا کی حرمت کے فلسفے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۲ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے
یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سب سے پہلے شرک، پھر قتل نفس اور اس کے بعد کے بارے میں گفتگو ہے بعض روایات کے مطابق ان تینوں گناہوں کی بالترتیب وہی اہمیت ہے جو آیت میں آئی ہے۔
ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کیا:
ای الذنب اعظم؟ قال ان تجعل للہ ندًا وھو خلقک، قال قلت ثم ای؟
قال ان تقتل ولدک مخافۃ ان یطعم معک، قال قلت ثم ای؟ قال ان تزانی

---

[1] مندرجہ بالا جملے میں اصطلاحی طور پر "استثنائے مفرغ" ہے جس کی تقدیر یوں ہے: "ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ بہ من الاسباب الا بالحق"۔
[2] تفسیر فخر رازی اسی آیت کے ذیل میں۔

حلیلة جارك. فانزل الله تصدیقها و الذین لا یدعون مع الله الٰهاً اٰخر۔ الیٰ اٰخر الاٰیة

سب گناہوں سے بڑھ کر کون سا گناہ ہے ؟

آپؐ نے فرمایا :

یہ کہ تم خدا کا شریک ٹھہراؤ جبکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے ۔

عرض کیا اس کے بعد ؟

فرمایا یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس لیے قتل کر ڈالو کہ تمھارے کھانے میں شریک ہو جائے گی ۔

عرض کیا اس کے بعد ؟

فرمایا یہ کہ اپنے ہمسایے کی بیوی سے بدکاری کرو ۔

اس موقع پر خدا نے اپنے پیغمبرؐ کی تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل کر دی (والذین لا یدعون مع الله الٰها اٰخر.........)۔[1]

اگرچہ اس حدیث میں قتل اور زنا کی خاص قسموں کا ذکر آیا ہے لیکن اگر مفہوم کے اطلاق پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قتل اور زنا کی تمام اقسام کے بارے میں ہے اور روایت میں ان کا واضح مصداق بیان ہوا ہے ۔

چونکہ یہ تینوں گناہ زبردست اہمیت کے حامل ہیں لہذا بعد والی آیت میں بھی انھیں کے بارے میں زور دیا گیا ہے کہ جو لوگ ان گناہوں کا ارتکاب کریں گے قیامت کے دن ان کا عذاب دگنا ہوگا اور بڑی ذلت اور خواری کے ساتھ عذاب میں ہمیشہ کے لیے گرفتار رہیں گے (یضاعف له العذاب یوم القیامة و یخلد فیه مهانًا) ۔

اس جگہ پر دو سوال پیش آتے ہیں ایک تو یہ کہ آخر ان لوگوں کا عذاب دگنا کیوں ہوگا اور گناہ کے برابر انھیں سزا کیوں نہیں ملے گی اور آیا یہ بات عدلِ الٰہی سے مطابقت رکھتی ہے ؟

دوسرے یہ کہ یہاں پر ہمیشہ کے عذاب کی گفتگو ہو رہی ہے جبکہ ہمیشگی صرف کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور آیت میں جو تین گناہ ذکر ہوئے ہیں ان میں سے صرف ایک یعنی پہلا گناہ کفر ہے لیکن قتلِ نفس اور زنا تو خلود کا سبب نہیں بن سکتے ۔

پہلے سوال کے جواب کے بارے میں مفسرین نے بہت بحث کی ہے اور جو جواب سب سے زیادہ صحیح نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ عذاب کے دگنا ہونے سے مراد یہ ہے کہ آیت میں مذکور ان تینوں گناہوں کی سزائیں علیحدہ علیحدہ ہوں گی جو مجموعی صورت میں دگنی بن جائیں گی ۔

اس سے قطع نظر یہ بات بھی ہے کہ بسا اوقات ایک گناہ کئی دوسرے گناہوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے مثلاً کفر ہی کو لے لیجیے کہ ایک گناہ ہے لیکن یہی گناہ واجبات کے ترک اور محرمات کے انجام دینے کا سبب بن جاتا ہے اور یہی چیز خداوندِ عالم کی سزا کے دو گنا ہونے کا سبب بن جاتی ہے ۔

اسی لیے تو بعض مفسرین نے اس آیت کو اس مشہور مسئلے پر دلیل سمجھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "جس طرح کفار اصولِ دین کے لیے

---

[1] مجمع البیان ، اسی آیت کے ذیل میں ، بحوالہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم ۔

مکلف ہیں اسی طرح فروعِ دین کے لیے بھی مکلف ہیں :

الکفار مکلفون بالفروع کما انهم مکلفون بالاصول

دوسرے سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ بعض گناہ اس قدر سخت ہوتے ہیں کہ اس دنیا سے بے ایمان ہوکر مرنے کا سبب بن جاتے ہیں جیسا کہ ہم قتلِ نفس کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۲ سورہ نساء کی آیت ۹۲ میں بیان کر چکے ہیں ۔

زنا خاص طور پر جب محصنہ (شوہر دار عورت) کے ساتھ ہو تو ممکن ہے کہ وہ بے ایمان ہونے کا سبب بن جائے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں مذکور دائمی عذاب ان لوگوں کے لیے ہو جو مذکورہ تینوں گناہوں کا باہم ارتکاب کریں شرک کا بھی ، قتلِ نفس اور زنا کا بھی اور اس بات کی گواہ بعد والی آیت ہے جس میں کہا گیا ہے :-

الا من تاب و اٰمن و عمل عملاً صالحًا

مگر وہ شخص جو توبہ کرے ، ایمان لے آئے اور عملِ صالح بجا لائے ۔

تو اس طرح سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا ۔

بعض مفسرین نے یہاں پر ہمیشگی کو ایک لمبی مدت کے معنی میں لیا ہے نہ کہ ہمیشہ کی مدت کے معنی میں ۔ لیکن پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

یہاں پر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اس آیت میں معمول کی سزا کے علاوہ ایک دوسری سزا کا ذکر بھی ہے اور وہ ہے ان گناہ گاروں کی تحقیر اور توہین جو ایک طرح کی باطنی سزا ہے اور یہ سزا کے دگنا ہونے کی تفسیر بھی ہو سکتی ہے کیونکہ انھیں جسمانی عذاب بھی دیا جائے گا اور روحانی عذاب بھی ۔

چونکہ قرآن مجید نے مجرمین کے لیے واپس آجانے کا راستہ بند نہیں کیا اور گناہگاروں کو توبہ کی تشویق کرتا ہے اور دعوت دیتا ہے لہذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : مگر جو شخص توبہ کرے ، ایمان لے آئے اور اعمالِ صالح بجا لائے تو خداوند عالم اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان کے بُرے اعمال کو نیک اعمال میں تبدیل کر دے گا اور خداوند عالم بخشنے والا اور مہربان ہے (الا من تاب و اٰمن و عمل عملاً صالحًا فاولئك یبدل الله سیئاتهم حسنات و کان الله غفورًا رحیمًا) ۔

جیسا کہ ابھی گزشتہ آیت میں گناہانِ کبیرہ میں سے تین گناہوں کا ذکر ہوا ہے اور ان گناہوں کے مرتکب افراد کے لیے توبہ کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر نادم اور پشیمان انسان ، توبہ کے دروازے سے اپنے خالق اور مالک کے حضور لوٹ سکتا ہے بشرطیکہ اس کی توبہ حقیقی ہو اور جیسا کہ آیت میں بیان ہوا ہے ، اس کی علامت عملِ صالح ہے جس سے گناہوں کی تلافی کی جاسکتی ہے ورنہ صرف زبان سے استغفار یا دل میں لمحہ بھر کی پشیمانی اور پھر وہی سابقہ حالت یہ توبہ کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتی ۔

اس بارے میں اہم اور قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم ان "سیئات" کو "حسنات" میں کیونکر تبدیل کرتا ہے ؟

سیئات کی حسنات میں تبدیلی

اس کے بارے میں چند ایک تفسیریں ہیں جو سب کی سب ماننے کے قابل ہیں۔

۱۔ جب انسان توبہ کرتا ہے اور خدا پر ایمان لے آتا ہے تو اس کے پورے وجود میں ایک گہری تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور اس اندرونی انقلاب اور تبدیلی کی وجہ سے اس کے بُرے اعمال مستقبل میں نیک اعمال میں تبدیل ہو جاتے ہیں اگر اس نے ماضی میں کسی کو قتل کیا تھا تو اب (حقیقی توبہ کی وجہ سے) مظلوم کا دفاع اور ظالم سے جنگ اس کی جگہ لے لیتی ہے اگر سابق میں وہ زانی اور بدکار تھا تو اب وہ پاکدامن بن جائے گا اور یہ خدائی توفیق اسے ایمان اور توبہ کی بدولت حاصل ہو گی۔

۲۔ دوسری یہ کہ خداوندِ عالم اپنی مہربانی، فضل اور احسان کی وجہ سے توبہ کے بعد اس کے تمام بُرے اعمال کو مٹا کر نیک اعمال کو ان کی جگہ دے دے گا جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں کہ:

بروزِ قیامت ایک شخص کو لایا جائے گا اور خداوندِ عالم حکم دے گا کہ اس کے صغیرہ گناہوں کو اس کے سامنے پیش کیا جائے اور کبیرہ کو چھپایا جائے اور پھر اس سے کہا جائے گا کہ تو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں صغیرہ گناہ کیا تھا اور وہ اس کا اعتراف کرے گا لیکن اس کا دل کبیرہ گناہوں کے خوف کی وجہ سے کانپ رہا ہو گا۔

اس مقام پر خداوندِ عالم اپنی مہربانی کی وجہ سے حکم دے گا کہ اسے ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی دی جائے، وہ شخص عرض کرے گا خداوندا! میں نے تو بڑے بڑے گناہ کیے تھے جنھیں یہاں پر میں نہیں دیکھ رہا ہوں۔

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ اس موقع پر آنحضرتؐ یوں مسکرائے کہ آپ کے مبارک دانتوں کی سفیدی نمودار ہو گئی اور آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فاولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات[۱]

۳۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ "سیئات" سے مراد انسان کے خود اعمال نہیں ہیں جنھیں وہ انجام دیتا ہے بلکہ اس سے مراد ان اعمال کے بُرے اثرات ہیں جو انسان کے جسم اور روح پر چھا جاتے ہیں اور جب وہ توبہ کرتا ہے تو وہ بُرے اثرات دور ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ اچھے اثرات لے لیتے ہیں۔

البتہ ان تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ممکن ہے کہ تینوں کی تینوں ایک مفہوم میں جمع ہوں۔

بعد والی آیت صحیح توبہ کی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے: جو شخص توبہ کرکے اعمالِ صالح بجا لاتا ہے وہ اپنے رب کی طرف لوٹ جائے گا (اور اسی سے اپنی جزا پائے گا) (ومن تاب وعمل صالحًا فانه یتوب الی الله متابًا)[۲]

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۲۔

۲۔ "متاب" مصدر میمی اور توبہ کے معنی میں ہے چونکہ یہاں مفعول مطلق ہے لہذا تاکید کے معنی دے رہا ہے۔

یعنی توبہ اور گناہوں کا ترک کرنا صرف اس وجہ سے نہ ہو کہ گناہ بُری چیز ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی نیت خلوص ...ف خدا پر مبنی ہو۔

بنابریں (بطور مثال) شراب نوشی یا دروغ گوئی کو اس وجہ سے ترک کر دینا کہ یہ بُری چیزیں ہیں اگرچہ ایک اچھی بات ہے لیکن ...س کی حقیقی قدر وقیمت اس وقت ہو گی جب یہ کام صرف اور صرف خدا کی خوشنودی کے لیے کیا جائے۔

بعض مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے جو یہ ہے:

یہ آیت دراصل اس تعجب خیز سوال کا جواب ہے جو کبھی کبھار کچھ ذہنوں میں اٹھتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ خداوندِ عالم برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا تو یہ آیت اس سوال کا جواب دے رہی ہے کہ جب انسان اپنے رب کی طرف لوٹ جائے تو یہ امر باعثِ تعجب نہیں۔

اس سلسلے میں ایک تیسری تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص گناہوں سے توبہ کرتا ہے وہ خدا اور بے حد وحساب اجر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

اگرچہ ان تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے خاص طور پر وہ اس روایت سے زیادہ ہم آہنگ ہے جسے علی بن ابراہیم نے اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

۷۲۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○

۷۳۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ○

۷۴۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○

۷۵۔ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۙ○

۷۶۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ○

ترجمہ

۷۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے (اور باطل کی محفلوں میں شرکت نہیں کرتے) اور جب لغو اور بے ہودہ باتوں سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ بڑے وقار سے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔

۷۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب پروردگار کی آیات سنتے ہیں تو بہرے اور اندھے بن کر ان پر گر نہیں پڑتے۔

۷۴۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں پروردگارا! ہماری بیویوں اور اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور ہمیں متقی اور پرہیزگار لوگوں کا پیشوا بنا۔

۷۵۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں صبر و شکیبائی کے بدلے بہشتِ بریں کے بلند درجات عطا ہوں گے اور انھیں وہاں پر تحیۃ اور سلام پیش کیا جائے گا۔

۷۶۔ وہ بہشت میں ہمیشہ رہیں گے کیا خوب ٹھکانا اور کیسی عالی شان اقامت گاہ ہے۔

تفسیر

عباد الرحمٰن کی جزا

گزشتہ آیات میں رحمان کے خاص بندوں کی کچھ خصوصیات بیان کی گئی تھیں زیرِ نظر آیات میں ان کی بقیہ خصوصیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

ان (عباد الرحمٰن) کی نویں اہم صفت دوسروں کے حقوق کا احترام اور ان حقوق کی حفاظت ہے" وہ ایسے لوگ ہیں جو کبھی بھی جھوٹی گواہی نہیں دیتے" (والذین لا یشھدون الزور)۔

بزرگ مفسرین نے اس آیت کی دو طرح سے تفسیر کی ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں بعض مفسرین نے "شہادتِ زور" کو "جھوٹی گواہی" کے معنی میں لیا ہے۔ کیونکہ لغت میں "زور" کا معنی انحراف اور پھرنا ہے اور چونکہ جھوٹ، باطل اور ظلم کا تعلق بھی انحرافی امور سے ہوتا ہے لہٰذا انھیں "زور" کہتے ہیں۔

شہادتِ زور (یعنی جھوٹی گواہی) کی تعبیر ہماری فقہ کی کتابِ شہادت میں اسی عنوان سے موجود ہے اور بہت سی روایات میں جھوٹی گواہی سے منع کیا گیا ہے لیکن ان روایات میں اس آیت سے استدلال کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "شہود" سے مراد حاضر اور موجود ہونا ہے لیکن خدا کے خاص بندے لغو، باطل اور بے ہودہ محفلوں میں حاضر اور موجود نہیں ہوتے۔

اہلِ بیت اطہار علیہم السلام سے منقول بعض روایات میں "زور" کو "غناء کی محفل" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ایسی محفل جہاں گانے گائے جائیں خواہ آلاتِ موسیقی کے ساتھ یا ان کے بغیر۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کی روایات کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ "زور" کے وسیع مفہوم کو صرف "غناء" تک محدود کر دیں بلکہ غناء بھی اس کے بہت سے مصادیق میں سے ایک ہے اور اس کے مفہوم میں لہو و لعب، شراب نوشی، جھوٹ اور غیبت وغیرہ کی محفلیں بھی شامل ہیں۔

یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ آیت کے معنی میں دونوں تفسیریں جمع ہوں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خدا کے خاص بندے نہ تو جھوٹی گواہی دیتے ہیں اور نہ ہی لہو و لعب، باطل اور گناہ کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں کیونکہ ایسی محافل میں شرکت گناہ کی تائید کرنے کے علاوہ قلب اور روح کی آلودگی کے اسباب بھی فراہم کرتی ہے۔

پھر اسی آیت کے ذیل میں خدا کے خاص بندوں کی دسویں اہم صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب وہ لغو اور بے ہودہ کاموں کو دیکھتے ہیں تو وقار کے ساتھ وہاں سے گزر جاتے ہیں (واذا مروا باللغو مروا کراما)۔

درحقیقت نہ تو وہ کسی باطل اور لغو محفل میں شرکت کرتے ہیں اور نہ ہی لغو اور بے ہودہ چیزوں میں خود کو ملوث کرتے ہیں۔

"لغو" کے معنیٰ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا اطلاق ہر اس کام پر ہوتا ہے جس کا کوئی معقول ہدف نہ ہو اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے یہ خالص بندے اپنی زندگی میں ہمیشہ معقول، مفید اور تعمیری کام انجام دیتے ہیں۔ بیہودہ کاموں اور بے ہودہ لوگوں سے متنفر ہوتے ہیں اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوجائے کہ انھیں کسی قسم کی بے ہودہ باتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے تو وہ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ وہاں سے گزر جاتے ہیں اور یہ بے نیازی اور بے اعتنائی اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ باطنی طور پر ایسے کاموں سے متنفر ہیں وہ اس قدر باعظمت اور باکردار لوگ ہیں کہ ماحول کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ماحول کے رنگ میں رنگے جا سکتے ہیں۔

اس میں بھی شک نہیں کہ ایسے غلیظ ماحول سے اس طرح کی بے اعتنائی اسی صورت میں ہوگی جب بدکاری سے مقابلے اور نہی عن المنکر کے لیے اس سے بہتر چارہ نہ رہ گیا ہو ورنہ کسی شک وشبہ کے بغیر وہ مردانہ وار ڈٹ جاتے ہیں اور اپنے شرعی فریضے کو آخری مرحلے تک سرانجام دیتے ہیں۔

خدا کے خاص بندوں کی ایک اور صفت یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور یاد کے موقع پر چشم بینا اور گوش شنوا کے مالک ہوتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انھیں ان کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ بہرے اور اندھے بن کر ان پر گر نہیں پڑتے (والذین اذا ذکروا بآیات ربهم لم یخروا علیها صمًّا وعمیانًا)۔

مسلّم بات یہ ہے کہ اس سے کفّار کے عمل کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ وہ تو آیاتِ الٰہی کی قطعًا پرواہ ہی نہیں کرتے بلکہ یا تو منافق ٹولے کی طرف اشارہ مقصود ہے یا پھر سطحی مسلمانوں کی طرف جو کانوں اور آنکھوں کو بند کر کے آیاتِ الٰہی پر گر پڑتے ہیں یعنی ان کی حقیقت کو سمجھتے نہیں اور نہ ہی ان کی تہ تک پہنچتے ہیں اور خدا کے مقصود اور مطلوب کو جانے بغیر، ان آیات میں غور و فکر کیے بغیر اور اپنے اعمال میں ان آیات سے درس لیے بغیر ان پر گر پڑتے ہیں۔

راہِ خدا کو آنکھیں اور کان بند کر کے طے نہیں کیا جا سکتا سب سے پہلے اس راستے کو طے کرنے کے لیے سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔ ایسی آنکھ جو باطن کو دیکھ سکتی ہو اور گہرائیوں تک پہنچ سکتی ہو اور ایسا کان جو حسّاس اور نکتہ شناس ہو۔

اگر خوب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آنکھ اور کان بند کر کے آیاتِ الٰہی پر گر پڑنے والے لوگوں کا نقصان ان دشمنوں سے کم نہیں جو جان پہچان کر دینِ حق کی بنیادوں پر کاری ضربیں لگاتے ہیں بلکہ کئی درجے زیادہ ہوتا ہے۔

اصولی طور پر بات یہ ہے کہ مذہب سے سچی آشنائی کی وجہ سے ہی پائیداری، مستقل مزاجی کے ساتھ حوادثات کے مقابلے اور مذہب کے لیے ڈٹ جانے کا درس ملتا ہے کیونکہ جو لوگ آنکھ اور کان بند کیے دین یا مذہب کی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں انھیں جلد ہی دھوکا دے کر ورغلایا جا سکتا ہے اور مذہب کی تحریف کر کے انھیں مذہب کے صحیح راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے اور آسانی سے کفر، بے ایمانی اور گمراہی کی طرف دھکیلا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے لوگ دشمن کے آلہ کار اور شیطان کا بہترین شکار ہیں، صرف گہری نظر رکھنے والے، دوراندیش اور صاحبانِ بصیرت و بصارت مومنین ہی پہاڑ کی مانند ڈٹ جاتے ہیں اور ہر ایسے ویسے کو اہمیت نہیں دیتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو امامؑ نے فرمایا:

مستبصرین لیسوا بشکاك

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنا قدم آگے بڑھاتے ہیں نہ کہ شک وشبہ کے ساتھ[1]

ان سچے مومنین کی بارہویں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال اور افرادِ خاندان کی تربیت پر خاص توجہ رکھتے ہیں اور اس امر کے بارے میں اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ پروردگارا! ہماری بیویوں اور اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا (والذین یقولون ربنا هب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرة اعین)۔

ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر دعا کرتے ہیں بلکہ یہ دعا تو ان کے اندرونی جذبوں کی دلیل اور سعی وکوشش کی علامت ہے۔

مسلّم ہے ایسے لوگ جتنا بھی ان کے بس میں ہوتا ہے اولاد اور ازواج کی تربیت، انھیں اسلام کے اصول وفروع سے مطلع کرنے اور حق وعدالت کی راہ دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے اور جس چیز تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس کا اپنے مالک سے سوال کرتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں بلکہ اصولی طور پر ہر صحیح دعا کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ پہلے تو تا حدِ امکان کوشش کرنا چاہیے اور جہاں بس نہ چل سکتا ہو اس کے لیے دعا کرنا چاہیے۔

"قرة عین" عربی کلمہ ہے جس کا متبادل لفظ فارسی میں "نورِ چشم" (آنکھوں کی ٹھنڈک) ہے اور یہ اس شخص کے لیے کنایہ ہے جو کسی کے لیے مسرت اور خوشی کا سبب بنتا ہے اور یہ تعبیر دراصل لفظ "قر" (بروزن "حُر") سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ سردی اور خنکی ہوتا ہے اور ایک مشہور ومعروف محاورہ بھی ہے (جس کی بہت سے مفسّرین نے صراحت بھی کی ہے) کہ محبت کے آنسو ہمیشہ ٹھنڈے اور رنج وغم کے اشک ہمیشہ گرم ہوا کرتے ہیں لہٰذا "قرة العین" ایسی چیز کو کہیں گے جس سے انسان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں یہ جو محاورہ ہے کہ "محبّت کے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں" تو یہ خوشی اور سرور کے لیے ایک بہترین کنایہ ہے[2]

اولاد کی تربیت، ازواج کی ہدایت ورا ہنمائی اور بچوں کے لیے ماں باپ کا فریضہ ایسے اہم ترین مسائل ہیں قرآن نے جن پر بہت زیادہ زور دیا ہے ہم ان مسائل کو انشاء اللہ العزیز سورۂ تحریم کی آیت ۶ کی تشریح میں بیان کریں گے۔

آخر میں خدا کے ان خالص بندوں کی تیرہویں نمایاں صفت کو بیان فرمایا گیا ہے جو درحقیقت ایک لحاظ سے مذکورہ تمام اوصاف میں سے اہم تر ہے اور وہ یہ کہ وہ صرف اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ خود ہی حق کی راہ پر گامزن رہیں بلکہ ان کی ہمّت اس قدر والا اور بالا ہے کہ وہ خدا سے خود کو مومنین کی جماعت کا امام اور پیشوا بنانے کی درخواست کر رہے ہیں تاکہ اس طرح سے وہ دوسرے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۔

[2] اس بات کا شاہد عرب کے ایک شاعر کا شعر ہے جسے قرطبی نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کیا ہے:

فکم سخنت بالامس عین قریرة   وقرت عیون دمعها الیوم ساکب

کل ٹھنڈی آنکھیں گرم ہوگئیں لیکن آج پھر دی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئی ہیں کہ جن سے آنسو جاری ہیں۔

لوگوں کو بھی راہِ حق وحقیقت کی طرف بلا سکیں۔

وہ ایک گوشہ نشین عابد اور زاہد کی مانند نہیں ہیں جو صرف اپنی پاکیٔ داماں کے لیے کوشاں رہتا ہے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی راہِ نجات پر لے آئیں۔

لہٰذا اسی آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خداوندا! تو ہمیں پرہیزگار لوگوں کا امام اور پیشوا بنا (واجعلنا للمتقین اماماً)۔

ایک بار پھر توجہ مبذول فرمائیں اور اس نکتے پر غور کریں کہ وہ صرف دعا پر اکتفا نہیں کرتے کہ اپنے اسلاف پر نازاں ہو کر باتیں ہی بناتے رہیں نہیں بلکہ اپنے لیے بزرگواری، عظمت اور امامت کے ایسے اسباب فراہم کرتے ہیں کہ ایک سچے اور برحق پیشوا کی تمام صفات ان میں جمع ہو جاتی ہیں اور یہ کام بہت مشکل اور نہایت ہی سنگین ہوتا ہے۔

آپ یقیناً نہیں بھولے ہوں گے کہ یہ آیات تمام مومنین کی صفات بیان نہیں کر رہیں بلکہ مومنین کے ایک ممتاز گروہ کے اوصاف بیان کر رہی ہیں جو مومنین کی اگلی صفوں میں ہوتے ہیں جنھیں "عباد الرحمٰن" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

یقیناً وہ خدا کے خاص بندے ہوتے ہیں جس طرح خدا کی عمومی رحمت تمام بندگانِ خدا کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتی ہے خدا کے ان خاص بندوں کی مہربانی اور رحمدلی ایک لحاظ سے عمومی ہوتی ہے، ان کا علم و فکر، بیان و قلم، مال و قدرت ہمیشہ خلقِ خدا کی ہدایت کے کام آتی ہے۔

وہ انسانی معاشرے کے لیے اسوہ اور نمونۂ عمل ہوتے ہیں۔

وہ پرہیزگاروں کے سرخیل شمار ہوتے ہیں۔

وہ سمندروں اور صحراؤں میں چراغ کی مانند ہوتے ہیں جن سے بھٹکی ہوئی انسانیت ہدایت پا جاتی ہے اور گردابِ بلا میں پھنس جانے والے چھٹکارا حاصل کر جاتے ہیں۔

متعدد روایات میں ہے کہ یہ آیت حضرت علی اور اہلبیت اطہار علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اس آیت سے مراد ہم ہیں[1]

اس میں شک نہیں کہ آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام اس آیت کے روشن مصداق ہیں اور یہ مصداق آیت کے مفہوم کی اس وسعت میں مانع نہیں ہے کہ دوسرے مومن بھی مختلف مراتب کے تحت دوسرے لوگوں کے پیشوا ہوں۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ استفادہ کیا ہے کہ معنوی، روحانی اور خدائی رہبری اور پیشوائی کی درخواست نہ صرف مذموم نہیں بلکہ ممدوح اور پسندیدہ بھی ہے[2]

---

[1] ان روایات کو علی بن ابراہیم اور صاحب "نور الثقلین" نے اپنی اپنی تفسیروں میں اسی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی اور تفسیر فخر رازی۔

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ لفظ "امام" اگرچہ مفرد ہے لیکن بعض اوقات جمع کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور اس آیت میں بھی ایسا ہی ہے۔

ان تیرہ صفات کو مکمل کرنے کے بعد اللہ کے ان خاص بندوں کی مجموعی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصر لفظوں میں ان کا اجر بیان فرمایا گیا ہے: یہی وہ لوگ ہیں جنھیں صبر و استقامت کے بدلے میں بہشت کے بلند درجات جزا کے طور پر دیئے جائیں گے (اولئك يجزون الغرفة بما صبروا)۔

"غرفة" "غرف" (بروزن "حرف") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ کسی چیز کا اٹھانا اور حاصل کرنا ہوتا ہے اور غرفۃ اس چیز کو کہتے ہیں جسے اٹھائیں اور حاصل کریں (جیسے انسان پینے کے لیے چشمہ سے پانی حاصل کرتا ہے) بعد ازاں اس کا اطلاق عمارت کے بالائی حصے پر ہونے لگا اور اس آیت میں بہشت بریں کے بلند و بالا درجات کے لیے کنایہ ہے۔

چونکہ "عباد الرحمٰن" دنیا میں ان صفات کے حامل ہونے کی بنا پر مومنین کی اگلی صفوں میں اور ان کے پیش پیش ہوتے ہیں لہٰذا آخرت میں بھی بہشت میں ان کے درجات دیگر مومنین سے بلند و بالا ہونے چاہئیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ انھیں یہ بلند درجات اس لیے عطا ہوں گے کہ وہ راہِ خدا میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ آیا صفت مذکورہ تیرہ صفات کے علاوہ ہے؟ لیکن حقیقت میں یہ کوئی نئی صفت نہیں بلکہ مذکورہ صفات کے نفاذ اور اجراء کی محافظ ہے آیا خدا کی بندگی، خواہشاتِ نفس سے نبرد آزمائی، جھوٹی شہادت کے نزدیک نہ جانا، تواضع اور فروتنی کو اپنانا اور اس قسم کی دیگر صفات، صبر اور استقامت کے بغیر امکان پذیر ہیں؟

جب ہم یہاں پر پہنچتے ہیں تو ہمیں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا یہ مشہور فرمان یاد آجاتا ہے کہ:

الصبر من الايمان كالرأس من الجسد

صبر و استقامت کو ایمان میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو سر کو بدن میں ہوتا ہے۔

بدن کی بقا سر کی بقا پر منحصر ہے کیونکہ تمام اعضائے انسانی کا مرکزی نقطہ اس کا مغز ہوتا ہے جو سر میں واقع ہے۔

بنا بریں یہاں پر صبر کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔

مشکلات کے مقابلے میں استقامت اور شکیبائی،

پروردگارِ عالم کی اطاعت کی راہ،

سرکش اور منہ زور ہوا و ہوس اور خواہشاتِ نفسانی کے ساتھ جہاد اور نبرد آزمائی،

گناہ کے اسباب و عوامل کے سامنے ڈٹ جانا،

غرض اس قسم کے تمام امور اس میں جمع ہیں۔

اگر بعض روایات میں صبر کا اطلاق صرف فقر و فاقہ پر ہوا ہے اور مالی محرومی سے اس کی تفسیر کی گئی ہے تو یقیناً اس کا ایک یہ مصداق بیان ہوا ہے۔

پھر اضافہ فرمایا گیا ہے: بہشت کے ان بلند مقامات پر انھیں تحیہ اور سلام پیش کیا جائیگا (ويلقون فيها تحية وسلاماً)۔

اہل بہشت، وہاں پر ایک دوسرے کو سلام اور تحیہ پیش کریں گے اور فرشتے بھی ان کا سلام و تحیہ سے استقبال کریں گے اور ان سب سے بڑھ کر خود خدا انھیں سلام اور تحیہ کہے گا۔ جیسا کہ سورۂ یٰسٓ کی آیت ۵۸ میں ہے:

سلام قولًا من رب رحیم

ان کے لیے ان کے رحیم پروردگار کی طرف سے سلام ہے۔

سورۂ رعد کی آیت ۲۳، ۲۴ میں ہے:

والملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب سلام علیکم

فرشتے ان کے پاس ہر در سے داخل ہوں گے اور انھیں "سلام علیکم" کہیں گے۔

آیا اس مقام پر "تحیت" اور "سلام" کا ایک معنٰی ہے یا مختلف معانی؟ مفسرین نے اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے لیکن اگر ان میں ذرا سی توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ "تحیت" کسی کو زندگی کی دعا دینے کے معنٰی میں ہوتا ہے اور "سلام" کسی کو سلامتی کی دعا دینے کے معنٰی میں ہوتا ہے۔ بنابریں اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ پہلا لفظ "تحیت" زندگی کی دعا کے عنوان سے ہے اور دوسرا لفظ "سلام" زندگی کے ساتھ سلامتی کے لیے ہے ہر چند کہ یہ دونوں کبھی ایک معنٰی میں بھی آتے ہیں۔

البتہ عرف میں "تحیت" نے زیادہ وسیع معنٰی پیدا کر لیا ہے اور وہ ہے ہر ایسی گفتگو جو کسی جگہ پر کسی کے داخل ہوتے ہی خوشی، احترام اور اس کے اظہارِ محبت کے طور پر کی جاتی ہے۔

پھر اس بات کی مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: وہ بہشت میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ کیا ہی خوب ٹھکانا اور کیسی ہی بہترین اقامت گاہ ہے (خالدین فیھا حسنت مستقرًا و مقامًا)۔

۷۷۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ۝

ترجمہ

۷۷۔ کہہ دو! اگر تمھاری دعا نہ ہوتی تو میرا پروردگار تمھیں کوئی اہمیت نہ دیتا۔ تم نے (خدا اور انبیاء کی) تکذیب کی اور یہ (تکذیب) تمھارا دامن پکڑے گی اور تمھیں ہرگز نہ چھوڑے گی۔

تفسیر

دُعا کی اہمیّت

یہ آیت سورۂ فرقان کی آخری آیت ہے جو درحقیقت تمام سورت کا خلاصہ اور نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی "عباد رحمٰن" کی صفات کا خلاصہ بھی ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دے کہ میرا پروردگار تمھیں کوئی وزن اور اہمیت نہ دیتا اگر تم دعا نہیں کرتے (قل مایعبؤا بکم ربی لولا دعاؤکم)۔

"یعبؤا" کا صیغہ "عبأ" (بر وزن "عبد") سے مشتق ہے جس کا معنٰی وزن اور بوجھ ہے بنابریں "لا یعبؤا" کا معنٰی بنے گا "کسی قسم کا وزن نہیں دیتا" جسے دوسرے لفظوں میں کہیں گے "پرواہ نہیں کرتا، اہمیت نہیں دیتا"۔ اگرچہ دعا کے معنٰی کے سلسلے میں یہاں پر بہت سے احتمالات پائے جاتے ہیں لیکن ان کی بنیاد ایک ہی بنتی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ دعا کا معنٰی وہی مشہور دُعا ہے جو مانگی جاتی ہے بعض نے اسے ایمان کے معنٰی میں لیا ہے اور بعض نے عبادت، بعض نے توحید، بعض نے شکر اور بعض نے مشکلات میں خدا کو پکارنے کے معنٰی میں لیا ہے لیکن ان سب کی بنیاد وہی خدا پر ایمان اور اس کی طرف توجہ ہے۔

بنابریں آیت کا مفہوم کچھ یوں ہوگا کہ جو چیز تمھیں وزن دے رہی ہے اور اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں تمھاری قدر و قیمت بنا رہی ہے وہ خدا پر ایمان، اس کی ذات کی طرف توجہ اور اس کی بندگی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تم نے خدا کی آیات اور اس کے پیغمبروں کی تکذیب کی یہی تکذیب تمھارا دامن پکڑے گی اور تمھیں کبھی نہیں چھوڑے گی (فقد کذبتم فسوف یکون لزامًا)۔

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ اس آیت کے آغاز اور اختتام میں تضاد پایا جاتا ہے یا کم از کم ابتداء اور انتہا میں کوئی باہم رابطہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ تم گزشتہ زمانے میں آیاتِ الٰہی کی تکذیب کر چکے ہو اور انبیاء کو جھٹلا چکے ہو۔ اگر اب تم خدا کی طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے اور ایمان اور بندگی کا راستہ اختیار نہیں کرو گے تو خدا کے

نزدیک تمھاری کوئی وقعت اور حیثیت نہیں ہوگی اور تمھارے جھٹلانے کی سزا تمھیں دامن گیر ہوگی [1]

ان واضح شواہد میں سے ایک شاہد جو اس تفسیر کی تائید کر رہا ہے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے کہ جب آنجنابؑ سے سوال کیا گیا کہ :

کثرۃ القرائۃ افضل او کثرۃ الدعاء

قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت افضل ہے یا کثرت سے دعا مانگنا ؟

تو آپؑ نے ارشاد فرمایا :

کثرۃ الدعاء افضل

کثرت سے دعا مانگنا فضیلت زیادہ رکھتا ہے ۔

پھر آپؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی [2]

ایک نکتہ

دعا، خودسازی اور خداشناسی کا راستہ

ہر کوئی جانتا ہے کہ مسئلہ دعا کو قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کا ایک نمونہ یہی مندرجہ بالا آیت ہے ۔ ہوسکتا ہے ابتداء میں یہ بات بعض لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو اور وہ کہیں کہ دعا کرنا تو آسان سی بات ہے اور اسے ہر شخص

---

[1] مندرجہ بالا آیت ان آیات میں شمار ہوتی ہے جن کے بارے میں مفسرین نے بہت کچھ گفتگو کی ہے اور ہم نے جو تفسیر اوپر بیان کی ہے وہ واضح ترین تفسیر ہے لیکن کچھ دوسرے مشہور مفسرین نے اس کی اور بھی تفسیریں بیان کی ہیں جن کا خلاصہ کچھ اس طرح بنتا ہے :۔

خدا کو تمھاری کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ تم نے اس کی آیات کو جھٹلایا ہے مگر یہ کہ وہ انھیں ایمان کی طرف بلاتا ہے (اس تفسیر کے مطابق مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور اس کا فاعل ایک ضمیر ہے جو "ربی" کی طرف لوٹ رہی ہے لیکن جس تفسیر کو ہم نے منتخب کیا ہے اس کے مطابق مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور مصدر کو سہل کی ضمیر کی طرف بظاہر مضاف کیا جاتا ہے مگر یہ کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ پایا جائے ۔)

یہاں پر ایک تیسری تفسیر بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ تم بنی نوعِ انسان نے غالب طور پر تکذیب کا راستہ اختیار کر رکھا ہے لہٰذا خدا کے نزدیک تمھاری کوئی قدر و قیمت نہیں ہے سوائے عباد الرحمٰن کی ایک مخصوص اقلیت کے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں اور اسے خلوصِ دل سے پکارتے ہیں (اگرچہ یہ تفسیر معنی اور مطلب کے لحاظ سے تو صحیح ہے لیکن آیت کے ظاہر کے ساتھ قطعاً ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ "دعاؤکم و کذبتم" میں ضمیر ظاہراً ایک گروہ کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ دو گروہوں کی طرف ۔ غور کیجیے گا)

[2] "تفسیر صافی" اسی آیت کے ذیل میں ۔ اس روایت کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دوسری تفسیروں نے بھی نقل کیا ہے اس کے علاوہ اور روایات بھی ملتی ہیں جن میں سے بعض کو شیخ نے امالی میں اور بعض کو علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے ۔

انجام دے سکتا ہے یا اس سے بھی آگے بڑھ جائیں اور کہیں کہ دعا تو بے بس اور بیکار لوگوں کا کام ہے اس کی کیا اہمیت ہے ۔

لیکن یہ غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دعا کو اس کی شرائط سے ہٹ کر دیکھیں لیکن اگر اس کی شرائط کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ دعا انسان کی خودسازی کا ایک مؤثر ذریعہ اور انسان اور خدا کے درمیان ایک مضبوط رابطہ ہے ۔

سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ انسان جس کو پکار رہا ہے اور جس سے دعا مانگ رہا ہے اس کی معرفت رکھتا ہو ۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک صاف کرے اور اس سے مانگنے کے لیے اپنی روح کو آمادہ کرے کیونکہ جب انسان کسی کو ملنے جاتا ہے تو اس کی ملاقات کے لیے تیار بھی ہونا چاہیے ۔

دعا کی تیسری شرط یہ ہے کہ انسان جس سے مانگ رہا ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے کیونکہ اس کے بغیر دعا کی قبولیت کے آثار بہت کم نظر آتے ہیں ۔

دعا کی قبولیت کی چوتھی اور آخری شرط یہ ہے کہ اس کام کے لیے انسان اپنی تمام توانائیاں صرف کر دے اور اس کے لیے تاحدِ امکان سعی و کوشش کرے اور اس کے ماوراء کے لیے ہاتھوں کو دعا کے واسطے اٹھائے اور اپنی تمام قلبی توجہ اپنے خالق کی طرف مبذول کر دے ۔

اسلامی روایات میں بڑی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ جو کام انسان خود انجام دے سکتا ہے اسے انجام دینے میں کوتاہی کرے اور دعا کے ذریعے اسے پورا ہونے کی خواہش کرے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوگی ۔

اس لحاظ سے دعا، خداوندِ عالم کی معرفت اور اس کی صفات جلال و جمال کی پہچان کا ایک ذریعہ ہے اسی طرح گناہوں سے توبہ اور روح کی پاکیزگی کا بھی ایک ذریعہ ہے اور نیکیوں کی بجا آوری کے لیے ایک اہم اور مؤثر عامل ہے اور آخری حد تک تلاش و کوشش اور جدوجہد کا ایک سبب ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ دعا کے بارے میں ایسی اہم تعبیرات وارد ہوئی ہیں جو مندرجہ بالا تصریحات کو مدِنظر رکھ کر ہی سمجھ میں آسکتی ہیں مثلاً حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

الدعاء سلاح المؤمن، وعمود الدین، و نور السمٰوٰت والارض

دعا مومن کا ہتھیار، دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے [1]

ایک اور مقام پر حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں :

الدعاء مفاتیح النجاح، و مقالید الفلاح و خیر الدعاء ما صدر عن صدر نقی و قلب تقی

دعا کامیابیوں کی دلیل ہے، فلاح اور کامرانیوں کی چابی ہے اور بہترین دعا وہ ہے جو پاک سینے

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ابواب الدعا (باب ان الدعاء سلاح المؤمن)۔

اور پرہیزگار دل سے بلند ہو[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

الدعاء انفذ من السنان

دعا نوکِ نیزہ سے بھی زیادہ تیز ہے[2]

ان سب باتوں سے ہٹ کر اصولی طور پر ہر انسان کی زندگی میں حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے اسے ناامیدی کی گہرائیوں میں لے جاتے ہیں لیکن یہ دعا ہی ہے جو اس کی کامیابی کی امید کا دریچہ کھول سکتی ہے اور ناامیدی اور مایوسی سے نبرد آزمائی کا موثر ذریعہ بن سکتی ہے ۔

اسی وجہ سے سخت ترین اور طاقت فرسا حوادث کے درمیان دعا ہی انسان کی ڈھارس بندھا سکتی ہے اور اسے قلبی تسکین مہیا کر سکتی ہے اور نفسیاتی اعتبار سے ناقابلِ تردید اثر رکھتی ہے ۔

مسئلہ دعا، اس کے فلسفہ، اس کی شرائط اور نتائج کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کی ہے مزید تشریح اور وضاحت کے لیے وہاں رجوع فرمائیں ۔

پروردگارا ! ہمیں اپنے خاص بندوں میں سے قرار دے اور توفیق عنایت فرما کہ ہم "عباد الرحمٰن" کی صفات کو اپنا سکیں ۔

خداوندا ! دعا کے دروازے ہم پر کھول دے اور اسے ہمارے وجود کی قدر و قیمت کا سبب بنا دے ۔

خدایا ! ہمیں ایسی دعا کی توفیق عطا فرما جو تیری پاک ذات کو مطلوب ہے اور اس کی قبولیت سے ہمیں محروم نہ فرما ۔

انك على كل شيء قدير ، و بالاجابة جدير .

سورۂ فرقان کی تفسیر اختتام کو پہنچی

۲۰ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ

---

[1]، [2] اصولِ کافی جلد ۲ ، ابواب الدعاء (باب ان الدعاء سلاح المؤمن) ۔

سورۂ شعراء

مکہ میں نازل ہوئی (آخری چار آیتوں کے سوا)

اس کی ۲۲۷ آیتیں ہیں

سُورۂ شعراء کے مندرجات

مفسرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ سُورۂ شعراء کی آخری چار آیات کے علاوہ باقی تمام سورت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی کل ۲۲۷ آیتیں ہیں [۱]

اس سورت کا اندازِ گفتگو مکمل طور پر دوسری مکّی سورتوں سے ہم آہنگ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکّی سورتیں آغازِ اسلام میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کے مندرجات میں بیشتر اصولِ عقائد، توحید، معاد اور انبیاءِ خدا کی دعوت اور قرآن کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے سورہ شعراء کی تمام گفتگو بھی انھی مسائل پر مشتمل ہے۔

درحقیقت اس سورۃ کی تمام مباحث کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ، سورت کا مطلع ہے جس کا حروفِ مقطعات سے آغاز ہوتا ہے اس میں قرآن کی عظمت کا بیان ہوتا ہے اور پھر مشرکین کے سامنے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی استقامت کی بناء پر آپؐ کو تسلّی دی جا رہی ہے اس کے بعد توحید کی کچھ نشانیوں اور خدا کی کچھ صفات کے بارے میں گفتگو ہے۔

دوسرے حصے میں سات عظیم انبیاء کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات، اپنی قوم کے ساتھ ان کی نبرد آزمائی، مشرک لوگوں کی کج بحثی اور انبیاء علیہم السّلام کے مقابلے میں ان کی بے تکی باتوں کا تذکرہ شامل ہے۔ جن میں سے کچھ کا تذکرہ زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے جیسے موسیٰؑ کی داستان ہے اور کچھ کا تذکرہ نہایت مختصر ہے جیسے حضرت ابراہیم، حضرت ہود، حضرت نوح، حضرت صالح حضرت لوط اور شعیب علیہم السلام کے حالات ہیں۔

اس حصے میں خاص طور پر ان مشرکین کی کمزور اور تعصب آمیز منطق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا سلسلہ ہر نبی کے دور میں چلتا رہا ہے جس کا زیادہ تر حصہ حضرت رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے دور کے مشرکین کی منطق سے ملتا جلتا ہے جو درحقیقت ابتدائی دور کے تھوڑے سے مسلمانوں کے لیے باعثِ تسلّی ہے کہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ اس قسم کے افراد اور اس طرح کی بودی منطق سے بھری پڑی ہے لہٰذا وہ اپنے عزائم میں کمزوری کو ہرگز پیدا نہ ہونے دیں۔

مذکورہ اقوام پر نازل ہونے والے عذاب کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور ان پر جو وحشت ناک بلائیں نازل ہوئی ہیں، ان کو بھی خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے جو اس دور کے دشمنانِ رسول کے لیے ایک مؤثر تنبیہ ہے۔

تیسرے حصے میں درحقیقت گزشتہ دونوں حصّوں میں بیان شدہ مطالب کو نتیجہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی دعوت اسلامی کیسی ہے؟ قرآن کس قدر عظیم ہے؟ مشرکین نے آپؐ کی کیونکر تکذیب کی؟ دعوتِ اسلامی کے

[۱] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، تفسیر قرطبی اور تفسیر تبیان، تفسیر روح المعانی نے پانچ آیات کا استثناء کیا ہے لیکن علامہ طباطبائی جیسے مفسرین نے ان آیات کے استثناء کو قبول نہیں کیا۔ انشاء اللہ ہم انھی آیات کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

سلسلے میں رسولِ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو کیسے احکام ملے اور مومنین سے کس طرح ملا جاتا ہے اور آخر میں صالح مومنین کو خوشخبری اور ظالم اور ستمگر لوگوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے اور اسی پر سُورہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس سورت کا نام اسی کی آخری چند آیات سے لیا گیا جن میں بے مقصد شعراء کے بارے میں گفتگو کی گئی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ سورہ آیات کے لحاظ سے سُورۂ بقرہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے اگرچہ کلمات کی تعداد کے لحاظ سے ایسا نہیں ہے بلکہ بہت سی سورتوں سے چھوٹی ہے۔

سُورۂ شعراء کی فضیلت

اس سورت کی اہمیت کے بارے میں پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

من قرء سورة شعراء كان له من الاجر عشر حسنات بعدد كل من صدق بنوح و كذب به و هود و شعيب و صالح و ابراهيم و بعدد كل من كذب بعيسى و صدق بمحمد صلى الله عليه و آله وسلم

جو شخص سُورہ شعراء کو پڑھے اسے نوح (علیہ السّلام) کی تصدیق اور تکذیب کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں ملیں گی اسی طرح ہود، شعیب، صالح اور ابراہیم (علیہم السلام) کی تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں ملیں گی اور جتنی تعداد نے عیسیٰ (علیہ السلام) کی تکذیب اور محمد (مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) کی تصدیق کی [۱] کے برابر نیکیاں ملیں گی۔

یہ تو صاف سی بات ہے کہ اتنا بڑا اجر اور ثواب فکر و عمل سے خالی تلاوت کا نہیں ہو گا بلکہ سورتوں کے فضائل پر مشتمل روایات کے قرائن بتاتے ہیں کہ اس سے ایسی تلاوت مراد ہے جو ایسے غور و فکر کا مقدمہ بنے جو ارادے اور عمل تک لے جائے سابقہ سورتوں کے فضائل کے سلسلے میں اس بات کو کئی مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔

اتفاق سے مندرجہ بالا حدیث کی تعبیر بھی ہمارے اس مدعا کی موید ہے کیونکہ انبیاء کی تصدیق کرنے اور تکذیب کرنے والوں کی تعداد کے مطابق ثواب اور حسنات کا استحقاق اس لیے ہے تاکہ انسان ان لوگوں کی صف میں آ جائے جنھوں نے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی اور ان لوگوں سے دوری اختیار کرے جنھوں نے تکذیب کی۔

[۱] مجمع البیان، سُورۂ شعراء کا آغاز۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ طٰسٓمّٓ ○

۲۔ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ○

۳۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا یَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ○

۴۔ اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ
لَهَا خٰضِعِیۡنَ ○

۵۔ وَ مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا كَانُوۡا
عَنۡهُ مُعۡرِضِیۡنَ ○

۶۔ فَقَدۡ كَذَّبُوۡا فَسَیَاۡتِیۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا بِهٖ
یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے ۔

۱۔ طٰسم

۲۔ یہ کتابِ مبین کی آیتیں ہیں ۔

۳۔ شاید اس غم میں تو اپنے آپ کو مار ڈالے گا کہ وہ ایمان نہیں لاتے ۔

۴۔ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسماں سے آیت نازل کر دیں جس کے سامنے ان کی گردنیں جھک جائیں ۔

۵۔ جو بھی نیا ذکر ان کے پاس، ان کے ربّ کی طرف سے آتا ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں ۔

۶۔ انھوں نے جھٹلایا لیکن بہت جلد اس چیز کی خبر بھی انھیں مل جائے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں (اس کی سزا پالیں گے) ۔

تفسیر

وہ ہر نئی چیز سے خوف کھاتے ہیں

ہم ایک دفعہ پھر قرآن کے ایک اور قسم کے حروفِ مقطعات کو ملاحظہ کر رہے ہیں وہ ہیں (طٰسم) ۔

اس قسم کے حروفِ مقطعات کی تفسیر میں ہم سورۂ بقرہ ، سورۂ آلِ عمران اور سورۂ اعراف کے آغاز میں بالتفصیل اور جداگانہ گفتگو کر چکے ہیں جسے یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں ہے ۔

یہاں پر جس چیز کا اضافہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ "طٰسم" کے بارے میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؑ کے اصحاب سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب یہ بتا رہی ہیں کہ یہ خداوند تبارک و تعالیٰ یا قرآن مجید کے اسماء یا مقدس مقامات یا بہشت کے درخت وغیرہ کے ناموں کی علامتیں ہیں ۔

یہ روایات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں جو ہم نے تفسیرِ نمونہ کی چھٹی جلد میں سورۂ اعراف کے آغاز میں درج کی ہے اور اس تفسیر کے منافی بھی نہیں ہیں جو سورۂ بقرہ کے آغاز میں ذکر کی گئی ہے کہ ان حروف سے مراد قرآن کی عظمت اور اس کا اعجاز ہے کہ اس قدر عظیم کتاب اس قدر سادہ اور چھوٹے سے حروف سے مرکب ہے ۔

بعد والی آیت قرآنِ پاک کی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے : یہ کتابِ مبین کی آیتیں ہیں (تلك اٰیات الکتٰب المبین) ۔

البتہ ادبیاتِ عرب کی رُو سے " تلك " کا اشارہ دُور کے لیے آتا ہے جس کا معنیٰ "وہ" ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ کلامِ عرب اور بعض اوقات فارسی زبان میں بھی کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے دور کے اسمِ اشارہ سے استفادہ کرتے ہیں یعنی موضوع اس قدر اہم اور بلند مرتبہ ہے گویا ہماری دسترس سے باہر اور آسمان کی بلندیوں پر واقع ہے ۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہی آیت بعینہٖ اسی صورت میں سورۂ یوسف اور سورۂ قصص کے آغاز میں بھی آ چکی ہے اور ہر جگہ حروفِ مقطعات کے بعد آئی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان حروف کا قرآن کی عظمت کے ساتھ گہرا ربط ہے ۔

" قرآن" کی توصیف "مبین" کے ساتھ کی گئی ہے "مبین" "بیان" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے "روشن" اور یہ قرآن کی عظمت اور اعجاز کے واضح اور آشکار ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جتنا اس کے مطالب میں غور و فکر کرے گا اتنا ہی قرآن کے معجزہ ہونے سے آشنا ہوتا جائے گا ۔

اس کے علاوہ قرآن مجید "حق" اور "باطل" میں تمیز کرنے والا اور سعادت، کامیابی اور نجات کے رستے کو گمراہی کے رستے سے جدا کرنے والا بھی ہے ۔

اس کے بعد رسولِ پاکؐ کی دلجوئی اور تسلّی کے لیے قرآن فرماتا ہے: گویا تو شدتِ غم کی وجہ سے جان دے دے گا کہ وہ ایمان نہیں لاتے (لعلك باخع نفسك ان لا یکونوا مؤمنین) ۔

"باخع" کا صیغہ "بخع" (بروزن "بخش") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے شدتِ غم کی وجہ سے اپنے آپ کو مار ڈالنا۔

اس بات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس حد تک لوگوں کے لیے دلسوز ہیں اور اپنی رسالت کے فریضے کی ادائیگی کے لیے کس قدر کوشاں ہیں؟ جب آپؐ دیکھتے تھے کہ وہ قرآن اور اسلام جیسے چشمۂ آبِ زلال کے کنارے پر پیاسے کھڑے ہوئے ہیں اور اس سے اپنی پیاس نہیں بجھاتے تو اس سے آپؐ کو کتنا دکھ ہوتا تھا؟

وہ اس بات سے مغموم تھے کہ قرآن و اسلام جیسے روشن چراغ کی موجودگی میں صاحبانِ عقل کیوں بے راہ روی کا شکار ہیں اور کیوں گمراہی کی گہرائیوں میں گر کر اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔

ویسے تو تمام انبیاء الٰہی اسی طرح غم خوار، ہمدرد اور دلسوز تھے لیکن اسلام کے عظیم پیغمبرؐ تو ایسے واقعات پر بہت ہی غمگین تھے۔ چنانچہ آپؐ کے بارے میں کئی مقامات پر قرآن میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت کے نزول کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار اہلِ مکہ کو دعوتِ اسلام دی لیکن انھوں نے آپؐ کی ایک نہ سنی اور ایمان نہیں لائے تو ایک مرتبہ آپؐ اس قدر غمگین اور پریشان ہو گئے کہ اس کے آثار آپؐ کے چہرہ مبارک پر ظاہر ہو گئے چنانچہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے آپؐ کو تسلی دی اور آپؐ کی دلجوئی کی [1]

بعد والی آیت اس حقیقت کے ثابت کرنے کے لیے کہ خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے حتیٰ کہ وہ مجبور کر کے بھی لوگوں کو ایمان لانے پر آمادہ کر سکتا ہے فرمایا گیا ہے، اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی آیت نازل کر دیں جس کی وجہ سے ان کی گردنیں جھک جائیں (ان نشأ ننزل علیهم من السماء آیة فظلت اعناقهم لها خاضعین)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ ان پر ایسا خیرہ کر دینے والا معجزہ یا زبردست اور وحشت ناک عذاب نازل کر دیں کہ سب کے سب بے ساختہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ایمان لے آئیں لیکن اس طرح کے ایمان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کو اہمیت حاصل ہے کہ وہ شعوری طور پر سوچ سمجھ کر اپنے ارادے اور اختیار سے ایمان لے آئیں اور حق کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں۔

اس بات کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ گردنوں کے جھکنے سے مراد گردن والوں کا جھکنا ہوتا ہے کیونکہ فارسی میں "گردن"، عربی میں "رقبہ" اور "عنق" کا اطلاق انسان کے ایک اہم ترین عضو پر ہوتا ہے جو کنایہ کی صورت میں خود انسان پر بھی بولا جاتا ہے جیسے باغی اور سرکش انسان کو فارسی میں "گردن کش" جابر ظالم انسان کو "گردن کلفت" اور کمزور شخص کو "گردن شکستہ" کہتے ہیں۔

البتہ اس مقام پر "اعناق" کی تفسیر میں اور بھی کئی احتمال پیدا ہوتے ہیں جو سب کے سب ضعیف ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "اعناق" کا معنی یا تو "سربراہ اور روساء" ہے اور یا لوگوں کا ایک گروہ ہے۔

آگے چل کر قرآن مجید کے مقابلے میں کفار اور مشرکین کے ردِ عمل کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: جو بھی نیا ذکر خداوند رحمان کی طرف سے ان کے پاس آتا ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں (وما یأتیهم من ذکر من الرحمان محدث الا کانوا

---

[1] تفسیر ابو الفتوح رازی جلد ۸، اسی آیت کے ذیل میں۔

عنه معرضین)۔

قرآن کو "ذکر" سے تعبیر کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مقدس کتاب اپنی تمام آیات اور سورتوں کے ساتھ بیدار اور آگاہ کرنے والی ہے لیکن یہ گروہ بیداری اور آگاہی سے دُور بھاگتا ہے۔

"رحمان" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیات اس خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں جس کی رحمت عام ہے اور کسی استثناء کے بغیر وہ تمام بنی نوعِ انسان کو سعادت اور کمال کی طرف دعوت دیتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسانوں کی شکر گزاری کی حس بیدار کرنے کے لیے ہو کہ یہ آیات اس خدا کی طرف سے آئی ہیں جس کی نعمتیں تمھیں سر سے پاؤں تک ڈھانپے ہوئے ہیں تم کیوں اپنے ولی نعمت سے منہ موڑ رہے ہو۔ اگر وہ تمھیں عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا تو یہ بھی اس کی رحمت کے باعث ہے۔

"محدث" (نیا تازہ) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیات ایک دوسرے کے بعد نازل ہوتی رہتی ہیں اور ہر ایک کا کوئی نہ کوئی نیا مضمون ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ ان نئے حقائق سے موافقت نہیں کرتے گویا وہ اپنے بڑوں کی خرافات پر ڈٹے ہوئے ہیں اور جہالت، گمراہی اور خرافات کو الوداع کہنے پر کسی قیمت پر راضی نہیں۔ اصولاً ہوتا بھی یہی ہے کہ نئی بات خواہ کتنی ہی ہدایت کی موجب کیوں نہ ہو بے سمجھ، متعصب اور ہٹ دھرم لوگ اس کی مخالفت ہی کرتے ہیں۔

سورۂ مومنون کی آیت ۶۸ میں ہے:

افلم یدبروا القول ام جاءهم ما لم یأت اٰباءهم الاولین

آیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا یہ کہ آیات نئی ہیں جو ان کے بزرگوں کے پاس کبھی نہیں آئیں (اور نئی بات کہہ کر اس کے مقابلے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں)۔

قرآن آگے چل کر فرماتا ہے کہ وہ فقط روگردانی پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ "تکذیب" اور اس سے بڑھ کر "استہزاء" کی حد تک جا پہنچتے ہیں ارشاد ہوتا ہے: انھوں نے تکذیب کی ہے لیکن جو وہ استہزاء کرتے ہیں بہت جلد اس کی خبریں ان کے پاس آجائیں گی اور وہ اپنے کاموں کی دردناک جزا سے باخبر ہو جائیں گے (فقد کذبوا فسیأتیهم انباء ما کانوا به یستهزءون)۔

"انباء"، "نبأ" کی جمع ہے جس کا معنی اہم خبر ہے یہاں پر ایسی سخت سزا مراد ہے جو انھیں اس دنیا میں اور آئندہ جہان میں ملے گی اگرچہ بعض مفسرین مثلاً شیخ طوسی نے اپنی تفسیر تبیان میں اس سزا کو آخرت کی سزا میں منحصر کیا ہے لیکن زیادہ تر مفسرین اسے مطلق سزا سمجھتے ہیں جس میں دونوں شامل ہیں۔

درحقیقت ہے بھی ایسا ہی کیونکہ آیت میں اطلاق ہے اس کے علاوہ کفر اور آیاتِ الٰہی کے انکار کا انسان کی تمام زندگی میں عظیم اور وحشت ناک ردِ عمل ہوتا ہے لہٰذا اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان انحراف اور گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو دن بدن اس کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے اور وہ روز بروز حق و حقیقت سے دور ہوتا جاتا ہے۔

پہلے تو حق سے بے پروائی اور روگردانی کا مرحلہ آتا ہے، پھر تکذیب اور انکار کی نوبت آتی ہے آخر میں حق کے مذاق اڑانے کا مرحلہ آجاتا ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان کو عذاب الٰہی گھیر لیتا ہے اس طرح سے وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے (اس طرح کی تعبیر سورۂ انعام کے آغاز میں آیت نمبر ۴ اور نمبر ۵ کی تفسیر میں بھی گزر چکی ہے)۔

چند ایک نکات

۱۔ ایمان آزادی کے ساتھ ہی سودمند ہوتا ہے

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک مشہور و معروف خطبہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے انبیاء کرام کو اس طرح مبعوث فرمایا ہے کہ لوگ ایمان لانے کے لیے آزاد ہو کر فیصلہ کریں، وگرنہ ان کا ایمان مجبوری کی وجہ سے ہوگا جس کا ہرگز کوئی فائدہ نہ ہوتا، ارشاد ہوتا ہے:

> انبیاء کو مبعوث کرتے وقت اگر خدا چاہتا تو خزانوں اور سونے کی کانوں کے منہ ان کے لیے کھول دیتا، سرسبز و شاداب باغات کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جاتے۔ اگر چاہتا تو آسمانی پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اور زمین کے وحشی جانوروں کے دل ان کے ہمراہ کر دیتا لیکن اس طرح سے ایک تو امتحان اور آزمائش کی بات ختم ہو جاتی اور دوسرے سزا اور جزا کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا۔[1]

کافی میں اسی آیت کے ضمن میں یوں درج ہے:

> اگر خدا چاہتا تو آسمان سے کوئی نشانی نازل کر دیتا جس کی وجہ سے ان کی گردنیں جھک جاتیں لیکن اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کی آزمائش اور امتحان کا تصور بالکل ختم ہو کر رہ جاتا۔[2]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ کتاب ارشاد از شیخ مفید، روضۃ الکافی، کمال الدین شیخ صدوق'' اور تفسیر قمی جیسی مشہور و معروف کتابوں میں درج ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیت" ان نشأ ننزل .... کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے:[3]

> اس سے مراد بنی اُمیہ کے سرکش لوگ ہیں جب وہ امام مہدی آخر الزماں کے ظہور کے وقت آسمانی نشانیاں ملاحظہ کریں گے تو مجبوراً سر تسلیم خم کر دیں گے۔[3]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ (نمبر ۱۹۲)۔

[2] تفسیر نور الثقلین اسی آیت کے ذیل میں بحوالہ کافی۔

[3] تفسیر المیزان اور تفسیر نور الثقلین، انھی آیات کے ضمن میں۔

واضح ہے کہ اس طرح کی روایت سے مراد آیت کے وسیع مفہوم کی وجہ سے اس کے کسی نہ کسی مصداق کا بیان ہوتا ہے کہ آخر کار عالمی حکومت کے سربراہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت ظلم و جور پر مبنی ان تمام حکومتوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو بنی امیہ کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے، حضرت امام مہدیؑ کی طاقت اور انھیں حاصل تائید ایزدی کی وجہ سے مجبوراً ان کے آگے سر تسلیم خم کریں گے۔

۲۔ کلام اللہ حادث ہے یا قدیم: ہم جانتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں" کلام اللہ" کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں لمبی چوڑی بحث عرصہ دراز تک چلتی رہی اور اس کی صدائے بازگشت کتب تفاسیر میں بھی سنائی دینے لگی اور کئی ایک مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں موجود لفظ" محدث" کے ذریعے اس کے حادث ہونے پر استدلال قائم کیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس بحث کی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے بنی امیہ اور بنی عباس کے خودسر زمامداران حکومت نے اپنی مطلق العنان حکومتوں کو دوام بخشنے کے لیے اس قسم کی بحثوں کا ڈھونگ رچایا تھا تاکہ اس طرح سے وہ مسلمان لوگوں کے افکار کو اہم ترین اسلامی مسائل پر غور و خوض کرنے سے منحرف کر دیں اور لوگوں کو حکومت کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملے انھوں نے یہ مسائل چھیڑے ہی اس لیے تھے تاکہ علمائے اسلام ایسے مسائل میں الجھے رہیں اور ان کی خودسر اور مطلق العنان حکومت چار دن اور چل جائے۔

اگر" کلام الٰہی" سے مراد اس کے موضوع اور مطالب ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ ازل ہی سے علم الٰہی میں تھے اور خدا ان سب سے واقف تھا اس لحاظ سے قدیم ہے اور اگر اس سے مراد وحی کا نزول اور قرآن کے حروف اور کلمات ہیں تو مسلّم ہے کہ حادث ہیں۔ بنا بریں کلام الٰہی پہلی صورت میں قدیم اور دوسری صورت میں حادث ہے اور اس میں نہ تو کسی کو شک و شبہ ہے اور نہ ہی مقام بحث ہے۔

اسی لیے عالم اسلام خاص کر علماء اور دانشور طبقہ اس سے خبردار اور ہوشیار رہیں اور جابر و آمر حکمرانوں کے ذریعے چھیڑی جانے والی کج بحثیوں میں ہرگز نہ الجھیں۔

۷۔ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الۡاَرۡضِ كَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ ○

۸۔ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ○

۹۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ○ ع

ترجمہ

۷۔ آیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کس قدر کثیر مقدار میں اس میں مختلف قسم کی نباتات پیدا کی ہیں۔

۸۔ اس بات میں (خدا کے وجود پر) روشن نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ہرگز مومن نہیں۔

۹۔ تمھارا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

نباتات میں زوجیت

گزشتہ آیات میں تشریعی آیات یعنی قرآن مجید سے کفار کی روگردانی کا تذکرہ تھا ان آیات میں ان کے تکوینی آیات (کائنات میں موجود خدا کی نشانیوں) سے اعراض کا ذکر ہے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام سننے سے صرف کانوں ہی کو بند نہیں کر رکھا تھا بلکہ اپنے اطراف میں موجود حق کی نشانیوں کو دیکھنے سے بھی آنکھوں کو محروم رکھا ہوا تھا۔

فرمایا گیا ہے: کیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں اس میں مختلف قسم کی نباتات پیدا کی ہیں کہ جن میں نر بھی ہیں اور مادہ بھی، خوبصورت و زیبا بھی ہیں اور فائدہ مند بھی (اولم یروا الی الارض کم انبتنا فیھا من کل زوج کریم)[1]

---

[1] عموماً ایسا ہوتا ہے "رؤیت" کا مادہ "الیٰ" کے ساتھ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات دو مفعولوں کی طرف بھی متعدی ہوتا ہے اور اگر یہاں پر "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہوا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ یہ نگاہ کرنے کے معنیٰ میں ہے جو غور و فکر کے ساتھ دیکھنے کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں پر نباتات کے بارے میں لفظ "زوج" لایا گیا ہے اور یہی چیز غور طلب ہے اگرچہ اکثر مفسرین نے زوج کو نوع اور صنف کے معنیٰ میں لیا ہے اور ازواج کا معنیٰ انواع اور اصناف کیا ہے لیکن اگر ہم اسے اس کے مشہور معنیٰ میں لیں یعنی ہر چیز کا جوڑا جوڑا تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس سے عالم نباتات میں زوجیت اور جوڑا ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

گزشتہ زمانے میں لوگوں نے کم و بیش اس حد تک سمجھ رکھا تھا کہ نباتات کی بعض قسمیں نر اور مادہ پر مشتمل ہیں اور نباتات کو ثمرآور بنانے کے لیے تلقیح کے عمل سے استفادہ کرتے تھے اور کم از کم کھجور کے درخت کی حد تک تو یہ بات مسلم تھی۔

لیکن باقاعدہ طور پر سب سے پہلے سویڈن کا مشہور و معروف ماہر نباتات مسٹر "لینے" اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ نباتات کی دنیا میں تقریباً یہ ایک عام قانون ہے اور عام حیوانات کی طرح نباتات بھی نر اور مادہ کے نطفے کی آمیزش سے ثمرآور ہوتے ہیں اور ان کی نسل بڑھتی ہے۔

لیکن اس سائنس دان کی دریافت سے صدیوں پہلے قرآن نے مختلف آیات میں کئی مرتبہ نباتات کے جوڑا جوڑا ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے (زیر نظر آیات، سورہ رعد کی آیت ۴، سورۂ لقمان کی آیت ۱۰ اور سورہ ق کی آیت، اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں) اور یہ قرآن کا ایک علمی معجزہ ہے۔

"کریم" کا لفظ دراصل ہر قیمتی اور قابل قدر چیز کے معنیٰ میں آتا ہے جو کبھی تو انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی نباتات کے لیے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات "خط" کو بھی "کریم" کے لفظ کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کے بارے میں ملکہ سبا نے کہا تھا "انی القی الیّ کتاب کریم" (نمل / ۲۹)

کریم نباتات سے مراد مفید نباتات ہیں۔ اگرچہ تمام نباتات مفید ہیں اور یہ افادیت علم اور سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ مزید اجاگر ہوتی جائے گی۔

بعد والی آیت میں مزید تاکید اور بیشتر وضاحت کے طور پر قرآن فرماتا ہے: ان قیمتی نباتات کی تخلیق میں خدا کے وجود پر واضح نشانی موجود ہے (ان فی ذٰلک لاٰیۃ)۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے کہ یہ مٹی جو بظاہر ایک بے قیمت سی چیز ہے لیکن اگر اسے ایک مقررہ ترکیب حاصل ہو جائے تو یہ قدرتِ الٰہی کا ایک عظیم شاہکار بن جاتی ہے جس سے رنگا رنگ خوب صورت پودے، پھول، ثمرآور درخت اور مختلف خواص کے حامل انواع و اقسام کے میوے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

لیکن یہ دل کے اندھے اس قدر غافل اور بے خبر ہیں کہ اس قدر عظیم آیات کو دیکھنے کے باوجود غفلت کا شکار ہیں کیونکہ کفر اور ہٹ دھرمی ان کے دل میں راسخ ہو چکے ہیں۔ بنابریں آیت کے اختتام پر فرمایا گیا ہے: ان میں سے اکثر لوگ تو کبھی بھی مومن نہیں تھے (وما کان اکثرھم مؤمنین)۔

یعنی یہ بے ایمانی ان کی ایک راسخ صفت بن چکی ہے لہٰذا اگر وہ ان آیات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ فعل کی اہلیت اور لیاقت بھی تو تاثیر کی اصل شرط ہے جیسا کہ قرآن مجید کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ "ھدًی للمتقین" (یعنی متقیوں کے لیے سبب ہدایت) ہے۔ (بقرہ / ۲)

زیر بحث آیات کے سلسلے میں آخری کڑی میں تنبیہ اور تشویق کے ساتھ امید اور خوف کا منظر پایا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تیرا پروردگار عزیز اور رحیم ہے (و ان ربك لهو العزيز الرحيم)۔

"عزیز" اس طاقت ور کو کہتے ہیں جو ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ خدا اس لیے عزیز ہے کہ وہ اپنی عظیم نشانیاں دکھانے پر بھی قادر ہے اور جھٹلانے والوں کی سرکوبی بھی بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ رحیم ہے اور اس کی وسیع رحمت ہر جگہ کو گھیرے ہوئے ہے کہ اگر ایک مختصر سے لمحہ میں بھی تہ دل کے ساتھ اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا جائے تو یہی کافی ہے کہ انسان پر اس کی نظرِ کرم ہو جائے اور وہ اس کے تمام گزشتہ گناہوں پر بخشش کا قلم پھیر دے۔

"عزیز" کو "رحیم" پر شاید اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ اگر رحیم کو عزیز پر مقدم کرتا تو شاید اس سے کمزوری کا احساس ہوتا لیکن عزیز کے مقدم کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ وہ انتہائی قدرت کے باوجود رحیم اور نہایت ہی مہربان ہے۔

۱۰۔ وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

۱۱۔ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۚ أَلَا يَتَّقُونَ ۝

۱۲۔ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۝

۱۳۔ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ ۝

۱۴۔ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۝

۱۵۔ قَالَ كَلَّا ۖ فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا ۖ إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ ۝

ترجمہ

۱۰۔ اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے موسیٰ کو ندا دی کہ اس ظالم قوم کے پاس جا۔

۱۱۔ قوم فرعون (کے پاس)، آیا وہ (خدا کے فرمان کی مخالفت سے) پرہیز نہیں کرتے؟

۱۲۔ (موسیٰ نے) عرض کی پروردگارا! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔

۱۳۔ اور میرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور میری زبان کافی حد تک گویا بھی نہیں (میرے بھائی) ہارون کو بھی رسالت عطا فرما (تاکہ وہ میری امداد کرے)۔

۱۴۔ اور ان لوگوں کی طرف سے (ان کے اپنے نظریئے کے مطابق) مجھ پر جرم کا الزام ہے، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے (اور رسالت کا یہ فریضہ انجام نہ پا سکے گا)۔

۱۵۔ (خدا نے) فرمایا کہ ایسا نہیں ہے (وہ تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے) تم دونوں (ان کی ہدایت کے لیے) ہماری آیات لے کر جاؤ، ہم تمھارے ساتھ ہیں اور (تمھاری باتوں کو) سن رہے ہیں۔

تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ مقصد فوت نہ ہو جائے۔ لہٰذا انھوں نے اس معرکے کے لیے خدا سے زیادہ سے زیادہ طاقت اور قوت کی درخواست کی۔

جس قسم کے وسیلے کی انھوں نے خداوندِ عالم سے درخواست کی اس حقیقت پر "شاہد ناطق" کی درخواست تھی۔ اس نے "شرح صدر" (وسیع اور کشادہ روح) کی درخواست کی۔ اسی طرح زبان کی ہر قسم کی گرہوں کے کھولنے کی درخواست کی اور اپنے بھائی جناب ہارون علیہ السلام کو منصبِ رسالت عطا کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ اس کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں چنانچہ اس آخری درخواست کا ماجرا سورۂ طٰہٰ میں زیادہ تفصیل سے درج ہے، موسیٰؑ عرض کرتے ہیں :۔

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدة من لسانی یفقھوا
قولی. واجعل لی وزیرًا من اھلی ھٰرون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی
امری کی نسبحك كثیرًا و نذكرك كثیرًا

پروردگارا! میرا سینہ کشادہ کردے، میرے کام کو مجھ پر آسان فرما، میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھ سکیں اور میرے خاندان سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا، اس کے ذریعے میری کمر مضبوط کردے، اسے میرے کاموں میں میرا شریک بنا تاکہ ہم تیری بہت تسبیح کرسکیں اور تجھے بہت یاد کرسکیں۔

(طٰہٰ / ۲۵ تا ۳۴)

خداوندعالم نے موسیٰ علیہ السلام کی صدقِ دل پر مبنی اس درخواست کو منظور فرمالیا اور "فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا" کہ وہ تمھیں قتل کردیں یا تیرا سینہ تنگ ہو یا تیری زبان میں کوئی گرہ ہو اور تو بول نہ سکے (قال کلا)۔

تمھارے بھائی کے بارے میں تمھاری دعا کو مستجاب کیا اور اسے بھی حکم دیا ہے" تم دونوں ہماری آیات لے کر جاؤ" (اور اس کی گمراہ قوم کو میری طرف دعوت دو) (فاذھبا بأیاتنا)۔

اور یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے دور ہوں اور تمھارا ماجرا مجھے معلوم نہیں ہے، بلکہ" ہم تمھارے ساتھ ہیں اور تمھاری باتوں کو اچھی طرح سن رہے ہیں (انا معکم مستمعون)۔

ہم کبھی بھی تمھیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے اور سخت حوادث میں بھی تمھاری مدد کریں گے۔ تم بالکل مطمئن ہو کر آگے بڑھو اور بڑھتے چلے جاؤ۔

تو اس طرح سے خداوندِ عالم نے تین جملوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو کافی اطمینان دلادیا اور ان کی درخواست کو عملی جامہ پہنایا۔ " کلّا " کے لفظ کے ساتھ انھیں اطمینان دلادیا کہ وہ لوگ انھیں ہرگز قتل نہیں کرسکیں گے۔ نیز سینے کی تنگی اور زبان کی مشکل بھی پیدا نہیں ہوگی اور" فاذھبا بأیاتنا " کے جملے کے ساتھ ان کے بھائی (ہارون) کو ان کی کمک کے لیے بھیجا اسی طرح" انا معکم مستمعون " کے ساتھ انھیں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلادیا۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آخری جملے میں ضمیر کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے اور خدا نے فرمایا ہے : " انا معکم " (ہم تمھارے ساتھ ہیں) ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے ہو کہ تم دونوں بھائی جہاں جہاں اور جس جس میدان میں بھی اس ظالم و جابر

گروہ کا سامنا کرو گے، ہم وہیں وہیں موجود ہوں گے اور تم سب لوگوں کی باتوں کو سنیں گے، تم دو بھائیوں کی امداد کرکے ان پر کامیاب کریں گے۔

اس مقام پر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ چونکہ " مع " کا کلمہ حمایت اور امداد پر دلالت کرتا ہے لہٰذا یہاں یہ فرعون اور فرعون والوں کے لیے نہیں ہوگا، یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ " مع " کا معنیٰ ہے خداوندِ عالم کا ہر موقع و محل پر حاضر اور ناظر ہونا لہٰذا وہ گناہ گاروں کے لیے بھی ہوگا بلکہ اس میں بے جان چیزیں بھی شامل ہوں گی کیونکہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے اور کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔

" استماع " کا معنیٰ ہے کسی چیز کو غور سے سننا اور یہ کلمہ بھی اسی واقعیت کی تاکید ہے۔

۱۶۔ فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَآ إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝

۱۷۔ أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۝

۱۸۔ قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ
سِنِينَ ۝

۱۹۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنتَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ۝

۲۰۔ قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّآلِّينَ ۝

۲۱۔ فَفَرَرْتُ مِنكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي
مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

۲۲۔ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۝

ترجمہ

۱۶۔ پس تم فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔

۱۷۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔

۱۸۔ (فرعون نے) کہا: آیا ہم نے تجھے بچپن میں اپنے درمیان نہیں پالا اور کیا تو اپنی عمر کے کئی سال ہم میں نہیں رہا؟

۱۹۔ اور تو نے (آخر کار جو) کام (تجھے انجام نہیں دینا چاہیے تھا اسے) انجام دیا، (اور ہم میں سے ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا) اور تو کافروں میں سے تھا۔

۲۰۔ (موسٰی نے) کہا: میں نے وہ کام انجام دیا جبکہ میں بے خبر لوگوں میں سے تھا۔

۲۱۔ پھر جب میں تم لوگوں سے خوف زدہ ہوا تو تم سے بھاگ نکلا اور میرے پروردگار نے مجھے علم و دانش عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے قرار دیا۔

۲۲۔ کیا یہ احسان ہے جو تو مجھے جتلا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کو تو نے اپنا غلام بنا رکھا ہے؟

تفسیر

فرعون سے معرکۃ الآرا مقابلہ

گزشتہ آیات میں حضرت موسٰی علیہ السلام کی ماموریت کا پہلا مرحلہ ختم ہوا جس میں بتایا گیا ہے کہ انھیں وحی و رسالت ملی اور انھوں نے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وسائل کے حصول کی درخواست کی۔

اس کے ساتھ ہی زیر نظر آیات میں دوسرے مرحلے" کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے یعنی فرعون کے پاس جانا اور اس کے ساتھ گفتگو کرنا چنانچہ ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اسے یہاں پر بیان کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے مقدمے کے طور پر فرمایا گیا ہے: اب جبکہ تمام حالات سازگار ہیں تو تم فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم عالمین کے پروردگار کے رسول ہیں (فأتيا فرعون فقولا انا رسول رب العالمين)۔

"فأتيا" کا لفظ بتا رہا ہے کہ تم ہر قیمت پر اس کے ساتھ رابطہ قائم کرو اور "رسول" کے لفظ کو مفرد کے صیغے کے ساتھ بیان کرنا جب کہ وہ دونوں رسول تھے، ان کی دعوت کی یگانگت کی دلیل ہے۔ گویا وہ یک جان دو قالب کے مصداق ایک پروگرام ایک منصوبے اور ایک ہدف کے ماتحت کام کر رہے ہیں[1]۔

اور اپنی رسالت کا ذکر کرنے کے بعد بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیجیے اور کہیئے کہ ہمیں حکم ملا ہے کہ تجھ سے مطالبہ کریں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے (ان ارسل معنا بني اسرائيل)۔

ظاہر ہے کہ اس مطالبے کا مقصد ان کو غلامی سے آزاد کروانا تھا تاکہ وہ فرعون کی قید سے نکل کر ان کے ساتھ چلے جائیں۔

اس مقام پر فرعون نے زبان کھولی اور شیطنت پر مبنی چند ایک نپے تُلے جملے کہے جس سے ان کی رسالت کی تکذیب کرنا مقصود تھا، وہ حضرت موسٰی علیہ السلام کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: آیا بچپن میں ہم نے تجھے اپنے دامنِ محبت میں پروان نہیں چڑھایا

---

[1] "راغب" نے "مفردات" میں لکھا ہے کہ "رسول" کا لفظ ان کلمات میں سے ہے جن کا اطلاق مفرد اور جمع پر یکساں ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی اس کی جمع "رسل" بھی لائی جاتی ہے اور بعض لوگوں نے اسے مصدر اور "رسالت" کے معنی میں لیا ہے اور معلوم ہے کہ مصدر کے تثنیہ اور جمع کے صیغے نہیں ہوتے ("لسان العرب" میں ہے "الرسول بمعنى الرسالة") لیکن حقیقتاً یہ لفظ وصفی معنٰی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر اس کا استعمال تثنیہ اور جمع کی صورت میں ہوتا ہے چنانچہ موسٰی اور فرعون کی اسی داستان میں آیا ہے:

انا رسولا ربك

ہم دونوں تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (سورۂ طٰہٰ / ۴۷)

(قال الم نربك فينا وليدًا).

ہم نے تجھے دریائے نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی خشمگیں موجوں سے نجات دلائی دگرنہ تیری زندگی خطرے میں تھی۔ تیرے لیے آیاؤں کو بلایا اور ہم نے اولادِ بنی اسرائیل کے قتل کر دینے کا جو قانون مقرر کر رکھا تھا اس سے تجھے معاف کر دیا اور امن وسکون اور نازونعمت میں تجھے پروان چڑھایا۔

اور اس کے بعد بھی "تو نے اپنی زندگی کے کئی سال ہم میں گزارے" (و لبثت فينا من عمرك سنين).

پھر وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایک اور اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے: تو نے وہ اہم کام کیا ہے (فرعون کے حامی ایک قبطی کو قتل کیا ہے) (و فعلت فعلتك التي فعلت).

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسا کام کرنے کے بعد تم کیونکر رسول بن سکتے ہو؟

ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے "تو ہماری نعمتوں کا انکار کر رہا ہے" (و انت من الكافرين).

تو کئی سالوں تک ہمارے دسترخوان پر پلتا رہا ہے، ہمارا نمک کھانے کے بعد نمک حلالی کا حق اس طرح ادا کر رہا ہے؟ اس قدر کفرانِ نعمت کے بعد تو کس منہ سے نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے؟

درحقیقت وہ بزعمِ خود اس طرح کی منطق سے ان کی کردار کشی کر کے موسیٰ علیہ السلام کو خاموش کرنا چاہتا تھا۔

یہاں اس واقعے کو بیان کرنا مقصود تھا جو سورۂ قصص آیہ ۱۵ میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دو آدمیوں کو دیکھا کہ آپس میں لڑ رہے ہیں جن میں سے ایک تو فرعونی تھا اور دوسرا بنی اسرائیلی۔ چنانچہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم بنی اسرائیلی کی حمایت میں فرعونی کو ایک زوردار مُکا رسید کیا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی شیطنت آمیز باتیں سن کر اس کے تینوں اعتراضات کے جواب دینا شروع کیے۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے فرعون کے دوسرے اعتراض کا سب سے پہلے جواب دیا (یا پہلا اعتراض کو بالکل جواب کے لائق ہی نہیں سمجھا کیونکہ کسی کا کسی کی پرورش کرنا اس بات کی دلیل نہیں بن جاتا کہ اگر وہ گمراہ ہو تو اسے راہِ راست کی بھی ہدایت نہ کی جائے)۔

بہرحال جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں نے یہ کام اس وقت انجام دیا جب کہ میں بے خبر لوگوں میں سے تھا۔ (قال فعلتها اذًا وانا من الضالين).

اس مقام پر "ضالین" کی تعبیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ ایک طرف تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کا ماضی بالکل بے داغ ہونا چاہیے حتیٰ کہ مقامِ نبوت تک پہنچنے سے پہلے کے زمانہ میں بھی اسے معصوم ہونا چاہیے ورنہ اس کی عظمت اور شخصیت لوگوں کے درمیان مشکوک ہو جائے گی اور وہ تزلزل کا شکار ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں بعثت کا مقصد تشنۂ تکمیل ہو کر رہ جائے گا۔ بنابریں عصمتِ انبیاء کا دامن قبل از نبوت بھی بے داغ ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کا جواب اس قدر ناطق اور مسکت ہونا چاہیے کہ فرعون کو دوبارہ اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکے۔

لہٰذا کچھ مفسرین تو کہتے ہیں کہ یہاں پر "ضال" سے مراد خطا در موضوع ہے یعنی میں نے اسے جو مُکا مارا تھا وہ اسے جان سے مار دینے کی

غرض سے نہیں بلکہ مظلوم کی حمایت کے طور پر تھا میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس طرح سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

بنابریں یہاں پر "ضال" "بمعنی" غافل" کے ہے اور غفلت سے مراد انجام سے لاعلمی ہے۔

کچھ اور مفسرین کہتے ہیں کہ اس ظالم شخص کے قتل کے سلسلے میں کوئی خطا واقع نہیں ہوئی کیونکہ وہ اسی بات کا مستحق تھا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس قتل کا انجام یہ ہوگا کہ میں مصر میں نہیں رہ سکوں گا اور ایک عرصہ تک جلاوطن رہوں گا جس سے میرے بہت سے منصوبے التوا میں پڑ جائیں گے۔

لیکن ظاہراً یہ جواب ایسا نہیں تھا جو موسیٰ علیہ السلام فرعون کو دیتے اور وہ اسے قبول بھی کر لیتا۔ بلکہ یہ ایک ایسا مطلب تھا جو حضرت موسیٰ اپنے دوستوں کو بیان کرتے تھے۔

تیسری تفسیر جو کئی لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شایانِ شان اور ان کے مقامِ عظمت کے لائق ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہاں پر "توریہ" سے کام لیا ہے انھوں نے ایسی بات کہی ہے جس کا ظاہری معنیٰ تو یہ بنتا ہے کہ میں اس وقت راہِ حق سے ناآشنا تھا پھر خداوندِ عالم نے مجھے حق کا راستہ دکھایا اور رسالت کا عہدہ تفویض کیا۔ لیکن اس کا باطن میں کچھ اور معنیٰ بنتا ہے۔

وہ یہ کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ چیز اس قدر دردِ سر بن جائے گی۔ وگرنہ اصل کام تو بالکل ٹھیک ہی تھا اور قانونِ عدالت کے بھی عین مطابق تھا (یا یہ کہ جس دن یہ حادثہ رونما ہوا تھا اس دن میں راستہ بھول کر وہاں پر پہنچ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ واقعہ ہو گیا)۔

معلوم ہے کہ "توریہ" سے مراد یہ ہے کہ انسان ایسی بات کرے جس کا باطن حق پر مبنی ہو لیکن مخاطب اس کے ظاہر سے کچھ اور سمجھے اور اس قسم کی گفتگو وہاں پر جائز ہو جاتی ہے جہاں انسان کسی الجھن میں پڑ جائے اور جھوٹ بھی نہ بولنا چاہے ساتھ ہی ظاہر بھی محفوظ رہے۔[1]

پھر موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: اس حادثے کی وجہ سے جب میں نے تم سے خوف کیا تو تم سے بھاگ گیا اور میرے پروردگار نے مجھے دانش عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے قرار دیا (ففررت منكم لما خفتكم فوهب لي ربي حكمًا وجعلني من المرسلين).

اس آیت میں "حکم" سے کیا مراد ہے؟ اور کیا اس سے مراد مقامِ نبوت ہے یا علم، دانش اور آگاہی؟ تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن خود آیت میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "رسالت" کو "حکم" کے مقابلے میں بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ رسالت اور نبوت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

اس موضوع کا ایک اور شاہد سورۂ آلِ عمران کی آیت ۹، ہے جس میں فرمایا گیا ہے

---

[1] یہ گفتگو حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی حدیث کے مطابق ہے جسے صاحب تفسیر "نور الثقلین" نے اسی آیت کی تفسیر کے ضمن میں جلد ۴ ص ۴۸ پر بیان کیا ہے۔

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللہ

کسی انسان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ خداوندِ عالم اسے کتاب، حکم اور نبوّت عطا فرمائے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کے علاوہ میری عبادت کرو اور میرے بندے بن جاؤ۔

دراصل "حکم" کا لغوی معنیٰ " اصلاح کی غرض سے روکنا" ہوتا ہے۔ اسی لیے جانور کی لگام کو "حکمۃ" (بروزن "صدقۃ") کہا جاتا ہے۔ پھر یہ لفظ حکمت کے مطابق چیز پر بولا جانے لگا۔ اسی طرح علم اور عقل کو بھی "حکم" کہتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ یہاں پر یہ سوال درپیش آئے کہ سورۂ قصص کی آیت ۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس واقعے کے رونما ہونے سے قبل ہی "حکم" اور "علم" کے منصب پر فائز ہوچکے تھے چنانچہ ارشادِ باری ہوتا ہے:

ولما بلغ اشدہ واستوٰی اٰتینٰہ حکمًا وعلمًا

جب موسیٰ اپنے رُشد کی حدوں کو پہنچ گئے تو ہم نے انھیں حکم اور علم عطا کیا۔

اس کے بعد قبطی کے ساتھ جناب موسیٰ علیہ السلام کی لڑائی کا ذکر آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علم اور حکمت کے مختلف مراحل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جناب موسیٰؑ ایک مرحلے تک تو نبوّت و رسالت سے قبل پہنچ چکے تھے لیکن جب نبوّت و رسالت کے عہدے پر فائز ہوئے تو کمال کے بقیہ مراحل کو بھی پا لیا۔

پھر موسیٰ علیہ السلام اس احسان کا جواب دیتے ہیں جو فرعون نے بچپن اور لڑکپن میں پرورش کی صورت میں ان پر کیا تھا دوٹوک انداز میں اعتراض کی صورت میں فرماتے ہیں: تو کیا جو احسان تو نے مجھ پر کیا ہے یہی ہے کہ تو بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالے (وتلک نعمۃ تمنھا علیّ ان عبدت بنیٓ اسرائیل)۔

یہ ٹھیک ہے کہ حوادثِ زمانہ نے مجھے تیرے محل تک پہنچا دیا اور مجھے مجبورًا تمھارے گھر میں پرورش پانا پڑی اور اس میں بھی خدا کی قدرت نمائی کارفرما تھی لیکن ذرا یہ تو سوچو کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا وجہ ہے کہ میں نے اپنے باپ کے گھر میں اور ماں کی آغوش میں تربیت نہیں پائی؟ آخر کس لیے؟

کیا تو نے بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑ رکھا؟ یہاں تک کہ تو نے اپنے خود ساختہ قوانین کے تحت ان کے لڑکوں کو غلام اور ان کی لڑکیوں کو کنیز بنایا۔

تیرے بے حد وحساب مظالم اس بات کا سبب بن گئے کہ میری ماں اپنے نومولود بچّے کی جان بچانے کی غرض سے مجھے ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دے اور پھر منشائے ایزدی یہی تھا کہ میری چھوٹی سی کشتی تمھارے محل کے نزدیک لنگر ڈال دے۔ ہاں تو یہ تمھارے بے انداز مظالم ہی تھے جن کی وجہ سے مجھے تمھارا مرہونِ منت ہونا پڑا اور جنھوں نے مجھے اپنے باپ کے مقدس اور پاکیزہ گھر سے محروم کرکے تمھارے آلودہ محل تک پہنچا دیا۔

اس تفسیر کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا جواب فرعون کے سوال کے سلسلے میں مکمل طور پر واضح ہوجاتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اگر میری پرورش تمھاری طرف سے کوئی نعمت

ہو بھی سہی تب بھی ان تمام مظالم کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ۔ جو چیز تو نعمت کی صُورت میں بیان کررہا ہے کیسی نعمت ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مظالم بھی ہیں۔

ایک تیسری تفسیر بھی ہے جو فرعون کے سوال میں موسیٰ کے جواب کی صورت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر میں نے تیرے محل میں پرورش پائی ہے اور رنگ برنگی نعمتوں سے بہرہ یاب ہوا ہوں تو یہ بات بھی تجھے فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس محل کے اصل تعمیر کار میری قوم کے افراد ہی تھے جنھیں تو نے غلام بنایا ہوا ہے یہ تمام نعمتیں مہیا کرنے والے بنی اسرائیل کے قیدی ہی تھے میری قوم کے افراد کی کمائی پر تو مجھ پر کس طرح احسان جتا رہا ہے۔

باوجودیکہ ان تینوں تفسیروں میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے لیکن کئی لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

ضمنی طور پہ یہ بھی بتاتے چلیں کہ " من المرسلین " کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ صرف ایک میں ہی رسول اور خدا کا بھیجا ہوا انسان نہیں ہوں بلکہ مجھ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں، میں ان میں سے ایک ہوں اور تو نے سب کو فراموش کردیا ہے۔

۲۳۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۲۴۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝
۲۵۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝
۲۶۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝
۲۷۔ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝
۲۸۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝
۲۹۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ فرعون نے کہا: یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟
۲۴۔ (موسیٰ نے) کہا: آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم صاحبانِ یقین ہو۔
۲۵۔ (فرعون نے) اپنے اطراف والوں سے کہا کیا سُن نہیں رہے (کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے)؟
۲۶۔ (موسیٰ نے) کہا: تمھارا اور تمھارے آباؤاجداد کا رب ہے۔
۲۷۔ (فرعون) بولا: تمھاری طرف بھیجا جانے والا یہ رسول تو پاگل ہے۔
۲۸۔ (موسیٰ نے) کہا: وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا خدا ہے، اگر تم عقل و خرد سے کام لو۔
۲۹۔ (فرعون نے غصے میں آکر) کہا: اگر تو نے میرے علاوہ کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر لوں گا۔

تفسیر

دیوانگی کی تہمت اور قید کی دھمکی

جب موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون کو دو ٹوک اور قاطع جواب دے دیا جس سے وہ لاجواب اور عاجز ہو گیا تو اس نے کلام کا رُخ بدلا اور موسیٰ علیہ السّلام نے جو یہ کہا تھا کہ "میں رب العالمین کا رسول ہوں" تو اس نے اسی بات کو اپنے سوال کا محور بنایا اور کہا یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ (قال فرعون و مارب العالمین)۔

بہت بعید ہے کہ فرعون نے واقعاً یہ بات مطلب سمجھنے کے لیے کی ہو بلکہ زیادہ تر یہی لگتا ہے کہ اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تھا اور تحقیر کے طور پر یہ بات کہی تھی۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیدار اور سمجھ دار افراد کی طرح اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ گفتگو کو سنجیدگی پر محمول کریں اور سنجیدہ ہو کر اس کا جواب دیں اور چونکہ ذاتِ پروردگار عالمِ انسانی افکار کی دسترس سے باہر ہے لہٰذا انھوں نے مناسب سمجھا کہ اس کے آثار کے ذریعے استدلال قائم کریں لہٰذا انھوں نے آیاتِ آفاقی کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا: وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین کا راستہ اختیار کرو (قال رب السماوات والارض وما بینھما ان کنتم موقنین)۔

اتنے وسیع و عریض اور باعظمت آسمان و زمین اور کائنات کی رنگ برنگی مخلوق جس کے سامنے تو اور تیرے چاہنے اور ماننے والے ایک ذرۂ ناچیز سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے، میرے پروردگار کی آفرینش ہے اور ان اشیاء کا خالق و مدبّر اور ناظم ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ تیرے جیسی کمزور اور ناچیز سی مخلوق۔

اس حقیقت کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ بُت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک چیز کا علیحدہ علیحدہ رب ہے اور وہ کائنات کو مختلف نظاموں کا مجموعہ سمجھتے تھے لیکن موسیٰ علیہ السّلام کی گفتگو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ پوری کائنات پر حکم فرما ایک ہی نظام اس بات کی دلیل ہے کہ تمام کائنات کا صرف اور صرف ایک رب ہے۔

"ان کنتم موقنین" کا جملہ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ موسیٰ علیہ السّلام فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمجھانا چاہتے ہوں کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس سوال سے تمھارا مقصد درکِ حقیقت نہیں ہے لیکن اگر تمھیں حقیقت کی تلاش ہو اور تمھارے اندر عقل اور شعور بھی ہو تو جو استدلال میں نے کیا ہے وہی کافی ہے۔ ذرا اپنی آنکھوں کو کھولو اور ایک لحظہ ان آسمانوں، زمین اور ان کے آثار کو غور سے دیکھو تاکہ تمھیں حقیقت کا پتہ چلے اور کائنات کے بارے میں اپنے نظریئے کی اصلاح کر لو۔

لیکن عظیم آسمانی معلّم کے اس قدر محکم بیان اور پختہ گفتگو کے بعد بھی فرعون خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوا اس نے پہنے مٹھے مذاق اور استہزاء کو جاری رکھا اور مغرور مستکبرین کے پرانے طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے اپنے اطراف میں بیٹھنے والوں کی طرف منہ کر کہا: کیا سُن نہیں رہے ہو (کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے)۔ (قال لمن حولہ الا تستمعون)۔

معلوم ہے کہ فرعون کے گرد کون لوگ بیٹھے ہیں اسی قماش کے لوگ تو ہیں۔ صاحبانِ زور اور زر ہیں یا پھر ظالم اور جابر کے معاون۔

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں:

وہاں پر فرعون کے اطراف میں پانچ سو آدمی موجود تھے، جن کا شمار فرعون کے خواص میں ہوتا تھا [1]

اس طرح کی گفتگو سے فرعون یہ چاہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی منطقی اور دلنشیں گفتگو اس گروہ کے تاریک دلوں میں ذرہ بھر بھی اثر نہ کرے اور لوگوں کو یہ باور کروائے کہ ان کی باتیں بے ڈھنگی اور ناقابلِ فہم ہیں۔

مگر جناب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی منطقی اور جچی تلی گفتگو کو بغیر کسی خوف و خطر کے جاری رکھتے ہوئے فرمایا: وہ تمھارا بھی رب ہے اور تمھارے آباؤاجداد کا بھی رب ہے (قال ربکم و رب اٰبائکم الاولین)۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو آفاقی آیات کے حوالے سے استدلال کیا اب یہاں پر "آیات انفس" اور خود انسان کے اپنے وجود میں تخلیق خالق کے اسرار اور انسانی روح اور جسم میں خداوندِ عالم کی ربوبیت کے آثار کی طرف اشارہ کر رہے ہیں تاکہ یہ عاقبت نا اندیش مغرور کم از کم اپنے بارے میں تو کچھ سوچ سکیں خود کو اور پھر ——— اپنے خدا کو پہچان سکیں۔

لیکن فرعون اپنی ہٹ دھرمی سے پھر بھی باز نہ آیا اب استہزاء اور مسخرہ پن سے چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور موسیٰؑ کو جنون اور دیوانگی کا الزام دیتا ہے چنانچہ اس نے کہا، جو پیغمبر تمھاری طرف آیا ہے بالکل دیوانہ ہے (قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون)۔

وہی تہمت جو تاریخ کے ظالم اور جابر لوگ خدا کے بھیجے ہوئے مصلحین پر لگاتے رہتے تھے۔

یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ یہ مغرور فرعی اس حد تک بھی روادار نہ تھا کہ کہے "ہمارا رسول" اور "ہماری طرف بھیجا ہوا" بلکہ کہتا ہے "تمھارا پیغمبر" اور "تمھاری طرف بھیجا ہوا" کیونکہ "تمھارا پیغمبر" میں طنز اور استہزاء پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس میں غرور اور تکبر کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ میں اس بات سے بالاتر ہوں کہ کوئی پیغمبر مجھے دعوت دینے کے لیے آئے اور موسیٰؑ پر جنون کی تہمت لگانے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ جناب موسیٰؑ کے جاندار دلائل کو حاضرین کے اذہان میں بے اثر بنایا جائے۔

لیکن یہ ناروا تہمت موسیٰؑ کے بلند حوصلوں کو پست نہیں کر سکی اور انھوں نے تخلیقاتِ عالم میں آثارِ الٰہی اور آفاق و انفس کے حوالے سے اپنے دلائل کو برابر جاری رکھا اور کہا، وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم عقل و شعور سے کام لو (قال رب المشرق والمغرب و ما بینهما ان کنتم تعقلون)۔

اگر تمھارے پاس مصر نامی محدود سے علاقے میں چھوٹی سی ظاہری حکومت ہے تو کیا ہوا؟ میرے پروردگار کی حقیقی حکومت

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، اسی آیت کے ذیل میں۔

تو مشرق و مغرب اور اس کے تمام درمیانی علاقے پر محیط ہے اور اس کے آثار ہر جگہ موجوداتِ عالم کی پیشانی پر چمک رہے ہیں اصولی طور پر خود مشرق و مغرب میں آفتاب کا طلوع و غروب اور کائناتِ عالم پر حاکم نظامِ شمسی ہی اس کی عظمت کی نشانیاں ہیں لیکن عیب خود تمھارے اندر ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ تمھارے اندر سوچنے کی عادت ہی نہیں ہے (یاد رہے کہ "ان کنتم تعقلون" کا جملہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تمھاری گزشتہ اور موجودہ زندگی میں سوچ بچار کا طریقہ ہوتا اور تم کچھ سوچ بچار سے کام لیتے تو یقیناً اس حقیقت کو بھی پا لیتے)۔

درحقیقت یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف جنون کی نسبت کا بڑے اچھے انداز میں جواب دیا ہے۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دیوانہ میں نہیں ہوں بلکہ دیوانہ اور بے عقل وہ شخص ہے جو اپنے پروردگار کے ان تمام آثار اور نشانات کو نہیں دیکھتا۔

عالمِ وجود کے ہر در و دیوار پر ذاتِ پروردگار کے اس قدر عجیب و غریب نقوش موجود ہیں پھر بھی
جو شخص ذاتِ پروردگار کے بارے میں نہ سوچے اسے خود نقشِ دیوار ہو جانا چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلی بار ہی آسمانوں اور زمین کے نظام کی طرف اشارہ کیا ہے چونکہ آسمان بہت بلند اور زمین نہایت اسرار آمیز ہے لیکن آخر میں آکر ایک ایسے نقطے پر انگلی رکھی جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا تھا اور ہر شخص کا روزانہ اس سے واسطہ رہتا ہے اور وہ ہے سورج کا روزمرہ طلوع و غروب کا منظم پروگرام جس کے متعلق کوئی شخص بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ میں ہی اسے منظم کرنے والا ہوں۔

"ما بینهما" (جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان وحدت اور ارتباطِ باہم پایا جاتا ہے جس طرح آسمان اور زمین کے باہمی ارتباط کی طرف اشارہ گزر چکا ہے اور "ربکم و رب اٰبائکم الاولین" کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ موجودہ اور سابقہ نسلوں کے درمیان ایک وحدت و ہم آہنگی برقرار ہے۔

ان طاقتور دلائل نے فرعون کو سخت بوکھلا دیا، اب اس نے اسی حربے کا سہارا لیا جس کا سہارا ہر بے منطق اور طاقتور لیتا ہے اور جب وہ دلائل سے عاجز آ جاتا ہے تو اسے آزمانے کی کوشش کرتا ہے: فرعون نے کہا اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو معبود بنایا تو تمھیں قیدیوں میں شامل کر دوں گا (قال لئن اتخذت الٰهًا غیری لاجعلنّك من المسجونین)۔

میں تمھاری اور کوئی بات نہیں سننا چاہتا میں تو صرف ایک ہی عظیم اللہ اور معبود کو جانتا ہوں اور وہ میں خود ہوں اگر کوئی شخص اس کے علاوہ کہتا ہے تو بس سمجھ لے کہ اس کی سزا یا تو موت ہے یا عمر قید جس میں زندگی ہی ختم ہو جائے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "المسجونین" میں الف لام عہد کے لیے ہے جو ایک مخصوص زندان کی طرف اشارہ ہے جس میں جو شخص بھی گیا زندہ سلامت واپس نہیں آیا [1]

درحقیقت فرعون چاہتا تھا کہ اس قسم کی تیز و تند گفتگو کر کے موسیٰ علیہ السلام کو ہراساں کرے تاکہ وہ ڈر کر چپ ہو جائیں کیونکہ اگر بحث جاری رہے گی تو لوگ اس سے بیدار ہوں گے اور ظالم و جابر لوگوں کے لیے عوام کی بیداری اور شعور سے بڑھ کر کوئی اور چیز خطرناک نہیں ہوتی۔

[1] "تفسیر المیزان"، "تفسیر رازی" اور "تفسیر روح المعانی" اسی آیت کے ذیل میں۔

۳۰۔ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ۝
۳۱۔ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝
۳۲۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ۝
۳۳۔ وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ۝
۳۴۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ۝
۳۵۔ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝
۳۶۔ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۝
۳۷۔ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ۝

ترجمہ

۳۰۔ (موسیٰ نے) کہا: اگر میں تمھارے پاس اپنی رسالت کی واضح نشانی لے آؤں تو کیا پھر بھی؟
۳۱۔ (فرعون نے) کہا، اگر سچ کہتے ہو تو لے آؤ۔
۳۲۔ اسی اثنا میں موسیٰ نے اپنا عصا پھینک دیا تو وہ بہت بڑا اور واضح سانپ بن گیا۔
۳۳۔ پھر اپنے ہاتھ کو گریبان میں لے گئے اور واپس نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید اور چمک دار تھا۔
۳۴۔ (فرعون نے) اپنے اطرافیوں سے کہا یہ تو ماہر اور سمجھ دار جادوگر ہے۔
۳۵۔ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے ذریعے تمھیں تمھاری سرزمین سے نکال دے تمھارا کیا حکم ہے؟
۳۶۔ انھوں نے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور تمام شہروں کی طرف ہرکارے بھیج دے۔
۳۷۔ تاکہ وہ ہر ماہر جادوگر کو تیرے پاس لے آئیں۔

تفسیر

تمھارا مُلک خطرے میں ہے

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے منطق اور استدلال کی رُو سے فرعون پر کیونکر اپنی فوقیت اور برتری کا سکہ منوالیا اور حاضرین پر ثابت کر دیا کہ ان کا خدائی دین کس قدر عقلی و منطقی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ فرعون کے خدائی کے دعوے کس قدر پوچ اور عقل و خرد سے عاری ہیں۔ کبھی تو وہ استہزاء کرتا ہے کبھی جنون اور دیوانگی کی تہمت لگاتا ہے اور آخر کار طاقت کے نشے میں آکر قید و بند اور موت کی دھمکی دیتا ہے۔

اس موقع پر گفتگو کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے اب جناب موسیٰؑ کو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس سے فرعون کا عجز ظاہر ہو جائے۔

موسیٰؑ کو بھی کسی طاقت کے سہارے کی ضرورت تھی ایسی خدائی طاقت جس کے معجزانہ انداز ہوں، چنانچہ آپؑ فرعون کی طرف منہ کر کے فرماتے ہیں: آیا اگر میں اپنی رسالت کے لیے واضح نشانی لے آؤں پھر بھی تو مجھے زندان میں ڈالے گا (قال اولو جئتك بشیء مبین)۔

اس موقع پر فرعون سخت مخمصے میں پڑ گیا، کیونکہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے ایک نہایت ہی اہم اور عجیب و غریب منصوبے کی طرف اشارہ کر کے حاضرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ اگر فرعون ان کی باتوں کو اَن سنا کر کے ٹال دیتا تو سب حاضرین اس پر اعتراض کرتے اور کہتے کہ موسیٰ کو وہ کام کرنے کی اجازت دی جائے اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو معلوم ہو جائے گا اور اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکے گا اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو بھی اس کی شیخی آشکارا ہو جائے گی۔ بہرحال موسیٰؑ کے اس دعوے کو آسانی سے مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخرکار فرعون نے مجبور ہو کر کہا: "اگر سچ کہتے ہو تو اسے لے آؤ" (قال فأت به ان كنت من الصادقین)

اسی دوران میں موسیٰ نے جو عصا ہاتھ میں لیا ہوا تھا زمین پر پھینک دیا اور وہ (خدا کے حکم سے) بہت بڑا اور واضح سانپ بن گیا" (فالقیٰ عصاه فاذا هی ثعبان مبین)

پھر اپنا ہاتھ آستین میں لے گئے اور باہر نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید اور چمک دار بن چکا تھا (و نزع یده فاذا هی بیضاء للناظرین)۔

درحقیقت یہ دو عظیم معجزے تھے۔ ایک خوف کا مظہر تھا تو دوسرا امید کا مظہر۔ پہلے میں انذار کا پہلو تھا تو دوسرے میں بشارت کا۔ ایک خدائی عذاب کی علامت تھی تو دوسرا نور اور رحمت کی نشانی۔ کیونکہ معجزے کو پیغمبر خدا کی دعوت کے مطابق ہونا چاہیے۔

"ثعبان" بہت بڑے سانپ کا نام ہے جسے فارسی میں "اژدہا" کہتے ہیں۔

"راغب" نے اپنی کتاب "مفردات" میں لکھا ہے کہ "ثعبان"، "ثعب" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے پانی کا چلنا

کیونکہ سانپ کی حرکت بھی پانی کی طرح ہوتی ہے جو بل کھا کر چلتا ہے۔

"مبین" کی تعبیر سے ممکن ہے کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ عصا سچ مچ سانپ بن گیا۔ اس میں ہاتھ کی صفائی فریب نظر اور جادو کارفرما نہ تھا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر "ثعبان" کا لفظ آیا ہے اور سورۂ نمل کی آیت ۱۰ اور سورۂ قصص کی آیت ۳۱ میں "جان" کا لفظ استعمال ہوا ہے (جس کا معنیٰ ہے چھوٹے چھوٹے اور تیز رفتار سانپ) سورۂ طٰہٰ کی آیت ۲۰ میں "حیۃ" کا لفظ ذکر ہوا ہے (جس کا معنیٰ ہے سانپ، اور "حیات" کے مادہ سے لیا گیا ہے)۔

بادی النظر میں یہ تعبیریں مختلف نظر آتی ہیں جن سے ذہن میں مختلف سوال بھی اُٹھ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں مندرجہ ذیل دو مطالب میں سے کسی ایک کے بیان کرنے کے لیے ہیں:

ایک تو یہ ممکن ہے یہ اس سانپ کی مختلف حالتوں کی طرف اشارہ ہو کہ پہلے تو وہ "عصا" چھوٹا سا ایک سانپ بن جاتا ہو، پھر آہستہ آہستہ بڑا ہوتے ہوتے اژدہا بن جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ممکن ہے کہ یہ تینوں الفاظ اس سانپ کی مختلف خاصیتوں کی طرف اشارہ ہوں "ثعبان" اس کے بڑا ہونے کی طرف اشارہ ہو اور "جان" اس کی تیز رفتاری کی طرف اور "حیۃ" اس کے زندہ سلامت ہونے کی طرف اشارہ ہو۔

فرعون نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو سخت بوکھلا گیا اور وحشت کی گہری کھائی میں جا گرا لیکن اپنے شیطانی اقتدار کو بچانے کے لیے جو موسیٰؑ کے ظہور کے ساتھ متزلزل ہو چکا تھا اس نے ان معجزات کی توجیہ کرنا شروع کر دی تاکہ اس طرح سے اطراف میں بیٹھنے والوں کے عقائد محفوظ اور ان کے حوصلے بلند کر سکے اس نے پہلے تو اپنے حواری سرداروں سے کہا: یہ شخص ماہر اور سمجھ دار جادوگر ہے (قال للملإ حوله ان هذا لساحر عليم)۔

جس شخص کو تھوڑی دیر پہلے تک دیوانہ کہہ رہا تھا اب اسے "علیم" کے نام سے یاد کر رہا ہے۔ ظالم اور جابر لوگوں کا طریقہ کار ایسا ہی ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی محفل میں کئی روپ بدل لیتے ہیں اور اپنی انا کی تسکین کے لیے نت نئے حیلے تراشتے رہتے ہیں۔

اس نے سوچا چونکہ اس زمانے میں جادو کا دور دورہ ہے لہٰذا موسیٰؑ کے معجزات پر جادو کا لیبل لگا دیا جائے تاکہ لوگ اس کی حقانیت کو تسلیم نہ کریں۔

پھر اس نے لوگوں کے جذبات بھڑکانے اور موسیٰؑ کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لیے کہا: وہ اپنے جادو کے ذریعے تمھیں تمھارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے (يريد ان يخرجكم من ارضكم بسحره)۔

تم لوگ اس بارے میں کیا سوچ رہے ہو اور کیا حکم دیتے ہو (فماذا تأمرون)۔

یہ وہی فرعون ہے جو کچھ دیر پہلے تک تمام سرزمین مصر کو اپنی ملکیت سمجھ رہا تھا "اليس لى ملك مصر" (کیا سرزمین مصر پر میری حکومت اور مالکیت نہیں ہے) اب جبکہ اسے اپنا راج سنگھاسن ڈولتا نظر آ رہا ہے تو اپنی حکومتِ مطلقہ کو مکمل طور پر فراموش کر کے اسے عوامی ملکیت کے طور پر یاد کر کے کہتا ہے "تمھارا ملک خطرات میں گھر چکا ہے اسے بچانے کی سوچو"۔

وہی فرعون جو ایک لحظہ قبل کسی کی بات سننے پر تیار نہیں تھا بلکہ ایک مطلق العنان آمر کی حیثیت سے تختِ حکومت پر براجمان تھا اب اس حد تک عاجز اور درماندہ ہو چکا ہے کہ اپنے اطرافیوں سے درخواست کر رہا ہے کہ تمھارا کیا حکم ہے نہایت ہی عاجز اور کمزور ہو کر التجا کر رہا ہے۔

سورۂ اعراف کی آیت ۱۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے درباری باہمی طور پر مشورے کرنے لگ گئے وہ اس قدر حواس باختہ ہو چکے تھے کہ سوچنے کی طاقت بھی ان سے سلب ہو گئی تھی۔ ہر کوئی دوسرے کی طرف منہ کر کے کہتا:

"تمھاری کیا رائے ہے؟"

جی ہاں! پوری تاریخِ انسانی میں ظالم حکمرانوں کا یہی شیوہ رہا ہے کہ جب وہ ملکی حالات پر مکمل طور پر مسلط ہوتے ہیں تو ہر چیز کو اپنی ملکیت اور ہر ایک کو اپنا غلام سمجھتے ہیں اور جبر و استبداد ان کی منطق ہوتی ہے۔

لیکن جب اپنی ظالمانہ حکومت کی چولیں ہلتی نظر آتی ہیں تو وقتی طور پر سخت استبداد سے اُتر کر عوام کا دامن تھامنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی آراء و افکار کو اہمیت دینے لگ جاتے ہیں، عوامی حکومت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں "ملک کے اصلی مالک عوام ہیں" کا شور مچاتے ہیں ان کی رائے کا احترام کرتے ہیں لیکن جب بحرانی لمحات ٹل جاتے ہیں تو پھر وہی چال بے ڈھنگی ....

ہمیں بھی ایک ایسے بادشاہ سے پالا پڑا ہے کہ جب سلطنت کے حالات اس کے لیے سازگار تھے تو اس نے تمام مملکت کو اپنی ذاتی ملکیت بنا رکھا تھا حتیٰ کہ جو لوگ اس کی پارٹی کا رکن نہیں بننا چاہتے تھے انھیں ملک سے چلے جانے کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ خدا کی زمین وسیع ہے جہاں چاہو چلے جاؤ اس ملک میں تمھارے رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی ہوگا اور بس!

لیکن جب انقلاب کی آندھی چلی تو یہی آمرِ مطلق عوام کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ اپنے گناہوں کی معافی کا طلب گار ہوا، گناہوں سے توبہ کی لیکن عوام نے اسے سالہا سال سے پہچانا ہوا تھا کہ سب دھوکا اور فریب ہے لہٰذا عوام کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

بہرحال کافی صلاح مشورے کے بعد درباریوں نے فرعون سے کہا: موسیٰ اور اس کے بھائی کو مہلت دو اور اس بارے میں جلدی نہ کرو اور تمام شہروں میں ہرکارے روانہ کر دو" (قالوا ارجه واخاه وابعث فى المدائن حاشرين)[1]

تاکہ ہر ماہر اور منجھے ہوئے جادوگر کو تمھارے پاس لے آئیں (يأتوك بكل سحار عليم)۔

دراصل فرعون کے درباری یا تو غفلت کا شکار ہو گئے یا موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کی تہمت کو جان بوجھ کر قبول کر لیا اور موسیٰ کو "ساحر" (جادوگر) سمجھ کر پروگرام مرتب کیا کہ ساحر کے مقابلے میں "سحار" یعنی ماہر اور منجھے ہوئے جادوگر

---

[1] "ارجه" کا کلمہ "ارجاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے فیصلے میں تاخیر سے کام لینا اور جلدی نہ کرنا اور اس کی آخری ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہ صیغہ دراصل "ارجئه" تھا۔ ہمزہ کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے۔

کو بلایا جائے۔

چنانچہ انھوں نے کہا: خوش قسمتی سے ہمارے وسیع و عریض ملک (مصر) میں فنِ جادو کے بہت سے ماہر استاد موجود ہیں اگر موسیٰ ساحر ہے تو ہم اس کے مقابلے میں سحّار لا کھڑا کریں گے اور فنِ سحر کے ایسے ایسے ماہرین کو لے آئیں گے جو ایک لمحہ میں موسیٰ کا بھرم کھول کر رکھ دیں گے۔

"حاشرین" "حشر" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے میدان جنگ یا اسی قسم کے مقام پر کچھ لوگوں کو تیار کر کے لے آنا۔ یعنی فرعون کے ہرکاروں کو حکم ہوا کہ موسیٰ کے مقابلے کے لیے ہر قیمت پر ماہر جادوگروں کو جمع کر کے لائیں۔

۳۸۔ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ○

۳۹۔ وَّقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُونَ ○

۴۰۔ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ○

۴۱۔ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ○

۴۲۔ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○

ترجمہ

۳۸۔ آخر کار ایک دن مقرّرہ وقت پر جادوگر اکٹھے ہو گئے۔

۳۹۔ اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم بھی (اس میدان میں) جمع ہو جاؤ۔

۴۰۔ تاکہ اگر جادوگر کامیاب ہو جائیں تو ہم ان کی پیروی کریں۔

۴۱۔ جب تمام جادوگر آ گئے، تو انھوں نے فرعون سے کہا: اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمارے لیے کوئی خاص اجر بھی ہو گا؟

۴۲۔ اس نے کہا ہاں! اور تم اس صورت میں (ہمارے) مقربین میں سے قرار پاؤ گے۔

تفسیر

ہر طرف سے جادوگر پہنچ گئے

ان آیات میں اس دلچسپ داستان کا ایک اور پہلو بیان کیا گیا ہے:

فرعون کے درباریوں کی تجویز کے بعد مصر کے مختلف شہروں کی طرف ملازمین روانہ کر دیئے گئے اور انھوں نے ہر جگہ پر ماہر جادوگروں کی تلاش شروع کر دی آخر کار ایک مقرّرہ دن کی میعاد کے مطابق جادوگروں کی ایک جماعت اکٹھا کر لی گئی"

(فجمع السحرة لميقات يوم معلوم)۔

دوسرے لفظوں میں انھوں نے جادوگروں کو اس روز کے لیے پہلے ہی سے تیار کر لیا تاکہ ایک مقرّر دن مقابلے

لیے پہنچ جائیں۔

"یوم معلوم" سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیات سے معلوم ہوتا ہے مصریوں کی کسی مشہور عید کا دن تھا جسے موسیٰ علیہ السلام نے مقابلے کے لیے مقرر کیا تھا اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس دن لوگوں کو فرصت ہوگی اور وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کریں گے کیونکہ انھیں اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آیاتِ خداوندی کی طاقت اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کی کمزوری اور پستی سب دنیا پر آشکار ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں شمع ایمان روشن ہو جائے۔

اس میدان مقابلہ میں عوام الناس کو بھی دعوت دی گئی" اور لوگوں سے کہا گیا کہ آیا تم بھی اس میدان میں اکٹھے ہو گے؟ (و قیل للناس هل انتم مجتمعون)۔

اس طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے کارندے اس سلسلے میں سوچی سمجھی سکیم کے تحت کام کر رہے تھے انھیں معلوم تھا کہ لوگوں کو زبردستی میدان میں لانے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ اس کا منفی ردعمل ہو کیونکہ ہر شخص فطری طور پر زبردستی کو قبول نہیں کرتا لہٰذا انھوں نے کہا اگر تمھارا جی چاہے تو اس اجتماع میں شرکت کرو اس طرح سے بہت سے لوگ اس اجتماع میں شریک ہوئے۔

لوگوں کو بتایا گیا" مقصد یہ ہے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے کہ جن کی کامیابی ہمارے خداؤں کی کامیابی ہے تو ہم ان کی پیروی کریں گے" اور میدان کو اس قدر گرم کر دیں گے کہ ہمارے خداؤں کا دشمن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میدان چھوڑ جائے گا (لعلنا نتبع السحرة ان کانوا هم الغالبین)۔

واضح ہے کہ تماشائیوں کا زیادہ سے زیادہ اجتماع جو مقابلے کے ایک فریق کے ہمنوا بھی ہوں ایک طرف تو ان کی دلچسپی کا سبب ہوگا اور ان کے حوصلے بلند ہوں گے اور ساتھ ہی وہ کامیابی کے لیے زبردست کوشش بھی کریں گے اور کامیابی کے موقع پر ایسا شور مچائیں گے کہ حریف ہمیشہ کے لیے گوشۂ گمنامی میں چلا جائے گا اور اپنی عددی کثرت کی وجہ سے مقابلے کے آغاز میں فریق مخالف کے دل میں خوف وہراس اور رعب ودحشت بھی پیدا کر سکیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون کے کارندے کوشش کر رہے تھے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کریں موسیٰ علیہ السلام بھی ایسے کثیر اجتماع کی خدا سے دعا کر رہے تھے تاکہ اپنا مدعا اور مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔

یہ سب کچھ ایک طرف، ادھر "جب جادوگر فرعون کے پاس پہنچے اور اسے مشکل میں پھنسا ہوا دیکھا تو موقع مناسب سمجھتے ہوئے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور بھاری انعام وصول کرنے کی غرض سے اسے کہا: اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمارے لیے کوئی اہم صلہ بھی ہوگا؟" (فلما جاء السحرة قالوا لفرعون ائن لنا لاجرًا ان کنا نحن الغالبین)۔

فرعون جو بری طرح پھنس چکا تھا اور اپنے لیے کوئی راہ نہیں پاتا تھا انھیں زیادہ سے زیادہ مراعات اور اعزاز دینے پر تیار ہو گیا اس نے فوراً کہا: ہاں ہاں جو کچھ تم چاہتے ہو میں دوں گا اس کے علاوہ اس صورت میں تم میرے مقربین بھی بن جاؤ گے (قال نعم و انکم اذا لمن المقربین)۔

درحقیقت فرعون نے انھیں کہا: تم کیا چاہتے ہو؟ مال ہے یا عہدہ: میں یہ دونوں تمھیں دوں گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول اور زمانے میں فرعون کا قرب کس حد تک اہم تھا کہ وہ ایک عظیم انعام کے طور پر اس کی پیش کش کر رہا تھا درحقیقت اس سے بڑھ کر اور کوئی صلہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنے مطلوب کے زیادہ نزدیک ہو۔

اگر گمراہ لوگ فرعون کے قرب کو اپنی بہت بڑی عزت سمجھتے تھے تو باخبر اور آگاہ خدا پرست بھی اپنی سب سے عظیم سعادت قربِ الٰہی کو جانتے تھے اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز ان کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ بہشت کی تمام نعمتوں کے باوجود خداوندِ عالم کی ذات پاک کے جلوے کے مقابلے میں اسے کچھ اہمیت نہیں دیتے۔

اسی بناء پر اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کا عظیم ترین اجر جو انھیں ان کے عظیم ایثار کے بدلے میں ملے گا وہ قرآن کی گواہی کے مطابق "قرب خداوندی" ہوگا چنانچہ "عند ربهم" کی تعبیر اس حقیقت کی شاہد ناطق ہے۔

اسی وجہ سے پاک دل مومن اپنی عبادت کی ادائیگی کے وقت جو چیز خدا سے مانگتا ہے وہ صرف اور صرف "قربة الی الله" ہے۔

۴۳۔ قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝
۴۴۔ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ۝
۴۵۔ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ۝
۴۶۔ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ۝
۴۷۔ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
۴۸۔ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝
۴۹۔ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝
۵۰۔ قَالُوْا لَا ضَیْرَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝
۵۱۔ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

ترجمہ

۴۳۔ (وعدے کا دن آن پہنچا اور سب لوگ جمع گئے) موسیٰ نے (جادوگروں کی طرف منہ کرکے) کہا: تم جو کچھ پھینکنا چاہتے ہو پھینکو۔
۴۴۔ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں اور کہا فرعون کی عزّت کی قسم ہم کامیاب ہیں۔
۴۵۔ پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو اس نے اچانک ان کے جھوٹے کرشموں کو نگلنا شروع کردیا۔
۴۶۔ سب کے سب جادوگر فوراً سجدے میں گر پڑے۔

۴۷۔ اور کہنے لگے ہم عالمین کے رب پر ایمان لے آئے۔
۴۸۔ جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔
۴۹۔ (فرعون نے) کہا: میری اجازت کے بغیر ہی تم اس پر ایمان لے آئے ہو؟ یقیناً وہ تمھارا بڑا اور استاد ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے لیکن بہت جلد جان لوگے کہ میں تمھارے ہاتھوں اور پاؤں کو مختلف سمت میں کاٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر لٹکاؤں گا۔
۵۰۔ تو سب نے کہا: کوئی بڑی بات نہیں (تم جو کچھ کرسکتے ہو کرو) ہم تو اپنے رب کی طرف لوٹ جائیں گے۔
۵۱۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہماری خطاؤں کو معاف کردے گا، کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

تفسیر

جادوگروں کے دل میں نورِ ایمان چمک اُٹھا

جب جادوگروں نے فرعون کے ساتھ اپنی بات پکّی کرلی اور اس نے بھی انعام، اُجرت اور اپنی بارگاہ کے مقرب ہو[نے کا] وعدہ کرکے انھیں خوش کردیا اور وہ بھی مطمئن ہوگئے تو اپنے فن کے مظاہرے اور اس کے اسباب کی فراہمی کے لیے تگ و د[و] کرنی شروع کردی، فرصت کے ان لمحات میں انھوں نے بہت سی رسیاں اور لاٹھیاں اکٹھی کرلیں اور بظاہر ان کے اندر [سے] کھوکھلا کرکے ان میں ایسا کوئی کیمیکل مواد (پارہ وغیرہ کی مانند) بھر دیا جس سے وہ سورج کی تپش میں ہلکی ہوکر بھا[گنے] لگ جاتی ہیں۔

آخر کار وعدے کا دن پہنچ گیا اور لوگوں کا انبوہِ کثیر میدان میں جمع ہوگیا۔ تاکہ وہ اس تاریخی مقابلے کو دیکھ س[کیں] فرعون اور اس کے درباری، جادوگر اور موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ سب میدان میں پہنچ گئے۔

لیکن حسبِ معمول قرآن مجید اس بحث کو حذف کرکے اصل بات کو بیان کرتا ہے۔

یہاں پر بھی اس تاریخ ساز منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: موسیٰؑ نے جادوگروں کی طرف منہ کرکے کہا جو کچھ پھی[نکنا] چاہتے ہو پھینکو اور جو کچھ تمھارے پاس ہے میدان میں لے آؤ۔ (قال لهم موسیٰ القوا ما انتم ملقون)۔

سورۂ اعراف کی آیت ۱۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام ۔ نہ یہ بات اس وقت کی جب جادوگروں [نے] کہا: آپ پیش قدم ہوکر اپنی چیز ڈالیں گے یا ہم؟

موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیش کش درحقیقت انھیں اپنی کامیابی پر یقین کی وجہ سے تھی اور اس بات کی مظہر تھی کہ فرعو[ن]

زبردست حامیوں اور دشمن کے انبوہِ کثیر سے وہ ذرہ بھر بھی خائف نہیں چنانچہ یہ پیش کش کر کے آپ نے جادوگروں پر سب سے کامیاب وار کیا جس سے جادوگروں کو بھی معلوم ہوگیا کہ موسیٰؑ ایک خاص نفسیاتی سکون سے بہرہ مند ہیں اور وہ کسی ذات خاص سے لو لگائے ہوئے ہیں کہ جو ان کا حوصلہ بڑھا رہی ہے۔

جادوگر تو غرور و نخوت کے سمندر میں غرق تھے انھوں نے اپنی انتہائی کوششیں اس کام کے لیے صرف کر دی تھیں اور انھیں اپنی کامیابی کا بھی یقین تھا لہٰذا انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں اور کہا فرعون کی عزت کی قسم ہم یقیناً کامیاب ہیں (فالقوا حبالھم وعصیھم و قالوا بعزۃ فرعون انا لنحن الغالبون)[1]

جی ہاں! انھوں نے دوسرے تمام چاپلوس خوشامدیوں کی مانند فرعون کے نام سے شروع کیا اور اس کے کھوکھلے اقتدار کا سہارا لیا۔

جیسا کہ قرآن مجید ایک اور مقام پر کہتا ہے: اس موقع پر انھوں نے جب رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو وہ چھوٹے بڑے سانپوں کی طرح زمین پر حرکت کرنے لگیں (طٰہٰ ۶۶) انھوں نے اپنے جادو کے ذرائع میں سے لاٹھیوں کا انتخاب کیا ہوا تھا تاکہ وہ بزعم خود موسیٰؑ کی عصا کی برابری کر سکیں اور مزید برتری کے لیے رسیوں کو بھی ساتھ شامل کر لیا تھا۔

اسی دوران میں حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور فرعون اور اس کے درباریوں کی آنکھیں خوشی کے مارے چمک اٹھیں اور وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے یہ منظر دیکھ کر ان کے اندر وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوگئی اور وہ جھوم رہے تھے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کیفیت کو زیادہ دیر نہیں پنپنے دیا وہ آگے بڑھے اور اپنے عصا کو زمین پر دے مارا تو وہ اچانک ایک اژدہے کی شکل میں تبدیل ہو کر جادوگروں کے ان کرشموں کو جلدی جلدی نگلنے لگا اور انھیں ایک ایک کر کے کھا گیا۔
(فالقیٰ موسیٰ عصاہ فاذا ھی تلقف ما یأفکون)[2]

اس موقع پر لوگوں پر یکدم سکوت طاری ہوگیا حاضرین پر سناٹا چھا گیا، تعجب کی وجہ سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، آنکھیں پتھرا گئیں گویا ان میں جان ہی نہیں رہی لیکن بہت جلد تعجب کی بجائے دہشت ناک چیخ و پکار شروع ہوگئی، کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے کچھ لوگ نتیجے کے انتظار میں رک گئے اور کچھ لوگ بے مقصد نعرے لگا رہے تھے لیکن جادوگروں کے منہ تعجب کی وجہ سے کھلے ہوئے تھے۔

اس مرحلے پر سب کچھ تبدیل ہوگیا جو جادوگر اس وقت تک شیطانی رستے پر گامزن، فرعون کے ہم رکاب اور موسیٰؑ کے مخالف تھے یک دم اپنے آپے میں آ گئے اور کیونکہ جادو کے ہر قسم کے ٹونے ٹوٹکے اور مہارت اور فن سے واقف تھے اس لیے انھیں یقین آگیا کہ ایسا کام ہرگز جادو نہیں ہوسکتا بلکہ یہ خدا کا ایک عظیم معجزہ ہے لہٰذا اچانک وہ سارے کے سارے سجدے میں

---

[1] "حبال"، "حبل" (بروزن "طبل") کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے رسی اور "عصی" "عصا" کی جمع ہے۔

[2] "تلقف" "لقف" (بروزن "سقف") کسی چیز کا جلدی جلدی پکڑنا کے معنی میں ہے خواہ وہ ہاتھ سے ہو یا منہ سے اور ظاہر ہے کہ یہاں پر منہ سے پکڑنے کے معنی میں ہے اور "یأفکون" "افک" (بروزن "کذب") بمعنی جھوٹ ہے یہاں پر جھوٹے کرشموں اور ذرائع کی طرف اشارہ ہے۔

ڑپے (فالقی السحرۃ ساجدین)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے یہاں پر "القی" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا معنیٰ ہے گرادیئے گئے یہ اس بات کی طرف شارہ ہے کہ وہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ بے اختیار زمین پر سجدے میں جا پڑے۔

اس عمل کے ساتھ ساتھ جو ان کے ایمان کی روشن دلیل تھا انھوں نے زبان سے بھی کہا: ہم عالمین کے پروردگار پر ایمان لے آئے (قالوا آمنا برب العالمین)۔ اور ہر قسم کا ابہام و شک دور کرنے کے لیے انھوں نے ایک اور جملے کا بھی اضافہ کیا تاکہ فرعون کے لیے کسی قسم کی تاویل باقی نہ رہے، انھوں نے کہا: موسیٰ اور ہارون کے رب پر، (رب موسیٰ وھارون)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصا زمین پر مارنے اور ساحرین کے ساتھ گفتگو کرنے کا کام اگرچہ موسیٰؑ نے انجام دیا لیکن ان کے بھائی ہارونؑ بھی ان کے ساتھ ساتھ ان کی حمایت اور مدد کر رہے تھے۔

یہ عجیب و غریب تبدیلی جادوگروں کے دل میں پیدا ہوگئی اور انھوں نے ایک مختصر سے عرصے میں مطلق تاریکی سے نکل کر روشنی اور نور میں قدم رکھ دیا اور جن جن مفادات کا فرعون نے ان سے وعدہ کیا تھا ان سب کو ٹھکرا دیا۔ یہ بات تو آسان تھی۔ انھوں نے اس اقدام سے اپنی جانوں کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔ یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کے پاس علم و دانش تھا جس کے باعث وہ حق اور باطل میں تمیز کرنے میں کامیاب ہوگئے اور حق کا دامن تھام لیا۔

انھوں نے باقی ماندہ راہ کو "عقل کے پاؤں سے" طے نہیں کیا بلکہ "عشق کے راہوار" پر سوار ہو کر آگے بڑھے اور بوئے گل نے انھیں ایسا مست کیا کہ وہ خود سے بے گانہ ہوگئے اور ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اسی بناء پر انھوں نے فرعون کی زبردست دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کے ہر ظلم و ستم کا شجاعانہ اور مردانہ وار مقابلہ کیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے: ۔

مامن قلب الا بین اصبعین من اصابع الرحمان ان شاء اقامہ و ان شاء ازاغہ

ہر ایک دل خداوند رحمان کے پنجۂ قدرت میں ہے اگر چاہے تو اسے راہ راست پر لگا دے اور اگر چاہے تو اسے پھیر دے[1]

(ظاہر ہے کہ ان دونوں مراحل میں منشائے ایزدی خود انسان کی آمادگی پر منحصر ہے اور اس قسم کی توفیق یا سلب توفیق دلوں کی مختلف آمادگی کی بدولت حاصل ہوتی ہے اور کسی حساب و کتاب کے بغیر حاصل نہیں ہوتی)۔

اس موقع پر ایک طرف تو فرعون کے اوسان خطا ہو چکے تھے اور دوسرے اسے اپنا اقتدار بلکہ اپنا وجود خطرے میں دکھائی دے رہا تھا خاص طور پر وہ جانتا تھا کہ جادوگروں کا ایمان لانا حاضرین کے دلوں پر کس قدر مؤثر ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کافی سارے

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۶ ص ۲۰۸۔

لوگ جادوگروں کی دیکھا دیکھی سجدے میں گر جائیں لہٰذا اس نے بزعم خود ایک نئی اپج نکالی اور جادوگروں کی طرف منہ کرکے کہا: اجازت سے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو (قال اٰمنتم له قبل ان اٰذن لکم)[1]

چونکہ وہ سالہا سال سے تختِ استبداد پر براجمان چلا آ رہا تھا لہٰذا اسے قطعاً یہ اُمید نہیں تھی کہ لوگ اس کی اجازت کے بغیر کام انجام دیں گے بلکہ اسے تو یہ توقع تھی کہ لوگوں کے قلب و عقل اور فکر و اختیار اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں، جب تک وہ اجازت وہ نہ تو کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جابر حکمرانوں کے طریقے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

یہ مغرور سرکش تو اس بات کا روادار بھی نہ تھا کہ خدا یا موسیٰ علیہ السّلام کا نام ہی زبان پر لے آئے بلکہ اس نے حقارت اور نفرت کے اظہار کی صورت میں صرف "له" پر ہی اکتفا کیا۔

لیکن اس نے اسی بات کو کافی نہیں سمجھا بلکہ دو جملے اور بھی کہے تاکہ اپنے زعم باطل میں اپنی حیثیت اور شخصیت کو برقرار رکھ سکے اور ساتھ ہی عوام کے بیدار شدہ افکار کے آگے بند باندھ سکے اور انھیں دوبارہ خوابِ غفلت میں سلا دے۔

اس نے پہلے جادوگروں سے کہا: تمھاری موسیٰ سے یہ پہلے سے لگی بندھی سازش ہے بلکہ مصری عوام کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ ہے اس نے کہا وہ تمھارا بزرگ اور استاد ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے اور تم سب نے جادوگری کی تعلیم اسی سے حاصل کی ہے (انه لکبیرکم الذی علمکم السحر)۔

تم نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت یہ ڈرامہ رچایا ہے تاکہ مصر کی عظیم قوم کو گمراہ کرکے اس پر اپنی حکومت چلاؤ اور اس ملک کے اصلی مالکوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کر دو اور ان کی جگہ غلاموں اور کنیزوں کو ٹھہراؤ۔

لیکن میں تمھیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی سازش میں کامیاب ہو جاؤ، میں اس سازش کو پنپنے سے پہلے ہی ناکام کر دوں گا، تم بہت جلد جان لو گے کہ تمھیں ایسی سزا دوں گا جس سے دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں گے تمھارے ہاتھ اور پاؤں کو ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کاٹ ڈالوں گا (دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں) اور تم سب کو (کسی استثناء کے بغیر) سولی پر لٹکا دوں گا: (فلسوف تعلمون لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاصلبنکم اجمعین)۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ تم سب کو قتل کر دوں گا بلکہ ایسا قتل کروں گا جس میں دُکھ، درد، تکلیف اور شکنجہ بھی ہوگا اور وہ بھی سرعام کھجور کے بلند درختوں پر۔ کیونکہ ہاتھ پاؤں کے مخالف سمت کے کاٹنے سے احتمالاً انسان کی دیر سے موت واقع ہوتی ہے اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے۔

ہر دور کے ظالم اور جابر حکمرانوں کا یہی شیوہ رہا ہے کہ پہلے تو وہ خدا کے مصلح لوگوں پر عوام کے خلاف سازش کا الزام لگاتے ہیں

[1] یہاں پر اور سورہ طٰہٰ کی آیت ۷۱ میں "اٰمنتم له" آیا ہے جبکہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۲۳ میں "اٰمنتم به" آیا ہے چنانچہ بعض اربابِ لغت کے مطابق اگر "ایمان" "لام" کے ساتھ متعدی ہو تو خضوع و خشوع کا معنیٰ دیتا ہے اور اگر "با" کے ساتھ متعدی ہو تو تصدیق کا معنیٰ دیتا ہے۔

پھر تہمتوں اور الزام تراشیوں کے حربے آزماتے ہیں آخر میں تلوار کا حربہ ہوتا ہے تاکہ اس طرح حق کے طلب گار افراد کی پہلے تو پوزیشن کمزور ہو اور پھر انھیں وہ اپنی راہ سے آسانی کے ساتھ ہٹا دیں۔

لیکن فرعون یہاں پر سخت غلط فہمی میں مبتلا تھا کیونکہ کچھ دیر قبل کے جادوگر اور اس وقت کے مومن افراد کے دل نورِ ایمان سے اس قدر منور ہو چکے تھے اور خدائی عشق کی آگ ان کے دل میں اس قدر بھڑک چکی تھی کہ انھوں نے فرعون کی دھمکیوں کو ہرگز ہرگز کوئی وقعت نہ دی بلکہ بھرے مجمع میں اسے دو ٹوک جواب دے کر اس کے تمام شیطانی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

انھوں نے کہا: کوئی بڑی بات نہیں اس سے ہمیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے (قالوا لا ضیر انا الی ربنا منقلبون)۔

اس کام سے نہ صرف یہ کہ تم ہمارا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکو گے بلکہ ہمیں اپنے حقیقی معشوق اور معبود تک بھی پہنچا دو گے، تمھاری یہ دھمکیاں ہمارے لیے اس وقت مؤثر تھیں جب ہم نے خود کو نہیں پہچانا تھا، اپنے خدا سے ناآشنا تھے اور راہِ حق کو بھلا کے زندگی کے بیابان میں سرگرداں تھے لیکن آج ہم نے اپنی گمشدہ گراں بہا چیز کو پا لیا ہے جو کرنا چاہو کر لو۔

انھوں نے سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہم ماضی میں گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہیں اور اس میدان میں بھی اللہ کے سچے رسول جناب موسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ مقابلے میں پیش پیش تھے اور حق کے ساتھ لڑنے میں ہم پیش قدم تھے لیکن "ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں" (انا نطمع ان یغفر لنا ربنا خطایانا ان کنا اول المؤمنین)۔

ہم آج کسی چیز سے نہیں گھبراتے نہ تو تمھاری دھمکیوں سے اور نہ ہی بلند و بالا کھجور کے درختوں کے تنوں پر سولی پر لٹک جانے کے بعد ہاتھ پاؤں مارنے سے۔

اگر ہمیں خوف ہے تو اپنے گزشتہ گناہوں کا اور امید ہے کہ وہ بھی ایمان کے سائے اور حق تعالیٰ کی مہربانی سے معاف ہو جائیں گے۔

یہ کیسی طاقت ہے کہ جب کسی انسان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جاتی ہے اور وہ سخت سے سخت شکنجوں سے بھی نہیں گھبراتا اور اپنی جان دے دینا اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں رہتی۔

یقیناً یہ ایمانی طاقت ہوتی ہے۔

یہ عشق کے روشن و درخشاں چراغ کا شعلہ ہوتا ہے جو شہادت کے شربت کو انسان کے حلق میں شہد سے بھی زیادہ شیریں بنا دیتا ہے اور محبوب کے وصال کو انسان کا ارفع و اعلیٰ مقصد بنا دیتا ہے۔

یہ وہی طاقت ہے جس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استفادہ کیا اور صدر اسلام کے مسلمانوں کی اسی سے تربیت کی جس کی وجہ سے ایک پسماندہ قوم بہت جلد اعزاز و افتخار کی بلندیوں کو چھونے لگی، ایسے مسلمان جن پر تاریخ بشر تا ابد ناز کرتی رہے گی۔

بہر حال یہ منظر فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے لیے بہت ہی مہنگا ثابت ہوا ہر چند کہ بعض روایات کے مطابق اس نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ بھی پہنایا اور تازہ ایمان لانے والے جادوگروں کو شہید کر دیا لیکن عوام کے جو جذبات موسیٰؑ کے حق میں اور فرعون کے خلاف بھڑک اُٹھے تھے وہ انھیں نہ صرف دبا نہ سکا بلکہ اور بھی برانگیختہ کر دیا۔

اب جگہ جگہ اس خدائی پیغمبر کے تذکرے ہونے لگے اور ہر جگہ ان باایمان شہداء کے چرچے تھے بہت سے لوگ اس وجہ سے ایمان لے آئے جن میں فرعون کے کچھ نزدیکی لوگ بھی تھے حتیٰ کہ خود اس کی زوجہ ان ایمان لانے والوں میں شامل ہو گئی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ کرنے والے تازہ مومن جادوگروں نے اپنے آپ کو پہلے مومن کیوں کہا؟ آیا ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اس میدان میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں؟

یا فرعون کے حامیوں میں سے سب سے پہلے مومن ہیں؟

یا شربتِ شہادت نوش کرنے والے سب سے پہلے مومن ہیں؟

ان سب امور کا احتمال ہو سکتا ہے اور ان کا آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔

یہ تمام تفسیریں اس صورت میں ممکن نہیں جب ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ ان سے پہلے بنی اسرائیل یا غیر بنی اسرائیل میں سے کچھ اور لوگ بھی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے ہوں گے لیکن اگر یہ کہیں کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بعثت کے فوراً بعد حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ براہِ راست فرعون سے بات چیت کریں اور سب سے پہلی ضرب اس کے پیکر پر لگائیں تو ایسی صورت میں بعید نہیں ہے کہ وہ واقعاً پہلے مومنین ہوں اور پھر کسی دوسری تفسیر کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔

۵۲۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○

۵۳۔ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ○

۵۴۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ○

۵۵۔ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ○

۵۶۔ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ○

۵۷۔ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○

۵۸۔ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ○

۵۹۔ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○

ترجمہ

۵۲۔ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے لے جاؤ کیونکہ وہ تمھارا پیچھا کرنے والے ہیں۔

۵۳۔ فرعون (کو اس پروگرام کا پتہ چل گیا اور اس) نے شہروں میں کارندے بھیج دیئے تاکہ طاقت جمع کریں۔

۵۴۔ (اور اس نے کہا) یہ تھوڑے سے لوگ ہیں۔

۵۵۔ اور انھوں نے ہمیں غُصّہ دلایا ہے۔

۵۶۔ اور ہم سب آمادۂ پیکار ہیں۔

۵۷۔ لیکن ہم نے (فرعون اور فرعون والوں غرض) ان سب کو باغوں اور چشموں سے باہر نکال دیا۔

۵۸۔ اور خزانوں اور عالیشان محلّوں سے (بھی)۔

۵۹۔ جی ہاں! ہم نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا۔

تفسیر

ہم نے انھیں باہر نکال دیا

ہم گزشتہ آیات میں دیکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میدانِ مقابلہ میں فرعون پر غالب آگئے اور سرخرد اور سرفراز ہوکر میدان سے باہر آئے اگرچہ فرعون اور اس کے تمام درباری ان پر ایمان نہیں لائے لیکن اس کے چند اہم نتائج ضرور برآمد ہوئے، جن میں سے ہر ایک اہم کامیابی شمار ہوتا ہے۔

۱۔ بنی اسرائیل کا اپنے رہبر اور پیشوا پر عقیدہ مزید پختہ ہوگیا اور انھیں مزید تقویت مل گئی چنانچہ ایک دل اور ایک جان ہوکر ان کے گرد جمع ہوگئے کیونکہ انھوں نے سالہا سال کی بدبختی اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب اپنے اندر کسی آسمانی پیغمبر کو دیکھا تھا جو کہ ان کی ہدایت کا بھی ضامن تھا اور ان کے انقلاب، آزادی اور کامیابی کا بھی رہبر تھا۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام نے مصریوں اور قبطیوں کے درمیان ایک اہم مقام حاصل کرلیا۔ کچھ لوگ ان کی طرف مائل ہوگئے اور جو مائل نہیں ہوئے تھے وہ کم ازکم ان کی مخالفت سے ضرور گھبراتے تھے اور جناب موسیٰؑ کی صدائے دعوت تمام مصر میں گونجنے لگی۔

۳۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فرعون عوامی افکار اور اپنی جان کو لاحق خطرے سے بچاؤ کے لیے اپنے اندر ایسے شخص کے ساتھ مقابلے کی طاقت کھو چکا تھا جس کے ہاتھ میں اس قسم کا عصا اور منہ میں اس طرح کی گویا زبان تھی۔

مجموعی طور پر یہ امور موسیٰ علیہ السلام کے لیے اس حد تک زمین ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوئے کہ مصریوں کے اندر ان کے پاؤں جم گئے اور انھوں نے کھُل کر اپنا تبلیغی فریضہ انجام دیا اور اتمام حُجّت کی۔

اس روش کو کئی سال گزر گئے اور اس دوران میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے منطقی دلائل کے ساتھ ساتھ انھیں کئی معجزے بھی دکھائے جن کی طرف ہم سُورۂ اعراف کی آیت ۱۳۰ سے ۱۳۵ تک کے ذیل میں اشارہ کرچکے ہیں جیسا کہ خداوندِ عالم نے اہلِ مصر کو کئی سال تک قحط اور خشک سالی میں مبتلا رکھا تاکہ جو لوگ بیدار ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ بیدار ہوجائیں۔

(اس بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں مذکورہ آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو)۔

جب موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں پر اتمام حجت کرچکے اور مومنین و منکرین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہوگئیں تو موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا چنانچہ یہی آیات اس منظر کی تصویر کشی کررہی ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے باہر) نکال کرلے جاؤ، کیونکہ وہ تمھارا پیچھا کرنے والے ہیں (واوحینا الیٰ موسیٰ ان اسر بعبادی انکم متبعون)۔

یہ ایک خدائی منصوبہ ہے کہ تم رات کو سفر کرو اور وہ بھی باخبر ہوجائیں اور تمھارے پیچھے چل پڑیں پھر کیا ہوگا؟ یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔

"عبادی" (میرے بندے) کی تعبیر (باوجودیکہ اس سے پہلے "او حینا" یعنی "ہم نے وحی بھیجی" جمع کی صورت میں ہے)، خدا کی اپنے مومن بندوں سے نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور دشمن کی نگاہوں سے بچ کر بنی اسرائیل کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے بعد کوچ کا حکم دیا اور حکمِ خدا کے مطابق رات کو خصوصی طور پر منتخب کیا تاکہ یہ منصوبہ صحیح صورت میں تکمیل کو پہنچے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تعداد کی روانگی ایسی چیز نہیں تھی جو زیادہ دیر تک چھپی رہ جاتی۔ جاسوسوں نے جلد ہی اس کی رپورٹ فرعون کو دے دی اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: فرعون نے اپنے کارندے مختلف شہروں میں روانہ کردیئے تاکہ فوج جمع کریں (فارسل فرعون فی المدائن حاشرین)۔

البتہ اس زمانے کے حالات کے مطابق فرعون کا پیغام تمام شہروں میں پہنچانے کے لیے کافی وقت کی ضرورت تھی لیکن نزدیک کے شہروں میں یہ اطلاع بہت جلد پہنچ گئی اور پہلے سے تیار شدہ لشکر فوراً حرکت میں آگئے اور مقدمۃ الجیش اور حملہ آور لشکر کی تشکیل کی گئی اور دوسرے لشکر بھی آہستہ آہستہ ان سے آملتے رہے۔

ساتھ ہی لوگوں کے حوصلے بلند رکھنے اور نفسیاتی اثر قائم رکھنے کے لیے اس نے حکم دیا کہ اس بات کا اعلان کردیا جائے کہ "وہ تو ایک چھوٹا سا گروہ ہے (تعداد کے لحاظ سے بھی کم اور طاقت کے لحاظ سے بھی کم) (ان ھٰؤلاء لشرذمۃ قلیلون)۔

لہٰذا اس چھوٹے سے کمزور گروہ کے مقابلے میں ہم کامیاب ہوجائیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ طاقت اور قوت ہمارے پاس زیادہ ہے لہٰذا فتح بھی ہماری ہی ہوگی۔

"شرذمۃ" دراصل چھوٹے سے گروہ اور کسی چیز سے کچھ بچ رہنے کو کہتے ہیں۔ کٹے پھٹے لباس کو "شراذم" کہتے ہیں بنابریں اس کلمہ میں کم ہونے کے معنیٰ کے علاوہ پراگندگی اور انتشار کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے گویا اس طرح سے فرعون یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ لوگ صرف تعداد ہی میں ہم سے کم نہیں بلکہ ان میں انتشار اور افتراق بھی پایا جاتا ہے۔

فرعون نے یہ بھی کہا آخر ہم کس حد تک برداشت کریں اور کب تک ان سرکش غلاموں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے رہیں؟ "انھوں نے تو ہمیں غُصّہ دلایا ہے" (وانھم لنا لغائظون)۔

آخر کل مصر کے کھیتوں کی کون آبپاشی کرے گا؟ ہمارے گھر کون بنائے گا؟ اس وسیع و عریض مملکت کا کون لوگ بوجھ اٹھائیں گے؟ اور ہماری نوکری کون کرے گا؟

اس کے علاوہ "ہمیں ان لوگوں کی سازشوں سے خطرہ ہے (خواہ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور چلے جائیں) اور ہم ان سے مقابلہ کے لیے مکمل طور پر آمادہ اور اچھی طرح ہوشیار ہیں" (وانا لجمیع حاذرون)۔

بعض مفسّرین کے مطابق "حاذرون" "حذر" سے ہے جس کا مطلب ہے ان کی سازشوں سے خطرہ اور بعض "حذر" کو افرادی قوت اور اسلحہ کے لحاظ سے مکمل ہوشیاری، بیداری اور تیاری کے معنیٰ میں سمجھتے ہیں۔

لیکن ان دونوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ فرعون والے خائف بھی ہوں اور ان سے مقابلے کے لیے مکمل طور پر تیار بھی ہوں۔

پھر قرآن پاک فرعونیوں کے انجام کا ذکر کرتا ہے اور اجمالی طور پر ان کی حکومت کے زوال اور بنی اسرائیل کے اقتدار کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے انھیں سرسبز باغات اور پانی سے لبریز چشموں سے باہر نکال دیا: (فاخرجناهم من جنات وعیون)۔

اور خزانوں، خوبصورت محلّات اور آرام و آسائش کے مقامات سے بھی نکال دیا (وکنوز و مقام کریم)۔

ہاں ہاں!! ہم نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل کو بغیر کسی مشقّت کے یہ سب کچھ دے دیا اور انھیں فرعون والوں کا وارث بنادیا (کذٰلک واورثناها بنی اسرائیل)۔

"مقامِ کریم" کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کچھ لوگوں کے نزدیک اس سے بلند و بالا محلّات اور قیمتی عمارتیں مراد ہیں اور بعض لوگوں نے اس سے عیش و نشاط کی محفلیں مراد لی ہیں کچھ مفسرین اس سے حکمرانوں اور اہلِ اقتدار کی مجالس مراد لیتے ہیں کہ جن کے آگے نوکر چاکر سرِ تسلیم خم کیے منتظرِ فرمان ہوتے ہیں اور بعض لوگ اس سے وہ منبر مراد لیتے ہیں جن پر بیٹھ کر خطباءُ تقریریں کرتے ہیں (یعنی وہ منبر جن پر بیٹھ کر فرعون اور اس کی حکومت کے حق میں پروپیگنڈا کیا جاتا تھا)۔

البتہ پہلا معنیٰ سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ ان تمام معانی کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں جمع ہوں یعنی ان سے محلات بھی لے لیے گئے ہیں، قدرت و طاقت، حکومت و دولت اور شان و شوکت بھی چھین لیے گئے اور محافلِ سرور و نشاط کی بساط بھی لپیٹ لی گئی۔

چند ایک نکات

۱۔ آیا بنی اسرائیل نے مصر میں حکومت کی ہے؟ آیات بالا میں خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون والوں کا وارث بنایا۔ اسی تعبیر کی بناء پر بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کہ بنی اسرائیل کے افراد مصر کی طرف واپس لوٹ آئے اور زمامِ حکومت و اقتدار اپنے قبضے میں لے کر مدّتوں وہاں حکومت کرتے رہے[1]

آیاتِ بالا کا ظاہری مفہوم بھی اسی تفسیر سے مناسبت رکھتا ہے۔

جبکہ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ لوگ فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد مقدس سرزمینوں کی طرف چلے گئے البتہ کچھ عرصے کے بعد مصر واپس آگئے اور وہاں پر اپنی حکومت تشکیل دی[2]

تفسیر کے اسی حصّے کے ساتھ موجودہ تورات کی فصول بھی مطابقت رکھتی ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ مصر میں رہ گیا اور وہیں پر حکومت کی

[1] "تفسیر مجمع البیان" اور "تفسیر قرطبی" انھی آیات کے ذیل میں۔ نیز "آلوسی" نے اپنی تفسیر "روح المعانی" میں اس موضوع پر ایک قابلِ قدر تفسیر نقل کی ہے۔

[2] "تفسیر روح المعانی" انھی آیات کے ذیل میں۔

اور ایک گروہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرزمین مقدس کی طرف روانہ ہوگیا۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے وارث ہونے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور جناب حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں مصر کی وسیع و عریض سرزمین پر حکومت کی۔

لیکن اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک عظیم انقلابی پیغمبر تھے لہٰذا یہ بات بالکل بعید نظر آتی ہے کہ وہ ایسی سرزمین کو کلی طور پر خیرباد کہہ کر چلے جائیں جس کی حکومت مکمل طور پر انھیں کے قبضے اور اختیار میں آچکی ہو اور وہ وہاں کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ کیے بغیر بیابانوں کی طرف چل دیں خصوصاً جبکہ لاکھوں بنی اسرائیلی عرصہ دراز سے وہاں پر مقیم بھی تھے اور وہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔

بنابریں یہ کیفیت دو حال سے خالی نہیں یا تو تمام بنی اسرائیلی مصر میں واپس لوٹ آئے اور حکومت تشکیل دی، یا کچھ لوگ جناب موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق وہیں رہ گئے تھے اور حکومت چلاتے رہے اس کے علاوہ فرعون اور فرعون والوں کے باہر نکال دینے اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنادینے کا اور کوئی واضح مفہوم نہیں ہوگا۔

۲۔ آیات کی ترتیب: قرآن مجید بعد والی آیات میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے غرق ہونے کو تفصیل کے ساتھ بیان کر رہا ہے یہ بات اس سوال کا سبب بن جاتی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید فرعونیوں کے اپنے محلّات اور جائیداد سے باہر نکال دینے اور بنی اسرائیل کے ان کے وارث ہونے کو تو پہلے بیان کر رہا ہے اور فرعون وغیرہ کے غرق ہونے کو بعد میں؟ جبکہ اس کی طبیعی ترتیب اس کے برعکس ہے۔

اس سلسلے میں ممکن ہے کہ یہاں اجمال بیان کرنے کے بعد تفصیل بیان کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے نتیجہ اور پھر اس کی تفصیل کے ذکر کا انداز ہو۔ (غور کیجیے گا)

۶۰۔ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ○
۶۱۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ○
۶۲۔ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ ○
۶۳۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ○
۶۴۔ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ○
۶۵۔ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ○
۶۶۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ○
۶۷۔ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○
۶۸۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○

ترجمہ

۶۰۔ وہ (فرعون والے) بنی اسرائیل کے تعاقب میں چل پڑے اور طلوعِ آفتاب کے وقت انھیں جالیا۔
۶۱۔ جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے ہم تو فرعونیوں کے چنگل میں پھنس گئے۔
۶۲۔ (موسیٰ نے) کہا ایسی کوئی بات نہیں بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے جو جلد ہی میری راہنمائی کرے گا۔
۶۳۔ اس کے بعد ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ تم اپنا عصا دریا پر مارو، دریا پھٹ گیا اور اس کا ہر ایک حصّہ ایک عظیم پہاڑ کی مانند تھا۔
۶۴۔ اور وہاں پر ہم نے دوسرے لوگوں کو بھی دریا کے نزدیک کر دیا۔
۶۵۔ ہم نے موسیٰ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے (سب کو) نجات بخشی۔
۶۶۔ پھر دوسروں کو ہم نے غرق کر دیا۔

۶۷۔ اس واقعے میں (حق طلب افراد کے لیے) واضح نشانی ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔
۶۸۔ اور تیرا پروردگار عزیز اور رحیم ہے۔

تفسیر

فرعون والوں کا دردناک انجام

ان آخری آیات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی داستان کا آخری حصّہ پیش کیا گیا ہے کہ فرعون اور فرعون والے کیونکر غرق ہوئے اور بنی اسرائیل نے کس طرح نجات پائی ؟

جیسا کہ ہم گزشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ فرعون نے اپنے کارندوں کو مصر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تاکہ وہ بڑی تعداد میں لشکر اور افرادی قوت جمع کر سکیں چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق فرعون نے چھ لاکھ کا لشکر مقدمۃ الجیش کی صورت میں بھیج دیا اور خود دس لاکھ کے لشکر کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ساری رات بڑی تیزی کے ساتھ چلتے رہے اور طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی انھوں نے موسیٰؑ کے لشکر کو جا لیا چنانچہ اس سلسلے کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : فرعون والوں نے ان کا تعاقب کیا اور طلوعِ آفتاب کے وقت انھیں جا لیا (فاتبعوهم مشرقين)[1]

جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے اب تو ہم فرعون والوں کے نرغے میں آگئے ہیں اور بچ نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی (فلما تراء الجمعان قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون)۔

ہمارے سامنے دریا اور اس کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں ہیں، ہمارے پیچھے خونخوار مسلح لشکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے لشکر بھی ایسے لوگوں کا ہے جو ہم سے سخت ناراض اور غصّے سے بھرے ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی خونخواری کا ثبوت ایک طویل عرصے تک ہمارے معصوم بچوں کو قتل کرکے دیا ہے اور خود فرعون بھی بہت بڑا مغرور، ظالم اور خونخوار شخص ہے لہٰذا وہ فوراً ہمارا محاصرہ کرکے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے یا قیدی بنا کر تشدّد کے ذریعے ہمیں واپس لے جائیں گے۔ قرائن سے بھی ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا اس مقام پر بنی اسرائیل پر کرب کی حالت طاری ہو گئی اور ان کا ایک ایک لمحہ کرب و اضطراب میں گزرنے لگا یہ لمحات ان کے لیے زبردست تلخ تھے شاید بہت سے لوگوں کا ایمان بھی متزلزل ہو چکا تھا اور بڑی حد تک ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔

---

[1] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "مشرقین" سے مراد بنی اسرائیل کا مشرق کی جانب سفر تھا اور فرعون کا لشکر بھی اسی سمت چلتا رہا "بیت المقدس" کی سرزمین مصر سے مشرق کی طرف ہے۔

لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام حسبِ سابق نہایت ہی مطمئن اور پرسکون تھے انھیں یقین تھا کہ بنی اسرائیل کی نجات اور سرکش فرعونیوں کی تباہی کے بارے میں خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور وعدہ یقینی ہے۔

لہٰذا انھوں نے مکمل اطمینان اور بھرپور اعتماد کے ساتھ بنی اسرائیل کی وحشت زدہ قوم کی طرف منہ کرکے کہا: ایسی کوئی بات نہیں وہ ہم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے اور وہ بہت جلدی مجھے ہدایت کرے گا (قال کلا ان معی ربی سیهدین)۔

ممکن ہے اس طرح کی تعبیر اس وعدہ کی طرف اشارہ ہو جو خداوندِ عالم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے حکمِ تبلیغ دیتے ہوئے کیا تھا:

انّی معکما اسمع واریٰ

میں ہر جگہ پر تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں (طٰہٰ — ۴۶)۔

موسیٰ علیہ السلام کو علم تھا کہ خدا ہر جگہ ان کے ساتھ ہے خاص کر "رب" (یعنی خداوند مالک و مصلح) کے نام پر بھروسا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جو بھی راستہ طے کر رہے ہیں اپنے پاؤں کے ساتھ چل کر نہیں بلکہ خداوند قادر و مہرباں کے لطف و کرم کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔

اسی موقع پر شاید بعض لوگوں نے موسیٰؑ کی باتوں کو سن تو لیا لیکن انھیں پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا اور وہ اسی طرح زندگی کے آخری لمحات کے انتظار میں تھے کہ خدا کا آخری حکم صادر ہوا، قرآن کہتا ہے: ہم نے فوراً موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو (فاوحینا الی موسٰی ان اضرب بعصاک البحر)۔

وہی عصا جو ایک دن تو ڈرانے کی علامت تھا اور آج رحمت اور نجات کی نشانی۔

موسیٰؑ نے تعمیلِ حکم کی اور عصا فوراً دریا پر دے مارا تو اچانک ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا جس سے بنی اسرائیل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ان کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، ناگہانی طور پر دریا پھٹ گیا، پانی کے کئی ٹکڑے بن گئے اور ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی مانند بن گیا اور ان کے درمیان میں راستے بن گئے (فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم)۔

"انفلق" "فلق" (بروزن "فرق") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے پھٹ جانا اور "فِرق" (بروزن "رزق") کے مادہ سے "فَرق" (بروزن "حلق") جدا ہونے کے معنیٰ میں ہے۔

دوسرے لفظوں میں (جیسا کہ "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں) "فلق" اور "فرق" کے درمیان یہ فرق ہے کہ پہلا لفظ پھٹ جانے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جدا ہونے کی طرف۔ لہٰذا فرقہ اور فرق اس ٹولے یا گروہ کو کہتے ہیں جو باقیوں سے جدا ہو جائے۔

"طود" کا معنیٰ بہت بڑا پہاڑ ہے اور آیتِ زیر بحث میں "طود" کی صفت کا "عظیم" ہونا اس معنی کی تاکید پر دلالت کرتا ہے۔

بہرحال جس کا فرمان ہر چیز پر جاری اور نافذ ہے کہ اگر پانی میں طغیانی آتی ہے تو اس کے حکم سے اور اگر طوفانوں میں حرکت آتی ہے تو اس کے امر سے، وہ خدا کہ:

نقشِ ہستی نقشی از ایوان اوست — آب و باد و خاک سرگردان اوست

اسی نے دریا کی موجوں کو حکم دیا اور امواجِ دریا نے اس حکم کو فوراً قبول کیا اور ایک دوسرے پر جمع ہوگئیں اور ان کے درمیان کئی راستے بن گئے اور بنی اسرائیل کے ہر گروہ نے ایک ایک راستہ اختیار کرلیا۔

فرعون اور اس کے ساتھی یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے، اس قدر واضح اور آشکار معجزہ دیکھنے کے باوجود تکبر اور غرور کی سواری سے نہیں اترے انھوں نے موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا تعاقب جاری رکھا اور اپنے آخری انجام کی طرف آگے بڑھتے رہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: اور وہاں پر دوسرے لوگوں کو بھی ہم نے دریا کے نزدیک کردیا (وازلفنا ثم الاٰخرین)۔

اس طرح سے فرعونی لشکر بھی دریائی راستوں پر چل پڑے اور وہ لوگ اپنے ان پرانے غلاموں کے پیچھے دوڑتے رہے جنھوں نے اب اس غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ان کی زندگی کے آخری لمحات ہیں اور ابھی ابھی عذاب کا حکم جاری ہونے والا ہے۔

بعد والی آیت کہتی ہے: ہم نے موسیٰ اور ان تمام لوگوں کو نجات دی جو ان کے ساتھ تھے (وانجینا موسٰی ومن معہ اجمعین)۔

ٹھیک اس وقت جبکہ بنی اسرائیل کا آخری فرد دریا سے نکل رہا تھا اور فرعونی لشکر کا آخری فرد اس میں داخل ہو رہا تھا ہم نے پانی کو حکم دیا کہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آ۔ اچانک موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں اور فرعون اور اس کے لشکر کو گھاس پھونس اور تنکوں کی طرح بہا کر لے گئیں اور صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

قرآن نے ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ یہ ماجرا یوں بیان کیا ہے: پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا (ثم اغرقنا الاٰخرین)۔

تو اس طرح سے سب کچھ ایک لمحے میں ختم ہوگیا قیدی غلام آزاد ہوگئے۔ مغرور ظالم لوگ پھنس کر تباہ و برباد ہوگئے۔ تاریخ کا ورق اُلٹ گیا۔ چکا چوند کرنے والا تمدن صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا وہی تمدن جس کی بنیاد مستضعف لوگوں کے گھر دار کو اجاڑ کر رکھی گئی تھی، مستکبرین کا دور ختم ہوگیا اور مستضعفینِ عالم ان کی املاک اور حکومت کے وارث بن گئے۔

تو جناب "اس واقعے میں روشن نشانی اور عبرت کا درسِ عظیم ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے" گویا ان کی آنکھیں بند، کان بہرے اور دل خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیة وما کان اکثرهم مؤمنین)۔

جہاں فرعون اور فرعون کے ساتھی یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر ایمان نہیں لائے تو آپ بھی (اے پیغمبر!) اس مشرک قوم پر تعجب نہ کریں اور ان کے ایمان نہ لانے پر پریشان نہ ہوں کیونکہ اس قسم کے بہت سے مناظر تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں۔

"اکثر" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فرعون کی قوم سے کچھ لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کا دین قبول کرلیا تھا اور ان کے ساتھیوں میں شامل ہوگئے تھے، نہ صرف فرعون کی بیوی آسیہ اور موسیٰؑ کے باوفا دوست جسے قرآن نے "مومن آلِ فرعون" کے عنوان سے یاد کیا ہے بلکہ جادوگروں کی طرح بہت سے دوسرے لوگ بھی توبہ کرکے حضرت موسیٰؑ سے آملے تھے۔

اس سلسلے کی آخری آیت ایک مختصر لیکن معنی سے بھرپور جملے میں خدا کی بے پناہ قدرت اور رحمت کی طرف اشارہ کرکے

لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام حسبِ سابق نہایت ہی مطمئن اور پرسکون تھے انھیں یقین تھا کہ بنی اسرائیل کی نجات اور سرکش فرعونیوں کی تباہی کے بارے میں خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور وعدہ یقینی ہے۔

لہٰذا انھوں نے مکمل اطمینان اور بھرپور اعتماد کے ساتھ بنی اسرائیل کی دہشت زدہ قوم کی طرف منہ کر کے کہا: ایسی کوئی بات نہیں وہ ہم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے اور وہ بہت جلدی مجھے ہدایت کرے گا (قال کلا ان معی ربی سیھدین)۔

ممکن ہے اس طرح کی تعبیر اس وعدہ کی طرف اشارہ ہو جو خداوندِ عالم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے حکمِ تبلیغ دیتے ہوئے کیا تھا:

انی معکما اسمع و اریٰ

میں ہر جگہ پر تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں (طٰہٰ — ۴۶)۔

موسیٰ علیہ السلام کو علم تھا کہ خدا ہر جگہ ان کے ساتھ ہے خاص کر "رب" (یعنی خداوند مالک و مصلح) کے نام پر پھر دوسرا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جو بھی راستہ طے کر رہے ہیں اپنے پاؤں کے ساتھ چل کر نہیں بلکہ خداوند قادر و مہرباں کے لطف و کرم کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔

اسی موقع پر شاید بعض لوگوں نے موسیٰؑ کی باتوں کو سن تو لیا لیکن انھیں پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا اور وہ اسی طرح زندگی کے آخری لمحات کے انتظار میں تھے کہ خدا کا آخری حکم صادر ہوا، قرآن کہتا ہے: ہم نے فوراً موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو (فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر)۔

وہی عصا جو ایک دن توڑانے کی علامت تھا اور آج رحمت اور نجات کی نشانی۔

موسیٰؑ نے تعمیلِ حکم کی اور عصا فوراً دریا پر دے مارا تو اچانک ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا جس سے بنی اسرائیل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ان کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، ناگہانی طور پر دریا پھٹ گیا، پانی کے کئی ٹکڑے بن گئے اور ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی مانند بن گیا اور ان کے درمیان میں راستے بن گئے (فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم)۔

"انفلق" "فلق" (بروزن "فرق") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے پھٹ جانا اور "فِرق" (بروزن "رزق") کے مادہ سے "فرق" (بروزن "حلق") جدا ہونے کے معنیٰ میں ہے۔

دوسرے لفظوں میں (جیسا کہ "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں) "فلق" اور "فرق" کے درمیان یہ فرق ہے کہ پہلا لفظ پھٹ جانے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جدا ہونے کی طرف۔ لہٰذا فرقہ اور فرق اس ٹولے یا گروہ کو کہتے ہیں جو باقیوں سے جدا ہو جائے۔

"طود" کا معنیٰ بہت بڑا پہاڑ ہے اور آیتِ زیرِ بحث میں "طود" کی صفت کا "عظیم" ہونا اس معنیٰ کی تاکید پر دلالت کرتا ہے۔

بہرحال جس کا فرمان ہر چیز پر جاری اور نافذ ہے کہ اگر پانی میں طغیانی آتی ہے تو اس کے حکم سے اور اگر طوفانوں میں حرکت آتی ہے تو اس کے امر سے، وہ خدا کہ؛

نقشِ ہستی نقشی از ایوان اوست
آب و باد و خاک سرگردان اوست

اسی نے دریا کی موجوں کو حکم دیا اور امواجِ دریا نے اس حکم کو فوراً قبول کیا اور ایک دوسرے پر جمع ہو گئیں اور ان کے درمیان کئی راستے بن گئے اور بنی اسرائیل کے ہر گروہ نے ایک ایک راستہ اختیار کر لیا۔

فرعون اور اس کے ساتھی یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے، اس قدر واضح اور آشکار معجزہ دیکھنے کے باوجود تکبر اور غرور کی سواری سے نہیں اترے انھوں نے موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا تعاقب جاری رکھا اور اپنے آخری انجام کی طرف آگے بڑھتے رہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: اور وہاں پر دوسرے لوگوں کو بھی ہم نے دریا کے نزدیک کر دیا (وازلفنا ثم الآخرین)۔

اس طرح سے فرعونی لشکر بھی دریائی راستوں پر چل پڑے اور وہ لوگ اپنے ان پرانے غلاموں کے پیچھے دوڑتے رہے جنھوں نے اب اس غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ان کی زندگی کے آخری لمحات ہیں اور ابھی ابھی عذاب کا حکم جاری ہونے والا ہے۔

بعد والی آیت کہتی ہے: ہم نے موسیٰ اور ان تمام لوگوں کو نجات دی جو ان کے ساتھ تھے (و انجینا موسیٰ و من معه اجمعین)۔

ٹھیک اس وقت جبکہ بنی اسرائیل کا آخری فرد دریا سے نکل رہا تھا اور فرعونی لشکر کا آخری فرد اس میں داخل ہو رہا تھا ہم نے پانی کو حکم دیا کہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آ۔ اچانک موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں اور فرعون اور اس کے لشکر کو گھاس پھونس اور تنکوں کی طرح بہا کر لے گئیں اور صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

قرآن نے ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ یہ ماجرا یوں بیان کیا ہے: پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا (ثم اغرقنا الآخرین)۔

تو اس طرح سے سب کچھ ایک لمحے میں ختم ہو گیا قیدی غلام آزاد ہو گئے۔ مغرور ظالم لوگ پھنس کر تباہ و برباد ہو گئے، تاریخ کا ورق الٹ گیا۔ چکاچوند کرنے والا تمدن صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا وہی تمدن جس کی بنیاد مستضعف لوگوں کے گھروں کو اجاڑ کر رکھی گئی تھی، مستکبرین کا دور ختم ہو گیا اور مستضعفینِ عالم ان کی املاک اور حکومت کے وارث بن گئے۔

تو جناب" اس واقعے میں روشن نشانی اور عبرت کا درسِ عظیم ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے" گویا ان کی آنکھیں بند، کان بہرے اور دل خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں (ان فی ذٰلک لآیة و ما کان اکثرھم مؤمنین)۔

جہاں فرعون اور فرعون کے ساتھی یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر ایمان نہیں لائے تو آپ بھی (اے پیغمبر!) اس مشرک قوم تعجب نہ کریں اور ان کے ایمان نہ لانے پر پریشان نہ ہوں کیونکہ اس قسم کے بہت سے مناظر تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں۔

"اکثر" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فرعون کی قوم سے کچھ لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کا دین قبول کر لیا تھا اور ساتھیوں میں شامل ہو گئے تھے، نہ صرف فرعون کی بیوی آسیہ اور موسیٰؑ کے باوفا دوست جسے قرآن نے "مومنِ آلِ فرعون" کے عنوان سے یاد کیا ہے بلکہ جادوگروں کی طرح بہت سے دوسرے لوگ بھی توبہ کر کے حضرت موسیٰؑ سے آملے تھے۔

اس سلسلے کی آخری آیت ایک مختصر لیکن معنی سے بھرپور جملے میں خدا کی بے پناہ قدرت اور رحمت کی طرف اشارہ کر کے

تمھارا پروردگار عزیز بھی ہے اور رحیم بھی (وان ربك لهو العزيز الرحيم)۔

یہ اس کی "عزت" (غلبے) کا کرشمہ ہی تو ہے کہ جب چاہے باغی اور منحرف قوموں کی نابودی کا حکم صادر کر دیتا ہے اور کسی ظالم و جابر قوم کی تباہی کے لیے اسے اس بات کی ضرورت نہیں کہ آسمان سے فرشتوں کے لشکر نازل کرے بلکہ جو پانی اس قوم کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اسے انھی لوگوں کی موت کا حکم دیتا ہے اور جو دریائے نیل فرعون اور اس کی قوم کا سرمایۂ قدرت اور سبب ثروت ہو وہی ان کا قبرستان بن جاتا ہے۔

اس کی رحمت یہ ہے کہ وہ ایسے کام میں ہرگز جلدی نہیں کرتا بلکہ کئی کئی سال تک ڈھیل دیتا ہے معجزے دکھاتا اور اتمام حجت کرتا ہے اور یہ بھی اس کی رحمت ہے کہ اس قسم کی ستم رسیدہ قوم کو اس طرح کے خودسر اور سرکش حکمرانوں کی غلامی سے نجات بخشتا ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ بنی اسرائیل کی گذرگاہ:

قرآن مجید میں بارہا اس بات کو دُہرایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کو "بحر" عبور کروایا[۱] اور چند مقامات پر "یم" کا لفظ بھی آیا ہے[۲]

اب سوال یہ ہے کہ یہاں پر "بحر" اور "یم" سے کیا مراد ہے آیا یہ نیل (Nile River) جیسے وسیع و عریض دریا کی طرف اشارہ ہے کہ سرزمین مصر کی تمام آبادی جس سے سیراب ہوتی تھی یا بحیرہ احمر یعنی بحر قلزم Red Sea کی طرف اشارہ ہے۔

موجودہ تورات اور بعض مفسرین کے اندازِ گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحیرہ احمر کی طرف اشارہ ہے لیکن ایسے قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نیل کا عظیم و وسیع دریا ہے کیونکہ لغت میں ..... جیسا کہ راغب مفردات میں کہتے ہیں: "بحر" دراصل بہت زیادہ اور وسیع پانی کو کہتے ہیں اور "یم" بھی اسی معنیٰ میں آتا ہے بنابریں ان دونوں کلمات کا دریائے نیل پر اطلاق بالکل صحیح ہے۔

رہے وہ قرائن جو اس نظریے کی تائید کرتے ہیں تو وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ فراعنہ مصر کا محلِ سکونت جو مصر کے آباد شہروں کا مرکز تھا یقیناً ایسے مرکزی مقام پر ہوگا جو دریائے نیل سے زیادہ دُور نہیں ہوگا۔ اگر موجودہ اہرام اور اس کے اطراف کو معیار قرار دیں تو بنی اسرائیل مجبور تھے کہ سرزمینِ مقدس تک پہنچنے کے لیے پہلے دریائے نیل کو عبور کریں کیونکہ یہ علاقہ دریائے نیل کے مغرب میں واقع ہے اور انھیں مقدس سرزمین تک پہنچنے کے لیے

۱۔ سورۂ یونس ۹۰، سورۂ طٰہٰ ۷۷، سورۂ شعراء ۶۳ (یہی آیت) اور سورۂ دُخان ۲۴۔
۲۔ سورۂ طٰہٰ ۷۸، سورۂ قصص ۴۰ اور سورۂ ذاریات ۴۰۔

مشرق کی طرف جانا چاہیے تھا۔ (غور کیجیے گا)

۲۔ دریائے نیل کے نزدیک آباد علاقے بحیرہ احمر سے اس قدر دُور ہیں کہ بنی اسرائیل اسے ایک شب یا نصف شب میں طے نہیں کر سکتے تھے (جبکہ گزشتہ آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بنی اسرائیل نے فراعنہ مصر کی سرزمین کو راتوں رات ترک کیا اور قاعدۃً رات کے وقت ہی یہ کام انجام پانا چاہیے تھا اور فرعونی لشکر بھی ان کے پاس صبح صبح طلوعِ آفتاب کے وقت پہنچ گیا)۔

۳۔ سرزمین مصر کو عبور کرنے اور سرزمین مقدس تک پہنچنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بحیرہ احمر کو عبور کریں کیونکہ نہر سویز کی کھدائی سے پہلے وہاں پر خشکی کا ایک راستہ موجود تھا مگر یہ کہ اس مفروضے کو تسلیم کر لیں کہ ہزار ہا سال قبل بحیرۂ احمر Red Sea کا بحیرہ روم (Mediterranean) سے براہِ راست اتصال تھا اور خشکی کا کوئی راستہ موجود نہیں تھا لیکن اس طرح کا کوئی مفروضہ کسی بھی صورت میں ثابت نہیں ہے۔

۴۔ قرآن نے عصائے موسیٰ کے پانی میں ڈالنے کی داستان میں "یم" کا لفظ استعمال کیا ہے (سورۂ طٰہٰ ۳۹) اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں فرعون والوں کی غرقابی کے موقع پر بھی لفظ "یم" استعمال کیا گیا ہے اور پھر یہ کہ دونوں واقعات ایک ہی داستان بلکہ ایک ہی سورہ (طٰہٰ) میں ہیں اور دونوں مطلق طور پر منقول ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ دونوں کا معنیٰ ایک ہے اور پھر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انھیں سمندر میں نہیں ڈالا تھا بلکہ تاریخی شواہد اور قرائن کے مطابق انھیں دریائے نیل کی موجوں کے سپرد کیا تھا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کا لشکر دریائے نیل میں غرق ہوئے تھے (غور کیجیے گا)۔

۲۔ بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کی غرقابی

بعض مفسرین جو معجزات کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے اور اس بات پر مُصر ہیں کہ گزشتہ آیات میں مذکور فرعون والوں کی غرقابی اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعے کی اس طرح توجیہ کریں جو عام طبیعی اسباب سے ہم آہنگ ہو۔

لہٰذا کبھی تو وہ کہتے ہیں کہ اس واقعے کو چلتے پھرتے اور متحرک پل سے مطابقت دی جائے جس کا آج بھی رواج ہے[۱] (کہ ہنگامی طور پر عبور کرنے کے لیے متحرک پل سے استفادہ کرتے ہیں)۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام راستوں سے واقف تھے اور دریائے "سوف" (خلیج سویز) میں موجود درمیانی راستوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے لہٰذا وہاں سے گزر کر "جزیرہ سینا" پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور آیات "انفلاق بحر" سے اسی چیز کی طرف اشارہ ہے[۲]

کچھ اور مفسرین نے شاید اس احتمال کو تقویت دی ہے اور کہا ہے موسیٰ علیہ السلام سمندر کے کنارے اس وقت پہنچے جب سمندر کا "جزر" ختم ہوگیا تھا اور خشکی ظاہر ہو چکی تھی اور وہاں سے بآسانی گزرنے میں کامیاب ہوگئے جونہی وہ گزر گئے او

---

۱ و ۲۔ اعلام قرآن ص ۶۲۲۔

فرعونی قافلہ اس میں اُترا تو "مد" شروع ہوگیا جس کی وجہ سے وہ سمندر کی موجوں میں گھر کر ہلاک ہوگیا۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ ان احتمالات میں سے کوئی بھی قرآنی آیات کے ظاہری مفہوم (اگر صریحی نہ بھی کہیں) سے ہم آہنگ نہیں ہے لیکن اگر معجزہ کے مسئلہ کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر اس قسم کی توجیہات کی ضرورت بھی پیش نہ آئے معجزے کا مسئلہ انبیاء کے تفصیلی حالات میں بارہا آچکا ہے خاص کر اس داستان میں بھی عصا کے معجزے کا تذکرہ موجود ہے۔

اگر ہم یہ بات مان لیں تو کیا حرج ہے کہ عصا کے لگنے سے خدا کے حکم کے مطابق دریائے نیل کا پانی کئی حصوں میں بٹ گیا اور پھر اکٹھا ہوگیا کیونکہ کائنات میں خداوندعالم ہی تو قانون علت ومعلول پر حاکم ہے۔ ہوسکتا ہے پانی کی یہ تقسیم کسی مخفی کشش کے تحت ہوئی ہو اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ کشش ختم ہوگئی ہو اور تمام پانی اپنی طبعی حالت پر واپس آگیا ہو اس قسم کا استثناء قانون علت ومعلول میں نہیں ہے بلکہ غیر معمولی علتوں کی تاثیر کا اعتراف کرنا پڑے گا جو ...... ہماری محدود معلومات کی وجہ سے ہماری پہچان سے باہر ہے۔

۲۔ قدرت کے باوجود رحیم ہے

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اس سلسلے کی آخری آیت جو موسیٰ اور فرعون کے مجموعی کاموں اور لشکرِ حق کی فتح اور لشکرِ باطل کی شکست اور تباہی کے نتیجے کے طور پر ہے، خداوندعالم کی دو صفات بیان کر رہی ہے ایک "عزت" اور دوسری "رحمت" پہلی صفت اس کی قدرت کے ناقابل تسخیر ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری اپنے بندوں پر اس کی رحمت کی وسعت کا پتہ دیتی ہے اور پھر "عزیز" کو "رحیم" پر مقدم کرکے یہ بتایا جارہا ہے کہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ یہ رحمت اس کی کمزوری کی وجہ سے ہے، نہ! نہ!! بلکہ وہ قدرت رکھنے کے باوجود رحیم ہے۔

البتہ بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اس کی عزت سے توصیف اس کے دشمنوں کی شکست کی طرف اور رحمت سے توصیف اس کے دوستوں کی فتح کی جانب اشارہ ہے اور اگر دونوں صفات دونوں گروہوں کے لیے ہوں تو بھی کوئی ہرج کی بات نہیں کیونکہ گناہگاروں سمیت سب اس کی رحمت سے بہرہ در ہو رہے ہیں اور نیک لوگوں سمیت سب اس کے جاہ وجلال اور سطوت اور دبدبے سے خوف کھاتے نظر آتے ہیں۔

۶۹۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرٰهِيمَ ○

۷۰۔ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ○

۷۱۔ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِينَ ○

۷۲۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ○

۷۳۔ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ○

۷۴۔ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُونَ ○

۷۵۔ قَالَ أَفَرَءَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ○

۷۶۔ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ○

۷۷۔ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِينَ ○

۷۸۔ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ○

۷۹۔ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ○

۸۰۔ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ○

۸۱۔ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ○

۸۲۔ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ○

ترجمہ

۶۹۔ اور ان کے سامنے ابراہیم کی خبر پڑھو۔

۷۰۔ جبکہ انھوں نے اپنے (منہ بولے) باپ اور اپنی قوم سے کہا: تم کس چیز کی پرستش کرتے ہو؟

۷۱۔ انھوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور سارا سارا دن انھی کی پوجا میں لگے رہتے ہیں۔

لیکن متعصب لوگ بجائے اس کے کہ اس منطقی سوال کا کوئی ٹھوس جواب دیتے وہی پُرانا اور بار بار کا دہرایا ہوا جواب
کرتے ہیں: انھوں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا کرتے دیکھ
(قالوا بل وجدنا اٰبائنا کذٰلک یفعلون)۔

ان کا یہ جواب اپنے جاہل اور نادان بزرگوں کی اندھی تقلید کو بیان کر رہا ہے وہ جو جواب ابراہیم کو دے سکتے تھے یہی
بس۔ یہ ایسا جواب ہے جس کے بُطلان کی دلیل خود اسی میں موجود ہے اور کوئی بھی عقل مند انسان اپنے آپ کو اس بات کی
نہیں دے سکتا کہ وہ آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے لگ جائے خاص کر جبکہ آنے والے لوگوں کے تجربے گزشتہ لوگوں
کہیں زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی اندھی تقلید کا نہ تو کوئی جواز رہتا ہے اور نہ ہی کوئی دلیل۔

"کذٰلک یفعلون" (وہ اس طرح کیا کرتے تھے) کی تعبیر ان کی اندھی تقلید پر تاکیدِ مزید ہے یعنی جو کچھ وہ
کرتے تھے ہم بھی کرتے ہیں، خواہ وہ بتوں کی عبادت ہو یا کسی اور چیز کی۔

اب جناب ابراہیم علیہ السلام اپنے تیز حملوں کا رخ بتوں کی طرف موڑ دیتے ہیں اور "فرماتے ہیں آیا تم نے ان چیزوں کا مشاہد
بھی کیا ہے جن کی تم عبادت کرتے ہو" (قال افرأیتم ما کنتم تعبدون)۔

"تم بھی اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد بھی" (انتم واٰباؤکم الاقدمون)۔

"وہ سب کے سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے" (فانھم عدو لی الا رب العالمین)۔

جی ہاں! وہ سب میرے دشمن ہیں اور میں بھی ان سے صُلح نہ کرنے والا ان کا دشمن ہوں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جناب ابراہیمؑ فرماتے ہیں "وہ میرے دشمن ہیں" ہر چند کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ میں بھی ان کا
دشمن ہوں لیکن ممکن ہے کہ ان کا یوں فرمانا اس لیے ہو کہ بتوں کی عبادت انسان کی بدبختی، گمراہی اور دنیا و آخرت کے عذاب کا
سبب بن جاتی ہے اور یہ چیز ان کی عداوت میں شمار ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآنِ مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن بُت اپنے عبادت گزاروں سے اظہارِ براءت
کریں گے اور ان کی دشمنی پر کمربستہ ہو جائیں گے حکمِ خداوندی کے مطابق وہ گویا ہو کر ان سے اظہارِ نفرت کریں گے [1]

"رب العالمین" کا استثناء، باوجودیکہ وہ ان کے معبودوں میں شامل نہیں (اصطلاح کے مطابق استثنائے منقطع ہے)
توحیدِ خالص کی تاکید کے لیے ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان مشرکین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو بتوں کے ساتھ ساتھ خداوندِ عالم کی
عبادت بھی کیا کرتے تھے اس لیے انھوں نے پروردگارِ عالم کا استثناء کیا ہے۔

"ھُمْ" کی ضمیر کا ذکر جو عام طور پر صاحبانِ عقل کی جمع کے لیے استعمال ہوتی ہے بتوں کے لیے اس کا استعمال
مندرجہ بالا موضوع کی مناسبت سے ہے۔

پھر ابراہیم علیہ السلام پروردگارِ عالم کی صفات اور اس کی مادّی اور روحانی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ ان بتوں سے موازنہ
کیا جا سکے جو نہ تو اپنے عبادت کرنے والوں کی آواز سنتے ہیں اور نہ ہی انھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے وہ آفرینش اور ہدایت جیسی نعمتوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں: وہ خدا تو وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۷، سورہ مریم آیت ۸۲۔

مجھے ہدایت بھی کرتا ہے (الذی خلقنی فھو یھدین)۔
اس نے عالمِ تکوین میں بھی مجھے ہدایت کی ہے اور اس زندگی میں بھی مادّی اور روحانی وسائل میرے اختیار میں دے
اور عالمِ تشریع میں بھی ہدایت کی ہے اور وحی اور آسمانی کتابیں مجھ پر نازل کی ہیں۔

تخلیق کے ذکر کے بعد کلمہ "فاء" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت، خلقت سے جُدا نہیں ہے بلکہ اس کے
ساتھ ہے اور ہر جگہ پیش قدم ہے "یھدین" جو فعلِ مضارع کی صورت میں ہے اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ہدایت
اور مستمر ہے اور انسان کو ساری عمر اس کی ضرورت رہتی ہے۔

گویا ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ کر اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ میں جب سے پیدا ہوا ہوں اسی کے ساتھ ہوں اور کسی بھی
اس سے جدا نہیں ہوا ہوں اس کی موجودگی کو اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہوں میں نے اس کی محبت کا طوق اپنے گلے میں ڈالا ہوا
ہے وہ جدھر چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے۔

ربوبیت کے پہلے مرحلے یعنی تخلیق و ہدایت کے بیان کے بعد مادّی نعمتوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں "وہ وہی تو ہے
جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی" (والذی ھو یطعمنی و یسقین)۔

جی ہاں! میں اپنی ساری نعمتیں اسی کی طرف سے سمجھتا ہوں۔ میرا گوشت پوست اور میرا دانہ پانی سب اسی کی
طرف سے ہے۔

نہ صرف صحت اور تندرستی کی حالت میں اس کی نعمتیں میرے شاملِ حال ہیں بلکہ "جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفاء
عنایت فرماتا ہے" (واذا مرضت فھو یشفین)۔

باوجودیکہ کبھی کبھی بیماری بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے لیکن گفتگو میں آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے بھی اپنی طرف
نسبت دی ہے۔

دنیاوی زندگی کے مراحل کے بعد قدم کو اور آگے بڑھاتے ہوئے جہانِ آخرت کی حیاتِ جاوید کا تذکرہ فرماتے ہیں تاکہ
معلوم ہو جائے کہ ہر جگہ پر میں اس کے خوانِ نعمت سے پرورش پا رہا ہوں نہ صرف دنیاوی زندگی میں بلکہ آخرت کے عالم میں بھی۔
چنانچہ فرماتے ہیں: وہ خدا ایسا ہے جو مجھے مارے گا بھی اور پھر دوبارہ زندہ بھی کرے گا (والذی یمیتنی ثم یحیین)۔

جی ہاں! میری موت بھی اسی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد پھر نئی زندگی بھی اسی کی جانب سے ہے۔

اور جب میں عرصۂ محشر میں قدم رکھوں گا تو میری چشمِ امید پھر بھی اسی پر ہو گی کیونکہ "وہ وہی تو ہے جس کے بارے میں مجھے
امید ہے کہ قیامت کے دن میرے گناہ معاف کر دے گا" (والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی
یوم الدین)۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور ان کا کوئی گناہ ہی نہیں ہوتا کہ جس کے بخشے جانے کی ضرورت ہو لیکن جیسا کہ
ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ بعض اوقات "حسنات الابرار سیئات المقربین" کے مصداق نیک لوگوں کی
کی اچھائیاں، مقربینِ بارگاہ کے لیے گناہ شمار کی جاتی ہیں اور ان کے مقامِ عظمت کے پیشِ نظر ان کا ایک اچھا کام بھی قابلِ مواخذہ

۷۲۔ ابراہیم نے کہا: جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمھاری آواز بھی سنتے ہیں؟
۷۳۔ یا تمھیں کوئی نفع یا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں؟
۷۴۔ انھوں نے کہا: ہم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو ایسے ہی کرتا ہوا پایا ہے۔
۷۵۔ ابراہیم بولے: آیا تم نے دیکھا ہے کہ جس کی تم عبادت کرتے تھے۔
۷۶۔ تم اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد؟
۷۷۔ وہ سب میرے دشمن ہیں سوائے عالمین کے پروردگار کے۔
۷۸۔ جس (خدا) نے مجھے پیدا کیا پس وہی میری ہدایت کرتا ہے۔
۷۹۔ وہی تو ہے جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی۔
۸۰۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفاء بھی دیتا ہے۔
۸۱۔ جو مجھے مارے گا بھی اور پھر زندہ بھی کرے گا۔
۸۲۔ اسی کے بارے میں مجھے اُمّید ہے کہ قیامت کے دن میرے گناہ بھی معاف کر دے گا۔

تفسیر

میں ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں

جیسا کہ ہم سورت کی ابتداء میں بتا چکے ہیں کہ خداوندِ عالم نے اس سورۃ میں سات عظیم الشان پیغمبروں کے تفصیلی حالات اور گمراہ لوگوں کی ہدایت کے لیے ان کی معرکہ آرائی کا تذکرہ فرمایا ہے تاکہ اس طرح سے ایک تو پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور اس دور کے معدودے چند مومنین کے لیے تسلّی خاطر ہو، نیز حق کے تمام دشمنوں اور مستکبرین کے لیے تنبیہ کا کام دے۔

لہٰذا موسیٰؑ اور فرعون کی عبرت آموز داستان کے فوراً بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ہدایت بخش سرگزشت اور مشرکین سے ان کی محاذ آرائی کے واقعات کو بیان کرتا ہے اور داستان کا آغاز ابراہیم کی اپنے چچا اور گمراہ قوم سے گفتگو کے ساتھ کرتا ہے[1]

[1] ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ لفظ "اب" لغتِ عرب اور قرآنِ مجید میں کبھی باپ پر اور کبھی چچا پر بولا جاتا ہے اور یہاں پر دوسرا معنیٰ مراد ہے (مزید وضاحت کے لیے جلد ۳ اُردو ترجمہ ص ۲۹۳ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ان کے سامنے ابراہیم کی خبر پڑھو (واتل علیھم نبأ ابراھیم)۔

اس عظیم الشان پیغمبر سے متعلق تمام واقعات میں سے اس حصے کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے: جبکہ انھوں نے اپنے باپ (جیسے چچا) اور اپنی قوم سے کہا: تم کس چیز کی پرستش کرتے ہو: (اذ قال لابیه وقومه ما تعبدون)۔

یقیناً ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ کس چیز کی پوجا پاٹ کرتے ہیں لیکن اس سوال سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ کوئی بات کریں اور اپنے منہ سے خود اعتراف کریں اور ساتھ ہی "ما" (کیا چیز؟) کی تعبیر ایک طرح کی حقارت کا اظہار بھی ہے۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السّلام کے سوال کے جواب میں وہ فوراً بولے: ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور سارا دن ان پر توجہ رکھتے ہیں اور نہایت ہی ادب اور احترام کے ساتھ ان کی عبادت میں لگے رہتے ہیں (قالوا نعبد اصناما فنظل لها عاكفين)۔

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ فقط اپنے اس عمل پر شرمندہ نہیں تھے بلکہ اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے کیونکہ "نعبد اصناما" (ہم بتوں کی عبادت و پرستش کرتے ہیں) کا جملہ ان کے مقصود اور مدّعا کے بیان کے لیے کافی تھا ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا "فنظل لها عاكفين" (ہم سارا سارا دن ان کے آستان پر جبہ سائی کرتے رہتے ہیں)۔

لفظ "نظل" عموماً ایسے کاموں کے لیے بولا جاتا ہے جو دن کو انجام پاتے ہیں اور اسے مضارع کی صُورت میں بیان کرنا اس کے استمرار اور دوام کی طرف اشارہ ہے۔

"عاکف" "عکوف" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ کسی چیز کی طرف توجہ کرنا اور اس کی ادب و احترام کے ساتھ معیت اختیار کرنا ہے اور یہاں پر گزشتہ معنیٰ کی تاکید مزید کے لیے ہے۔

"اصنام" "صنم" کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے مجسمہ، جیسے سونے یا چاندی یا لکڑی وغیرہ سے بناتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں اور اسے مقدس مردوں اور مقدس عورتوں کا مظہر جانتے ہیں۔

بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے ان کی یہ باتیں سن کر ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور دو زبردست منطقی اور معتدل جملوں کے ذریعہ انھیں ایسی جگہ لا کھڑا کیا جہاں نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کے مصداق ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا۔

آپؑ نے ان سے فرمایا: "جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمھاری فریاد سنتے بھی ہیں؟" (قال هل يسمعونكم اذ تدعون)۔

"یا کیا وہ تمھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں" (او ينفعونكم او يضرون)۔

کم از کم جو چیز کسی معبود کے لیے ضروری ہے وہ یہی کہ اپنے عابد کی آواز سنے اور مصیبت میں اس کی مدد کو پہنچے یا کم از کم اس کے فرمان کی مخالفت کا خطرہ ہو لیکن ان بتوں میں ذرہ بھر بھی درک و شعور نہیں پایا جاتا اور نہ ہی انسان کی زندگی کے بارے میں وہ کچھ بھی مؤثر ذرائع ہو سکتے ہیں۔ یہ بت تو بیکار سی دھاتیں، پتھر یا لکڑی ہی ہیں جنھیں خرافات اور اوہام و خیالات نے اس حد تک پہنچا دیا ہے۔

ہوتا ہے کیونکہ اس اچھے کام نے اس سے بہتر کے انجام دینے سے روک دیا ہے اسی لیے اسے ترکِ اولیٰ کا نام دیا جاتا ہے۔
وہ کسی بھی صورت میں اپنے نیک اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے کیونکہ یہ اعمال خدا کے لطف و کرم کے مقابلے میں بالکل ناچیز ہیں اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کے سامنے ان کا کوئی شمار نہیں بلکہ ان کی ساری توقعات ذاتِ خدا کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور یہی انقطاع الی اللہ کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔

قصہ مختصر جناب ابراہیم علیہ السلام نے معبودِ حقیقی کی شناخت کے لیے پہلے پروردگار کی خالقیت کا تذکرہ فرمایا پھر اس کی ربوبیت کے تمام مراحل واضح کیے۔

ربوبیت کا پہلا مرحلہ ہدایت ہے پھر "مادی نعمتوں" کا مرحلہ ہے خواہ وہ نعمتیں حالات کی سازگاری کی صورت میں ہوں یا رکاوٹوں کے دور کرنے کی وجہ سے اور آخر میں ایک دوسرے جہان میں "حیاتِ جاوید" کا مرحلہ ہے وہاں پر بھی اس کی ربوبیت نعمتوں کی عطا اور گناہوں کی بخشش کی صورت میں جلوہ گر ہوگی اس طرح سے خرافات کی پیداوار متعدد خداؤں اور مختلف ارباب کی خدائی پر خطِ تنسیخ کھنچ جاتا ہے اور صرف ایک اور حقیقی خدا کی بارگاہ میں سرِ تعظیم جھک جاتا ہے۔

۸۳۔ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝
۸۴۔ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝
۸۵۔ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝
۸۶۔ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝
۸۷۔ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝

ترجمہ

۸۲۔ پروردگارا! مجھے علم و دانش عطا فرما اور مجھے صالحین سے ملحق کر دے۔
۸۴۔ اور میرے لیے آنے والی امتوں میں سچی زبان (اور ذکرِ خیر) قرار دے۔
۸۵۔ اور مجھے نعمتوں سے بھرپور بہشت کے وارثوں سے بنا دے۔
۸۶۔ اور میرے باپ (کی مانند چچا) کو بخش دے کیونکہ وہ گمراہوں میں سے ہے۔
۸۷۔ اور جس دن لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے (اس دن) مجھے شرمندہ اور رسوا نہ کر۔

تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کی اہم دعائیں

اس مقام پر جناب ابراہیم علیہ السلام کی اپنے اللہ سے دعاؤں اور اس کی بارگاہ میں درخواستوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا اس گمراہ قوم کو خدا کی طرف دعوت دینے اور کائنات میں اس کی ربوبیت کے جلووں کو بیان کرنے کے بعد یک لخت ان سے اپنا تعلق منقطع کر کے ذاتِ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جو کچھ مانگنا چاہتے ہیں اسی سے مانگتے ہیں اس طرح سے وہ بت پرستوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے لیے جو کچھ بھی چاہتے ہو اسی سے طلب کرو۔ ضمنی طور پر یہ اس کی ربوبیت مطلقہ پر ایک اور تاکید بھی ہے۔

بارگاہِ رب العزت میں جناب ابراہیم علیہ السلام کی سب سے پہلی درخواست یہ ہے: پروردگارا! مجھے علم و دانش (اور حق بینی کی نعمت) عطا فرما اور صالح افراد کے ساتھ ملحق فرما دے (رب هب لی حکمًا و الحقنی بالصالحین)۔

اس مقام پر سب سے پہلے "حکم" کے منصب کی درخواست کرتے ہیں اور پھر "صالحین سے ملحق ہونے" کی دعا۔

"حکم" اور "حکمت" کی بنیاد ایک ہی ہے اور جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے حکمت، علم اور معرفت کے ذریعہ حق تک پہنچنے اور موجوداتِ عالم اور نیک افعال کی معرفت کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان اقدار اور معیاروں کو حکمت کہتے ہیں جن کے ذریعے انسان حق کی معرفت حاصل کر سکے چاہے وہ جہاں بھی ہو اور باطل کو پہچان سکے چاہے وہ جس لباس میں بھی ہو۔ یہی وہ چیز ہے جسے بعض فلاسفر "قوۃ نظریہ کے کمال" کا نام دیتے ہیں۔

یہ وہی حقیقت ہے جو جناب لقمان کو خدا کی طرف سے حاصل ہوئی تھی ارشاد ہوتا ہے:

ولقد اٰتینا لقمان الحکمة

ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔ (لقمان / ۱۲)

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۹ میں اسے "خیراً کثیرا" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرًا کثیرًا

نیز معلوم ہوتا ہے کہ "حکم" کا مفہوم "حکمت" سے بالاتر ہے یعنی ایسا علم اور ایسی آگاہی جس میں اجراء اور نفاذ کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہو۔ بالفاظ دیگر صحیح فیصلے کی قوت جس میں خواہشاتِ نفسانی اور غلطی کا قطعی عمل دخل نہ ہو۔

اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السّلام سب سے پہلے خداوندِ عالم سے اسی گہری اور صحیح معرفت کی درخواست کرتے ہیں جس میں صحیح فیصلہ کرنے کی قدرت بھی موجود ہو کیونکہ کوئی بھی عملی منصوبہ اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی بنیاد اسی چیز پر نہ رکھی جائے۔

اس درخواست کے بعد خدا سے صالحین کے ساتھ ملحق ہونے کی درخواست کرتے ہیں جو عملی پہلو کی جانب اشارہ ہے جسے اصطلاح میں "حکمتِ عملی" کہتے ہیں اور یہ سابقہ درخواست کا نقطہ مقابل ہے جسے اصطلاح میں "حکمت نظری" کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ جناب ابراہیمؑ "حکم" کی منزلت پر بھی فائز تھے اور "صالحین" کے زُمرے میں بھی شامل تھے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس طرح کی درخواست کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو حکمت کی کوئی حد مقرر ہے اور نہ ہی صالح ہونے کی حد معیّن ہے ان کی درخواست کا مقصد یہ ہے کہ روز بروز علم و عمل کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند مرتبے تک پہنچتے رہیں حتیٰ کہ وہ تو ایک اولوالعزم نبی کے مرتبہ پر فائز ہونے پر بھی قانع نہیں ہیں۔

پھر یہ کہ انھیں معلوم ہے کہ یہ سب کچھ خداوندِ عالم کی طرف سے ہے اور کسی بھی لمحے کسی بھی لغزش کے سرزد ہونے اور ان نعمتوں کے سلب ہو جانے کا اندیشہ ہے لہٰذا وہ خدا سے ارتقاء کی علاوہ ان کی پائیداری کی بھی درخواست کر رہے ہیں جیسا کہ ہم روزانہ ہر نماز میں خداوندِ عالم سے "صراطِ مستقیم" کی ہدایت کی درخواست کرتے ہیں اور اس راہ پر ثابت قدم رہنے اور ارتقاء کی منزلوں کو طے کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

ان دو درخواستوں کے بعد ایک اور اہم درخواست ان لفظوں میں کرتے ہیں: خداوندا! آنیوالی امتوں میں میرے لیے لسانِ صدق اور ذکرِ خیر مقرر فرما (واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین)۔

اس طرح کر دے کہ میری یاد دلوں میں باقی رہ جائے اور میرا مقرر کردہ طریقہ کار آنے والی نسلوں میں دائم و برقرار رہے۔ میں ایک اُسوہ اور نمونۂ عمل قرار پاؤں کہ لوگ میری اقتداء کریں میرے ہاتھوں ایسے مکتب کی بنیاد رکھ جس سے لوگ تیرے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں۔

چنانچہ خداوندِ عالم نے آپؑ کی یہ درخواست بھی منظور فرمائی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وجعلنا لھم لسان صدق علیًا

ہم نے ابراہیم، اسحاق، اور یعقوب کے لیے ذکرِ خیر اور بلند مرتبہ زبان مقرر کر دی۔

(مریم / ۵۰)

بعید نہیں ہے کہ یہ درخواست بھی اسی درخواست میں شامل ہو جو جناب ابراہیم علیہ السّلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد ان لفظوں میں کی تھی۔

و ابعث فیھم رسولًا منھم یتلوا علیھم اٰیاتك و یعلمھم الکتاب والحکمة و یزکیھم

پروردگارا! ہماری (میری اور اسماعیل کی) اولاد میں ایک پیغمبر مبعوث فرما جو ان لوگوں پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور رشد و ہدایت کے ذریعے انھیں پاک کرے۔

(بقرہ / ۱۲۹)

چنانچہ معلوم ہے کہ آنجنابؑ کی اس دعا نے بھی پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے ساتھ عملی صُورت اختیار کر لی اور اس طرح سے اس عظیم اُمّت میں ان کا ذکرِ خیر دوام کی صورت اختیار کر گیا۔

اس کے بعد آپؑ اپنی نگاہوں کے افق کو تبدیل کر کے آخرت کی جاودانی زندگی کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں اور چوتھی دعا کے لیے عرض کرتے ہیں:

خداوندا! مجھے بہشت بریں کے وارثوں میں سے قرار دے (واجعلنی من ورثة جنة النعیم)۔

ایسی بہشت جس میں روحانی اور مادی نعمتیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں جن کو نہ تو کسی قسم کا زوال ہے اور نہ ہی وہاں پر کسی طرح کا رنج و ملال ہے ایسی نعمتیں جو ہم جیسے اس پست جہان کے قیدیوں کے لیے ذرّہ برابر بھی قابل ادراک نہیں نہ تو انھیں عقل سوچ سکتی ہے نہ کسی آنکھ نے انھیں دیکھا ہے اور نہ ہی کسی کان نے سُنا ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بہشت کے بارے میں "ارث" کی تعبیر یا تو اس لیے ہے کہ ارث بمعنی کسی نعمت کو بغیر کسی قسم کی تکلیف اور محنت و مشقت کے حاصل کرنے کے ہے اور یقیناً ہم جتنی تکلیفیں بھی اٹھائیں اور محنت و مشقت کریں پھر بھی وہ بہشت کی نعمتوں کے مقابلے میں ناچیز ہیں۔

یا پھر اس لیے کہ ہر انسان کا ایک گھر بہشت میں ہوتا ہے اور ایک جہنم میں اور جب وہ جہنم میں چلا جاتا ہے تو اس کا بہشت والا گھر دوسروں کو دے دیا جاتا ہے۔

پانچویں دعا میں ان کی نظر اپنے گمراہ چچا (آزر) کی طرف اٹھتی ہے چنانچہ اس وعدے کی بناء پر جو آپؑ نے ان سے دعائے مغفرت کے لیے پہلے سے کیا ہوا تھا بارگاہِ ایزدی میں عرض کرتے ہیں: خداوندا! میرے باپ (کی مانند چچا) کو بخش دے کیونکہ وہ گمراہوں میں سے ہے (واغفر لابی انہ کان من الضآلین)۔

اس قسم کا وعدہ جناب ابراہیم علیہ السلام نے پہلے سے اس سے کیا ہوا تھا جیسا کہ قرآن مجید کی صریح آیت اس بارے میں کہتی ہے:

وماکان استغفار ابراھیم لابیہ الاعن موعدۃ وعدھا ایاہ۔ (توبہ، ۱۱۴)

اس سے ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ اس کی تالیفِ قلب کر کے اسے ایمان کی طرف لے آئیں لہٰذا انھوں نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا اور اس پر عمل بھی کیا۔

جناب عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق جناب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر کے لیے دعائے مغفرت کی لیکن جب کفر کی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی اور دینِ برحق کے مقابلے میں اس کی دشمنی مسلّم ہو گئی تو آپ نے اس کے لیے استغفار کرنا بھی چھوڑ دی جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ہم پڑھتے ہیں" فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرأ منہ " یعنی جب یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ دشمنِ خدا ہے تو انھوں نے اس سے بیزاری اختیار کر لی [1]

آخر کار روزِ محشر کے بارے میں اپنے رب سے ان الفاظ میں چھٹی اور آخری دعا مانگتے ہیں: خداوندا! مجھے اس دن شرمسار اور رسوا نہ کرنا جس دن سب لوگ (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے (ولا تخزنی یوم یبعثون)۔

"لاتخزنی" "خزی" (بروزنِ "حزب") کے مادہ سے ہے۔ مفردات میں راغب کی تصریحات کے مطابق "روح کی شکست" (شرمساری) کے معنی میں ہے جو یا تو خود انسان کی اپنی وجہ سے ہوتی ہے جو زبردست حیاء کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے یا پھر کسی اور کی طرف سے اس پر مسلّط کی جاتی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ تعبیر ایک طرف تو دوسروں کے لیے درسِ عمل اور اسوۂ حسنہ ہے اور دوسری طرف اپنی ذمہ داری کا زبردست احساس اور خداوندِ عالم کے لطف و کرم پر حد درجہ بھروسے کی دلیل ہے۔

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد سورہ توبہ کی آیت ۱۱۴ کے ذیل میں مطالعہ فرمائیں۔

۸۸۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ
۸۹۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ؕ
۹۰۔ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ
۹۱۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۙ
۹۲۔ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ
۹۳۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ؕ
۹۴۔ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ۙ
۹۵۔ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ؕ
۹۶۔ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۙ
۹۷۔ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ
۹۸۔ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
۹۹۔ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ
۱۰۰۔ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۙ
۱۰۱۔ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ
۱۰۲۔ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
۱۰۳۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ
۱۰۴۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ع

ترجمہ

۸۸۔ جس دن مال اور اولاد کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔
۸۹۔ مگر جو شخص قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو۔
۹۰۔ (اس دن) بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک کردی جائے گی۔
۹۱۔ اور جہنم، گمراہ لوگوں کے لیے ظاہر ہوجائے گی۔
۹۲۔ اور ان سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ معبود کہ تم جن کی پرستش کیا کرتے تھے۔
۹۳۔ خدا کے علاوہ (دوسرے) معبود، آیا وہ تمھاری مدد کریں گے یا کوئی ان کی مدد کو آئے گا؟
۹۴۔ تو اس وقت تمام معبود (گمراہ) عابدوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔
۹۵۔ اور اسی طرح ابلیس کے سارے کے سارے لشکر۔
۹۶۔ وہ وہاں پر جھگڑے پر کمربستہ ہوکر کہیں گے:
۹۷۔ خدا کی قسم ہم تو واضح گمراہی میں تھے۔
۹۸۔ کیونکہ تمھیں عالمین کے رب کے برابر سمجھتے تھے۔
۹۹۔ لیکن ہمیں تو سوائے مجرمین کے کسی اور نے گمراہ نہیں کیا۔
۱۰۰۔ (افسوس کہ آج) ہماری شفاعت کرنے والے موجود نہیں۔
۱۰۱۔ اور نہ ہی کوئی گرمجوش اور محبت بھرا دوست۔
۱۰۲۔ اگر ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تو مومنین میں سے ہوجائیں گے۔
۱۰۳۔ اس ماجرے میں (عبرت اور) نشانی ہے، لیکن ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے۔
۱۰۴۔ اور تمھارا پروردگار عزیز اور رحیم ہے۔

تفسیر

معبودوں اور گمراہ عابدوں کا جھگڑا

گزشتہ گفتگو کی آخری آیت میں روزِ قیامت اور معاد کے مسئلے کی طرف ایک مختصر سا اشارہ تھا لیکن زیرِ نظر کئی آیات میں قیامت کے منظر کی جامع تصویر کشی کی گئی ہے اور اس بازار میں جس اہم ترین سودے کے خریدار پائے جاتے ہیں اس کا بھ ذکر موجود ہے اور مومن، کافر، گمراہ اور شیطانی ٹولے کے افراد کا بھی ذکر ہے آیات کے ظاہر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ توصیف اور تشریح حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا تتمہ اور ضمیمہ ہے اور اکثر مفسرین بھی یہی کہتے ہیں لیکن بعض مفسرین کا احتمال یہ ہے کہ زیرِ نظر تمام آیات خدا کی گفتگو کا حصہ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے فوراً بعد ان کی گفتگو کی وضاحت اور تکمیل کے طور پر آئی ہیں لیکن یہ احتمال ضعیف ہے۔

صورتِ حال خواہ کچھ ہو قرآن سب سے پہلے کہتا ہے: قیامت کا دن وہ دن ہے، جس میں کوئی بھی مال اور اولاد کسی قس کا فائدہ نہیں پہنچائیں گے (یوم لا ینفع مال و لا بنون)۔

درحقیقت جب دنیاوی زندگی کے دو اہم سرمائے، یعنی مال اور افرادی قوت اپنے صاحب کے لیے ذرہ بھر بھی مفید ثابت نہیں ہوں گے تو صاف ظاہر ہے کہ باقی دنیاوی سرمایہ جس کا شمار ان کے بعد ہوتا ہے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا ظاہر ہے کہ یہاں پر مال اور اولاد سے مراد ایسا مال اور اولاد نہیں ہے جس سے رضائے الٰہی کے حصول کا کام لیا جائے، ان کے مادی پہلو پر گفتگو کی جا رہی ہے یعنی اس دن مادی سرمایہ کسی مشکل کو حل نہیں کرسکے گا، لیکن اگر یہ چیزیں، یعنی مال اور ا راہِ الٰہی میں کام آجائیں تو وہ مادی سرمایہ نہیں کہلائیں گی بلکہ وہ رنگ الٰہی اور "صبغۃ اللہ" میں رنگ جائیں گی اور "الباقیات الص میں ان کا شمار ہونے لگے گا۔

پھر استثناء کے عنوان سے بات کو آگے بڑھاتا ہے: مگر جو شخص قلب سلیم لے کر اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو (اس ک ہر قسم کے شرک و کفر اور گناہوں کی آلائش سے پاک صاف اور صحیح و سالم ہو) (الا من اتی اللہ بقلب سلیم)۔

تو معلوم ہوا کہ قیامت کے دن جو سرمایہ نجات دے گا وہ قلب سلیم ہے اور بس۔ کیا ہی جامع اور عمدہ تعبیر ہے۔ ایک ایسی تعبیر ہے جس میں خالص ایمان بھی پایا جاتا ہے اور پاک نیت اور ہر قسم کا نیک عمل بھی۔ کیونکہ اس طرح کے پا پاکیزہ دل کا ثمرہ بھی پاک اور پاکیزہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح انسان کا دل اور روح اس کے اعمال میں مؤثر ہو ہیں اس کے اعمال کا بھی اس کے دل و جان پر وسیع ردِّعمل ہوتا ہے اور انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ اعمال رحمانی ہوں یا شیطانی ان کا دل و جان پر ضرور اثر ہوتا ہے۔

پھر جنت اور جہنم کی تشریح کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: اس وقت بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک کردی جا (وازلفت الجنۃ للمتقین)۔[1]

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور جہنم گمراہ لوگوں کے لیے ظاہر ہوگی (وبرزت الجحیم للغاوین)۔

درحقیقت یہ سب کچھ ان لوگوں کے جنت یا جہنم میں داخل ہونے سے پہلے ہوگا اور ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے ٹھکانے کا منظر نزدیک سے دیکھ لے گا، مومن مسرور و شادمان اور گمراہ مبہوت و وحشت زدہ ہوجائیں گے اور یہ ان کی پاداش اور جزا و سزا کا پہلا مرحلہ ہوگا۔

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ پرہیزگاروں کو بہشت کے نزدیک کردیا جائے گا بلکہ فرماتا ہے بہشت کو ان کے قریب کردیا جائے گا اور یہ ان متقین کی عظمت اور بلندیٔ درجات کی طرف اشارہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ " غاوین " (گمراہ لوگ) کی تعبیر وہی تعبیر ہے جو شیطان کی داستان میں آچکی ہے کہ جب شیطان بارگاہِ الٰہی سے دھتکار دیا گیا اور خدا نے فرمایا:

"ان عبادی لیس لک علیھم سلطان الا من اتبعک من الغاوین"

تجھے میرے بندوں پر تسلط حاصل نہیں ہوگا، مگر جو لوگ گمراہ ہیں وہ تیری پیروی کریں گے۔

(حجر / ۴۲)

پھر اس گفتگو کا تذکرہ کرتا ہے جس کے ذریعے اس گمراہ گروہ کو سرزنش اور عتاب کیا جائے گا، فرماتا ہے انھیں کہا جائے گا کہاں ہیں تمھارے وہ معبود کہ جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے (وقیل لھم این ما کنتم تعبدون)۔

وہی معبود جو خدا کے علاوہ تھے (من دون اللہ)۔

اب جبکہ ان شدید مصائب اور سختیوں میں تم گھرے ہوئے ہو تو کیا وہ تمھاری مدد کر رہے ہیں (ھل ینصرونکم)۔

کسی کو تمھاری امداد کے لیے بلا رہے ہیں یا کوئی ان کی امداد کو آرہا ہے (او ینتصرون)[1]

لیکن وہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے اور نہ ہی کسی کو ان سے اس قسم کی توقع ہے۔

اس موقع پر تمام معبودوں کو اکٹھا کرکے ان کے گمراہ عابدوں کے ساتھ انھیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا (فکبکبوا فیھا ھم والغاوون)۔

بعض مفسرین کے بقول ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر اوندھے منہ ڈالا جائے گا۔

اور اسی طرح ابلیس کے لشکری تمام کے تمام (وجنود ابلیس اجمعون)۔

درحقیقت یہ تینوں گروہ یعنی بُت، بتوں کے پجاری اور شیطان کے لشکری جو کہ ان گناہوں کے دلال ہیں سب کے سب دوزخ میں جمع کیے جائیں گے لیکن اس طرح کہ انھیں یکے بعد دیگرے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) "از لغت " " زلفی " (بروزن کبریٰ) قرب اور نزدیکی کے معنی میں ہے۔

[1] ممکن ہے کہ "ینتصرون " اپنے لیے مدد طلب کرنے کی طرف یا دوسروں کے لیے مدد طلب کرنے کی طرف یا ہر دو کے لیے مدد کی درخواست کی طرف اشارہ ہو کیونکہ بعد والی آیات میں ہے کہ معبود اور عابد دونوں جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

چونکہ " کبکبوا " دراصل " کب " کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو گڑھے میں منہ کے بل ڈالنا اور " کب " کو مکرر صورت (کبکب) میں لانا ان کو جہنم میں لڑھکانے کا معنیٰ بیان کرتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دوزخ میں ایسے ڈالا جائے گا جس طرح کسی پتھر کو ڈالا جاتا ہے کہ اسے ایک بلند مقام سے گرایا جائے تو پہلے وہ درے میں آگرے گا پھر ایک اور جگہ پھر وہاں سے کسی اور جگہ اسی طرح گرتے گرتے وہ گہرے کھڈ میں جا پڑے گا۔[1]

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کے بعد ان جہنمیوں کی باہمی تلخ کلامی اور جھگڑے فساد کی منظرکشی کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ جہنم میں آپس میں لڑائی جھگڑا کریں گے اور کہیں گے (قالوا وھم فیھا یختصمون)۔

جی ہاں وہ گمراہ عابد کہیں گے: خدا کی قسم ہم تو کھلم کھلا گمراہی میں تھے (تاللہ ان کنا لفی ضلال مبین)[2]

کیونکہ تم جھوٹے معبودوں کو رب العالمین کے برابر سمجھتے تھے (اذ نسویکم برب العالمین)[3]۔

لیکن سوائے مجرمین کے ہمیں کسی نے بھی گمراہ نہیں کیا (وما اضلنا الا المجرمون)۔

وہی مجرمین جو ہمارے معاشرہ کے سرغنے تھے اور جنھوں نے اپنے مفادات کی خاطر ہمیں قربانی کا بکرا بنایا اور بدبختی کے اس مقام پر لے آئے۔

لیکن افسوس کہ ہماری شفاعت کرنے والے موجود نہیں (فما لنا من شافعین)۔

اور نہ ہی کوئی گرم جوش اور محبّت کرنے والا دوست ہے جو ہماری مدد کرسکے (ولا صدیق حمیم)۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح ہم دنیا میں سمجھتے تھے کہ ہمارے معبود ہماری مدد کریں گے لیکن ایسا نہیں ہے اور وہ ہماری مدد نہیں کر رہے اور نہ ہی ہمارے دوستوں میں مدد کا یارا ہے۔

قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ گزشتہ آیت میں " شافعین " جمع اور " صدیق " مفرد کی صورت میں آیا ہے ممکن ہے کہ یہ تفاوت اس لیے ہو کہ گمراہوں کا یہ گروہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ جو مومنین دنیا میں لغزشوں کا شکار تھے آج انھیں انبیاء، اوصیاء، ملائکہ اور دوسرے شفاعت کرنے والے دوستوں کی شفاعت نصیب ہو رہی ہے، تو وہ بھی یہی آرزو کریں گے کہ اے کاش!

---

[1] موجودہ فارسی میں " کبکبہ " سواروں کی جماعت یا گھوڑوں اور انسانوں کے اکٹھا چلنے کی صدا کو کہا جاتا ہے اور یہ شان و شوکت اور عظمت و جلال کے لیے کنایہ ہے (فرہنگ معین)۔
بعید نہیں کہ اس کلمہ کو " کبکوبہ " (دونوں کاف پر پیش کے ساتھ) سے لیا گیا ہو جو عربی میں انسانوں کی جماعت یا گھوڑوں کے ٹولے کے معنیٰ میں ہے اور کبھی اسے فارسی میں " دبدبہ " بھی استعمال کرتے ہیں جس کا معنیٰ بھی لوگوں کے پاؤں کی یا ڈھول باجے وغیرہ کی صدا ہے۔

[2] " ان کنا " میں " ان " مثقلہ سے مخففہ بن کر استعمال ہوا ہے جو دراصل " انا کنا " تھا۔

[3] ہوسکتا ہے کہ یہاں پر " اذ " ظرفیت کے معنیٰ میں ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ تعلیلیہ ہو۔

کران کا بھی کوئی شفاعت کرنے والا اور دوست ہوتا۔

رہا "صدیق" تو بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق "صدیق" اور "عدو" کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی

لیکن بہت جلد ان کو اس حقیقت کا پتہ چل جائے گا کہ اب افسوس کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی وہاں پر کوئی نیک عمل کرکے
اپنی کوتاہیوں کی تلافی کی جاسکتی ہے لہٰذا وہ دنیا میں واپس آنے کی آرزو کریں گے اور کہیں گے: اگر ہم دوبارہ دنیا میں پلٹ جائیں تو
مومنوں میں سے ہوں گے (فلوان لنا کرۃ فنکون من المؤمنین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ وہاں پر اور اس دن ایمان لے آئیں گے، لیکن ان کا یہ ایمان ایک طرح سے مجبوری والا ایمان ہوگا
ایمان وہ مؤثر، تعمیری اور قابلِ قبول ہوتا ہے جو اختیاری ہو اور اسی جہان میں ہو۔ جس سے ہدایت بھی حاصل ہو اور اعمالِ صالحہ
بھی سرزد ہوں۔

لیکن یہ آرزو بھی کسی صورت میں کوئی مشکل حل نہیں کرے گی اور طریقۃ الٰہیہ کسی کو واپس پلٹنے کی اجازت نہیں دے گا اور وہ خود
بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہوں گے اور کلمہ "لو" اسی بات کی دلیل ہے[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گمراہ قوم کے ساتھ گفتگو، بارگاہِ ربُّ العزّت میں ان کی دعا اور روزِ قیامت کی کیفیت بیان
کرنے کے بعد خداوندِ عالم نے تمام لوگوں کے لیے نتیجہ کے طور پر آخر میں وہی دو آیات ذکر کی ہیں جو موسیٰؑ اور فرعون کی داستان کے
آخر میں ذکر کی ہیں اور اسی سورہ میں دوسرے انبیاء کی داستانوں میں بھی آئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: اس ماجرے میں خدا کی عظمت و
قدرت اور گمراہ لوگوں کے دردناک انجام اور مومنین کی کامیابی میں بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے (ان
فی ذلک لاٰیۃ و ما کان اکثرھم مؤمنین)۔

اور تمھارا پروردگار ناقابلِ تسخیر اور بے حد مہربان ہے (وان ربک لھو العزیز الرحیم)۔

اس قسم کے جملوں کو بار بار اس لیے دہرایا جاتا ہے تاکہ اس طرح سے پیغمبر اسلامؐ اور اس زمانے کے تھوڑے سے مسلمانوں
کی تسلّی خاطر کے اسباب فراہم کیے جاسکیں، نیز اس لیے بھی کہ کسی دور میں بھی مومن اقلیت گمراہ اکثریت سے وحشت نہ کرے اور خدا کی
عزّت و رحمت کے ذریعے اپنے آپ کو مشغول اور سرگرم رکھے۔ نیز یہ گمراہ لوگوں کے لیے ایک قسم کی تنبیہ اور اس بات کی طرف
اشارہ بھی ہے کہ اگر انھیں کچھ ڈھیل دی جارہی ہے تو اس لیے نہیں کہ خداوندِ عالم کمزور ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ رحیم ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ **"قلبِ سلیم" ہی نجات کا سرمایہ ہے:** آیاتِ بالا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو کے دوران قیامت
کی کیفیت کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ سوائے "قلبِ سلیم" کے اور کچھ کام نہیں آئے گا۔

"سلیم" "سلامت" کے مادہ سے ہے جس کا مفہوم واضح ہے یعنی وہ دل جو ہر قسم کی بیماری اور اخلاقی و اعتقادی بے راہروی سے

[1] "لو" حرفِ شرط ہے اور عام طور پر وہاں بولا جاتا ہے جہاں پر شرط محال ہو۔

پاک ہو۔

قرآنِ مجید منافق لوگوں کے بارے میں یہ فرماتا ہے:

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا

ان کے دلوں میں ایک طرح کی بیماری ہے اور ان کی ہٹ دھرمی کی بناء پر خداوندِ عالم ان کی
بیماری میں اضافہ کردیتا ہے۔ (بقرہ / ۱۰)

چند ایک احادیث میں قلبِ سلیم کا بخوبی تعارف کروایا گیا ہے:

ا۔ اسی آیت کے ذیل میں ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

و کل قلب فیہ شرک او شک فھو ساقط

ہر وہ دل جس میں شرک اور شک ہو اور جو ساقط اور بے قدر و قیمت ہوتا ہے[1]

۲۔ یہی معلوم ہوا کہ انسان کا مادی چیزوں سے شدید تعلق ہے اور دنیا پرستی اسے ہر گناہ پر آمادہ اور ہر قسم کی
بے راہروی کا شکار بنادیتی ہے کیونکہ:

حب الدنیا رأس کل خطیئۃ

دنیا سے محبت ہر برائی کا سرچشمہ ہے[2]

لہٰذا "قلبِ سلیم" وہ دل ہوتا ہے جو "حُبِّ دنیا" سے خالی ہو، جیسا کہ اسی آیت کے ضمن میں حضرت امام جعفر صادق
علیہ السلام کی ایک اور حدیث میں ہے:

ھو القلب الذی سلم من حب الدنیا

یہ وہ قلب ہوتا ہے جو دنیا کی محبّت سے محفوظ ہو[3]

اگر سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۷ کو مدِّنظر رکھا جائے، جس میں خدا فرماتا ہے:

و تزوّدوا فان خیر الزاد التقوٰی

اپنے لیے زادِ راہ تیار کرلو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔

تو معلوم ہوگا کہ قلبِ سلیم وہ قلب ہوتا ہے جس میں تقوائے الٰہی جاگزیں ہو۔

۳۔ آخری بات یہ ہے کہ قلبِ سلیم وہ قلب ہوتا ہے جس میں خدا کے علاوہ اور کوئی چیز نہ ہو۔
جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اسی آیت کے سلسلے میں کیے جانے والے ایک سوال کے جواب میں

[1] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] بحار الانوار جلد ۷۰، ص ۲۳۹۔

[3] تفسیر صافی اسی آیت کے ضمن میں۔

ارشاد فرماتے ہیں :۔

القلب السليم الذی يلقی ربه وليس فيه احد سواه

قلب سلیم وہ دل ہے جو خدا کی ملاقات کرے جبکہ اس میں خدا کے سوا کوئی اور نہ ہو[1]

واضح سی بات ہے کہ اس جیسے مقامات پر قلب سے مراد انسان کی روح اور جان ہوتے ہیں۔

اسلامی روایات میں قلب، اس کی سلامتی، اس کو لاحق ہونے والی آفتیں اور ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں بہت سی باتیں مذکور ہیں جن سے اس اسلامی منطق کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام ہر چیز سے پہلے فکری، عقیدتی اور اخلاقی بنیادوں کو زبردست اہمیت دیتا ہے کیونکہ انسان کے تمام اعمال کا دارو مدار انہی چیزوں پر ہے۔

جس طرح کہ ظاہری دل کی سلامتی اور تندرستی سے تمام جسم صحیح سالم اور تندرست رہتا ہے اور اس کے بیمار پڑ جانے سے تمام اعضاء بیمار ہو جاتے ہیں کیونکہ بدن کے تمام خلیوں (Cells) کو غذا خون کے ذریعے ملتی ہے اور خون، دل کے ذریعے بدن کے تمام حصوں میں پہنچتا ہے۔

بالکل اسی طرح انسانی زندگی کے سالم اور فاسد ہونے کا دارو مدار بھی اس کے عقیدے اور اخلاق کے سالم اور فاسد ہونے پر ہے۔

اس تفصیلی گفتگو کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں :

قلب چار قسم کے ہیں :۔

ایک وہ دل جس میں ایمان ہوتا ہے اور نفاق بھی۔

ایک وہ دل جو الٹا ہوتا ہے۔

ایک وہ دل جس پر مُہر لگی ہوتی ہے اور کوئی حق وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک وہ دل جو نورانی اور (غیر خدا سے) خالی ہوتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں :۔

نورانی دل مومن کا دل ہوتا ہے جس طرح خدا فرماتا ہے "افمن يمشی مكبا على وجهه اهدى امن يمشی سويا على صراط مستقيم" یعنی آیا جو شخص زمین پر منہ کے بل چلتا ہے وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا جو شخص سیدھے ہو کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہے"؟ (الملک ـــ ۲۲)

اور وہ دل جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی، تو یہ ایسے لوگوں کا دل ہے جو حق اور باطل کے بارے میں بالکل لاتعلق ہوتے ہیں اور ان کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اگر حق کے ماحول میں پہنچ جائیں تو حق کے تابع ہو جاتے ہیں اگر باطل کے ماحول میں پھنس جائیں تو اس کے

[1] صافی بحوالہ کافی۔

طرف دار بن جاتے ہیں۔

رہا وہ دل کہ جس پر مہر لگی ہوتی ہے وہ منافقین کا دل ہوتا ہے[1]

۲۔ آیت "فكبكبوا ......" کا مفہوم : حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے "فكبكبوا فيها هم والغاوون" والی آیت کے ذیل میں بہت سی روایات منقول ہیں۔ مثلاً

هم قوم وصفوا عدلا بالسنتهم ثم خالفوه الى غيره

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حق و انصاف کی زبان سے تو بڑی تعریف کرتے ہیں لیکن عمل میں اس کی مخالفت کرتے ہیں[2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کے بغیر باتیں کرنا کس قدر بُری اور قابلِ مذمت بات ہے اور اس قسم کے شخص کو جہنم کی آگ میں دردناک طریقے سے ڈالا جائے گا اور وہ وہ لوگ ہوں گے جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ان کی باتیں تو لوگوں کو حق کی طرف بلاتی ہیں لیکن اعمال باطل کی طرف دعوت دیتے ہیں، بلکہ ان کے اعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اپنی باتوں پر ایمان نہیں ہے۔

ضمنی طور پر اس طرف بھی توجہ رہے کہ "غاوون" کو "غی" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہر قسم کی گمراہی نہیں بلکہ "مفردات" میں "راغب" کے بقول یہ گمراہی اور جہالت کی وہ قسم ہے جس کا مرکز اور منبع فاسد عقیدہ ہوتا ہے۔

۳۔ آیت "فما لنا من شافعين ولا صديق حميم" کا مفہوم : اس کا معنیٰ ہے نہ تو ہمارے شفاعت کرنے والے موجود ہیں اور نہ ہی محبت بھرے دوست متعدد روایات اس ضمن میں بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض روایات میں صراحت کے ساتھ آیا ہے :

الشافعون الائمة والصديق من المؤمنين

شافع تو آئمہ ہیں اور صدیق مومنین ہیں[3]

ایک اور حدیث میں جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے :۔

ان الرجل يقول فی الجنة ما فعل صديقی فلان، وصديقه فی الجحيم، فيقول الله اخرجوا له صديقه الى الجنة فيقول من بقی فی النار فما لنا من شافعين ولا صديق حميم

بعض بہشتی لوگ کہیں گے کہ ہمارے دوست کا کیا انجام ہوا ہے جبکہ ان کے دوست جہنم میں

[1] اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۳۰۹ باب فی ظلمة قلب المنافق۔

[2] تفسیر نور الثقلین کے مؤلف نے اس روایت کو "اصولِ کافی"، "تفسیر علی بن ابراہیم" اور "محاسنِ برقی" سے نقل کیا ہے۔

[3] "محاسنِ برقی" منقول از تفسیر نور الثقلین اسی آیت کے ضمن میں۔

ہوں گے۔ خداوندِ عالم اس مومن کے دل کو خوش کرنے کے لیے حکم دے گا کہ ان کے دوستوں کو جہنم سے نکال کر بہشت میں بھیج دیا جائے تو ایسے موقع پر جہنم میں باقی رہ جانے والے لوگ کہیں گے ہائے افسوس! نہ تو کوئی ہماری شفاعت کرنے والا ہے اور نہ ہی کوئی مہربان دوست ہے[1]

ظاہر ہے کہ نہ تو شفاعت کسی معیار کے بغیر ہوگی اور نہ ہی بے حساب دوستوں کے بارے میں ان کی درخواست [illegible] ہوگی بلکہ شفاعت کرنے اور شفاعت کیے جانے والوں کے درمیان کسی قسم کا معنوی اور روحانی رابطہ ہونا ضروری ہے تاکہ شفاعت کا مقصد پورا ہو۔ (شفاعت کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۴۸ کی تفسیر مطالعہ فرمائیں)۔

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

۱۰۵۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۰۶۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝

۱۰۷۔ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝

۱۰۸۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝

۱۰۹۔ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

۱۱۰۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝

۱۱۱۔ قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ۝

۱۱۲۔ قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

۱۱۳۔ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ۝

۱۱۴۔ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

۱۱۵۔ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝

ترجمہ

۱۰۵۔ نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔

۱۰۶۔ جب ان کے بھائی نوحؑ نے انھیں کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

۱۰۷۔ میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں۔

۱۰۸۔ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۰۹۔ اس تبلیغ رسالت کے بدلے میں، میں تم سے کسی قسم کی مزدوری نہیں مانگتا، میرا اجر تو میرے پروردگار کے پاس ہے۔

۱۱۰۔ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔
۱۱۱۔ انھوں نے کہا: آیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں جبکہ پست اور رذیل لوگ تیری پیروی کر چکے ہیں۔
۱۱۲۔ (نوح نے) کہا: مجھے کیا معلوم ان کے عمل کیسے ہیں؟
۱۱۳۔ ان کا حساب وکتاب تو میرے پروردگار کے ذمے ہے اگر تم سمجھ دار ہو۔
۱۱۴۔ میں کبھی بھی مومنین کو نہیں دھتکاروں گا۔
۱۱۵۔ میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

تفسیر

نوحؑ کے گرد افراد

قرآن مجید جناب ابراہیم علیہ السلام کی داستان اور ان کی اپنی گمراہ قوم کے ساتھ گفتگو کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ کرتا ہے اور اسے ایک اور سبق آموز داستان کی صورت پیش کرتا ہے اور چند آیات میں اس قوم کی ہٹ دھرمی، ضد اور بغض کو ان کے دردناک انجام کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

سب سے پہلے کہتا ہے: قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا (کذبت قوم نوح المرسلین)[1]

معلوم ہے کہ نوح کی قوم نے صرف نوح کی ہی تکذیب کی تھی لیکن چونکہ اصولی طور پر تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت ایک ہوتی ہے لہذا نوح کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب شمار ہوئی۔ لہذا خدا بھی یہی فرماتا ہے کہ نوح کی قوم نے "رسولوں" کو جھٹلایا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم تمام ادیان اور مذاہب ہی کی منکر ہو اور وہ خدا کے تمام انبیاء کی تکذیب کرتی ہو چاہے وہ نوح سے پہلے گزر چکے تھے یا ان کے بعد آنے والے تھے۔

پھر ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کی طرح ان کی زندگی کا بلند نصب العین بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ان کے بھائی نوح نے انھیں کہا: کیا تم پرہیز گاری اختیار نہیں کرتے ہو (اذ قال لهم اخوهم نوح الا تتقون)۔

---

[1] "کذبت" کو مؤنث اس لیے لایا گیا ہے کہ "قوم" "جماعت" کے معنیٰ میں ہے اور جماعت مونث لفظی ہے۔ بعض ارباب فن کہتے ہیں کہ قوم مونث ذاتی ہے کیونکہ اس کی تصغیر "قویمة" آتی ہے (پہلی بات طبرسی نے مجمع البیان میں اور دوسری فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کہی ہے) لیکن آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں کہتے ہیں کہ لفظ "قوم" مذکر اور مؤنث دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔

"بھائی" کی تعبیر ایسی ہے جو مساوات اور برابری کی بنیاد پر ایک نہایت ہی محبت آمیز تعلق کو ظاہر کرتی ہے یعنی حضرت نوح علیہ السلام ان پر کسی قسم کی برتری جتائے بغیر نہایت ہی سادگی اور صمیم قلب کے ساتھ انھیں دعوت پرہیز گاری دیتے رہے۔

اخوت کی تعبیر صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی کے لیے نہیں آئی بلکہ ہود، صالح اور لوط علیہم السلام جیسے دوسرے انبیاء کے لیے بھی آئی ہے جو راہ حق کے تمام راہنماؤں کی راہنمائی کر رہی ہے کہ ان کی دعوت نہایت ہی پیار، محبت اور عزم و خلوص پر مبنی ہونی چاہیے اور ہر قسم کی فوقیت طلبی سے دوری اختیار کرنی چاہیے تاکہ دین حق سے دور بھاگے ہوئے دل زیادہ سے زیادہ نزدیک آجائیں اور کسی قسم کا بوجھ بھی اپنے لیے محسوس نہ کریں۔

چونکہ ہر قسم کی ہدایت اور مکمل نجات کا دارومدار تقویٰ پر ہے لہذا اسے پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: میں تمھارے لیے (اللہ کا) امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔

"خدا سے ڈرو، تقویٰ اپناؤ اور میری اطاعت کرو" (فاتقوا الله و اطیعون)۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی امانت کے لحاظ سے اپنی قوم میں ایک عرصہ دراز سے مسلم حیثیت تھی اور لوگ آپؑ کو "امین" کی اعلیٰ صفت کے ساتھ پہچانتے تھے۔ اسی لیے آپؑ بھی فرماتے ہیں: اسی دلیل کی بناء پر میں خدائی رسالت کی ادائیگی میں بھی امین ہوں اور مجھ سے کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں دیکھو گے۔

"تقویٰ" کو "اطاعت" پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ "اللہ" کی ذات پر مکمل ایمان و اعتقاد نہ ہو اور دل میں اس کی ذات کا خوف نہ ہو تو اس کے پیغمبر کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

ایک بار پھر حضرت نوح علیہ السلام اپنی نبوت کی حقانیت پر ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں۔ یہ ایسی دلیل ہے جس سے بہانہ بنانے والے لوگوں کی زبان بند کر دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں: میں تم سے اس دعوت کے عوض میں کوئی مزدوری نہیں مانگتا (و ما اسئلکم علیه من اجر)۔

"میرا اجر تو پروردگار عالم کے ذمے ہے" (ان اجری الا علی رب العالمین)۔

ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی عموماً نبوت کے دعویدار کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے جبکہ مادی اغراض بخوبی واضح کرتی ہیں کہ اس کا مقصد مفاد پرستی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ خاص کر اس زمانے کے اعراب اس مسئلے کے سلسلے میں کاہنوں اور ان جیسے افراد سے اچھی طرح واقف تھے۔

اس جملے کے بعد پھر وہی جملہ کہتے ہیں جو انھوں نے اپنی رسالت اور امانت کو بیان کرنے کے بعد کہا تھا: فرماتے ہیں: خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (فاتقوا الله و اطیعون)۔

لیکن ہٹ دھرم مشرکین اور خود سر متکبرین نے جب بہانہ تراشیوں کی تمام راہیں اپنے اوپر بند دیکھیں تو یہ بہانا بنانا شروع کر دیا اور کہا: آیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں جب کہ پست اور رذیل لوگ تیری پیروی کر چکے ہیں (قالوا انؤمن لك واتبعك الارذلون)۔

کسی رہبر اور پیشوا کی حیثیت اور اس کی قدر و قیمت اس کے پیروؤں سے پہچانی جاتی ہے اور اصطلاح کے مطابق

صاحبِ مزار کو اس کے زائرین سے پہچانا جاتا ہے جب ہم تمھارے پیروکاروں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں چند ایک بے بضاعت گمنام، فقیر اور غریب لوگ ہی نظر آتے ہیں جن کا سلسلۂ روزگار بھی نہایت ہی معمولی ہے تو پھر ایسی صورت میں تم کس طرح امید کر سکتے ہو کہ مشہور و معروف دولت مند اور نامی گرامی لوگ تمھارے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیں گے۔

ہم اور یہ لوگ کبھی بھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے ہم نہ تو کبھی ایک دسترخوان پر بیٹھے ہیں اور نہ ہی ایک چھت کے نیچے اکٹھے ہوئے ہیں تمھیں ہم سے کیسی غیر معقول توقع ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ اپنی اس بات میں سچے تھے کہ کسی پیشوا کو اس کے پیروکاروں سے پہچانا جاتا ہے لیکن ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے شخصیت کے مفہوم اور معیار کو اچھی طرح نہیں پہچانا تھا۔ ان کے نزدیک شخصیت کا معیار مال، دولت لباس اور گھر اور خوبصورت اور قیمتی سواری تھا لیکن طہارت، تقویٰ، حق جوئی جیسی اعلیٰ انسانی صفات سے غافل تھے جو غریبوں میں زیادہ اور امیروں میں کم پائی جاتی ہیں۔

طبقاتی اونچ نیچ بدترین صورت میں ان کی افکار پر حکم فرما تھی۔ اسی لیے وہ غریب لوگوں کو "اراذل" سمجھتے تھے۔ "اراذل"، "اَرذل" (بروزن "اہرم") کی جمع ہے اور وہ بھی "رذل" بمعنی پست اور حقیر کی جمع ہے اور اگر وہ طبقاتی معاشرے کے قید خانے سے باہر نکل کر سوچتے اور باہر کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو انھیں معلوم ہوجاتا کہ ایسے لوگوں کا ایمان اس پیغمبر کی حقانیت اور اس کی دعوت کی سچائی پر بذاتِ خود ایک دلیل ہے۔

لیکن نوح علیہ السلام انھیں یہ کہہ کر فوراً لاجواب کر دیتے ہیں کہ میرا کام تو حق کی طرف دعوت دینا اور معاشرے کی اصلاح کرنا ہے میں کیا جانوں کہ وہ کیا کرتے تھے (قال و ما علمی بما کانوا یعملون)۔

ان کا ماضی جو کچھ تھا وہ گزر چکا، معیار موجودہ حالت ہے اور آج انھوں نے خدائی راہبر کی دعوت کو "لبیک" کہا ہے اپنی اصلاح کے لیے تیار ہوگئے ہیں اور اپنے دل کو حق کے قبضۂ قدرت میں دے دیا ہے۔

انھوں نے گزشتہ زمانے میں اچھا یا برا کام کیا ہے تو "ان کا حساب و کتاب میرے پروردگار کے پاس ہے اگر تم کچھ سمجھدار ہو" اور تمھارے اندر قوتِ تمیز موجود ہے، (ان حسابھم الا علی ربی لو تشعرون)۔

اس گفتگو سے ضمنی طور پر یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ لوگ ان مومنین کو غربت کے علاوہ اخلاقی اور عملی جرائم کا الزام بھی دینا چاہتے تھے کہ ان کے ماضی کا ریکارڈ خراب رہا ہے۔ حالانکہ اخلاقی جرائم معاشرے کے خوشحال طبقے میں کئی درجے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ان جرائم کے ہر طرح کے وسائل اور ذرائع ہوتے ہیں، وہ اپنے مال اور دولت کے نشے میں مغرور ہوتے ہیں اور خدا کے بندے بہت کم ہوتے ہیں۔

لیکن نوح علیہ السلام نے ان سے اس مسئلے میں الجھے بغیر یہی کہا کہ میں نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی اور اگر واقعاً ایسا ہے جیسا تم کہتے ہو تو پھر ان کا حساب و کتاب خدا پر ہے۔

جو میرا فریضہ بنتا ہے وہ یہی ہے کہ میری دعوت سب حق طلب انسانوں کے لیے ہے "میں کبھی ایمان لانے والوں کو دھتکاروں گا نہیں" (و ما انا بطارد المؤمنین)۔

درحقیقت یہ ان مغرور دولت مندوں کی ضمنی درخواست کا جواب ہے جو انھوں نے جناب نوح علیہ السلام سے کی تھی کہ ان غریبوں کو اپنے اطراف سے ہٹادیں تاکہ ہم آپ کے پاس آئیں۔

میرا فریضہ صرف یہی ہے کہ لوگوں کو ڈراؤں میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں (ان انا الا نذیر مبین)۔

جو شخص میری اس تنبیہ کو سنے اور کجروی سے صراطِ مستقیم پر آجائے تو وہ میرا پیروکار ہے۔ خواہ کوئی ہو اور اس کی مادی اور اجتماعی کیفیت خواہ کیسی ہی ہو۔

پھر قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتراض صرف حضرت نوح علیہ السلام پر ہی نہیں کیا کہ جو سب سے پہلے اولوا العزم رسول ہیں بلکہ پیغمبر خاتم الانبیاء اور اسی طرح دوسرے کئی انبیاء پر بھی کیا ہے انھوں نے اپنی سیاہ عینک سے ان سفید لباس والوں کو تاریکی میں دیکھا اور ہمیشہ انھیں دور کرنے کا تقاضا کرتے رہے۔ بلکہ وہ تو خدا اور ان انبیاء کو نہیں چاہتے تھے جن کے اس قسم کے پیروکار تھے۔

لیکن قرآن مجید سورۂ کہف میں کیسے عمدہ پیرائے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے:

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدوة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان امره فرطًا۔ (کہف: ۲۸)

ان لوگوں کے ساتھ رہو جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور صرف اسی کی ذات کو چاہتے ہیں اور اپنی آنکھوں کو دنیاوی زینت کی خاطر کبھی بھی ان سے نہ پھیرو اور ان لوگوں کی اطاعت مت کرو جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا، وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے اپنے نفس کی اطاعت کی ہے اور ان کا کام حد سے بڑھا ہوا ہے۔

یہی اعتراض ہمارے زمانے میں راہِ حق کے راہنماؤں اور رہبروں پر بھی کیا جاتا ہے کہ تمھارے طرفداروں کی زیادہ تر تعداد مستضعفین اور غریب لوگوں پر مشتمل ہے۔

اس طرح سے وہ ان کے عیب بیان کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ لاشعوری طور پر ان کی تعریف اور ان کے مشن کی حقیقت کی تائید کر رہے ہوتے ہیں۔

۱۱۶۔ قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ○
۱۱۷۔ قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ○
۱۱۸۔ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○
۱۱۹۔ فَأَنجَيْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ○
۱۲۰۔ ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ ○
۱۲۱۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ○
۱۲۲۔ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ○

ترجمہ

۱۱۶۔ انھوں نے کہا: اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو سنگسار کیے جاؤ گے۔
۱۱۷۔ (نوح نے) کہا: پروردگارا! میری قوم نے میری تکذیب کی ہے۔
۱۱۸۔ اب میرے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے (اور فیصلہ فرمادے) اور مجھے اور جو مومنین میرے ساتھ ہیں ان کو نجات دے۔
۱۱۹۔ ہم نے نوح اور جو (لوگ اور جانور کشتی میں) ان کے ساتھ تھے سب کو نجات دی۔
۱۲۰۔ پھر باقی سب کو غرق کر دیا۔
۱۲۱۔ اس واقعے میں واضح نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے۔
۱۲۲۔ اور تمھارا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

نوحؑ نجات پاگئے اور مشرک غرق ہوگئے

حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے اس گمراہ اور ہٹ دھرم قوم کا ردعمل بھی وہی ہے جو تاریخ میں دوسرے متکبرین کا

رہا ہے یعنی وہی طاقت، اکڑ اور جان سے مار دینے کی دھمکی چنانچہ حضرت نوحؑ کی قوم والے بولے "اے نوح! اب تک جو کچھ ہوا ہے کافی ہے اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے اور ہمارے ماحول کو اپنی گفتگو سے پھر تلخ اور تاریک بنایا تو یقیناً تمھیں سنگسار کیا جائے گا" (قالوا لئن لم تنتہ یا نوح لتکونن من المرجومین)۔

"من المرجومین" کی تعبیر بتاتی ہے کہ ان میں سنگسار کرنے کی رسم پرانے وقتوں سے چلی آرہی تھی۔ وہ درحقیقت نوح علیہ السلام سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر تم نے اپنی دعوتِ توحید کو جاری رکھا اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف ایسے ہی بلاتے رہے تو تمھارا انجام بھی ہمارے دوسرے مخالفین کا سا ہوگا اور وہ ہے سنگساری جو قتل کی بدترین صورت ہے[1]

جب نوح علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ اس قدر مدت مدید تک میں انھیں دعوت دیتا رہا ہوں، اس واضح منطق کے ساتھ ان سے گفتگو کرتا رہا ہوں اور صبر و شکیبائی کی بھی حد کر دی، اس کے باوجود اس کا اثر صرف محدودے چند لوگوں پر ہی ہوا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی شکایت اللہ کی بارگاہ میں پیش کر دی۔ جس میں اپنا مفصل حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان بے منطق ظالم لوگوں کے چنگل سے نجات اور ان سے جدائی کی درخواست بھی کی۔

انھوں نے عرض کیا پروردگارا! "میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے" (قال رب ان قومی کذبون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ خداوند عالم ہر چیز سے آگاہ ہے، لیکن اپنی شکایت پیش کرنے اور اپنی بعد کی درخواست پیش کرنے کے لیے مقدمے کے طور پر یہ عرض کرتے ہیں۔

قابلِ توجہ یہ بات بھی ہے کہ جناب نوح علیہ السلام اپنی اس درخواست میں اپنی ذات پر نازل ہونے والے مصائب کی شکایت نہیں کرتے بلکہ انھیں غم ہے تو صرف اس بات کا کہ لوگوں نے انھیں جھٹلایا اور خدائی پیغام قبول نہیں کیا۔

پھر عرض کرتے ہیں: اب جبکہ اس گمراہ ٹولے کے لیے ہدایت کا کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا "تو میرے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے اور ہمارے درمیان تو خود ہی فیصلہ فرما دے": (فافتح بینی وبینھم فتحًا)۔

جیسا کہ اربابِ لغت کہتے ہیں "فتح" دراصل کھولنے اور تعلقات کو ختم کرنے کے معنی میں ہے اور اس کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے، کبھی تو اس کا حسی پہلو ہوتا ہے جیسے "فتح الباب" (دروازے کا کھولنا) اور کبھی معنوی پہلو ہوتا ہے جیسے "فتح الھم" (رنج و غم کا کھولنا اور ان کا دور کرنا) اور "فتح المستغلق من العلوم" کا معنی علمی موشگافیاں ہے اور "فتح القضیۃ" کا معنی فیصلہ کرنا اور لڑائی جھگڑے کو ختم کرنا ہے۔

پھر وہ بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں مجھے اور جو مومنین میرے ساتھ ہیں انھیں نجات دے (ونجنی ومن معی من المؤمنین)۔

اب یہاں پر رحمتِ الٰہی جناب نوحؑ کی مدد کو پہنچتی ہے اور دردناک سزا کی وعید جھٹلانے والوں کو تلاش کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

---

[1] "رجم" دراصل "رجام" (بروزن "کتاب") کے مادہ سے "رجمۃ" (بروزن "لقمہ") کی جمع ہے جو پتھر کے اس ٹکڑے کے معنی میں ہے جسے قبر پر رکھا جاتا ہے یا جس کے گرد بت پرست لوگ چکر لگاتے ہیں۔ نیز "رجم" کسی کو اس حد تک پتھر مارنا جس سے اس کی موت واقع ہوجانے کے معنی میں ہے۔ اور بعض اوقات قتل کے معنی میں بھی آتا ہے خواہ وہ کسی طرح بھی واقع ہو کیونکہ وہ لوگ پتھر سے ہی قتل کیا کرتے تھے۔

ہم نے انھیں بھی اور جو لوگ ان کے ہمراہ کشتی میں تھے اور وہ انسانوں اور جانوروں سے بھری ہوئی تھی، سب کو نجات عطا کی:
(فانجیناہ ومن معہ فی الفلک المشحون)۔

"پھر دوسرے سب لوگوں کو غرق اور فنا کر دیا" (ثم اغرقنا بعد الباقین)۔

"مشحون" "شحن" (بروزن "صحن") کے مادہ سے بھر دینے کے معنی میں ہے اور کبھی کبھی تیار کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے "شحناء" اس دشمنی کو کہتے ہیں جو انسان کے تمام وجود میں بھر جائے۔

اس مقام پر مراد یہ ہے کہ وہ کشتی افراد اور تمام وسائل سے بھری ہوئی تھی اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی باقی نہیں رہ گئی تھی یعنی جب کشتی ہر لحاظ سے تیار اور چلنے پر آمادہ ہوگئی تو خداوند عالم نے طوفان بھیجا تاکہ نوح علیہ السلام اور دوسرے تمام کشتی نشین کسی قسم کی مشکل سے دوچار نہ ہوں یہ بجائے خود ایک نعمت الٰہی ہے۔

اس تمام واقعے کے آخر میں قرآن وہی کہتا ہے جو جناب موسیٰ اور جناب ابراہیم علیہما السلام کے ماجرے کے آخر میں کہا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:۔

نوح کی داستان، ان کی متواتر دعوت حق، ان کا صبر و شکیبائی اور آخر کار ان کے مخالفین کی غرقابی اور تباہی و بربادی میں سب لوگوں کے لیے آیت اور نشانی ہے (ان فی ذلک لاٰیۃ)۔

"ہر چند کہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (وما کان اکثرھم مؤمنین)۔

بنابریں آپ بھی اے پیغمبر اسلامؐ! اپنی قوم کے مشرکین کی سخت مزاجی، ترش روئی اور روگردانی سے پریشان نہ ہوں، صبر کا مظاہرہ کریں کیونکہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کا انجام بھی وہی ہوگا جو نوح اور ان کے ساتھیوں کا ہوا اور گمراہوں کا انجام وہی ہوگا جو غرق ہونے والوں کا ہوا۔

اور جان لو" تمھارا پروردگار ناقابلِ شکست اور رحیم ہے" (وان ربک لھو العزیز الرحیم)۔

اس کی رحمت اس بات کی متقاضی ہے کہ انھیں بڑی حد تک مہلت عطا فرمائے اور اتمام حجت کرے اور ان کی عزت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ انجام کار آپ کو کامیاب اور آپ کے دشمنوں کو شکست سے دوچار کر دے۔

۱۲۳۔ كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝
۱۲۴۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝
۱۲۵۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝
۱۲۶۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝
۱۲۷۔ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۱۲۸۔ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝
۱۲۹۔ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝
۱۳۰۔ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝
۱۳۱۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝
۱۳۲۔ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝
۱۳۳۔ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝
۱۳۴۔ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝
۱۳۵۔ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

ترجمہ

۱۲۲۔ قوم عاد نے (خدا کے) رسولوں کو جھٹلایا۔
۱۲۴۔ جبکہ ان کے بھائی ہود نے کہا: آیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟
۱۲۵۔ میں تمھارے لیے امین رسول ہوں۔
۱۲۶۔ خدائی تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔
۱۲۷۔ میں اس دعوت کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف عالمین کے رب کے ذمے

۱۲۸۔ کیا تم ہر بلند مقام پر اپنی خواہش کی ایک ایک نشانی بناتے ہو۔

۱۲۹۔ خوبصورت اور مضبوط قلعے اور محلات تعمیر کرتے ہو گویا تم نے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔

۱۳۰۔ جب تم کسی کو سزا دیتے ہو تو جابر لوگوں کی طرح سزا دیتے ہو۔

۱۳۱۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۳۲۔ تم اس خدا سے ڈرو جس نے تمھاری ان نعمتوں سے امداد کی جنھیں تم جانتے ہو۔

۱۳۳۔ تمھاری چوپایوں اور (لائق اور ارجمند) اولاد کے ذریعہ امداد فرمائی۔

۱۳۴۔ اسی طرح باغوں اور چشموں کے ذریعے۔

۱۳۵۔ (اگر تم کفران کرو تو) میں تم پر عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

تفسیر

قوم عاد کے جرائم اور بے راہروی

اب قوم عاد اور ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السّلام کی باری آتی ہے اور اٹھارہ آیتوں میں ان کی مختصر سی سوانح، انجام اور اس سے حاصل ہونے والے عبرت آموز سبق بیان فرمائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قوم عاد "جزیرۃ العرب" کے جنوب میں واقع "یمن" کے اطراف اور "حضرموت" کے علاقے میں رہتی تھی۔

سرکش قوم نے ——— جیسا کہ قرآن کہتا ہے ——— "خدا کے رسولوں کو جھٹلایا"، (کذبت عاد المرسلین)[1]

اگرچہ انھوں نے صرف حضرت ہود علیہ السّلام کی تکذیب کی تھی لیکن چونکہ ہود کی دعوت تمام انبیاء الٰہی کی دعوت تھی لہٰذا انھوں نے گویا تمام انبیاء کی تکذیب کی۔

اس اجمالی ذکر کے بعد اب اس کی تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جبکہ ان کے بھائی ہود نے کہا، آیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (اذ قال لھم اخوھم ھود الا تتقون)۔

---

[1] چونکہ قوم "عاد" ایک "جماعت اور قبیلہ" پر مشتمل تھی لہٰذا فعل مؤنث لایا گیا ہے اور "کذبت" کہا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں لفظ مؤنث لفظی ہیں۔

چونکہ حضرت ہودؑ انھیں ایک بھائی کی مانند نہایت ہمدردی اور مہربانی کی صورت میں توحید و تقویٰ اور حق کی جانب دعوت دیتے رہے لہٰذا یہاں پر "اخ" (بھائی) کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔

پھر انھوں نے فرمایا: میں تمھارے لیے امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔ تمھارے درمیان میری زندگی کا سابقہ ریکارڈ اس حقیقت کا گواہ ہے کہ میں نے کبھی بھی خیانت کا راستہ نہیں اپنایا اور حق و صداقت کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

اسی بات پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں: جب صورتِ حال یہ ہے اور تم بھی اس سے بخوبی آگاہ ہو، "تو خدا سے ڈرو، اور پرہیزگاری اختیار کرو اور میری اطاعت کرو" کیونکہ میری اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں حصولِ زر کے لیے ایسا کر رہا ہوں اور یہ سب کچھ مال و دولت اور مقام و منصب تک پہنچنے کا ایک مقدمہ ہے تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ "میں اس دعوت کے بدلے تم سے ذرہ برابر بھی اجر نہیں مانگتا" (وما اسئلکم علیہ من اجر)۔

"میرا اجر تو بس پروردگارِ عالم کے پاس ہی ہے" (ان اجری الا علی رب العالمین)۔ تمام برکتیں اور نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو صرف اسی سے مانگتا ہوں، کیونکہ ہم سب کا پروردگار وہی ہے۔

قرآن مجید نے حضرت ہودؑ اور قوم عاد کی اس داستان کو بالترتیب چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے تو حضرت ہودؑ کی دعوت کے مندرجات کو بیان کیا ہے جو توحید اور تقویٰ پر مشتمل ہے۔ اس کو ہم ابھی پڑھ چکے ہیں۔

پھر ان کے ناشائستہ افعال اور ٹیڑھے پن کو بیان کرتے ہوئے انھیں تین موضوعات کی یاد دہانی کراتا ہے۔ استفہام انکاری کی صورت میں انھیں جناب ہودؑ مخاطب کر کے فرماتے ہیں: کیا تم ہر بلند مقام پر اپنی خواہشات کی ایک نشانی بناتے ہو (اتبنون بکل ریع اٰیۃ تعبثون)۔

"ریع" دراصل بلند جگہ کے معنی میں ہے اور "تعبثون" "عبث" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ایسا کام ہے جس کا کوئی صحیح مقصد پیشِ نظر نہ ہو اور "آیۃ" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مالدار اور ثروت مند قوم نے دوسروں پر اپنی خودنمائی، فخر اور بڑائی جتانے کے لیے پہاڑ کی بلندیوں اور اونچے اونچے ٹیلوں پر (برجوں وغیرہ کی مانند) عمارتیں بنا رکھی تھیں جن سے وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے اور اپنی راقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس گفتگو سے مراد ان کے وہ مکانات (جھونپڑے) ہیں جو وہ اونچی جگہ پر بناتے تھے اور ان سے لہو و لعب اور عیاشی کے اڈوں کا کام لیتے تھے جیسا کہ آج کے دور میں طاغوتی لوگوں کے درمیان رسم ہے۔

لیکن یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ کلمہ "آیۃ" اور لفظ "عبث" کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ احتمال بھی بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ قوم عاد نے اس قسم کے گھر سڑکوں اور راستوں کے کنارے بلند مقامات پر

بنا رکھے تھے تاکہ ان بلندیوں سے وہ راہ چلتے لوگوں کا مذاق اڑائیں۔

ان تینوں تفسیروں میں سب سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ایک بار پھر ان پر تنقید کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، فرماتے ہیں: تم خوبصورت اور پختہ محلات اور قلعے تعمیر کرتے ہو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تم لوگ اس دنیا میں ہمیشہ رہوگے۔ (و تتخذون مصانع لعلکم تخلدون)۔

"مصانع" "مصنع" کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے خوبصورت اور پختہ مکان یا عمارت۔

جناب ہود علیہ السلام ان پر یہ اعتراض نہیں کرتے کہ تمھارے لیے مناسب گھر کیوں ہیں؟ بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم اس دنیا اور اس کی زیبائش و آرائش اور گھروں اور محلات کو پختہ اور محکم بنانے میں اس قدر غرق ہو چکے ہو کہ تم نے سرائے آخرت کو بالکل فراموش کر دیا ہے دنیا کو ایک گزرگاہ سمجھنے کی بجائے سرائے جاودانی سمجھ رکھا ہے۔

جب صورت حال یوں ہو تو اس قسم کی غافل کر دینے اور غرور پیدا کرنے والی عمارتیں یقیناً قابل مذمت ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جگہ سے گزر رہے تھے کہ آپ کی نگاہ ایک گنبد اور عمارت پر پڑی جو راستے کے اوپر بنے ہوئے تھے، آپ نے سوال فرمایا: "کہ یہ کیا چیز ہے"؟

ساتھیوں نے عرض کیا یہ ایک انصاری کی عمارت ہے، آپ وہیں پر تھوڑا سا رک گئے کہ اتنے میں اس عمارت کا مالک بھی آگیا۔ اس نے سلام کیا آپ نے اپنا چہرہ مبارک دوسری طرف پھیر لیا۔

اس شخص نے یہ ماجرا اپنے ساتھیوں سے بیان کیا اور کہا:۔

"خدا کی قسم! میں اپنے بارے میں رسول اللہؐ کی نظر کو بہتر نہیں دیکھ رہا ہوں، معلوم نہیں کہ مجھ سے کیا بات ہوئی ہے اور میں نے کیا کیا ہے؟"

لوگوں نے بتایا کہ آنحضرت تمھاری اس عظیم الشان عمارت کو دیکھ کر ناراض ہو گئے ہیں۔

وہ انصاری گھر واپس آگیا اور اس تمام عمارت کو گرا دیا۔ ایک دن آنحضرتؐ کا وہاں سے گزر ہوا لیکن اس عمارت کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ وہ عمارت کیا ہوئی؟ تو لوگوں نے تمام ماجرا بیان کیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

ان لکل بناء یبنی وبال علی صاحبہ یوم القیامۃ الا ما لا بد منہ

قیامت کے روز ہر عمارت اپنے مالک کے لیے وبالِ جان بن جائے گی، سوائے اس مقدار کے جو انسان کے لیے بہت ضروری ہوتی ہے[1]

اس روایت سے اور اس قسم کی دوسری روایات سے اسلام کا نظریہ مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی عمارتوں کا مخالف ہے جو طاغوتی اور غافل کر دینے والی ہونے کے ساتھ ساتھ اسراف اور فضول خرچی کا مظہر ہوں اور مسلمانوں کو ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ مستکبرین اور خدا سے بے خبر لوگوں کی طرح بلند و بالا عمارتیں تعمیر کریں خاص کر ایسے معاشرے میں جن میں غریب اور ضرورت مند

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

افراد کی تعداد زیادہ ہو۔

لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ آپؐ نے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے طاقت کا سہارا نہیں لیا اور اس عمارت کے ڈھانے کا حکم صادر نہیں فرمایا، بلکہ ایک لطیف سے اخلاقی ردعمل کے ذریعے ——— بے پرواہی اور نفرت کا اظہار کر کے اپنے مقصد کو واضح فرمایا۔

اس کے بعد قوم عاد پر ایک اور تنقید کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ لڑائی جھگڑے کے وقت بے رحمی کا مظاہرہ کرتی تھی ارشاد ہوتا ہے: جب تم کسی کو سزا دیتے ہو تو حد سے تجاوز کر جاتے ہو۔ اور ظالم و جابر لوگوں کی طرح سزا دیتے ہو (واذا بطشتم بطشتم جبارین)۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایسا کام کرے جس سے وہ سزا کا مستحق ہو لیکن اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تم حق اور عدالت سے تجاوز کر جاؤ اور چھوٹے سے جرم کے بدلے سنگین اور سخت سزائیں دو اور غصے کے وقت لوگوں کا خون بہانا شروع کر دو اور تو لے کر لوگوں کے پیچھے پڑ جاؤ کیونکہ یہ زمانے کے جابر، ظالم اور سرکش لوگوں کا کام ہوتا ہے۔

راغب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "بطش" (بروزن "نقش") کا معنیٰ کوئی چیز طاقت اور زور کے ذریعے حاصل کرنا ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام درحقیقت ان لوگوں کو تین وجوہ سے سرزنش کر رہے ہیں۔

ایک ان نشانیوں کی وجہ سے جو وہ خود خواہی اور خود نمائی کے لیے بلندیوں پر تعمیر کرتے تھے تاکہ ان کے ذریعے وہ دوسروں پر شیخی بگھار سکیں۔

دوسرے ان عمارتوں کی وجہ سے جو انھوں نے جابر حکمرانوں کے محلات کی طرح زیبا اور محکم بنا رکھی تھیں، جن سے ان کی لمبی آرزوؤں کی نشان دہی ہوتی تھی اور وہ اس نکتے سے غافل ہو چکے تھے کہ دنیا گزرگاہ ہے نہ کہ ہمیشہ کا گھر۔

تیسرے سزا دینے کے وقت جب وہ حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ ان تینوں امور کی قدر مشترک وہی دوسروں پر فخر اور بقاء سے محبت کی حس ہے۔ اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی محبت ان پر اس حد تک غالب آگئی تھی کہ وہ بندگی کا اسلوب بھلا بیٹھے تھے اور دنیا پرستی میں اس قدر غرق ہو چکے تھے کہ خدائی دعوے کی حد تک جا چکے تھے چیزیں ایک بار پھر اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ:

حب الدنیا رأس کل خطیئۃ[1]

ان تینوں تنقیدات کے بعد انھیں ایک بار پھر تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو تم تقویٰ اختیار کرو اور خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

اب ہم حضرت ہود علیہ السلام کے بیان کے تیسرے حصے تک پہنچتے ہیں جس میں بندگانِ خدا پر نعمتوں کا ذکر ہے تاکہ اس طرح

[1] تفسیر فخر رازی، اسی آیت کے ذیل میں۔

ان کی حسِ شکر گزاری کو متحرک کیا جا سکے اور وہ خدا کی طرف لوٹ آئیں۔

اس سلسلے میں اجمال اور تفصیل کی روش سے استفادہ کیا گیا ہے جو بحث کو دل نشین کرنے کے لیے بے حد مفید ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ان کی طرف روئے سخن کرکے فرماتے ہیں: اس خدا سے ڈرو جس نے ایسی نعمتوں کے ساتھ تمھاری امداد کی ہے جو تم جانتے ہو اور اس نے وہ نعمتیں ہمیشہ سے تمھیں دے رکھی ہیں (و اتقوا الذی امدکم بما تعلمون)[۱]

پھر اس مختصر بیان کے بعد اس کی تشریح اور تفصیل بیان کرتے ہیں۔ اس نے تمھیں چوپائے اور (لائق اور باآبرد) اولاد دے کر تمھاری امداد کی ہے (امدکم بانعام و بنین)۔

خدا نے ایک طرف تو تمھیں مادی سرمائے سے نوازا ہے اس دور میں اس سرمایہ کا اہم حصہ جانور اور چوپائے ہوا کرتے تھے، دوسری طرف کافی حد تک افرادی قوت عنایت فرمائی ہے جو اس سرمائے کی حفاظت اور پرورش کر سکتی ہے۔

یہ تعبیر قرآن مجید میں کئی مقامات پر دہرائی گئی ہے کہ جب بھی مادی نعمتوں کو شمار کیا گیا پہلے "مال" اور پھر "افرادی قوت" کی طرف اشارہ کیا گیا جو اس مال کی محافظ اور مربیّ ہوتی ہے۔ یہ ایک طبیعی ترتیب معلوم ہوتی ہے نہ کہ مال کی اہمیت کے پیش نظر اسے مقدم کیا گیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وامددناکم باموال و بنین وجعلناکم اکثر نفیرًا

ہم نے اموال اور اولاد کے ذریعے تمھاری امداد کی ہے اور تمھاری بہت سی تعداد قرار دی ہے۔

پھر فرماتے ہیں: اور سرسبز اور تر و تازہ باغات اور جاری پانی کے چشمے تمھیں بخشے ہیں (وجنات وعیون)۔

بنا بریں ہم نے افرادی قوت، زراعت، باغبانی، پرورشِ حیوانات اور ذرائع نقل و حمل کے لحاظ سے تمھیں خود کفیل اور بے نیاز کر دیا ہے تاکہ تم اپنی زندگی میں کسی بھی چیز کی کمی اور پریشانی کا احساس نہ کرو۔

لیکن کیا وجہ ہے کہ تم نے اس قدر نعمتیں عطا کرنے والے مالک کو فراموش کر دیا ہے اور رات دن جس کے خوانِ نعمت سے بہرہ ور ہو رہے ہو اسے نہیں پہچانا۔

پھر اپنی گفتگو کے آخری مرحلے پر پہنچ کر انھیں متنبہ کرتے اور عذابِ الٰہی سے ڈراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم نعمت کا انکار کرو گے تو: مجھے تم پر بڑے دن کے عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے۔ (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم)۔

جس دن تم سب ظلم و ستم، غرور و تکبر، ہوا و ہوس اور پروردگار سے دوری اور بیگانگی کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔

---

[۱] "امدکم" "امداد" کے مادہ سے ہے یہ لفظ دراصل ان امور پر بولا جاتا ہے جو مسلسل اور منظم طریقے سے انجام دیئے جائیں اور چونکہ اللہ اپنی نعمتیں مسلسل اور ایک خاص نظام کے تحت اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے اسی لیے یہاں پر "امد" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

عموماً قرآن مجید میں "یوم عظیم" (بڑا دن) کا اطلاق قیامت پر ہوتا ہے اور وہ ہر لحاظ سے باعظمت ہے لیکن آیاتِ قرآنی میں بعض اوقات اس کا اطلاق ان سخت اور وحشت ناک ایام پر بھی ہوا ہے جو سابقہ امتوں پر گزر چکے ہیں جیسا کہ خود اسی سورت میں جناب شعیب علیہ السلام کی داستان میں ہے کہ خداوندِ عالم نے قوم شعیب کو حق کے مقابلے میں سرکشی کی وجہ سے دردناک عذاب دیا (کہ بادل کے ٹکڑے سے ان پر بجلی گری)۔ اس واقعے کے بعد اس دن کو "یوم عظیم" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

فاخذھم عذاب یوم الظلۃ انہ کان عذاب یوم عظیم (الشعراء: ۱۸۹)

بنا بریں زیرِ نظر آیات میں بھی ممکن ہے کہ "یوم عظیم" سے اس دن کی طرف اشارہ ہو جس دن قوم عاد کے سرکش اور متکبر لوگ اجاڑ کر رکھ دینے والے دردناک طوفان کے عذاب میں مبتلا ہوئے اور اس بات کی گواہ بعد میں آنے والی چند آیات ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے روزِ قیامت کی یا دونوں ایام کی سزاؤں کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ دونوں دنوں کی تاریخ عظیم ہے۔

۱۳۶۔ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَکُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ○
۱۳۷۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ○
۱۳۸۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ○
۱۳۹۔ فَکَذَّبُوْهُ فَاَهْلَکْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○
۱۴۰۔ وَاِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ○

ترجمہ

۱۳۶۔ (قوم عاد کے) ان افراد نے کہا ہمارے لیے یکساں ہے کہ تم ہمیں نصیحت کرو یا نہ کرو (خواہ مخواہ خود کو تھکاؤ نہیں)۔
۱۳۷۔ یہ وہی پہلے والے لوگوں کا طریقۂ کار ہے۔
۱۳۸۔ ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا۔
۱۳۹۔ انھوں نے ہُود کو جھٹلایا، تو ہم نے بھی انھیں تباہ کر دیا۔ اور اس میں (صاحبانِ علم کے لیے) آیت اور نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے۔
۱۴۰۔ اور تمھارا پروردگار عزیز اور رحیم ہے۔

تفسیر

نصیحت ہم پر اثر نہیں کرتی

گزشتہ آیات میں ہم نے خدا کے مہربان نبی کی اپنی سرکش قوم کے ساتھ مدلّل گفتگو کا تذکرہ پڑھا۔ اب ہم اس قوم کے نامعقول اور اذیّت ناک جوابات کا مطالعہ کریں گے، قرآن کہتا ہے: انھوں نے جواب میں کہا، تم خود کو مزید نہ تھکاؤ، ہمارے لیے یکساں ہے کہ خواہ ہمیں نصیحت کریں یا نہ کریں ہمارے دل میں ذرہ بھر اس کا اثر نہیں ہوگا (قالوا سواء علینا اوعظت ام لم تکن من الواعظین)۔

لیکن یہ اعتراض جو تم ہم پر کرتے ہو تو یہ تمھارا بے جا اعتراض ہے کیونکہ یہ تو گزشتہ لوگوں کا طریقۂ کار ہے (ان هذا الا خلق الاولین)۔

اور تمھارے قول کے برعکس ہمیں کبھی بھی عذاب نہیں ہوگا، نہ اس دنیا میں اور نہ ہی کسی اور جہان میں (وما نحن بمعذبین)۔

"خلق" (خا اور لام کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی عادت، روش اور اخلاق ہے کیونکہ یہ کلمہ جب مفرد ہو تو خلق اور اخلاق عادات کے معنی میں آتا ہے اور اس صورت میں ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں مثلاً بت پرستی کرنا، محکم اور دلفریب محلات بنانا، بلند و مرتفع مقامات پر برُج تعمیر کر کے شیخی بگھارنا، اسی طرح سزاؤں میں سختی سے کام لینا گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں ہم سے پہلے لوگ بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے اس سے جھوٹ اور دروغ گوئی مراد لی ہے یعنی اے ہوُد! خدا اور قیامت کے بارے میں تمھاری باتیں سب جھوٹ ہیں جو پہلے بھی کہی جاتی تھیں (تو یہ معنی اس صورت میں ہوگا جب ہم خَلْق (بروزن حَلْق) پڑھیں۔ لیکن مشہور قرائت اس طرح نہیں ہے)۔

اس کے بعد قرآن مجید اس قوم کا دردناک انجام ان لفظوں میں بیان کرتا ہے: ۔ ان لوگوں نے ہود کی تکذیب کی تو ہم نے انھیں تباہ و برباد کر دیا (فکذبوه فاهلکناهم)۔

اس داستان کے اختتام پر پھر وہی دو عبرت انگیز جملے کہے جاتے ہیں جو جناب نوح، ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کی داستانوں کے آخر میں کہے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: اس سرگزشت میں قدرتِ خدا، انبیاء کی استقامت اور سرکش اور جابر لوگوں کے انجام کی واضح اور روشن نشانی ہے لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (ان فی ذلک لاٰیة وما کان اکثرهم مؤمنین)۔

"اور تمھارا پروردگار طاقت ور اور ناقابلِ تسخیر اور رحیم و مہربان ہے (وان ربک لهو العزیز الرحیم)۔ کافی حد تک ڈھیل دیتا ہے، مہلت عطا کرتا ہے، گمراہ لوگوں کے لیے روشن دلائل پیش کرتا ہے لیکن جب سزا دینے پر آتا ہے تو یوں سخت گرفتار کرتا ہے کہ کسی کے لیے مجال فرار باقی نہیں رہ جاتی۔

۱۴۱۔ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۞

۱۴۲۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۞

۱۴۳۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۞

۱۴۴۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۞

۱۴۵۔ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۞

۱۴۶۔ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۞

۱۴۷۔ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۞

۱۴۸۔ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۞

۱۴۹۔ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۞

۱۵۰۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۞

۱۵۱۔ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۞

۱۵۲۔ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۞

ترجمہ

۱۴۱۔ قوم ثمود نے (خدا کے) رسولوں کو جھٹلایا۔

۱۴۲۔ جبکہ ان کے بھائی (اور ہمدرد) صالحؑ نے انھیں کہا: آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟

۱۴۳۔ میں تمھارے لیے (اللہ کا) امین رسول ہوں۔

۱۴۴۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۴۵۔ میں اس دعوت کے بدلے تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت تو صرف عالمین کے رب کے پاس ہے۔

۱۴۶۔ آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیشہ نہایت ہی امن و سکون اور نعمتوں میں یہاں رہو گے۔

۱۴۷۔ ان باغات اور چشموں میں۔

۱۴۸۔ ان زراعتوں اور کھجور کے درختوں میں کہ جن کے پھل میٹھے اور پکے ہوئے ہیں۔

۱۴۹۔ تم پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو اور ان میں عیش و نوش میں مگن ہو جاتے ہو۔

۱۵۰۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۵۱۔ اور مسرف لوگوں کا کہنا نہ مانو۔

۱۵۲۔ وہی جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

تفسیر

مُسرفین کی اطاعت نہ کرو

اس سورت میں بیان ہونے والی انبیاءؑ کی داستان کا یہ پانچواں حصہ ہے جس میں قوم ثمود اور اس کے پیغمبر جناب صالحؑ کی مختصر سرگزشت بیان کی گئی ہے وہ "وادی القریٰ" میں رہتے تھے جو "مدینہ" اور "شام" کے درمیان واقع ہے۔ یہ قوم اس سرزمین میں خوشحال زندگی بسر کر رہی تھی لیکن اپنی سرکشی کی بناء پر صفحۂ ہستی سے یوں مٹ گئی کہ آج اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

اس داستان کا آغاز مکمل طور پر قوم عاد اور قوم نوح کی داستانوں سے ملتا جلتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، فرمایا گیا ہے: قوم ثمود نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا (كذبت ثمود المرسلين)۔

کیونکہ تمام انبیاءؑ کی دعوتِ حق ایک جیسی تھی اور اس قوم کا اپنے پیغمبر جناب صالحؑ کی تکذیب کرنا درحقیقت تمام رسولوں کی تکذیب کے مترادف تھا۔

اس اجمال کے بعد اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جبکہ ان کے ہمدرد پیغمبر صالحؑ نے ان لوگوں سے کہا: آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟ (اذ قال لهم اخوهم صالح الا تتقون)۔

وہ جو کہ تمھارے بھائی کی مانند تمھارا ہادی اور راہبر تھا اس کی نظر میں نہ برتری جتانا تھا اور نہ ہی مادی مفادات، اسی لیے قرآن نے جناب صالح علیہ السلام کو "اخوہم" سے تعبیر کیا ہے۔ جناب صالحؑ نے بھی دوسرے انبیاءؑ کی مانند اپنی دعوت کا آغاز تقویٰ اور فرض کے احساس سے کیا۔

پھر اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے ہیں: میں تمھارے لیے امین پیغمبر ہوں۔ میرا ماضی میرے اس دعویٰ کی بیّن دلیل ہے

(انی لکم رسول امین)۔

" اسی لیے تم تقویٰ اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، کیونکہ میرے مدنظر رضائے الہٰی تمھاری خیر و خوبی سعادت کے سوا اور کچھ نہیں (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

بنابریں" اس دعوت کے بدلے میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا اور نہ ہی مجھے تمھاری کسی چیز کی طمع ہے (وما اسئلکم علیہ من اجر)۔

میں تو کسی اور کے لیے کام کرتا ہوں اور میرا اجر بھی اسی کے پاس ہے۔" ہاں تو میرا اجر صرف عالمین کے پروردگار کے پاس ہے" (ان اجری الا علی رب العالمین)۔

یہ جناب صالح علیہ السلام کی داستان کا ابتدائی حصہ تھا جو دو جملوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک دعوت کا پیش کرنا اور دوسرے رسالت کو بیان کرنا۔

پھر دوسرے حصے میں افرادِ قوم کی زندگی کے قابل تنقید اور حساس پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں ضمیر کی عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔ آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیشہ امن و سکون اور ناز و نعمت کی زندگی بسر کرتے رہوگے (اتترکون فیما ھٰھنا اٰمنین)۔

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری یہ مادی اور غفلت کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے اور موت، انتقام اور سزا کا ہاتھ تمھارے گریبانوں تک نہیں پہنچے گا ؟

پھر اجمال سے تفصیل کے طریقۂ کار کو کام میں لاتے ہوئے اپنے گزشتہ سربستہ جملے کی یوں تشریح کرتے ہیں: تم گمان کرتے ہو کہ ان باغات اور چشموں میں (فی جنات و عیون)۔

اور ان کھیتوں اور کھجور کے درختوں میں کہ جن کے پھل شیریں شاداب اور پکے ہوئے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگے (و زروع و نخل طلعھا ھضیم)[1]

پھر ان کے پختہ اور خوشحال گھروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں:۔

تم پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو اور اس میں عیاشی کرتے ہو (و تنحتون من الجبال بیوتاً فارھین)۔

"فارہ"، "فرہ" (بروزن "فرح") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے ایسی خوشی جو جہالت اور ہوس پرستی پر مبنی ہو اور

---

[1] "طلع" "طلوع" کے مادہ سے ہے جو عموماً کھجور کے اس شگوفے کو کہتے ہیں جو میوہ ظاہر ہونے سے پہلے درخت سے سر نکالتا ہے اور تر انداز کے دو پلڑوں کی مانند ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں ان خوشوں کے اندر خرما کا پھل ہوتا ہے جو اس وقت بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے یہ شگوفہ شگفتہ ہوتا ہے جس سے خوشہ ظاہر ہوتا ہے کبھی طلع کھجور کے پہلے ثمر کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن "ھضیم" "ھضم" کے مادہ سے ہے جس کے کئی معانی ہیں کبھی تو کسی چیز کے اندر گھس جانے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی پکے ہوئے پھل کے معنی میں کبھی لطیف نرم اور پورے طور پر ہضم ہو جانے کے معنی میں۔ اور کبھی ہضم شدہ کے معنی میں۔ آیت بالا میں اگر طلع کو کھجور کے شگوفوں کے معنی میں لیا جائے اور "ہضم" کو اندر گھسی ہوئی چیز کے معنی میں تو اس وقت یہ درخت کے زبردست بارآور ہونے کی نشانی ہوگا اور اگر "طلع" کو کھجور کے پہلے ثمر کے معنی میں لیا جائے تو "ھضیم" کا معنیٰ شاداب، لطیف، نرم اور پکا ہوا ہوگا۔

بھی کبھار کوئی کام مہارت کے ساتھ انجام دینے کے معنی میں بھی آتا ہے اگرچہ دونوں معنی مندرجہ بالا آیت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لیکن حضرت صالح کی طرف سے کی گئی ملامت اور سرزنش کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلا معنی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

اگر ان تمام آیات کا قوم عاد کے بارے میں نازل ہونے والی گزشتہ آیات سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قوم عاد میں خودخواہی، مقام پرستی اور خودنمائی جیسی برائیاں تھیں، جبکہ قوم ثمود شکم کی اسیر اور ناز و نعمت بھری خوشحال زندگی سے بہرہ مند تھی لیکن دونوں قومیں ایک ہی منحوس انجام کو پہنچیں، کیونکہ انھوں نے انبیاء کی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا اور خود پرستی کی پستی سے نکل کر خدا پرستی کی معراج کو اختیار نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئیں۔

حضرت صالح علیہ السلام اس تنقید کے بعد انھیں متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔ حکم خدا کی مخالفت سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

اور مسرفین کا حکم نہ مانو (ولا تطیعوا امر المسرفین)۔

وہی جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے (الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون)۔

اسراف اور فساد فی الارض کا باہمی رابطہ:۔ ہم جانتے ہیں کہ اسراف قانون آفرینش اور قانون تشریع کی حدود سے تجاوز کا نام ہے اور یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی صحیح نظام میں حد سے کسی قسم کا تجاوز فساد اور انتشار کا موجب بن جاتا ہے۔

بالفاظ دیگر اسراف فساد کا سرچشمہ ہے اور اسراف کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔

البتہ اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ اسراف کا ایک وسیع مفہوم اور معنی ہے کبھی تو کھانے پینے جیسے زندگی کے سادہ اور عمومی مسائل میں اسراف ہوتا ہے (جیسا کہ سُورۂ اعراف کی آیت ۳۱ میں آیا ہے)۔

کبھی حد سے زیادہ قصاص اور انتقام لینے کے سلسلے میں ہوتا ہے (جیسے سُورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۳ میں آیا ہے)۔

کبھی حد سے زیادہ خرچ کرنے کے سلسلے میں ہوتا ہے (جیسا کہ سُورۂ فرقان کی آیت ۶۷ میں آیا ہے)۔

کبھی ایسا فیصلہ کرنے کے مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو جھوٹ اور کذب پر مبنی ہوتا ہے (جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۲۸ میں "مسرف اور کذب" ساتھ ساتھ ذکر ہوئے ہیں)۔

کبھی یہ اعتقادات میں ہوتا ہے کہ جو شک و شبہ تک جا پہنچتا ہے (جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۳۴ میں مسرف اور مرتاب اکٹھے آئے ہیں) کبھی دوسروں پر برتری حاصل کرنے، استکبار اور استثمار کے معنی میں آتا ہے (جیسا کہ سورۂ دخان کی آیت ۳۱ میں فرعون کے بارے میں ہے:

انہ کان عالیا من المسرفین

وہ برتری کا خواہاں اور مسرف تھا۔

اور کبھی ہر قسم کے گناہ کے معنی میں بھی آتا ہے (جیسا کہ سُورہ زمر کی آیت ۵۳ میں ہے):

قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا

کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے آپ پر اسراف کیا ہے خدا کی رحمت سے مایوس ہونا

کیونکہ خداوند عالم تمام گناہوں کو بخش دے گا۔

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں اسراف اور فساد کا باہمی رابطہ بخوبی روشن ہوجاتا ہے۔

تفسیر "المیزان" میں "علامہ طباطبائی" کے فرمان کے مطابق یہ کائنات نظم اور صلاح کا ایک مجموعہ ہے حتیٰ کہ اگر کبھی کبھا[ر] اجزاء میں کوئی تضاد بھی دیکھنے میں آتا ہے تو اس میں بھی بڑی حد تک ملاپ اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ کائنات کا یہ نظام اہداف صالحہ [کی] طرف رواں دواں ہے اور اس کے ہر ایک جز کے لیے ایک مقررہ راستہ ہے جس پر وہ گامزن ہے۔ اب اگر ان میں سے کوئی جزء ا[پنے] مدار سے ہٹ جائے اور فساد کے راستے پر چل نکلے تو اس کے اور کائنات کے دوسرے اجزاء کے درمیان تصادم شروع ہوجاتا [ہے] اگر تو دوسرے اجزاء اسے اس کی اپنی راہ پر واپس لانے میں کامیاب ہوجائیں تو بہتر ورنہ اسے نابود کر دیتے ہیں تاکہ یہ نظام اپنے سفر [کو] صحیح صورت میں جاری رکھ سکے۔

انسان بھی اس عالم ہستی کا ایک جز ہے اور اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے اگر فطری بنیادوں پر اپنے مدار پر حرکت کر[تا] رہے اور نظام ہستی سے ہم آہنگ رہے تو اپنے مقدر شدہ سعادت کے ہدف تک پہنچ جاتا ہے لیکن اگر اپنی حد سے تجاوز کر جائے اور "فساد فی الارض" کی راہ پر گامزن ہوجائے تو پہلے خداوندِ عالم اسے متنبہ کرتا ہے اور سخت اور دردناک حوادث کے ذریعے اسے متنبہ کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ روم کی آیت ۴۱ میں ہے:

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذ یقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون

لوگوں کے اعمال کی وجہ سے جنگلوں اور سمندروں میں فساد ظاہر ہوگیا، خدا چاہتا ہے کہ لوگوں کے کچھ بُرے اعمال کی وجہ سے ان کا نتیجہ انھیں چکھائے، شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔

لیکن اگر یہ تنبیہ بھی کارگر ثابت نہ ہو اور فساد ان کے رگ و ریشہ میں جاگزیں ہوجائے تو خداوندعالم "عذاب استیصالی" کے ذریعے زمین کو ان کے وجود سے پاک کر دیتا ہے[1]

اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ خداوندِ عالم نے کس لیے "اسراف" کو "فساد فی الارض" اور عدم اصلاح کے ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۵ صفحہ ۳۲۲

۱۵۳۔ قَالُوٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ○

۱۵۴۔ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

۱۵۵۔ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ○

۱۵۶۔ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

۱۵۷۔ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ○

۱۵۸۔ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

۱۵۹۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○

ترجمہ

۱۵۳۔ انھوں نے کہا: (اے صالح!) تم اپنی عقل کھوچکے ہو۔

۱۵۴۔ تم ہمارے جیسے ایک بشر ہی تو ہو، اگر سچ کہتے ہو تو کوئی نشانی لاؤ۔

۱۵۵۔ (صالح نے) کہا: یہ ناقہ ہے جس کا (بستی کے) پانی میں حصہ ہے اور تمھارے لیے مقررہ دن کا حصہ۔

۱۵۶۔ اسے ذرا سی بھی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تمھیں عظیم دن کا عذاب آلے گا۔

۱۵۷۔ آخر کار انھوں نے اس (ناقہ) پر حملہ کرکے اس کا خاتمہ کر دیا پھر اپنے کیے پر نادم ہوئے۔

۱۵۸۔ عذاب الٰہی نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس میں ایک نشانی ہے۔ لیکن ان میں سے اکث[ر] نہیں تھے۔

۱۵۹۔ اور تمھارا پروردگار عزیز بھی ہے اور رحیم بھی۔

تفسیر

قومِ صالح کی ہٹ دھرمی

آپ گزشتہ آیات میں گمراہ قوم کے سامنے حضرت صالح علیہ السلام کی منطقی اور خیر خواہی پر مبنی گفتگو ملاحظہ فرما چکے ہیں اب صالح کے جواب میں اس قوم کی گفتگو سنیے۔

انھوں نے کہا: اے صالح! تم سحر زدہ ہو کر اپنی عقل کھو چکے ہو، لہٰذا غیر معقول باتیں کرتے ہو (قالوا انما انت من المسحرین)۔

اور پھر یہی نہیں بلکہ "تم تو ہمارے جیسے بشر ہی تو ہو" اور کوئی بھی عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے جیسے شخص کی اطاعت کریں (ما انت الا بشر مثلنا)۔

اگر سچ کہتے ہو تو کوئی نشانی لاؤ تاکہ ہم تم پر ایمان لے آئیں (فأت باٰیة ان کنت من الصادقین)۔

"مسحر" سحر کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے "جس پر جادو کیا گیا ہو" اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بسا اوقات جادوگر لوگ جادو کے ذریعے انسان کی عقل و ہوش کو بیکار بنا دیتے ہیں صرف انھوں نے جناب صالح پر ہی یہ تہمت نہیں لگائی بلکہ اور لوگوں نے بھی دوسرے انبیاء پر ایسی تہمتیں لگائی ہیں۔ حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تک کو متہم کیا جیسا کہ سورۂ فرقان کی آیت ۸ میں ہے:

ان تتبعون الا رجلًا مسحورًا

ظالم لوگ کہتے تھے کہ تم تو اس شخص کی اتباع کرتے ہو جو مسحور ہونے کی بناء پر اپنی عقل کھو چکا ہے۔

جی ہاں! ان کے نزدیک عقل مند انسان وہ ہوتا ہے جو ماحول میں ڈھل جائے ابن الوقت بن جائے اور خود تمام برائیوں پر منطبق ہو جائے اگر کوئی انقلابی مردِ خدا فاسد عقائد اور غلط نظام کے بطلان کے لیے قیام کرتا تو وہ اپنی اس منطق کی رو سے اسے دیوانہ، مجنون اور سحر زدہ کہتے۔

بعض مفسرین نے "مسحر مبین" کے معنی میں اور بھی کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے جو اس سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتے لہٰذا انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بہرحال یہ سرکش لوگ حق طلبی کی خاطر نہیں بلکہ حیلے بہانوں کی بنا پر معجزے کے طلبگار ہوئے جس سے ان پر اتمام حجت ہو جائے، لہٰذا خداوندِ متعال کے حکم کے مطابق جناب صالح علیہ السلام نے کہا: یہ ناقہ ہے جس کے لیے بستی کے پانی میں حصّہ ہے اور تمھارے لیے مقررہ دن کا حصّہ ہے۔ (قال ھذہ ناقة لھا شرب ولکم شرب یوم معلوم)۔

"ناقہ" کا معنی ہے اونٹنی، اور قرآن نے اس اعجاز آمیز حالت کی حامل اونٹنی کے بارے میں مجمل ذکر کیا ہے اس کی تفصیل اور خصوصیت کو بیان نہیں کیا لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ ایک عام اور معمولی اونٹنی نہیں تھی۔ بعض مفسرین کے بقول یہ اونٹنی معجزانہ

صورت میں پہاڑ کے اندر سے برآمد ہوئی اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بستی کا ایک دن کا پانی پی جاتی تھی جیسا کہ آیت میں اور سورۂ قمر کی آیت ۲۸ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

البتہ اس کی اور خصوصیات بھی مختلف روایات میں ذکر ہوئی ہیں[1]

بہرصورت جناب صالح علیہ السلام کو حکمِ خداوندی تھا کہ ان لوگوں کو بتا دیں کہ یہ عجیب و غریب اور غیر معمولی اونٹنی ہے جو خداوندِ متعال کی بے انتہا قدرت کی ایک نشانی ہے لہٰذا اسے اپنے حال پر ہی رہنے دیں اور فرمایا کہ اسے ذرہ بھر بھی تکلیف نہ پہنچاؤ، ورنہ عظیم دن کا عذاب تمھیں اپنی لپیٹ میں لے لے گا (ولا تمسوھا بسوء فیأخذ کم عذاب یوم عظیم)۔

البتہ وہ سرکش قوم یہ نہیں چاہتی تھی کہ فریب خوردہ لوگ بیدار ہو جائیں کیونکہ لوگوں کی آگاہی کی وجہ سے اس کے مفادات کو خطرہ لاحق تھا لہٰذا ان سرکش اور مجرم لوگوں نے منصوبہ یہ بنایا کہ اس ناقہ کا ہی خاتمہ کر دیا جائے آخر کار اس پر حملہ کر ہی دیا اور ایک یا چند ضربات سے اس کا خاتمہ کر دیا اور پھر اپنے کیے پر نادم ہو گئے، کیونکہ عذابِ الٰہی کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہے تھے۔ (فعقروھا فاصبحوا نادمین)[2]

چونکہ اس قوم کی سرکشی حد سے بڑھ گئی اور عملی طور پر اس نے ثابت کر دیا کہ وہ حق قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے لہٰذا ارادہ الٰہی اس بات کا متقاضی ہوا کہ زمین کو اس قوم کے وجود سے پاک کر دے، ایسی حالت میں عذابِ الٰہی نے انھیں آ لیا (فاخذھم العذاب)۔

اور جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۷۸، اور سورۂ ہود کی آیت ۶۷ میں اجمالی طور پر مذکور ہے کہ پہلے پہل زبردست زلزلے نے ان کی زمین کو لرزا دیا، جب وہ خواب سے بیدار ہوئے اور اپنے زانوؤں کے بل بیٹھ گئے تو حادثے نے انھیں مہلت نہ دی، گرجدار بجلی بہت ہی زور کے ساتھ کڑکی اور دیواروں کو ان کے اوپر گرا دیا اور اسی حالت میں انھوں نے عجیب و غریب دہشت کے ساتھ جان دی۔

اس داستان کے آخر میں قرآن وہی کچھ کہتا ہے جو قومِ ہود، قومِ نوح اور قومِ ابراہیم کی سرگزشت کے آخر پہ کہتا ہے:

قومِ صالح کی اس داستان میں آیت اور درسِ عبرت ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے کس قدر پامردی، صبر اور عمدہ منطق کا مظاہرہ کیا اور ان روسیاہ لوگوں نے کس حد تک سرکشی، ہٹ دھرمی اور مخالفت کا اظہار کیا کہ بالآخر وہ منحوس انجام کو جا پہنچے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (ان فی ذٰلک لاٰیة وما کا

---

[1] اس بارے میں مزید تفصیلات کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۵ سورۂ ہود کی آیت ۶۴ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] "عقروا" "عقر" (بروزن "قفل") کے مادہ سے ہے جس کا معنی کسی چیز کی اساس اور بنیاد ہے۔ جس کا معنی تو "سر کاٹنے" کا ہے اور دوسرا "جانور کے پے کرنے کا ہے۔ (یعنی جانور کے پاؤں کے نچلے حصّے اور زمین پر گرا دینا)۔

اکثرھم مؤمنین)۔

یقیناً کوئی بھی شخص قدرتِ خدا پر غالب نہیں آسکتا ! جیسا کہ اس کی یہ قدرتِ کاملہ دوستوں بلکہ دشمنوں تک پہنچنے کے لیے اس کی رحمت میں مانع نہیں ہو سکتی لہٰذا "تمھارا پروردگار عزیز اور رحیم ہے" (وان ربك لھو العزیز الرحیم)[1]

[1] روایات کے مطابق جس نے ناقۂ صالح کو قتل کیا وہ ایک شخص تھا جبکہ یہ عمل قرآنِ مجید میں "فعل جمع" کی صورت میں بیان ہوا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ دوسرے لوگ اس کے ہم عقیدہ، ہم آواز اور اس کے عمل پر راضی تھے اور یہیں سے ایک بنیادی قاعدے کی راہ کھلتی ہے کہ مذہبی اور عقیدتی رشتہ مختلف لوگوں کو ایک ہی لڑی میں منسلک کر دیتا ہے اس کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۵ سورۂ ہود کی آیت ۶۵ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۶۰۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطِ ٍۨ الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۶۱۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝

۱۶۲۔ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝

۱۶۳۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝

۱۶۴۔ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

۱۶۵۔ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝

۱۶۶۔ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ۝

ترجمہ

۱۶۰۔ قومِ لُوط نے (خدا کے) رسولوں کی تکذیب کی۔

۱۶۱۔ جبکہ ان کے بھائی لُوط نے انھیں کہا: آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟

۱۶۲۔ میں تمھارے لیے امین رسول ہوں۔

۱۶۳۔ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۶۴۔ میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف پروردگارِ عالمین کے ذمے ہے۔

۱۶۵۔ کیا تم جہان (والوں) میں سے صرف مذکر جنس کے پیچھے ہی جاتے ہو؟ (کیا یہ بُری اور شرم کی بات نہیں ہے؟)

۱۶۶۔ اور اپنی ازواج کو چھوڑ دیتے ہو جنھیں خدا نے تمھارے ہی لیے مرز فرمایا ہے، تم تو تجاوز کرنے والی قوم ہو۔

تفسیر

بے حیا قوم!

چھٹے پیغمبر کہ جن کی اپنی اور گمراہ قوم کی زندگی کا ایک گوشہ اس سُورت میں بیان ہوا ہے، حضرت لوط علیہ السلام ہیں باوجودیکہ جناب لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر ہیں۔ لیکن ان کا ماجرا ابراہیمؑ کی داستان کے بعد بیان ہوا، کیونکہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب تو نہیں کہ واقعات کو بالترتیب بیان کرے بلکہ اس کے پیشِ نظر تربیتی اور انسان سازی کے پہلو ہوتے ہیں جو دوسری مناسبتوں کے متقاضی بھی ہوتے ہیں۔ جناب لوط کی زندگی اور ان کی قوم کا ماجرا ایسے انبیاء کی داستانوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے جن کا ذکر ابھی بیان ہوا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے :۔ لوط کی قوم نے خدا کے بھیجے ہوئے افراد کی تکذیب کی (کذبت قوم لوطِ المرسلین)۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ "مرسلین" کو جمع کی صورت میں بیان کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت ایک ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی پیغمبر کی تکذیب سب کی تکذیب شمار کی جاتی ہے یا پھر اس لیے ہے کہ وہ گزشتہ کسی بھی پیغمبر پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

پھر جناب لوط علیہ السلام کی دعوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کی دعوت بھی گزشتہ انبیاء جیسی تھی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے : جبکہ ان کے بھائی لوطؑ نے انھیں کہا کہ آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اذ قال لھم اخوھم لوط الا تتقون)۔

ان کی گفتگو کا انداز اور حد سے زیادہ اور گہری محبت و ہمدردی بتا رہی ہے کہ وہ ایک بھائی کی مانند ان سے باتیں کرتے تھے۔

پھر فرمایا گیا ہے : میں تمھارے لیے امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔

کیا اب تک تم نے مجھ سے کوئی خیانت دیکھی ہے؟ اس کے بعد وحی الٰہی اور تمھارے رب کا پیغام پہنچانے میں بھی یقیناً امانت کو مدِنظر رکھوں گا۔

"اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو پرہیزگاری اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"، کیونکہ میں راہِ سعادت کا رہبر ہوں (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

یہ نہ سمجھو کہ یہ دعوتِ الٰہی میرے گزر اوقات کا ایک ذریعہ ہے یا کسی مادی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ایسا کام کر رہا ہوں، نہ، نہ میں تو ذرہ بھر بھی تم سے اُجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف عالمین کے رب کے پاس ہے (و ما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العالمین)۔

پھر (وہ) ان کے ناشائستہ اعمال اور ان کی کچھ اخلاقی بے راہروی کی باتوں کو بیان کرتے ہیں اور چونکہ ان کا بڑا انحراف جنسی انحراف اور

ہم جنس بازی تھا لہٰذا اسی بات پر زیادہ زور دے کر کہتے ہیں : آیا تم ساری دنیا میں صرف مَردوں کے پاس ہی جاتے ہو (اتأتون الذکران من العالمین)۔

یعنی باوجودیکہ خداوندِ عالم نے اس قدر جنس مخالف تمھارے لیے خلق فرمائی ہے جن سے صحیح طریقے سے شادی کر کے پاک و پاکیزہ اور اطمینان بخش زندگی بسر کر سکتے ہو۔ خدا کی اس پاک اور فطری نعمت کو چھوڑ کر تم نے خود کو اس طرح کے پست اور حیاسوز کام سے آلودہ کر رکھا ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ "من العالمین" کا جملہ خود اس قوم کے لیے ہو یعنی تمام جہان والوں میں صرف تم ہی ہو جنھوں نے یہ کج روی اختیار کی ہوئی ہے اور یہ بات بعض تاریخوں سے بھی ہم آہنگ ہے کہ قوم لوط ہی سب سے پہلی قوم ہے جس نے ہم جنس بازی کا وسیع صورت میں ارتکاب کیا ہے[1] لیکن بعد والی آیت سے پہلی تفسیر زیادہ ہم آہنگ ہے۔

پھر فرمایا : اپنی ازواج کو ترک کر دیتے ہو جنھیں خدا نے تمھارے لیے خلق فرمایا ہے (و تذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم)۔

تم تو تجاوز کرنے والی قوم ہو (بل انتم قوم عادون)۔

یقیناً کسی روحانی یا جسمانی فطری ضرورت نے تمھیں اس بے راہروی پر آمادہ نہیں کیا بلکہ یہ تمھاری سرکشی ہے جس نے تمھارے دامن کو اس شرمناک فعل کی گندگی سے آلودہ کر دیا ہے۔

تمھارے کام کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص خوشبودار میوے، مقوی اور صحیح سالم غذائیں چھوڑ کر زہر آلود اور مار ڈالنے والی غذاؤں کو استعمال کرے۔ یہ فطری خواہش نہیں بلکہ سرکشی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **لواطت ایک شرمناک فعل ہے :۔** قرآن مجید نے سورۂ اعراف، ہود، حجر، انبیاء، نمل اور عنکبوت میں قوم لوط کے حالات اور ان کے اس بُرے گناہ کی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ ہر مقام پہ دوسرے مقام کی نسبت مختلف تعبیریں پائی جاتی ہیں در حقیقت ان میں سے ہر ایک تعبیر اس بے حیائی پر مبنی قبیح فعل کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف آیہ ۸۱ میں ہے کہ لُوط علیہ السلام نے انھیں کہا :۔

بل انتم قوم مسرفون

تم اسراف کرنے والے لوگ ہو۔

سورۂ انبیاء آیت ۷۴، میں ہے :۔

---

[1] اس بے شرم قوم کے انحراف کی وجہ ایک داستان ہے جو تاریخوں میں موجود ہے اور جسے ہم تفسیر نمونہ جلد ۵ میں سورۂ ہود آیت ۸۱ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث انھم کانوا قوم سوء فاسقین

ہم نے لُوط کو اس بستی سے نجات دلائی جو "خبائث" کا ارتکاب کرتی تھی، وہ بہت بُرے اور فاسق لوگ تھے۔

سُورۂ شعراء کی زیر بحث آیت میں ہے کہ جناب لوط علیہ السّلام نے انھیں فرمایا:۔

بل انتم قوم عادون

تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔

سُورۂ نمل آیت ۵۵ میں ہے:۔

بل انتم قوم تجھلون

تم جاہل اور نادان قوم ہو۔

سُورۂ عنکبوت کی آیت ۲۹ میں ہے کہ لُوط علیہ السّلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:۔

ائنکم لتاتون الرجال وتقطعون السبیل

تم مَردوں کے پاس جاتے ہو اور فطری اور نسلِ انسانی کے راستے کو منقطع کرتے ہو[۱]

اس طرح سے یہ قبیح فعل "اسراف"، "خبیث"، "فسق"، "تجاوز"، "جہل" اور "قطع سبیل" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

"اسراف" اس لیے کیونکہ ان لوگوں نے اس بارے میں نظامِ آفرینش کو فراموش کر دیا تھا اور حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ تعدّی کا لفظ بھی اس پر بولا گیا ہے۔

"خبیث" کا معنی ہے ایسا کام یا ایسی چیز جس سے انسان کی صحیح و سالم طبیعت نفرت کرے اور اس قبیح عمل سے بڑھ کر اور کون سا فعل ہوگا جس سے طبیعت نفرت کرے۔

"فسق" کا معنی ہے پروردگار کی اطاعت سے نکل جانا اور شخصیت انسانی کا ننگا ہو جانا اور یہ کام یقیناً اطاعتِ الٰہی سے خارج اور شخصیت انسانی کو ننگا کر دیتا ہے۔

"جہل" اس کے ان خطرناک نتائج سے بے خبری کی وجہ سے کہ جو فرد اور معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

اور "قطع سبیل" یعنی اس قبیح فعل کا بدترین انجام نسلِ انسانی کا خاتمہ ہے کیونکہ اگر یہ شرمناک فعل وسعت اختیار کر لے تو نسلِ انسانی ختم ہو کر رہ جائے وہ اس لیے کہ موافق جنس کی طرف میلان آہستہ آہستہ مخالف جنس سے تعلقات منقطع کرنے کا سبب بن جائے گا اور نسلِ بشر بڑھنے سے رک جائے گی۔

۲۔ لواطت کے خطرناک نتائج:۔ اگرچہ ہم نے تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد (سورۂ ہود کی آیات ۸۱ تا ۸۳ کی شرح) میں

[۱] بعض مفسرین نے "تقطعون السبیل" کے جملے کی یوں تفسیر کی ہے کہ قوم لوط کے افراد راہزن، ڈاکو اور لٹیرے بھی تھے۔

...رمناک فعل کے مضرات اور نقصانات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر پھر بھی چند ایک مطالب ...ن کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث ہے۔

لا یجد ریح الجنۃ زنوق ۔ وھو المخنث

جس سے لواطت کی جائے وہ بہشت کی خوشبو نہیں سونگھ پائے گا[۱]

حضرت علی علیہ السّلام کے ایک فرمان میں اس قبیح فعل کا کفر کی حد تک تعارف کرایا گیا ہے[۲]

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے لواطت کی حرمت کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

علۃ تحریم الذکران للذکران و الاناث للاناث لما رکب فی الاناث و ما طبع علیہ الذکران. ولما فی اتیان الذکران، الذکران و الاناث للاناث، من انقطاع النسل، وفساد التدبیر، وخراب الدنیا

مردوں پر مردوں کے اور عورتوں پر عورتوں کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے مرد اور عورت کی جو فطرت بنائی ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ (اور اس فطری اور طبعی ساخت کی مخالفت، انسان کی روح اور جسم کے انحراف کا سبب بن جائے گی) اور یہ اس لیے بھی حرام ہے کہ اگر مرد، مردوں کے ساتھ، اور عورتیں عورتوں کے ساتھ ملاپ شروع کر دیں تو نسلِ انسانی منقطع ہو جائے اور اجتماعی زندگی کی تمام تدبیریں خرابی کا شکار ہو جائیں اور دنیا تباہ و برباد ہو جائے[۳]

اور اسلام کی نگاہ میں یہ فعل اس حد تک برا اور شرمناک ہے کہ اسلامی حُدود کے ابواب میں اس کی سزا کسی شک کے بغیر ...لئے موت ہے حتیٰ کہ جو لوگ اس قبیح فعل کے کم ترین مرحلے کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے لیے بھی سخت سے سخت سزائیں مقرر کی ...گئی ہیں منجملہ ان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا فرمان ہے:۔

من قبل غلاما من شھوۃ الجمہ اللہ یوم القیامۃ بلجام من نار[۴]

جو شخص کسی لڑکے کا شہوت کے ساتھ بوسہ لے خداوندِ عالم بروز قیامت اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالے گا۔

جو شخص اس حدیث میں مذکور بُرے فعل کا مرتکب ہو اس کی سزا تیس تا ننانوے کوڑے ذکر ہوئے ہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ جنسی بے راہروی خطرناک ترین انحراف ہے کہ اگر یہ انسانی معاشرے میں رونما ہو جائے تو یہ اپنا منحوس سایہ تمام اخلاقی مسائل پر ڈال دیتا ہے اور انسانی مزاج اور جذبات کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔

(اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۵ سُورۂ ہود کی آیہ ۸۱ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)

[۱]، [۲]، [۳] بحار الانوار، طبع جدید جلد ۷۹، ص ۶۴، ۶۷۔

[۴] بحار الانوار جلد ۷۹، ص ۷۲۔

۱۶۷۔ قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ○

۱۶۸۔ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ ○

۱۶۹۔ رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ○

۱۷۰۔ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ○

۱۷۱۔ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ○

۱۷۲۔ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ○

۱۷۳۔ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنذَرِينَ ○

۱۷۴۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ○

۱۷۵۔ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ○

ترجمہ

۱۶۷۔ ان لوگوں نے کہا: اے لُوط! اگر تم ایسی باتوں سے باز نہ آئے تو نکال دیئے جانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

۱۶۸۔ کہا: میں تو (بہر حال) تمھارے اعمال کا دشمن ہوں۔

۱۶۹۔ پروردگارا! مجھے اور میرے خاندان کو ان کے کرتوتوں سے نجات دے۔

۱۷۰۔ ہم نے اسے اور اس کے خاندان سب کو نجات دی۔

۱۷۱۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو اس گروہ میں باقی رہ گئی۔

۱۷۲۔ پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے ہلاک کر ڈالا۔

۱۷۳۔ اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی، کس قدر بُری بارش تھی ڈرائے جانے والوں پر۔

۱۷۴۔ (قوم لوط کی) اس داستان (اور ان کے منحوس انجام) میں نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے۔

۱۷۵۔ اور تیرا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

قوم لوط کا انجام

قوم لوط کے افراد جو بادہ شہوت و غرور سے مست ہو چکے تھے، اس رہبر الٰہی کی نصیحتوں کو جان و دل سے قبول کرنے اور خود کو اس دلدل سے باہر نکالنے کی بجائے اس کے مقابلے پر تُل گئے اور انھیں کہا: اے لوط! کافی ہو چکا ہے، اب خاموش رہو اگر ان باتوں سے باز نہ آئے تو تمھارا شمار بھی اس شہر سے نکال دیئے جانے والوں میں سے ہوگا (قالوا لئن لم تنتہ یالوط لتکونن من المخرجین)۔

تمھاری باتیں ہماری فکر اور آرام میں خلل ڈال رہی ہیں ہم ان باتوں کے سننے کے ہرگز روادار نہیں: اگر تمھاری یہی حالت رہی تو ہم تمہیں سزا دیں گے جو کم از کم جلاوطنی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید کے ایک اور مقام پہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنایا اور حکم دیا کہ لوط کے خاندان کو شہر سے باہر نکال دو کیونکہ وہ پاک لوگ ہیں اور گناہ نہیں کرتے۔

اخرجوھم من قریتکم انھم اناس یتطھرون (الاعراف: ۸۲)

ان گمراہ اور گناہ آلود لوگوں کی جسارت اس حد تک جا پہنچی کہ تقویٰ اور طہارت ان کے درمیان بہت بڑا عیب سمجھا جانے لگا اور ناپاکی اور گناہ سے آلودگی سرمایۂ افتخار! اور یہ کسی معاشرے کی تباہی کی علامت ہوتی ہے جو تیزی کے ساتھ برائیوں کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔

"لتکونن من المخرجین" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فاسق و فاجر گروہ نے ایسے پاک و پاکیزہ لوگوں کو پہلے باہر نکال دیا جو ان کو ان کے بیہودہ اعمال سے روکا کرتے تھے لہٰذا انھوں نے حضرت لوط کو بھی یہی دھمکی دی کہ اگر تم نے اپنے اس تبلیغی سلسلے کو جاری رکھا تو تمھارا بھی وہی انجام ہوگا۔

بعض تفسیروں میں صراحت کے ساتھ تحریر ہے کہ وہ پاک دامن لوگوں کو بدترین طریقے سے جلا وطن کر دیا کرتے تھے[1] لیکن حضرت لوط علیہ السلام نے ان دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنا کام جاری رکھا اور کہا: میں تمھارے ان کاموں کا دشمن ہوں۔ (قال انی لعملکم من القالین)۔

یعنی میں اپنا احتجاج برابر جاری رکھوں گا، تم جو کچھ میرا بگاڑنا چاہتے ہو بگاڑ لو مجھے راہ خدا اور برائیوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں ان دھمکیوں کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہے۔

"القالین" جمع کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس احتجاج اور جہاد میں اور بھی بہت سے لوگ جناب لُوط

---

[1] تفسیر روح المعانی اور تفسیر کبیر فخر رازی اسی آیت کے ذیل میں۔

علیہ السلام کے ہمنوا ہو چکے تھے یہ اور بات ہے کہ سرکش قوم نے آخر کار انھیں جلاوطن کر دیا۔

" قالین " " قال " کی جمع اور " قلی " (بروزن حلق یا بروزن شرک) کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ایسی عداو[ت] ہے جو انسان کی روح میں اُتر جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب لُوط علیہ السلام کو ان کے اعمال سے کس قدر نفرت تھی

لائق توجہ بات یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام فرماتے ہیں کہ " میں تمھارے اعمال کا دشمن ہوں " یعنی مجھے تمھاری ذات سے دشمنی نہیں بلکہ تمھارے شرمناک اعمال سے نفرت ہے اگر ان اعمال کو اپنے سے دور کردو تو پھر تم میرے پکے دوست ہو۔

بہرحال جناب لوط علیہ السلام کی کسی بھی نصیحت نے ان پر کوئی اثر نہ کیا ان کا تمام معاشرہ اس متعفن دلدل میں پھنس کر رہ [گیا] بڑی حد تک اتمام حجت بھی کی گئی مگر بے فائدہ۔ اب لوط علیہ السلام کی ذمہ داری کا آخری مرحلہ آن پہنچا لہٰذا وقت آ پہنچا [کہ] جناب لوط علیہ السلام خود کو بھی اور جو لوگ ان پر ایمان لا چکے ہیں انھیں بھی اس گناہ آلود علاقے سے باہر نکال کر لے جائیں تاکہ ہولناک عذاب اس بے حیا قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں دستِ دعا بلند کر کے کہا:۔

پروردگارا! جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں مجھے اور میرے خاندان کو اس سے نجات دے (رب نجنی واھلی مما یعملون)۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ " اہل " سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو آپ پر ایمان لا چکے تھے لیکن سورۂ " ذاریات " کی آیت ۳۶ کہتی ہے:۔

فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین

صرف ایک ہی خاندان تھا جو ایمان لا چکا تھا۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ زیرِ تفسیر آیت میں بعض ایسی تعبیرات پائی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کچھ لوگ حضرت لُوط پر ایمان لا چکے تھے لیکن انھیں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

جو کچھ بتایا جا چکا ہے اس سے ضمنی طور پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جناب لوط علیہ السلام کی اپنے خاندان کے لیے دعا خاندانی شفقت اور رشتہ داری کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ایمان لانے کی بناء پر تھی۔

خداوندِ عالم نے ان کی دعا قبول فرمائی جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے لُوط اور ان کے سب خاندان والوں کو نجات دی (فنجیناہ و اھلہ اجمعین)۔

سوائے اس بڑھیا کے جو گمراہ لوگوں کے درمیان باقی رہ گئی تھی (الا عجوزًا فی الغابرین)۔[1]

بچ رہنے والی یہ بڑھیا جناب لوط علیہ السلام کی بیوی ہی تھی جو عقیدے اور مذہب کے لحاظ سے اس گمراہ قوم سے ہم آہنگ و

---

[1] " غابر " " غبور " کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے باقی ماندہ اور بچی کھچی چیز۔ جب کوئی ایک گروہ کسی جگہ سے چل پڑے تو جو شخص وہیں پر رہ جائے اسے غابر کہتے ہیں اسی لیے مٹی کے بچے کھچے حصے کو " غبار " کہتے ہیں اور حیوان کے پستان سے دودھ دوہ لینے کے بعد جو بچ رہے اسے غبرۃ کہتے ہیں۔

ہم خیال تھی۔ وہ آخر دم تک جناب لوطؑ پر ایمان نہیں لائی اور اسی گمراہ قوم کے انجام سے دوچار ہوئی۔ اس کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد ۹ سورہ ہود کی مذکورہ آیات کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

ہاں تو خداوندِ عالم نے جناب لوط اور جو تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لے آئے تھے ان سب کو نجات بخشی۔ چنانچہ انھوں نے حکمِ الٰہی کے تحت گناہ آلود لوگوں کے علاقہ سے رختِ سفر باندھا اور راتوں رات چل پڑے اور گناہ و بے شرمی میں غرق لوگوں کو ان کے اپنے حال پر باقی چھوڑ دیا۔ علی الصباح عذاب کا حکم صادر ہوا، وحشت ناک لے نے ان کے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس سے ان کے آباد و شاد شہر، خوبصورت محلات، عیش و عشرت اور بے شرمی و بے حیائی پر مبنی ان کی زندگی غرض سب کچھ مکمل طور پر تہ و بالا ہو گیا، جیسا کہ خداوندِ عالم نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے: پھر ہم نے ان تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دیا۔ (ثم دمرنا الاٰخرین)۔

اور ان پر بارش برسائی (لیکن کیسی بارش؟ پتھروں کی بارش اور وہ بھی اس حد تک کہ ان کے کھنڈرات تک دکھائی نہ دیتے تھے) (و امطرنا علیھم مطرًا)۔

کس قدر بُری بارش نے اس ڈرائے جانے والے گروہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا (فساء مطر المنذرین)۔

معمول کے مطابق برسنے والی بارشیں مُردہ زمینوں کو زندہ کر دیتی ہیں اور ان میں تازہ روح پھونک دیتی ہیں۔ لیکن یہ وحشتناک بارش تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے والی تھی۔

سُورہ ہود کی آیت ۸۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے قوم لوط کے شہر تہ و بالا ہوئے پھر ان پر پتھروں کی مسلسل بارش برسی اور جیسا کہ اسی آیت کی تفسیر میں ہم بتا چکے ہیں کہ پتھروں کی بارش ان پر شاید اس لیے تھی کہ ان کے نام و نشان تک مٹ جائیں اور آباد و شاد شہروں کی بجائے پتھر اور مٹی کے ٹیلے یادگار کے طور پر باقی رہ جائیں۔

آیا یہ پتھر عظیم طوفان کی وجہ سے بیابانوں سے اُڑ اُڑ کر برسنے لگے یا آسمانی فضا میں اُڑتے پھرتے پتھر تھے کہ جو حکمِ خداوندی کے تحت وہاں پر برسے۔

یا بعض مفسرین کے بقول قریب ہی خاموش آتش فشاں تھا جو حکمِ پروردگار کے مطابق پھٹ پڑا۔ اور اسی کے پتھر بارش بن کر برسنے لگے؟ یہ اچھی طرح معلوم نہیں ہے جو بات مسلّم ہے وہ یہ کہ اس تباہ کن بارش نے اس گناہ آلود سرزمین میں سے زندگی کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

اس واقعے کی تفصیل تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد صفحہ ۲۳۱ سے ۲۳۷ تک اور چھٹی جلد کے صفحہ ۲۰۷ سے ۲۱۴ تک میں مختلف نکات کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

اس واقعے کے اختتام پر ایک بار پھر ان دو جملوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس طرح کے دوسرے پانچ انبیاء کے واقعات کے آخر میں پڑھ چکے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: اس ظالم اور بے حیا قوم کی داستان اور ان کے منحوس انجام میں آیت و نشانی اور درسِ عبرت ہے (ان فی ذٰلک لاٰیۃ)۔

لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (و ما کان اکثرھم مؤمنین)۔

اس سے بڑھ کر اور کون سی واضح اور روشن نشانی ہو سکتی ہے جو تمھیں اہم اور نتیجہ خیز مسائل سے آگاہ کرتی ہے اور تمھیں ذاتی تجربات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

یقیناً گزشتہ لوگوں کی تاریخ ایک درسِ عبرت ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک نشانی ہے۔ یہ ذاتی تجربہ بھی نہیں ہے کیونکہ ذاتی تجربے میں تو نقصان اٹھانے کے بعد نتائج حاصل ہوتے ہیں لیکن اس میں دوسروں کے تجربوں سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اور تیرا پروردگار عزیز و رحیم ہے (وان ربک لهو العزیز الرحیم)۔

اس سے بڑھ کر اور رحمت کیا ہو سکتی ہے کہ اس قسم کے گناہوں سے آلودہ قوموں کو سزا نہیں دیتا بلکہ انھیں ہدایت اور نظر ثانی کے لیے کافی ڈھیل اور لمبی مہلت دیتا ہے۔

اور پھر یہ کہ اس سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہو کہ اس کی سزا میں سب خشک و تر نہیں جلتے حتیٰ کہ اگر ہزاروں لاکھوں گناہگار خاندانوں میں صرف ایک ہی مومن خاندان ہے تو وہ انھیں نجات عطا فرماتا ہے۔

اور غلبہ و قدرت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس قسم کے گناہ آلود شہروں کو چشم زدن میں یوں تہ و بالا کر دیتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے ان کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے جو زمین گناہگاروں کی آسائش و آرام کا گہوارہ ہوتی ہے اسے پل بھر میں ان کی موت پر مامور کر دیتا ہے اور حیات بخش بارش کو موت کی بارش میں تبدیل کر دیتا ہے۔

۱۷۶۔ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ○ۚ
۱۷۷۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ۚ
۱۷۸۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ۙ
۱۷۹۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ۚ
۱۸۰۔ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ۭ
۱۸۱۔ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ○ۚ
۱۸۲۔ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ○ۚ
۱۸۳۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ۚ
۱۸۴۔ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ○ۭ

ترجمہ

۱۷۶۔ (مدین کے نزدیک شہر) ایکہ والوں نے (خدا کے) رسولوں کو جھٹلایا۔
۱۷۷۔ جبکہ شعیب نے انھیں کہا: کیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟
۱۷۸۔ میں تمھارے لیے امین رسول ہوں۔
۱۷۹۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
۱۸۰۔ میں اس دعوت کے بدلے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف عالمین کے پروردگار کے پاس ہے۔
۱۸۱۔ پیمانے کا حق ادا کرو (اور کم مت بیچو) اور لوگوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔
۱۸۲۔ اور ٹھیک ترازو سے تولا کرو۔

۱۸۳۔ لوگوں کا حق کم نہ دیا کرو اور زمین میں خرابی نہ پھیلاتے پھرو۔
۱۸۴۔ جس نے تمھیں اور تم سے اگلی قوموں کو خلق کیا ہے، اس سے ڈرو۔

تفسیر

شعیبؑ اور اہلِ ایکہ

اس سورت میں انبیاء کے واقعات کا یہ ساتواں اور آخری حصہ ہے۔ یہ اللہ کے عظیم نبی شعیب علیہ السلام اور ان کی سرکش قوم کی داستان ہے۔

اللہ کے یہ نبی مدین (شامات کے جنوب میں ایک شہر کا نام) اور ایکہ (بروزن لیکہ، مدین کے نزدیک ایک آبادی کا نام) میں رہتے تھے۔

سورۂ حجر کی آیت ۷۹، اس بات کی گواہ ہے کہ سرزمین ایکہ حجاز سے شام کی طرف جانے والے رستے میں تھی۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ایکہ والوں نے خدا کے رسولوں کی تکذیب کی (کذب اصحاب الایکۃ المرسلین)۔

انھوں نے نہ صرف جناب شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی جو ان کی طرف مبعوث ہوئے بلکہ دعوت کی یگانگت اور وحدت کی وجہ سے دوسرے انبیاء بھی ان کی تکذیب سے محفوظ نہ رہ سکے یا انھوں نے کسی بھی آسمانی دین کو قبول نہیں کیا تھا۔

"ایکہ" دراصل ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پر گھنے جنگلات ہوں کہ جسے فارسی میں "بیشہ" (اور اردو میں کچھار، مترجم) کہتے ہیں۔ یہ علاقہ مدین کے پاس تھا۔ پانی اور گھنے درختوں کی وجہ سے "ایکہ" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ قرائن بتلاتے ہیں کہ ایکہ کے رہنے والے بڑے خوشحال اور ثروت مند لوگ تھے۔ اور یہی خوشحالی اور ثروت ہی شاید ان کے غرور اور غفلت میں غرق ہو جانے کا سبب بن گئی۔

پھر اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، جب شعیب نے انھیں کہا کہ آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اذ قال لھم شعیب الا تتقون)۔

درحقیقت جناب شعیب علیہ السلام کی دعوت کا آغاز بھی دوسرے انبیاء کی مانند تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہوتا ہے کہ جو تمام اصلاحی کاموں کی بنیاد اور اخلاقی وسماجی برائیوں سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس طرح جناب صالح، ہود، نوح اور لوط علیہم السلام کی داستانوں میں لفظ "اخوھم" آیا ہے یہاں پر دکھائی نہیں دیتا اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جناب شعیب علیہ السلام کا وطن "مدین" تھا ان کی رشتے داری مدین والوں کے ساتھ تھی اہلِ ایکہ کے ساتھ نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ ہود کی آیہ ۸۴ میں جب صرف "مدین" کا تذکرہ آتا ہے تو یوں کہا جاتا ہے:

والی مدین اخاھم شعیبًا

زیرِ نظر آیت میں چونکہ "ایکہ" والوں کا ذکر ہے اور شعیب علیہ السلام سے ان کی کسی قسم کی رشتہ داری نہیں تھی لہٰذا یہاں پر وہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔

پھر فرمایا گیا ہے۔ شعیب نے کہا: میں تمھارے لیے امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔

تقویٰ اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (کیونکہ میری اطاعت اسی کی ہی اطاعت ہے) (فاتقوا اللہ واطیعون)۔

یہ بھی اچھی طرح جان لو کہ "میں اس دعوت کا اجر تم سے نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اور صرف عالمین کے رب کے پاس ہے" (وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العالمین)۔

وہی ایک جملہ اور ہر لحاظ سے جچا تُلا جملہ جو دوسرے تمام انبیاء کی دعوت کے آغاز میں آیا ہے، تقویٰ کی دعوت، اپنی دیانت وامانت پر مبنی زندگی کا حوالہ اور اس بات پر خاص طور پر زور کہ اس دعوتِ الٰہی کا سبب صرف اور صرف روحانی ہے کوئی مادی فائدہ پیشِ نظر نہیں۔ یہ اس لیے فرمایا تاکہ بہانہ ساز اور بدگمان لوگوں کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی دوسرے انبیاء کا سا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے انھوں نے تقویٰ اور اطاعتِ پروردگار پر مبنی عمومی دعوت دی۔ اپنی تعلیمات کے دوسرے حصے میں اس ماحول کی خرابیوں، اخلاقی اور اجتماعی برائیوں کی نشاندہی کی اور انھیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس خوشحال قوم کی اہم ترین خرابیاں اقتصادی ناہمواری، کھلم کھلا ظلم، حق کشی اور لوٹ کھسوٹ تھیں لہٰذا انھوں نے بھی انھی مسائل پر خاص زور دیا۔

پہلے فرماتے ہیں: پیمانے کا حق ادا کرو (ناپ تول میں کمی نہ کرو)۔ (اوفوا الکیل)۔

اور لوگوں کو نقصان اور گھاٹا نہ پہنچاؤ (ولا تکونوا من المخسرین)۔

سیدھے اور صحیح ترازو سے تولو (وزنوا بالقسطاس المستقیم)[1]۔

لوگوں کا حق کم نہ کرو اور نہ ہی لوگوں کی اشیاء اور جنس میں عیب نکالو (ولا تبخسوا الناس اشیاءھم)۔

زمین پر خرابی نہ پھیلاتے پھرو (ولا تعثوا فی الارض مفسدین)۔

ان تین آیات میں شعیب علیہ السلام نے ایک مختصر مگر جچی تلی عبارت میں اس گمراہ قوم کو "پانچ حکم" دیے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ تصور کیا ہے کہ یہ پانچ حکم ایک دوسرے کی تاکید کے طور پر آئے ہیں لیکن اگر خوب غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ پانچ حکم درحقیقت پانچ بنیادی اور مختلف مطالب کی طرف اشارہ ہے ان میں چار حکم ہیں اور ایک مجموعی کُلیہ ہے۔

اس فرق کو معلوم کرنے کے لیے اس حقیقت کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قومِ شعیبؑ (ایکہ اور مدین کے لوگ) ایک اہم تجارتی راستے پر رہتے تھے۔ جہاں سے حجاز سے شام اور شام سے حجاز اور دوسرے مقامات کی طرف تجارتی قافلوں کی

---

[1] "قسطاس" (بروزن مقیاس) ترازو کے معنی میں ہے بعض لوگ اسے رومی اور کچھ لوگ عربی لفظ سمجھتے ہیں بعض کا خیال ہے قسطاس بڑے ترازو کو کہتے ہیں اور میزان چھوٹے کو اور چونکہ قسطاس ایسا ترازو ہوتا ہے جس کی سوئی کی مانند زبان ہوتی ہے لہٰذا یہ صحیح وزن بتاتا ہے۔

آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔

معلوم ہے کہ ایسے قافلوں کو راستے میں بہت سی چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے اور بعض اوقات راستے میں پڑنے والے شہروں
مسافروں کی ضروریات اور مشکلات سے بہت ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ان کی اجناس کو کم قیمت پر خریدتے ہیں اور اپنی
زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں (البتہ تو خیر رہے کہ اس زمانے میں زیادہ تر کاروبار مال کے بدلے مال کی صورت میں ہوا کرتا تھا)۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی کا مال خریدتے ہیں اس میں ہزار عیب نکالتے ہیں، جب اپنا مال بیچتے ہیں تو اس کی
تعریف کرتے ہیں۔ جب تولتے ہیں تو اپنا مال پورا پورا یا کم تولتے ہیں اور دوسروں کا مال بے پرواہی سے تولتے ہیں یا زیادہ تو
چونکہ فریق ثانی بے چارہ ضرورت مند ہوتا ہے لہٰذا مجبور ہوتا ہے کہ ایسی بے انصافیاں قبول کرے۔

قافلوں اور کاروانوں سے ہٹ کر بھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاقے کے غریب اور بے بس لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک ک
ہیں اور معاشرے کے مالدار اور سرمایہ دار لوگ ایسے مجبور اور بے بس لوگوں کے ساتھ اسی قسم کا ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ غریب لو
کوئی جنس بیچیں یا خریدیں اس کی قیمت دولت مندوں کی حسب منشا متعین ہوتی ہے اور پیمانہ بھی ہر حالت میں انھی کے اختیار میں ہو
ہے اور بے بس اور بے نوا مستضعف "مردہ بدست زندہ" کے مصداق ان کے سامنے مجبور اور بے اختیار ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو کو پیش نظر رکھ کر اب ہم آیات زیر بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔

ایک مقام پر تو انھیں پیمانے کا حق ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے دوسری جگہ پر صحیح طور پر تولنے کا اور ہم جانتے ہیں کہ سامان کو یا
تو تولا جاتا ہے اور یا ناپا جاتا ہے لہٰذا ہر دو صورتوں کی جداگانہ طور پر نشاندہی کی گئی ہے تاکہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرادی جائے
کہ کسی بھی موقع پر کم نہ بیچیں۔

اور پھر یہ کہ کم فروشی کے بھی کئی طریقے ہیں کبھی ترازو یا پیمانہ تو ٹھیک ہوتا ہے لیکن اس کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور کبھی ترازو اور پیمانہ
صحیح نہیں ہوتا بلکہ خود ساختہ اور جعلی ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں ان سب باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ان دو تعبیروں کے واضح ہو جانے کے بعد اب ہم " لا تبخسوا " کی بات کرتے ہیں چنانچہ یہ " بخس " کے مادہ سے
ہے جس کا معنی ہے ظالمانہ طریقے سے کسی کے حقوق گھٹا دینا اور کبھی یہ لفظ فریب دہی کے معنی میں بھی آتا ہے جس کا انجام دوسروں کے
حقوق ضائع کرنا ہوتا ہے بنا بریں مندرجہ بالا جملے کا ایک وسیع معنی ہے جس میں لین دین میں کھوٹ، ملاوٹ، ٹھگی، لوٹ کھسوٹ
اور دھوکا دہی سب شامل ہیں۔

رہا " لا تکونوا من المخسرین " کا جملہ تو چونکہ " مخسر " کا معنی ہے ایسا شخص جو کسی شخص یا کسی چیز کو
خسارہ پہنچاتا ہے اور اس کے بھی کئی معانی ہیں جس میں خرید و فروخت اور لین دین میں ہر قسم کی کمی شامل ہے۔

اس لحاظ سے ہر قسم کی ناجائز منافع خوری اور لین دین میں ظلم و ستم، ہر طرح کی دھوکا بازی اور نقصان پہنچانے کی کوشش خواہ
وہ کمیت میں ہو یا کیفیت میں، سب کچھ مندرجہ بالا حکم میں شامل ہیں۔

اور چونکہ اقتصادی ناہمواری اجتماعی نظام کے منتشر ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے لہٰذا ان احکام کے آخر میں مجموعی صورت کو
بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے " ولا تعثوا فی الارض مفسدین " یعنی زمین میں خرابی نہ کرو اور معاشرے کو تباہی کی طرف نہ لے جاؤ

کی لوٹ کھسوٹ اور ظالمانہ منافع خوری اور دوسروں کے حقوق ضائع کرنے سے پرہیز کرو۔
یہ احکام صرف شعیب علیہ السلام کے دور کے متمول اور ظالم معاشرے کے لیے ہی کارآمد نہیں بلکہ ہر دور اور ہر زمانے کے
لیے کارساز ہیں اور معاشرتی مشکلات کا حل ہیں۔

جناب شعیب علیہ السلام اپنے آخری فرمان میں ایک بار پھر انھیں تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں:
س خدا سے ڈرو جس نے تمھیں بھی اور گزشتہ اقوام کو بھی پیدا کیا ہے۔ (و اتقوا الذی خلقکم و الجبلة الاولین)۔
صرف تم ہی ایسی قوم نہیں ہو جس نے روئے زمین پر قدم رکھا ہے تم سے پہلے تمھارے آباؤ اجداد اور دوسری قومیں آئیں اور
چلی گئیں ان کے ماضی کو اور اپنے مستقبل کو فراموش مت کرو۔

" جبلة " " جبل " سے ہے جس کا معنی ہے " پہاڑ "۔ اور اس کا اطلاق اس کثیر التعداد جماعت پر ہوتا ہے، جس کی
عظمت پہاڑ ایسی ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس جماعت کی تعداد دس ہزار تک ذکر کی ہے۔
انسان کی طبیعت اور فطرت کو بھی " جبلت " کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پہاڑ کی مانند اٹل ہوتی ہے جسے ایک جگہ سے دوسری
جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

شاید یہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ میں جو یہ کہتا ہوں کہ ظلم و فساد کو چھوڑ دو، حقوق العباد ادا کرو اور عدالت کو پیش نظر
رکھو تو یہ سب کچھ روزِ اوّل ہی سے انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔ میں تو صرف اس پاکیزہ فطرت کو دوبارہ زندہ کرنے کے
لیے آیا ہوں۔

لیکن افسوس کہ اس ہمدرد اور بیدار کرنے والے پیغمبر کی نصیحتیں ان پر کارگر نہیں ہوئیں۔ اس منطقی گفتگو کا جو انھوں نے تلخ
اور نازیبا جواب دیا وہ ہم اگلی آیات میں پڑھیں گے۔

۱۸۵۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝
۱۸۶۔ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
۱۸۷۔ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝
۱۸۸۔ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝
۱۸۹۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝
۱۹۰۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
۱۹۱۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ

۱۸۵۔ انھوں نے کہا تو تو بس پاگل ہے۔
۱۸۶۔ (اس کے علاوہ) تو فقط ہم جیسا انسان ہے تیرے بارے میں ہمارا گمان صرف یہی ہے کہ تو جھوٹا ہے۔
۱۸۷۔ اگر تو سچا ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر برسا دے۔
۱۸۸۔ (شعیب نے) کہا: میرا پروردگار ان اعمال سے زیادہ آگاہ ہے جو تم انجام دیتے ہو۔
۱۸۹۔ آخر کار انھوں نے اسے جھٹلایا اور "سایہ دار بادل" کے دن عذاب نے انھیں آلیا اور وہ عظیم دن کا عذاب تھا۔
۱۹۰۔ اس واقعے میں آیت اور نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے۔
۱۹۱۔ اور تیرا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

اس سرکش قوم کا انجام

اس ظالم اور ستم گر قوم نے جب خود کو شعیب علیہ السلام کی منطقی باتوں کے مقابلے میں بے دلیل دیکھا تو اپنی برائیوں کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ان پر تہمتوں کی بوچھاڑ کر دی۔

سب سے پہلے وہی پرانا لیبل جو مجرم اور ظالم لوگ ہمیشہ سے خدا کے انبیاء پر لگاتے رہے ہیں آپ پر بھی لگایا اور کہا:۔

"تو تو بس پاگل ہے" (قالوا انما انت من المسحرین)۔[1]

تیری گفتگو میں کوئی منطقی اور مدلل بات دکھائی نہیں دیتی۔ تیرا خیال ہے کہ ایسی باتیں کر کے تو ہمیں اپنے مال میں آزادی عمل سے روک دے۔

اس کے علاوہ "تو بھی تو صرف ہماری طرح کا ایک انسان ہے" کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم تیری اطاعت کریں گے۔ آخر تجھے ہم پر کون سی فضیلت اور برتری حاصل ہے (وما انت الا بشر مثلنا)۔

تیرے بارے میں ہمارا یہی خیال ہے کہ تو ایک جھوٹا شخص ہے (وان نظنک لمن الکاذبین)۔

ان کی یہ گفتگو کیسی تضادات پر مبنی ہے کبھی تو انھیں ایسا جھوٹا اور مفاد پرست انسان کہتے تھے جو دعوائے نبوت کی وجہ سے ان پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے اور کبھی انھیں مجنون کہتے تھے۔ ان کی آخری بات یہ تھی کہ بہت اچھا "اگر تو سچا ہے تو ہمارے سر پر آسمان سے پتھر برسا اور ہمیں ایسی مصیبت میں مبتلا کر دے جس کی ہمیں دھمکی دے رہا ہے تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ ہم ایسی دھمکیوں سے نہیں ڈرتے (فاسقط علینا کسفا من السماء ان کنت من الصادقین)۔

"کسف" (بروزن پدر) "کسفہ" (بروزن "قطعہ") کی جمع ہے جس کا معنی ٹکڑا ہے اور آسمانی ٹکڑوں سے مراد پتھروں کے ٹکڑے ہیں جو آسمان سے برستے ہیں۔

یہ الفاظ کہہ کر انھوں نے اپنی ڈھٹائی اور بے حیائی کی انتہا کر دی اور اپنے کفر و تکذیب کا بدترین مظاہرہ کیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے ان ناموزوں الفاظ، قبیح اور نازیبا کلمات اور عذاب الٰہی کے تقاضے کے جواب میں صرف ایک ہی جملہ کہا اور یہ کہا کہ میرا پروردگار ان اعمال سے زیادہ آگاہ ہے جو تم انجام دیتے ہو۔ (قال ربی اعلم بما تعملون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ . سے متعلق نہیں ہے آسمان سے پتھروں کا برسنا ہو یا کوئی دوسرا عذاب، میرے بس کی بات نہیں اور نہ ہی یہ اختیار مجھے دیا گیا۔ ہے۔ خداوند تعالیٰ ہی تمھارے اعمال کو جانتا اور

---

[1] جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں "مسحر" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس پر کئی مرتبہ سحر کیا جائے اور جادو گر اس کی عقل کو بے کار کر دیں۔

تمھارے استحقاق کے معیار سے باخبر ہے جب اس نے تمھیں سزا کا مستحق دیکھا اور وعظ و نصیحت نے بھی تم پر کوئی اثر نہ کیا اور کافی حد تک اتمام حجت بھی ہوگئی تو تم پر عذاب نازل کرکے تمھارا ستیاناس کردے گا۔

یہ جملہ اور انبیاء کی داستانوں میں اس جیسی دوسری تعبیریں، واضح کرتی ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السّلام ہر چیز کو خدا کے حکم اور امر کے تابع سمجھتے ہیں اور انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اپنی طرف سے کچھ کرسکتے ہیں۔

لیکن جوں توں کرکے آخر وہ وقت بھی آپہنچا کہ روئے زمین کو ایسے مجرمین کے وجود سے پاک کیا جائے چنانچہ قرآن مجید بعد والی آیت میں کہتا ہے: انھوں نے شعیب کو جھٹلایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "سایہ ڈالنے والے بادل" کے دن عذاب نے ان کو آلیا

(فکذبوہ فاخذھم عذاب یوم الظلۃ)۔

اور "یہ عذاب، بڑے دن کا عذاب تھا" (انہ کان عذاب یوم عظیم)۔

" ظلہ " بادل کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو سایہ کردیتا ہے بہت سے مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ مسلسل سات دن تک ان پر گرم ہوا چلتی رہی اس دوران میں بادِ نسیم کا ایک بھی جھونکا نہیں آیا۔ اسی اثنا میں آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نمایاں ہوا اور بادِ نسیم بھی چلنے لگی وہ لوگ فوراً اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور سخت تکلیف کی وجہ سے جب بادل کے سایے تلے آگئے تو سکھ کا سانس لیا۔

لیکن اچانک بادلوں سے بجلی کی ایک ایسی کڑک سنائی دی جس سے ان کے کان پھٹ گئے اس کے فوراً بعد ان پر آگ برسنے لگی اور زمین میں بھونچال آگیا جس سے وہ سب ہلاک اور برباد ہوگئے۔

ہم جانتے ہیں کہ بادلوں اور زمین کے درمیان طاقت ور الیکٹریسٹی کے باہمی تبادلے کے نتیجے میں "صاعقہ" پیدا ہوتی ہے اس کی آواز بہت دہشت ناک ہوتی ہے اور اس کا شعلہ بھی بہت بڑا ہوتا ہے جہاں یہ بجلی گرے وہاں بعض اوقات زلزلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے قوم شعیب کے عذاب کے بارے میں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں جو مختلف الفاظ آئے ہیں وہ دراصل ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۹۱ میں " رجفۃ " (زلزلہ) سورۂ ہود کی آیت ۹۴ میں " صیحۃ " (زبردست آواز) اور زیرِ گفتگو آیت میں " عذاب یوم الظلۃ " کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

ہرچند کہ قرطبی اور فخر رازی جیسے مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اصحاب ایکہ اور اصحاب مدین دو مختلف قومیں تھیں اور دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ عذاب نازل ہوا، لیکن متعلقہ آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احتمال زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

اس داستان کے آخر میں بھی انھی الفاظ کو دہرایا گیا ہے جو چھ بزرگ انبیاء کی گزشتہ داستانوں میں آئے ہیں۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: سرزمینِ ایکہ کے لوگوں کی داستان، ان کے مہربان نبی شعیب کی محبت بھری تبلیغ، ان لوگوں کی طرف سے ڈھٹائی، سرکشی اور تکذیب اور انجام کار اس ظالم قوم کی گرجدار بجلی سے تباہی اور بربادی میں عبرت کی نشانی اور درس موجود ہے (ان فی ذٰلک لاٰیۃ)۔

لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (و ما کان اکثرھم مؤمنین)۔

اس کے باوجود خداوند رحیم و مہربان نے انھیں کافی مہلت دی تاکہ وہ سمجھ جائیں اور اپنی اصلاح کرلیں لیکن جب وہ عذاب کے مستحق ہوگئے تو اس نے بھی اپنی قہاری قدرت کی شان دکھلائی اور ان پر اپنی گرفت مضبوط کرلی، یقیناً تیرا پروردگار ناقابلِ تسخیر اور رحیم ہے (و ان ربک لھو العزیز الرحیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ **انبیاء کی دعوت میں مکمل ہم آہنگی:** ان سات عظیم انبیاء کے واقعات کہ جو درحقیقت تربیتی دروس کے سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں کے آخر میں اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ انھی انبیاء کی داستانیں قرآن مجید کی اور سورتوں میں بھی بیان ہوئی ہیں لیکن اس انداز سے بیان نہیں ہوئیں جیسا کہ اس سورت میں کہ جن کا آغاز بھی ایک جیسا اور انجام بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔

ان داستانوں کے پانچ حصّوں میں ان کی دعوت کا موضوع تقویٰ ہے پھر ان کی امانت کا بیان ہے اور کسی قسم کی اجرت طلب نہ کرنے کا ذکر ہے۔

پھر اس دور میں پائی جانے والی لغزشوں اور غلطیوں پر دوستانہ طریقے سے تنقید کی گئی ہے۔

پھر ان گمراہ لوگوں کے بُرے ردِعمل اور نہایت ہی بھونڈے طریقے کا ذکر ہے آخر کار موقع کی مناسبت سے نازل ہونے والے دردناک عذاب کا بیان ہے۔

ان ساتوں داستانوں میں سے ہر ایک کے آخر میں اسے آیت اور عبرت کی نشانی بتایا گیا ہے اور ان گمراہ قوموں کی اکثریت کے ایمان نہ لانے کا تذکرہ ہے۔

اور پھر ان سب کے آخر میں خدا کی " قدرت " اور " رحمت " کا ذکر ہے۔

یہ ہم آہنگی سب سے پہلے اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی دعوت میں " توحید " کی جھلک پائی جاتی ہے کہ ان سب کا " واحد " پروگرام تھا اور جس کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہے۔ سب انبیاء انسان سازی کی کلاسوں کے معلّم تھے ہرچند کہ مرورِ زمان کے ساتھ اور انسانی معاشرے کی پیش رفت کی بناء پر ان کلاسوں کے مضامین تبدیل ہوتے رہے لیکن ان سب کے اصول، بنیادیں اور نتائج ایک جیسے تھے اور پھر یہ بھی کہ یہ داستانیں اسلام اور اوائل کے چند گنے چنے مومنین کے دلوں کے لیے ڈھارس اور تسلی کا کام بھی دیتی ہیں بلکہ ہر دور کے مومنین کے لیے موجب تسلی ہیں کہ وہ مخالفین کی کثرت اور گمراہ قوم کی اکثریت سے ہرگز نہ گھبرائیں اور اپنے کام کے نتائج کی سو فیصد امید رکھیں۔

نیز ہر دور اور ہر عصر کے ظالم اور ستمگر اور گمراہ لوگوں کے لیے ایک زبردست تنبیہ بھی ہیں کہ وہ سزائے الٰہی کو کسی بھی لمحے اپنے سے دور تصور نہ کریں کیونکہ ان پر زلزلوں، بجلیوں، ہولناک طوفانوں، آتش فشاں پہاڑوں، زمین کے پھٹنے کی صورتوں اور سیلاب اور بارشوں جیسے عذاب بھی نازل ہوسکتے ہیں اور آج کا انسان بھی ایسے عذاب کے سامنے اسی طرح بے بس ہے جس طرح گذشتہ زمانے کے لوگ۔ کیونکہ موجودہ دور کا انسان اپنی تمام صنعتی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود اس طرح کے عذابوں کے سامنے عاجز اور بے بس

قرآن مجید کا ان تمام داستانوں کے بیان کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ انسان رشد اور ارتقاء کے مراحل طے کرے

اپنے قلب وروح میں نوراور روشنی پیدا کرے، اپنی سرکش خواہشات کو کنٹرول کرے اور ظلم وستم اور ہر قسم کی لغزشوں کا مقابلہ کرے۔

۲۔ **سب کی دعوت کا آغاز تقویٰ ہے :۔** یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان انبیاء علیہم السلام کی انھی داستانوں کے اہم حصے سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں بھی آچکے ہیں لیکن ان کا آغاز عموماً خدا کی توحید اور یگانگت سے ہوا ہے مثلاً اس جملے سے "یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ" یعنی اے میری قوم خدا کی عبادت کرو کیونکہ اس کے علاوہ تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔

لیکن جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اس سورہ میں "الا تتقون" کہہ کر دعوتِ تقویٰ سے آغاز کرتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر دو کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے کیونکہ جب تک کسی انسان میں تقویٰ کی کم از کم حدود یعنی حق طلبی اور حق جوئی نہ پائی جائیں، اس وقت تک اس پر نہ توحید کی دعوت مؤثر ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز۔ لہٰذا سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم پڑھتے ہیں۔

ذٰلك الكتب لا ريب فيه هدى للمتقين

یہ وہ آسمانی کتاب ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔

البتہ تقویٰ کے کئی مراتب ہوتے ہیں اور ہر مرتبہ، دوسرے مرتبے کے لیے ایک بنیاد ہوتا ہے۔

سورۂ شعراء اور سورۂ اعراف وسورۂ ہود کے مضامین میں ایک اور فرق یہ بھی نظر آتا ہے کہ اعراف اور ہود میں انبیاء کا بت پرستی کے خلاف جہاد کا تذکرہ ہے اور دوسرے مسائل اس کے تحت ہیں، لیکن یہاں فخر وغرور، تکبر ونخوت، اسراف وہوس، جنسی راہزنی لوٹ کھسوٹ، کم فروشی اور دھوکے بازی جیسے اخلاقی اور سماجی جرائم کے خلاف زور دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے قرآن مجید میں ایسی داستانوں کے بار بار دہرانے کا بھی کوئی خاص مقصد ہوتا ہے اور ہر دفعہ کسی خاص مقصد کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ **شرک سب برائیوں کی بنیاد ہے :۔** یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جن اقوام کا اس سورت کے مختلف مقامات پر ذکر ہوا وہ اصل توحید سے منحرف ہو کر شرک اور بت پرستی جیسی لعنت میں گرفتار ہو گئی تھیں اور یہ چیز ان سب کے درمیان ایک قدر مشترک تھی اس کے علاوہ وہ خاص اخلاقی اور سماجی برائیوں میں بھی مبتلا ہو گئی تھیں۔ اور یہی چیز انھیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے :

کچھ قومیں غرور میں مبتلا تھیں (جیسے قوم ہود)۔

کچھ قومیں فضول خرچ اور عیاش تھیں (جیسے صالح کی قوم)۔

کچھ قومیں جنسی بے راہروی کا شکار تھیں (جیسے جناب لوط کی قوم)۔

کچھ بہت مال پرست تھیں جس کے لیے وہ اپنے کاروبار میں دھوکا دہی کا مظاہرہ کرتی تھیں (جیسے شعیبؑ کی قوم)۔

کچھ قوموں کو اپنی ثروت مندی کا گھمنڈ تھا (جیسے نوح علیہ السلام کی قوم)۔

لیکن انھیں جو عذاب دیا گیا وہ تقریباً ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا، چنانچہ :۔

کچھ تو بجلی کی کڑک اور زلزلے سے نابود ہو گئیں (جیسے شعیب، صالح، لوطا ور ہود علیہم السلام کی قومیں)۔

کچھ طوفان اور سیلاب کے ذریعے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں (جیسے نوح علیہ السلام کی قوم)۔

درحقیقت جو زمین ان کے عیش وآرام کا گہوارہ تھی وہ ایک دن ان کے لیے وبالِ جان بن گئی اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور جو ہوا اور پانی ان کی زندگی کے ضامن تھے ان کی موت پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار کیے گئے۔

کس قدر عجیب کیفیت ہے انسان کی کہ اس کی زندگی، موت کے منہ میں ہے اور موت زندگی کے سایے میں، اس کے باوجود بھی غافل اور مغرور ہے۔

۱۹۲۔ وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۱۹۳۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝

۱۹۴۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝

۱۹۵۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝

۱۹۶۔ وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۱۹۷۔ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝

ترجمہ

۱۹۲۔ اور یہ (قرآن) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

۱۹۳۔ روح الامین اسے لے کر نازل ہوا ہے۔

۱۹۴۔ تیرے (پاک) دل پر، تاکہ تو (لوگوں کو) ڈرائے۔

۱۹۵۔ اسے واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے۔

۱۹۶۔ اس کی تعریف تو گزشتہ لوگوں کی کتابوں میں بھی آچکی ہے۔

۱۹۷۔ کیا یہی نشانی ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔

تفسیر

گزشتہ کتابوں میں قرآن کی عظمت

گزشتہ انبیاء کی سات داستانوں کے بیان کرنے اور ان کی تاریخ میں پوشیدہ درس ہائے عبرت کا ذکر کرنے کے بعد قرآن مجید ایک بار پھر اسی گفتگو کی طرف لوٹ جاتا ہے جس سے اس سورت کا آغاز ہوا تھا یعنی قرآن مجید کی عظمت اور خدا کے کلام مبین کی حقانیت کی طرف، چنانچہ فرماتا ہے: یہ عالمین کے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا ہے (وانه لتنزیل رب العالمین)۔

اصولی طور پر گزشتہ انبیاء کی سرگزشت اور وہ بھی نہایت صحیح اور دقیق انداز میں کہ جس میں نہ تو کوئی خرافات ہے اور نہ ہی جھوٹے افسانے ہیں جبکہ وہ ماحول افسانوں اور قصّے کہانیوں کا تھا اور پھر ان صحیح واقعات اور داستانوں کو وہ شخص بیان فرما رہا ہے جس نے مطلقاً کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور یہ اعجازِ قرآن کی ایک علامت ہے۔

اسی وجہ سے آگے چل کر ارشاد فرمایا گیا ہے: اسے روح الامین خدا کی طرف سے لایا ہے (نزل به الروح الامین)۔

اگر وحی کا وہ فرشتہ اور "پروردگار کا روح امین" اسے خداوند عالم کی طرف سے نہ لاتا تو یہ کلام اس قدر روشن، تابناک اور ہر قسم کے خرافات اور باطل قصّے کہانیوں سے قطعاً پاک نہ ہوتا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہاں پر وحی کے فرشتے کی دو عنوانوں سے توصیف کی گئی ہے۔ ایک عنوان ہے "روح" اور دوسرے "امین"۔ روح جو حیات کا سرچشمہ ہوتی ہے اور "امانت" جو ہدایت اور رہبری کی شرط اولین شمار ہوتی ہے۔

جی ہاں اسی "روح الامین" نے قرآن مجید خداوند عالم کی طرف سے تیرے دل پر اتارا ہے تاکہ تو لوگوں کو ڈرائے (علی قلبك لتكون من المنذرین)[1]

مقصد یہ ہے کہ تو لوگوں کو ڈرائے اور انھیں اس خطرناک انجام سے مطلع کرے جو توحید سے منحرف ہو جانے کی وجہ سے ان کے دامن گیر ہوگا۔ گزشتہ لوگوں کی تاریخ بیان کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ موجودہ لوگوں کا دل بہلایا جائے اور انھیں قصّے کہانیوں میں ہی مشغول رکھا جائے بلکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ ان کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کیا جائے اور انھیں بیدار کیا جائے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ ان کی صحیح تربیت کی جائے اور انھیں انسان بنایا جائے۔

تاکہ کسی شخص کے لیے کسی قسم کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اسے واضح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے (بلسان عربی مبین)۔

قرآن مجید فصیح عربی میں نازل ہوا ہے اور ہر قسم کے ابہام سے بھی خالی ہے تاکہ ڈرانے اور بیدار کرنے کے لیے بہت واضح اور گویا ہو کیونکہ اس دور کے لوگ نہایت ہی بہانہ ساز اور ہٹ دھرم تھے۔

وہی عربی زبان جو دنیا کی کامل ترین زبان ہے اور دنیا کے مفید ترین اور غنی ترین ادبیات پر مشتمل ہے۔

اس نکتے کی جانب بھی توجہ ضروری ہے کہ لفظ "عربی" کا ایک معنی خود فصاحت اور بلاغت بھی ہے البتہ کیفیتِ زبان سے قطع نظر کرتے ہوئے ..... جیسا کہ راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں:۔

والعربی، الفصیح البین من الکلام۔

عربی فصیح اور آشکارا گفتگو کو کہتے ہیں۔

---

[1] ظاہر ہے کہ یہاں پر "قلب" سے مراد پیغمبر اکرم کی پاک و پاکیزہ روح ہی ہے نہ کہ گوشت کا وہ لوتھڑا جو گردشِ خون کا سبب ہوتا ہے یہاں پر یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے اپنی روح کے ساتھ قرآنِ مجید کو قبول فرمایا ہے اور اس عظیم آسمانی معجزے کا مرکز آپ کا قلب ہی ہے۔

ابنِ منظور نے بھی " لسان العرب" میں یہی معنیٰ لکھا ہے :۔

تو اس صورت میں یہ مقصد نہیں ہوگا کہ عربی زبان پر انحصار کیا گیا ہے بلکہ مدعا یہ ہوگا کہ قرآن مجید کی صراحت اور مفہوم کی وضاحت کو پیش نظر رکھا گیا ہے آئندہ آیات بھی اسی معنیٰ کی تائید کرتی ہیں اور سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۴۴ میں بھی آیا ہے ۔

ولوجعلناہ قراٰنًا اعجمیا لقالوا لولا فصلت اٰیاتہ

اگر ہم اس قرآن کو گونگا اور مبہم نازل کرتے تو وہ لوگ کہتے کہ اس قرآن کی آیات روشن اور واضح کیوں نہیں بیان کی گئیں ؟

یہاں پر اعجمی کا معنی غیر فصیح کلام ہے ۔

اس کے بعد قرآن مجید کی حقانیت کے دلائل میں سے ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اس کتاب کی توصیف گزشتہ لوگوں کی کتابوں میں بھی بیان کی جا چکی ہے اور انھوں نے آئندہ زمانے میں اس کے ظہور کی خوشخبری دی ہے (و انہ لفی زبر الاولین)[1]

خصوصاً جناب موسیٰ علیہ السلام کی تورات میں اس پیغمبر اور اس آسمانی کتاب کے اوصاف کی طرف اشارہ موجود تھا اور علماء بنی اسرائیل ان اوصاف سے بخوبی واقف تھے یہاں تک کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ " اوس" اور " خزرج " کے دو قبیلوں کا پیغمبر اسلام پر ایمان لانے کا سبب بھی وہ پیش گوئیاں تھیں جو بنی اسرائیل کے علماء اس پیغمبر کے ظہور اور اس آسمانی کتاب کے نزول کے بارے میں کیا کرتے تھے ۔

اس لیے قرآن مجید فرماتا ہے : آیا یہی نشانی ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس سے بخوبی آگاہ ہیں ۔ (او لم یکن لھم اٰیۃ ان یعلمہ علماء بنی اسرآئیل) ۔

ظاہر سی بات ہے کہ جس ماحول میں بنی اسرائیل کے اس قدر علماء موجود تھے اور مشرکین کے ساتھ مکمل طور پر ان کی نشست و برخاست تھی، یہ بات قطعاً ناممکن تھی کہ قرآن مجید اپنے بارے میں بغیر کسی ثبوت کے اتنی بڑی بات کہہ دے کیونکہ اس کی تردید میں ہر طرف سے شور و غوغا بلند ہو جاتا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ نزول آیات کے موقع پر یہ مسئلہ اس قدر واضح اور اظہر من الشمس تھا کہ کوئی بھی اس کا انکار نہ کر سکا ۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۸۹ میں بھی ہے :۔

و کانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ

وہ (یہودی) لوگ اس سے پہلے مشرکین کے ظلم و ستم کے سامنے (پیغمبر اسلام کے ظہور کے ذریعہ) فتح و کامرانی کی آرزو کیا کرتے تھے لیکن جب وہی کتاب اور پیغمبر جنھیں وہ پہلے سے پہچانتے تھے ان کے پاس آ گئے تو وہ اس کے منکر ہو گئے ۔

یہ سب کچھ قرآن کی صدقِ گفتار اور اس کی حقانیتِ دعوت کا روشن گواہ ہے

[1] " زبر" " زبور" کی جمع ہے جو کتاب کے معنی میں ہے اور دراصل یہ " زبر" (بروزن " ابر") کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے " لکھنا " ۔

۱۹۸۔ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝

۱۹۹۔ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝

۲۰۰۔ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

۲۰۱۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝

۲۰۲۔ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

۲۰۳۔ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۹۸۔ اگر ہم اسے کسی عجمی (غیر عرب) پر نازل کرتے ۔

۱۹۹۔ اور وہ اس کو ان کے سامنے پڑھتا تو وہ اس پر ایمان نہ لاتے ۔

۲۰۰۔ (جی ہاں) ہم قرآن کو اسی طرح مجرموں کے دلوں میں سے گزارتے ہیں ۔

۲۰۱۔ وہ لوگ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ۔

۲۰۲۔ (عذاب الٰہی) اچانک ان کو آ لے گا کہ انھیں اس کا خیال بھی نہیں ہوگا ۔

۲۰۳۔ تو وہ اس وقت کہیں گے آیا ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے ؟

تفسیر

اگر قرآن کسی عجمی پر نازل ہوتا تو .... ؟

ان آیات میں سب سے پہلے کفار کے ایک اور احتمالی بہانے کی پیش بندی کی گئی ہے اور گزشتہ آیات میں قرآن مجید کے واضح عربی زبان میں ہونے کے بارے میں جو گفتگو تھی اس کی تکمیل کی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے : اگر ہم اس قرآن کو کسی عجمی (غیر عرب اور غیر فصیح) پر نازل کرتے ...... (و لو نزلناہ علی بعض الاعجمین)۔

اور وہ ان آیات کو ان لوگوں کے سامنے پڑھتا تو وہ ہرگز ایمان نہ لاتے (فقرأہ علیھم ما کانوا بہ مؤمنین)۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں "عربی" کا لفظ کبھی تو ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو اہل عرب کی نسل سے ہوں اور کبھی فصیح کلام کے معنی میں آتا ہے اسی طرح اس کا مقابل لفظ "عجمی" ہے اس کے بھی دو معنی ہیں ایک غیر عرب نسل اور دوسرے غیر فصیح کلام اور مندرجہ بالا آیت میں دونوں معانی کا احتمال ہے لیکن جو بات زیادہ قرین عقل معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پر "غیر عرب نسل" کی طرف اشارہ ہے۔

یعنی عربوں کی نسل پرستی اور قومی تعصب اس قدر شدید ہے کہ اگر قرآن مجید کسی غیر عرب شخص پر نازل ہوتا تو ان کے تعصب کی موجیں انھیں اس کے قبول کرنے سے مانع ہوتیں حالانکہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ایک حقیقی عرب خاندان کے شریف انسان پر فصیح و بلیغ بیان کے ساتھ نازل ہوا ہے اور کتب آسمانی میں بھی اس کے بارے میں بشارت آچکی ہے اور بنی اسرائیل کے علماء بھی اس کی گواہی دے چکے ہیں پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے اگر رسول میں یہ اوصاف بالکل نہ ہوتے تو وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟

پھر تاکید مزید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ہم قرآن مجید کو اسی طرح مجرموں کے دلوں میں سے گزارتے ہیں (کذلک سلکناہ فی قلوب المجرمین)۔

واضح بیان اور ایسے شخص کی زبان کے ذریعے جو انھی میں سے ہے اور وہ لوگ اس کے اخلاق اور طرز کلام سے بھی آشنا ہیں اور وہ ایسے مطالب پیش کرتا ہے کہ جن کی تائید سابقہ کتابوں میں بھی آچکی ہے۔ المختصر اس قرآن کو ان تمام اوصاف کے ساتھ جس کی قبولیت ہر ایک کے لیے آسان ہو اس گناہ گار قوم کی طرف بھیجا ہے لیکن یہ بیمار دل اسے قبول نہیں کرتے جس طرح صحیح و سالم اور مقوی غذا کو غیر سالم اور بیمار معدہ قبول نہیں کرتا اور اسے واپس پلٹا دیتا ہے۔

(توجہ رہے کہ "سلکناہ" "سلوک" کے مادہ سے ہے جس کا معنی "راستے سے گزرنا" ہے اور ایک راہ سے آنا اور دوسری راہ سے گزر جانا)۔

اسی لیے فرمایا گیا ہے: ایسی صورت میں یہ ہٹ دھرم لوگ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں (لا یؤمنون بہ حتّٰی یروا العذاب الالیم)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ "کذلک سلکناہ فی قلوب المجرمین" سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اس عصبیت، ہٹ دھرمی اور قبول نہ کرنے کی عادت کو ان کے اپنے جرائم اور گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں میں اتار دیا۔

اس معنی کی رُو سے یہ آیت بعینہٖ "ختم اللہ علی قلوبھم" "یعنی خدا نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی" کے مانند ہو جائے گی۔

لیکن پہلی تفسیر اوّل و آخر کی آیات سے زیادہ ہم آہنگ ہے لہٰذا بہت سے مفسرین نے اسے ہی اختیار کیا ہے[1]

---

[1] مندرجہ بالا چند آیات میں معنوی کی پانچ ضمیریں ان الفاظ میں ملتی ہیں "نزلناہ" "قرأہ" "و ما کانوا بہ" (باقی اگلے صفحہ پر)

ہاں ہاں! وہ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک عذاب الٰہی ناگہانی طور پر ان کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے اور انھیں اس کا خیال بھی نہ ہو (فیأتیھم بغتۃ و ھم لا یشعرون)[1]

اس میں شک نہیں کہ اس عذاب الٰہی سے مراد جو انھیں اچانک اپنی لپیٹ میں لے لے گا یہی دنیاوی عذاب نیست و نابود کر دینے والی بلائیں ہیں جسے "استیصالی عذاب" کہتے ہیں۔

اسی لیے اس آیت کے بعد فرمایا گیا ہے: ایسی صورت میں وہ اپنی صحیح حالت کی طرف لوٹ آئیں گے، اپنے شرمناک ماضی پر پچھتائیں گے، اپنے خطرناک مستقبل سے سخت خوف کھائیں گے اور کہیں گے کیا ہمیں کچھ مہلت مل جائے گی، "تاکہ ہم ایمان لے آئیں اور اپنے برباد ماضی کو آباد کریں (فیقولوا ھل نحن منظرون)۔

چند ایک نکات

۱۔ قومی اور قبائلی تعصبات:

اس میں شک نہیں کہ انسان جس سرزمین، قوم یا قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اسی سے اس کو عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے اور اس کا یہ جغرافیائی، قومی اور قبائلی تعلق نہ صرف معیوب ہی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کے لیے ایک مؤثر عامل بھی ہے لیکن اس تعلق کے لیے کوئی حد اور حساب ہے کہ اگر یہ اس سے بڑھ جائے تو یہ نقصان دِہ ہے بلکہ ہولناک مصیبت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ لہٰذا جس قومی اور قبائلی تعصب کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی حد سے بڑھ جانے والا تعلق ہوتا ہے۔

"تعصب" اور "عصبیت" دراصل "عصب" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے وہ چربی جو اعضاء کے جوڑوں کو آپس میں مربوط رکھتی ہے۔ اسی مناسبت سے ہر قسم کے ارتباط اور باہمی وابستگی کو "تعصب" اور "عصبیت" کہنے لگے، لیکن عام طور پر یہ لفظ افراط اور مذموم مفہوم میں بولا جاتا ہے۔

تاریخی طور پر قوم، قبیلے، نسل اور وطن کا حد سے زیادہ دفاع بہت سی جنگوں کا سبب بنا ہے اور قبائلی اور نسلی آداب و رسوم کے نام پر بہت سی برائیاں ایک سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

یہی دفاع اور حد سے بڑھ جانے والی طرفداری بسا اوقات اس حد تک جا پہنچتی ہے کہ انسان کی نگاہ میں اپنی قوم اور قبیلے کا بدترین انسان، بہترین انسان بن جاتا ہے اور دوسری قوم اور قبیلے کا بہترین شخص بھی بدترین شخص سمجھا جاتا ہے اور یہی آداب و رسوم کا

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) "سلکناہ" اور "لا یؤمنون بہ" پہلی تفسیر کے مطابق یہ سب کی سب قرآن کی طرف لوٹ رہی ہیں لیکن دوسری تفسیر کے مطابق بعض ضمیریں قرآن کی طرف اور بعض ہٹ دھرمی اور عدم قبولیت کی جانب پلٹ رہی ہیں لیکن جب تک قرینہ موجود نہ ہو ایسا کرنا مشکل ہے۔

حاشیہ صفحہ ھذا: [1] توجہ رہے کہ "فیأتیھم" کا جملہ منصوب ہے اور "حتّٰی یروا" پر اس کا عطف پڑ رہا ہے لہٰذا اسی تناظر میں اس کا معنی بیان کرنا چاہیے۔

بھی حال ہے گویا نسلی تعصب خود پرستی اور جہالت کا ایک پردہ ہوتا ہے جو انسان کی عقل وادراک پر پڑ جاتا ہے جس سے وہ صحیح فیصلہ کرنے کی قوت کھو بیٹھتا ہے۔

بعض قوموں میں یہ تعصب زبردست حد تک پایا جاتا ہے جن میں سے وہ عرب بھی ہیں جو اپنے تعصب میں عالمی شہرت کے حامل ہیں اور ان کے بارے میں ہم ابھی آیات بالا میں بھی پڑھ چکے ہیں ان میں جاہلیت عرب کا تعصب اس حد تک پایا جاتا تھا کہ اگر قرآن مجید کسی غیر عرب پر نازل ہوتا تو وہ ہرگز اس پر ایمان نہ لاتے۔

روایات میں بھی تعصب کو اخلاق مذمومہ کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے اور اس کی زبردست مذمت کی گئی ہے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

من کان فی قلبہ حبۃ من خردل من عصبیۃ بعثہ اللہ یوم القیامۃ مع اعراب الجاھلیۃ

جس شخص کے دل میں رائی برابر بھی تعصب ہوگا خداوند عالم اسے قیامت کے دن زمانۂ جاہلیت کے اعراب کے ساتھ محشور فرمائے گا [1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

من تعصب او تعصب لہ فقد خلع ربقۃ الایمان من عنقہ

جس شخص نے تعصب برتا یا جس کے لیے تعصب برتا گیا اس نے ایمان کے حلقے کو اپنی گردن سے اتار پھینکا [2]

روایات ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ "ابلیس پہلا وہ شخص ہے جس نے تعصب کا مظاہرہ کیا۔

جیسا کہ نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے تعصب کے سلسلے میں ایک نہایت ہی جامع ومانع اور مدلل گفتگو فرمائی ہے جو کہ "خطبہ قاصعہ" میں موجود ہے ہم اس کا ایک حصہ ذیل میں درج کرتے ہیں، امام فرماتے ہیں:۔

اما ابلیس فتعصب علی اٰدم لاصلہ وطعن علیہ فی خلقتہ، فقال انا ناری وانت طینی

ابلیس نے اپنی تخلیق کے بل بوتے پر آدمؑ کے ساتھ تعصب برتا اور آدم کی تخلیق پر طعن وتشنیع کرتے ہوئے کہا کہ میں آگ سے ہوں اور تو مٹی سے۔

پھر آگے چل کر امامؑ فرماتے ہیں:۔

فان کان لابد من العصبیۃ فلیکن تعصبکم لمکارم الخصال ومحامد الافعال ومحاسن الامور

[1]، [2] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۲۲ (باب العصبیہ)۔

اگر تعصب کے بغیر چارہ نہیں ہے تو پھر تمھارا یہ تعصب پسندیدہ اخلاق، نیک افعال اور اچھے کاموں کے لیے ہونا چاہیے [1]

ضمنی طور پر اس حدیث سے بھی بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک پسندیدہ اور مستحسن واقعیت پر ڈٹ جانا نہ صرف قابلِ مذمت نہیں بلکہ انسان کے جاہلیت کے غلط رسم ورواج اور ربط وضبط کی وجہ سے پیدا ہونے والے روحانی خلا کو بھی پُر کر سکتا ہے۔

اسی لیے تو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے جب "تعصب" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

العصبیۃ التی یأثم علیھا صاحبھا ان یری الرجل شرار قومہ خیرًا من خیار قوم اٰخرین، ولیس من العصبیۃ ان یحب الرجل قومہ، ولکن من العصبیۃ ان یعین قومہ علی الظلم

جس تعصب کی وجہ سے انسان گناہ گار ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی قوم کے بُرے لوگوں کو دوسری قوموں کے اچھے افراد سے بہتر سمجھا جائے اگر کوئی شخص اپنی قوم اور قبیلے سے محبت رکھتا ہے تو یہ تعصب نہیں ہوگا بلکہ عصبیت تو اس بات میں ہے کہ انسان اپنے قبیلے اور قوم کی ظلم وستم میں امداد کرے [2]

آیات اور روایات میں عصبیت کو "حمیت" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے یا اسے "حمیۃ جاہلیہ" کا نام دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں کرنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن اپنی گفتگو کو دو حدیثوں کے بیان پر ختم کرتے ہیں:۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

ان اللہ عزوجل یعذب ستۃ بست، العرب بالعصبیۃ، والدھاقنۃ بالکبر، والامراء بالجور، والفقھاء بالحسد، والتجار بالخیانۃ، واھل الرستاق بالجھل

خداوند عالم چھ طرح کے لوگوں کو چھ طرح کی صفات کی وجہ سے معذب کرے گا عربوں کو ان کے تعصب کی بنا پر، جاگیرداروں (اور صاحبان ثروت) کو ان کے تکبر کی وجہ سے، حکمرانوں کو ان کے ظلم وجور کی وجہ سے، فقہاء کو ان کے حسد کی بنا پر، تاجروں کو خیانت کی وجہ سے اور دیہاتیوں کو ان کی جہالت کی بنا پر [3]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز چھ چیزوں سے پناہ مانگا کرتے تھے:

کان رسول اللہ (ص) یتعوذ فی کل یوم من ست من الشک والشرک والحمیۃ والغضب والبغی والحسد [4]

[1] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ نمبر ۱۹۲۔
[2] اصول کافی (باب العصبیہ) جلد ۲ ص ۲۲۳۔
[3]، [4] بحار، ج ۷۳ ص ۲۸۹

شک، شرک، حمیّت (تعصّب)، غضب، ظلم اور حسد سے [1]

۲۔ دنیا کی طرف لوٹ جانے کی درخواست: ۔ مرنے کے فوراً ہی بعد گناہ گار اور مجرم لوگوں کی آہ و حسرت کا دور شروع ہو جاتا ہے ۔ اور ان کے اندر دنیا کی طرف پلٹ جانے کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر بے فائدہ آہ و فریاد اور نا قبول دعائیں شروع ہو جاتی ہیں ۔

آیاتِ قرآنی میں اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں جن میں سے ایک سادہ ترین نمونہ انھی آیات میں موجود ہے جن کی ہم تفسیر بیان کر رہے ہیں یعنی:۔

" ھل نحن منظرون " یعنی آیا ہمیں مہلت ملے گی ؟

سورۂ انعام کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں :

یالیتنا نرد ولا نکذب بآیات ربنا

اے کاش ہم واپس لوٹ جاتے اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کرتے ۔

سورۂ احزاب کی آیت ۶۶ میں آیا ہے :

یا لیتنا اطعنا اللہ و اطعنا الرسولا

اے کاش ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی ۔

سورۂ مومنون کی آیات ۹۹ تا ۱۰۰ میں آیا ہے :

حتّٰی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت

مجرم لوگوں کی یہ کیفیت برقرار رہے گی یہاں تک کہ ان میں سے ایک کے پاس موت آجائے گی تو وہ کہے گا خداوندا! مجھے واپس پلٹا دے تاکہ میں اپنے گزشتہ تاریک اعمال کی تلافی کر کے اعمالِ صالحہ انجام دوں ۔

یہی صورتِ حال رہے گی یہاں تک کہ گناہ گار لوگ آتشِ جہنم کے کنارے لا کھڑے کیے جائیں گے تو وہاں پر بھی وہ اپنی یہی بات دہرائیں گے ۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام آیہ ۲۷ :

ولو تریٰ اذ وقفوا علی النار فقالوا یا لیتنا نرد ولا نکذب بآیات ربنا ونکون من المؤمنین

اگر آپ مجرموں کو اس وقت دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آتشِ جہنم کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے اور کہیں گے اے کاش! ہم پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیات کو نہ جھٹلاتے اور مومنین سے ہوتے ۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۳، ص ۲۸۹۔

لیکن ظاہر ہے کہ امرِ الٰہی میں ایسی بازگشت ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر نا پختہ میوہ اپنے درخت کی طرف واپس جا کر پک سکتا ہے اور ناقص پیدا ہونے والا بچہ رحمِ مادر کی طرف واپس پلٹایا جا سکتا ہے تو ایسی بازگشت بھی ممکن ہو سکتی ہے لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوا لہٰذا مجرم ٹولہ بھی واپس نہیں پلٹایا جائے گا ۔

لہٰذا اس افسوس کے تدارک کا بہترین راستہ یہی ہے کہ یہیں پر رہ کر عملِ صالح انجام دیئے جائیں اور گناہوں سے توبہ کی جائے کیونکہ ابھی فرصت باقی ہے وگرنہ باقی سب بے فائدہ ہے ۔

۳۔ عجم کی ایک فضیلت: ۔ اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک فرمان ہے جسے علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے :

لو نزل القرآن علی العجم ما اٰمنت بہ العرب، و قد نزل علی العرب فاٰمنت بہ العجم، فھذہ فضیلۃ العجم۔

اگر قرآن عجم پر نازل ہوتا تو عرب اس پر ایمان نہ لاتے لیکن عرب پر نازل ہوا ہے اور عجم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور یہ عجمیوں کی ایک فضیلت ہے [1]

اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی تیسری جلد (سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ کے ذیل) میں بھی کچھ ذکر کیا گیا ہے ۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۶۵۔

۲۰۴۔ اَفَبِعَذَابِنَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ۝

۲۰۵۔ اَفَرَءَيۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِيۡنَ ۝

۲۰۶۔ ثُمَّ جَآءَهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُوۡعَدُوۡنَ ۝

۲۰۷۔ مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُمَتَّعُوۡنَ ۝

۲۰۸۔ وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ۝

۲۰۹۔ ذِكۡرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۝

۲۱۰۔ وَمَا تَنَزَّلَتۡ بِهِ الشَّيٰطِيۡنُ ۝

۲۱۱۔ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهُمۡ وَمَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۝

۲۱۲۔ اِنَّهُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ ۝

ترجمہ

۲۰۴۔ آیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں ؟

۲۰۵۔ کیا تم نے غور کیا اگر ہم انھیں سالہا سال بھی اس زندگی سے بہرہ مند کر دیں ....

۲۰۶۔ پھر وہ عذاب ان کے پاس آ پہنچے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔

۲۰۷۔ تو دنیا سے اس قدر فائدہ اٹھانا ان کے لیے سُودمند نہیں ہو گا۔

۲۰۸۔ ہم نے کسی بھی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اسے خبردار کرنے والے موجود تھے۔

۲۰۹۔ تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور ہم ہرگز ظالم نہیں ہیں۔

۲۱۰۔ یہ آیتیں شیطانوں اور جنوں نے نازل نہیں کیں۔

۲۱۱۔ یہ چیز ان کے لائق بھی نہیں اور نہ یہ کام ان کے بس میں ہے۔

۲۱۲۔ وہ تو (ان آسمانی خبروں کے) سننے سے دور رکھے گئے ہیں۔

تفسیر

قرآن پاک پر ایک اور تہمت

چونکہ گزشتہ آیات اس جملے پر ختم ہو گئی تھیں کہ جب مجرم اور گناہ گار لوگ عذاب الٰہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور موت کی وادی میں اتر چکے ہوں گے تو دوبارہ پلٹ جانے کی درخواست کریں گے تاکہ اپنے گناہوں کی تلافی کر سکیں تو موجودہ آیات انھیں دو طرح سے جواب دے رہی ہیں۔

پہلا یہ کہ آیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں (افبعذابنا یستعجلون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم کئی مرتبہ طنزیہ اپنے پیغمبر سے اس عذاب کے جلد آنے کا تقاضا کیا کرتے تھے جس کے متعلق وہ تمھیں پیش گوئی کر چکے تھے لیکن اب جبکہ تم اسی عذاب میں پھنس چکے ہو تو اس سے مہلت اور چھٹکارے کی درخواست کر رہے ہو تاکہ اس طرح سے تم اپنے ماضی کی تلافی کر سکو ؟ ایک دن تم اس چیز کو مذاق سمجھتے تھے لیکن آج اسے ہر حقیقت سے بالاتر حقیقت دیکھ رہے ہو۔

بہر صورت بات خواہ کچھ بھی ہو پروردگار عالم کا طریقہ کار یہی ہے کہ جب تلک مہلت نہ دے اور اتمام حجت نہ کر لے کسی قوم کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا لیکن جب اتمام حجت ہو جائے اور کہنے کے لائق باتیں کہی جا چکی ہوں اور کافی حد تک لوگوں کو مہلت مل جائے اور پھر بھی وہ راہ راست پر نہ آئیں تو پھر اللہ انھیں ایسے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ جس سے چھٹکارا ناممکن ہوتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ : اگر ہم انھیں اور بھی کئی سال اس دنیاوی زندگی سے بہرہ مند کر دیں .... (افرأیت ان متعناھم سنین)۔

پھر جس عذاب کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا ان کے دامن گیر ہو گا .... (ثم جآء ھم ما کانوا یوعدون)۔

یہ سامانِ حیات انھیں کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچائے گا (ما اغنٰی عنھم ما کانوا یمتعون):

بالفرض اگر انھیں مہلت دے بھی دی جائے ——— جبکہ اتمامِ حجت کے بعد کوئی مہلت نہیں دی جائے گی ——— اور بالفرض کئی اور سال بھی وہ یہیں پر رہ جائیں اور غرور و غفلت میں مگن رہیں تو کیا اس دنیاوی زندگی میں بیشتر مادی مفادات کے علاوہ اور کوئی کام کریں گے ؟ کیا وہ اپنے گزشتہ دور کی تلافی کریں گے ؟ یقیناً نہیں اور بالکل نہیں! پھر جب عذاب نازل ہو تو کیا یہ چیزیں اس وقت ان کی کوئی مشکل حل کر سکیں گی ؟ یا ان کے انجام پر کوئی تبدیلی پیدا کر دیں گی ؟

زیر بحث آیات کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ لوگ دنیا کی طرف دوبارہ واپس جانے کی درخواست اس لیے نہیں کریں گے کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں گے یا اپنے گناہوں کی تلافی کریں گے بلکہ ان کی درخواست اس لیے ہو گی کہ وہ دنیا میں جا کر اس جہان کی ناپائیدار نعمتوں سے بہرہ مند ہوں اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں لیکن یہ بات بھی انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی اور جلد یا بدیر وہ اس فانی دنیا سے عالم بقا کو کوچ ضرور کریں گے اور اپنے اعمال کے نتائج ضرور بھگتیں گے۔

یہاں پر ایک یا کئی سوال پیدا ہوتے ہیں بعد والی آیات جن کا جواب دیتی ہیں اور وہ یہ کہ: اصولی طور پر جب خداوند عالم کو قوم کے مستقبل کا علم ہے تو پھر مہلت دینے کی کیا ضرورت ہے؟

اور یہ بھی کہ جب گزشتہ امتوں نے پے در پے اپنے انبیاء کو جھٹلایا اور جیسا کہ ان میں سے بہت سے انبیاء کی داستان کے آخر میں "وما کان اکثرهم مؤمنین" آیا ہے یعنی ان میں سے اکثریت ایمان نہیں لاتی رہی تو پھر انبیاء کے پے در پے بھیجنے کا کیا یہی مقصد تھا کہ وہ آئیں اور لوگوں کو ڈرائیں اور تبلیغ کریں؟

انہی سوالات کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ یہ خدائی طریقۂ کار ہے کہ ہم کسی بستی کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتے جب تک ان کی طرف خبردار کرنے والے نہ بھیجیں اور انبیاء وعظ و نصیحت کے لیے اور اتمام حجت کے لیے بھیجے جاتے ہیں (و ما اهلکنا من قرية الا لها منذرون)۔

تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور بیدار ہوجائیں اور ان کے لیے حق کی طرف پلٹ آنے کا موقع موجود ہو (ذکری)[1]

اور اگر ہم اپنے رسولوں کے ذریعے لوگوں کو نہ ڈراتے اور اتمام حجت کیے بغیر انھیں عذاب میں مبتلا کر دیتے تو یہ ظلم ہوتا حالانکہ ہم ہرگز ظالم و ستمگار نہیں ہیں بلکہ اصولی طور پر ظلم و ستم ہمارے شایانِ شان ہی نہیں ہے (و ما کنا ظالمین)۔

یہ ظلم ہوگا کہ ہم غیر ظالم لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں یا ظالموں کو کافی حد تک اتمام حجت کیے بغیر نیست و نابود کر دیں۔

جو کچھ ان آیات میں ذکر ہوا ہے درحقیقت وہ مشہور و معروف عقلی اصول ہے جسے "قاعدہ قبح عقاب بلا بیان" کہتے ہیں۔ اسی کی مانند سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۵ میں بھی آیا ہے:

وماکنا معذبین حتّٰى نبعث رسولا

ہم لوگوں کو اس وقت تک ہرگز عذاب نہیں دیتے جب تک ان میں کسی رسول کو نہ بھیج دیں جو انھیں حقائق بتائے۔

یقیناً کافی حد تک حقائق بیان کیے بغیر سزا دینا قبیح اور ظلم ہے اور خداوند حکیم عادل ہرگز ایسا نہیں کرتا اور یہ وہی چیز ہے جسے علم اصول میں "اصل برائت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی جس حکم کے ثبوت کے لیے کافی حد تک دلیل موجود نہ ہو۔ اسی اصول کی بنا پر اس کی نفی ہو جاتی ہے (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ سورۂ بنی اسرائیل کی ۱۵ ویں آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں)۔

پھر ایک اور بہانے یا دشمنان قرآن کی ایک اور ناجائز تہمت کا جواب دیا گیا ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رابطہ کسی جن کے ساتھ ہے۔ وہ انھیں یہ آیات تعلیم دیتا ہے جبکہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ تنزیل من رب العالمین ہے۔

[1] یہاں پر "ذکری" کا کیا اعراب بنتا ہے، مفسرین نے چار احتمال کا ذکر کیا ہے پہلا یہ کہ ممکن ہے یہ کلمہ "منذرون" کا "مفعول له" ہو (مندرجہ بالا تفسیر بھی اسی بنیاد پر ہے) دوسرا یہ کہ "منذرون" کا "مفعول مطلق" ہو کیونکہ "انذار" اور "تذکر" قریب المعنی ہیں۔ تیسرا یہ کہ "منذرون" میں جو ضمیر ہے یہ کلمہ اس سے حال بن رہا ہے اور چوتھا یہ کہ (هذه) مبتدا محذوف کی خبر ہو یعنی "هذه ذکری"۔

یہاں پر ارشاد فرمایا گیا ہے: شیاطین اور جنات نے ان آیات کو نازل نہیں کیا ہے (و ماتنزلت به الشیاطین)۔

پھر دشمنوں کے اس بے بنیاد الزام کے جواب میں فرمایا گیا ہے: جنوں اور شیطانوں کے ہرگز لائق نہیں ہے کہ وہ اس جیسی کتاب نازل کریں (و ماینبغی لهم)۔

یعنی اس عظیم کتاب کے مضامین ایسے ہیں جن میں حق کا راستہ، پاکی، عدالت، تقویٰ اور ہر قسم کے شرک کی نفی موجود ہے۔ ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیطانی افکار اور الہامات سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی جبکہ شیطانوں کا کام شر و فساد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ کتاب تو مجسم خیر اور فلاح و بہتری ہے۔ بنابریں صرف اس کے مضامین پر ہی اگر غور کیا جائے تو اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے پھر یہ کہ وہ ایسا کام کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے (و ما یستطیعون)۔

اگر ایسا کام کرنا ان کے بس میں ہوتا تو "کاہنوں" جیسے افراد جو نزولِ قرآن کے زمانے میں شیاطین سے قریبی رابطہ رکھتے تھے وہ اس جیسی کتاب تیار کر لیتے (یا کم از کم وہ مشرکین جن کا شیاطین کے ساتھ رابطہ مسلّم تھا) لیکن وہ سب کے سب عاجز آگئے اور اپنے عجز سے ثابت کر دیا کہ یہ آیات ان کی طاقت سے باہر ہیں۔

اس کے علاوہ خود کاہنوں کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کے بعد ان شیاطین کا رابطہ آسمانی خبروں سے منقطع ہوگیا ہے جن کے ساتھ ان کا تعلق تھا اور وہ (آسمانی خبریں) سننے سے معزول اور برطرف کر دیئے گئے ہیں (انهم عن السمع لمعزولون)۔

کئی قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے شیاطین آسمانوں میں چلے جایا کرتے تھے اور وہاں کی خبریں چرالاتے تھے اور جو باتیں فرشتوں کے درمیان ہوا کرتی تھیں وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں کو بتا دیا کرتے تھے لیکن اسلام کے عظیم الشان پیغمبر کی ولادت باسعادت اور آپؐ کے ظہور کے ساتھ ہی باتیں چرانے کا یہ سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا اور خبریں دینے کا رابطہ بھی ختم ہوگیا ان باتوں کا تو مشرکین کو بھی علم تھا، بالفرض اگر مشرکین نہ بھی جانتے ہوں تو قرآن یقیناً اس کی خبر دیتا ہے[1]

اسی بنا پر مندرجہ بالا آیات میں قرآن مجید نے ایک دلیل کے عنوان سے اس کو بیان کیا ہے۔

اس طرح سے اس تہمت کا جواب تین طریقوں سے دیا گیا ہے:

۱۔ قرآنی مضامین شیطانی القاء سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

۲۔ شیاطین ایسا کام کر بھی نہیں سکتے۔

۳۔ شیطانوں کو آسمانی خبریں چرانے سے روک دیا گیا ہے۔

[1] شیاطین کو چوری چھپے باتیں سننے سے روک دینے کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے "سیرت ابن ہشام" جلد اوّل ص ۲۱۷ کے بعد کے اوراق ملاحظہ فرمائیں۔ ہم نے اس موضوع کی تفسیری تشریح اور شیاطین کے "شہاب ثاقب" کے ذریعے آسمانوں میں سے چوری چھپے باتیں سننے سے باز رکھے جانے کو تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں سورۂ حجر آیت ۱۶ تا ۱۸ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۲۱۳۔ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۚ۝

۲۱۴۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ۝

۲۱۵۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ۝

۲۱۶۔ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۚ۝

۲۱۷۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ۝

۲۱۸۔ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ۝

۲۱۹۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝

۲۲۰۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

ترجمہ

۲۱۳۔ خدا کے ساتھ کسی اور کو معبود مت پکارو ورنہ عذاب پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

۲۱۴۔ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

۲۱۵۔ اپنے بازوان مومنین کے لیے جھکا دو جو تمھاری پیروی کرتے ہیں۔

۲۱۶۔ اگر وہ تمھاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ میں اس کام سے بیزار ہوں جو تم کرتے ہو۔

۲۱۷۔ اور خداوند عزیز و رحیم پر توکل کرو۔

۲۱۸۔ وہی جو تمھیں اس وقت دیکھتا ہے جب (عبادت کے لیے) کھڑے ہوتے ہو۔

۲۱۹۔ اور سجدہ گزاروں میں تمھاری نقل و حرکت کو دیکھتا ہے۔

۲۲۰۔ وہی خدا سننے اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت

خداوندِ عالم نے گزشتہ آیات میں اسلام اور قرآن کے بارے میں مشرکین کے موقف کو بیان کرنے کے بعد زیرِ نظر آیات میں اپنے پیغمبر کو ان مشرکین کے سامنے اپنی پالیسی واضح کر دینے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اس ضمن میں پانچ امور کی نشاندہی کی گئی ہے۔

خداوند عالم سب سے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو توحید پر عقیدہ راسخ کرنے کی دعوت دیتا ہے کیونکہ توحید ہی تمام انبیاء کی دعوت کا بنیادی عنصر ہے، ارشاد ہوتا ہے: خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو مت پکارو، ورنہ سزا پاؤ گے (فلا تدع مع اللہ الٰھًا اٰخر فتکون من المعذبین)۔

اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علمبردار توحید تھے اور آپ کے بارے میں اس عقیدے سے انحراف کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ سب سے پہلے آپ ہی کی ذات کو مخاطب کیا گیا ہے تاکہ دوسرے لوگ اپنا حساب خود کر لیں دوسرا مقصد یہ ہے کہ دوسروں کی تربیت کا آغاز خودسازی سے کیا جائے۔

پھر اس سے بھی بڑھ کر ایک اور مرحلے کا حکم دیا گیا ہے: اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ اور شرک اور حکمِ الٰہی کی نافرمانی سے خوف دلاؤ (و انذر عشیرتک الاقربین)[1]

اس میں شک نہیں کہ کسی وسیع انقلابی پروگرام کو سب سے پہلے ایک محدود اور مختصر حلقوں سے شروع کیا جاتا ہے اور کیا ہی بہتر ہو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعوت کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کریں کیونکہ ایک تو وہ آپ کے پاکیزہ ماضی کو دوسروں سے بہتر پہچانتے ہیں اور دوسرے قریبی رشتہ داری کی محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہی لوگ دوسروں سے زیادہ آپ کی باتوں کو سنیں اس لیے کہ قریبی رشتے دار عموماً دوسروں کی نسبت حسد، کینہ اور دشمنی سے دور ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کسی سے نہ تو سودے بازی کرتے ہیں اور نہ ہی دوغلی پالیسی اپناتے ہیں بلکہ اپنے قریبی رشتہ داروں تک کو توحید، حق اور عدالت کی دعوت سے مستثنیٰ نہیں فرماتے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اسلام کے اس عظیم پیغمبر نے اس پر عمل درآمد کے لیے ایک منصوبہ بنایا جس کی تفصیل انشاء اللہ آپ نکات کے ذیل میں پڑھیں گے۔

تیسرے مرحلے میں دائرہ تبلیغ اور وسیع ہوتا ہے، حکم ہوتا ہے: جو مومنین تمھاری اتباع کرتے ہیں (ان کا محبت اور تواضع کے ساتھ

---

[1] "عشیرۃ" "عشرۃ" (دس کا عدد) سے مشتق ہے اور چونکہ دس کا عدد اپنی حد تک ایک مکمل عدد سمجھا جاتا ہے، اسی لیے قریبی رشتہ داروں کو "عشیرہ" کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے ذریعے انسان کا ایک مکمل گروپ بنتا ہے۔ ممکن ہے کہ "معاشرت" کا مادہ بھی اسی معنی سے لیا گیا ہو کیونکہ معاشرت ہی سے انسانوں کا ایک کامل مجموعہ تشکیل پاتا ہے۔

استقبال کرد اور اپنے بال و پران کے لیے جھکا دو (و اخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنین)۔

یہ عمدہ تعبیر ایسی تواضع کے لیے کنایہ ہے کہ جس میں مہر و محبت اور نرمی پائی جائے جیسا کہ پرندے جب اپنے بچوں سے محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو اپنے بال و پر کھول کر نیچے لے جاتے اور اپنے بچوں کو ان کے اندر لے لیتے ہیں تاکہ ایک تو وہ درپیش احتمالی خطرے سے بچ جائیں دوسرے انتشار اور افتراق کا شکار نہ ہوں اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کو بھی حکم ہے کہ وہ سچے مومنین کو اپنے پروں کے نیچے لے لیں۔

یہ معنی خیز تعبیر مومنین کے ساتھ محبت کے مختلف اہم پہلوؤں کو بیان کر رہی ہے جس میں اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ ڈرانے اور خوف دلانے کے حکم کے فوراً بعد اس جملے کا ذکر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اگر تربیتی مسائل بیان کرنے کے لیے کہیں سختی سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے تو فوراً ہی مہر و محبت اور نرمی سے کام لینے کا امر بھی کر دیا گیا ہے تاکہ ان دونوں کو ملا کر مناسب نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

پھر چوتھا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ تمھاری دعوت قبول نہ کریں اور مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں تو تم گھبراؤ نہیں بلکہ ان سے کہہ دو کہ "میں تمھارے طرزِ عمل سے بیزار ہوں"۔ اس طرح سے اپنا لائحہ عمل ان پر واضح کر دو (فان عصوك فقل انی بریٓء مما تعملون)۔

ظاہر یہ ہے کہ "عصوك" میں جو ضمیر ہے وہ پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیکی رشتہ داروں کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی آپ کی دعوت الی الحق کے بعد بھی انھوں نے آپ کا حکم نہ مانا اور اپنی مخالفت کو جاری رکھا تو آپ بھی ان کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کر دیں۔

قرآن کی یہ پیش گوئی بھی پوری ہو کر رہی۔ نکات کے ذیل میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ چنانچہ علی علیہ السلام کے سوا سب لوگوں نے آنحضرتؐ کی یہ دعوت مسترد کر دی کچھ لوگوں نے تو خاموشی اختیار کر لی اور کچھ نے تمسخر اڑا کر اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔

آخر کار مذکورہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے اپنے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ پانچواں حکم دیتا ہے:

اور خداوند عزیز و رحیم پر توکل کرو (و توکل علی العزیز الرحیم)۔

اس طرح کی مخالفتوں سے قطعاً نہ گھبراؤ، دوستوں اور پیروکاروں کی قلت کی بنا پر اپنے آہنی عزائم پر کاربند رہو تم اکیلے نہیں ہو تمھاری پناہ گاہ ذاتِ خداوندِ عالم ہے جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اور وہ بے حد رحیم و مہربان ہے۔

وہی خداوند جہاں جس کے عزیز و رحیم ہونے کی توصیف کی گئی ہے۔

وہی خدا جس نے اپنی عظیم قدرت سے فرعون اور اہل فرعون کے ظلم، نمرود اور اس کے حواریوں کے غرور، قوم نوح کے تکبر اور خود خواہی، قوم عاد کی دنیا پرستی اور قوم لوط کی ہوس پرستی کو خاک میں ملا دیا اور ان عظیم انبیاء اور مومنین کو نجات دلائی اور اپنی رحمتِ کاملہ میں شامل فرمایا جو اقلیت میں تھے۔

وہی خدا جو تجھے حالتِ قیام میں بھی دیکھتا ہے (الذی یراك حین تقوم)۔

اور سجدہ گزاروں میں بھی تمھاری نقل و حرکت کو ملاحظہ کرتا ہے (و تقلبك فی الساجدین)۔

جی ہاں! وہی تو ہے سننے اور دیکھنے والا (انه هو السمیع العلیم)۔

اس طرح سے خداوندِ عالم کی عزیز اور رحیم کی صفات کے علاوہ تین اور صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے دلوں کو مزید تقویت ملتی ہے اور پہلے سے زیادہ ڈھارس بندھ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ اپنے رسول کی تکالیف کو دیکھ رہا ہے اور ان کے قیام، سجدے اور حرکت اور سکون سے پوری طرح باخبر ہے۔

آپ کی آواز کو سنتا ہے۔

اور آپ کی ضروریات سے آگاہ ہے۔

اسی لیے ایسے خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دینا چاہییں۔

چند ایک نکات

۱۔ "تَقَلُّبَكَ فِی السَّاجِدِیْنَ" کی تفسیر:۔

"الذی یراك حین تقوم" و "تقلبك فی الساجدین" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے ان دو جملوں کی مختلف تفسیر کی ہے۔

آیات کا ظاہری مفہوم تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ: جب آپ قیام کرتے ہیں تب بھی آپ کو خداوند عالم دیکھتا ہے اور جب آپ سجدہ کرنے والوں میں نقل و حرکت کرتے ہیں تب بھی وہ آپ کو دیکھتا ہے۔

ممکن ہے قیام نماز کے لیے ہو یا عبادت کے واسطے نیند سے بیدار ہونا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ قیام "فرادی نماز" کے لیے ہو جبکہ ممکن ہے "تقلبك فی الساجدین" نماز با جماعت کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ سب قیام مراد ہوں۔

"تقلب" کا معنی چلنا پھرنا، حرکت کرنا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس سجدے کی طرف اشارہ ہو جو آپ دوسرے نمازیوں کے ساتھ بجا لاتے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے اس چلنے پھرنے کی طرف اشارہ ہو جب آپ اپنے نمازی ساتھیوں کا حال معلوم کرنے کے لیے ان کی عبادت کی حالت میں چلتے پھرتے تھے۔

بہر صورت مجموعی طور پر یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کے حالات میں سے کوئی حالت اور آپ کی کوششوں میں سے کوئی کوشش خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی جس سے آپ لوگوں کے حالات سدھارتے اور دینِ حق کی نشر و اشاعت فرماتے ہیں سب سے خداوند عالم آگاہ ہے (توجہ رہے کہ اس آیت میں آنے والے سب افعال کا تعلق مضارع سے ہے جو حال اور مستقبل کا معنی دیتے ہیں)۔

لیکن یہاں پر دو اور تفسیریں بھی ہیں جو آیت کے ظاہر سے تو ہم آہنگ نہیں ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کی باطنی تفسیریں ہوں

پہلی یہ کہ نمازیوں پر آنحضرتؐ کی نگاہیں جو کہ پس پشت سے ان پر پڑتی تھیں اس طرح تھیں کہ جس طرح آپ سامنے کی چیزوں کو دیکھ سکتے تھے پس پشت بھی اسی طرح چیزوں کو دیکھ سکتے تھے جیسا کہ ایک حدیث میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

لا ترفعوا قبلی ولا تضعوا قبلی، فانی اراکم من خلفی کما اراکم من امامی

نہ تو مجھ سے پہلے سجدہ سے سر اٹھاؤ اور نہ ہی مجھ سے پہلے سجدہ میں سر رکھو کیونکہ میں تمھیں پس پشت بھی ویسا ہی دیکھتا ہوں جیسا کہ سامنے سے دیکھتا ہوں۔

یہ فرمانے کے بعد آپ نے شاہد کے طور پر مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرمائی۔[1]

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد آنحضرتؐ کا جناب آدمؑ سے جناب عبداللہ تک پاک و پاکیزہ انبیاء کی صلبوں میں منتقل ہونا ہے جو پروردگار عالم کی نظر کرم کے تحت انجام پایا یعنی جب بھی آپ کا پاکیزہ نور ایک ساجد اور توحید پرست پیغمبر سے دوسرے موحد اور سجدہ گزار نبی میں منتقل ہوتا خدا اس سے آگاہ تھا۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے "وتقلبك فی الساجدين" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

فی اصلاب النبيين صلوات الله عليهم

انبیاء کی صلبوں میں خدا کی ان پر رحمت ہو۔[2]

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے اس جملے کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

فی اصلاب النبيين نبی بعد نبی، حتیٰ اخرجه من صلب ابيه عن نكاح غير سفاح من لدن آدم

انبیاء کی صلبوں میں رکھا، ایک پیغمبر سے دوسرے پیغمبر کی صلب میں، یہاں تک کہ خداوند عالم نے آپ کو آپ کے باپ کی صلب سے باہر نکالا، پاکیزہ نکاح کے ساتھ اور ہر طرح کی ناپاکی اور آلائشوں سے دور رکھا۔[3]

البتہ آیات بالا اور ان کی تفسیر سے قطع نظر ہمارے پاس ایسے دلائل بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے آباؤ اجداد کبھی مشرک نہیں تھے اور ان کی ولادت ہر قسم کے شرک و برائی سے پاک اور نہایت ہی مقدس ماحول میں ہوئی ہے (مزید

---

[1] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۶۹۔

[3] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۳ میں سورۂ انعام کی آیت ۷۴، کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں)۔

مندرجہ بالا تفسیریں آیت کی باطنی تفسیریں ہیں۔

۲۔ **دعوت ذو العشیرہ:** تاریخ اسلام کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعثت کے تیسرے سال اس دعوت کا حکم ہوا کیونکہ اب تک آپ کی دعوت مخفی طور پر جاری تھی۔ اور اس مدت میں بہت کم لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی "وانذر عشيرتك الاقربين" اور یہ آیت بھی "فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشركين" (سورۃ الحجر آیہ ۹۴) تو آپ کھلم کھلا دعوت دینے پر مامور ہو گئے۔ اس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرنے کا حکم ہوا۔[1]

اس دعوت اور تبلیغ کی اجمالی کیفیت کچھ اس طرح سے ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جناب ابوطالب کے گھر میں دعوت دی اس میں تقریباً چالیس افراد شریک ہوئے آپ کے چچاؤں میں سے ابوطالب، حمزہ اور ابولہب نے بھی شرکت کی۔

کھانا کھا لینے کے بعد جب آنحضرتؐ نے اپنا فریضہ ادا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے بڑھ کر کچھ ایسی باتیں کیں جس سے سارا مجمع منتشر ہو گیا لہٰذا آپ نے انھیں کل کے کھانے کی دعوت دے دی۔

دوسرے دن کھانا کھانے کے بعد آپ نے انھیں فرمایا:

"اے عبدالمطلب کے بیٹو! پورے عرب میں مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو اپنی قوم کے لیے مجھ سے بہتر چیز لایا ہو، میں تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمھیں اس دین کی دعوت دوں، تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے تاکہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہو"؟

سب لوگ خاموش رہے سوائے علی بن ابی طالب کے جو سب سے کم سن تھے۔ علی اٹھے اور عرض کی:

"اے اللہ کے رسول! اس راہ میں میں آپ کا یار و مددگار ہوں گا"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ علی کی گردن پر رکھا اور فرمایا:

ان هذا اخی و وصيی و خليفتی فيكم فاسمعوا له و اطيعوه

یہ (علی) تمھارے درمیان میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے اس کی باتوں کو سنو اور اس کے فرمان کی اطاعت کرو۔

یہ سن کر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور تمسخر آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر تھی، ابوطالب سے کہنے لگے "اب تم اپنے بیٹے کی باتوں کو سنا کرو اور اس کے فرمان پر عمل کیا کرو"۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۸۰۔

اس روایت کو بہت سے اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:
ابنِ ابی جریر، ابنِ ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی اور طبری۔ مورخ ابن اثیر نے یہ واقعہ اپنی کتاب "کا[مل]"
میں اور "ابوالفداء" نے اپنی تاریخ میں اور دوسرے بہت سے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے [1]
اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دنوں کس حد تک تنہا سے تھے اور لوگ آپ کی دعوت
کے جواب میں کیسے کیسے تمسخر آمیز جملے کہا کرتے تھے۔ اور علی علیہ السلام ان ابتدائی ایام میں جبکہ آپ بالکل تنہا تھے کیونکر آنحضرت
مدافع بن کر آپ کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت قریش کے ہر قبیلے کا نام لے لے کر انھیں بلایا
انھیں جہنم کے عذاب سے ڈرایا، کبھی فرماتے:

"یابنی کعب انقذوا انفسکم من النار

اے بنی کعب! خود کو جہنم سے بچاؤ۔

کبھی فرماتے:

یا بنی عبد الشمس .... کبھی فرماتے یا بنی عبد مناف ....

کبھی فرماتے:

یا بنی ھاشم ....

کبھی فرماتے:

یا بنی عبد المطلب ...... انقذوا انفسکم من النار

تم خود ہی اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ، ورنہ کفر کی صورت میں میں تمھارا دفاع نہیں کرسکوں گا [2]

[1] مزید تفصیل کے لیے کتاب المراجعات ص ۱۳۰ کے بعد اور کتاب احقاق الحق جلد ۴ ص ۶۲ کے بعد کا مطالعہ فرمائیں۔
[2] تفسیر قرطبی جلد، ص ۴۸۵۹ اسی آیت کے ذیل میں (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

۲۲۱۔ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ عَلٰى مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيۡنُ ؕ
۲۲۲۔ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۙ
۲۲۳۔ يُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَاَكۡثَرُهُمۡ كٰذِبُوۡنَ ؕ
۲۲۴۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الۡغَاوٗنَ ؕ
۲۲۵۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّهُمۡ فِىۡ كُلِّ وَادٍ يَّهِيۡمُوۡنَ ۙ
۲۲۶۔ وَاَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا يَفۡعَلُوۡنَ ۙ
۲۲۷۔ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا وَّانْتَصَرُوۡا
مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا ؕ وَسَيَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَىَّ مُنۡقَلَبٍ يَّنۡقَلِبُوۡنَ ۚ

ترجمہ

۲۲۱۔ کیا تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کن لوگوں پر نازل ہوتے ہیں؟
۲۲۲۔ ہر جھوٹے گناہ گار پر نازل ہوتے ہیں۔
۲۲۳۔ وہ جو کچھ بھی سنتے ہیں (دوسروں کو) بتا دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔
۲۲۴۔ (پیغمبر شاعر نہیں ہیں) شاعر تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔
۲۲۵۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟
۲۲۶۔ اور وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے۔
۲۲۷۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال انجام دیئے ہیں اور خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں اور جب ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ اپنے (اور دوسرے مومنین کے) دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں (اور اپنے شعری ذوق کو کام میں لاتے ہیں) اور جنھوں نے ظلم کیا ہے انھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ انھیں کہاں لوٹ کر جانا ہے۔

تفسیر

رسولِ اکرمؐ شاعر نہیں ہیں

مندرجہ بالا آیات جو سورہ شعراء کی آخری آیات ہیں ایک بار پھر اس گفتگو کی طرف لوٹ رہی ہیں جن میں دشمنان رسولؐ کی اس تہمت کا ذکر ہے کہ قرآن شیطانی القاء کا مجموعہ ہے چنانچہ یہ آیات دو ٹوک اور دلچسپ انداز میں اس تہمت کا جواب دے رہی ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: کیا تمھیں معلوم ہے کہ شیاطین کن لوگوں پر نازل ہوتے ہیں (ھل انبئکم علی من تنزل الشیاطین)۔

وہ ہر جھوٹے گناہ گار پر نازل ہوتے ہیں (تنزل علی کل افاک اثیم)[1]

شیطان جو کچھ سنتے ہیں اس میں بہت سے جھوٹ ملا کر اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں اور ان میں سے اکثر دروغ گو ہیں (یلقون السمع و اکثرھم کاذبون)۔

قصہ مختصر یہ کہ شیطانی القاء کی نشانیاں بالکل واضح ہوتی ہیں جن کے ذریعے انھیں پہچاننا بالکل آسان ہوتا ہے۔

شیطان ایک خطرناک، ایذارساں، تخریب کار وجود کا نام ہے جس کی بتائی ہوئی باتیں فساد اور تخریب کاری پر مبنی ہوتی ہیں اور اس کے خریدار بھی جھوٹے اور گناہ گار لوگ ہوا کرتے ہیں اور ان امور میں سے کوئی ایک بھی قرآن اور اس کے لانے والے سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس سے ذرہ بھر مشابہت رکھتا ہے۔

اس دور کے لوگوں نے جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صادق، امین اور مصلح کے طور پر پہچانا تھا۔ قرآنی مضامین بھی سوائے توحید، حق، عدالت اور تمام موارد میں اصلاح کی دعوت کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو پھر کس بناء پر تم انھیں شیطانی القاء کے ساتھ متہم کرتے ہو؟

"افاک اثیم" سے مراد وہی "کاہن لوگ" ہیں جن کا شیطانوں کے ساتھ رابطہ تھا اور شیاطین چوری چھپے کان لگا کر فرشتوں سے سچی باتیں سنتے تھے اور پھر اپنی طرف سے بہت سے جھوٹ ملا کر کاہنوں کو بتایا کرتے تھے اور پھر کاہن لوگ اس کو مزید مرچ مصالحہ لگا کر اور جھوٹ ملا کر لوگوں کو بتایا کرتے تھے ایک سچ کے ساتھ سو سو جھوٹ ملا دیا کرتے تھے۔

---

[1] "افاک" "افک" (بروزن پلک) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "بہت بڑا جھوٹ" اسی لیے "افاک" اس شخص کو کہتے ہیں جو بڑا جھوٹا ہو اور "اثیم"، "اثم" (بروزن اسم) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ایسا کام ہے جو انسان کو ثواب حاصل کرنے سے مؤخر کر دیتا ہے اور عام طور پر گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لہٰذا "اثیم" کا معنی گناہ گار ہوگا۔

نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو شیاطین کو آسمانوں پر جانے سے روک دیا گیا اس سے چوری چھپے سننے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا اس کے بعد تو جو کچھ بھی وہ کاہنوں کو بتایا کرتے تھے سو فیصد جھوٹ، کذب اور افتراء کا پلندہ ہوتا تھا ایسی صورت میں قرآنی مضامین کا ان کے ساتھ کیا موازنہ کیا جا سکتا ہے؟ اور صادق اور امین رسول کا جھوٹے اور کذاب کاہنوں سے کیونکر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

"یلقون السمع" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں پہلی تفسیر یہ ہے کہ "یلقون" میں جو ضمیر ہے وہ شیطانوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور "سمع" کا معنی مسموعات (یعنی سنی سنائی باتیں) ہے۔ یعنی شیاطین سنی سنائی باتیں اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں (بہت سے جھوٹ ان میں سے اپنی طرف سے ملا دیتے ہیں)۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "یلقون" میں موجود ضمیر ان جھوٹے گناہ گاروں کی طرف لوٹ رہی ہے جو شیطانوں کی باتوں کو غور سے سنتے ہیں یا جو کچھ وہ شیطانوں سے سنتے تھے وہ دوسرے لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔[1]

زیر نظر چوتھی آیت میں پیغمبر اسلامؐ پر کفار کی طرف سے لگائے جانے والے ایک اور الزام کا جواب دیا گیا ہے۔ کفار آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر کہتے تھے جیسا کہ سورۂ انبیاء کی پانچویں آیت میں آیا ہے کبھی کہتے تھے "بل ھو شاعر" (بلکہ وہ تو شاعر ہے) حتیٰ کہ کبھی آپ کو "شاعر مجنون" بھی کہا کرتے تھے جیسا کہ سورہ صافات کی آیت ۳۶ میں ہے:

ویقولون ء انا لتارکوا الھتنا لشاعر مجنون

وہ کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے خداؤں کو ایک پاگل شاعر کی وجہ سے چھوڑ دیں؟

قرآن مجید موجودہ آیت میں نہایت ہی منطقی بیان کے ساتھ فرماتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا طریقۂ کار شعراء کے طریقہ کار سے بالکل جدا ہے۔ شعراء تخیلات اور تصورات کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں جبکہ رسول اللہؐ ایک حقیقی اور واقعی دنیا میں رہ رہے ہیں اور عالم انسانیت کو ایک نظام عطا فرما رہے ہیں۔

شعراء عموماً عیش و نوش کے طالب ہوتے ہیں اور یار کے خال و زلف دراز کے اسیر ہوتے ہیں (خصوصاً وہ شعراء جو اس دور میں اور حجاز کے ماحول میں رہتے تھے، جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہے)۔

اسی وجہ سے "شعراء وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں" (والشعراء یتبعھم الغاوون)۔

---

[1] کیونکہ "یلقون" "القاء" کے مادہ سے ہے اور اس جیسے مقامات پر خبروں اور مطالب کے منتقل کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۂ حج کی آیت ۵۲ میں ہے:

لیجعل ما یلقی الشیطان فتنۃ للذین فی قلوبھم مرض

اور "اکثرھم کاذبون" کا جملہ بھی شیاطین کے کاموں سے مناسبت رکھتا ہے۔ وگرنہ جو لوگ "افاک اثیم" ہوتے ہیں وہ سب کے سب جھوٹے ہوتے ہیں نہ کہ اکثر لوگ (غور کیجیے گا)۔

پھراس کے فوراً بعداس جملے کا اضافہ فرمایاگیا ہے: کیاتو نے نہیں دیکھاکہ" وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں" (ال
تر انھم فی کل واد یھیمون)[۱]

وہ اپنی شاعرانہ سوچ اور تشبیہوں میں غرق رہتے ہیں حتیٰ کہ جدھر قافیہ انھیں لے جاتا ہے اُدھر ہی چل نکلتے ہیں۔
یہ لوگ عموماً منطق اور استدلال کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے اشعار ان کے ہیجانات کی پیداوار ہوتے ہیں اور یہی ہیجانات
اور خیالی دوڑ ہر زمانے میں انھیں ایک نئی وادی میں لے جاتے ہیں۔
جب کسی سے خوش ہوجاتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملادیتے ہیں اور اسے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے ہیں خواہ وہ
تحت الثریٰ کا مستحق ہی کیوں نہ ہو اور اسے ایک خوبصورت فرشتہ بنا دیتے ہیں خواہ وہ شیطانِ لعین ہی کیوں نہ ہو۔
اور جب کسی سے ناراض ہوجاتے ہیں تو اپنی ہجویات کے ذریعے گویا اسے اسفل السافلین تک پہنچا دیتے ہیں خواہ وہ مقدس
آسمانی فرشتہ ہی کیوں نہ ہو۔

کیا قرآن مجید کے نپے تلے مضامین، شاعروں کی فکری سرزمین سے ذرہ بھر بھی مشابہت رکھتے ہیں؟ خاص کر اس دور کے
شعراء سے کہ جن کا کام ہی صرف شراب و جمال، معشوق اور خط یار اور منظورِ نظر قبیلہ کی مدح اور دشمنوں کی ہجو کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔
پھر یہ کہ شعراء عموماً بزم کے شیر ہوتے ہیں مردِ میدان نہیں ہوتے، اہلِ سخن ہوتے ہیں صاحبانِ عمل نہیں، لہٰذا بعد والی آیت
میں ارشاد ہوتا ہے کیا دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے (و انھم یقولون ما لا
یفعلون)۔

لیکن پیغمبر اسلام تو سراپا عمل ہیں حتیٰ کہ آپ کے بدترین دشمن بھی آپ کے عزمِ راسخ، زبردست استقامت اور عمل کے
پہلوؤں کو اہمیت دینے کی تعریف کرتے ہیں، کجا شاعر اور کجا اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ؟
مندرجہ بالا تصریحات کو مدِ نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قرآن نے شعراء کی تین علامتیں بیان کی ہیں:
پہلی یہ کہ: ان کے پیروکار گمراہ لوگ ہوتے ہیں وہ خیالی دنیا میں مگن اور حقائق سے گریزاں رہتے ہیں۔
دوسری یہ کہ ان لوگوں کا کوئی خاص مطمحِ نظر نہیں ہوتا۔ ان کا فکری راستہ بہت جلد تبدیل ہوجاتا ہے۔ وہ ہیجانات و جذبات سے
متاثر ہوکر بہت جلد تبدیل ہوجاتا ہے۔
تیسری یہ کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے یہاں تک کہ جن حقائق کو وہ خود بیان کرتے ہیں ان پر
بھی عمل نہیں کرتے۔

لیکن ان علامات میں سے کوئی ایک بھی پیغمبرؐ میں نہیں پائی جاتی بلکہ آپ ان کے بالکل برعکس ہیں۔
لیکن چونکہ شعراء میں نیک اور بامقصد شاعر بھی ہوتے ہیں جو صاحبانِ عمل اور اہلِ حقائق ہوتے ہیں۔ حقانیت اور پاکیزگی کی
طرف دعوت دیتے ہیں (ہرچند کہ اس قماش کے شاعر اس دور میں بہت کم ملتے تھے) قرآن مجید نے ایسے باایمان ہنرمندوں

[۱] "یھیمون"، "ھیام" (بروزن "قیام") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے بغیر مقصد کے چلنا پھرنا۔

اور حق و صداقت کے متلاشیوں کا حق ضائع ہونے سے بچانے کے لیے، ایک استثناء کے ذریعے ان کی صف کو دوسروں سے
جدا کر دیا چنانچہ فرماتا ہے: لیکن جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے عملِ صالح انجام دیئے ہیں (الا الذین اٰمنوا و
عملوا الصالحات)۔
جن شعراء کا ہدف صرف شعر گوئی نہیں ہوتا بلکہ وہ اشعار کے پردے میں خدائی اور انسانی اہداف کے متلاشی ہوتے ہیں
ایسے شعراء جو صرف اشعار میں غرق ہوکر خدا کو بھول نہیں جاتے بلکہ" جو خدا کو بہت یاد کرتے ہیں اور ان کے اشعار لوگوں کو خدا
کی یاد دلاتے ہیں (و ذکروا اللہ کثیرًا)۔
جب ان پر ظلم و ستم کیا جاتا ہے تو وہ اپنے فدق کی بناء پر اپنے اور دوسرے مومنین کے دفاع کے لیے کھڑے ہو
جاتے ہیں (و انتصروا من بعد ما ظلموا)۔
اگر وہ اپنے اشعار کے ذریعے کسی کی ہجو اور مذمت کرتے ہیں تو اس لیے کہ حق پر ہونے والے حملوں کا دفاع کریں۔
تو اس طرح سے قرآن پاک نے ان بامقصد شعراء کی چار صفات بیان کی ہیں۔" ایمان"،"عمل صالح"" خدا کا ذکر کثیر"
اور اپنے اور دوسرے مومنین پر ہونے والے ظلم کا شعری طاقت کے ذریعے دفاع"۔
اور چونکہ اس سورت کی بیشتر آیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اوائلِ اسلام کے معدودے چند مومنین کی دلجوئی
کے لیے نازل ہوئی ہیں کیونکہ انھیں اس وقت کثیر تعداد میں دشمنوں کا سامنا تھا اور چونکہ اس سورہ کی بہت سی آیات پیغمبر اکرمؐ پر
لگائی جانے والی ناروا تہمتوں کے جواب اور آپ کے دفاع کے طور پر نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان ہٹ دھرم اور ضدی دشمنوں کو
سورۃ کے آخر میں ایک بار پھر متنبہ کیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ظلم کیا ہے وہ بہت جلد جان لیں گے کہ ان کی بازگشت کدھر کو ہے
اور ان کا کیا انجام ہوگا (وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون)۔
اگرچہ بعض مفسرین نے ان کی بازگشت اور انجام کو دوزخ تک ہی منحصر کرنا چاہا ہے لیکن اسے محدود کرنے کی کوئی دلیل
ہمارے پاس موجود نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ جنگ بدر وغیرہ میں انھیں جن پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس دنیا میں
جس ذلت اور زبوں حالی کا شکار رہے ہیں، بھی اس آیت کے مفہوم میں جمع ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ پیغمبرؐ پر شاعری کی تہمت کیوں؟ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ
مخالفینِ اسلام اور دشمنانِ پیغمبر آپؐ پر جو الزام تراشی کیا کرتے تھے اس میں آپ کی طرف شعر اور شاعری کی نسبت بھی تھی
اور مندرجہ بالا آیات اسی الزام کے جواب میں ہیں۔
وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ قرآن مجید ذرہ برابر بھی اشعار سے مشابہ نہیں ہے یعنی قرآن اور اشعار کا کوئی بھی جوڑ نہیں ہے۔ نہ
تو ظاہری لحاظ سے یعنی نظم، وزن اور قافیہ کے لحاظ سے اور نہ ہی مضامین کے اعتبار سے، یعنی شاعرانہ تشبیہات، تخیلات اور
تغزّل کے اعتبار سے۔

لیکن چونکہ وہ دیکھتے تھے کہ قرآن مجید لوگوں کے افکار و اذہان میں بے حد اثر کر رہا ہے اور اس کا دلنشین لحن ان کی
کے اندر اتر رہا تھا لہٰذا اس نور خداوندی پر پردہ ڈالنے کے لیے کبھی تو اسے جادو کا نام دیتے اور کبھی شعر کا، جادو اس لیے کہ وہ
پر بہت زیادہ تاثیر کرتا ہے اور شعر اس لیے کہ دلوں میں ارتعاش پیدا کر کے انھیں اپنی طرف مائل کر لیتا ہے ۔

وہ تو درحقیقت اس کی مذمت کرنا چاہتے تھے لیکن ان الفاظ کے ساتھ اس کی تعریف کر رہے ہوتے تھے اور ان کی یہ گفت
اس بات کی دلیل تھی کہ قرآن مجید دلوں اور دماغوں پر معجزانہ اثر کرتا ہے ۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہتا ہے :۔

وماعلمناه الشعر وما ينبغی له ان هو الا ذكر وقرآن مبين لينذر
من كان حيًا

ہم نے انھیں شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان ہے بلکہ یہ تو واضح ذکر، بیداری
اور قرآن ہے تاکہ جن لوگوں کے بدن میں جان ہے انھیں ڈرائیں ۔ (یٰسٓ ــــ ۶۹-۷۰)

۲۔ اسلام میں شعر و شاعری کا مقام :۔ اس میں شک نہیں کہ شعری ذوق اور شعری صلاحیت انسان کی دوسری تمام صلاحیتوں کی مانند اس وقت ایک قیمتی سرمایہ شمار ہوگی جب وہ صحیح خطوط پر چلے اور اس سے مثبت اور تعمیری فائدہ حاصل کیا جائے لیکن اگر اسے معاشرے کے اعتقاد اور اخلاق کی بنیادوں کو تباہ اور ویران کرنے اور معاشرے میں برائی اور بے راہروی کی ترغیب دلانے کا ذریعہ بنا لیا جائے یا اس سے انسانی معاشرے کو کھوکھلا کیا جائے یا بیہودہ بنا دیا جائے اور خیالی پلاؤ پکانے کی حد تک محدود رکھا جائے یا ایک بے مقصد مشغلے کے طور پر اس سے استفادہ کیا جائے تو ایسی صورت میں یہ صرف بے قیمت ہی نہیں مضر اور نقصان دہ بھی ہے ۔

اور اس جملے کے ساتھ اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ آخر آیاتِ بالا سے کیا سمجھا جائے شاعر ہونا اچھی بات ہے یا بُری مناسب ہے یا غیر مناسب ؟ اور اسلام شعر کے موافق ہے یا مخالف ؟

اور یہ بھی یاد رہے کہ اسلام اس سلسلے میں "اہداف" "اطراف" اور "نتائج" کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلہ کرتا ہے ۔ جب ماہِ رمضان المبارک کی ایک رات، امیر المومنین کے کچھ دوستوں نے افطار کے وقت شعر اور شعراء کے بارے میں گفتگو شروع کر دی، تو آنجنابؑ نے ارشاد فرمایا :

اعلموا ان ملاك امركم الدين، وعصمتكم التقوى، وزينتكم الادب،
وحصون اعراضكم الحلم

جان لو تمھارے تمام کاموں کا معیار دین، تمھارا محافظ تقوٰی ، تمھاری زینت ادب اور تمھاری آبرو
کے محکم قلعے حلم اور بُردباری ہیں [1]

امامِ عالی مقام کا یہ ارشاد اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک وسیلہ ہوتا ہے جس کے اچھے یا بُرے ہونے کا دار و مدار اس کے

[1] شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید جلد ۲۰ ص ۴۶۱ ۔

ف اور مقصد پر ہوتا ہے کہ جس کے لیے شعر کہا جاتا ہے ۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اقوام عالم کی تاریخ ادبیات میں شعر سے بہت ہی غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اس خداداد ذوقِ لطیف سے گندے ماحول میں اس قدر شرمناک کام لیا گیا کہ بسا اوقات وہ فساد اور تخریب کاری کا مؤثر ترین ذریعہ بن گیا خصوصاً عصرِ جاہلیت میں جو کہ عرب قوم کے اخلاقی اور فکری انحطاط کا دور تھا کیونکہ اس دور میں "شعر" "شراب" اور "غارتگری" شانہ بشانہ چل رہے تھے ۔

لیکن اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ تاریخ میں تعمیری اور بامقصد شعر نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور اپنی شہامت کے جوہر دکھائے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات اس نے کسی قوم اور ملّت کو خونخوار اور وحشی دشمن کے مقابلے میں یوں متحد کر دیا کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دشمن پر یوں ٹوٹ پڑی کہ اس کے دانت کھٹے کر دیئے اور اسے ہزیمت اٹھانے پر مجبور کر دیا ہم نے اپنے اسلامی انقلاب کی تحریک کے دوران میں بھی دیکھا ہے اور موزوں اشعار اور شعر کے قالب میں ڈھلے ہوئے نعرے بھی سنے ہیں کہ جن کی وجہ سے عوام میں جوش و خروش اور ذوق و ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور حرارت کا خون ان کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے اور ان سادہ اور مختصر اشعار نے کس قدر دشمن کو لرزہ براندام کر دیا تھا ؟ اور اس کے ایوانِ حکومت کی بنیادوں کو کس طرح ہلا کر رکھ دیا تھا ۔ کہ جن سے بہادری اور جرات کا مظاہرہ ہوتا ہے ،

اور اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بسا اوقات ایک اخلاقی شعر انسان کے قلب و روح میں اس حد تک اُتر جاتا ہے کہ ایک بہت بڑی کتاب بھی اس قدر مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی ۔

جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ :۔

ان من الشعر لحكمة، وان من البيان لسحرًا

بعض اشعار حکمت اور بعض بیان جادو ہوا کرتے ہیں [1]

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اشعار قیامت برپا کر دیتے ہیں ۔

بسا اوقات شاعرانہ موزوں کلمات دشمن کے دل پر تلوار سے زیادہ اور تیر سے بڑھ کر کارگر ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے اشعار کے سلسلے میں فرمایا ہے :

والذی نفس محمد بيده فكانما تنضحونهم بالنبل

اس ذات کی قسم محمدؐ کی جان جس کے دستِ قدرت میں ہے ان اشعار کے ذریعے گویا تم ان کی
طرف تیر چلا رہے ہو [2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کلمات اس وقت ارشاد فرمائے جب دشمن اپنے ہجویہ اشعار کے ذریعے مسلمانوں کے

[1] اس حدیث کو بہت سے شیعہ و سنی علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے (کتاب الغدیر جلد ۲ ص ۹ کا مطالعہ فرمائیں)۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۴۶۰ ۔

حوصلے پست کر رہا تھا تو آپ نے حکم دیا کہ دشمن کی مذمت اور مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے اشعار پڑھے جائیں۔
ایک مرتبہ ایک مدافع اسلام شاعر کے بارے میں فرمایا:

اهجهم فان جبرئیل معك

ان کی مذمت اور ہجو کرو کہ جبرائیل تمھارے ساتھ ہیں[1]

خصوصاً جب باایمان شاعر کعب بن مالک اسلام کی تقویت کے لیے شعر پڑھ رہے تھے تو رسولِ پاکؐ سے دریافت کیا یارسول اللہ! اشعار کی مذمت میں تو یہ آیات نازل ہو چکی ہیں میں کیا کروں؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ان المؤمن یجاهد بنفسه وسیفه و لسانه

مومن اپنی جان، تلوار اور زبان کے ساتھ جہاد کرتا ہے[2]

آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے بھی بامقصد اشعار اور شعراء کی بہت تعریف، ان کے حق میں دعا اور ان کے لیے بہت سے انعام و اکرام کی روایات ملتی ہیں۔ اگر ہم ان تمام کو یہاں پر لکھنا شروع کر دیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

لیکن افسوس کہ تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جنھوں نے اس عظیم صلاحیت اور ملکوتی ذوقِ لطیف کو جو تخلیقِ کائنات کا بہترین مظہر ہے آلودہ کر دیا اور اسے اوجِ ثریا سے مادیت کے تحت الثریٰ میں ڈال دیا اور انھوں نے اس قدر جھوٹے اشعار کہے ہیں کہ مندرجہ ذیل ضرب المثل وجود میں آگئی ہے " احسنه اكذبه " (یعنی جس شعر میں زیادہ جھوٹ ہو گا وہی زیادہ اچھا ہو گا)

کبھی تو اس سے ظالموں اور جابر حکمرانوں کی مدح سرائی کی گئی اور ناچیز اور حقیر سے صلہ اور انعام کے لیے اس قدر خوشامد اور چاپلوسی کی کہ گویا اپنے تئیں سات آسمان اتار کر اُن کے پاؤں میں رکھ دیئے تاکہ قزل ارسلان کے پاؤں کا بوسہ لیں"۔

اور کبھی عیش و شراب، رسوائی اور بے حیائی میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ قلم ان کے ذکر کرنے سے شرماتا ہے۔

اور کبھی ایسے شعراء نے اپنے اشعار کے ذریعہ جنگوں کی آگ بھڑکائی اور لوٹ مار اور قتل و غارت کے لیے انسانوں کو آپس میں لڑا دیا اور بے گناہوں کے خون سے صفحۂ زمین کو رنگین کر دیا۔

لیکن ان کے مقابلے میں باایمان اور عالی ظرف شعراء بھی موجود رہے ہیں جنھوں نے مادیت کو ٹھوکر مار دی۔ اور اس ملکوتی عطیہ کو انسانوں کی آزادی، تقوای اور پاکیزگی کے راستے میں استعمال کیا۔ ڈاکوؤں، لٹیروں اور ظالم و جابر حکمرانوں سے پنجہ آزمائی کی اور اوجِ کمال و افتخار تک جا پہنچے۔

کبھی حق کے دفاع میں ایسے ایسے شعر کہے کہ ہر بیت کے بدلے جنت میں ایک گھر خرید لیا۔[3]

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۹۹۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۷ ص ۴۸۶۹۔

[3] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من قال فینا بیت شعر بنی الله له بیتًا فی الجنة

جو شخص ہمارے بارے میں ایک بیت کہے گا خدا اس کا گھر بہشت میں بنائے گا۔ (الغدیر جلد ۲ ص ۲)

اور کبھی "بنی امیہ" اور "بنی عباس" جیسے ظالم و جابر حکام کے دورِ حکومت میں جبکہ اس حد تک گھٹن کا ماحول تھا کہ سانس لینا بھی دشوار تھا تو "مدارس آیات" جیسے قصیدے کہہ کہہ کر دلوں کو جلا بخشی اور جھوٹ اور فریب کے پردے چاک کر کے رکھ دیئے۔
گویا یہ اشعار ان سے روح القدس کہلا رہا تھا[1]

کبھی معاشرے کے محکوم و محروم اور پسے ہوئے طبقے میں تحرک پیدا کرنے کے لیے شعر کہتے رہے جس سے ان کے اندر جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا تھا۔

اور قرآن مجید بھی ایسے لوگوں کے لیے فرماتا ہے:

الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات و ذکروا الله کثیرًا و انتصروا
من بعد ما ظلموا

اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کے شاعر بسا اوقات ایسی جاودانہ یادگاریں چھوڑ جاتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق عظیم ہادیانِ اسلام لوگوں کو ان کے اشعار یاد کرنے کا حکم دیتے ہیں، جس طرح کہ "عبدی" کے اشعار کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

یا معشر الشیعة علموا اولادکم شعر العبدی فانه علی دین الله

اپنی اولاد کو عبدی کے اشعار تعلیم دو کیونکہ وہ خدا کے دین پر تھا[2]

ہم بھی اپنی اس گفتگو کو "عبدی" کے ان مشہور و معروف اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو اس نے پیغمبرؐ کی خلافت اور جانشینی کے بارے میں کہے ہیں:

وقالوا رسول الله ما اختار بعده — اماما و لکنا لانفسنا اخترنا
اقمنا اماما ان اقام علی الهدٰی — اطعنا و ان ضل الهدایة قومنا
فقلنا اذا انتم امام امامکم — بحمد من الرحمٰن تهتم و لا تهنا
و لکننا اخترنا الذی اختار ربنا — لنا یوم خم ما اعتدینا و لا حلنا
و نحن علی نور من الله واضح — فیا رب زدنا منك نورًا و ثبتنا

ترجمہ: انھوں نے کہا کہ رسولِ خدا نے اپنے بعد کسی کو امام نہیں بنایا ہم تو خود ہی اپنے لیے امام کا انتخاب کریں گے۔
ہم ایسے امام کا انتخاب کریں گے کہ اگر وہ ہدایت پر گامزن رہا تو ہم بھی اس کی اطاعت کریں گے اور

---

[1] ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
ما قال فینا قائل بیت شعر حتی یؤید بروح القدس (عیون اخبار الرضا)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۷۱۔

اگر گمراہی کی راہ اختیار کی تو ہم اسے سیدھا کریں گے (یا اسے ہٹا دیں گے)۔

تو ہم نے انھیں کہا پھر تو تم اپنے امام آپ ہی ہو گے بحمد للہ تم لوگ سرگرداں پھر رہے ہو لیکن ہم سرگرداں نہیں ہیں۔

ہم نے اسے امام تسلیم کیا ہے جسے غدیر خم کے دن ہمارے لیے ہمارا امام بنایا گیا تھا۔ ہم اس سے ذرہ برابر انحراف نہیں کریں گے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے واضح نور پر ہیں اور اے پروردگار! تو اس نور میں مزید اضافہ فرما اور ہمیں بھی ثابت قدم رکھ ؎۱

۳۔ **ذکرِ خدا:** مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ بامقصد شعراء کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

"ذکرِ کثیر سے مراد حضرت فاطمہ زہرا کی تسبیح ہے (جو تکبیر حمد اور تسبیح پر مشتمل ہے)۔

ایک اور حدیث میں آپ ہی فرماتے ہیں:

سخت ترین اور اہم ترین امور میں سے ایک سخت اور اہم امر جو خدا نے اپنی مخلوق پر فرض کیا ہے خدا کا ذکر کثیر ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

میری مراد یہ نہیں ہے کہ لوگ "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر" کہیں اگرچہ یہ بھی اس کا ایک جز ہے لیکن "ذکر اللہ عند ما احل وحرم فان کان طاعۃ عمل بھا وان کان معصیۃ ترکھا" یعنی میرا مقصد یہ ہے کہ جب انسان کسی حلال اور حرام کا سامنا کرے تو اس وقت خدا کو یاد کرے اگر اس میں خدا کی اطاعت ہے تو اسے انجام دے اور اگر معصیت ہے تو اسے چھوڑ دے ؎۲

پروردگارا! تو ہمارے دلوں کو اپنی یاد کے ساتھ سرشار فرما! اور جن چیزوں میں تیری ذات کی رضامندی ہے اسے اپنائیں اور جس میں تیری ذات کی ناراضی ہے اسے چھوڑ دیں۔

خداوندا! ہماری زبانوں کو گویا، ہمارے قلم کو توانا اور ہمارے دلوں کو خلوص سے بھر دے! تاکہ ان سب کو تیری راہ اور تیری رضا میں کام میں لائیں۔ آمین یارب العالمین!

تفسیر سورۂ شعراء ختم ہوئی

۱۰ رجب ۱۴۰۲ھ۔ روز ولادت حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام

۱ه الکنی والالقاب جلد ۲ ص ۵۵۴۔

۲ه اصولِ کافی۔

سورۂ نمل

مکہ میں نازل ہوئی

اس کی ۹۳ آیات ہیں

سُورۂ نمل کے مضامین

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مشہور قول کی بناء پر یہ سورہ مکہ میں سورۂ شعراء کے بعد نازل ہوئی ہے ۔

مجموعی طور پر اس سورۃ کے مضامین بھی وہی ہیں جو دوسری مکی سورتوں کے ہوتے ہیں یعنی اعتقادی لحاظ سے زیادہ تر مبداء اور معاد پر زور دیا گیا ہے اور قرآن مجید، وحی، عالمِ آفرینش میں خداوندِ عالم کی نشانیوں اور قیامت کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ عملی اور اخلاقی مسائل کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے پانچ عظیم نبیوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ منحرف اور گمراہ اقوام کے ساتھ ان کے مقابلے کا ذکر ہے تاکہ اس طرح سے ایک تو ان مومنین کی تسلّی کا سامان فراہم کیا جا سکے جو خاص طور پر ان دنوں مکہ میں نہایت اقلیت میں تھے اور دوسرے ہٹ دھرم اور ظالم مشرکین کے لیے تنبیہ ہو تاکہ وہ صفحہ تاریخ میں گزشتہ سرکشوں کا انجام دیکھ کر کچھ عبرت حاصل کریں، بیدار ہوں اور ہوش میں آجائیں !

اس سورہ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ حضرت سلیمان اور ملکہ سباء کی داستان، ملکہ کے توحید پر ایمان لانے کی کیفیت، جناب سلیمانؑ کے ساتھ ہُدہُد جیسے پرندوں اور چیونٹی جیسے حشرات کی گفتگو پر مشتمل ہے ۔

اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی "نمل" (چیونٹی) ہے۔ عجیب بات یہ بھی ہے کہ بعض روایات میں اسے "سُورۂ سلیمان" کے نام سے یاد کیا گیا ہے (کبھی سُورۂ سلیمان اور کبھی سُورۂ نمل) اور جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس کے یہ نام بہت ہی مناسب ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے لیے گئے ہیں۔ ان میں ایسے اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے کہ لوگ عام طور پر ان سے بے خبر تھے ۔

ساتھ ہی اس سورت میں پروردگارِ عالم کے بے انتہا علم، کائنات میں اس کی ہر چیز پر نگرانی اور بندوں پر اس کی حاکمیت کہ جس کی طرف توجہ انسان کی تربیت کے لیے نہایت ہی مؤثر ہے کا ذکر بھی ہے ۔

یہ سورت "بشارت" کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور "تنبیہ" پر ختم ہو جاتی ہے۔ بشارت وہ جو قرآن مجید مومنین کے لیے لایا ہے اور تنبیہ اس بات کی کہ خداوندِ عالم تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے ۔

سورۂ نمل کی فضیلت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے :

من قرء طس سليمان كان له من الاجر عشر حسنات، بعدد من صدق سليمان، وكذب به، و هود وشعيب وصالح و ابراهيم و يخرج من قبره وهو ينادى لا اله الّا الله

جو شخص سورہ طس سلیمان (سُورۂ نمل) کی تلاوت کرے گا خداوندِ عالم اسے ان لوگوں کی تعداد سے دس گنا اجر دے گا، جنھوں نے سلیمان کی تصدیق یا تکذیب کی۔ اسی طرح ان لوگوں کی تعداد سے بھی جنھوں نے جناب ہود، شعیب، صالح اور ابراہیم علیہم السلام کی تصدیق یا تکذیب کی اور بروز قیامت جب وہ اپنی قبر سے باہر نکلے گا تو اس کے منہ پر "لا الٰہ الّا اللہ" کا ورد ہو گا[1]

ہر چند کہ اس سورت میں جناب موسیٰ، سلیمان، داؤد، صالح اور لوط علیہم السلام کا تذکرہ ہے اور جناب ہود، شعیب اور ابراہیم علیہم السلام کا ذکر نہیں ہوا ہے لیکن چونکہ دعوت کے لحاظ سے تمام انبیاء یکساں ہیں لہٰذا یہاں روایت میں ان کا ذکر باعثِ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے :

جو شخص طواسین ثلاث (سُورۂ شعراء، نمل اور قصص کہ جن کے آغاز میں طس ہے) کی ہر شب جمعہ تلاوت کرے گا وہ اولیاء اللہ سے ہو گا۔ اسی کے جوار اور اس کے لطف و حمایت کے زیر سایہ رہے گا۔[2]

---

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] ثواب الاعمال (منقول از نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۷)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ طٰسٓ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِیۡنٍ ○

۲۔ هُدًی وَّبُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

۳۔ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ○

۴۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ زَیَّنَّا لَهُمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فَهُمۡ یَعۡمَهُوۡنَ ○

۵۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ وَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ هُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ○

۶۔ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّی الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِیۡمٍ عَلِیۡمٍ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ طٰس۔ یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں۔

۲۔ مومنین کے لیے ہدایت اور بشارت ہیں۔

۳۔ وہی جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

۴۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے (برے) اعمال کو یوں خوشنما بنائیں گے کہ وہ بھٹکتے ہی پھریں گے

۵۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے برا (اور دردناک) عذاب ہے اور وہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

۶۔ اور یقیناً یہ قرآن حکیم اور دانا خدا کی طرف سے تجھ پر بھیجا جاتا ہے۔

تفسیر

قرآن ایک حکیم دانا کی طرف سے ہے

اس سورت کے آغاز میں ہم ایک بار پھر حروف مقطعات کا سامنا کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ ان حروف کے فوراً ہی بعد قرآن مجید کی عظمت کی بات ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کا ایک راز یہ ہو کہ یہ عظیم کتاب اور اس کی آیات مبین تو الف، با جیسے سادہ اور معمولی حروف سے بنی ہیں لیکن تعریف کے لائق تو وہ آفریدگار ہے جس نے ایسا محیر العقول کارنامہ معمولی اور سادہ سے مواد کے ذریعے ظاہر کیا۔ اس سلسلے میں ہم سورۂ بقرہ، آل عمران اور سورۂ اعراف کے آغاز میں کافی اور مفصل گفتگو کر چکے ہیں (تفسیر نمونہ کی جلد اوّل، دوم اور چہارم کا مطالعہ فرمائیے)۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں (تلک ایات القراٰن و کتاب مبین)۔

لفظ "تلک" دور کے لیے اسم اشارہ ہے۔ یہاں یہ ان آسمانی آیات کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے اور "مبین" کی تعبیر اس بات کی تاکید ہے کہ یہ قرآن خود بھی واضح اور آشکار ہے اور حقائق کو آشکار کرنے والا بھی ہے[1]

اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "قرآن" اور "کتاب مبین" کے دو الگ الگ معنی ہیں اور کتاب مبین سے مراد "لوح محفوظ" ہے لیکن آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔ پہلا الفاظ اور تلاوت کے لباس میں اور دوسرا تحریر اور کتابت کے لباس میں۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں قرآن مجید کی ایک اور صفت بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ "یہ ایسا قرآن ہے جو مومنین کے لیے ہدایت کا ذریعہ اور بشارت کا وسیلہ ہے" (ھدًی و بشرٰی للمؤمنین)۔

"وہ وہی لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں" (الذین یقیمون الصلٰوۃ ویؤتون الزکٰوۃ وھم بالاٰخرۃ ھم یوقنون)۔

اس لحاظ سے ایک تو ان کا مبداء اور معاد پر پختہ عقیدہ ہے۔ دوسرے ان کا خدا اور خلق خدا کے ساتھ محکم تعلق ہے اسی لیے مندرجہ بالا اوصاف ان کے مکمل عقیدے اور طرز عمل کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مومنین اعتقادی اور عملی لحاظ سے صاف اور واضح راستہ اختیار کر چکے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ قرآن ان کی ہدایت کے لیے آئے؟

---

[1] "مبین" "ابانہ" کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ بعض مفسرین نے (جیسے آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں) کہا ہے کہ یہ مادہ کبھی فعل لازم کے معنی میں آتا ہے اور کبھی فعل متعدی کے معنی میں۔ پہلی صورت میں "مبین" کا معنی ہے واضح اور آشکار۔ اور دوسری صورت میں آشکار کرنے والا۔

اگر توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں اور ہر مرحلہ اپنے سے بالاتر مرحلے کے لیے مقدمہ اور
ہے اسی طرح یہ سلسلہ اوپر کو چلا جاتا ہے اسی سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ ہدایت کا دائم اور برقرار رہنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کی ہم اپنی شب و روز
ہیں ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگا کرتے ہیں" اھدنا الصراط المستقیم " کہ خداوندا! ہمیں اس راہ پر ثابت قدم رکھ اور اس پر
دائم رکھ کیونکہ تیری مہربانی کے بغیر ایسا قطعاً ناممکن ہے۔
اس کے علاوہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات سے استفادہ کرنا صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کے اندر حقیقت
اور حق جوئی کی تڑپ پائی جاتی ہو ہرچند کہ وہ مکمل ہدایت تک نہ بھی پہنچے ہوں۔
اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کہیں پر قرآن مجید کو " پرہیزگاروں " کے لیے ہدایت کہا گیا ہے (بقرہ — ۲) کہیں پر "مسلمانوں" کے
لیے ہدایت کہا گیا ہے (نحل — ۱۰۲) اور یہاں پر "مومنین" کے لیے ہدایت کہا گیا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب تک کم از کم
تقویٰ، تسلیم اور حقیقت پر ایمان انسان کے دل میں نہ ہو اس وقت تک وہ حق کی تلاش میں نہیں نکل سکتا اور کتاب مبین کے نور سے
بہرہ مند نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ظرف میں استعداد اور قابلیت کا ہونا بھی شرط ہے۔
اس سے قطع نظر " ہدایت " اور " بشارت " باہمی طور پر صرف مومنین کے لیے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لیے ایسی بشارت
نہیں ہے۔
یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اگر قرآن کی بعض آیات میں ہدایت کو عام لوگوں کے لیے شمار کیا گیا ہے۔ اور
" ھدًی للناس " (بقرہ — ۱۸۵) کہا گیا ہے تو اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جن کے اندر حق کی قبولیت کے لیے قابلیت
پائی جاتی ہے ورنہ متعصب قسم کے ہٹ دھرم لوگ تو دل کے ایسے اندھے ہوتے ہیں کہ اگر ایک کی بجائے ہزاروں سورج ان کے
لیے چمکنے لگ جائیں تو بھی وہ ذرہ برابر بہرہ یاب نہیں ہو پائیں گے۔
پھر قرآن ان لوگوں کے حالات بیان فرماتا ہے جو مومنین کے برعکس ہیں اور ان کے نہایت المناک حالات کا ایک رُخ
یوں بیان فرماتا ہے : جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے بُرے اعمال کو بنا سنوار کر پیش کریں گے۔ وہ زندگی کی راہوں
میں بھٹکتے پھرتے ہیں (ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ زینا لھم اعمالھم فھم یعمھون)۔
ان کی نگاہوں میں نجاست، طہارت ہوتی ہے، برائی، بھلائی ہوتی ہے، پستی بلندی ہوتی ہے اور بدبختی سعادت و
کامیابی ہوتی ہے۔
جی ہاں! یہی انجام ہوتا ہے ان لوگوں کا جو غلط راہ پر گامزن ہوتے ہیں اور اسی راہ پر ڈٹے رہتے ہیں۔
جب انسان غلط کام کرتا ہے تو آہستہ آہستہ برائی اس کی نظروں میں کم ہوجاتی ہے اور وہ اس کا عادی ہوجاتا ہے جب
ایک عرصے تک اس سے مانوس ہوجاتا ہے تو پھر اس کے لیے مختلف توجیہات گھڑنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ایک مدت کے
بعد وہ برائی اس کی نگاہوں میں خوبصورت چیز بلکہ ایک فریضہ بن جاتی ہے اور دنیا میں کتنے مجرم لوگ ہیں جو اپنے ان ناشائستہ اور
غلط کاموں پر فخر و مباہات کرتے اور انھیں مثبت کام شمار کرتے ہیں۔

اقدار اور معیار جب یوں بدل جاتے ہیں تو انسانی زندگی بے راہ اور سرگرداں ہوکر رہ جاتی ہے اور یہ انسانی زندگی کی
ین کیفیت ہے۔
یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسی آیت میں اور سُورہ انعام کی آیت ۱۰۸ میں "زینت دینے" کی نسبتُ "خدا" کی طرف دی
ہے جبکہ آٹھ مقامات پر "شیطان" کی طرف اور دو جگہوں میں فعل مجہول " زین " آیا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو سب ایک ہی
ت کو بیان کر رہے ہیں۔
یہ جو خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ " مسبب الاسباب " ہے یعنی اسباب کا پیدا کرنے والا وہی ہے
س لحاظ سے ہر کام کے نتیجے کا تعلق خدا سے بنتا ہے اور خداوندِ عالم نے یہ خاصیت تکرارِ عمل میں رکھ دی ہے کہ آہستہ آہستہ جب انسان
اس کا عادی ہوجاتا ہے تو پہچان کی حس تبدیل ہوجاتی ہے اور اس سے انسان بھی جواب دہ رہتا ہے اور خدا پر بھی کوئی اعتراض وارد
نہیں ہوتا (غور کیجیے گا)۔
اور اگر شیطان یا خواہشاتِ نفسانی کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے تو اس لیے کہ اس کے نزدیکی اور بلاواسطہ عوامل
یہی ہوتے ہیں۔
اور اگر کہیں پر فعل مجہول کی صورت میں آیا ہے تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عمل کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ
بار بار کے ارتکاب سے انسان کے اندر یہ عمل "حالت"، "ملکہ" اور "عشق" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔
پھر "اعمال کے مزین کرنے" کا نتیجہ بیان فرماتے ہوئے ایسے لوگوں کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے : یہی وہ لوگ ہیں جن کے
لیے بُرا، سخت اور دردناک انجام ہے (اولٰئك الذین لھم سوء العذاب)۔
دنیا میں سرگرداں، مایوس، حیران و پریشان ہوں گے اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔
"اور وہ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے" (وھم فی الاٰخرۃ ھم الاخسرون)۔
ان کے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے کی وجہ وہی ہے جو سُورہ کہف کی آیہ ۱۰۲ — ۱۰۴ میں آئی ہے۔
قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً ہ الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا
وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا
کہہ دیجیے کہ آیا میں تمھیں اعمال کے لحاظ سے زیادہ نقصان اٹھانے والے لوگوں کا تعارف کراؤں؟
وہ وہی لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں بیکار ہوگئی ہیں جبکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ
نیک اعمال انجام دے رہے ہیں۔
اس سے بڑھ کر اور کیا نقصان ہوگا کہ انسان اپنے بُرے اعمال کو نیک اعمال سمجھے اور اپنی تمام توانائیاں ان پر صرف کر دے اور
مثبت کام سمجھ کر انھیں بجا لاتا رہے لیکن ان کا انجام بدبختی، سیاہ بختی اور عذاب کے سوا اور کچھ نہ ہو۔
اسی سلسلے کی آخری آیت جو قرآنی مضامین کی عظمت کے سلسلے میں گزشتہ اشاروں کی تکمیل کے طور پر اور انبیاء کرام علیہم السلام
کے حالاتِ زندگی کے لیے جو ابھی شروع ہونے والے ہیں کے مقدمے کی صورت میں ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ یہ قرآن خداوند حکیم ودانا کی طرف سے تیری جانب بھیجا جاتا ہے (و انك لت
القرآن من لدن حکیم علیم)۔

اگرچہ "حکیم" اور "علیم" ہر دو خدا کی دانائی کی طرف اشارہ ہیں لیکن "حکمت" عام طور پر عملی پہلو کو بیان کرتی ہے اور
نظری پہلو کو۔ بالفاظ دیگر "علیم" خداوند عالم کے بے انتہا علم کی خبر دیتا ہے اور "حکیم" کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ
عالم کے معرض وجود میں لانے اور قرآن کے نازل کرنے میں حساب وکتاب اور ہدف ومقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

اور اس طرح کا قرآن جب ان صفات کے مالک پروردگار کی طرف سے نازل ہو تو اسے مبین اور آشکار کرنے والی کتاب
ہی ہونا چاہیے جو مومنین کے لیے ہدایت اور بشارت کا سبب ہو اور اس کی داستانیں ہر طرح کی خرافات اور تحریف سے
پاک ہوں [1]

حق بینی اور ایمان

انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ حقائق کو اسی طرح سمجھے جیسا کہ وہ ہیں اور ان کے بارے میں صحیح موقف رکھتا ہو۔
نظریات، خواہشات، انحرافی میلان اور حب وبغض حقائق کو صحیح طور پر دیکھنے اور سمجھنے میں مانع نہ ہوں اور فلسفہ کی جو سب سے
اہم تعریف کی گئی ہے وہ بھی یہی ہے یعنی "حقائق کا ادراک جیسا کہ وہ ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ معصومین نے خداوند عالم سے جو اہم ترین تقاضا کیا ہے وہ بھی یہی ہے کہ،

اللّٰھم ارنی الاشیاء کما ھی

خداوندا! حقائق اور موجودات کو ہمیں ویسے ہی دکھا جیسے وہ ہیں (تاکہ ہم اقدار کو صحیح معنوں میں
سمجھ کر ان کا حق ادا کریں)۔

اور یہ حالت ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ سرکش خواہشات نفسانی اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ رکاوٹیں
تقویٰ کے بغیر اور خواہشات نفسانی پر کنٹرول کیے بغیر دُور نہیں ہو سکتیں۔

اسی لیے ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے:

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے بُرے اعمال کو زینت دیتے ہیں اور وہ سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

اس کا ظاہری نمونہ ہم اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنے دور کے دُنیا پرست افراد کی زندگی میں دیکھ رہے ہیں۔
وہ ایسی چیزوں پر فخر کرتے ہیں اور ایسے امور کو اپنے تمدن کا حصّہ شمار کرتے ہیں جو درحقیقت ننگ وعار، گناہ اور رسوائی کے علاوہ

---

[1] "تلقیٰ" باب تفعیل کا فعل مضارع بصادہ مجہول کا صیغہ ہے جس کا ثلاثی مجرد کا صیغہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے (لقی) اور ثلاثی مزید فیہ کا صیغہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اس آیت میں خداوند عالم فاعل اور قرآن کا نازل کرنے والا ہے پیغمبر اکرم مفعول اول ہیں اور قرآن مفعول دوم ہے۔ یہاں پر چونکہ فعل مجہول کی صورت میں آیا ہے لہٰذا پہلا مفعول نائب فاعل ہے اور دوسرا مفعول ظاہری طور پر ذکر ہوا ہے۔

ر کچھ نہیں ہیں۔

وہ بے لگامی اور بے مہاری کو "آزادی" کی علامت،
عورتوں کی عریانی اور فحاشی کو "تہذیب" کا نشان،
مقابلۂ حسن کو "شخصیت" کی علامت،
مختلف گناہوں میں آلودگی کو "حریت" کی نشانی،
آدم کشی، جرائم کے ارتکاب اور تباہ کاری کو "طاقت" کی دلیل،
تخریب کاری اور دوسروں کے سرمایے کی لوٹ مار کو "نوآبادیات"،
ذرائع ابلاغ کو فحاشی اور اخلاق باختگی میں استعمال کرنے کو "احترام آدمیت"،
مظلوموں کے حقوق کی پائمالی کو "انسانی حقوق کا احترام"،
نشے کی عادت ڈالنے، ہوا وہوس اور ننگ ورسوائی میں مبتلا کرنے کو "آزادی کی ایک صورت"،
دروغ، ٹھگ بازی اور لوٹ کھسوٹ اور ہر جائز وناجائز ذریعے سے دوسروں کے مال وثروت
کے اصول کو "استعداد اور صلاحیت کی علامت"،
عدل وانصاف کے اصولوں کی پابندی اور دوسروں کے حقوق کے احترام کو "نااہلی اور نالائقی کی علامت"،
جھوٹ، وعدہ خلافی، دورنگی اور فریب کاری کو "سیاست" قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ بُرے اور باعث ننگ وعار کاموں کو ان کی نظروں میں اس حد تک بنا سجا کر پیش کیا گیا ہے کہ یہی نہیں کہ وہ
اس سے شرم محسوس نہیں کرتے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے ہیں۔ جب صورت حال ایسی ہو تو واضح ہے کہ ایسی دنیا کا چہرہ مہرہ کیسا ہونا چاہیے
اور یہ بھی معلوم ہے کہ جو راستہ وہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہاں کو جا رہا ہے؟

۷۔ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّىْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ
بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ○
۸۔ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِىَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِى النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
۹۔ يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○
۱۰۔ وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ
يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۚ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ○
۱۱۔ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
۱۲۔ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۚ فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ
اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○
۱۳۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○
۱۴۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ○

ترجمہ

۷۔ اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا: مجھے دُور سے آگ دکھائی دے رہی ہے (تم یہیں ٹھہرو) میں ابھی تمھارے لیے کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا شعلہ تاکہ تم اسے تاپ سکو۔
۸۔ جب وہ آگ کے نزدیک پہنچے تو ایک آواز سنائی دی کہ بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو اس کے اطراف میں ہے اور پاک و منزہ ہے وہ اللہ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

۹۔ اے موسیٰ! میں عزیز و حکیم اللہ ہوں۔
۱۰۔ تم اپنا عصا پھینک دو، جب اسے دیکھا تو وہ (جلدی کے ساتھ) چھوٹے چھوٹے سانپوں کی مانند اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے (تو وہ گھبرا گئے اور) واپس مُڑے اور پلٹ کر بھی نہ دیکھا، اے موسیٰ! ڈرو نہیں کہ رسول میرے حضور ڈرا نہیں کرتے۔
۱۱۔ مگر یہ کہ کسی نے ظلم کیا ہو اور پھر وہ برائی کو نیکی میں تبدیل کرے۔ تو (میں اس کی توبہ کو قبول کرتا ہوں اور) میں غفور و رحیم ہوں۔
۱۲۔ اور اپنا ہاتھ ذرا اپنے گریبان میں ڈالو، جب باہر نکلے گا تو چمکدار اور روشن ہوگا اور اس میں کوئی عیب نہیں ہوگا اور یہ ان نو معجزوں میں سے ہے جن کے ساتھ تم فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جاؤ گے، وہ فاسق اور سرکش لوگ ہیں۔
۱۳۔ اور جب ہماری روشنی عطا کرنے والی آیات ان کے پاس آئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے
۱۴۔ اور ظلم و تکبر کی بناء پر ان کا انکار کیا حالانکہ دل میں ان کا یقین رکھتے تھے۔ پس (اے رسولؐ) دیکھو کہ آخر مفسدوں کا انجام کیا ہوا۔

تفسیر

موسیٰؑ آگ کے شعلے کی امید لے کر آئے

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس سُورت میں قرآن مجید کی اہمیت کو بیان کرنے کے بعد خدا کے پانچ عظیم انبیاء اور ان کی اقوام کے حالات کا تذکرہ ہے جن میں مومنین کی کامیابی اور کافروں کی سزا کا واضح طور پر دعدہ موجود ہے۔
سب سے پہلے خدا کے ایک اولوالعزم نبی جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان کیے گئے ہیں اور براہِ راست ان کی زندگی کے نہایت حساس لمحات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ بات اس لمحے سے شروع ہوتی ہے جب وحی کی پہلی کرن ان کے دل پر پڑی اور وہ خداوندِ عالم کے پیغام اور کلام سے آشنا ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کیجیے جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا: مجھے دُور سے آگ دکھائی دی ہے (اذ قال موسیٰ لاھلہ انی اٰنست نارًا)[1]
"تم یہیں پر ٹھہر جاؤ! میں ابھی تمھارے لیے کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا شعلہ تاکہ تم اسے تاپ سکو (ساٰتیکم

[1] "اٰنست" "ایناس" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو آرام و اطمینان سے دیکھنا اور انسان کو انسان بھی اسی معنی میں کہا جاتا ہے۔

منہ بخبر او اتیکم بشھاب قبس لعلکم تصطلون)[1]

اور یہ اس رات کا واقعہ ہے جب جناب موسیٰ علیہ السّلام اپنی زوجہ دختر شعیب کے ہمراہ مصر جا رہے تھے تو راستے میں ایک بیابان تاریک میں پھنس گئے اور انھیں رات پڑ گئی، راستہ کھو بیٹھے اور طوفانی ہوائیں چلنے لگیں پھر یہ کہ اسی وقت ان کی بیوی کو وضع حمل کی تکلیف شروع ہو گئی۔ جناب موسیٰ نے سردی دُور کرنے کے لیے آگ کی بہت ضرورت محسوس کی لیکن اس بیابان میں کچھ بھی نہیں تھا اچانک انھیں دُور سے آگ کا شعلہ نظر آیا تو بہت خوش ہوئے اور اسے انسانوں کی موجودگی کی دلیل سمجھا انھوں نے کہا میں جاتا ہوں یا تو تمھارے لیے کوئی خبر لاؤں گا یا پھر آگ کا شعلہ جسے تم تاپ سکو۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ موسیٰ فرماتے ہیں میں "تمھارے لیے کوئی خبر لاؤں گا یا آگ کا شعلہ ("تمھارے لیے" جمع کی ضمیر ہے) ہو سکتا ہے یہ اس لیے ہو کہ آپ کی بیوی کے علاوہ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی بچہ یا بچے ہوں کیونکہ مدین میں آپ کی شادی کو دس سال گزر چکے تھے یا پھر اس لیے کہ بیابان میں اس قسم کی گفتگو مخاطب کے بیشتر اطمینان اور سکون کا باعث بنتی ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے اہلِ خاندان کو وہیں پہ چھوڑا اور اس طرف کو چل دیئے جدھر آگ جلتی دکھی تھی جب اس کے نزدیک پہنچے تو آواز آئی بابرکت ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اطراف میں ہے اور پاک و منزہ ہے وہ اللہ جو عالمین کا پروردگار ہے (فلما جاء ھا نودی ان بورك من فی النّار ومن حولھا وسبحان اللہ ربّ العالمین)۔

"جو اس آگ میں ہے" اور "جو اس کے اطراف میں ہے" سے کون مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں کئی احتمال پیش کیے ہیں ان میں سے جو احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "جو آگ میں ہے" سے مراد جناب موسیٰ ہیں کیونکہ آگ کے وہ شعلے جو سبز درخت کے درمیان سے ظاہر ہو رہے تھے موسیٰ علیہ السّلام سے اس قدر نزدیک تھے کہ گویا وہ خود اس کے اندر تھے اور "جو اس کے اطراف میں ہے" سے مراد خداوند عالم کے مقرّب فرشتے ہیں جو اس خاص لمحے اس مقدس سرزمین کو گھیرے ہوئے تھے۔ یا پھر اس کے برعکس یعنی جو آگ میں ہیں سے مراد فرشتے ہیں اور جو اطراف میں ہے سے مراد موسیٰ علیہ السّلام ہیں۔

بہرحال بعض روایات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السّلام آگ کے نزدیک پہنچے تو رک گئے اور خوب غور سے دیکھنے لگے تو نظر آیا کہ درخت کی سبز ٹہنی سے شعلۂ آتش بھڑک رہا ہے جوں جوں یہ شعلہ بڑھتا جا رہا ہے، سبز درخت مزید روشن اور خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔ نہ تو آگ کی حرارت درخت کو جلاتی ہے اور نہ ہی درخت کی رطوبت آگ کو بجھاتی ہے یہ منظر دیکھ کر وہ تعجب کرنے لگے۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹہنی لیے ہوئے تھے وہاں سے آگ لینے کی غرض سے جھکے تو آگ خود بخود ان کی طرف آنے لگی،

---

[1] "شہاب" اس روشنی کے معنی میں ہے جو آگ کے ستون کی مانند چمکتی ہے اور جس روشنی میں بھی ستون کی مانند چمک ہو اسے "شہاب" کہا جاتا ہے اور دراصل شہاب ان سرگرداں آسمانی پتھروں کو کہا جاتا ہے جو اطرافِ زمین میں پائی جانے والی ہواؤں سے نہایت تیزی کے ساتھ ٹکراتے ہیں تو ان سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور فضا میں آگ کا ستون بنا دیتے ہیں۔

"قبس" (قفس کے وزن پر) آگ کے اس شعلے کو کہتے ہیں جو آگ سے الگ کیا جاتا ہے۔

"تصطلون" "اصطلاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنی آگ تاپنا ہے۔

پیچھے ہٹے کبھی وہ آگ کی طرف بڑھتے اور کبھی آگ ان کی طرف لپکتی کہ اسی اثناء میں ایک اور آواز آئی اور انھیں وحی کی بشارت دی گئی۔

مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام آگ سے اس قدر نزدیک تھے کہ "من فی النار" کے جملے کا مصداق بن گئے۔

تیسری تفسیر جو اس جملہ کی بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "من فی النار" سے مراد خدا کا نور ہے جو آگ کے شعلے میں جلوہ نمائی کر رہا تھا اور "من حولھا" سے مراد جناب موسیٰ علیہ السّلام ہیں جو اس شعلے کے نزدیک موجود تھے اور تمام صورتوں میں خدا کے بارے میں "جسم" ہونے کے تصوّر اور توہم کو دُور کرنے کے لیے آیت کے آخر میں "سبحان اللہ رب العلمین" کا جملہ لایا گیا ہے جو خدا کے ہر قسم کے عیب و نقص، جسم و جسمانیت اور جسمانی عوارض سے مبرا، منزّہ اور پاک ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک بار پھر آواز بلند ہوئی اور موسیٰ کو مخاطب کر کے کہا: اے موسیٰ! میں عزیز اور حکیم اللہ ہوں (یاموسٰی انہ انا اللہ العزیز الحکیم)۔

یہ جملہ اس لیے تھا تاکہ موسیٰ علیہ السّلام سے ہر قسم کا شک و شبہ دُور کیا جا سکے اور وہ جان لیں کہ یہ خداوندِ عالم ہی ہے جو ان سے مخاطب ہے نہ کہ آگ کا شعلہ یا درخت۔ وہ خدا جو "ناقابلِ شکست" اور "صاحب حکمت و تدبیر" ہے۔

یہ تعبیر درحقیقت اس معجزے کے لیے مقدمہ کے طور پر ہے جو بعد والی آیت میں بیان ہو گا۔ کیونکہ اعجاز بھی پروردگارِ عالم کی ان دو صفات کی وجہ سے منصۂ شہود پر آتا ہے۔ ایک قدرت اور دوسری حکمت۔ لیکن بعد والی آیت تک پہنچنے سے پہلے یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کو کیسے یقین پیدا ہوا کہ یہ خدائی ندا ہے، غیر خدا کی آواز نہیں؟

تو اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس آواز کے ساتھ ایک روشن معجزہ بھی تو ہے اور وہ ہے سبز درخت کی ٹہنیوں میں سے آگ کے شعلے کا بلند ہونا، جو اس بات کا زندہ گواہ تھا کہ یہ ایک خدائی امر ہے۔

اس کے علاوہ اگلی آیت میں دیکھیں گے کہ اس آواز کے فوراً بعد موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے جس کے تحت وہ عصا اور ید بیضا کا معجزہ حاصل کرتے ہیں اور یہ دو سچے گواہ تھے اس آواز کی حقانیت اور صداقت پر۔

ان سب سے قطع نظر قاعدہ کے مطابق خدائی آواز کی اپنی خصوصیت ہوتی ہے جو اسے تمام دوسری آوازوں سے ممتاز کرتی ہے اور جب انسان اسے سنتا ہے تو اس کے قلب و روح پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ اس کے ندائے الٰہی ہونے میں ذرّہ بھر بھی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

چونکہ رسالت کے امور بجالانے کے لیے ظاہری قدرت و طاقت اور حقانیّت کی سند کی ضرورت ہوتی ہے خاص کر جب امور رسالت کی ادائیگی فرعون جیسے ظالم اور جابر شخص کے سامنے ہو تو اس مقام پہ حکم ہوتا ہے: اپنا عصا زمین پر پھینکو (والق عصاك)۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر دے مارا تو اچانک وہ بہت بڑا سانپ بن گیا" جب موسیٰ علیہ السلام نے اس پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے تو ڈر کر واپس ہوئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا

(فلما راٰھا تھتز کانھا جآن ولّٰی مدبرًا ولم یعقب)[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ عصا پہلے تو چھوٹے سے سانپ میں تبدیل ہوا ہو پھر مختلف مراحل کے بعد بہت بڑے اژدہا میں تبدیل ہو گیا ہو۔

یہاں پر ایک بار پھر موسیٰ علیہ السّلام سے خطاب ہوتا ہے : اے موسیٰ ! ڈر نہیں کیونکہ رسول میرے حضور ڈرا نہیں کرتے (یاموسٰی لا تخف انی لایخاف لدی المرسلون)۔

یہ قرب پروردگار کا مقام ہے وہ پروردگار جو قادر و توانا ہے۔ یہ اس کی بارگاہِ امن ہے۔ یہاں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں پر خوف وہراس کا وجود ہی نہیں ہے یعنی اے موسیٰ ! تم عظیم پروردگار کے سامنے ہو اور اس کی ذات کے سامنے ہونے کا خاصہ یہ ہے کہ یہاں پر مطلق امن وسکون ہے۔

اسی طرح کی ایک اور تعبیر سورۂ قصص کی آیت ۳۱ میں بھی ہے :

یاموسٰی اقبل ولا تخف انک من الاٰمنین

اے موسیٰ ! لوٹ جاؤ اور گھبراؤ نہیں کیونکہ تم امن میں آچکے ہو۔

لیکن بعد والی آیت میں" انی لایخاف لدی المرسلون" کے جملے کا استثناء کرتے ہوئے فرمایا ہے مگر جن لوگوں نے ظلم کیا ہے پھر توبہ کر کے اپنے گناہوں کی تلافی کی ہے اور اپنی برائیوں کو نیکی میں تبدیل کر دیا ہے تو میں بھی غفور و رحیم ہوں (الا من ظلم ثم بدل حسنًا بعد سوٓءٍ فانی غفور رحیم)۔

اس استثناء کا پہلے جملے سے کیا ربط ہے ؟ مفسرین کی طرف سے اس میں دو مختلف نظریئے ہیں۔

پہلا تو یہ کہ گزشتہ آیت میں ایک محذوف موجود ہے اور وہ یہ کہ" پیغمبروں کے علاوہ دوسرے لوگ امان میں نہیں ہیں" پھر استثناء کر کے کہتا ہے مگر جن لوگوں نے ظلم وگناہ کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی تو وہ بھی خدا کی حدودِ امن میں داخل ہو جائیں گے۔

دوسرا یہ کہ خود جملہ مذکورہ ہی سے استثناء ہے اور ظلم سے ترکِ اولیٰ کی طرف اشارہ ہے، جو کبھی کبھار انبیاء سے سرزد ہو جاتا ہے اور مقامِ عصمت کے بھی منافی نہیں ہے یعنی اگر انبیاء ترکِ اولیٰ کا ارتکاب کریں تو وہ بھی امن وامان میں نہیں ہیں اور خدا ان کا بھی سخت مواخذہ اور محاسبہ کرتا ہے جیسا کہ جناب آدم اور جناب نوح علیہما السّلام کے بارے میں قرآنی آیات میں مذکور ہے۔

مگر وہ انبیاء جو اپنے ترکِ اولیٰ کی جانب فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اور خداوند کریم کے دامنِ محبت میں پناہ لیتے ہیں اور اپنے اعمالِ صالحہ اور حسنات کے ذریعے اس کی تلافی کرتے ہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السّلام کی داستان میں اس قبطی شخص کے قتل کا

[1] بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ" جان" وہی" جن" ہے جس کا معنی نہ دیکھی جانے والی مخلوق ہے کیونکہ چھوٹے اور باریک سانپ عموماً گھاس پھونس اور زمین کی دراڑوں میں چھپے رہتے ہیں اور اندر ہی اندر چلتے رہتے ہیں۔

تذکرہ آتا ہے جس میں جناب موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے ترکِ اولیٰ کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کی :

رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی

پروردگارا ! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے مجھے بخش دے (قصص / ۱۶)

پھر خدا نے انھیں دوسرا معجزہ دکھایا اور فرمایا اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں لے جاؤ جب وہ نکلے گا تو چمک رہا ہوگا بغیر اس کے کہ اس میں کسی قسم کا عیب ہو (وادخل یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوٓءٍ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سفیدی، برص کی بیماری کی وجہ سے پیدا ہونے والی نہیں بلکہ وہ نورانیت اور روشنی ہے جو بذاتِ خود ایک معجزے اور خارق العادت امر کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السّلام پر مزید مہربانی کے طور پر اور راہِ راست سے انحراف کرنے والوں کے لیے ہدایت کے مزید امکانات کے لیے فرمایا گیا ہے : تمھارے معجزات صرف یہی دو نہیں بلکہ یہ دو ان نو معجزوں میں سے ہیں جنھیں لے کر تم فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جاؤ گے کیونکہ وہ باغی اور فاسق لوگ چلے آرہے ہیں اور انھیں ایسی ہدایت ورہنمائی کی ضرورت ہے جس کے ہمراہ بہت بڑے معجزات ہوں (فی تسع اٰیات الی فرعون وقومہ انھم کانوا قومًا فاسقین)[1]۔

اس آیت کے ظاہر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو معجزے بھی موسیٰ علیہ السّلام کے ان نو مشہور معجزوں میں شامل ہیں، جو اللہ نے انھیں عطا کیے تھے۔ اس کے بارے میں ہم تفصیلی گفتگو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ کے ذیل میں کر چکے ہیں اور یہ واضح کر چکے ہیں کہ دوسرے سات معجزے یہ تھے : طوفان، زرعی آفات، ٹڈی دل، مینڈکوں کی فراوانی اور دریائے نیل کے پانی کا خون کے رنگ میں تبدیل ہو جانا، ان پانچ حوادث میں سے ہر ایک فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک تنبیہ تھی۔ وہ جب بھی ان میں سے کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے تو فوراً موسیٰ علیہ السّلام کے دامن سے وابستہ ہو جاتے تاکہ یہ بلائیں دُور ہوں۔

دوسرے دو معجزات ایک تو" خشک سالی" اور دوسرا" میووں کی قلّت" تھی۔ جن کی طرف سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۰ میں ارشاد موجود ہے کہ :

ولقد اخذنا اٰل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون

ہم نے فرعون والوں کو خشک سالی اور میووں کی قلت میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ سنبھل جائیں۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۷ صفحہ ۱۹ (اُردو ترجمہ) ملاحظہ فرمائیں۔

آخرکار جناب موسیٰ علیہ السّلام معجزے کے نہایت طاقتور ہتھیار سے مسلح ہو کر فرعون اور اس کے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے

[1] "فی تسع اٰیات" میں جار اور مجرور یا تو" اذھب" سے متعلق ہیں یا پھر کسی ایسے عمومی فعل سے جو تقدیری ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ" فی" کا لفظ" مع" کے معنی میں ہو اور" الٰی فرعون" بھی یا اسی مقدر جملے سے متعلق ہے یا پھر ایک اور مقدّر جملے" انت مرسل بھما" سے متعلق ہے۔

اور انھیں دین حق کی طرف دعوت دی، قرآن مجید بعد والی آیت میں فرماتا ہے: جب ہماری روشنی عطا کرنے والی آیات ان کے پاس آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو بالکل کھلا جادو ہے (فلما جاء تهم اٰياتنا مبصرة قالوا هٰذا سحر مبين)۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ تہمت تنہا جناب موسیٰ پر نہیں لگائی گئی بلکہ متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں نے انبیاء کے ساتھ اپنی مخالفت کی توجیہ اور دوسروں کا راستہ روکنے کے لیے تمام انبیاء پر تہمت لگائی اور یہ ان کے مشن کی عظمت کی واضح دلیل ہے۔

جبکہ ہم جانتے ہیں کہ انبیاء کرام خداوندِ عالم کے برگزیدہ، حق طلب اور پارسا بندے تھے اور جادوگر تو منحرف، مادیت پرست اور ٹھگ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ جادوگر ہمیشہ ایسا کام کر سکتے ہیں جو بالکل محدود ہوتا ہے اور انبیاء کے معجزات غیر محدود ہوتے ہیں اور ان کی دعوت کے مطالب اور ان کے تمام پروگرام حق وحقیقت پر مشتمل ہوتے ہیں ان کا اور جادوگروں کا کیا مقابلہ؟

اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے زیرِ نظر آیات کے آخر میں ایک اور اہم انکشاف کیا ہے اور وہ یہ کہ ان کے یہ اتہامات اس لیے نہیں تھے کہ وہ سچ مچ شک و شبہ میں مبتلا تھے بلکہ "انھوں نے ان معجزات کا انکار ظلم اور تکبر کی وجہ سے کیا جبکہ ان کے دل میں مکمل یقین اور اطمینان تھا" (وجحدوا بها و استيقنتها انفسهم ظلمًا و علوًّا)۔

اس تعبیر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان ایک علیحدہ حقیقت ہے اور علم و یقین علیحدہ حقیقتیں! اور یہ بات بالکل ممکن ہے کہ علم و آگاہی کے ہوتے ہوئے بھی انکار سرزد ہوتا رہے۔

دوسرے لفظوں میں ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ "حق کے آگے ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں میں جھک جانا"۔

بنابریں اگر کوئی شخص کسی چیز کے متعلق یقین تو رکھتا ہے لیکن ظاہر یا باطن میں اس کے آگے جھکتا نہیں ہے تو اس پر اس کا ایمان نہیں ہے بلکہ وہ کافر اور منکر ہے اور یہ ایک لمبی بحث ہے جس سے فی الحال ہم انھی اشاروں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں کفر کی پانچ اقسام میں سے ایک کفر جحودی (انکاری کفر) بھی بتائی ہے اور "جحود" کے شعبہ جات میں سے ایک شعبہ یہ بتایا ہے:

هوان يجحد الجاحد و هو يعلم انه حق قد استقر عنده

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا انکار کرے جبکہ وہ جانتا ہو کہ وہ حق ہے اور یہ حق اس کے نزدیک ثابت بھی ہو چکا ہو۔

پھر امام نے اسی آیت کو ثبوت کے لیے تلاوت فرمایا[1]

اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید نے فرعونیوں کے انکار کے اسباب دو بتائے ہیں: ایک ظلم اور دوسرے "بڑا بننے کی خواہش"۔

ممکن ہے کہ "ظلم" سے دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی طرف اشارہ ہو اور "علوًّا" سے مراد ان کی بنی اسرائیل پر

[1] کافی جلد ۲ باب وجوہ الکفر ص ۲۸۷۔

...یت طلبی ہو یعنی وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں تو ان کے غلط مفادات خطرے میں ...جائیں گے اور ساتھ ہی وہ اپنے غلاموں یعنی بنی اسرائیل کی صف میں آکھڑے ہوں گے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک ...ات بھی ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔

یا پھر "ظلم" سے مراد اپنی ذات پر ظلم ہے اور "علوًّا" سے مراد دوسروں پر ظلم ہے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۹ میں آیا ہے:

بما كانوا باٰياتنا يظلمون

اس لیے کہ وہ ہماری آیات پر ظلم کرتے تھے۔

بہرحال اسی آیت کے آخر میں ایک نہایت ہی مختصر مگر جامع فقرے کے ذریعے فرعون اور فرعون والوں کے انجام کو درسِ عبرت کے طور پر بیان کیا گیا ہے ان کے غرق اور نیست و نابود ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: دیکھیے مفسد لوگوں کا کیا انجام ہوا (فانظر كيف كان عاقبة المفسدين)۔

قرآن مجید نے اس مقام پر اس بات سے پردہ نہیں اٹھایا کیونکہ اس قوم کی عبرت ناک کہانی وہ دوسری آیات میں پڑھ چکے تھے اور اس مختصر سے اشارے سے وہ جو کچھ سمجھ سکتے تھے سمجھ لیا۔

ساتھ ہی یہ بھی بتاتے چلیں کہ فرعونیوں کی تمام برائیوں کو لفظ "مفسد" میں جمع کر کے بیان کر دیا گیا ہے کیونکہ ایک تو اس کا مفہوم جامع ہے اور دوسرے عقیدہ اور عمل کی تباہی دونوں اس میں شامل ہیں نیز انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی برائیوں کی طرف اشارہ اس میں موجود ہے۔ لفظ "افساد" میں ان کے تمام اعمال کو اکٹھا کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔

۱۵- وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ وَقَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّنۡ عِبَادِہِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

۱۶- وَوَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ عُلِّمۡنَا مَنۡطِقَ الطَّیۡرِ وَاُوۡتِیۡنَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡفَضۡلُ الۡمُبِیۡنُ ○

ترجمہ

۱۵- ہم نے داؤد اور سلیمان کو اچھا خاصا علم عطا کیا اور انھوں نے کہا اس خدا کے لیے حمد ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ہے۔

۱۶- اور سلیمان، داؤد کے وارث ہوئے اور سلیمانؑ نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی گفتگو کی تعلیم دی جاچکی ہے اور ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے اور یہ ایک کھلم کھلا فضیلت ہے۔

تفسیر

داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حکومت

جناب موسیٰ علیہ السّلام کی داستان کا ایک گوشہ بیان کرنے کے بعد خداوند عظیم انبیاء "داؤد" اور "سلیمان" کے واقعات بیان کرتا ہے البتہ داؤد کے بارے میں ایک اشارہ سا ہے لیکن سلیمان کے بارے میں مفصّل گفتگو ہے۔

ان دو انبیاء کی داستان کا یہ حصہ جناب موسیٰ کی داستان کے بعد اس لیے ذکر ہوا ہے کیونکہ یہ باپ بیٹا بھی بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے ان کی اور دوسرے انبیاء کی تاریخ کا فرق یہ ہے کہ انھوں نے بنی اسرائیل کی فکری اور اجتماعی آمادگی کے پیش نظر ایک عظیم حکومت تشکیل دی اور اسی حکومت کے ذریعے دینِ الٰہی کو وسعت ملی لہٰذا یہاں پر دوسرے انبیاء کی نسبت گفتگو کا انداز بھی کچھ اور ہے۔ دوسرے انبیاء کے بارے میں ہے کہ انھیں اپنی قوم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ بعض کو تو ان کی قوم نے شہر بدر کر دیا لیکن یہاں پر ایسی چیزوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہاں بات بالکل مختلف ہے۔

یہاں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر خداوند عالم کی طرف دعوت دینے والے افراد کو حکومت تشکیل دینے کی توفیق حاصل ہو جائے تو کس قدر مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور کس حد تک حالات سدھر سکتے ہیں؟

بہرحال یہاں پہ علم، قدرت اور عظمت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

جن وانس سمیت تمام مخلوقات کے حکومتِ الٰہیہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا تذکرہ ہے۔

اس کے علاوہ پرندوں کا بھی اس حکومت کے تابع ہونے کا ذکر ہے۔

اور آخر میں منطقی اور مدلّل دعوت کے ذریعے بُت پرستی کے خلاف زبردست معرکے اور پھر حکومت کی طاقت سے صحیح صحیح فائدہ اٹھانے کا تذکرہ ہوگا۔

یہی وہ امتیازات ہیں جو ان دو پیغمبروں کو دوسرے انبیاء سے جُدا کرتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے علم عطا کرنے کے ذکر سے ان انبیاء کی داستان کا ذکر کیا ہے جو کسی صالح اور طاقتور حکومت کا بنیادی عُنصر ہے، فرمایا گیا ہے: ہم نے داؤد اور سلیمان کو اچھا خاصا علم عطا فرمایا۔ (ولقد اٰتینا داؤد و سلیمان علمًا)۔

بعض مفسرین نے یہاں پر اپنے آپ کو خواہ مخواہ زحمت میں ڈالا ہے اور یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس علم سے مراد کون سا علم ہے جو داؤد اور سلیمان کو عطا کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے دوسری آیت کے قرینے سے قضا اور فیصلے کا علم مراد لیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

و اٰتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب

ہم نے داؤد کو حکمت عطا کی اور جھگڑوں کے ختم کرنے کا طریقہ بتایا۔ (ص / ۲۰)

و کلًّا اٰتینا حکمًا و علمًا

ہم نے ان میں سے ہر ایک (داؤد اور سلیمان) کو فیصلے کرنے کی قوت اور علم عطا کیا۔
(انبیاء / ۷۹)

بعض مفسرین نے انھی آیات میں موجود منطق الطیر (پرندوں کی زبان) کے قرینے سے پرندوں کے ساتھ گفتگو کا علم مراد لیا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے قرآنی آیات کے قرینے سے زرہ وغیرہ کے بنانے کا علم مراد لیا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہاں پہ "علم" وسیع معنوں میں ہے جس میں توحید، مذہبی عقائد اور دینی قوانین کا علم بھی شامل ہے اور قضا کا علم بھی بلکہ وہ تمام علوم بھی جو اس طرح کی وسیع اور طاقتور حکومت کے لیے ضروری ہوتے ہیں کیونکہ کسی حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل جو عدل وانصاف کی بنیادوں پر قائم ہو اور آباد و آزاد ہو وہ ایک وسیع اور سرشار علم کے بغیر ناممکن ہے۔ اس طرح سے قرآنِ مجید نے انسانی معاشرے اور حکومت کی تشکیل میں علم کے مقام کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ معاشرے اور حکومت کے لیے اس کی حیثیت عمارت کے بنیادی پتھر کی سی ہے۔

اور اس کے بعد جناب داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السّلام کی زبانی یہ جملہ نقل کیا گیا ہے: اور انھوں نے کہا تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے (وقالا الحمد للہ الذی فضلنا علٰی کثیر من عبادہ المؤمنین)۔

اور یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ "علم" کی عظیم نعمت کے فوراً بعد "شکر" کی بات آئی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہر نعمت کا شکر لازم ہے اور شکر کی حقیقت یہ ہے کہ جس نعمت کو جس کام کے لیے خلق کیا گیا ہے اسے اسی کے لیے استعمال کیا جائے اور خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں نے اپنے خداداد علم سے ایک حکومت الٰہیہ کو منظم کرنے میں بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی آپ کو بتلاتے چلیں کہ انھوں نے اپنی دوسروں پر فضیلت کا معیار "علم" کو قرار دیا ہے نہ کہ اقتدار اور حکومت کو۔ نیز شکر بھی علم کی نعمت عطا ہونے پر ادا کیا ہے کیونکہ اگر کسی کی قدر و قیمت ہے تو علم سے ہے اور ہر قدرت و طاقت علم ہی سے میسر آتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ ایک باایمان قوم پر حکومت کرنے پر شکر ادا کر رہے ہیں کیونکہ فاسد اور بے ایمان لوگوں پر حکومت کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ انھوں نے شکر کے موقع پر یہ کیوں فرمایا ہے کہ خدا نے ہمیں بہت سے مومنین پر فضیلت عطا فرمائی ہے یہ کیوں نہیں فرمایا تمام مومنین پر جبکہ وہ اپنے دور کے تمام لوگوں سے افضل تھے۔

ممکن ہے کہ ان کے یہ الفاظ ادب اور انکساری کے پیشِ نظر ہوں کیونکہ ایسے انسان کبھی بھی اپنے آپ کو تمام دوسروں سے برتر نہیں سمجھتے۔

یا پھر اس لیے کہ انھوں نے کسی خاص زمانے کو مدنظر نہ رکھا ہو بلکہ تمام زمانے ان کے پیشِ نظر ہوں اور معلوم ہے کہ تاریخِ بشریت میں ان سے بھی عظیم کئی انبیاء گزرے ہیں۔

بعد والی آیت میں پہلے، حضرت داؤدؑ سے جناب سلیمانؑ کے وراثت پانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؛ اور سلیمان، داؤد کے وارث ہوئے (وورث سلیمان داؤد)۔

یہاں پر "ارث" سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان مختلف آراء پائی جاتی ہیں:

بعض مفسرین اسے علم و دانش کی میراث سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کی سمجھ کے مطابق انبیاء کی کوئی میراث نہیں ہوتی۔

بعض نے اسے مال اور حکومت کی میراث میں منحصر قرار دیا ہے کیونکہ اس کلمہ سے سب سے پہلے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں۔

بعض نے پرندوں کے ساتھ گفتگو کرنے کے علم کو میراث بتایا ہے (منطق الطیر)۔

لیکن اگر آیت پر توجہ دی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ آیت مطلق ہے اور بعد والے جملوں میں علم کا بیان بھی آیا ہے اور دوسری نعمتوں کا بھی (او تینا من کل شیء) تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم آیت کے مفہوم کو محدود کر دیں۔ لہٰذا جناب سلیمان علیہ السّلام اپنے باپ کی ہر چیز کے وارث بنے۔

جو روایات اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں ان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلبیت علیہم السّلام کے سامنے جو بھی یہ کہتا کہ انبیاء اپنی میراث نہیں چھوڑتے اور "نحن معاشر الانبیاء لا نورث" (ہم انبیاء کا گروہ اپنی کوئی میراث نہیں چھوڑتے) سے استدلال کرتا تو وہ اس کے جواب میں یہی آیت تلاوت فرماتے اور اس سے یہ ثابت کرتے کہ مذکورہ حدیث چونکہ کتابِ خدا کے مخالف ہے لہٰذا قطعًا قابلِ اعتبار نہیں۔

جو حدیث اہلِ بیت سے وارد ہوئی ہے اس میں ہے:

جب ابوبکر نے مصمم ارادہ کر لیا کہ فدک کو جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا سے چھین لے اور یہ بات جناب فاطمہ تک پہنچی تو آپ ابوبکر کے پاس تشریف لے گئیں اور فرمایا:

افی کتاب اللہ ان ترث اباك و لا ارث ابی لقد جئت شیئا فریا، فعلی عمد ترکتم کتاب اللہ و نبذتموہ وراء ظھورکم اذ یقول، وورث سلیمان داؤد

کیا کتابِ خدا میں ہے کہ تم تو اپنے باپ کے وارث بنو لیکن میں اپنے باپ کی وارث نہ بنوں یہ تو عجیب بات ہے!! کیا تم نے کتاب اللہ کو جان بوجھ کر پسِ پشت ڈال دیا ہے؟ جبکہ خدا فرماتا ہے کہ سلیمان داؤد کے وارث بنے[1]

پھر قرآن فرماتا ہے: سلیمان نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی گفتگو کی تعلیم دی گئی ہے (وقال یایھا الناس علمنا منطق الطیر)۔

اور ہمیں سب کچھ دیا گیا ہے، اور یہ واضح اور روشن فضیلت ہے (واوتینا من کل شیء ان ھٰذا لھو الفضل المبین)۔

اگرچہ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ نطق اور بولنے کا لفظ انسان کے علاوہ کسی اور کے لیے صحیح نہیں البتہ مجازی معنی کی اور بات ہے لیکن اگر غیر انسان بھی اپنے منہ سے ایسی آواز اور الفاظ نکالیں جو معانی اور مطالب کو بیان کرتے ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے نطق نہ کہیں، کیونکہ "نطق" ہر وہ لفظ ہوتا ہے جو کسی حقیقت اور مفہوم کو بیان کرتا ہو[2]

البتہ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ مخصوص آوازیں جو بعض جانور غم و غصّے کے وقت یا خوشی کے موقع پر یا درد و غم کے موقع پر یا اپنے بچوں سے پیار کے وقت نکالتے ہیں وہ بھی نطق ہے ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ایسی آوازیں ہیں جو خاص حالت کے ساتھ منہ سے نکلتی ہیں لیکن جیسا کہ آگے چل کر آیات سے مفصل معلوم ہوگا کہ جناب سلیمان علیہ السّلام ہُدہُد کے ساتھ معانی اور مطالب پر مبنی گفتگو کرتے ہیں اس کے ذریعے پیغام بھیجتے اور اسے پیغام کا جواب لانے کا حکم دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات ان آوازوں کے علاوہ جو ان کے حالات بیان کر رہی ہوتی ہیں خداوند عالم کے حکم کے مطابق اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ خاص مواقع پر گفتگو کریں۔ اسی طرح آئندہ آیات میں "چیونٹی" کی گفتگو کے بارے میں

---

[1] کتاب احتجاج طبرسی منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۷۵۔

[2] "ابنِ منظور" کتاب "لسان العرب" میں کہتے ہیں کہ نطق کا معنی گفتگو کرنا ہے۔ پھر کہتے ہیں "وکلام کل شیء منطقہ ومنہ قولہ تعالیٰ علمنا منطق الطیر" ہر چیز کا کلام اس کا نطق ہوتا ہے اور علمنا منطق الطیر والی آیت بھی اسی باب سے ہے پھر وہ علماء ادب میں سے ابن سیدہ سے یہ بات نقل کرتے ہیں (یہ جو کہتے ہیں کہ بات کرنا صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے برخلاف) کبھی غیر انسان کے لیے بھی نطق کا استعمال ہوتا ہے۔
اس نکتے کی طرف بھی توجہ لازمی ہے کہ علمائے منطق اور فلاسفہ کے نزدیک نطق اس قدرت تفکر کو کہتے ہیں جو انسان کو بولنے کی طاقت عطا کرتی ہے۔

بھی بحث ہوگی۔

البتہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر نطق اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جو "نطق" کی روح اور نتیجہ کی حقیقت کو بیان کرتا ہے اور وہ ہے "مافی الضمیر کا بیان" اور یہ بیان خواہ الفاظ اور گفتگو کی صورت میں ہو یا دوسرے حالات کی صورت میں جیسے یہ آیت ہے:۔

هٰذا کتابنا ینطق علیکم بالحق

یہ ہماری کتاب ہے جو حق بات تمھیں بتاتی ہے۔ (جاثیہ / ۲۹)

لیکن جناب سلیمان کی پرندوں کے ساتھ گفتگو کو اس معنی میں تفسیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حضرت سلیمانؑ مندرجہ بالا آیات کے ظاہر کی رُو سے پرندوں کے خاص الفاظ کو سمجھ سکتے تھے جو وہ اپنا مطلب بیان کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور پرندوں کے ساتھ گفتگو بھی کر سکتے تھے۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل انشاء اللہ چند اہم نکات کے ذیل میں آئے گی۔

"اوتینا من کل شیءٍ" (ہمیں ہر چیز سے عطا کیا گیا ہے) یہ جملہ اس محدودیت کے خلاف ہے جس کے بعض مفسرین قائل ہیں۔ اس کا وسیع مفہوم ہے اور اس میں وہ تمام وسائل شامل ہیں جو مادی اور روحانی لحاظ سے حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اصولاً اس کے بغیر یہ کلام ناقص ہوگا اور گذشتہ آیات کے ساتھ اس کا کوئی واضح تعلق نہیں ہوگا۔

اس مقام پر فخر رازی نے ایک سوال پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ آیا "علمنا" اور "اوتینا" (ہم کو تعلیم دی گئی، ہم کو عطا کیا گیا) متکبرین کا سا کلام نہیں ہے؟

پھر اس کا جواب بھی انھوں نے خود ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں پر جمع کی ضمیر سے مراد خود جناب سلیمانؑ اور ان کے والد ہیں یا خود سلیمانؑ اور ان کے رفقائے حکومت ہیں اور یہ معمول ہے کہ جب کوئی سربراہِ مملکت گفتگو کرتا ہے تو جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **دین اور سیاست:** بعض کوتاہ نظر یہ سمجھتے ہیں کہ دین وعظ و نصیحت یا انسان کی شخصی اور نجی زندگی کے مسائل کا نام ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ دین مجموعہ ہے تمام قوانینِ حیات کا اور ایسا وسیع پروگرام ہے جو تمام انسانی زندگی خصوصاً اس کے اجتماعی مسائل کو اس کے اندر لیے ہوئے ہے۔

انبیاء کو اس لیے بھیجا گیا تاکہ وہ عدل کو قائم کریں۔ (حدید / ۲۵)

دین انسان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور بنی نوع انسان کی آزادی کے تحفظ کے لیے ہے۔

(سورۂ اعراف / ۱۵۷)

دین مستضعفین کو ظالموں کے چنگل سے آزاد کروانے اور ظالموں کا تسلط ختم کرنے کے لیے ہے۔

مختصر یہ کہ دین تزکیہ نفس کی راہ پر تعلیم و تربیت کر کے انسان کامل بنانے کے لیے آیا ہے۔ (جمعہ / ۲)

ظاہر ہے کہ یہ عظیم مقاصد حکومت تشکیل دیئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ کون شخص اخلاقی نصیحتوں کے ذریعے عدل و انصاف کا رواج قائم کر سکتا ہے اور ظالموں کے ہاتھوں کو مظلوموں کے گریبانوں تک جانے سے کون شخص وعظ و نصیحت کے ذریعے روک سکتا ہے؟ کون شخص غلاموں کے ہاتھوں سے غلامی کی زنجیریں طاقت کا سہارا لیے بغیر توڑ سکتا ہے؟

جس معاشرے میں ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈہ مشینری فاسد اور مفسد لوگوں کے ہاتھ میں ہو، وہاں تعلیم و تربیت کے صحیح اصولوں کا نفاذ کون شخص کر سکتا ہے؟ اور کون شخص اخلاقی فضائل کو انسان کے اندر اس کے بغیر پروان چڑھا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے ہم کہتے ہیں کہ "دین" "سیاست" سے جدا نہیں ہے اور یہ دونوں ایسے عناصر ہیں جو ایک دوسرے کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ اگر دین سیاست سے جدا ہو جائے تو دین اپنا انتظامی بازو کھو دے گا۔ اگر سیاست دین سے جدا ہو جائے تو ایک ایسے تخریبی عنصر میں تبدیل ہو جائیگی، جو خود سر لوگوں کے مفادات کی حفاظت کرے گی۔

اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ نے اپنے آسمانی دین کو دنیا بھر میں بڑی تیزی سے متعارف کروایا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ آپؐ نے موقع ملتے ہی ایک حکومت تشکیل دی اور اسی حکومتِ الٰہیہ کے ذریعے آپ نے خدا کے بتائے ہوئے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا۔

اگر کچھ اور انبیاء کو بھی اس قسم کا موقع ملا تو انھوں نے بھی بہتر انداز میں دعوتِ حقہ پیش کی لیکن جو انبیاء مشکلات میں گھرے ہوئے تھے اور حالات نے انھیں حکومت تشکیل دینے کی اجازت نہیں دی تو وہ اپنی دعوت کو اس انداز میں پیش کر کے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

۲۔ **نظامِ حکومتِ الٰہیہ:** کتنی جاذبِ نظر بات یہ ہے کہ جناب سلیمانؑ و داؤدؑ نے شرک اور بُت پرستی کے آثار کا بہت جلد خاتمہ کر کے نظامِ الٰہی کا نفاذ کر دیا۔ ایک ایسا نظام جس کا اصلی اور بنیادی عنصر علم و دانش اور مختلف شعبوں میں آگاہی ہے۔

ایسا نظام جس کے تمام پروگراموں اور منصوبوں میں "خدا" کا نام سرفہرست ہے۔

ایسا نظام جس میں تمام لائق عناصر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مقصد کے حصول کے لیے ایک پرندے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

ایسا نظام جس میں دیوؤں کو مقید کر دیا گیا اور ظالموں کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔

مختصر یہ، ایسا نظام جس کے پاس فوجی طاقت بھی بہت حد تک تھی اور جاسوسی کے ذرائع بھی کافی تھے جو لوگ اقتصادیات اور پیداوار کے مختلف امور میں مہارت یا کافی حد تک واقفیت رکھتے تھے ان سب کو ایمان اور توحید کے پرچم تلے جمع کر دیا۔

۳۔ **پرندوں کی بولی:**۔ مندرجہ بالا آیات میں بھی اور آگے چل کر ہُدہُد اور سلیمان علیہ السلام کی داستان کے سلسلے کی آیات میں بھی، پرندوں کی گفتگو اور اس کے ادراک کے بارے میں واضح اشارہ موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ——— دوسرے جانوروں کی مانند ——— پرندے بھی مختلف حالات میں مختلف آوازیں

نکالتے ہیں کہ اگر غور و خوض سے کام لیا جائے تو ان کی آوازوں سے ان کی مختلف کیفیتوں کا پتہ چلایا جاسکتا ہے کہ کون سی آواز غصّے کی ہے اور کون سی خوشی کی، کس آواز سے ان کی بھوک کا پتہ چلایا جاسکتا ہے، کس سے ان کی تمنّا کا، کس آواز سے وہ اپنے بچّوں کو بلاتے ہیں اور کس سے وہ انھیں دہشت ناک حادثے کی خبر دیتے ہیں ۔

اس حد تک تو پرندوں کی آواز میں کسی کو شک و شبہ نہیں اور ہم میں سے ہر ایک کم و بیش اس چیز سے آگاہ ہے ۔

لیکن اس سورت کی آیات ظاہراً اس سے بڑھ کر کچھ اور مطلب بیان کرتی ہیں۔ یہاں ان کے خاص انداز سے گفتگو کرنے کا ذکر ہے جس میں عجیب و غریب مطالب بیان ہوئے ہیں۔ ایک انسان کے ساتھ ان کے افہام و تفہیم کی بات کی گئی ہے اگرچہ یہ چیز بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ان مطالب کی طرف توجّہ کی جائے جسے پرندوں کے بارے میں ماہرین نے اپنی کتابوں میں تحریر کیا ہے اور اسی طرح جو چیزیں بعض لوگوں کے ذاتی مشاہدے میں آئی ہیں انھیں دیکھا جائے تو یہ بات قطعاً عجیب معلوم نہیں ہوگی ۔

ہم تو جانوروں خاص کر پرندوں کی فہم اور سمجھ کے بارے میں بھی اس سے بھی بڑھ کر عجیب و غریب معلومات رکھتے ہیں ۔

بعض جانور اور پرندے ایسے ہوتے ہیں جو اپنا گھر یا گھونسلا بنانے میں اس قدر ماہر ہیں کہ بعض مواقع پر ماہر انجینئروں پر بھی بازی لے جاتے ہیں۔

بعض پرندے اپنے آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کے مستقبل کے بارے میں اور ان کی ضروریات اور مشکلات کے سلسلے میں اس حد تک باخبر ہوتے ہیں اور ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے اس قدر کوشش کرتے ہیں کہ ہم سب کے لیے باعثِ حیرت ہے ۔

ان کی موسم کے بارے میں پیش گوئی حتیٰ کہ بعض اوقات تو وہ کئی ماہ پہلے ہی موسم کا اندازہ لگا لیتے ہیں ۔ ایسے پرندے بھی ہیں جو زلزلوں کی قبل از وقت اطلاع دے دیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ خفیف ترین جھٹکوں کی اطلاع دینے والے آلات سے بھی بہت پہلے بتا دیتے ہیں ۔

دورِ حاضر میں حیوانات کو سدھا کر سرکسوں میں ان سے جو کام لیے جاتے ہیں انھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ وہاں پر واقعتاً محیّر العقول کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔

"چیونٹیوں" کے حیرت ناک کارنامے اور ان کا حیران کن تمدّن !

"شہد کی مکھیوں" کے عجائبات زندگی اور ان کی حیرت انگیز سراغ رسانی !

"مہاجر پرندوں" کی عجیب و غریب معلومات اور اس قدر عظیم سفر کے درمیانی راستے سے باخبری کہ جن کی وجہ سے وہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کا درمیانی لیکن بہت طولانی فاصلہ طے کر لیتے ہیں ۔

سمندروں کی گہرائیوں کے بارے میں "آزاد مچھلیوں" کی بہت زیادہ معلومات کہ جن کے ذریعے وہ اجتماعی صورت میں سارا سال مختلف سمندروں میں گھومتی پھرتی ہیں، عمومی طور پر ایسے مسائل ہیں جو علمی لحاظ سے مسلّم ہیں اور ان کے ادراک یا جبلّت یا اسے جو بھی نام دیں پر بیّن دلیل ہے ۔

بعض جانوروں کے بعض حواس قوی ہوتے ہیں جیسے چمگادڑ میں راڈار جیسی مشینری ہوتی ہے یا بعض حشرات کی قوتِ شامّہ بہت تیز ہوتی ہے، بعض پرندوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں ۔ یہ سب چیزیں بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ حیوانات وغیرہ تمام چیزوں میں ہم سے زیادہ پسماندہ نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مخصوص انداز میں گفتگو بھی کر سکتے ہیں اور جو ان کی گفتگو کے الفاظ اور طریقے سے واقف ہیں ان سے ہم کلام ہو سکتے ہیں ۔

قرآنی آیات میں بھی مختلف عنوانات کے تحت اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۳۸ میں ہے :

وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم

روئے زمین پر ایسا کوئی حرکت کرنے والا جانور اور اپنے دو پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جن کی تم جیسی امتیں نہ ہوں [1]

روایات میں بھی بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو جانوروں، خاص کر پرندوں کی گفتگو پر دلالت کرتی ہیں حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک کی زبان کو نعروں کی طرح کی بولی بتایا گیا ہے ۔ اگر اس کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی [2]

ایک روایت میں ہے کہ جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام نے عبداللہ بن عباس سے فرمایا :

ان اللہ علمنا منطق الطیر کما علم سلیمان بن داؤد، ومنطق کل دابۃ فی برّ و بحر

خداوندِ عالم نے ہمیں پرندوں کی بولی کی بھی تعلیم دی ہے جس طرح سلیمان بن داؤد کو تعلیم دی تھی اور خشکی اور تری میں چلنے والی ہر مخلوق کی بولی بھی سکھائی ہے [3]

۴۔ "لا وارث" حدیث :۔ اہلِ سنت کی مختلف کتابوں میں پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی طرف منسوب ایک حدیث موجود ہے جو اس طرح سے مضمون پر مشتمل ہے ۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ

ہم پیغمبر لوگ اپنی میراث نہیں چھوڑتے جو ہم سے رہ جائے اسے راہِ خدا میں صدقے کے طور پر خرچ کر دیا جائے ۔

اور بعض کتابوں میں " لا نورث " کا جملہ نہیں ہے بلکہ " ماترکناہ صدقۃ " کی صورت میں نقل کیا گیا ہے اس روایت کی سند عام طور پر ابو بکر تک جا کر ختم ہو جاتی ہے جنھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بعد مسلمانوں کی زمام امور

---

[1] سورہ انعام کی آیت ۳۸ کے ذیل میں ایک اور تفصیلی گفتگو بھی ہے ۔ (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۳)

[2] انھی آیات کے ذیل میں مزید معلومات کے لیے "تفسیر قرطبی" کا مطالعہ فرمائیے اور تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ،، کی طرف رجوع فرمائیں ۔

[3] مذکورہ حوالہ ۔

اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ اور جب حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا یا پیغمبر اکرمؐ کی بعض بیویوں نے ان سے پیغمبرؐ کی میراث کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اس حدیث کا سہارا لے کر انھیں میراث سے محروم کر دیا۔

اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح (جلد ۳ کتاب الجهاد والسیر ص ۱۳۷۹) میں بخاری نے جزو ہشتم کتاب الفرائض کے صفحہ [illegible] اور اسی طرح بعض دیگر افراد نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ کتابوں میں سے بخاری میں بی بی عائشہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے:

فاطمہ زہرا علیہا السّلام اور جناب عباس بن عبدالمطلب (رسول اللہ کی وفات کے بعد) ابوبکر کے پاس آئے اور ان سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔ اس وقت انھوں نے اپنی فدک کی اراضی اور خیبر سے ملنے والی میراث کا مطالبہ کیا تو ابوبکر نے کہا کہ میں نے رسولِ خدا (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: "ہم میراث میں کوئی چیز نہیں چھوڑ جاتے، جو کچھ ہم سے رہ جائے وہ صدقہ ہوتا ہے"۔

جناب فاطمہ زہراؑ نے جب یہ سنا تو ناراض ہو کر وہاں سے واپس آگئیں اور مرتے دم تک ان سے بات نہیں کی[1]

البتہ یہ حدیث مختلف لحاظ سے تجزیہ و تحلیل کے قابل ہے لیکن اس تفسیر میں ہم چند ایک نکات بیان کریں گے:

۱۔ یہ حدیث، قرآنی متن کے مخالف ہے اور اس اصول اور کلیہ قاعدہ کی رُو سے ناقابلِ اعتبار ہے کہ جو بھی حدیث کتاب اللہ کے مطابق نہ ہو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور ایسی حدیث کو پیغمبر اسلامؐ یا دیگر معصومین علیہم السّلام کا قول سمجھ کر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام جناب داؤد علیہ السّلام کے وارث بنے اور آیت کا ظاہر مطلق ہے کہ جس میں اموال بھی شامل ہیں۔ جناب یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السّلام کے بارے میں ہے:

یرثنی و یرث من اٰل یعقوب

خداوندا! مجھے ایسا فرزند عطا فرما جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث بنے۔ (مریم / ۶)

حضرت "زکریا" کے بارے میں تو بہت سے مفسرین نے مالی وراثت پر زور دیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں "وراثت" کی آیات کا ظاہر بھی عمومی ہے کہ جو بلا استثناء سب کے لیے ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اہلِ سنت کے مشہور عالم علامہ قرطبی نے مجبور ہو کر اس حدیث کو غالب اور اکثر فعل کی حیثیت سے قبول کیا ہے نہ کہ عمومی کلیے کے طور پر، اور اس کے لیے یہ مثال دی ہے کہ عرب ایک جملہ کہتے ہیں:

(انا معشر العرب اقری الناس للضیف)

[1] صحیح بخاری جزو ۸ ص ۱۸۵۔

ہم عرب لوگ دوسرے تمام افراد سے بڑھ کر مہمان نواز ہیں (حالانکہ یہ کوئی عمومی حکم نہیں ہے)[1]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اس حدیث کی اہمیت کی نفی کر رہی ہے کیونکہ حضرت سلیمان اور حضرت یحییٰ کے بارے میں اس قسم کا [illegible] قبول کر لیں تو پھر دوسرے کے لیے بھی یہ قطعی نہیں رہ جاتی۔

۲۔ مندرجہ بالا روایت ان دوسری روایات کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر نے جناب فاطمہ زہرا کو فدک [illegible]پس لوٹانے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا لیکن دوسرے لوگ اس میں حائل ہو گئے تھے چنانچہ سیرت حلبی میں ہے

فاطمہ بنت رسولؐ، ابوبکر کے پاس اس وقت آئیں جب وہ منبر پر تھے۔ انھوں نے کہا:

اے ابوبکر! کیا یہ چیز قرآنِ مجید میں ہے کہ تمھاری بیٹی تمھاری وراثت لے لیکن میں اپنے باپ کی میراث نہ لوں؟

یہ سن کر ابوبکر رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر وہ منبر سے نیچے اترے اور فدک کی واپسی کا پروانہ فاطمہ کو لکھ دیا۔ اسی اثناء میں عمر آگئے، پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ تحریر لکھ دی ہے تاکہ فاطمہ کو ان کے باپ سے ملنے والی وراثت واپس لوٹا دوں!

عمر نے کہا: اگر آپ یہ کام کریں گے تو پھر دشمنوں کے ساتھ جنگی اخراجات کہاں سے پورے کریں گے؟ جبکہ عربوں نے آپ کے خلاف قیام کیا ہوا ہے۔ یہ کہا اور تحریر لے کر اسے پارہ پارہ کر دیا[2]

یہ کیونکر ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے تو صریحی طور پر ممانعت کی ہو اور ابوبکر اس کی مخالفت کی جرأت کریں؟ اور پھر عمر نے جنگی اخراجات کا تو سہارا لیا لیکن پیغمبر اکرمؐ کی حدیث پیش نہیں کی۔

مندرجہ بالا روایت پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے ممانعت کا سوال نہیں تھا، بلکہ سیاسی مسائل آڑے تھے اور ایسے موقع پر معتزلی عالم ابن ابی الحدید کی گفتگو یاد آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے اپنے استاد علی بن فارقی سے پوچھا کہ کیا فاطمہؑ اپنے دعویٰ میں سچی تھیں؟ تو انھوں نے کہا جی ہاں! پھر میں نے پوچھا تو ابوبکرؓ نے انھیں فدک کیوں نہ دیا، جب کہ وہ انھیں سچا اور برحق بھی سمجھتے تھے۔

اس موقع پر میرے استاد نے معنی خیز تبسم کے ساتھ نہایت ہی لطیف اور پیارا جواب دیا حالانکہ ان کی مذاق کی عادت نہیں تھی، انھوں نے کہا:

لو اعطاها الیوم فدك بمجرد دعواها لجاءت الیه غدًا وادعت لزوجها الخلافة!

و زحزحته عن مقامه ولم یمکنه الاعتذار والموافقة بشیء

[1] تفسیر قرطبی جلد ۷، ص ۴۸۸۰۔

[2] سیرت حلبی جلد ۳ ص ۳۹۱۔

اگر وہ آج انھیں صرف ان کے دعویٰ کی بناء پر ہی فدک دے دیتے تو پھر کل اپنے شوہر کی خلافت
کا دعویٰ دائر کرکے ابوبکر کو ان کے مقام سے متزلزل کر دیتیں تو پھر نہ تو ان کے لیے کسی عذر کی گنجائش
باقی رہتی اور نہ ہی ان سے موافقت کا امکان [1]

٢۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے جسے شیعہ اور سنی میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، حدیث یہ ہے:

العلماء ورثة الانبياء

علماء، انبیاء کے وارث ہوتے ہیں [2]

نیز یہ قول بھی آنحضرتؐ ہی سے منقول ہے:

ان الانبياء لم يورثوا دينارًا ولا درهمًا

انبیاء اپنی میراث میں نہ تو دینار چھوڑتے ہیں اور نہ ہی درہم [3]

ان دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو یہ بات باور کرائیں کہ انبیاء کے لیے سرمایہ افتخار ان کا علم ہے اور اہم ترین چیز جو وہ یادگار کے طور پر چھوڑ جاتے ہیں ان کا ہدایت وراہنمائی کا پروگرام ہے اور جو لوگ علم و دانش سے زیادہ بہرہ مند ہوں گے وہی انبیاء کے اصلی وارث ہوں گے ۔ بجائے اس کے کہ ان کی مال پر نگاہ ہو اور اسے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں، اس کے بعد اس حدیث کو نقل بہ معنی کر دیا گیا اور اس کی غلط تعبیریں کی گئیں اور شاید "ما تركناه صدقة" والے جملے کا بعض روایات میں اس پر اضافہ کر دیا گیا ۔

اس مقام پر ہم اپنی بحث کو اہل سنت کے مشہور مفسر فخر رازی کی اس گفتگو پر ختم کرتے ہیں جو انھوں نے سُورۂ نساء کی آیت ١١ کے ضمن میں کی ہے تاکہ بات زیادہ لمبی نہ ہو جائے ۔ فخر رازی لکھتے ہیں:

"اس آیت (اولاد کی وراثت والی آیت) کی منجملہ اور تخصیصات کے ایک تخصیص وہ چیز ہے، جو اکثر مجتہدین (اہل سنت) کا مذہب ہے کہ انبیائے کرام اپنی وراثت کے طور پر کچھ نہیں چھوڑ جاتے لیکن (عمومی طور پر) شیعوں نے اس بات کی مخالفت کی ہے ۔ روایت میں ہے کہ جب فاطمہ (علیہا السلام) نے اپنی وراثت کا مطالبہ کیا تو ان لوگوں نے اس حدیث کے ذریعے انھیں اپنی وراثت سے محروم کر دیا کہ "نحن معاشر الانبياء لا نورث ما تركناه صدقة" یعنی ہم پیغمبر لوگ کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں صدقہ ہوتا ہے ۔

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید جلد ١٦ ص ٢٨٤۔
[2] صحیح ترمذی باب العلم حدیث ١٩ و سنن ابن ماجہ مقدمہ حدیث ١٧۔
[3] اصول کافی جلد اول باب صفۃ العلم حدیث ٢۔

تو اس موقع پر جناب فاطمہ نے (اولاد کی وراثت والی) عمومی آیت سے استدلال پیش کیا
گویا وہ اس طرح سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں کہ قرآن کے عمومی حکم کو خبر واحد کے
ساتھ محدود نہیں کیا جا سکتا ۔
فخر رازی آگے کہتے ہیں کہ شیعہ کہتے ہیں کہ:
بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ قرآن کو خبر واحد کے ذریعے محدود کیا جا سکتا ہے تو یہاں پر تین
دلیلوں کی وجہ سے تخصیص جائز نہیں ۔
پہلی یہ کہ: ۔ قرآن مجید واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ زکریا نے خدا سے درخواست کی کہ وہ انھیں
ایسا فرزند عطا کرے جو ان کا اور آل یعقوب کا وارث بنے اسی طرح قرآن ایک اور مقام پر کہتا
ہے کہ سلیمان نے داؤد سے وراثت پائی ۔ چونکہ ان آیات کو علم اور دین جیسی وراثت پر لاگو نہیں
کیا جا سکتا کیونکہ اس قسم کی وراثت مجازی وراثت کہلاتی ہے اس لیے کہ ان انبیاء نے اپنی اولاد
کو علم اور دین کی تعلیم دی نہ یہ کہ یہ چیزیں وراثت کے طور پر حاصل کر کے اپنی اولاد کو ان کا
وارث بنا دیا ۔
وراثت حقیقی صرف اور صرف مال ہی میں تصوّر کی جا سکتی ہے (جو کسی سے حاصل کیا جائے اور
دوسروں کو دیا جائے) ۔
دوسری بات یہ ہے کہ: ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس مسئلہ کی ابوبکر کو ضرورت ہی نہیں تھی اس
سے تو وہ آگاہ ہوں لیکن فاطمہ، علی اور عباس جو عظیم ترین زاہد اور عالم تھے اور پیغمبر اسلام کی
وراثت سے بھی انھیں سروکار تھا، اس سے بالکل بے خبر ہوں ۔
یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام یہ حدیث اس شخص کو تو تعلیم دیں جسے ضرورت نہ ہو اور ان سے مخفی
رکھیں جنھیں اس کی ضرورت ہو ۔
تیسری بات یہ ہے کہ: ۔ "ماتركناه صدقة" والا جملہ "لا نورث" کے
بعد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن اموال کو ہم نے صدقہ قرار دیا ہے وہ میراث کے دائرہ
میں نہیں آتے کیونکہ وہ صدقہ کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں نہ کہ تمام اموال!
پھر فخر رازی مذکورہ بالا مشہور استدلالات کا مختصر سا جواب ۔ دیتے ہوئے کہتے ہیں:
فاطمہ زہراؑ نے جب ابوبکر کے ساتھ بات چیت کی تو اس پر راضی ہو گئیں ۔
اس کے علاوہ اجماع بھی اس بات پر ہے کہ ابوبکر کی بات صحیح تھی [1]

[1] تفسیر فخر رازی جلد ٩ ص ٢١٠۔

لیکن ظاہر ہے کہ فخر رازی کا یہ استدلال قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی ابھی اہل سنت کی مشہور اور معتبر کتابوں سے ثابت کر آئے ہیں کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام نہ صرف یہ کہ ابوبکر سے راضی نہیں ہوئیں بلکہ اس قدر ان پر ناراض ہوئیں کہ مرتے دم تک ان سے گفتگو نہیں کی۔

اس سے قطع نظر، یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ایسے مسئلہ پر اجماع قائم ہو جائے جس میں وحی کے زیر سایہ تربیت پانے والے افراد علی و زہرا علیہما السلام اور جناب عباس جیسی شخصیتیں نہ صرف شریک ہی نہیں بلکہ مخالف بھی ہیں۔

۱۷۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○

۱۸۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

۱۹۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰى وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ○

ترجمہ

۱۷۔ سلیمان کے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر ان کے پاس جمع ہوئے اور وہ اس قدر زیادہ تھے کہ آپس میں ملحق ہونے کے لیے انھیں توقف کرنا پڑتا۔

۱۸۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ چیونٹیوں کی سرزمین کی طرف آنکلے تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو! تم اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں بے خبری میں روند نہ ڈالے۔

۱۹۔ (سلیمان) اس کی بات پر مسکرا دیئے اور ہنس کر کہا: پروردگارا! جو نعمتیں تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں مجھے ان کے شکر کی توفیق عطا فرما اور مجھے توفیق دے کہ میں وہ عمل صالح انجام دوں جو تیری رضا کا سبب بنے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کے زمرے میں داخل فرما۔

تفسیر

حضرت سلیمانؑ وادی نمل میں

اس سورت کی اور سورہ سبا کی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان کی داستانِ حکومت کوئی عام سا

واقعہ نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف قسم کی غیر معمولی باتیں ہیں اور بہت سے معجزات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اسی
میں بیان ہوئے ہیں: مثلاً جناب سلیمانؑ کا جنوں اور پرندوں پر حکومت کرنا، چیونٹیوں کا کلام سمجھ لینا اور ہُدہُد سے ہم کلام
اسی طرح کچھ واقعات سورہ سبا میں بیان ہوئے ہیں۔

درحقیقت خداوند عالم نے ایسی عظیم حکومت کے قیام اور اتنی عظیم طاقتیں جناب سلیمانؑ کے لیے مسخر کرکے اپنی قدرت
مظاہرہ فرمایا ہے اور ایک موحد انسان کے نزدیک قدرت خدا کے آگے یہ کام بالکل آسان ہے۔

انھی آیات میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: سلیمان کے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر ان کے پاس جمع ہو
(وحشر لسلیمان جنوده من الجن والانس والطیر)۔

لشکر والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے حکم دیا جاتا تاکہ "اگلی صفوں کو روکے رکھیں اور پچھلی صفوں کو چلاتے رہیں تاکہ سب مل کر حرکت کریں (فهم یوزعون)۔

"یوزعون" "وزع" (بروزن "جمع") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے روکنا۔ اور جب اس کا اطلاق فوج اور لشکر وغیرہ پر ہو تو اس کا مطلب ہے کہ لشکر کے اگلے حصے کو روکے رکھیں تاکہ پچھلے حصے کے فوجی بھی اس کے ساتھ آملیں، اور افتراق و بدنظمی پیدا نہ ہو۔

"وزع" "کسی چیز کے بارے میں لالچ کرنے اور اس کے ساتھ ایسا زبردست تعلق پیدا کرنے کے معنی میں ہے جو انسان کو دوسرے کاموں سے روک دے۔

اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمان کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا اور خاص نظم و ضبط کے تحت حرکت کرتا تھا۔

"حشر" "حشر" (بروزن "نشر") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کثیر تعداد کے افراد کو اپنے ٹھکانوں سے نکال کر میدان جنگ وغیرہ کی طرف لے چلنا۔ اس سے اور اسی طرح بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے کسی علاقے پہ لشکر کشی کی تھی لیکن اس لشکر کشی کی تفصیل واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔ چونکہ بعد والی آیت "وادی نمل" کے بارے میں گفتگو کرتی ہے لہٰذا بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ وہ "وادی النمل" (چیونٹیوں کی سرزمین) طائف کے قریب کا علاقہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ شام کے نزدیک کی سرزمین ہے۔

لیکن چونکہ اس موضوع کے بیان میں کوئی اخلاقی یا تربیتی پہلو نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا آیت میں اس بارے میں مزید گفتگو نہیں ہوئی۔

بعض مفسرین نے اس بارے میں بھی اختلاف کیا ہے کہ کیا تمام جن و انس اور پرندے حضرت سلیمان کے لشکر میں شامل تھے (ایسی صورت میں آیت میں مذکور "من" "بیانیہ ہوگا) یا ان میں سے کچھ افراد لشکر میں شامل تھے (تو ایسی صورت میں "من" "تبعیض" کا ہوگا)۔ یہ ایک اضافی بحث معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس بات میں شک نہیں کہ جناب سلیمان علیہ السلام کی تمام روئے زمین پر حکومت نہیں تھی بلکہ ان کی حکومت میں شام، بیت المقدس اور شاید اس کے اطراف کا کچھ علاقہ شامل تھا۔

حتیٰ کہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں آپ نے یمن کی سرزمین پر بھی تسلط حاصل نہیں کیا تھا بلکہ "ہُدہُد" کے واقعے اور ملکہ سباء کے ایمان لانے کے بعد آپ نے وہاں غلبہ پایا۔

"تفقد الطیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمان کے زیر فرمان پرندوں میں ایک ہُدہُد بھی تھا جب سلیمان علیہ السلام نے اسے غیر حاضر پایا تو اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اگر تمام پرندے ہوتے جن میں ہزاروں کی تعداد میں ہُدہُد بھی ہوتے اور ان میں سے ایک یہ پرندہ بھی تو یہ تعبیر صحیح نہ ہوتی۔ (غور کیجیے گا)

بہرحال جناب سلیمانؑ اس عظیم لشکر کے ساتھ چلے حتیٰ کہ چیونٹیوں کی سرزمین پر پہنچ گئے (حتّٰی اذا اتوا علی واد النمل)۔

یہاں پر چیونٹیوں میں سے ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے مخاطب ہوکر کہا:

"اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ تاکہ سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں بے خبری میں پامال نہ کردے (قالت نملة یا ایها النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنوده وهم لا یشعرون)۔[1]

اس سرزمین میں جناب سلیمانؑ اور ان کے لشکر کی آمد سے چیونٹی کیونکر مطلع ہوئی اور اس نے اپنی آواز دوسری چیونٹیوں تک کیونکر پہنچائی، اس بارے میں تفصیلی گفتگو انشاء اللہ نکات کی بحث میں آئے گی۔

البتہ ضمنی طور پر اس جملے سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ سلیمان کی عدالت چیونٹیوں تک پر آشکار ہو گئی کیونکہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ اس بات کی طرف متوجہ ہوں تو ایک کمزور سی چیونٹی کو بھی پامال کرنا گوارا نہیں کرتے چنانچہ اگر وہ پامال کرتے ہیں تو ان کی اس طرف توجہ نہیں ہوتی!

سلیمان یہ سن کر مسکرا دیئے اور ہنسے (فتبسم ضاحکا من قولها)۔

حضرت سلیمان کس وجہ سے ہنسے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ظاہر امر یہ ہے کہ بذاتِ خود یہ قضیہ ایک عجیب چیز تھی کہ ایک چیونٹی اپنے ساتھیوں کو سلیمان کے عظیم لشکر سے آگاہ کرے اور اس کی بے توجہی کا ذکر کرے اور یہی عجیب امر جناب سلیمان کے ہنسنے اور مسکرانے کا سبب بنا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کی یہ ہنسی خوشی کی ہنسی تھی کیونکہ آپ کو معلوم ہوگیا کہ چیونٹی تک کی مخلوق ان کی اور ان کے لشکر والوں کی عدالت اور تقویٰ کا اعتراف کرتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آپ کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ خداوند عالم نے انھیں اس قدر قدرت عطا فرمائی ہے کہ لشکر عظیم کے شور و غل کے باوجود وہ چیونٹی جیسی مخلوق کی آواز سے غافل نہیں ہیں۔

---

[1] بعض مفسرین نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ "نملة" میں "تا" بیانِ وحدت کے لیے ہے اور فعل کو ظاہر کلمہ کی رعایت سے مؤنث لایا گیا ہے۔

بہرحال وجہ خواہ کچھ بھی ہو اس موقع پر جناب سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں چند معروضات پیش کیں
پہلی یہ کہ خداوندا! جو نعمتیں تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں ان کا شکر کرنے کا طریقہ مجھے سکھا دے
(و قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علیّ وعلیٰ والدیّ)[1]۔
تاکہ میں اپنی ان تمام عظیم نعمتوں کو تیری اس راہ میں بروئے کار لاؤں جس میں تیری خوشی اور رضا ہے اور میں جادۂ حق سے
انحراف نہ کروں کیونکہ ان تمام نعمتوں کا شکر تیری امداد اور نصرت کے بغیر ناممکن ہے ۔

دوسری یہ کہ " مجھے توفیق عطا فرما تاکہ ایسا نیک عمل بجالاؤں کہ جس سے تو راضی ہو (و ان اعمل صالحاً ترضاہ)۔

کیونکہ میرے لیے یہ لشکر و سپاہ اور حکومت و سلطنت کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ اہم چیز یہ ہے کہ میں ایسے نیک اعمال بجا لاؤں جس سے تو راضی ہو ۔ چونکہ " اعمل " فعل مضارع کا صیغہ ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جناب سلیمان نے دائمی توفیق کی درخواست کی ہے ۔

آخر میں تیسری عرض داشت یہ پیش کی کہ پروردگارا! مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے صالح بندوں کے زمرے میں شامل فرما
(وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین)۔

چند اہم نکات

۱۔ **جناب سلیمان عؑ کا جانوروں کی بولی جاننا :** ۔ حیوانات کی دنیا کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں اور اس بارے میں تمام ترقی کے باوجود ابھی تک اس پر شک و ابہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں ۔

البتہ بہت سے کاموں میں ہم ان کی فہم، سمجھ اور مہارت کے آثار ضرور دیکھتے ہیں ۔

شہد کی مکھیوں کا گھر بنانا، شہد کے چھتے کا منظم و مضبوط کرنا، چیونٹیوں کا موسم سرما کی ضروریات کے لیے اپنی غذا کو ذخیرہ کرنا، جانوروں کا دشمن سے اپنا دفاع کرنا، حتیٰ کہ ان کا بہت سی بیماریوں کے علاج سے باخبر ہونا، دور دراز کے فاصلوں سے اپنے آشیانوں اور بلوں تک واپس لوٹ آنا، لمبے اور طویل فاصلے طے کر کے منزل مقصود تک پہنچنا، آئندہ حوادث کے بارے میں پیشگی اندازہ لگا لینا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات کی پُراسرار زندگی کے بارے میں ابھی تک بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قابلِ حل ہیں ۔

ان تمام باتوں سے ہٹ کر بہت سے جانور ایسے ہیں کہ اگر انھیں سدھایا جائے اور ان کی تربیت کی جائے تو وہ ایسے ایسے عجیب غریب کارنامے انجام دیتے ہیں جو انسان کے بھی بس میں نہیں ہوتے ۔

[1] " اوزعنی " " ایزاع " بمعنی " الہام " کے معنی میں ہے ۔ یا انحراف کے روکنے کے معنی میں یا پھر منع ۔ رغبت کے معنی میں ہے
لیکن بیشتر مفسرین نے پہلا معنی اختیار کیا ہے ۔

لیکن پھر بھی اچھی طرح معلوم نہیں کہ وہ انسانی دنیا سے کس حد تک باخبر ہیں ؟ کیا وہ واقعاً یہ جانتے ہیں کہ ہم (انسان) کون ہیں اور کیا کرتے ہیں ؟ ہو سکتا ہے ہمیں ان میں اس قسم کے ہوش اور سمجھ کے آثار نہ ملیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان میں ان چیزوں کا فقدان ہے ۔

اسی بناء پر اگر ہم نے مندرجہ بالا داستان میں یہ پڑھا ہے کہ چیونٹیوں کو جناب سلیمان کے اس سرزمین میں آنے کی خبر ہو گئی تھی اور انھیں اپنے بلوں میں گھس جانے کا حکم ملا تھا تاکہ وہ لشکر کے پاؤں تلے کچلی نہ جائیں اور سلیمان بھی اس بات سے باخبر ہو گئے تھے تو زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے ۔

اس کے علاوہ ——— جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ——— سلیمان کی حکومت غیر معمولی اور معجزانہ امور پر مشتمل تھی اسی بناء پر بعض مفسرین نے اپنے نظریئے کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ سلیمان علیہ السّلام کے دورِ حکومت میں بعض جانوروں میں اس حد تک آگاہی کا پایا جانا ایک اعجاز اور خارقِ عادت بات تھی لہٰذا اگر دوسرے ادوار میں اس قسم کی باتیں جانوروں میں نہیں ملتیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے ۔

ان کی اس قسم کی گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں سلیمان اور چیونٹی یا سلیمان اور ہُدہُد کی داستان کو کنایہ، مجاز یا زبان حال وغیرہ پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ ظاہر امر کی حفاظت اور حقیقی معنی پر محمول کرنے کا امکان بھی موجود ہے[1]۔

۲۔ **حضرت سلیمان عؑ اور شکرِ الٰہی :** ۔ الٰہی حکمرانوں اور ظالم و جابر حکمرانوں کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جب ظالموں کو حکومت حاصل ہوتی ہے تو وہ غرور اور غفلت میں غرق ہو کر تمام انسانی اقدار کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنی خودسری کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ خدائی حکام جب اقتدار حاصل کر لیتے ہیں تو اسے اپنے دوش پر ایک عظیم ذمہ داری سمجھتے ہیں، دوسروں سے زیادہ خدا کی بارگاہ کا رُخ کرتے ہیں، اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق خدا سے طلب کرتے ہیں جیسا کہ سلیمان علیہ السّلام نے سریرِ قدرت پر پہنچنے کے بعد جس سب سے اہم چیز کا خدا سے سوال کیا وہ شکرِ خدا کی ادائیگی اور ان نعمتوں کو راہِ حق اور بندوں کی فلاح میں استعمال کرنے کا سوال تھا ۔

اور پھر قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ انھوں نے اپنی درخواست کو " اوزعنی " کے لفظ سے شروع کیا ہے جس کا مفہوم اس عظیم مقصد کے انجام دینے کے لیے اندرونی ہدایت اور تمام باطنی طاقتوں کو اکٹھا کرنا ہے گویا سلیمان خدا سے دعا کر رہے ہیں خدایا مجھے اس قدر قدرت عطا فرما کہ میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے اپنی تمام اندرونی توانائیوں کو اکٹھا کر کے تیرا شکر ادا کروں اور اپنے فرائض کو پورا کروں اور تو ہی مجھے اس راستے پر چلا تا رہ کیونکہ یہ نہایت ہی کٹھن، خوفناک اور طولانی سفر ہے اور اس جیسی عظیم حکومت میں تمام لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کا یہی راستہ ہے ۔

جناب سلیمان نے صرف ان نعمتوں کے شکر کی توانائی کا تقاضا نہیں کیا کہ جو خود ان کو ذاتی طور پر عطا کی گئی تھیں بلکہ اپنے ماں باپ کو عطا کی جانے والی نعمتوں کے شکر کی توفیق بھی چاہی کیونکہ انسان کو ملنے والی بہت سی نعمتیں اسے ماں باپ کی طرف سے

[1] ہم تفسیر نمونہ کی جلد پنجم میں سورۂ انعام کی آیت ۳۸ کے ذیل میں بھی اس بارے میں گفتگو کر چکے ہیں ۔

میراث میں ملتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ خداوندِ عالم جو وسائل ماں باپ کو عطا کرتا ہے وہ اولاد کے لیے بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

۲۔ **حضرت سلیمانؑ اور عملِ صالح**:۔ یہ بات بھی باعثِ دلچسپی ہے کہ باوجودیکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس اس قدر بے نظیر طاقت اور حکومت تھی لیکن انھوں نے خدا سے سوال کیا کہ آپ کو ہمیشہ شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کا خدا کے نیک بندوں میں شمار ہو۔

اس درخواست سے واضح ہوتا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے اقتدار حاصل کرنے کا مقصد اعمالِ صالح کی بجاآوری ہے اور باوقار عمل، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ان اعمال کی بجاآوری کے لیے مقدمہ ہیں۔

اعمالِ صالح بھی خدا کی رضا و خوشنودی کے حصول کا مقدمہ ہیں جو منتہائے مقصود اور سب غایتوں کی آخری غایت ہے۔

دوسری بات یہ کہ، صالح افراد کے زمرے میں شمولیت اعمالِ صالحہ کی ادائیگی سے بھی بڑھ کر ایک بلند درجہ ہے کیونکہ پہلا مرحلہ ذاتی درستی کا ہے اور دوسرا عمل کی درستی کا۔ (غور کیجیے گا)۔

دوسرے لفظوں میں بسا اوقات انسان اعمالِ صالح بجا لاتا ہے لیکن یہ اس کی ذات، روح اور وجود میں رچ بس نہیں جاتے لہٰذا سلیمان خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انھیں اپنی عنایات میں اس حد تک شامل کر دے کہ ان کا صالح ہونا ان کے اعمال سے بھی بڑھ جائے اور ان کی روح اور رگ و ریشے میں رچ بس جائے اور یہ بات خدا کی رحمت کے بغیر قطعًا ناممکن ہے۔

سچ سچ خدا کا صالح بندہ ہونا کس قدر قیمتی اور انمول عطیہ ہے کہ جناب سلیمان اس قدر جاہ و جلال، ملک و سلطنت، حکومت و حشمت کے باوجود یہی درخواست کرتے ہیں کہ خداوندِ عالم انھیں اپنی رحمت کے زیرِ سایہ اپنے خالص بندوں میں قرار دے اور ہر وقت انھیں ایسی لغزشوں سے محفوظ رکھے جو انسانوں سے سرزد ہو جاتی ہیں، خاص کر بڑے منصب پر فائز لوگوں سے اور سربراہانِ حکومت سے

۲۰۔ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝

۲۱۔ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۝

۲۲۔ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ۝

۲۳۔ إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ۝

۲۴۔ وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ۝

۲۵۔ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝

۲۶۔ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ السجدة

ترجمہ

۲۰۔ (سلیمان نے ہُدہُد) پرندے کی تلاش شروع کی اور کہا کہ مجھے ہُدہُد دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟ یا کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔

۲۱۔ میں اسے یقینًا سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر ڈالوں گا یا وہ (اپنی غیر حاضری کی) کوئی واضح دلیل میرے سامنے پیش کرے۔

۲۲۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ (ہُدہُد آگیا اور) کہا: مجھے ایسی چیز کا پتہ چلا ہے جس سے آپ آگاہ نہیں ہیں

میں سرزمینِ سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں ۔

۲۳۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے جو وہاں کے لوگوں پر حکومت کر رہی ہے اور اس کے پاس سب کچھ ہے، خصوصًا بہت عظیم تخت ۔

۲۴۔ (لیکن) میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا ہے کہ وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزیّن کر رکھا ہے انھیں صحیح راستے سے بھٹکا دیا ہے اور وہ ہدایت پانے والے نہیں ہیں ۔

۲۵۔ وہ کیوں ایسے خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین میں مخفی چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو ۔

۲۶۔ وہ ایسا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے ۔

تفسیر

ہُدہُد اور ملکۂ سبا کی داستان

آیات کے اس حصے میں خداوندِ عالم حضرت سلیمانؑ کی حیرت انگیز زندگی کے ایک اور اہم واقعے کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور ہُدہُد اور ملکہ سباء کا قصہ بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: سلیمان کو ہُدہُد دکھائی نہ دیا تو وہ اسے ڈھونڈھنے لگے ۔ (و تفقد الطیر)۔

یہ تعبیر اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ حضرت سلیمان اپنی حکومت کے حالات اور ملک کی کیفیت کو اچھی طرح مدنظر رکھتے تھے یہاں تک کہ ایک پرندہ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں تھا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں پر پرندے سے مراد ہُدہُد ہے جیسا کہ قرآن اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ انھوں نے کہا" کیا ہوا کہ مجھے ہُدہُد دکھائی نہیں دے رہا" (فقال مالی لا اری الھد ھد)۔

"یا کیا وہ غائب ہے (ام کان من الغائبین)۔

سلیمان کو کیسے معلوم ہوا کہ ہُدہُد غیر حاضر ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ اس وجہ سے کہ جب آپ سفر کرتے تو پرندے آپ کے سر پر سایہ کیے رہتے تھے، چونکہ اس وقت اس سائبان میں اس کی جگہ خالی نظر آئی لہٰذا انھیں معلوم ہو گیا کہ ھُدھُد غیر حاضر ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سلیمان کے نظم حکومت میں پانی کی تلاش کا کام ہُدہُد کے ذمّہ تھا لہٰذا پانی کی ضرورت کے وقت

جب اسے تلاش کیا گیا تو وہ نہیں ملا۔

بہرحال، اس گفتگو کی ابتداء میں حضرت سلیمان نے فرمایا: مجھے وہ دکھائی نہیں دے رہا، پھر فرمایا" یا یہ کہ وہ غائب ہے. ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کیا وہ کسی معقول عذر کے بغیر غیر حاضر ہے یا معقول عذر کی وجہ سے غائب ہے ۔

بہرصورت ایک بااستقلال منظم اور طاقت ور حکومت میں یہی ہوتا ہے کہ ملک میں جو بھی اتار چڑھاؤ ہو وہ سربراہ حکومت کی نظر میں ہو حتیٰ کہ کسی پرندے کی حاضری اور غیر حاضری یا ایک عام ملازم کی موجودگی اور عدم موجودگی اس کے پیشِ نظر ہو اور یہ ایک بہت بڑا درس ہے ۔

حضرت سلیمان نے دوسروں کو درس دینے اور حکم عدولی پر سزا دینے کی خاطر مندرجہ ذیل جملہ کہا تاکہ ہُدہُد کی غیر حاضری دوسرے پرندوں پر بھی اثر کرے چہ جائیکہ اہم عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز انسان، فرمایا: میں یقینًا اسے سخت سزا دوں گا (لاعذبنه عذابًا شدیدًا)۔

یا اسے ذبح کر ڈالوں گا (او لاذبحنه)۔

یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی میرے سامنے واضح دلیل پیش کرے (او لیأتینی بسلطان مبین)۔

یہاں پر" سلطان" سے مراد ایسی دلیل ہے جو انسان کے مقصود کو ثابت کرنے کے لیے اس کے تسلّط کا سبب بنتی ہے اور پھر" مبین" کے ساتھ اس کی تاکید اس لیے کہ خلاف ورزی کرنے والا اپنی خلاف ورزی کی مکمل طور پر واضح اور روشن دلیل لائے ۔

درحقیقت جناب سلیمانؑ نے غیر حاضری کی صورت میں یکطرفہ فیصلہ دینے کی بجائے خلاف ورزی ثابت ہو جانے پر سزا کی تنبیہ کی ہے اور اپنی اس تنبیہ میں بھی دو مراحل بیان کیے ہیں جو جرم کی نوعیت کے مطابق ہیں ایک مرحلہ بغیر موت کے سزا ہے اور دوسرا سزائے موت کا مرحلہ ہے ۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انھیں اپنی حکومت اور طاقت کا گھمنڈ نہیں ہے بلکہ اگر ایک کمزور سا پرندہ بھی معقول اور واضح دلیل پیش کرے تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں ۔

ہدہد کی غیر حاضری کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا (فمکث غیر بعید)۔ کہ ہُدہُد واپس آگیا اور سلیمان کی طرف رُخ کر کے کہنے لگا: مجھے ایک ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس سے آپ آگاہ نہیں ہیں میں آپ کے لیے سرزمین سبا سے ایک یقینی (اور بالکل تازہ) خبر لایا ہوں (فقال احطت بما لم تحط به وجئتك من سبأ بنبأ یقین)۔

گویا ہُدہُد نے جناب سلیمانؑ کے چہرے پر غُصّے کے آثار دیکھ لیے تھے لہٰذا ان کی ناراضی دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے اس نے ایک ایسے اہم مطلب کی مختصر الفاظ میں خبر دی جس سے جناب سلیمان اس قدر علم و دانش رکھنے کے باوجود بے خبر تھے ۔ جب ان کا غُصّہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے اس ماجرا کی تفصیل بیان کی ۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ سلیمان کے لشکر والے حتیٰ کہ پرندہ تک کو بھی جو ان کے تابع فرمان تھے جناب سلیمان نے

اس قدر آزادی، امن وامان اور جسارت عطا کی ہوئی تھی کہ ہُدہُد نے کھل کران سے کہہ دیا : مجھے ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس کی آپ کو بھی خبر نہیں ہے۔

اس کی گفتار کا طریقہ ایسا نہیں تھا جیسے چاپلوس درباریوں کا جابر بادشاہوں کے سامنے ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے مدّتوں خوشامد کرتے رہتے ہیں اپنے آپ کو ذرّہ ناچیز بتلاتے ہیں پھر چاپلوسی اور خوشامد کے ہزار دں پردوں میں کوئی بات "بادشاہ سلامت" کے قدموں پر نثار کرتے ہیں اور کبھی بھی اپنی بات کھول کر بیان نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ پھول کی پتی سے بھی نازک کنایوں کا سہارا لیتے ہیں مبادا بادشاہ سلامت کی خاطرِ مبارک ملول ہو جائے۔

ہاں تو ہُدہُد نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میری غیر حاضری کسی دلیل کے بغیر نہیں تھی، میں ایک ایسی اہم خبر لایا ہوں جس سے آپ بھی بے خبر ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر سب لوگوں کے لیے ایک بہت بڑا درس بھی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہُدہُد جیسی ایک چھوٹی سی مخلوق ایسی بات جانتی ہو جس سے اپنے دور کے بہت بڑے دانشور بھی بے خبر ہوں۔ انسان کو نہیں چاہیے کہ اپنے علم و دانش پر گھمنڈ کرے چاہے وہ نبوّت کے وسیع علم کا مالک سلیمان ہی کیوں نہ ہو۔

بہرحال ہُدہُد نے ماجرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا : میں سرزمین سبا میں چلا گیا تھا میں نے دیکھا کہ ایک عورت وہاں کے لوگوں پر حکومت کر رہی ہے اس کے قبضے میں سب کچھ ہے خاص طور پر اس کا ایک بہت بڑا تخت بھی ہے (انی وجدت امرأة تملکھم واوتیت من کل شیٔ ولھا عرش عظیم)۔

ہُدہُد نے ان تین جملوں میں ملکِ سبا کی تقریبًا تمام خصوصیات بتادیں اور وہاں کے طرزِ حکومت سے بھی سلیمانؑ کو باخبر کر دیا۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے وہ ایک ایسا آباد شاد ملک ہے جس میں ہر طرح کی نعمتیں اور سہولیات مہیا ہیں۔

دوسری یہ کہ ان لوگوں پر ایک عورت حکومت کر رہی ہے جس کا ایک نہایت ہی آراستہ دربار ہے حتیٰ کہ سلیمانؑ کے دربار سے بھی زیادہ آراستہ کیونکہ ہُدہُد نے حضرت سلیمان کا تخت دیکھا ہوا تھا اس کے باوصف اس نے ملکہ سبا کے تخت کو "عرش عظیم" کے عنوان سے یاد کیا۔

ان الفاظ کے ساتھ اس نے سلیمان کو یہ بات جتلادی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ یہ تصور کر لیں کہ تمام جہان آپ کے قلمرو حکومت میں ہے اور صرف آپ کا تخت باعظمت ہے۔

سلیمانؑ ہُدہُد کی یہ بات سن کر ایک گہری سوچ میں پڑ گئے لیکن ہُدہُد نے انھیں مزید سوچنے کی مُہلت نہ دی اور فوراً ہی ایک اور بات پیش کر دی۔ اس نے کہا : جو عجیب و غریب اور تکلیف دہ چیزیں میں نے وہاں دیکھی ہے وہ یہ کہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ عورت اور اس کی قوم خدا کو چھوڑ کر سورج کے سامنے سجدہ کرتے ہیں (وجدتھا وقومھا یسجدون للشمس من دون اللہ)۔

شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے ان کے اعمال کو ان کے لیے مزیّن کر رکھا ہے (لہٰذا وہ سورج کو سجدہ کرنے میں

فخر محسوس کرتے ہیں) (وزین لھم الشیطان اعمالھم)۔

اس طرح سے "شیطان نے انھیں راہِ حق سے روک رکھا ہے (فصدھم عن السبیل)۔

وہ بُت پرستی میں اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ آسانی سے اس راہ سے پلٹ جائیں۔ وہ بالکل ہدایت نہیں پائیں گے (فھم لا یھتدون)۔

ہُدہُد نے ان الفاظ کے ساتھ ان کی مذہبی اور روحانی حیثیت بھی واضح کر دی کہ وہ بُت پرستی میں خوب مگن ہیں، حکومت آفتاب پرستی کو ترویج کرتی ہے۔ اور لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہیں۔

ان کے بت کدوں اور دوسرے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس غلط راہ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ جنون کی حد تک محبت کرتے اور اپنی اس غلط روش پر فخر کرتے ہیں ایسے حالات میں جبکہ حکومت اور عوام ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں ان کا ہدایت پانا بہت مشکل ہے۔

پھر کہا : وہ اس خدا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو باہر نکالتا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جسے تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو (الا یسجدوا للہ الذی یخرج الخبأ فی السماوات والارض ویعلم ما تخفون وما تعلنون)۔[1]

"خبأ" (بروزن "صبر") ہر مخفی اور پوشیدہ چیز کے معنی میں ہے اور یہاں پر خداوندِ عالم کے آسمان اور زمین کے غیب پر محیط ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ لوگ اس خدا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمان و زمین کے پوشیدہ امور کو جانتا ہے۔

یہ جو بعض مفسّرین نے آسمان کی مخفی چیزوں سے خصوصی طور پر بارش اور زمین کی چیزوں سے بالخصوص نباتات مراد لیا ہے تو درحقیقت یہ اس کے واضح مصداق ہیں۔

اسی طرح جنھوں نے موجودات کو غیب، عدم کے پردے سے باہر نکالنا مراد لیا ہے وہ بھی اس کا ایک مصداق ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پہلے تو خدا کے آسمان و زمین کے مخفی امور سے باخبر ہونے کی بات ہوئی ہے پھر انسان کے دل میں چھپی ہوئی چیزوں سے آگاہی کا ذکر ہوا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اور بھی تو کئی صفات ہیں مگر ہُدہُد نے صرف خدا کے کائنات میں عالم الغیب ہونے کا ذکر کیوں کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاید اس مناسبت سے ہو کہ جناب سلیمان اپنی تمام قدرت و توانائی کے باوجود ملکِ سبا کی ان خصوصیات سے بے خبر تھے اور ہُدہُد یہ کہتا ہے کہ اس خدا کے دامنِ لطف سے متمسک ہونا چاہیے جس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

---

[1] "الا" کا کلمہ اس جگہ پر بعض مفسّرین کے نزدیک "ان" اور "لا" سے مرکب ہے اور وہ اسے "صدھم" یا "زین لھم" کے متعلق جانتے ہیں اور "لام" کو مقدر سمجھتے ہیں جو مجموعی طور پر یوں ہوگا "صدھم عن السبیل لئلا یسجدوا للہ" لیکن ظاہر یہ ہے کہ "الا" یہاں پر حرف تحضیض اور "ھلا" کے معنی میں ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں یہ بھی ہُدہُد کے کلام کا حصّہ ہے ہر چند کہ بعض مفسّرین نے اسے جملہ استینافیہ بنا کر کلام الٰہی قرار دیا ہے۔

یا پھر اس مناسبت کی وجہ سے کہا ہے کیونکہ ________ مشہور یہ ہے کہ ________ ہُدہُد کے اندر ایک خاص حس پائی جاتی ہے جس کے ذریعے زمین کے اندر موجود پانی کا اسے پتہ چل جاتا ہے لہٰذا اس نے خداوندِ عالم کی بات کی ہے اور وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ تو صرف ذاتِ خداوندِ متعال ہی ہے جو عالمِ ہستی کی تمام پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔

وہ اپنی گفتگو کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے: وہ خدا وہ ہے جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور جو عرشِ عظیم کا پروردگار اور مالک ہے (اللہ لا الٰہ الا ھو رب العرش العظیم)۔

اس طرح سے اس نے پروردگار کی "توحیدِ عبادت" اور "توحیدِ ربوبیت" کو بیان کر کے اور ہر طرح کے شرک کی نفی کر کے اپنی گفتگو کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

چند اہم نکات

چند سبق آموز باتیں: مندرجہ بالا چند آیات میں بہت سے ایسے نکات موجود ہیں جو تمام لوگوں کی زندگی اور حکومتوں کے چلانے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

۱۔ کسی حکومت کا سربراہ یا کسی ادارے کا سربراہ اپنے انتظامی امور میں اس قدر باریک بین ہو کہ ایک عام اور معمولی فرد کی غیر حاضری تک کا نوٹس لے۔

۲۔ کسی ادارے کا سربراہ ایک فرد کی قانون شکنی تک کا نوٹس لے تاکہ اس کی خلاف ورزی دوسرے افراد میں سرایت نہ کر جائے لہٰذا اس کی سختی سے پیش بندی کرے۔

۳۔ کسی کی غیر حاضری اور عدمِ موجودگی میں اس پر مقدمہ نہیں چلایا جانا چاہیے بلکہ اسے حتی الامکان اپنے دفاع کا موقع دینا چاہیے۔

۴۔ جتنا جرم ہو سزا اتنی ہی ملنی چاہیے۔

۵۔ حیثیت وطاقت کے لحاظ سے انسان خواہ کتنا بڑا کیوں نہ ہو اسے دلیل اور منطق قبول کر لینی چاہیے خواہ وہ کسی چھوٹے شخص کے منہ سے کیوں نہ نکلے۔

۶۔ عوامی ماحول میں اس قدر آزادی ہونی چاہیے کہ ایک عام آدمی بھی اپنے سربراہِ مملکت کو آزادانہ طور پر کہہ سکے "کہ میں ایسی چیز جانتا ہوں جو آپ نہیں جانتے۔"

۷۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عام اور معمولی فرد ایسے مسائل سے باخبر ہو جسے بہت بڑے عالم اور طاقتور لوگ بھی نہ جانتے ہوں اور انسان کو کبھی بھی اپنے علم ودانش پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔

۸۔ انسان کی اجتماعی زندگی کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض اوقات سلیمان جیسے بہت بڑے انسانوں کو بھی ایک چھوٹے سے پرندے کی ضرورت درپیش آجاتی ہے۔

۹۔ اگرچہ عورت میں بہت سے کاموں کی صلاحیت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ خود یہی داستان بھی آگے چل کر بتائے گی

ملکہ سبا میں بہت زیادہ فہم وذکا پائی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود حکومت کی سربراہی اس کے جسم وروح کی ساخت سے چنداں مناسبت نہیں رکھتی حتیٰ کہ ہُدہُد جیسے پرندے کو بھی اس بات پر تعجب کرنا پڑا کہ "میں نے ایک عورت کو ان پر حکمرانی کرتے دیکھا ہے۔"

۱۰۔ عموماً لوگوں کا بھی وہی دین ہوتا ہے جو ان کے بادشاہوں کا ہوتا ہے لہٰذا اسی داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ ہُدہُد نے کہا کہ میں نے اس عورت اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ سورج کی پوجا کر رہے ہیں (پہلے ملکہ کی بات کی اور پھر اس کی قوم کی)۔

۲۔ چند سوال اور ان کا جواب: بعض مفسرین نے یہاں پر چند ایک سوال پیش کیے ہیں:

ان میں سے ایک یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ سلیمان کے پاس اس قدر علم تھا اور وسائل بھی پھر ایسے ملک کے وجود سے بے خبر کیوں تھے۔ اور پھر یمن اور سلیمان کا مرکزِ حکومت جو ظاہراً شام تھا کا طویل فاصلہ ہُدہُد نے کیونکر طے کیا اور پھر یہ کہ کیا ہُدہُد بھول کر وہاں پہنچ گیا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔

پہلے سوال کے بارے میں ممکن ہے کہ یہ جواب دیا جائے کہ سلیمان اس ملک سے قاعدۃً تو باخبر تھے لیکن اس کی خصوصیات اور تفصیلات اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ان دو ملکوں کے درمیان حجاز کے بیابان کا فاصلہ بھی تھا اور ذرائع رسل ورسائل ہمارے آج کے ذرائع کی طرح بھی نہیں تھے (البتہ علمِ غیب اور الہامِ الٰہی کی بات دوسری ہے)۔

رہا ہُدہُد کے لیے اس مسافت کا طے کرنا تو یہ کوئی غیر ممکن بات نہیں ہے کیونکہ ہم ایسے پرندوں کو بھی جانتے ہیں جو زمین کے قطب شمالی اور قطب جنوبی کا درمیانی فاصلہ طے کرتے رہتے ہیں جبکہ یمن اور شام کا درمیانی فاصلہ مذکورہ فاصلے کے مقابلہ میں بالکل ہی ناچیز ہے۔

ممکن ہے ہُدہُد اس علاقے میں اس لیے آیا ہو کیونکہ بعض روایات میں ہے کہ جناب سلیمان خانۂ خدا کی زیارت کے لیے شام سے مکہ تشریف لائے ہوئے تھے تاکہ ابراہیم علیہ السلام کے مقرر کردہ طریقۂ کار کے مطابق حج بجالائیں پھر وہ وہاں سے جنوب کی طرف چلے یہاں تک کہ ان کا یمن کی سرزمین تک زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا تھا اور جب آپ آرام فرما رہے تھے تو ہُدہُد نے موقع غنیمت جان کر وہاں سے پرواز کر کے ملکہ سباء کے محل پر آ بیٹھا اور وہاں پر عجیب وغریب صورتِ حال نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی [1]

---

[1] اس واقعے کی مزید تفصیلات کے لیے "دائرۃ المعارف فرید وجدی" جلد ۱۰ ص ۷۶۴ مادہ "ہُدہُد" ملاحظہ فرمائیں۔ ہر چند کہ اس کی مفصل روایت مبالغے سے خالی نہیں ہے۔

۲۷۔ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○
۲۸۔ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِىْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ○
۲۹۔ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ○
۳۰۔ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
۳۱۔ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَىَّ وَاْتُوْنِىْ مُسْلِمِيْنَ ○
۳۲۔ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِىْ فِىْۤ اَمْرِىْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ○
۳۳۔ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِىْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ○
۳۴۔ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○
۳۵۔ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌ ۢبِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۔ (سلیمان نے) کہا ہم تحقیق کریں گے اور دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے۔
۲۸۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کے سامنے ڈال دے پھر لوٹ آ (ایک کونے میں چھپ کر) دیکھ کہ وہ کیا ردِّ عمل کرتے ہیں؟

۲۹۔ (ملکہ سباء نے) کہا اے سردارو! یہ ایک نہایت ہی اہم خط میرے پاس گرایا گیا ہے۔
۳۰۔ یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس طرح ہے: رحمٰن و رحیم اللہ کے نام سے ....
۳۱۔ تمھیں میری یہی نصیحت ہے کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ۔
۳۲۔ (پھر) کہا اے سردارو! (اور اے بزرگو!) اس اہم معاملے میں اپنی رائے دو، کیونکہ میں نے کوئی بھی اہم کام تمھاری شرکت کے بغیر انجام نہیں دیا۔
۳۳۔ (درباریوں نے) کہا ہم بہت طاقتور ہیں اور ہمارے پاس بہت جنگی قوت ہے لیکن آخری فیصلہ کرنا پھر بھی تیرے ہاتھ میں ہے۔ تیرا حکم کیا ہے؟
۳۴۔ ملکہ نے کہا جب بادشاہ کسی آبادی والے علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ (جی ہاں) ان کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔
۳۵۔ میں (اس وقت جنگ کو خلافِ مصلحت سمجھتی ہوں لہٰذا) ایک قیمتی تحفہ اس کی طرف بھیجتی ہوں تاکہ پتہ چل جائے کہ میرے ایلچی کیا خبر لاتے ہیں۔

تفسیر

بادشاہ تباہیاں لاتے ہیں

حضرت سلیمان نے غور سے ہُدہُد کی باتیں سنیں اور سوچنے لگ گئے، ممکن ہے ان کا زیادہ گمان یہی ہو کہ یہ خبر سچی ہے اور اس کے جھوٹا ہونے پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بات معمولی نہ تھی بلکہ ایک ملک اور ایک بڑی قوم کی تقدیر اس سے وابستہ تھی لہٰذا انھوں نے ایک فرد کی خبر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ اس حساس موضوع پر مزید تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس طرح فرمایا ہم اس بارے میں تحقیق کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے (قال سننظر اصدقت ام کنت من الکاذبین)۔

اس بات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اہم اور نتیجہ خیز مسائل کے بارے میں توجہ دینی چاہیے خواہ اس کی اطلاع کسی معمولی سے فرد کی جانب سے کیوں نہ ملے۔ اور جلد ہی اس کے بارے میں تحقیقات کرنی چاہیے (جیسا کہ "سننظر" میں "سین" کا اقتضاء ہے)۔

سلیمان علیہ السلام نے نہ تو ہُدہُد کو جھوٹا کہا اور نہ ہی بغیر دلیل کے اس کی بات کو تسلیم کیا بلکہ اس بارے میں تحقیقات کا حکم صادر فرمایا۔

بہرحال سلیمانؑ نے ایک نہایت مختصر لیکن جامع خط تحریر فرمایا اور ہُدہُد کو دے کر کہا: "میرا یہ خط لے جاؤ اور ان کے پاس جاکر ڈال دو پھر لوٹ آؤ اور ایک کونے میں ٹھہر جاؤ اور دیکھو وہ کیا ردِعمل کرتے ہیں" (اذهب بكتابی هٰذا فالقه اليهم ثم تول عنهم فانظر ماذا يرجعون)[1]۔

"القه اليهم" (تو ان کی طرف ڈال دے) کی تعبیر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہُدہُد کو حکم دیا گیا کہ اس خط کو اس وقت ان کے پاس جاکر ڈال دینا جب ملکہ سباء اپنے درباریوں کے ساتھ محفل جمائے ہوئے ہو تاکہ فراموشی اور اخفا کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہُدہُد ملکہ کے محل میں داخل ہو کر اس کے سونے کے کمرے میں پہنچ گیا اور خط اس کے سینے یا گردن پر ڈال دیا اس کے لیے کوئی خاص دلیل نہیں ہے اگرچہ بعد والی آیت میں ہے۔

انی القی الی کتاب کریم

میری طرف ایک اہم خط پھینکا گیا ہے۔

یہ آیت اس دعوٰی سے موافقت رکھتی ہے۔

ملکہ سباء نے خط کھولا اور اس کے مندرجات سے آگاہی حاصل کی۔ چونکہ اس نے اس سے پہلے سلیمانؑ کا نام اور شہرت سُن رکھی تھی اور خط کے مندرجات سے بھی واضح ہوتا تھا کہ جناب سلیمان نے سباء کے بارے میں سخت فیصلہ کر لیا ہے لہٰذا وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور چونکہ ملک کے اہم ترین مسائل میں وہ اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کرتی تھی لہٰذا اس بارے میں بھی انھیں اظہارِ خیال کی دعوت دی اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: اے سردارو اور بزرگو! ایک نہایت ہی باوقار خط میری طرف پھینکا گیا ہے (قالت یا ایها الملؤا انی القی الی کتاب کریم)۔

کیا سچ مچ ملکہ سباء نے چٹھی رساں کو نہیں دیکھا تھا اور خود خط کے اندر موجود قرائن سے اس نے خط کی حقانیت کو تسلیم کر لیا تھا اور اسے یہ احتمال بھی پیدا نہ ہوا کہ یہ خط جعلی ہے۔

یا اپنی آنکھوں سے قاصد کو دیکھ لیا تھا اور اس کی محیر العقول کیفیت بذاتِ خود اس بات کی دلیل تھی کہ اس کے پس پردہ یقیناً کوئی حقیقت کارفرما ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بات خواہ کچھ بھی ہو اسے خط پر یقین آگیا۔

ملکہ نے یہ کیوں کہا کہ یہ بہت ہی باعظمت خط ہے یا تو اس لیے کہ اس خط کے مطالب بہت ہی گہرے تھے یا پھر اس لیے

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "ثم تول عنهم" معنی کے لحاظ سے مؤخر ہے اور عبارت میں مقدم ہے اور تقدیری صورت میں یوں ہوگا "فانظر ماذا یرجعون ثم تول عنهم"۔ یہ اس لیے ہے کہ انھوں نے اس جملے کو اس قوم کی طرف سے واپس لوٹ آنے کے معنی میں لیا ہے جبکہ آیت کا ظاہری معنی یہ ہے کہ تو ان سے رُخ پھیر کر ایک کونے میں انتظار کر کہ وہ کیا ردِعمل کرتے ہیں۔

اور اس کا آغاز خدا کے نام سے ہوا تھا اور اختتام پر جناب سلیمانؑ کے صحیح دستخط تھے اور مہر لگی تھی[1] یا اس کا لکھنے والا باعظمت انسان تھا۔ مفسرین نے یہ مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں ممکن ہے کہ یہ سب احتمالات جامع مفہوم میں جمع ہوں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ سورج پرست تھے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے بُت پرست خدا پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اسے "رب الارباب" کا نام دیتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے اور تعظیم بجا لاتے تھے۔

پھر ملکہ سباء نے خط کا مضمون سناتے ہوئے کہا "یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کے مندرجات یوں ہیں: رحمان و رحیم اللہ کے نام سے ...... (انه من سلیمان و انه بسم الله الرحمٰن الرحیم)۔

"میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی سے کام نہ لو اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ (الا تعلوا علی و أتونی مسلمین)[2]۔

بعید معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمانؑ نے اسی عبارت اور انھی عربی الفاظ میں خط لکھا ہو بنا بریں ممکن ہے مندرجہ بالا جملے یا تو صرف معنی کو بیان کر رہے ہیں یا پھر سلیمانؑ کے خط کا خلاصہ ہوں۔ جسے ملکہ سباء نے ان افراد کے سامنے بیان کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خط کا مضمون درحقیقت صرف تین جملوں پر مشتمل ہے۔

پہلے جملے میں خدا کا نام اور اس کے رحمان اور رحیم ہونے کا ذکر ہے۔

دوسرے جملے میں خواہشاتِ نفسانی پر کنٹرول کرنے اور تکبر و برتری کی خواہش کو ترک کرنے کا حکم ہے کہ جو تمام انفرادی اور اجتماعی برائیوں کی جڑ ہے۔

اور تیسرے جملے میں حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا تذکرہ ہے۔

اگر غور سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے علاوہ کوئی اور ایسی چیز تھی بھی نہیں جو قابلِ ذکر ہو۔

حضرت سلیمان کے خط کا تذکرہ کرنے کے بعد اہلِ دربار کی طرف رُخ کر کے ملکہ نے یوں کہا "اے سردارو! اس اہم معاملے میں تم اپنی رائے کا اظہار کرو، کیونکہ میں کوئی بھی اہم کام تمھاری شرکت اور تمھاری رائے کے بغیر انجام نہیں دیتی ہوں" (قالت یا ایها الملؤا افتونی فی امری ما کنت قاطعة امرًا حتٰی تشهدون)۔

اس رائے طلبی سے وہ ان کے درمیان اپنی حیثیت ثابت کرنا چاہتی تھی اور ان کی نظر اور توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہتی تھی

---

[1] حدیث میں آیا ہے کہ کسی خط کی عظمت اور وقار اس کی مُہر میں ہے (تفسیر مجمع البیان، المیزان اور قرطبی)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے عجم کے لیے خط لکھنا چاہا تو آپ سے عرض کی گئی کہ عجمی لوگ بغیر مُہر کے خط قبول نہیں کرتے تو آپ نے حکم دیا کہ ایک انگوٹھی تیار کروائی جائے جس کے نگینے پر یہ الفاظ کندہ ہوں لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور یہی مُہر آپ خط پر لگا دیا کرتے تھے (تفسیر قرطبی اسی آیت کے ذیل میں)۔

[2] ممکن ہے "الا تعلوا علی" کا جملہ مجموعی طور پر "کتاب" سے بدل ہو اور ممکن ہے کہ یہاں پر "ان" "بمعنی" ای "کے ہو اور تفسیر کے لیے ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ ایک محذوف جملے سے متعلق ہو اور وہ "اوصیکم" ہو سکتا ہے۔

تاکہ اس طرح سے وہ ان کی رائے اور اپنے فیصلے کو ہم آہنگ کرسکے۔

"افتونی" "فتوٰی" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے پیچیدہ مسائل میں خوب سوچ بچار کرکے صحیح صحیح فیصلہ کرنا چنانچہ اس طرح سے ملکہ سباء نے ایک تو ان کے آگے مسئلے کی پیچیدگی کو واضح کر دیا اور دوسرے اس نکتہ کی جانب ان کی توجہ مبذول کروائی کہ اپنے نظریئے کا اظہار کرتے وقت خوب غور و فکر سے کام لیں تاکہ بعد میں غلط نتائج کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

"تشھدون" "شہود" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ایسی موجودگی جو تعاون اور مشورے پر مشتمل ہو۔

اشرافِ قوم نے جواب میں کہا ہم بڑی طاقت والے اور جنگجو لوگ ہیں لیکن آخری فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے دیکھیے، آپ کیا حکم دیتی ہیں؟ (قالوا نحن اولوا قوة واولوا بأس شديد والامر اليك فانظري ماذا تأمرين)۔

اس طرح سے انھوں نے ایک تو اس کے سامنے اپنی فرمانبرداری کا اظہار کر دیا اور دوسرے اپنی قوت کا ذکر کرکے میدانِ جنگ میں لڑنے کا مشورہ بھی دے دیا۔

جب ملکہ نے ان کا جنگ کی طرف رجحان دیکھا اور اندرونی طور پر اس کا قطعًا یہ ارادہ نہیں تھا تو ان کی اس جنگی پیاس کو بجھانے بنز صحیح حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے انھیں قانع کرنے کے لیے کہا "جب بادشاہ کسی آباد علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں" (قالت ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها)۔

اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں (وجعلوا اعزة اهلها اذلة)۔

کچھ کو مار ڈالتے ہیں، کچھ کو قیدی بنا لیتے ہیں اور کچھ کو بے گھر کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا ہے، لوٹ مار کرتے ہیں۔

پھر اس نے تاکید کے طور پر بلکہ یقینی صورت میں کہا "جی ہاں! وہ ایسا ہی کرتے ہیں" (وكذلك يفعلون)۔

درحقیقت ملکہ سباء خود بھی ایک "بادشاہ" تھی لہٰذا وہ بادشاہوں سے اچھی طرح واقف تھی کہ بادشاہوں کی جنگی حکمت عملی دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے ایک تباہی اور بربادی اور دوسرے باعزت افراد کو ذلیل کرنا کیونکہ انھیں تو صرف اپنے ہی مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ قوم و ملت کے مفادات اور ان کی سربلندی سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا لہٰذا عمومی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

پھر ملکہ نے کہا: ہمیں سب سے پہلے سلیمان اور اس کے ساتھیوں کو آزمانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ واقعًا ہیں کیسے لوگ؟ آیا سلیمان بادشاہ ہے یا پیغمبر ہے؟ تباہ کار ہے یا مصلح، اقوام و ملل کو ذلیل کرتا ہے یا عزت بخشتا ہے؟ تو اس کام کے لیے ہمیں تحفے تحائف سے استفادہ کرنا چاہیے لہٰذا میں ان کی طرف کچھ معقول تحفے بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ میرے قاصد ان کی طرف سے کیا ردِعمل لاتے ہیں (وانی مرسلة اليهم بهدية فناظرة بم يرجع المرسلون)۔

بادشاہوں کو تحفے تحائف سے بڑی محبت ہوتی ہے اور یہ تحفے اور ہدیے ہی ان کی بہت بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔ انھیں تحفے دے کر جھکایا جاسکتا ہے ہم دیکھیں گے اگر سلیمان نے ان تحائف کو قبول کر لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بادشاہ ہے اور ہم بھی ڈٹ کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنی پوری طاقت استعمال کریں گے کیونکہ ہم بہرحال طاقتور ہیں اور اگر اس نے

ان تحائف سے بے رُخی برتی اور اپنی باتوں پر ڈٹا رہا تو ہم سمجھ لیں گے کہ وہ خدا کا نبی ہے تو ایسی صورت میں ہمیں بھی عقل مندی سے کام لینا ہوگا۔

ملکہ سباء نے جناب سلیمان کے لیے کیا تحائف بھیجے؟ اس بارے میں قرآن نے تو کچھ نہیں بتایا صرف کلمہ "ہدیہ" نکرہ کی صورت میں بیان کرکے اس کی عظمت کو ضرور واضح کر دیا ہے البتہ مفسرین نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے جن میں سے بعض باتیں مبالغہ آرائی اور افسانوی رنگ سے خالی نہیں ہیں۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ پانچ سو بہترین غلام اور پانچ سو بہترین کنیزیں ان کے لیے بھیجی گئیں، غلاموں کو زنانہ لباس میں اور کنیزوں کو مردانہ لباس میں، غلاموں کے کانوں میں گوشوارے اور ہاتھوں میں کنگن اور کنیزوں کے سر پر خوبصورت ٹوپیاں تھیں، ملکہ نے اپنے خط میں لکھا کہ اگر آپ اللہ کے نبی ہیں تو غلاموں اور کنیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیں۔

انھیں زر و جواہرات اور قیمتی زیورات سے آراستہ کرکے بہترین سواریوں پر سوار کرکے اور جواہرات کی معقول مقدار دے کر جناب سلیمان کی خدمت میں بھیجا گیا۔

اور ساتھ ہی ملکہ نے قاصد کو یہ بات بھی سمجھا دی کہ تمھارے دربار میں پہنچتے ہی اگر سلیمان نے تمھیں خشم آلود اور غضب ناک نگاہوں سے دیکھا تو سمجھ لینا کہ یہ بادشاہوں کا انداز ہے اور اگر پیار بھرے انداز میں خندہ پیشانی کے ساتھ تمھیں شرفِ حضور بخشا تو سمجھ لینا کہ خدا کا نبی ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ **نامہ نگاری کے آداب:** مندرجہ بالا آیات میں اہلِ سبأ کے نام حضرت سلیمانؑ کے خط کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے وہ طرزِ نامہ نگاری کا ایک اعلٰی نمونہ ہے جو اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے جس نے خداوند رحمان و رحیم کے نام سے شروع ہو کر صرف دو جچے تُلے جملوں میں تمام مفہوم کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

اسلامی تاریخ اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے عظیم پیشواؤں کا ہمیشہ اس بات پر اصرار رہا ہے کہ خط کو مختصر مگر جامع انداز میں تحریر کیا جائے جو تمام غیر متعلق اور بے فائدہ باتوں سے بالکل پاک ہو اور ہمیشہ سوچ سمجھ کر خط لکھا جائے۔

حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ملازمین اور نمائندوں کو خط کے بارے میں باقاعدہ سرکاری طور پر یہ ہدایات جاری فرمائیں:

"ادقوا اقلامكم وقاربوا بين سطوركم، واحذفوا عني فضولكم، واقصدوا قصد المعاني، واياكم والاكثار، فان اموال المسلمين لا تحتمل الاضرار"

نوکِ قلم باریک رکھو، سطروں کو نزدیک رکھو، میرے لیے لکھے جانے والے خطوط میں زائد اور اضافی باتوں کو نکال دیا کرو، معانی پر زیادہ توجہ رکھا کرو، زیادہ باتوں سے پرہیز کرو

کیونکہ مسلمانوں کے اموال ایسی فضول خرچیاں برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں[1]

نوکِ قلم کو باریک کرنے سے الفاظ چھوٹے لکھے جائیں گے اور سطور کو قریب کرکے لکھنے اور بے فائدہ اور اضافی چیزوں کو حذف کر دینے سے نہ صرف مسلمانوں کے بیت المال یا ذاتی اموال میں بچت ہوگی بلکہ لکھنے اور پڑھنے والے کا وقت بھی بچے گا حتیٰ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تکلفات پر مبنی عبارت تحریر کرنے سے اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جس سے نہ تو لکھنے والے کو کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی پڑھنے والا اس سے کچھ سمجھ پاتا ہے۔

گزشتہ دنوں یہ معمول ہو گیا تھا کہ ابتدائے اسلام کے طریقہ کار کے خلاف لوگ خط لکھنے لگے تھے۔

ان میں القاب، الفاظ اور تکلفات کی بھرمار ہوا کرتی تھی جس سے ایک تو قیمتی وقت ضائع ہوتا اور دوسرے سرمایہ۔

یہ نکتہ بھی خصوصی طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اس دور میں جبکہ کسی خط کو مخصوص قاصد کے ذریعے بھیجا جاتا اور جس کے پہنچانے کے لیے بسا اوقات کئی ہفتے درکار ہوتے تھے اور کافی سرمایہ خرچ ہوتا تھا اس کے باوجود نہایت ہی اختصار کو مدنظر رکھا جاتا تھا جس کا نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خسرو پرویز، قیصر روم اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے نام خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کسی کا خط اس کی شخصیت کا اسی طرح آئینہ دار ہوتا ہے جس طرح اس کا ایلچی اور پیغام رساں۔ جیسا کہ نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کا فرمان ہے:

رسولك ترجمان عقلك وكتابك ابلغ من ينطق عنك

تمھارا ایلچی تمھاری عقل کا ترجمان ہوتا ہے اور تمھارا خط تمھاری طرف سے سب سے بہتر بات کرنے والا ہوتا ہے[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"يستدل بكتاب الرجل على عقله، وموضع بصيرته، وبرسوله على فهمه وفطنته"

کسی شخص کا خط بتاتا ہے کہ اس میں کتنی عقل و بصیرت ہے اور اس کا ایلچی اس کی فہم و ذکا کی نشانی ہوتا ہے[3]

اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خط کا جواب بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح سلام کا جواب۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ہے:

[1] بحار الانوار جلد ۶، ص ۴۹۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۳۰۱۔

[3] بحار الانوار جلد ۶، ص ۵۰۔

رد جواب الكتاب واجب كوجوب رد السلام

خط کا جواب دینا اسی طرح واجب ہے جس طرح سلام کا جواب[4]

چونکہ عام طور پر خط میں سلام و دعا ہوتا ہے لہٰذا بعید نہیں ہے کہ اس آیت شریفہ کے ضمن میں آتا ہو:

واذا حييتم بتحية فحيوا باحسن منها او ردوها

جب تمھیں دعا و سلام کہا جائے تو تم بھی اس کا اس سے بہتر یا اسی جیسا جواب دیا کرو۔

(نساء / ۸۶)

۲۔ آیا سلیمانؑ نے اپنی پیروی کی دعوت دی؟ بعض مفسرین نے جناب سلیمان کے خط سے ظاہراً یہ سمجھا ہے کہ اہلِ سبا کو اپنی دعوت بلادلیل قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔

پھر انھوں نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا ہے کہ ہُدہُد کا معجزانہ طور پر ان لوگوں کے پاس آنا بذاتِ خود حضرت سلیمان کی دعوت کے برحق ہونے کی دلیل ہے[5]۔

لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ انبیاء کا کام دعوت دینا ہے اور دوسروں کا کام اس کی تحقیق کرنا ہے یا بالفاظ دیگر دعوت تحقیق کا سبب ہے جیسا کہ ملکہ سباء نے یہ کام انجام دیا اور حضرت سلیمان کی دعوت کی تحقیق کی کہ کیا وہ ایک بادشاہ ہیں یا خدا کے پیغمبر؟

۳۔ اس داستان کے اہم اشارے: حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان کے اس حصے میں بھی بعض اہم مطالب کی طرف مختصر اشارے ملتے ہیں۔

۱۔ انبیاء کی دعوت ہر قسم کی خواہش برتری اور تکبّر کی نفی کرتی ہے جو درحقیقت ہر قسم کے استعمار کی نفی اور قانونِ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا دوسرا نام ہے۔

۲۔ جب ملکہ سبا کے مصاحبین نے جنگ کے لیے آمادگی کا اعلان کیا تو چونکہ اس کی زنانہ طبع نازک جنگ کے حق میں نہیں تھی لہٰذا اس نے ان لوگوں کی توجہ دوسرے مسائل کی جانب موڑ دی۔

۳۔ اس کے علاوہ اگر وہ ان کے جنگ پر مبنی مشورے کو مان لیتی تو راہِ حقیقت سے ہٹ جاتی اور جیسا کہ ہم آگے پڑھیں گے کہ اس نے قاصد کے ذریعے تحفے تحائف بھیج کر سلیمان کی جس طرح سے آزمائش کی اس کے بہترین نتائج ظاہر ہوئے جو خود اس کی ذات کے لیے بھی اور ملکِ سبا کے باشندوں کے لیے بھی نہایت مفید ثابت ہوئے اور اس بات کا موجب بن گئے کہ وہ حق کی راہ کو پالیں اور خوں ریزی سے بچ جائیں۔

۴۔ اس واقعے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ضروری نہیں کہ شوریٰ کا نظام ہمیشہ حق پر انجام پذیر ہو۔ کیونکہ یہاں پر

[4] وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۴۳۲ (کتاب الحج ابواب العشرۃ باب ۳۳)۔

[5] تفسیر فخر رازی، انہی آیات کے ذیل میں۔

ملکہ سباء کے اکثر ساتھیوں کا یہ نظریہ تھا کہ فوجی طاقت کا مظاہرہ دوسری تمام باتوں پر فوقیت رکھتا ہے جبکہ ملکہ کا نظریہ اس کے بالکل برعکس تھا اور اس داستان کے آخر میں جاکر معلوم ہوگا کہ حق ملکہ کے ساتھ تھا ۔

یہاں پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کے مشورے ان مشوروں سے بالکل جُدا ہیں جو آج کل ہمارا معمول بن چکے ہیں کیونکہ ہم اکثریت کے نظریے کو معیار سمجھتے ہیں اور فیصلے کا حق اکثریت کو دیتے ہیں جبکہ اس قسم کے مشوروں میں کسی قسم کے فیصلے کا حق عوام کے قائد کو ہوتا ہے اور مشیر لوگ صرف مشورہ ہی دے سکتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیت مشورے کی اسی دوسری قسم کی طرف اشارہ ہے :

شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ

اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کرلیا کریں اور جب کوئی فیصلہ کرلیں تو پھر خدا پر بھروسہ کریں (آل عمران/۱۵۹)

جبکہ سُورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ ظاہراً مشورے کی پہلی قسم کی طرف اشارہ ہے، فرمایا گیا ہے :

"و امرھم شوریٰ بینھم

مومنین کا کام مشورے سے انجام پانا چاہیے [۱]

۵۔ ملکہ سبا کے مشیروں نے اسے کہا کہ ہم صاحبِ قوت اور جنگجو ہیں ۔ ممکن ہے کہ ان دو لفظوں کا باہمی فرق یہ ہو کہ "قوۃ" لشکر کی عظیم تعداد کی طرف اشارہ ہو اور "باس شدید" ان کے جنگی کاموں اور طریقہ کار سے واقفیت اور فوج کی شجاعت کی طرف اشارہ ہو یعنی وہ زبانِ حال سے یہ کہنا چاہتے ہوں کہ ہم لشکر کی تعداد کے لحاظ سے بھی اور اس کی کیفیت کے لحاظ سے بھی دشمن کے ساتھ لڑنے کے لیے بالکل آمادہ ہیں ۔

۴۔ **بادشاہوں کی علامت :** ۔ ان آیات سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ استبدادی حکومت اور سلطنت ہر جگہ پر فساد و تباہی اور کسی قوم کے باعزت افراد کو ذلیل کرنے کا اہم ذریعہ ہے کیونکہ اس میں باحیثیت افراد کو ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے اور چاپلوس اور خوشامدی لوگوں کو آگے لایا جاتا ہے ہر ہر قدم پر انھیں اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے انھیں صرف تحفے تحائف بھیجنے والوں، رشوت دینے والوں اور زر و جواہرات پیش کرنے والوں سے ہی سروکار ہوتا ہے پھر جو ظالم لوگ ان امور پہ دسترس رکھتے ہیں، فطری طور پر ان کے منظورِ نظر اور محبوبِ خاطر ہوتے ہیں ۔

بادشاہوں کا تو دھیان ہی ہمیشہ مقام و منصب، تحفے تحائف اور زر و جواہر کی طرف ہوتا ہے ۔ جبکہ انبیاءِ الٰہی کے سامنے اُمت کی اصلاح کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا ۔

[۱] مشورے کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ میں سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۵۹ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں ۔

۳۶۔ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝

۳۷۔ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ جب (ملکہ سباء کے ایلچی) سلیمان کے پاس آئے تو اس نے کہا، تم مجھے مال کے ذریعے کمک دینا (اور فریب دینا) چاہتے ہو۔ جو کچھ خدا نے مجھے عطا کیا ہے اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے یہ تو تمھی لوگ ہو جو تحفوں پر خوش ہوتے ہو۔

۳۷۔ ان کے پاس لوٹ جاؤ (اور انھیں جاکر بتادو کہ) ہم ایسے لشکروں کے ساتھ ان کی طرف آئیں گے جن سے مقابلے کی طاقت ان میں نہیں ہوگی اور انھیں اس سرزمین سے ذلیل کرکے نکال دیں گے اور وہ نہایت ہی حقیر ہوں گے ۔

تفسیر

مجھے مال کے ذریعہ نہ ورغلاؤ

ملکہ سبا کے روانہ کیے ہوئے افراد نے سرزمینِ یمن کو خیرباد کہا اور شام اور جناب سلیمان کے مرکزِ حکومت کی طرف چل دیئے ۔ دل میں یہی تصور لیے ہوئے کہ سلیمان ان کے تحائف قبول کرلیں گے اور خوش ہوکر انھیں شاباش کہیں گے ۔

لیکن جوں ہی وہ سلیمان کے حضور پیش ہوئے (فلما جاء سلیمان) تو وہاں پر عجیب و غریب منظر دیکھا سلیمان نے نہ صرف ان کا استقبال نہیں کیا بلکہ انھیں یہ بھی کہا "کیا تم لیہ چاہتے ہو کہ (اپنے) مال کے ذریعے میری مدد کرو؟ حالانکہ یہ مال میری نگاہ میں بالکل بے قیمت سی چیز ہے جو کچھ خدا نے مجھے عطا فرمایا ہے اس سے کئی حصے بہتر اور کہیں قیمتی ہے (قال اتمدوننِ بمال فما اٰتانی اللّٰہ خیر مما اٰتاکم) ۔

نبوت، علم و دانش، ہدایت اور تقویٰ کے مقابلے میں مال کی کیا حیثیت ہے ؟

"یہ تو تم ہو جو اپنے تحفے تحائف پر خوش ہوتے ہو" (بل انتم بهديتكم تفرحون)۔

جی ہاں! یہ تمھی لوگ ہو کہ اس قسم کے حسین اور قیمتی تحفے اگر میرے لیے بھی بھیجو تو اس قدر مسرور و شادماں نظر آتے ہو کہ خوشی کی چمک تمھاری آنکھوں سے نمایاں ہوتی ہے لیکن میری نگاہوں میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اس طرح سے جناب سلیمان علیہ السلام نے ان کی اقدار اور معیار کی نفی کر دی اور تحائف کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر ثابت کر دیا کہ ان کے نزدیک اقدار اور معیار کچھ اور ہیں۔ دنیا پرستوں کے مقرر کردہ معیار جن کے سامنے ہیچ اور بے قیمت ہیں۔

جناب سلیمان نے حق و باطل کے مسئلے میں اپنے اس عزم بالجزم کو ثابت کرنے کے لیے ملکہ سبا کے خاص ایلچی سے فرمایا: تم ان کی طرف واپس پلٹ جاؤ (اور اپنے یہ تحفے بھی ساتھ لے جاؤ) لیکن یہ ضرور یاد رکھو کہ ہم ایسی لشکر لے کر ان کے پاس بہت جلد پہنچ رہے ہیں جن کے مقابلے کی طاقت ان میں نہیں ہوگی (ارجع اليهم فلنأتينهم بجنود لا قبل لهم بها)۔

اور ہم انھیں اس سرزمین سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ نہایت ہی حقیر ہوں گے (و لنخرجنهم منها اذلة وهم صاغرون)۔

درحقیقت "اذلة" پہلا حال ہے اور "هم صاغرون" دوسرا حال جس کا معنی یہ ہے کہ ہم نہ صرف اس سرزمین سے انھیں نکال باہر کریں گے بلکہ نہایت ہی ذلت اور حقارت کی حالت میں انھیں ملک بدر کر دیں گے اور وہ اپنے تمام محلات و قصور، مال و دولت اور جاہ و جلال سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے کیونکہ انھوں نے آئین حق کے سامنے جھک کر ہماری طرف رجوع نہیں کیا بلکہ مکر و فریب کے ذریعے ہم سے رابطہ کیا ہے۔

جناب سلیمان کی یہ دھمکی ان لوگوں کے نزدیک صحیح اور قابل عمل بھی تھی کیونکہ انھوں نے جناب سلیمان اور ان کے جاہ و جلال اور فوج و لشکر کو نزدیک سے دیکھا تھا۔

پہلے کی آیات جو ابھی ہم پڑھ چکے ہیں اگر ان کی طرف رجوع کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جناب سلیمان نے ان سے دو چیزوں کا تقاضا کیا تھا ایک تو "برتری طلبی کو ترک کر دیں" اور دوسرے "حق کے آگے جھک جائیں"۔

اہل سبا کا ان دونوں چیزوں کا مثبت جواب نہ دینا اور اس کی بجائے تحائف کا بھیجنا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ حق کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی برتری طلبی سے باز آتے ہیں لہٰذا سلیمان نے انھیں پر فوجی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔

جبکہ ملکہ سبا اور اس کے درباریوں نے دلیل اور ثبوت یا معجزہ وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا لہٰذا انھیں موقع فراہم کیا کہ مزید تحقیق کریں لیکن تحفوں کے بھیجنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انکار کر چکے ہیں۔

یہ بات بھی ہمیں معلوم ہے کہ جناب سلیمان کو ہُدہُد نے جو ناخوشگوار خبر سنائی تھی وہ یہ کہ ملک سبا کے لوگ سورج پرست ہیں اور غیب و حضور کے جاننے والے خدا سے روگردانی کیے ہوئے ہیں اور مخلوق کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

حضرت سلیمان کو اسی بات سے سخت دکھ پہنچا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ بُت پرستی ایک ایسی بات ہے جس کے سامنے کوئی بھی خدائی دین خاموش تماشائی نہیں بن سکتا اور نہ ہی بُت پرستوں کو ایک مذہبی اقلیت مان سکتا ہے بلکہ بوقتِ ضرورت زبردستی بھی بتکدوں کو مسمار اور شرک و بت پرستی کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا توضیحات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے سلیمانؑ کی یہ دھمکی "لا اكراه في الدين" کے بنیادی اصول سے بھی متصادم نہیں ہے کیونکہ بُت پرستی کوئی دین نہیں بلکہ ایک خرافات اور راہِ حق سے انحراف ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ **زہد مادی وسائل سے استفادہ نہ کرنے کا نام نہیں:** یہ بات قابل توجہ ہے کہ خدا کے کسی بھی دین میں زہد کا معنی یہ نہیں کہ انسان مال و دولت اور دنیاوی وسائل سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ زہد کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے ہاتھوں "اسیر" ہو کر نہ رہ جائے بلکہ ان پر "امیر" ہو کر رہے۔ خدا کے عظیم پیغمبر جناب سلیمانؑ نے ملکہ سبا کے قیمتی تحائف کو ٹھکرا کر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ "امیر" ہیں "اسیر" نہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

الدنيا اصغر قدرًا عند الله و عند انبيائه و اوليائه من ان يفرحوا بشئ منها او يحزنوا عليه فلا ينبغي لعالم ولا لعاقل ان يفرح بعرض الدنيا

دنیا خداوند عالم، اس کے انبیاء اور اولیاء کے نزدیک اس قدر پست اور حقیر ہے کہ وہ اس سے کبھی خوش نہیں ہوتے، اور نہ ہی اس کے ہاتھ سے چلے جانے سے غمگین ہوتے ہیں بنا بریں کسی عالم اور عاقل کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ دنیا کی متاعِ ناپائیدار پر خوشی منائے[1]

۲۔ **کچھ سبق آموز باتیں:** داستان کے اس حصے میں بھی چند سبق آموز باتیں موجود ہیں جو پُر معانی آیات میں موجود ہیں۔ مثلاً:

الف: لشکر کشی کا یہ ہدف نہیں تھا کہ انسانوں کا قتل عام کیا جائے بلکہ اس کا مقصد دشمن کو اس حد تک ڈرانا تھا کہ وہ مقابلے کی جرأت نہ کر سکے (جنود لا قبل لهم بها)۔

یہ تعبیر بعینہٖ اس آیت کے مترادف ہے جس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے:

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة .... ترهبون به عدو الله

(الانفال / ۶۰)

اس قدر طاقت فراہم کرو کہ دشمن پر اس کا خوف طاری ہو جائے۔

ب: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے مخالفین کو قتل کی دھمکی نہیں دی بلکہ انھیں ان کے محلات سے ذلت و خواری کے ساتھ نکال باہر کرنے کی دھمکی دی ہے۔

---

[1] تفسیر روح البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

ج : حضرت سلیمان علیہ السّلام نے اپنے مخالفین کو غفلت میں نہیں ڈالا بلکہ انھیں حملہ کرنے کی صاف صاف دھمکی دی ۔

د : جناب سلیمان علیہ السّلام دوسروں کے مال پر نظریں نہیں ڈالتے بلکہ فرماتے ہیں :
جو کچھ خدا نے مجھے عطا فرمایا ہے وہ سب سے بہتر ہے ۔ وہ خدائی عنایات کو مادی اور مالی چیزوں میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ علم و ایمان اور معنوی عطاء و بخشش پر نازاں ہیں ۔

۳۸۔ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○

۳۹۔ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ○

۴۰۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ڣ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ○

ترجمہ

۳۸۔ (سلیمان نے) کہا: اے سردارو! تم میں سے کون شخص اس کا تخت میرے پاس لا سکتا ہے قبل اس کے کہ وہ خود میرے پاس آئیں اور سر تسلیم خم کریں ۔

۳۹۔ جنوں میں سے ایک عفریت نے کہا : میں اسے آپ کے مجلس سے اٹھنے سے پہلے آپ کے پاس لے آؤں گا اور میں اس کو لانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں اور امین بھی ہوں ۔

۴۰۔ لیکن جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا، اس نے کہا میں اسے آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا اور جب سلیمان نے اس (تخت) کو اپنے پاس موجود دیکھا تو کہا کہ یہ سب میرے پروردگار کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت، کیونکہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدے میں شکر کرتا ہے اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے، سو میرا رب بے نیاز اور کریم ہے ۔

تفسیر

پلک جھپکتے ہی تخت موجود

آخر کار ملکہ کے کارندے اپنے تحفے تحائف اور سازو سامان اکٹھا کرکے اپنے ملک واپس چلے گئے اور سارا ماجرا ملکہ اور اس کے مصاحبین سے جاکر بیان کیا، اسی طرح حضرت سلیمانؑ کے ملک کی معجزانہ عظمت بھی بیان کی جن میں سے ہر ایک بات اس امر کی دلیل تھی کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں اور نہ ہی عام دنیاوی بادشاہ ہیں بلکہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی حکومت ایک خدائی حکومت ہے۔

یہاں پر ان کے لیے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ نہ صرف جناب سلیمان کے ساتھ فوجی مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ اگر بالفرض مقابلہ کریں بھی تو قوی احتمال یہی ہے کہ ان کا خدا کے ایک زبردست طاقتور نبی سے مقابلہ ہوگا۔

لہٰذا ملکہ سبا نے اپنی قوم کے بہت سے سرداروں کے ساتھ مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ سلیمان کے پاس ذاتی طور پر جاکر اس اہم مسئلے کی بارے میں تحقیقات کریں تاکہ پتہ چل سکے کہ سلیمانؑ کا کیا مسلک ہے؟

کسی بھی صورت میں یہ خبر حضرت سلیمانؑ تک بھی پہنچ گئی لہٰذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب جبکہ ملکہ اور اس کے ساتھی راستے ہیں میں انھیں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ انھیں پہلے سے زیادہ ان کے اعجاز کی حقیقت کا علم ہوجائے اور وہ ان کی دعوت قبول کرلیں۔

لہٰذا حضرت سلیمان نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہوکر کہا اے بزرگو! تم میں سے کون شخص اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس کا تخت میرے پاس لے آئے قبل اس کے کہ وہ خود میرے پاس آئیں اور سرِ تسلیم خم کریں (قال یا ایھا الملؤ ایکم یأتینی بعرشھا قبل ان یأتونی مسلمین)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ملکہ سبا کے تخت کو یہاں پر لانے کی دلیل کے سلسلے میں اپنے آپ کو بہت زحمت میں ڈالا ہے بلکہ کچھ ایسے احتمالات بھی ذکر کیے ہیں جو کسی بھی صورت میں آیت کے موضوع سے مناسبت نہیں رکھتے لیکن واضح سی بات ہے کہ جناب سلیمان کے اس کام کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ وہ تو ان سے اپنی طاقت کا لوہا منوانا چاہتے تھے تاکہ اس طرح سے ایک نہایت اہم مقصد حاصل ہو یعنی اس طرح سے ان کے غیر مشروط طور پر ان کے دین کے آگے جھکنے اور قدرتِ خدا پر ایمان لانے کے راستے ہموار ہوجائیں اور میدانِ جنگ میں جانے اور خون ریزی کی نوبت نہ آنے پائے۔

وہ چاہتے تھے کہ ملکہ سباء اور اس کے رفقاءِ کار کے وجود کی گہرائیوں میں ایمان اچھی طرح راسخ ہوجائے تاکہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی ایمان لانے کی دعوت دے سکیں۔

اس موقع پر دو قسم کے افراد نے کہا کہ ہم یہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جن میں سے ایک عجیب اور دوسرا عجیب تر تھا۔

سب سے پہلے جنوں میں سے ایک عفریت نے ان کی طرف منہ کرکے کہا: میں اس کا تخت آپ کے مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے آپ کے پاس لادوں گا (قال عفریت من الجن انا اٰتیك به قبل ان تقوم من مقامك)[1]

یہ کام میرے لیے مشکل نہیں ہے اور نہ ہی میں اس بارے میں کسی قسم کی خیانت کردوں گا کیونکہ میں اس سلسلے میں طاقتور بھی ہوں اور امین بھی (و انی علیه لقوی امین)۔

"عفریت" کا معنی ہے مغرور، سرکش اور خبیث۔ اور "انی علیه لقوی امین" کے جملہ کی کئی لحاظ سے تاکید کی گئی ہے ("ان" لفظ اسمیہ اور لام کے ساتھ) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عفریت میں کئی لحاظ سے خیانت کا اندیشہ تھا لہٰذا اسے اپنا دفاع کرنا پڑا اور امانت و وفاداری کا یقین دلانا پڑا۔

صورتِ حال خواہ کچھ ہو جناب سلیمان کی زندگی عجائبات اور معجزات سے بھری پڑی ہے اور کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کہ ایک عفریت اس قسم کا کارنامہ ایک یا چند گھنٹوں میں انجام دے یعنی جتنی دیر سلیمانؑ لوگوں میں فیصلے کے لیے یا امورِ مملکت میں غور و فکر کے لیے یا عوام کو وعظ و نصیحت کے لیے بیٹھتے ہیں اتنی دیر میں وہ بھی ملکہ سبا کا تخت لاکر حاضر کردیتا۔

دوسرا ایک صالح اور متقی انسان تھا اور "کتابِ خدا" سے بھی اسے اچھی خاصی واقفیت تھی، جیسا کہ اس شخص کے بارے میں خود قرآن کہتا ہے "جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اس نے کہا میں آپ کے پلک جھپکنے سے بھی پہلے اس تخت کو لے آؤں گا" (قال الذی عنده علم من الکتاب انا اٰتیك به قبل ان یرتد الیك طرفك)۔

جب حضرت سلیمانؑ نے اس کی پیش کش منظور کرلی تو اس نے بھی اپنی معنوی طاقت کے ذریعے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں آپ کے پاس حاضر کردیا اور جب سلیمانؑ نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہنے لگے: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر بجالاتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں (فلما راٰہ مستقرًا عنده قال هٰذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر)۔

پھر خود ہی فرماتے ہیں: جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ میں شکر کرتا ہے اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے سو میرا پروردگار بے نیاز اور کریم ہے (ومن شکر فانما یشکر لنفسه ومن کفر فان ربی غنی کریم)۔

یہ شخص کون تھا، اسے یہ عجیب و غریب طاقت کہاں سے ملی اور علم الکتاب سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ شخص جناب سلیمان کے مومن اور قریبی رشتہ داروں اور خاص دوستوں میں سے تھا،

---

[1] "اٰتی" کے بارے میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ وہ "اتی" مادہ سے "اسم فاعل" ہو اور دوسرا اسی مادہ سے "فعل مضارع" بھی ہوسکتا ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تواریخ میں اس کا نام "آصف بن برخیا" لکھا ہے۔ وہ جناب سلیمان علیہ السلام کے وزیر اور بھانجے تھے[1]

اور "علم کتاب" سے ان کی آسمانی کتابوں سے واقفیت مراد ہے ایسی عمیق اور گہری واقفیت جس سے ان کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ اس طرح کا معجزانہ کارنامہ انجام دیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے یعنی علم الٰہی کی لوح اور اس کے صرف ایک گوشے کا اس بندۂ خدا کو علم حاصل تھا جس کی وجہ سے وہ ملکہ کے تخت کو "سبا" سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں لانے پر قادر تھا۔

بہت سے مفسرین اور غیر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ مردِ مومن اللہ تعالیٰ کے اسمِ اعظم سے باخبر تھا۔ یعنی ایسا باعظمت اور بزرگ نام جس کے سامنے دنیا کی ہر چیز سر جھکائے ہوئے ہے اور وہ انسان کو بے حد و انداز قدرت عطا کرتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسمِ اعظم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص کلمے کے زبان سے نکال دینے سے اس کے اس قدر عجیب و غریب اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں ایسی بات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس نام اور اس کی صفات کو اپنانا ہوتا ہے اور دل و جان سے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے اور علم، اخلاق، تقویٰ اور ایمان کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو کر خود کو اس کا مظہر بنانا ہوتا ہے تب کہیں جا کر اس اسمِ اعظم کے پرتو میں انسان کے اندر معجزانہ امور کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے[2]

"قبل ان یرتد الیک طرفک" کے بارے میں بھی مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن اگر قرآن مجید کی دوسری آیات کو مدنظر رکھا جائے تو اس جملے کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

چنانچہ سورۂ ابراہیم آیت ۴۳ میں ہے:

لا یرتد الیھم طرفھم

لوگ بروزِ قیامت اس قدر وحشت زدہ ہو جائیں گے کہ ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی حتیٰ کہ وہ جھپکیں گی بھی نہیں۔

کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ خوف و وحشت کی حالت میں انسان کی آنکھیں پتھرا کر کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں جیسے مردے کی آنکھوں کی کیفیت ہوتی ہے۔

بنابریں اس کا معنی یہ ہوگا کہ آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے میں ملکہ سبا کا تخت آپ کے سامنے لے آؤں گا[3]

---

[1] بعض لوگوں نے اس سے حضرت سلیمانؑ یا جناب جبرئیلؑ مراد لیے ہیں ان کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور پھر حضرت سلیمانؑ کے بارے میں تو ظاہر آیات کے بھی قطعاً خلاف ہے۔

[2] خدا کے "اسمِ اعظم" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۴ (سورہ اعراف کی آیت ۱۸۰ کے ذیل میں) ملاحظہ فرمائیں ہم نے وہاں تفصیلی بحث کی ہے۔

[3] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ "یرتد الیک طرفک" سے مراد کسی چیز پر نگاہ ڈالنا اور نظر کا انسان کی طرف واپس لوٹ آنا ہے لیکن اس کے اس مدعا پہ کوئی دلیل نہیں ہے اسی طرح یہ جملہ "آنکھ سے شعاع کے نکلنے" کے نظریہ پر بھی دلیل واقع نہیں ہو سکتا جو فلسفہ قدیم میں موجود ہے (غور کیجیے گا)۔

چند ایک نکات

۱۔ چند سوال اور ان کے جواب: مندرجہ بالا آیات کے ضمن میں چند ایک سوال پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ آخر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ معجزانہ کام خود کیوں انجام نہیں دیا؟ جب وہ خود اللہ کے عظیم پیغمبر اور صاحبِ معجزہ نبی تھے تو پھر آپ نے یہ فریضہ جناب آصف بن برخیا کے ذمہ کیوں لگایا؟

جواباً عرض ہے کہ یہ ممکن ہے کہ یہ اس لیے ہو کہ وہ جناب سلیمان علیہ السلام کے وصی تھے اور وہ اس ذریعے سے اپنے وصی کا تمام لوگوں سے تعارف کرانا چاہتے ہوں[1] علاوہ ازیں یہ بات بہت اہم ہے کہ استاد ضروری مواقع پر اپنے شاگردوں کو آزماتا ہے تاکہ ان کی استعداد، لیاقت اور اہلیت سے مطلع ہو اور اصولی طور پر شاگردوں کی لیاقت اور اہلیت استاد کی اہلیت اور لیاقت کی واضح دلیل ہوتی ہے۔ اگر شاگرد کوئی اہم کارنامہ انجام دیں تو استاد زیادہ قابلِ تعریف ہوتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے کس بناء پر ملکہ سبا کا تخت اس کی اجازت کے بغیر اپنے پاس منگوایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اس کا ایک نہایت عظیم ہدف ہو اور اس سے ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی اور انھیں معجزہ دکھانا مقصود ہو۔

علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ بادشاہوں کا مال اپنا مال تو ہوتا نہیں بلکہ عام طور پر دوسرے لوگوں کا غصب کردہ مال ہوتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ عفریت جن میں ایسے خارقِ عادت کام انجام دینے کی طاقت کیونکر ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب تو ہم اعجاز سے متعلق بحث میں دے چکے ہیں اور وہاں پر بتا چکے ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر مومن لوگ بھی زبردست ریاضتوں اور مشقتوں کی وجہ سے کچھ ایسے امور کی انجام دہی پر قادر ہو جاتے ہیں جو عموماً خلافِ معمول ہوتے ہیں لیکن ان کے کاموں میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے کیونکہ ان کے اس قسم کے کام محدود بشری طاقت کے مرہونِ منت ہوتے ہیں جبکہ معجزات کا دار و مدار خداوندِ عالم کی بے پایاں اور لایزال قدرت پر ہوتا ہے جو خود خدا کی دوسری صفات کی مانند غیر محدود ہوتی ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ عفریت جن اپنی توانائی کو ملکہ سبا کے تخت کو لانے کے لیے جناب سلیمان کی مجلس برخاست کرنے میں محدود کرتا ہے جبکہ جناب آصف بن برخیا نے اپنی توانائی کو کسی حد میں محدود نہیں کیا اگر وہ پلک جھپکنے کی بات بھی کرتے ہیں تو درحقیقت ایک کم از کم مدت کی طرف اشارہ ہے جس سے کم مدت اور کوئی ہو نہیں سکتی۔

اور مسلّم ہے کہ جناب سلیمان بھی اس قسم کے کاموں میں صالح شخص کی حمایت کریں گے کیونکہ اس طرح سے اس کا تعارف ہوگا

---

[1] یہ جواب تفسیر عیاشی میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے منقول ہے جو آپ نے تفصیل کے ساتھ یحییٰ بن اکثم کو دیا تھا (تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹۱)

اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے نہ کہ ایک عفریت کی کہ جس کی وجہ سے کوتاہ بین لوگ شک میں پڑ جائیں اور اسے اس کی پاکیزگی اور اچھائی کی دلیل سمجھنے لگ جائیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی معاشرے میں کوئی اہم کام انجام دے اور لوگوں میں بھی مقبول ہو جائے تو وہ اپنے نظریے کا پرچار بھی شروع کر دیتا ہے لہذا جناب سلیمان کی حکومت الٰہیہ میں امور مملکت کی باگ ڈور اور ان کی ترویج عفریت کے ہاتھوں میں نہیں آنی چاہیے تھی۔ بلکہ جن لوگوں کے پاس کتاب الٰہی کا کچھ علم تھا انھی کو لوگوں کے افکار و اذہان پر حکومت کرنا چاہیے تھی۔

۲۔ دو اہم چیزیں۔ طاقت اور امانت: مندرجہ بالا آیات اور سورۂ قصص کی آیت ۲۶ میں کسی اچھے اور مثالی کارکن اور کام کرنے والے کے لیے دو چیزیں اہم شرائط کے طور پر بیان ہوئی ہیں ایک طاقت و توانائی اور دوسرے امانت و دیانت داری۔

البتہ کبھی تو انسان کی اپنی فکری اور اخلاقی بنیادیں اس بات کی متقاضی ہوتی ہیں کہ اس میں یہ شرائط پائی جائیں (جیسا کہ سورۂ قصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہوا ہے) اور کبھی معاشرتی نظام اور صالح حکومت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ عفریت جن جیسے افراد بھی ان دو صفات سے ضرور متصف ہوں لیکن صورت خواہ کچھ بھی ہو جب تک معاشرے میں یہ دو بنیادی شرائط نہ پائی جائیں کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام انجام کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ شرائط خواہ انسان کے ذاتی تقویٰ کی وجہ سے پیدا ہوں یا معاشرے کے قانونی نظام کی وجہ سے (غور کیجیے گا)۔

۳۔ "علم من الکتاب" اور "علم الکتاب" میں فرق: زیر نظر آیات میں جس شخص نے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے کی تھوڑی سی مدت میں سلیمان کے دربار میں لا کر حاضر کیا اس کے بارے میں ہے کہ اس کے پاس "علم من الکتاب" (کتاب کا کچھ علم) تھا۔ جبکہ سورۂ رعد کی آیت ۴۳ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے گواہوں کی حقانیت کے بارے میں ہے:

قل کفیٰ باللہ شہیدًا بینی و بینکم و من عندہ علم الکتاب

کہہ دیجیے کہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے ایک تو خدا کافی ہے اور دوسرے وہ شخص جس کے پاس "کتاب کا علم" ہے۔

ابو سعید خدری سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (سلیمانؑ کی داستان میں مذکور) "الذی عندہ علم من الکتاب" کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کے وصی تھے۔

تو پھر میں نے "ومن عندہ علم الکتاب" کے متعلق پوچھا تو فرمایا:

ذالک اخی علی بن ابی طالب

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں[1]

"علم من الکتاب" جو جزوی علم کو ظاہر کرتا ہے اور "علم الکتاب" جو کلی علم کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

درمیان کتنا فرق ہے؟
درمیان فرق کو دیکھا جائے تو اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ جناب آصف اور حضرت علی کے
یہی وجہ ہے کہ بہت سی روایات میں ہے کہ خداوند عالم کے اس اسم اعظم کے تہتر حروف ہیں جن میں سے صرف ایک "آصف بن برخیا" کے پاس تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ایسا معجزانہ کام انجام دیا کہ پلک جھپکنے کی دیر میں تخت ملکہ سبا کو سلیمان کے قدموں میں پہنچا دیا اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے پاس بہتر حروف ہیں اور ایک حرف صرف اور صرف ذات خداوند عالم کے ساتھ مخصوص ہے[2]

۴۔ "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ": مغرور دنیا پرست جب برسر اقتدار آ جاتے ہیں تو اپنے سوا سب کچھ بھلا دیتے ہیں اور جب تمام مادی وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں تو قارون کی مانند ہر چیز کو اپنی طرف سے سمجھتے ہیں کسی اور کی جانب سے نہیں جیسا کہ قارون نے کہا ہے:

انما اوتیتہ علیٰ علم عندی

میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میرے اپنے علم کی بناء پر ہے۔ (قصص / ۷۸)

جبکہ خدا کے نیک بندے کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے اور منصب پر پہنچ جانے کے بعد بھی یہی کہتے ہیں:

ھٰذا من فضل ربی

یہ سب کچھ میرے پروردگار کا عطیہ ہے۔

پھر قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے ملکہ سبا کا تخت اپنے پاس پا کر صرف یہی نہیں کہا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ یہ اس لیے ہے تاکہ میرا خدا مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر بھی ادا کرتا ہوں یا نہیں؟

اسی سورت کے اوائل میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ جناب سلیمان اپنی تمام نعمتوں کو خداوند عالم کا عطیہ سمجھتے ہیں اور نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں:

پروردگارا! مجھے ان تمام نعمتوں کے شکر کی توفیق عطا فرما اور اپنی رضا کے حصول کی توفیق دے۔

مغرور دنیا پرستوں اور خدا کے خالص توحید پرستوں کے فرق کا یہی معیار ہے اور کم ظرف خود پرستوں اور باظرف و باکردار شخصیتوں میں یہی فرق ہے۔

اگرچہ اب یہ معمول سا بن گیا ہے کہ بعض ظاہر پسند اور ریاکار لوگ جناب حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس معنی خیز جملے "ھٰذا من فضل ربی" کو اپنے طاغوتی محلات اور عمارتوں کی پیشانی پر بڑے جلی حروف میں تحریر کرتے ہیں

حاشیہ پچھلے صفحہ کا: اس حدیث کو بہت سے مفسرین اور علماءِ اہل سنت نے بیان فرمایا ہے بالکل اس عبارت کے ساتھ یا اس سے ملتی جلتی عبارت کے ساتھ۔ مزید تفصیل کے لیے احقاق الحق کی تیسری جلد ص ۲۸۰ اور ص ۲۸۱ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] اصول کافی اور تفسیر نور الثقلین کی طرف رجوع فرمائیں۔

جبکہ نہ تو اس پر ان کا ایمان ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے عمل سے ذرہ برابر بھی کوئی اشارہ ملتا ہے۔

لیکن جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح عمارتوں کی پیشانی پر اسے جلی حروف میں لکھا جاتا ہے اسی طرح یہ انسان کی اپنی پیشانی پر اور اس کے دل میں بھی نقش ہو اور وہ اپنے عمل سے یہ بات ظاہر کرے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ فضلِ خداوندی ہے اور اسی کی جانب سے عطا کردہ ہے۔ پھر اس کا شکر بھی بجا لائے اور شکر بھی ایسا جو اس کے اعمال اور وجود سے ظاہر ہو نہ کہ صرف زبان سے[1]

۵۔ تخت کو کیسے حاضر کر دیا؟ یہ پہلا خارقِ عادت کام نہیں ہے جو ہم حضرت سلیمان علیہ السّلام کی داستان میں پڑھ رہے ہیں یا بطور کلی انبیاء کی داستان میں دیکھ رہے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی تعبیرات کی توجیہ کرکے ان کے ظاہری معنی کو بدل دینا چاہتے ہیں اور انھیں کنایہ یا کوئی اور معنوی رنگ دینا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ انبیاء کے معجزات کے بارے میں اپنے نظریے کا دو ٹوک اظہار کریں اور بتائیں کہ معجزات کے بارے میں ان کا کیا عقیدہ ہے۔ کیا وہ انبیاء یا ان کے جانشینوں سے خارقِ عادت کاموں کے انجام پانے کو محال سمجھتے ہیں اور مکمل طور پر اس کا انکار کرتے ہیں؟

اگر ان کا یہی عقیدہ ہے تو پھر یہ عقیدہ نہ تو توحید اور کائنات پر حکم فرما قدرتِ خداوندی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے جو تمام قوانینِ ہستی پر حکم فرما ہیں اور نہ ہی قرآن کی بہت سی صریح آیات سے مطابقت رکھتا ہے۔

لیکن اگر وہ معجزے کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر حضرت عیسیٰ کے ہاتھوں مُردوں کا زندہ ہونا ہو یا مادر زاد اندھوں کو شفا ملنا ہو یا آصف بن برخیا کے ذریعے سبا سے ملکہ کا تخت آنا ہو ان سب میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں پر مرموز روابط اور ان جانی علتیں کار فرما ہیں جن سے ہمارا محدود علم بالکل ناآشنا ہے۔ ہم تو صرف اس قدر جانتے ہیں کہ اس قسم کا کام محال ہرگز نہیں ہے۔

آیا آصف بن برخیا نے ملکہ سبا کے تخت کو نور کی لہروں میں تبدیل کرکے ایک ہی لمحے میں لے سلیمان کے پاس پہنچایا اور دوبارہ اسے اپنے اصلی مادے میں تبدیل کر دیا؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمیں اس کا پورا علم نہیں ہے۔

ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ سائنس کی موجودہ ترقی کے ذریعہ آج انسان ایسے ایسے کارنامے انجام دے رہا ہے کہ اگر ان کارناموں کا ذکر آج سے دو سو سال قبل کیا جاتا تو ممکن ہے لوگ اسے محال سمجھتے۔ مثلاً اگر چند سو سال پہلے کسی کو کہا جاتا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اگر ایک شخص مشرق میں بیٹھ کر گفتگو کرے گا تو اسی وقت مغرب میں رہنے والے لوگ اس کی باتوں کو بھی سنیں گے اور اس کی صورت کو بھی دیکھیں گے تو اس زمانے کے لوگ اسے مجذوب کی بڑ یا پریشان خیالی کا نمونہ سمجھتے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان ہر چیز کو اپنے محدود علم کے پیمانوں میں پرکھنا چاہتا ہے جبکہ اس کے علم و قدرت کے ماوراء کروڑوں اسرار و رموز موجود ہیں۔

---

[1] شکر کی اہمیت اور نعمتوں کی فراوانی میں اس کی تاثیر اور شکر کی اقسام (شکر تکوینی اور شکر تشریعی) کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورۂ ابراہیم کی آیت ۷ کے ذیل) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

۴۱۔ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ
لَا يَهْتَدُوْنَ ○
۴۲۔ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ○
۴۳۔ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ
قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ○
۴۴۔ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِى الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ
سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ
نَفْسِىْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ترجمہ

۴۱۔ (سلیمانؑ نے) کہا: اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کر دو تاکہ ہم دیکھیں کہ وہ سمجھتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو ہدایت نہیں پائیں گے۔

۴۲۔ جب وہ آگئی تو اسے کہا گیا کہ کیا تمھارا تخت اس جیسا ہے (جواب میں) اس نے کہا: یہ تو خود وہی معلوم ہوتا ہے، ہم تو پہلے ہی جان چکے تھے اور اسلام لا چکے تھے۔

۴۳۔ اور اسے (سلیمانؑ نے) غیر خدا کی عبادت سے روک دیا کیونکہ وہ کافروں میں سے تھی۔

۴۴۔ اسے کہا گیا کہ محل کے صحن میں داخل ہو جائے لیکن جب اس نے دیکھا تو سمجھا کہ یہ پانی کی نہر ہے اس نے (گزرنے کے لیے پائنچے اٹھائے اور) اپنی پنڈلیاں ظاہر کر دیں (لیکن سلیمان نے) کہا یہ (پانی نہیں بلکہ) صاف بلور کا محل ہے (ملکہ سبا) کہنے لگی: پروردگارا! میں تو اپنے آپ پر ظلم کرتی رہی اور اب سلیمان کے ساتھ مل کر عالمین کے پروردگار کو تسلیم کرتی ہوں۔

تفسیر

ملکہ سبا کے دل میں نور ایمان

ان آیات میں سلیمان اور ملکہ سبا کی سبق آموز داستان سے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سباء کی عقل وخرد کو آزمانے اور خدا پر اس کے ایمان لانے کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ پہچانا نہ جا سکے چنانچہ انھوں نے کہا: اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کر دو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو ہدایت نہیں پاتے (قال نکروا لھا عرشھا ننظر اتھتدی ام تکون من الذین لا یھتدون)۔

اگرچہ ملکہ کے تخت کا سبائے شام میں آجانا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ وہ اسے آسانی کے ساتھ نہ پہچان سکے لیکن اس کے باوجود جناب سلیمان نے حکم دیا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کر دی جائیں۔ ممکن ہے کہ یہ تبدیلیاں بعض علامتوں اور جواہرات کو ادھر اُدھر کرکے کی گئی ہوں یا بعض رنگوں کو تبدیل کر دیا گیا ہو لیکن یہاں پر جو سوال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آخر جناب سلیمان، اس کی عقل وخرد اور فہم وذکا کو کیوں آزمانا چاہتے تھے۔

ہو سکتا ہے اس لیے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ اس کے ساتھ کس انداز میں پیش آنا چاہیے اور اپنے عقیدے کے اثبات کے لیے کون سی دلیل پیش کرنی چاہیے۔

یا ان کا خیال تھا کہ اسے شادی کی پیش کش کریں لہذا وہ دیکھنا یہ چاہتے تھے کیا اس میں آپ کی زوجیت کی لیاقت بھی ہے یا نہیں؟ یا ہو سکتا ہے کہ اس کے ایمان لانے کے بعد کچھ اہم امور کی ذمہ داری اسے سونپنا چاہتے ہوں لہذا وہ اس طرح سے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت کو جاننا چاہتے ہوں۔

"اتھتدی" کے بارے میں دو تفسیریں ذکر ہوئی ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس کے اپنے تخت کی پہچان ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد معجزات دیکھ کر راہِ خدا کی ہدایت حاصل کرنا ہے۔

لیکن ظاہراً پہلا معنی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے اگرچہ پہلا معنی دوسرے معنی کا مقدمہ ہے۔

صورتِ حال خواہ کچھ ہو جب ملکہ پہنچی تو کسی نے (تخت کی طرف اشارہ کرکے) کہا: کیا آپ کا تخت اسی طرح کا ہے (فلما جاءت قیل اھکذا عرشك)۔

ظاہراً یہ جملہ کہنے والے خود حضرت سلیمانؑ نہیں تھے ورنہ "قیل" (کہا گیا) کی تعبیر مناسب نہیں تھی کیونکہ جناب سلیمان کا نام اس سے پہلے آچکا ہے اور بعد میں بھی۔ اور ان کی باتوں کو "قال" کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

پھر جناب سلیمانؑ کے شایانِ شان بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے آتے ہی اپنی بات کا آغاز ان الفاظ سے کرتے۔

لیکن سوال خواہ کسی نے کیا ہو ملکہ سبا نے نہایت ہی زیرکانہ انداز میں ایک بہت ہی شستہ اور جچا تلا جواب دیتے ہوئے کہا

یہ تو خود وہی تخت معلوم ہوتا ہے (قالت کانہ ھو)۔

اگر وہ کہتی کہ اس جیسا ہے تو جواب صحیح نہ ہوتا اور اگر کہتی کہ بالکل وہی ہے تو خلاف احتیاط بات تھی کیونکہ اس قدر لمبے فاصلوں سے اس کے تخت کا سرزمینِ سلیمان میں آنا عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہے معجزہ۔

اس کے علاوہ تاریخ میں ہے کہ ملکہ نے اپنے اس گراں قیمت تخت کی بڑی حفاظت کی تھی اسے اپنے خصوصی محل کے خاص کمرے میں اہم مقام پر نصب کیا ہوا تھا جس کی حفاظت کے لیے خصوصی دستہ مقرر تھا اور اس محل کو نہایت مضبوط دروازے لگے ہوئے تھے۔

لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود ملکہ نے اپنے تخت کو پہچان لیا تھا۔

اس نے فوراً کہا: ہم تو اسے پہلے ہی جان چکے تھے اور سر تسلیم خم کر چکے تھے (واوتینا العلم من قبلھا وکنا مسلمین)۔

گویا وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ ان سارے کاموں سے سلیمان کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس کے معجزے پر ایمان لے آئیں لیکن ہم تو اس سے پہلے ہی دوسری علامتوں کی وجہ سے ان کی حقانیت کے معترف ہو چکے ہیں اور ان غیر معمولی چیزوں کو دیکھنے سے پہلے ہی ان پر ایمان لا چکے ہیں اس طرح کے کاموں کی اب چنداں ضرورت نہیں تھی۔

تو اس طرح سے (سلیمان نے) اسے ہر غیر خدا کی عبادت سے روک دیا (وصدھا ما کانت تعبد من دون اللہ)[1]

ہر چند کہ وہ اس سے پہلے کافروں میں سے تھی (انھا کانت من قوم کافرین)۔

تو اس نے یہ واضح اور روشن علامات دیکھ کر اپنے تاریک ماضی کو الوداع کہا اور اپنی زندگی کے نئے مرحلے میں قدم رکھا، جو نورِ ایمان ویقین سے بھرپور تھا۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں اس داستان کا ایک اور منظر پیش کیا گیا ہے اور وہ ہے ملکہ سباء کا حضرت سلیمانؑ کے

---

[1] "صد" کا فاعل کون ہے اور اسی طرح "ما کانت" میں "ما" موصولہ ہے یا مصدریہ؟ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں۔ بعض نے (جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں) اس کا فاعل سلیمان کو جانا ہے اور بعض نے خداوند عالم کو۔ لیکن نتیجے کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ان دونوں تفسیروں کے مطابق "ھا" کی ضمیر مفعول اوّل ہے اور "ما کانت" حرف "جار" کے حذف کے ساتھ دوسرا مفعول ہے اور اس کی تقدیر یوں ہوگی "صدھا سلیمان۔ یا صدھا اللہ عما کانت تعبد من دون اللہ" لیکن بعض دوسرے مفسرین نے "ما کانت" کو "صدھا" کا فاعل جانا ہے تو ایسی صورت میں اس کا معنی یوں ہوگا: ملکہ کے معبودوں نے اسے حق کی پرستش سے روک دیا۔ لیکن چونکہ یہاں پر اس کے ایمان کی گفتگو ہو رہی ہے نہ کہ کفر کی۔ لہذا پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ "ما" یہاں پر موصولہ ہو یا مصدریہ ہو۔

حضرت سلیمانؑ نے حکم دے دیا تھا کہ ان کے ایک محل کے صحن کو بلور سے تیار کیا جائے اور اس کے نیچے پانی چلا دیا جائے ۔

توجب ملکہ سبا وہاں پہنچی تو اسے کہا گیا کہ محل کے صحن میں داخل ہوجاؤ (قيل لها ادخلی الصرح)[۱]۔

ملکہ نے جب صحن کو دیکھا تو اس نے سمجھا کہ پانی کی نہر چل رہی ہے اس نے پنڈلی سے کپڑا اٹھایا تاکہ پانی کو عبور کرے (اور وہ تعجب میں غرق تھی کہ پانی کی نہر کا یہاں کیا کام؟) (فلما رأته حسبته لجة وكشفت عن ساقيها)[۲]

لیکن سلیمان نے اسے کہا محل کا صحن صاف و شفاف بلور سے بنا ہوا ہے (یہ پانی نہیں ہے کہ جسے عبور کرنے کے لیے تم نے پائنچے اٹھا رکھے ہیں) ۔ (قال انه صرح ممرد من قوارير)[۳]۔

اس مقام پر ایک نہایت ہی اہم سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ جناب سلیمانؑ اللہ کے ایک عظیم پیغمبر تھے وہ اس قدر آرائشی اور زیبائشی کاموں میں کیوں لگ گئے ؟ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک بادشاہ اور فرمانروا تھے لیکن دوسرے انبیاءؑ کی طرح کیا وہ سادگی کو اختیار نہیں کرسکتے تھے ؟

جواباً عرض ہے کہ اگر حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو مسلمان بنانے کے لیے اس طرح کی آرائش و زیبائش سے کام لیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے ؟ خصوصاً جبکہ ملکہ اپنی تمام طاقت و عظمت خوبصورت تاج و تخت ، باشکوہ محل و قصر اور زرق برق آرائش و زیبائش میں ہی سمجھتی تھی چنانچہ جب حضرت سلیمان نے اسے اپنی سلطنت کی ایک جھلک دکھائی تو ملکہ کی آنکھوں کے سامنے اپنی حکومت کی تمام سج دھج ماند پڑ گئی اور حقیر دکھائی دینے لگی اور یہی بات اس کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوئی جس میں اسے اقدار اور معیارِ زندگی کے بارے میں تبدیلی کرنا پڑی ۔

آخر اس بات میں کیا حرج ہے کہ انھوں نے نقصان دہ اور خونریز لشکر کشی کی بجائے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ ملکہ کا دماغ چکرانے لگا وہ اس قدر مبہوت ہوگئی کہ جنگ کا تصور ہی اس کے دماغ سے کافور ہوگیا خصوصاً جبکہ وہ ایک عورت تھی اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس قسم کے تکلفات ہوتے ہیں کیونکہ عورت ایسے تکلفات کو بہت اہمیت دیتی ہے ۔

بہت سے مفسرین نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ ملکہ سبا کے سرزمین شام میں قدم رکھنے سے پہلے حضرت سلیمان نے حکم

۱۔ "صرح" (بروزن "طرح") کا ایک معنی تو وسیع و عریض فضا ہے اور دوسرا معنی بلند و بالا عمارت یا محل ۔ لیکن یہاں پر بظاہر محل کے دالان کے معنی میں ہے ۔

۲۔ "لجه" دراصل "لجاج" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی کام کی انجام دہی میں سختی کرنا ۔ پھر گلے میں آواز کی آمد و رفت پر "لجہ" (بروزن "ضجّہ") کا اطلاق ہونے لگا اور سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کو "لجہ" (بروزن "جُبّہ") کہتے ہیں ۔ مذکورہ آیت میں موجزن اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ ہے ۔

۳۔ "ممرد" کے معنی "صاف و شفاف" کے ہیں اور "قوارير" "قارورة" کی جمع ہے جس کا معنی بلور اور شیشہ ہے ۔

جاری کردیا تھا کہ اس قسم کا ایک عظیم محل تیار کیا جائے جس سے ان کا مقصد ملکہ کو مطیع کرنے کے لیے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ظاہری طاقت کے لحاظ سے بھی عظیم جناب سلیمان کے پاس ایک بڑی طاقت ہے جس کے ذریعے انھوں نے ایسا کام انجام دیا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں ایک وسیع و عریض علاقے کا امن و امان ، دینِ حق کی قبولیت اور بے پناہ جنگی اخراجات سے بچنے کے لیے اس قسم کے اخراجات کوئی بڑی بات نہیں تھے ۔

یہی وجہ ہے کہ جب ملکہ سبا نے ان مناظر کو دیکھا تو فوراً کہا : پروردگارا ! میں نے تو اپنے اوپر ظلم کیا ہے (قالت رب انی ظلمت نفسی)۔

اور اب میں سلیمان کے ساتھ مل کر اس اللہ کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کرچکی ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے (واسلمت مع سليمان لله رب العالمين)۔

میں پہلے سورج کی پوجا کیا کرتی تھی ، زیب و زینت میں کھو چکی تھی اور خود کو دنیا کا سب سے بہتر اور برتر انسان سمجھتی تھی ۔

لیکن اب پتہ چلا ہے کہ میری طاقت کتنی کمزور اور حقیر تھی بلکہ اصولی طور پر یہ زر و جواہر اور قیمتی زیورات انسانی روح کو کبھی سیراب نہیں کرسکتے ۔

خداوندا ! میں اپنے رہبر سلیمان کے ساتھ مل کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوں ، اپنے کیے پر نادم ہوں اور تیرے آستانِ قدس پر میں نے اپنا سر جھکا دیا ہے ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں پر لفظ "مع" استعمال کیا گیا ہے (یعنی سلیمانؑ کے ساتھ) تاکہ واضح ہوجائے کہ راہِ خدا میں سب برابر ہیں نہ کہ ظالم اور جابر بادشاہوں کی مانند کہ جن کے ہاں ایک دوسرے پر مسلّط ہوتا ہے خدا کے سامنے نہ کوئی غالب ہے اور نہ مغلوب ، جب حق کو قبول کرلیا تو سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ ملکہ سبا اس سے پہلے بھی اپنے ایمان کا اعلان کرچکی تھی جیسا کہ ہم گزشتہ آیات میں اس کی اپنی زبانی سُن چکے ہیں کہ :

واوتينا العلم من قبلها وكنا مسلمين

ہم اس تخت کو یہاں پر لائے جانے سے پہلے ہی جان چکے تھے اور اسلام قبول کرچکے تھے ۔

لیکن اس مرحلے پر پہنچ کر ملکہ کا اسلام اپنے عروج کو جا پہنچا لہٰذا اس نے پہلے سے زیادہ زوردار طریقے سے اس کا اظہار کیا ۔

ملکہ دعوتِ سلیمان کی حقانیت کی علامتیں پہلے سے دیکھ چکی تھی :

ہُدہُد کا اس خاص انداز میں آنا ۔

ملکہ کی طرف سے ارسال شدہ عظیم تحائف کا واپس لوٹا دینا ۔

مختصر سے عرصہ میں دور دراز کے سفر سے اس کا تخت یہاں پر لانا۔

المختصر سلیمان کی انتہائی زیادہ عظمت و طاقت کا مشاہدہ کرنا اور پھر اس سب کچھ کے باوجود جناب سلیمان کا عظیم اخلاق دیکھنا کہ جو بادشاہوں کے اخلاق سے ذرّہ بھر بھی مشابہت نہیں رکھتا۔

چند اہم نکات

۱۔ ملکہ سباء کا انجام :۔ ملکہ سبا کے بارے میں جو کچھ قرآنِ مجید نے بیان کیا ہے وہی ہے جو ہم نے ابھی پڑھا ہے۔ آخر کار وہ ایمان لے آئی اور صالحین کے کارواں میں شامل ہو گئی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ ایمان اختیار کرنے کے بعد اپنے ملک کو واپس لوٹ گئی اور سلیمان کی طرف سے ملک پر حکمرانی کرتی رہی یا سلیمان کے پاس رہ گئی اور انھی کے ساتھ شادی کر لی، یا سلیمان کے مشورے پر یمن کے کسی بادشاہ جسے "تبع" کہا جاتا تھا، کے ساتھ عقد کر لیا۔ اس بارے میں قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔

چونکہ قرآن کا ہدف اصلی تربیتی مسائل بیان کرنا ہے اور یہ بات ان مسائل سے غیر متعلق تھی لہٰذا اسے بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی لیکن مفسرین اور مورخین نے اس بارے میں مختلف راستے اختیار کیے ہیں جن کی تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین کے بقول مشہور و معروف یہی ہے کہ وہ حضرت سلیمان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی[۱]

البتہ اس مقام پر اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جناب سلیمان اور ان کے لشکر و حکومت کے بارے میں نیز ملکہ سباء اور اس کی تفصیلی زندگی کے بارے میں بہت ہی افسانہ طرازی کی گئی ہے کہ بعض مواقع پر تو عوام الناس کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور بعض موقعوں پر اس صحیح تاریخی واقعے پر ایسے تاریک پردے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس کی اصلیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ ان خرافات کا غلط نتیجہ ہوتا ہے جو حقائق کے ساتھ ملا دیئے جاتے ہیں لہٰذا ایسے خرافات سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے۔

۲۔ سلیمان کی داستان کا خلاصہ :۔ حضرت سلیمان کے حالات کا کچھ حصہ جو مندرجہ بالا تیس آیات میں ذکر ہوا ہے، بہت سے مسائل بیان کرتا ہے کہ جن میں سے کچھ تو ہم تفصیلی طور پر پڑھ چکے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ یہ داستان، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کو خدا کی طرف سے علم ہونے کے ذکر سے شروع ہوتی ہے، توحید و فرمانِ الٰہی کے سامنے جھک جانے پر ختم ہو جاتی ہے اور توحید بھی ایسی کہ جس کا مرکز "علم" ہے۔

۲۔ یہ داستان بتاتی ہے کہ کسی پرندے کا غائب ہو جانا اور کسی علاقے پر اس کا پرواز کرنا بعض اوقات کسی ملّت کی تاریخ کے دھاروں کو بھی بدل سکتا ہے اسے شرک سے ایمان کی طرف اور برائی سے اچھائی کی طرف پلٹا سکتا ہے اور یہی چیز پروردگارِ عالم کی قدرتِ کاملہ اور حکومتِ حقہ کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔

---

[۱] روح المعانی از آلوسی۔

۳۔ اس داستان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نور توحید تمام دلوں میں جلوہ فگن ہے حتیٰ کہ ایک پرندہ بھی جو ظاہراً خاموش ہے توحید کے اسرار پوشیدہ کی خبر دیتا ہے۔

۴۔ کسی انسان کو اس کی اصلی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلانے اور اسے اللہ کی طرف ہدایت دینے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کی رعونت اور تکبر کو توڑا جائے تاکہ آنکھوں پر پڑے ہوئے تاریک پردے اس کی حقیقت بین نگاہوں کے آگے سے ہٹ جائیں جیسا کہ جناب سلیمان نے دو کام کر کے ملکہ کے غرور و تکبر کو چکنا چور کر دیا، ایک تو اس کا تخت منگا کر اور دوسرے اپنے محل کے ایک حصّے میں اسے مغالطے میں ڈال کر۔

۵۔ انبیاء کرام کی حکومت میں ان کا منتہائے مقصود کشور کشائی نہیں ہوتا بلکہ وہی کچھ ہوتا ہے جو اس سلسلے کی آخری آیت میں ہم نے پڑھا ہے یعنی سرکش لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں اور رب العالمین کے حضور سرِ تسلیم خم کر دیں اسی لیے قرآنِ مجید نے بھی اس داستان کا اختتام اسی نکتے پر کیا ہے۔

۶۔ "ایمان" کی روح "تسلیم" ہے یہی وجہ ہے کہ جناب سلیمانؑ نے بھی اپنے خط میں اسی بات پر زور دیا تھا اور ملکہ سبا بھی آخر میں یہی کہتی ہے۔

۷۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی انسان کے پاس دنیا کی بہت طاقت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اسے پرندے جیسی کمزور سی مخلوق کی ضرورت پڑ جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اس کے علم سے بلکہ اس کے کام سے بھی استفادہ کرتا ہے اور کبھی چیونٹی جیسی کمزور و ناتواں مخلوق اس کی تحقیر کر دیتی ہے۔

۸۔ ان آیات کا مکہ میں اس وقت نازل ہونا جب مسلمان زبردست مشکلات کا شکار تھے اور دشمن نے ہر طرف سے ان کا گھراؤ کر رکھا تھا، مسلمانوں کی دلجوئی اور ان کی تقویت کا باعث تھا اور انھیں مستقبل میں خدا کی طرف سے کامیابیوں کی امید دلانے کا باعث تھا۔

۴۵۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ○

۴۶۔ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

۴۷۔ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ○

ترجمہ

۴۵۔ اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ خدائے واحد کی عبادت کرو، لیکن وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر جھگڑا کرنے لگے۔

۴۶۔ (صالح نے) کہا: اے میری قوم! تم نیکی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی کرتے ہو (اور عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہو اس کی رحمت کو نہیں) خداوند عالم سے اپنی بخشش کی درخواست کیوں نہیں کرتے ہو تاکہ تم بھی رحمتِ الٰہی میں شامل ہو جاؤ۔

۴۷۔ انھوں نے کہا: ہم نے تمھیں بھی اور جو لوگ تمھارے ساتھ ہیں انھیں بھی فالِ بد سمجھا ہے (صالح نے) کہا بد (اور نیک) فال تو خدا کے پاس ہے (اور تمھاری تقدیر اسی سے وابستہ ہے) تم ایسے لوگ ہو جنھیں آزمایا جا رہا ہے۔

تفسیر

حضرت صالحؑ اپنی قوم کے سامنے

گزشتہ آیات میں خداوند عالم کے تین پیغمبروں موسیٰ، داؤد اور سلیمان علیہم السلام کا تذکرہ ہے اب یہاں پر جس چوتھے نبی اور اس کی قوم کا ذکر ہوا ہے وہ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی صالح کو بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو عبادتِ خدا کی دعوت دیں (ولقد ارسلنا الی ثمود اخاھم صالحًا ان اعبدوا اللہ)۔[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ انبیاء کی داستان میں "اخاھم" (ان کے بھائی) کی تعبیر کا مقصد ان انبیاء کے اپنی قوم سے نہایت دلسوزی اور محبت کے اظہار کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور بعض مقامات پر اس کے علاوہ رشتہ داری کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

بہرحال اللہ کے اس باعظمت نبی کی دعوت اور تبلیغ کو صرف ایک جملے میں خلاصہ کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ "ان اعبدوا اللہ" یقیناً عبادتِ خداوندی ہی تمام خدائی پیغمبروں کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: وہ لوگ صالح کی دعوت کے سلسلے میں دو حصوں میں بٹ گئے اور لڑنے جھگڑنے لگے (ایک طرف مومن تھے اور دوسری طرف ضدی مزاج منکر)۔ (فاذاھم فریقان یختصمون)۔[2]

سورۂ اعراف کی ۷۵، ۷۶ اور ۷۶ویں آیت میں ان دو گروہوں کو "مستکبرین" اور "مستضعفین" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:

قال الملأ الذین استکبروا من قومہ للذین استضعفوا لمن اٰمن منھم اتعلمون ان صالحًا مرسل من ربہ قالوا انا بما ارسل بہ مؤمنون۔
قال الذین استکبروا انا بالذی اٰمنتم بہ کافرون

قوم صالح کے بڑے بڑے مستکبرین نے مستضعف مومنین سے کہا کیا تمھیں یقین ہے کہ صالح اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ہیں؟ تو انھوں نے کہا جی ہاں! ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو وہ لے کر آئے ہیں، لیکن مستکبرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

البتہ مومنین اور کافرین کے درمیان اس قسم کی لڑائی اکثر انبیاء کے زمانے میں رہی ہے ہر چند کہ بعض انبیاء تو اتنی مقدار میں بھی طرف داروں سے محروم رہے ہیں اور تقریباً سب لوگ ان کے منکرین کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے انھیں بیدار کرنے کے لیے انھیں تنبیہ کرنا شروع کی اور دردناک عذاب میں مبتلا ہونے سے بچانے کی کوشش کی، لیکن ان لوگوں نے نہ صرف نصیحت حاصل نہ کی اور بیدار نہ ہوئے بلکہ اسی چیز کو اپنی ہٹ دھرمی کی ایک

---

[1] "ان اعبدوا اللہ" کا جملہ اس حرفِ جر کے ساتھ مجرور ہے جو مقدر ہے اور اس کی اصل یوں ہے "ولقد ارسلنا الی ثمود اخاھم صالحًا بعبادۃ اللہ"۔

[2] "فریقان" تثنیہ ہے اور اس کا فعل "یختصمون" جمع کی صورت میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فریق ایک گروہ سے تشکیل پاتا ہے اور مل ملا کر ایک مجموعہ بنتا ہے۔

آڑ بنا کر اس بات پر اصرار کرنے لگے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر ہم پر عذاب الٰہی کیوں نازل نہیں ہوتا ؟ (یہی چیز سورہ اعراف کی آیت ۷۷ میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے)۔

لیکن صالح علیہ السّلام نے انھیں کہا : اے میری قوم ! تم نیکیوں کی کوشش اور ان کی تلاش سے پہلے ہی عذاب اور برائیوں کے لیے جلدی کیوں کرتے ہو؟ (قال یاقوم لم تستعجلون بالسیئة قبل الحسنة)۔

تم اپنی تمام تر فکر عذاب الٰہی کے نازل ہونے پر ہی کیوں مرکوز کرتے ہو ؟ اگر تم پر عذاب نازل ہوگیا تو پھر تمھارا خاتمہ ہوجائے گا اور ایمان لانے کا موقع بھی ہاتھ سے چلا جائے گا ۔ آؤ اور خدا کی برکت اور اس کی رحمت کے ساتھ ایمان کے زیر سایہ میری سچائی کو آزماؤ ، تم خدا کی بارگاہ سے اپنے گناہوں کی بخشش کا سوال کیوں نہیں کرتے ؟ تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہوجاؤ (لو لا تستغفرون الله لعلكم ترحمون)۔

صرف برائیوں اور عذاب نازل ہونے کا تقاضا کیوں کرتے ہو؟ یہ ہٹ دھرمی اور پاگل پن کی باتیں آخر کس لیے ؟

یہ صرف صالح علیہ السّلام کی قوم کے افراد ہی نہیں تھے جنھوں نے ان کی دعوت کو ٹھکرا کر موعود عذاب کا تقاضا کیا بلکہ قرآن مجید میں اس قسم کے اور بھی کئی واقعات ملتے ہیں جن میں سے ایک قوم ہود کا واقعہ بھی ہے ۔ ملاحظہ ہو سورۂ اعراف آیت ۷۰۔ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سرکش متعصب مشرکین کے بارے میں ہے :

وإذ قالوا اللهم ان كان هذا هو الحق من عندك فامطر علينا حجارة من السماء او ائتنا بعذاب اليم

وہ وقت یاد کرو جب انھوں نے کہا : پروردگارا ! اگر محمد کی یہ دعوت برحق ہے اور تیری جانب سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا ، یا ہمیں دردناک عذاب میں مبتلا کردے ۔

(انفال / ۳۲)

یہ بات واقعاً عجیب ہے کہ انسان دعوائے محبت کی صداقت کو تباہ کن عذاب کے ذریعے جانچ رہا ہے نہ کہ رحمت کا سوال کرکے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ قلبی طور پر انبیاء کرام علیہم السّلام کی صداقت کے معترف تھے لیکن زبان سے اس کا انکار کیا کرتے تھے ۔

اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے کوئی شخص علم طب کا مدعی ہو اور اسے معلوم ہو کہ فلاں دوا سے صحت اور شفا حاصل ہوتی ہے اور فلاں سے انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے لیکن وہ ایسی دوا حاصل کرنے کی کوشش کرے جو مہلک ہے نہ کہ وہ جو مفید اور شفابخش ہے ۔

یہ جہالت ، نادانی اور تعصب کی نہایت ہی بدترین مثال ہوگی اور جہالت کے اس قسم کے بہت سے نمونے ملتے ہیں ۔

بہرحال اس سرکش قوم نے اس عظیم پیغمبر کی ہمدردانہ نصیحتوں کو دل کے کانوں سے سننے اور ان پر عمل درآمد کرنے کی بجائے واہیات اور بے کار باتوں کے ذریعے ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی ، منجملہ اور باتوں کے انھوں نے کہا ہم تمھیں اور جو لوگ تمھارے ساتھ ہیں سب کو ایک بری فال سمجھتے ہیں (قالوا اطيرنا بك وبمن معك)۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ سال خشک سالی اور قحط سالی کا تھا اسی لیے وہ صالح علیہ السّلام سے کہنے لگے کہ یہ سب کچھ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے نامبارک قدموں کی بدولت ہوا ہے ۔ تم منحوس لوگ ہو ہمارے معاشرے میں تم ہی بدبختی اور نحوست لائے ہو وہ بری فال کو اس بہانے سے جو درحقیقت بے کار اور شریر لوگوں کا بہانہ ہوتا ہے ، جناب صالح علیہ السّلام کے وزنی دلائل کو کمزور کرنا چاہتے تھے ۔

لیکن جناب صالحؑ نے جواب میں کہا : بری فال (اور تمھارا نصیب) تو خدا کے پاس ہی ہے (قال طائركم عند الله)۔

اسی نے تمھارے اعمال کی وجہ سے تمھیں ان مصائب میں ڈال دیا ہے اور تمھارے اعمال ہی تمھاری اس سزا کا سبب بنے ہیں ۔

درحقیقت تمھارے لیے یہ خدا کی ایک عظیم آزمائش ہے جی ہاں ! "تم ہی ایسے لوگ ہو جن کی آزمائش کی جائے گی" (بل انتم قوم تفتنون)۔

یہ خدا کی آزمائش ہوتی ہے اور خبردار کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں تاکہ جو لوگ سنبھل جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ سنبھل جائیں ، خواب غفلت سے بیدار ہوجائیں ، غلط راستے کو چھوڑ کر خدائی راستے کو اختیار کرلیں ۔

ایک نکتہ

"فال" اور "تطیّر" : "تطیّر" (بدشگونی) "طیر" کے مادہ سے پرندے کے معنی میں ہے ۔ چونکہ عرب لوگ پرندوں کے ذریعے بری فال لیا کرتے تھے لہٰذا "تطیّر" بری فال (بدشگونی) کے معنی میں آتا ہے ۔ جو "تفأل" یعنی نیک فال کے مقابلے میں ہے ۔

قرآن مجید میں بارہا یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بے ہودہ مشرکین ، انبیاء کرامؑ کے مقابلے میں اسی حربے سے کام لیا کرتے تھے جیسا کہ جناب موسیٰ علیہ السّلام اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں ہے کہ :

وان تصبهم سيئة يطيروا بموسى ومن معه

جب بھی فرعون والوں کو کوئی تکلیف پہنچتی تو وہ اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے ۔ (اعراف ــــ ۱۳۱)

زیر نظر آیات کے مطابق قوم ثمود کے مشرکین نے صالح علیہ السّلام کے بارے میں یہی منطق اختیار کی ۔ سورۂ یٰسٓ کے مطابق (انطاکیہ کی طرف) حضرت مسیحؑ کے نمائندوں کے مقابلے میں بھی مشرکین نے یہی منطق اپنائی اور انھیں بدشگونی کا الزام دیا ۔ (یٰسٓ ــــ ۱۸)

بات دراصل یہ ہے کہ انسان حوادثات کے اسباب و علل سے لاتعلق نہیں رہ سکتا ، اسے ہر حادثے اور وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعے کی علت کی تلاش رہتی ہے اگر تو وہ موحد اور خدا پرست ہے اور واقعات کے اسباب کا مرکز ذات

خداوند ذوالجلال کو سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اس کی حکمت کے تحت ہی ہر کام کسی حساب کے تحت انجام پاتا ہے اور قدرتی علت و معلول کے لحاظ سے بھی اپنے علم پر انحصار کرتا ہے پھر تو اس کی مشکل حل ہوجاتی ہے ورنہ موہوم اور خرافاتی علتوں کا ایک سلسلہ از خود گھڑنا شروع کر دیتا ہے کہ جس کی نہ تو کوئی حد ہوتی ہے اور نہ ہی حساب! جس کا ایک واضح نمونہ یہی بدشگونی کا نظریہ ہے۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں تھا کہ اگر پرندہ ان کی دائیں طرف سے گزر جاتا تو اسے نیک فال اور کامیابی کی دلیل سمجھتے تھے اور اگر بائیں طرف سے حرکت کرتا تو اسے بدشگونی تصور کرتے اور اپنی ناکامی اور شکست کی دلیل سمجھتے ان کے اندر اس قسم کے اور بھی کئی خرافات اور موہومات پائے جاتے تھے۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی کچھ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ان خرافات اور موہومات پر بہت ایمان رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا خدا پر ایمان نہیں ہوتا اگرچہ جدید علم کے لحاظ سے وہ بہت بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں حتیٰ کہ ایک نمکدانی کا زمین پر گر جانا انھیں سخت پریشان کر دیتا ہے اور جس گھر یا میز یا کرسی کا نمبر ۱۳ ہو وہ اس سے گھبرا جاتے ہیں۔ اب بھی رمّالوں اور فال نکالنے والوں کا بازار گرم ہے اور یہ مسئلہ ابھی تک بہت رائج ہے۔

لیکن قرآن صرف ایک مختصر سے جملے میں اس بات کا جواب دیتا ہے کہ "طائركم عند الله" یعنی تمھارا بخت و طالع، فتح و شکست اور کامیابی و ناکامی غرض سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ خدا جو صاحبِ حکمت ہے اور اپنی نعمتیں، لیاقتوں اور صلاحیتوں کی بنا پر عطا کرتا ہے جو انسان کے ایمان و عمل اور گفتار و کردار کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

تو اس طرح اسلام اپنے پیروکاروں کو خرافات سے حقیقت اور بے راہروی سے صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے۔

(فال اور شگون کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۴ سورہ اعراف کی ۱۳۱ ویں آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے)

۴۸۔ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝

۴۹۔ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝

۵۰۔ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝

۵۱۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

۵۲۔ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

۵۳۔ وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝

ترجمہ

۴۸۔ اور اس شہر میں نو ٹولے تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح کرنے والے نہیں تھے۔

۴۹۔ انھوں نے کہا آؤ اور خدا کی قسم اٹھاؤ کہ اس (صالح) پر اور اس کے خاندان پر شب خون ماریں گے اور انھیں قتل کر دیں گے پھر اس کے خون کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہمیں اس کے اہل خاندان کی ہلاکت کی کوئی خبر نہیں ہے اور ہم اپنی اس بات میں بالکل سچے ہیں۔

۵۰۔ انھوں نے ایک اہم منصوبہ بنایا اور ہم نے بھی اہم منصوبہ بنایا جبکہ وہ اس سے بے خبر تھے۔

۵۱۔ تو دیکھو کہ ان کی سازش کا کیا انجام ہوا؟ کہ ہم نے انھیں اور ان کی ساری قوم کو نیست و نابود کر دیا۔

۵۲۔ سو یہ ان کے گھر ہیں جو ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے خالی ہو چکے ہیں اس میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانی ہے جو آگاہی رکھتے ہیں۔

۵۳۔ اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا تھا۔

تفسیر

نومفسد ٹولوں کی سازش

یہاں پر حضرت صالح اور ان کی قوم کی داستان کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے جو درحقیقت گزشتہ حصے کا تتمہ ہے اور اسی پر اس داستان کا اختتام ہوتا ہے اس میں حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کے منصوبے کا ذکر ہے جو نو کافر اور منافق لوگوں نے تیار کیا تھا اور خدا نے ان کے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

فرمایا گیا ہے: اس شہر (وادئ القریٰ) میں نو ٹولے تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے (وکان فی المدینة تسعة رهط یفسدون فی الارض ولا یصلحون)۔

چونکہ "رهط" کا معنی ہے دس سے کم یا چالیس سے کم افراد کا مجموعہ۔ اس لیے یہاں سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے ٹولے تھے جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ پالیسی تھی اور ان کی قدر مشترک زمین میں فساد پھیلانا اور اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا اور اعتقادی و اخلاقی بنیادوں کا اکھیڑنا تھا اور "لا یصلحون" اسی بات کی تاکید ہے کیونکہ بعض اوقات انسان فساد برپا کرتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ وہ اپنے کیے پر نادم ہو جاتا ہے اور پھر اصلاح کی ترکیبیں سوچتا ہے۔ لیکن حقیقی مفسد ایسا نہیں کرتے ان کا کام ہمیشہ فساد برپا کرنا ہوتا ہے وہ کبھی بھی اصلاح کی نہیں سوچتے۔ بالخصوص جبکہ "یفسدون" فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے اور بتا رہا ہے کہ ان کا یہ کام مسلسل ہوتا ہے۔

ان نو میں سے ہر گروہ کا ایک ایک سربراہ بھی تھا اور شاید ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی قبیلے کی طرف منسوب بھی تھا۔

ظاہر ہے کہ جب صالح علیہ السلام نے ظہور فرمایا اور اپنا مقدس اور اصلاحی آئین لوگوں کے سامنے پیش کیا تو ان ٹولوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت کے مطابق انھوں نے کہا: آؤ خدا کی قسم اٹھا کر عہد کریں کہ صالح اور ان کے خاندان پر شب خون مار کر انھیں قتل کر دیں گے پھر ان کے خون کے وارث سے کہیں گے کہ ہمیں اس کے خاندان کے قتل کی کوئی خبر نہیں اور اپنی اس بات میں ہم بالکل سچے ہیں (قالوا تقاسموا بالله لنبیتنه واهله ثم لنقولن لولیه ما شهدنا مهلك اهله وانا لصادقون)۔

"تقاسموا" فعل امر ہے جس کا معنی ہے قسم اٹھانے میں سب شریک ہو جاؤ اور اس بڑی سازش میں ایسا عہد کرو جس میں کوئی لچک نہ ہو۔

پھر لائق غور بات یہ ہے کہ انھوں نے قسم بھی "الله" کی اٹھائی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بتوں کو پوجنے کے علاوہ زمین و آسمان کے خالق اللہ پر بھی عقیدہ رکھتے تھے اور اپنے اہم مسائل میں اسی کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ اتنے مغرور اور بدمست ہو چکے تھے کہ اس قدر ہولناک جرم کے ارتکاب کے لیے بھی انھوں نے خدا ہی کا نام لیا۔ گویا وہ کوئی اہم عبادت یا کوئی ایسا کام انجام دینے لگے ہوں جو اللہ کو بہت منظور ہے۔ خدا سے بے خبر مغرور اور گمراہ

لوگوں کا وطیرہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

"لنبیتنه" "تبییت" کے مادہ سے ہے جس کا معنی شب خون مارنا اور رات کے وقت غافل پا کر حملہ کرنا ہے۔ اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صالح علیہ السلام کے ہمنواؤں اور ان کے قوم و قبیلہ سے خوف کھاتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ایسا منصوبہ بنایا کہ جس سے وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں اور صالح کے طرفداروں کے غیظ و غضب کا شکار بھی نہ ہوں۔ گویا وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ بنابریں انھوں نے رات کے وقت حملے کی ترکیب سوچی اور طے کر لیا کہ جب بھی کوئی شخص ان سے پوچھ گچھ کرے گا تو سب متفق ہو کر قسم اٹھائیں گے کہ اس منصوبے میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا حتیٰ کہ وہ اس وقت موجود بھی نہیں تھے۔ (کیونکہ ان کی صالح کے ساتھ مخالفت پہلے سے دنیا کو معلوم تھی)۔

تاریخوں میں ہے کہ ان کی سازش کچھ یوں تھی کہ شہر کے اطراف میں ایک پہاڑ تھا اور پہاڑ میں ایک غار تھی جس میں جناب صالح علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے اور کبھی کبھار وہ رات کو بھی اسی غار میں جا کر اپنے پروردگار کی عبادت کرتے تھے اور اس سے راز و نیاز کیا کرتے تھے۔

انھوں نے طے کر لیا کہ وہاں کمین لگا کر بیٹھ جائیں گے جب بھی صالح وہاں آئیں گے انھیں قتل کر دیں گے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے اہل خانہ پر حملہ کر کے انھیں بھی راتوں رات موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ پھر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے اگر ان سے اس بارے میں کسی نے پوچھ بھی لیا تو اس سے لاعلمی کا اظہار کر دیں گے۔

لیکن خداوند عالم نے ان کی اس سازش کو عجیب و غریب طریقے سے ناکام بنا دیا اور ان کے اس منصوبے کو نقش برآب کر دیا۔

جب وہ ایک کونے میں گھات لگائے بیٹھے تھے تو پہاڑ سے پتھر گرنے لگے اور ایک بہت بڑا ٹکڑا پہاڑ کی چوٹی سے گرا اور آن کی آن میں اس نے ان سب کا صفایا کر دیا۔

لہٰذا قرآن مجید بعد والی آیت میں کہتا ہے: اُدھر انھوں نے ایک اہم منصوبہ بنایا اور اِدھر ہم نے زبردست منصوبہ تیار کیا اور انھیں اس کا کوئی علم نہیں تھا (ومکروا مکرًا ومکرنا مکرًا وهم لا یشعرون)۔

پھر فرمایا گیا ہے: ذرا دیکھو کہ ان کی سازش اور مکاری کا انجام کیا ہوا؟ کہ ہم نے ان کو اور ان کی تمام قوم اور طرفداروں کو نیست و نابود کر دیا (فانظر کیف کان عاقبة مکرهم انا دمرناهم وقومهم اجمعین)۔

"مکر" کا لفظ جیسا کہ ہم پہلے (تفسیر نمونہ کی دوسری جلد ص ۱۳۱ پر) بھی بتا چکے ہیں کہ عربی ادب میں ہر قسم کی چارہ جوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے آج کل فارسی میں یہ لفظ شیطانی چالوں اور نقصان دہ منصوبوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں ایسا نہیں ہے بلکہ اچھے اور برے دونوں طرح کے منصوبوں اور چارہ جوئی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے[1]

راغب "مفردات" میں کہتے ہیں:

---

[1] اردو میں بھی یہ لفظ فارسی مفہوم سے ہم آہنگ ہے۔ (مترجم)

المکر صرف الغیر عما یقصدہ

مکر یہ ہے کہ کسی کو اپنے مقصد تک پہنچنے سے روکا جائے۔

بنا بریں جب یہ لفظ خداوندِ عالم کے بارے میں استعمال ہو تو اس کا مفہوم ہوگا کسی نقصان دہ منصوبے اور سازش کو ناکام بنانا اور جب فسادی لوگوں کے بارے میں استعمال ہوگا تو اس کا معنی ہوگا اصلاحی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روکنا۔

پھر قرآنِ پاک ان کی ہلاکت کی کیفیت اور ان کے انجام کو یوں بیان کرتا ہے: دیکھو یہ ان لوگوں ہی کے گھر ہیں کہ جو اب ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے ویران پڑے ہیں (فتلک بیوتھم خاویۃ بما ظلموا)۔

نہ وہاں سے کوئی آواز سنائی دیتی ہے،

نہ کسی قسم کا شور شرابہ سننے میں آتا ہے۔

اور نہ ہی وہ زرق برق گناہ بھری محفلیں دکھائی دیتی ہیں۔

جی ہاں! وہاں پر ظلم و ستم کی آگ بھڑکی جس نے سب کو جلا کر راکھ کر دیا۔

ظالموں کے اس انجام میں خداوندِ عالم کی قدرت کی واضح نشانی اور درسِ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم و آگہی رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لایۃ لقوم یعلمون)۔

لیکن اس بھٹی میں سب خشک و تر نہیں جلے بلکہ بے گناہ افراد گناہ گاروں کی آگ میں جلنے سے بچ گئے۔ ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لا چکے تھے اور تقویٰ اختیار کر چکے تھے (وانجینا الذین اٰمنوا و کانوا یتقون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **قومِ ثمود کو کیا سزا ملی؟** اس سرکش اور ظالم قوم کے بارے میں کبھی تو قرآن یوں فرماتا ہے:

فاخذتھم الرجفۃ

انھیں زلزلے نے آلیا اور تباہ و برباد کر دیا۔ (اعراف / ۷۸)

کبھی فرماتا ہے:

فاخذتھم الصاعقۃ

کڑکنے والی بجلی ان پر گری۔ (ذاریات / ۴۴)

اور کبھی کہتا ہے:

واخذ الذین ظلموا الصیحۃ

آسمانی چیخ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ (ہود / ۶۷)

اگر غور کیا جائے تو ان تینوں تعبیروں میں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا کیونکہ "صاعقہ" بھی بجلی کی بہت بڑی چنگاری ہوتی ہے جو بادل کے ٹکڑوں اور زمین کے درمیان آتی جاتی رہتی ہے۔ عظیم اور مہیب آواز بھی اس کے ہمراہ ہوتی ہے اور

اطرافِ زمین میں شدید قسم کا زلزلہ بھی ساتھ لاتی ہے (آسمانی چیخ کے بارے میں مزید تفصیل ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۵ سورۂ ہود کی آیت ۶۷ کی تفسیر میں بیان کی ہے)۔

۲۔ **بچ جانے والے:** بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کے دوستوں کی تعداد چار ہزار تھی جو آپ کے ساتھ عذاب سے بچ گئے تھے اور حکم پروردگار کے مطابق فساد و گناہ سے لبریز اس علاقے سے کوچ کر کے حضر موت جا پہنچے تھے۔[1]

۳۔ **"خاویہ" کا مفہوم:** "خاویۃ" "خواء" (بروزن "ھواء") کے مادہ سے ہے جس کا ایک معنی سقوط کرنا اور ویران ہونا ہے اور ایک معنی خالی ہونا۔ ورشہابی ستاروں کے بارے میں بھی یہی تعبیر استعمال کی جاتی ہے جیسے کہتے ہیں: "خوی النجم" یعنی ستارہ گرا۔

راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں "خویٰ" کا اصلی معنی خالی ہونا ہے اور بھوکے پیٹ، خالی اخروٹ در... خالی ستاروں کے بارے میں اس کا اطلاق ہوتا ہے (زمانہ جاہلیت کے عربوں کا نظریہ تھا کہ جو ستارہ بھی افق میں ظاہر ہو... اپنے ساتھ بارش لاتا ہے)۔

۴۔ **ظلم کا نتیجہ:** ایک روایت میں ابن عباس سے مروی ہے کہ

قرآن مجید سے مجھے اس بات کا بخوبی علم ہوا ہے کہ ظلم گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔[2]

پھر انھوں نے اس آیت کو اپنے مدعا کے ثبوت میں پیش کیا "فتلک بیوتھم خاویۃ بما ظلموا"

اور حقیقت یہ ہے کہ شہروں کی تباہی اور معاشروں کی بربادی میں ظلم ایک ایسا عنصر ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے... قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ظلم مار ڈالنے والی گرجدار بجلی ہے،

ظلم اجاڑ کر رکھ دینے والا زلزلہ ہے،

اور ظلم آسمانی چیخ کی مانند تباہ کر دینے والا موت کا پیغام ہے۔

تاریخ نے بارہا کے تجربات سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ممکن ہے دنیا کفر کے ساتھ تو برقرار رہ جائے لیکن ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

۵۔ **قومِ ثمود کو سزا کب ملی؟** اس میں شک نہیں ہے کہ قومِ ثمود کو عمومی طور پر سزا ناقۂ صالح کے قتل کر... بعد ملی جیسا کہ سورۂ ہود کی آیت ۶۵ تا ۶۷ میں ہے کہ جب انھوں نے ناقہ کو قتل کر دیا تو صالحؑ نے فرمایا:

تم تین دن تک اپنے گھروں میں فائدہ اٹھا لو اس کے بعد تمھیں خدا کا عذاب ضرور اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں، آلوسی نے روح المعانی میں، اور قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر میں، انھی آیات کے ذیل میں یہ بات لکھی ہے۔

[2] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

اور جب ہمارا حکم پہنچ گیا تو ہم نے صالح اور ان لوگوں کو نجات دے دی جو صالح پر ایمان لا
چکے تھے اور ظالموں کو آسمانی چیخ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ اپنے ہی گھروں میں زمین
پر گر پڑے اور مر گئے۔

بنابریں حضرت صالح کے قتل کی سازش کے بعد ہی عذاب نازل نہیں ہوا بلکہ قوی احتمال یہ ہے کہ خدا کے اس پیغمبر کے قتل کی سازش کے واقعے میں فقط سازشی ٹولے ہلاک ہوئے اور دوسرے ظالموں کو سنبھل جانے کے لیے مہلت دی گئی، لیکن ناقہ کے قتل کے بعد تمام ظالم اور بے ایمان گناہ گار فنا ہو گئے۔ لہٰذا اس سورہ کی اور سورۂ ہود اور سورۂ اعراف کی آیات کے ملانے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

بالفاظ دیگر زیر نظر آیات میں حضرت صالحؑ اور ان کے اہل خانہ کے قتل کی سازش کے نتیجے میں نازل ہونے والے عذاب کا تذکرہ ہے اور سورۂ اعراف اور ہود کی آیات میں ناقہ صالح کے قتل کے نتیجے میں عذاب کے نازل ہونے کا بیان ہے تو ان دونوں صورتوں کو ملا کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ ان ظالموں نے پہلے تو جناب صالح کے قتل کے منصوبے بنائے لیکن جب اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی تو پھر ان کے عظیم معجزہ یعنی ناقہ کو قتل کر دیا اور تین دن کی مہلت کے بعد انھیں دردناک عذاب نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ انھوں نے پہلے تو ناقہ کو قتل کیا ہو اور جب جناب صالح علیہ السلام نے انھیں تین دن کے بعد نازل ہونے والے عذاب سے ڈرایا ہو تو انھیں بھی شہید کرنے کی ٹھان لی ہو لیکن اس شیطانی منصوبے میں ناکامی کے بعد تباہ و برباد ہو گئے ہوں[1]

[1] تفسیر "روح البیان" اسی آیت کے ذیل میں۔

۵۴۔ وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○
۵۵۔ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○

ترجمہ

۵۴۔ اور لُوط کو یاد کیجیے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بُرے کاموں کی طرف جاتے ہو؟ جبکہ (ان کی برائی اور غلط نتائج) تم دیکھ رہے ہو۔
۵۵۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت سے مردوں کے پاس آتے ہو؟ تم تو جاہل قوم ہو۔

تفسیر

قومِ لُوط کی بے راہروی

حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت صالحؑ اور ان کی اقوام کے واقعات بیان کرنے کے بعد جس پانچویں پیغمبر کی زندگی کی طرف اس سورہ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ خدا کے باعظمت نبی حضرت لوط علیہ السلام ہیں۔

قرآن نے ان کے واقعات صرف اسی مقام پر بیان نہیں کیے بلکہ کئی اور مقامات پر بھی ان کے واقعات بیان کیے جا چکے ہیں مثلاً سورۂ حجر، ہود، شعراء اور اعراف میں ان کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

ایسے واقعات کا تکرار اس لیے ہے کیونکہ قرآن کوئی تاریخی کتاب تو ہے نہیں کہ ایک مرتبہ کسی واقعے کو مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد پھر اس کا تذکرہ ہی نہ کرے بلکہ یہ ایک انسان ساز اور تربیتی کتاب ہے اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ تربیتی مسائل میں بعض اوقات ضرورت پیش آجاتی ہے کہ کسی ایک واقعے کو ایک نہیں کئی مرتبہ دہرایا جائے اس کے مختلف زاویوں کو دیکھا جائے اور مختلف لحاظ سے اس سے نتائج اخذ کیے جائیں۔

بہرحال قومِ لوط کی جنسی بے راہروی، ہم جنس بازی اور دوسری برائیوں کی داستانیں مشہورِ عالم ہیں اور اسی طرح اس قوم کا دردناک انجام ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ثابت ہو سکتا ہے جو شہوات اور خواہشاتِ نفسانی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور چونکہ یہ آلودگی اور بے حیائی لوگوں میں سرایت کر چکی ہے لہٰذا ضروری ہو جاتا ہے کہ اس واقعے کو بار بار دہرایا جائے۔

زیر نظر آیات میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اور لُوط کو یاد کیجیے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بُرے کاموں کی طرف جاتے ہو۔ جبکہ (ان کی برائی اور غلط نتائج) تم دیکھ رہے ہو (ولوطا اذ قال لقومه اتأتون

الفاحشة و انتم تبصرون)[1]۔

"فاحشة" کے بارے میں ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ان کاموں کو کہا جاتا ہے جن کی برائی اور قباحت واضح اور آشکار ہو یہاں پر اس سے مراد "لواطہ" اور ہم جنس بازی کا فعل قبیح ہے۔

"انتم تبصرون" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اس قبیح فعل کی قباحت اور برائیاں نیز اس کے شرمناک اور خطرناک نتائج دیکھ رہے ہو کہ کس طرح اس نے تمھارے معاشرے کو ناپاک اور آلودہ کرکے رکھ دیا ہے حتیٰ کہ تمھارے چھوٹے چھوٹے اور کمسن بچے بھی اس گناہ سے محفوظ نہیں ہیں آخر کیا وجہ ہے کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود تم بیدار نہیں ہوتے۔

بعض مفسرین نے اس مقام پر یہ احتمال پیش کیا ہے کہ یہ آیت شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اس فعل قبیح کا ارتکاب ایک دوسرے کے سامنے کرتے تھے یہ بات ظاہری عبارت سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ لوط چاہتے تھے کہ ان کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑیں اور بیدار کریں اور ان کی باطنی آواز کو ان کے کانوں تک پہنچائیں۔ درحقیقت وہ ان کی بصیرت کو دعوت دے رہے تھے۔ اس فعل کے تباہ کن نتائج اور انھیں بیدار کرنے کی بات کر رہے ہیں۔

آگے چل کر قرآن فرماتا ہے: کیا تم عورتوں کی بجائے شہوت کے ساتھ مردوں کے پاس جاتے ہو؟ (ائنکم لتأتون الرجال شهوة من دون النساء)۔

درحقیقت پہلے تو اس قبیح فعل کو "فاحشہ" (بُرا کام) کہا پھر اسے مزید واضح کرکے بیان کر دیا تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے یہ انداز اہم ترین مسائل کو بیان کرنے کے فنونِ بلاغت میں سے ایک ہے چونکہ اس بُرے کام کا سبب جہالت اور نادانی ہے لہٰذا قرآن آگے فرماتا ہے: تم تو نادان اور جاہل قوم ہو (بل انتم قوم تجهلون)۔

خدا سے جہالت، مقصدِ تخلیق سے جہالت، ناموسِ خلقت سے جہالت اور اس بے شرمانہ گناہ کے آثار و نتائج سے جہالت اگر تم خوب غور سے کام لو اور خوب سوچو تو اس حقیقت کو یقیناً سمجھ لوگے کہ یہ قبیح فعل کس حد تک جاہلانہ کام ہے۔ اس جملے کو استفہام کی صورت میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کا جواب وہ اپنے ضمیر سے خود سنیں تاکہ اس کا بہتر اثر ہو۔

---

[1] ممکن ہے کہ "لوطًا" "ارسلنا" فعل کی وجہ سے منصوب ہو جو سابقہ آیات میں گزر چکا ہے یا "اذکر" جیسے مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہو لیکن "اذ قال" کے جملے کے پیشِ نظر دوسرا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۵۶۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ
قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝
۵۷۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝
۵۸۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝
۵۹۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ آٰللّٰهُ
خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۶۔ انھوں نے اس کا جواب صرف یہ دیا کہ ایک دوسرے سے کہا: لوط کے خاندان کو اپنے شہر اور علاقے سے نکال باہر کرو کہ یہ بڑے پاکدامن لوگ ہیں۔

۵۷۔ ہم نے اسے اور اس کے اہل خاندان کو نجات دی سوائے اس کی بیوی کے کہ ہم نے مقدر کر دیا کہ وہ باقی رہ جانے والوں میں سے ہو۔

۵۸۔ پھر ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی (کہ وہ سب کے سب اس میں دب کر مر گئے) اور یہ کتنی بُری بارش ہے ان کے لیے جنھیں ڈرایا گیا تھا۔

۵۹۔ کہہ دیجیے: حمد خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور (درود) سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر۔ تو کیا خداوند عالم بہتر ہے یا وہ بُت کہ جنھیں خدا کا شریک بناتے ہیں۔

تفسیر

جہاں پاکدامنی عیب بن جاتی ہے

گزشتہ گفتگو میں ہم اللہ کے عظیم نبی جناب لوط علیہ السّلام کے منطقی دلائل کو ملاحظہ کر چکے ہیں جو انھوں نے گناہوں سے آلودہ بے راہروی کے شکار لوگوں کے سامنے پیش کیے تھے۔ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے کس عمدہ اور استدلالی انداز میں

لواطہ جیسے قبیح فعل سے انھیں روکنے کی کوشش کی ہے۔ اور کس طرح انھیں سمجھایا ہے کہ یہ کام جہالت ونادانی اور قانونِ فطرت اور دوسرے تمام انسانی اقدار سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کثیف اور خبیث قوم نے آپ کی اس منطقی گفتار کا کیا جواب دیا؟ تو قرآن کی زبانی سن لیجیے قرآن کہتا ہے ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں تھا کہ ایک دوسرے سے کہا: لوط کے خاندان کو اپنے شہر اور علاقے سے نکال باہر کرو کیونکہ یہ بڑے پاکباز لوگ ہیں اور یہ اپنے تئیں ہم سے ہم آہنگ نہیں کر سکتے (فما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوا آل لوط من قریتکم انہم اناس یتطہرون)۔

یہ ایک ایسا جواب ہے جو ان کی فکری پستی اور انتہائی اخلاقی تنزل کا آئینہ دار ہے۔

جی ہاں! مجرم اور گناہ سے آلودہ ماحول میں پاکیزگی ایک جرم وعیب ہوا کرتی ہے۔ یوسف جیسے پاکدامن کو عفت و پارسائی کے جرم میں زندانوں میں ڈالا جاتا ہے۔ خدا کے باعظمت نبی جناب لوط کے خاندان کو گناہوں سے پرہیز اور دوری اختیار کرنے کی پاداش میں شہر بدر کیا جاتا ہے جبکہ زلیخائیں اس ماحول میں آزاد اور صاحبِ جاہ ومقام ہوا کرتی ہیں اور قومِ لوط اپنے اپنے گھروں میں آرام وآسائش کے ساتھ رہتی ہے۔

یہیں پر قرآن مجید کا مصداق واضح ہو جاتا ہے جو وہ گمراہ لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ:

ہم (ان کے اپنے اعمال کی بنا پر) ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیتے ہیں اور ان کے کان بہرے ہو چکے ہیں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ گناہوں کی دلدل میں اس حد تک پھنس چکے تھے کہ لوط کے خاندان کا تمسخر اڑا کر کہتے تھے کہ وہ ہمیں ناپاک سمجھتے ہیں اور خود بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ کیسا مذاق ہے؟

یہ عجیب بات نہیں تو اور کیا ہے کہ بے حیائی اور بے شرمی کے فعل سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے انسان کی حسِ شناخت ہی یکسر بدل جائے۔ یہ بالکل اس چمڑا رنگنے والے کی مثال ہے جو بدبو سے مانوس ہو چکا تھا اور جب ایک مرتبہ وہ عطاروں کے بازار سے گزر رہا تھا تو عطر کی نامانوس بو کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا جب اسے حکیم کے پاس لے گئے تو اس نے حکم دیا کہ اسے دوبارہ چمڑا رنگنے والوں کے بازار میں لے جایا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ ہوش میں آگیا اور مرنے سے بچ گیا اور واقعاً اس بارے میں یہ ایک دلچسپ حسی مثال ہے۔

روایات میں ہے کہ جناب لوط علیہ السّلام نے اس قوم کو تیس سال تک تبلیغ کی لیکن اپنے خاندان کے سوا (اور وہ بھی بیوی کو مستثنٰی کر کے کیونکہ وہ مشرکین کے ساتھ ہم عقیدہ ہو گئی تھی) اور کوئی بھی آپ پر ایمان نہیں لایا۔[1]

اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی اصلاح کی امید بالکل ختم ہو جائے انھیں دنیا میں جینے کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تو بہتر ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ہم نے لوط اور ان کے اہلِ خانہ کو

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۸۲۔

نجات دی۔ سوائے لوط کی زوجہ کے کہ جس کا مقدر ہم نے باقی رہ جانے والوں سے منسلک کر دیا تھا (فانجیناہ واھلہ الا امرأتہ قدرناھا من الغابرین)۔[1]

ایک مقررہ وقت کے مطابق ان کے باہر نکل جانے کے بعد (اس رات کی صبح کو جبکہ شہر گناہوں میں پوری طرح غرق ہو چکا تھا) صبح کا وقت ہوا تو ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کر دی (کہ وہ سب لوگ اس میں دفن ہو کر رہ گئے اور وہ یا اس وقت ہوا جب زلزلے نے مکمل طور پر ان کو تہہ وبالا کر دیا)۔ (وامطرنا علیہم مطرًا)۔

"اور کس قدر بُری سخت اور ناگوار ہے ڈرائے جانے والے لوگوں پر پتھروں کی یہ بارش" (فساء مطر المنذرین)۔

قومِ لوطؑ اس کے انجام اور ہم جنس بازی کے بُرے اثرات کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۵ (سورۂ ہود کی آیات ۷۷تا۸۳) میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں لہٰذا یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں۔

یہاں پر ہم صرف ایک نکتے کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ:

قانونِ خلقت نے ہمارے لیے ایک ایسے راستے کی نشاندہی کر دی ہے کہ جس پر چل کر ہم ارتقائی مراحل طے کر سکتے ہیں اور اسی میں ہماری زندگی کا راز مضمر ہے اور اس کی مخالفت ہماری پستی اور موت کا سبب بن جاتی ہے۔

قانونِ خلقت نے جنسی جذبے کو ——— نسلِ انسانی کی بقا اور انسان کی روحانی تسکین کو ——— دو مخالف جنسوں میں قرار دیا ہے اگر یہ راستہ "ہم جنس بازی" کی سمت موڑ دیا جائے تو نہ صرف اس سے روحانی تسکین ختم ہو جاتی ہے بلکہ اجتماعی سکون بھی غارت ہو جاتا ہے اور چونکہ اجتماعی قوانین کے ڈانڈے فطرت سے جا ملتے ہیں لہٰذا ان کی مخالفت انسان کی جسمانی ساخت پر بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

خدا کے باعظمت نبی جناب لوط علیہ السلام نے اپنی گمراہ اور بے راہرو قوم کو بھی اسی فطری امر کی طرف توجہ دلائی اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر فرمایا کیا تم ایسی برائی کے پیچھے لگے ہوئے ہو حالانکہ تم اس کے خطرناک نتائج کو بھی دیکھ رہے ہو، تمھاری یہ جہالت قانونِ حیات سے لاعلمی درحقیقت تمھاری حماقت، نادانی اور بے وقوفی ہے جو تمھیں اس حد تک بے راہ رو اور گمراہ کر چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر اس گمراہ قوم کے بارے میں دوسرے قوانین بھی تبدیل ہو جائیں تو مقامِ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پانی جو کہ مایۂ زندگی ہے کی بجائے پتھر برسنے لگ جائیں اور امن وسکون کا گہوارہ ان کی سرزمین زلزلوں کی وجہ سے تہ وبالا ہو جائے اور وہ صرف نیست ونابود ہی نہ ہو جائیں بلکہ ان کا نشان تک بھی باقی نہ رہے تو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں پانچ عظیم انبیاء کے تفصیلی حالات اور ان کی قوموں کا انجام بیان کرنے کے بعد گزشتہ واقعات کو بطور نتیجہ اور مشرکین سے گفتگو کے مقدمہ کے عنوان سے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے:

[1] "غابر" اسے کہتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد ٹھہرا رہے۔

کہہ دیجیے: حمد وستائش ذاتِ خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے (قل الحمد للہ)۔

حمد و تعریف صرف اس خدا کے لیے مخصوص ہے جس نے قوم لوط جیسی بے حیا قوم کو نیست و نابود کر دیا تاکہ ان کے اس قبیح فعل کی آلودگیوں سے باقی دنیا محفوظ رہ جائے۔

حمد وستائش اس خدا کے ساتھ مخصوص ہے جس نے ثمود جیسی فاسد و مفسد قوم کو اور فرعونیوں اور فرعون جیسے متکبرین کو ملکِ عدم میں بھیج دیا تاکہ ان کا طرزِ عمل دوسروں کے لیے اُسوہ اور نمونہ قرار نہ پا جائے۔

اور تمام تعریفیں صرف اس کے لیے مخصوص ہیں جس نے اپنی ہر طرح کی نعمتیں داؤد و سلیمان جیسے اپنے باایمان بندوں کو عطا فرمائیں اور قوم سبا جیسی گمراہ ملت کو ان کے ذریعے ہدایت بخشی۔

پھر فرمایا گیا ہے: درود و سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر (و سلام علی عباده الذین اصطفی)۔

سلام ہو موسیٰؑ، صالحؑ، لوطؑ، سلیمانؑ اور داؤدؑ پر اور سلام ہو تمام انبیاء اور ان کے سچے جانشینوں پر۔

بعد میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ خدا بہتر ہے جس نے یہ سب توانائی، قدرت و طاقت، نعمت و انعام عطا فرمائے ہیں یا وہ بت جو مطلقاً کسی چیز کی استطاعت نہیں رکھتے اور یہ لوگ انھیں خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں (آللہ خیر اما یشرکون)[1]

ہم نے انبیائے ماسلف کی ان داستانوں میں دیکھ لیا ہے کہ عذاب کے نزول کے موقع پر بت اپنے عبادت گزاروں کی ذرہ بھر بھی امداد نہ کر سکے۔ جبکہ خداوند عالم نے کسی بھی مشکل مرحلے میں مومنین کو تنہا نہیں چھوڑا اور اس کی بے پایاں رحمت ہر وقت ان کی مدد کو پہنچی۔

---

[1] "آللہ" دراصل "أ اللہ" تھا اور اس میں سے ایک ہمزہ الف میں تبدیل کر دینے سے مدّ کی صورت اختیار کر گیا اور "اما یشرکون" دراصل "ام ما یشرکون" تھا۔ کیونکہ "ام" استفہام کے لیے ہے اور "ما" موصولہ ہے دونوں میم آپس میں مدغم کر دی گئی ہیں۔

۶۰۔ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝

۶۱۔ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۶۲۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

۶۳۔ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

۶۴۔ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

۶۰۔ کیا جو بت تمھارے معبود ہیں وہ بہتر ہیں یا وہ ذات جس نے آسمان اور زمین کو خلق فرمایا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے پانی نازل کیا ہے پھر ہم ہی نے اس کے ذریعے خوبصورت اور سرور انگیز باغات اگائے اور تمھارے بس کی تو بات ہی نہ تھی کہ تم ان کے درخت اگا سکتے کیا خدا کے ساتھ کوئی اور

معبود ہے؟ نہیں بلکہ وہ تو ایسے نادان ہیں کہ خدا کی مخلوق کو اس کے برابر قرار دیتے ہیں۔

۶۱۔ یا وہ جس نے زمین کو جائے آرام و قرار بنایا ہے اور اس میں دریا جاری کیے ہیں اور زمین کے لیے ثابت و محکم پہاڑ بنائے ہیں اور دو سمندروں کے درمیان حدِ فاصل بنائی ہے (تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں، تو اس حالت میں) کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے (اور جاہل ہیں)۔

۶۲۔ یا وہ جو مضطر و بے چین کی دعا قبول کرتا ہے اور اس کی مصیبت دُور کرتا ہے اور تمھیں زمین پر خلیفہ بناتا ہے تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ تم میں سے بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

۶۳۔ یا وہ جو تمھیں صحرا کی تاریکیوں اور سمندر میں رستہ دکھاتا ہے اور وہ جو اپنی رحمت کے نازل ہونے سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیج دیتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ اللہ اس بات سے برتر و بالا ہے کہ اس کے ساتھ شریک قرار دیں۔

۶۴۔ یا وہ جس نے خلقت کا آغاز کیا اور پھر اسے پلٹائے گا اور وہ جو تمھیں زمین و آسمان سے روزی عطا کرتا ہے کیا کوئی اور معبود خدا کے ساتھ ہے؟ کہہ دیجیے کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو؟

تفسیر

یہ دلائل اور پھر بھی شرک

گزشتہ گفتگو کے سلسلہ آیات کی آخری آیت میں (پانچ عظیم انبیاء کی چونکا دینے والی داستانوں کے بعد) ایک مختصر مگر جامع سوال کیا گیا ہے کہ "کیا خداوند قادر و توانا بہتر ہے یا ان کے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بے قدر وقیمت بُت؟"

زیرِ نظر آیات میں اس جملے کی تشریح کی گئی ہے اور پانچ آیات میں پانچ پچے تُلے سوال کیے گئے ہیں۔ اور مشرکین کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان سوالات کا جواب طلب کیا گیا ہے تو پانچ آیات میں خداوند عالم کی بارہ عظیم نعمتیں توحید کے دلائل کے طور پر ذکر کی گئی ہیں۔

سب سے پہلے آسمان و زمین کی خلقت، بارانِ رحمت کا نزول اور اس سے پیدا ہونے والی برکتوں کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کیا وہ بُت بہتر ہیں جو تمھارے معبود ہیں یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے پانی نازل کیا ہے اور ہم نے اس سے خوبصورت اور سرور انگیز باغات اگائے ہیں (امن خلق السماوات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا به حدائق ذات بهجة)[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

"حدائق" "حدیقه" کی جمع ہے اور جس طرح بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس باغ کے معنی میں ہے جس کے اطراف میں دیوار کھینچی گئی ہو اور ہر لحاظ سے محفوظ ہو جیسا کہ آنکھ کا "حدقه" (ڈھیلا) پلکوں کے درمیان محصور ہے۔ راغب اصفہانی اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں:

حدیقہ دراصل اس زمین کو کہتے ہیں جس میں پانی ٹھہرا رہے جیسا کہ آنکھ کا حدقہ (ڈھیلا) ہے کہ ہمیشہ پانی اس میں موجود رہتا ہے۔

تو ان دونوں اقوال کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ "حدیقہ" اس باغ کو کہتے ہیں جس کے اطراف میں دیوار بھی ہو اور اس میں پانی بھی خوب موجود ہو۔

"بهجة" (ابروزن "لهجة") کا معنی رنگ کی ایسی زیبائی اور ظاہری خوبصورتی ہے جسے دیکھتے ہی لوگ خوشی میں ڈوب جائیں[1]

اسی آیت میں روئے سخن بندوں کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے: تمھارے بس سے یہ بات باہر ہے کہ تم ایسے خوش نما درخت اگاسکو (ما کان لکم ان تنبتوا شجرها)۔

تمھارا کام صرف اور صرف بیج ڈالنا اور آبپاشی کرنا ہے اور بس! جو ذات ان بیجوں کے دل میں روحِ حیات ڈالتی ہے اور ان کے اگانے کے لیے نورِ آفتاب، قطراتِ باران اور ذرّاتِ خاک کو مامور کرتی ہے وہ ذات خداوند ذوالجلال ہی ہے۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا اور نہ ہی انھیں غیرِ خدا کی طرف نسبت دے سکتا ہے وہ خدا ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا ہے، وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی عالمِ حیات میں حسن و جمال اور زیبائی و خوشنمائی کا خالق ہے۔

حتیٰ کہ اگر ایک خوش نما پھول کی رنگ آمیزی کے بارے میں غور کیا جائے اور لطیف اور منظّم پتیوں کو غور سے دیکھا جائے جو ایک دوسرے کے اندر رہ کر پھول کے مرکزی حصّے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے زندگی کا راگ الاپ رہی ہیں تو کافی ہو جائے گا کہ انسان اس کے خالق کی عظمت، قدرت اور حکمت کو سمجھ جائے، یہی چیزیں انسانی ضمیر کو جھنجوڑتی ہیں اور خالقِ کائنات کی طرف متوجّہ کرتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں خلقت میں توحید (توحید کے خالق) اور ربوبیّت میں توحید (مدبّرِ کائنات کی توحید) کو معبود کی توحید

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) درحقیقت اس کا ایک محذوف ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے "ما یشرکون خیر امن خلق السماوات والارض" درحقیقت اس سے پہلی آیت میں سوال یوں تھا کہ آیا وہ خدا جو بندوں کو نجات دیتا ہے بہتر ہے یا وہ بُت کہ جنھیں لوگ اس کا شریک بناتے ہیں؟ لیکن اس آیت میں سوال بتوں سے شروع کرتا ہے کہ آیا وہ بہتر ہیں یا خداوند متعال جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔

[1] "ذات بهجة" میں "ذات" کا لفظ مفرد آیا ہے جبکہ "حدائق" جمع کا صیغہ ہے اور اس کا موصوف ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ حدائق جمع مکسر ہے اور جمع مکسر کبھی "جماعت" کے معنوم میں بھی آتی ہے جو کہ مفرد ہے اور مفرد کی صفت بھی مفرد ہوا کرتی ہے۔

کے بنیادی ستون شمار کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (ءَ اللہ مع اللہ)۔

لیکن وہ نادان لوگ ہیں جو پروردگارِ عالم سے منہ موڑ کر غیر اللہ کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں جس میں کچھ بھی قدرت نہیں ہے (بل ھم قوم یعدلون)[1]

دوسرا سوال زمین کی آرام و سکون کی نعمت اور اس جہان میں انسان کی قرارگاہ کے بارے میں ہے: کیا ان کے بناوٹی معبود بہتر ہیں یا وہ کہ جس نے زمین کو آرام کی جگہ بنایا ہے اور اس میں دریا چلائے ہیں اور زمین کے لیے محکم اور ٹھہرے ہوئے پہاڑ بنائے ہیں (تاکہ زمین کو زلزلے سے محفوظ رکھیں)۔ (امن جعل الارض قرارًا وجعل خلا لھا انھارًا وجعل لھا رواسی)[2]

نیز "دو (میٹھے اور کڑوے) سمندروں کے درمیان ایک حدِّ فاصل قرار دی ہے تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں (وجعل بین البحرین حاجزًا)۔

تو اس طرح سے اس آیت میں چار عظیم نعمتوں کا ذکر آیا ہے اور تین حصوں میں آرام و سکون کی بات کی گئی ہے۔

زمین کا اپنا آرام کہ اس کے اپنے محور اور سورج کے گرد تیز رفتاری کے ساتھ گھومنے اور مجموعی طور پر نظامِ شمسی کی حرکت کے باوجود یہ زمین اس قدر ایک حالت پر قائم اور پُرسکون ہے کہ اس کے اوپر رہنے والوں کو اس کی حرکت کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا گویا وہ ایک جگہ پر ایسی گڑی ہوئی ہے کہ حرکت کا نام و نشان ہی نہیں ملتا۔

دوسری نعمت پہاڑوں کی ہے (جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ وہ زمین کے چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی بنیادیں آپس میں پیوستہ ہیں جو ایک طاقتور زرہ کا کام دیتے ہیں اور زمین کے اندرونی دباؤ اور بیرونی مدوجزر کا جو چاند کی کشش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور ایسے عظیم طوفانوں سے زمین کو بچاتے ہیں جو زمینی زندگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں[3]

ایک اور نعمت قدرتی حدِّ فاصل ہے جو سمندروں کے میٹھے اور کڑوے پانی کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھتی ہے اور یہ نادیدہ حجاب میٹھے اور کڑوے پانی کے ہلکے اور بھاری درجوں کے فرق کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جسے اصطلاح میں "مخصوص

---

[1] "یعدلون" کے بارے میں ایک احتمال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ "عدول" انحراف اور حق سے باطل کی طرف لوٹ جانے کے معنی میں ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ "عدل" (بروزن "فتنہ") برابر، مشابہ اور نظیر کے معنی میں ہو پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک سے انحراف و عدول کرتے ہیں اور دوسری صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ انھیں اس کے مشابہ، ہم پلہ اور نظیر تسلیم کرتے ہیں۔

[2] "خلال" دراصل دو چیزوں کے درمیانی شگاف کو کہتے ہیں اور "رواسی" "راسیۃ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے ٹھہرا ہوا اور برقرار۔

[3] زمین کے برقرار اور رُکے رہنے میں پہاڑ کیا کردار ادا کرتے ہیں اور ان کے اور کیا فوائد ہیں۔ اس کی تفصیل ہم تفسیر نمونہ جلد ۵ (سورۂ رعد کی آیت ۲ کے ذیل) میں بیان کر چکے ہیں۔

وزن کا فرق" کہا جاتا ہے اور یہ اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ جب بڑے بڑے دریاؤں کا پانی سمندروں میں گرتا ہے تو بہت عرصے میں نمکین پانی میں تحلیل ہوجاتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس پانی کو سمندر کا مدوجزر ساحل کے وسیع و عریض علاقے میں دھکیل دیتا ہے اور اس سے زراعت کے لیے آبپاشی کی جاتی ہے۔

اس کی تفصیل ہم اسی جلد میں سورہ فرقان کی آیت ۵۲ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اس کے باوجود زمین کے مختلف حصوں میں پانی کی نہریں اور دریا جاری ہیں جو حیات اور زندگی کا سرمایہ، شادابی و تازگی کا سرچشمہ اور لہلہاتے کھیتوں اور ثمر آور باغات کا ذریعہ حیات ہیں۔ یہ پانی کچھ تو پہاڑوں کے اندر موجود ہے اور کچھ خود زمین کے اندر۔

تو کیا اس قسم کا منظم اور جچا تلا نظام اندھے اور بہرے "اتفاق" اور عقل و خرد سے عاری "مبداء" کا شاہکار ہو سکتا ہے؟

کیا اس حیرت انگیز اور تعجب خیز نظام میں بتوں کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے؟

(نہیں اور ہرگز نہیں!!) حتیٰ کہ خود بت پرستوں نے بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں اس سوال کو ایک بار پھر دہراتا ہے کہ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ءِ اللہ مع اللہ)۔

نہیں کوئی نہیں" بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان اور بے خبر ہیں (بل اکثرھم لا یعلمون)۔

اسی سلسلے کے پانچ سوال ہیں جو درحقیقت ایک معنوی اور باطنی مقدمے کی تفتیش کے سلسلہ میں ہیں۔ تیسرے سوال میں حل مشکلات، رکاوٹوں کے دور کرنے اور دعا کے قبول ہونے کی بات ہوتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: کیا تمھارے بے قدر و قیمت معبود بہتر ہیں یا وہ جو عاجز و درماندہ اور مضطر انسان کی دعا قبول کرتا اور اس کی مشکلات کو دور کرتا ہے (امن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء)۔

جی ہاں! جب عالمِ اسباب کے تمام دروازے انسان پہ بند ہو جاتے ہیں، جب وہ مایوس اور پریشان اور درماندہ اور مضطر ہو جاتا ہے تو خدا ہی ان مشکلات کو حل کرتا ہے، مایوسیوں کو دور کرتا ہے، امید کی کرن دلوں میں روشن کرتا ہے اور عاجز و درماندہ لوگوں پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ یہ صرف اور صرف اس کی پاک ذات ہو سکتی ہے اور کوئی نہیں۔

چونکہ یہ حقیقت ایک فطری احساس کے طور پر تمام انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے تو بت پرست بھی جب سمندر کی بے رحم موجوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو اپنے تمام بناوٹی خداؤں کو فراموش کر کے حقیقی معبود "اللہ" کی رحمت کا سہارا طلب کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین

جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو پکارتے اور عبادت و پرستش بھی اسی کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ (عنکبوت ـــــ ۶۵)

پھر فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف اللہ مشکلات اور مصائب کو دور کرتا ہے بلکہ "تمھیں زمین کے خلفاء بھی قرار دیتا ہے (و یجعلکم خلفاء الارض)۔

توکیا پھر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (ء الٰہ مع اللہ)۔

"تم لوگ بہت کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو اور ان واضح دلائل کے باوجود تم کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتے" (قلیلًا ما تذکرون)۔[1]

"مضطر" کے مفہوم اور قبولیتِ دعا اور ان کی شرائط کے بارے میں انھی آیات کے آخر میں نکات کی بحث میں مفصل گفتگو ہوگی۔

"خلفاء الارض" سے ممکن ہے ساکنین وصاحبان زمین مراد ہوں کیونکہ خداوند عالم نے زمین میں جو امن وسکون، آرام و اطمینان، نعمتیں اور اسبابِ رفاہ قرار دیئے ہیں اس کے باوجود انسان کو اس کرہ خاکی کا حکمران بنایا ہے اور اس پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اسے صلاحیّت عطا کی ہے۔

خاص طور پر جب انسان حالتِ اضطرار میں ہوتا ہے اور مشکلات میں گھر جاتا ہے تو وہ بارگاہِ خداوندی کی طرف رُخ کرتا ہے اور خدا بھی اپنی مہربانی سے اس کی تمام مشکلات ومصائب کو دور کر دیتا ہے تو اس خلافت کا پایہ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے (اور یہیں سے آیت کے ان دونوں حصّوں کا باہمی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے)۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ چیز اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خداوند عالم نے سلسلہ حیات کو کچھ اس طرح خلق فرمایا ہے کہ ہمیشہ کچھ قومیں آتی رہتی ہیں اور دوسری قوموں کی جانشین ہوتی رہتی ہیں۔ اگر باریوں کا یہ سلسلہ نہ ہو تو ارتقاء اور تکامل کبھی بھی واقع نہ ہو۔[2]

چوتھے سوال میں مسئلہ ہدایت پیش کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا یہ بہتر ہیں یا وہ جو تمھیں صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں (ستاروں کے ذریعے) ہدایت کرتا ہے؟ (امن یھدیکم فی ظلمات البر والبحر)۔

"اور وہ جو اپنی رحمت کے نزول سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے" (ومن یرسل الریاح بشرًا بین یدی رحمتہ)۔

ہوائیں بارش کے نزول کا پیش خیمہ ہوتی ہیں اور خوشخبری دینے والے قاصد کی مانند اس کے آگے آگے چلتی رہتی ہیں درحقیقت ان کا کام بھی نزولِ باران کی جانب لوگوں کو ہدایت کرنا ہوتا ہے۔

ہواؤں کے بارے میں "بشرًا" (خوشخبری دینے والی) اور بارش کے بارے میں "رحمت" کی تعبیریں بھی دلچسپ ہیں کیونکہ یہ ہوائیں ہی ہوتی ہیں جو سمندروں سے رطوبت اور بادلوں کے ٹکڑوں کو اپنے دوش پر سوار کر کے خشک اور پیاسے علاقوں میں لے جاتی ہیں اور بارش کی تشریف آوری کی خبر دیتی ہیں۔

---

[1] "قلیلًا ما تذکرون" میں بظاہر "ما" زائدہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بہت سے مقامات پر حروفِ زائدہ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تاکید کا معنی دیتے ہیں اور "قلیلًا" مصدر محذوف کی صفت ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے "تتذکرون تذکرًا قلیلًا"۔

[2] بنابریں "خلفاء الارض" کا معنی "خلفاء فی الارض" ہوگا۔

اسی طرح بارش ہے جو تمام کرہ خاکی پر زندگی اور حیات کا اعلان کرتی ہے اور جہاں پر بھی نازل ہوتی ہے خیر وبرکت اور رحمت وحیات کو وجود میں لے آتی ہے[1]

(مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد ۴ سورۂ اعراف کی ۵۷ ویں آیت کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں کہ بارش برسانے میں ہوائیں کیا کردار ادا کرتی ہیں؟)

آیت کے آخر میں مشرکین کو ایک بار پھر خطاب کر کے قرآن فرماتا ہے: آیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (ء الٰہ مع اللہ)۔

پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی فرماتا ہے: خدا اس سے بلند وبالا ہے کہ اس کا شریک قرار دیں۔ (تعالی اللہ عما یشرکون)۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں پانچویں سوال کو پیش فرماتا ہے جو مبداء اور معاد سے متعلق ہے، سوال یہ ہے: کیا تمھارے وہ معبود بہتر ہیں یا وہ جس نے خلقت کا آغاز کیا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا (امن یبدؤا الخلق ثم یعیدہ)۔

اور وہ جو تمھیں آغاز اور انجام کے اس دورانیے میں آسمان وزمین سے روزی عطا کرتا ہے (ومن یرزقکم من السمآء والارض)۔

کیا پھر بھی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (ء الٰہ مع اللہ)۔

"تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تمھارا عقیدہ یہی ہے تو اپنی دلیل لے آؤ اگر سچ کہتے ہو (قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین)۔

درحقیقت گزشتہ آیات سب کی سب مبداء اور عالمِ ہستی میں خداوند عالم کی عظمت اور اس کی نعمتوں کی علامات کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں لیکن آخری آیت میں بڑے لطیف انداز میں گفتگو کا رُخ معاد کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ آغازِ آفرینش بذاتِ خود اس کے انجام کی دلیل ہے اور تخلیق کی قدرت بذاتہٖ معاد کی ایک واضح اور روشن برہان ہے۔

اسی سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جسے بہت سے مفسّرین پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ان آیات کا روئے سخن مشرکین کی طرف ہے اور مشرکین ہی ان کے مخاطب ہیں اور اکثر مشرکین معاد (جسمانی) کے قائل نہیں ہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان سے سوال کر کے اس چیز کا اقرار لیا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے فریقِ مخالف کو اقرار پر آمادہ کیا گیا ہے کیونکہ اگر وہ صرف یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ آغازِ آفرینش اسی کی طرف سے ہے اور یہ تمام نعمتیں اور رزق وروزی بھی وہی ذات کردگار عطا

---

[1] "بُشُر" (بروزن "عُشُر") جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ "بشُر" (بروزن "کُتُب") کا مخفف ہے جس کی جمع "بشور" (بروزنِ قبول) آتی ہے جس کا معنی ہے مبشر یعنی بشارت دینے والا۔

فرماتی ہے تو یہی بات اس اقرار کے لیے کافی ہے کہ یہ چیز بھی تسلیم کریں کہ بروزِ قیامت دوبارہ جی اٹھنے کا امکان بھی موجود ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ "آسمان کے رزق" سے مراد بارش، سورج کی روشنی اور ان جیسے امور ہیں اور "زمین کے رزق" سے مراد نباتات اور مختلف غذائیں اور اناج ہے جو یا تو براہِ راست زمین سے اگتے ہیں یا بالواسطہ اس سے کمک حاصل کرتے ہیں جیسے چوپائے وغیرہ یا معدنیات اور دوسری گوناگوں چیزیں کہ جن سے انسان اپنی زندگی میں بہرہ مند ہوتا ہے۔

چند اہم نکات

ا۔ **مضطر کون ہے؟** اگرچہ خداوندِ عالم (شرائط کی موجودگی میں) ہر ایک کی دعا کو قبول فرماتا ہے: لیکن مندرجہ بالا آیات میں "مضطر" کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے کیونکہ قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ انسان اپنی آنکھیں مکمل طور پر عالمِ اسباب سے ہٹا کر اپنے دل وجان کو پوری طرح خدا کے اختیار میں دے دے۔ سب کچھ اسی کی طرف سے جانے اور ہر مشکل کا حل اسی کی طرف سے سمجھے اور یہ سب اضطرار کی حالت میں حاصل ہوتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور مومن شخص اس بارے میں اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لاتا ہے لیکن وہ کسی بھی صورت میں عالمِ اسباب میں کھو نہیں جاتا۔ بلکہ عالمِ اسباب کے وسائل و ذرائع کو بھی اسی کا عطیہ سمجھتا ہے اور اسباب کے پس پردہ "مسبب الاسباب" کی ذات کو دیکھتا ہے اور سب کچھ اسی سے طلب کرتا ہے۔

یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ بعض روایات میں اس آیت کی تفسیر حضرت مہدی (صلوات اللہ وسلامہ علیہ) کے ظہور سے کی گئی ہے چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

و اللہ لکانی انظر الی القائم وقد اسند ظهره الی الحجر ثم ینشد اللہ حقه .... قال هو و اللہ المضطر فی کتاب اللہ فی قوله: امن یجیب المضطر اذا دعاه و یکشف السوء و یجعلکم خلفآء الارض

خدا کی قسم! میں مہدی کو دیکھ رہا ہوں کہ حجرِ اسود سے ٹیک لگائے خدا کو اپنے حق کی قسم دے کر دعا مانگ رہے ہیں۔

پھر آپ نے فرمایا:

خدا کی قسم! قرآن مجید کی آیت "امن یجیب المضطر....." میں "مضطر" سے مراد بھی وہی ہیں۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کی ایک اور حدیث میں ہے:

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹۴۔

نزلت فی القائم من آل محمد علیهم السلام هو و اللہ المضطر اذا صلی فی المقام رکعتین و دعا الی اللہ عز وجل فاجابه و یکشف السوء و یجعله خلیفة فی الارض

یہ آیت مہدی آلِ محمدؐ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خدا کی قسم وہی مضطر ہے، جب وہ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز بجالائے گا اور خدا کی بارگاہ میں دست بدعا ہو کر اس سے سوال کرے گا تو خدا اس کی دعا کو قبول فرمائے گا۔ اس کی مشکلات کو دور کرکے اسے زمین کا خلیفہ بنائے گا۔[1]

جیسا کہ اور مقامات پر بھی اس قسم کی تفسیریں بیان ہو چکی ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آیت کو حضرت مہدی کے وجودِ ذی جود میں منحصر کیا جائے بلکہ آیت کا مفہوم وسیع ہے کہ جس کا ایک واضح مصداق حضرت مہدی کا وجودِ گرامی بھی ہے کہ اس دور میں جبکہ ہر طرف فتنہ و فساد پھیل چکا ہوگا، امیدوں کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے، انسانی مصیبتیں انتہا کو پہنچ چکی ہوں گی، بشریت جا رہی ہوگی، تمام کائنات پر اضطرار کی حکومت ہوگی تو ایسی حالت میں وہ روئے زمین کے مقدس ترین حصے پر دعا کے لیے ہاتھ بلند کرکے مشکلات کے دور ہونے کی دعا کریں گے اور خداوندِ عالم ان کی اس دعا کو مقدس عالمی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دے گا۔ "ویجعلکم خلفاء الارض" کے مصداق انھیں اور ان کے یار و انصار کو روئے زمین کا وارث اور خلیفہ بنائے گا۔[2]

دعا کی اہمیت، اس کی قبولیت کی شرائط اور بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کے اسباب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

۲۔ **ہر جگہ منطقی دلائل کی دعوت:** ہم قرآن مجید میں کئی مرتبہ پڑھ چکے ہیں کہ وہ اپنے مخالفین سے دلیل کا مطالبہ کرتا ہے خاص کر "هاتوا برهانکم" (اپنی دلیل لے آؤ) کا جملہ چار مقامات پر دہرایا گیا ہے (سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۱، سورہ انبیاء کی آیت ۲۴، سورہ نمل کی آیت ۶۴ اور سورہ قصص کی آیت ۷۵ میں) اور ان کے علاوہ دوسرے کئی مقامات پر لفظ "برهان" پر خصوصی طور پر زور دیا گیا ہے (برہان ایسی محکم دلیل کو کہتے ہیں جس میں ہمیشہ سچائی پائی جائے)۔

اسلام کی برہان طلبی کی یہ منطق درحقیقت اس کے قوی اور بے نیاز ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اسلام کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بھی منطق کی رو سے مقابلہ کرتا ہے جب وہ دوسروں سے برہان و دلیل کا مطالبہ کرتا ہے تو پھر خود اس سے کیونکر بے پرواہ ہو سکتا ہے؟ قرآنی آیات مختلف مسائل میں مختلف سطح پر منطقی دلائل اور علمی براہین سے چھلک رہی ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹۴۔

[2] عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ گفتگو بھی ٹھیک ۱۵ / شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ بروز ولادت باسعادت حضرت مہدی آخرالزمانؑ معرضِ تحریر میں آئی ہے۔

بر چیز آج کی تحریف شدہ مسیحیت کے بالکل برعکس ہے کہ جس پر آج کی عیسائیت انحصار کیے ہوئے ہے اور مذہب کو دل کے تابع سمجھے ہوئے ہے اور عقل کو مذہب سے کوسوں دور سمجھتی ہے بلکہ عقلی تضادات (توحید در تثلیث جیسے مسائل) کو مذہب کا جزو سمجھتی ہے یہی وجہ ہے کہ مذہب میں طرح طرح کے خرافات داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے حالانکہ اگر مذہب کو عقل سے جدا کر دیا جائے تو اس کی حقانیت کی دلیل ہی باقی نہیں رہ جاتی اور مذہب اور اس کی ضد میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

اسلام کے اس طرزِ عمل (برہان پر انحصار اور مخالفین کو منطقی دلائل کی دعوت) کی اہمیت اس وقت زیادہ آشکار ہوتی ہے جب ہم اس بات کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ اسلام ایک ایسے ماحول میں نمودار ہوا تھا جس میں بے اساس خرافات اور غیر منطقی مسائل کی حکمرانی تھی۔

۳۔ گزشتہ آیات کا خلاصہ: گزشتہ آیات میں قرآنِ مجید نے توحیدِ معبود کو ثابت کرنے کے لیے "توحیدِ خالق" اور "توحیدِ رب" (تخلیق و تدبیر کی توحید) پر زیادہ زور دیا ہے اور کائنات میں خداوندِ عالم کی بارہ عظیم نشانیوں کا ذکر کیا ہے (آسمان و زمین، نزولِ باران، بارش کے حیات بخش اثرات، انسان کی قرارگاہ کا سکون، جاری دریا، عظیم اور ساکن پہاڑ، میٹھے اور کڑوے پانی کے درمیان حد فاصل، بندوں کی دعا کی قبولیت، خشکی اور تری میں ان کی راہنمائی، نزولِ باران کا پیغام لانے والی ہوائیں، مخلوق کی تجدید حیات اور انسان کو زمین و آسمان سے روزی کی فراہمی)۔

یہ بارہ نعمتیں پانچ آیات میں پانچ سوالوں کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں جو بالترتیب ان پانچ مسائل کو بیان کرتی ہیں۔

خلقت، سکون، حل مشکلات، ہدایت اور دوبارہ زندگی کی طرف بازگشت۔

اس ہر ایک سوال کے ذیل میں اس جملے کو دہرایا گیا ہے۔

ء الٰه مع الله

آیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟

اس سوال کے بعد پہلی آیت میں فوراً ہی ان کے حق سے انحراف کی طرف اشارہ ہوا ہے، دوسری آیت میں ان کی جہالت و نادانی کی طرف، تیسری آیت میں ان کے سوچ بچار سے کام نہ لینے، چوتھی آیت میں ان کی فکری پستی کی طرف اور پانچویں آیت میں ان سے استدلال کا مطالبہ کیا گیا ہے جو مل کر ایک متحد اور منظم بات کی نشاندہی کرتا ہے۔

۶۵۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝

۶۶۔ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۣ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝

۶۷۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝

۶۸۔ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ترجمہ

۶۵۔ کہہ دو: جو بھی زمین و آسمان میں ہیں ان میں سے کوئی بھی خدا کے سوا غیب سے آگاہ نہیں ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔

۶۶۔ یہ مشرک لوگ آخرت کے بارے میں کچھ بھی صحیح علم نہیں رکھتے بلکہ یہ خود اس کے بپا ہونے کے بارے میں بھی شک کرتے ہیں، بلکہ یہ تو اس سے بالکل اندھے ہیں۔

۶۷۔ کافروں نے کہا: جب ہم اور ہمارے آباؤ اجداد خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر دوبارہ نکالے جائیں گے؟

۶۸۔ یہ وہی وعدہ ہے جو ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

تفسیر

گزشتہ آیات کے آخر میں قیامت اور معاد کی بات ہو رہی تھی لہٰذا ان آیات میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالی جا رہی ہے۔

سب سے پہلے اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے جو بارہا مشرکین کی طرف سے کیا جاتا تھا کہ قیامت کب بپا ہوگی؟ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دو کہ اللہ کے سوا زمین و آسمان کے سب باسی غیب سے آگاہ نہیں ہیں، وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے (قل لا یعلم من فی السماوات و الارض الغیب الا اللہ ومایشعرون ایان یبعثون)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ قیام قیامت کی تاریخ سمیت غیب کا علم خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کچھ علم غیب کسی کے بھی اختیار میں دے دے۔ جیساکہ سورہ جن کی آیات ۲۶ اور ۲۷ میں فرمایا گیا ہے:

عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدًا الّا من ارتضٰی من رسول

خدا عالم غیب ہے اور کسی کو بھی اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر جس رسول پر راضی ہو جائے اور اسے نبوت کے لیے چن لے۔

دوسرے لفظوں میں علم غیب ذاتی طور پر، مستقل صورت میں اور غیر محدود انداز میں تو خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور اس کے علاوہ دوسرے افراد جو کچھ بھی جانتے ہیں اسی کی جانب سے عطا کردہ ہوتا ہے لیکن قیامت کی تاریخ کا علم پھر بھی اس سے مستثنیٰ ہے اور کوئی بھی شخص اس سے ہرگز آگاہ نہیں ہے۔[1]

پھر مشرکین کی قیامت سے بے خبری اور اس کے بارے میں ان کے شک کے متعلق فرمایا گیا ہے: وہ مرنے کے بعد کی دنیا سے آگاہ نہیں ہیں بلکہ وہ دراصل شک میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ تو اندھے ہیں (بل ادارک علمھم فی الاٰخرۃ بل ھم فی شک منھا بل ھم منھا عمون)۔

"ادارک" دراصل "تدارک" تھا جس کا معنی ایک دوسرے کے پیچھے قرار پانا ہے بنابریں "بل ادارک علمھم فی الاٰخرۃ" کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے آخرت کے بارے میں اپنی تمام معلومات سے کام تو لیا ہے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ لہٰذا اس کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں بلکہ اندھے ہیں کیونکہ آخرت کی نشانیاں تو اسی دنیا میں آشکار ہیں مثلاً موسم بہار میں مردہ زمینوں کا زندہ ہو جانا، موسم خزاں میں خشک ہو جانے والے درختوں کا بارآور ہو جانا اور مجموعی طور پر عالم آفرینش میں عظمت الٰہی کا مشاہدہ، غرض سب کے سب دوبارہ زندگی کے امکان پر دلالت کرتے ہیں لیکن مشرک لوگ اندھوں کی مانند ان کے پاس سے گزر جاتے ہیں اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔

البتہ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا جملے کی اور بھی کچھ تفسیریں بیان کی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ادارک علمھم فی الاٰخرۃ" سے مراد یہ ہے کہ آخرت کے بارے میں حصول علم کے اسباب بہت سے ہیں اور یکے بعد دیگرے موجود ہیں لیکن ان کی آنکھیں ان کو دیکھ نہیں پاتیں۔

---

[1] علم غیب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۳ صفحہ ۳۵۱ جلد ۴ صفحہ ۳۵۷ تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مشرکین اگلے جہان میں حقائق سے باخبر ہوں گے۔ جب تمام پردے ہٹا دیئے جائیں گے۔

لیکن ان تینوں تفاسیر میں سے پہلی تفسیر آیت کے دوسرے جملوں اور بعد کی آیات میں آنے والی گفتگو سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

اس طرح سے آخرت کے منکرین کی جہالت کی تین نشانیاں بیان ہوئی ہیں:

پہلی[1] یہ کہ ان کا انکار اور اعتراض اس بنا پر ہے کہ وہ آخرت کی خصوصیات کو نہیں جانتے اور جس نے حقیقت کو سمجھا ہی نہیں وہ افسانہ طرازیاں ہی کرتا ہے۔

دوسری[2] یہ کہ وہ اصل آخرت کے وجود میں شک کرتے ہیں اسی لیے وہ قیامت کے قیام کی تاریخ کا سوال کرتے ہیں۔

تیسری[3] یہ کہ ان کی یہ جہالت اور شک اس وجہ سے نہیں کہ آخرت کے بارے میں ان کے پاس کوئی کافی اور شافی دلیل نہیں۔ بلکہ دلائل تو بہت ہیں لیکن وہ آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان دلائل کو نہیں دیکھ پاتے۔

بعد والی آیت روز قیامت کے منکرین کی منطق کو ایک جملے میں بیان کرتی ہے: کافروں نے کہا کہ جب ہم اور ہمارے آباؤ اجداد خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر بھی اسی خاک سے نکالے جائیں گے (و قال الذین کفروا ءاذا کنا ترابًا و اٰباؤنا ائنا لمخرجون)۔

انھوں نے اسی پر اکتفا کر لیا ہے کہ یہ ان ہونی بات ہے کہ انسان ایک مرتبہ گل سڑ کر خاک بن جائے اور پھر زندہ ہو جائے، حالانکہ انھیں یہ معلوم نہیں کہ پہلے بھی تو وہ خاک تھے اور خاک ہی سے اٹھائے گئے ہیں تو پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ ایک مرتبہ پھر خاک میں تبدیل ہو کر جی اٹھیں۔

اور پھر مزے کی بات ہے کہ قرآن مجید کے آٹھ مقامات پر ہمیں کفار کی اس قسم کی گفتگو ملتی ہے کہ وہ فقط اس بات کو بعید سمجھنے کی وجہ سے منکر قیامت ہو جاتے ہیں۔

پھر وہ کہتے ہیں: "یہ بے اساس وعدہ ہے جو ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے"۔ اس کا قطعاً کوئی اثر نہ تو ظاہر ہوا ہے اور نہ ہی ہوگا۔ (لقد وعدنا ھٰذا نحن و اٰباؤنا من قبل)۔

"یہ سب کچھ گزشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں" اور ان کی اوہام و خرافات سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں (ان ھٰذا الّا اساطیر الاولین)۔

بنابریں سب سے پہلے انھوں نے استبعاد سے سلسلہ گفتگو شروع کیا تھا اور انکار مطلق پر آکر تان توڑی، گویا وہ منتظر تھے کہ قیامت جلد رونما ہونے والی ہے اور چونکہ انھوں نے اس کا اپنی آنکھوں سے

مشاہدہ نہیں کیا لہٰذا اس کے منکر ہو گئے۔

بہر حال ان کی اس قسم کی باتیں ان کے غرور اور غفلت کی علامت ہیں۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ وہ اس طرح سے قیامت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توہین و تحقیر کرنا چاہتے تھے اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ وہی پرانے وعدے ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہے جو دوسرے انبیاء ہمارے آباؤ اجداد سے کرتے رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جس پر سوچ بچار کی جا سکے۔

۶۹۔ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ○

۷۰۔ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡهِمۡ وَلَا تَكُنۡ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡكُرُوۡنَ ○

۷۱۔ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ○

۷۲۔ قُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّكُوۡنَ رَدِفَ لَكُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ○

۷۳۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا یَشۡكُرُوۡنَ ○

۷۴۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَیَعۡلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوۡرُهُمۡ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ○

۷۵۔ وَمَا مِنۡ غَآئِبَةٍ فِی السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّا فِیۡ كِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ○

ترجمہ

۶۹۔ کہہ دیجیے: روئے زمین پر چل پھر کے دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا؟

۷۰۔ ان کے جھٹلانے اور انکار کرنے سے نہ گھبراؤ۔ اور نہ ہی تجھے ان کی سازشوں سے دل تنگ ہونا چاہیے۔

۷۱۔ وہ کہتے ہیں کہ (عذاب کا) یہ وعدہ (جو تو ہم سے کر رہا ہے) اگر تو سچا ہے تو بتا کہ وہ کب آئے گا؟

۷۲۔ تو کہہ دو کہ جس کے بارے میں تم جلدی کرتے ہو شاید اس کا کچھ حصہ تمھارے نزدیک اور آس پاس ہی ہو۔

۷۳۔ اور تمھارا پروردگار لوگوں پر فضل و رحمت کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر گزار نہیں ہیں۔

۷۴۔ اور تمھارا رب اس چیز سے بھی آگاہ ہے جو وہ اپنے سینوں میں چھپاتے ہیں اور اس سے بھی باخبر ہے جو وہ کھلم کھلا کرتے ہیں۔

۷۵۔ اور زمین و آسمان میں کوئی ایسی مخفی چیز نہیں ہے کہ جو کتاب مبین (لوحِ محفوظ اور پروردگار کے غیر متناہی علم) میں موجود نہ ہو۔

تفسیر

ان کی سازشوں سے نہ گھبرائیں

گزشتہ آیات میں متعصب کفار کی طرف سے معاد کے انکار کے بارے میں گفتگو تھی۔

چونکہ اس ہٹ دھرم قوم کے ساتھ منطقی بحث بیکار تھی اور پھر یہ بھی کہ قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات میں معاد قیامت کے بارے میں دلائل پیش کیے جاچکے ہیں اور ایسے دلائل بھی موجود ہیں جو عالم نباتات، عالم جنین اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کیے جاتے ہیں لہٰذا زیر تفسیر آیات میں ان کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل پیش کرنے کی بجائے انھیں درپیش آنے والے عذاب الٰہی سے ڈرایا جارہا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: کہہ دو کہ روئے زمین میں چلو پھرو، گزشتہ لوگوں کے آثار اور نشانیوں کو دیکھو اور یہ بھی دیکھو کہ مجرموں اور گنہگاروں کا کیا انجام ہوا ہے (قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المجرمین)۔

تم کہتے ہو کہ اس قسم کے وعدے ہمارے باپ دادا سے بھی کیے جاچکے ہیں اور انھوں نے بھی ایسے وعدوں کی پرواہ نہیں کی اور کوئی نقصان بھی نہیں اٹھایا۔ لیکن اگر تم تھوڑا سا بھی اس دنیا میں چلو پھرو اور مجرموں، گناہ گاروں اور توحید و قیامت کے منکروں کے آثار دیکھو، خاص طور پر ان آثار کو دیکھو جو تمھاری اسی سرزمین حجاز کے اردگرد بکھرے پڑے ہیں تو تمھیں خود اچھی طرح معلوم ہوجائے گا کہ حقیقت کچھ اور ہے۔

عنقریب تمھاری باری بھی آجائے گی، جلدی کیوں کرتے ہو؟ اگر تم نے بھی ان جیسا طریقۂ کار جاری رکھا تو تمھارا بھی وہی برا انجام ہوگا۔

قرآن مجید نے بارہا لوگوں کو گھومنے پھرنے اور سیر کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ وہ زمین میں چل پھر کر گزشتہ لوگوں کے آثار اور ان اقوام کی تباہ شدہ سرزمین کو دیکھیں جو عذاب میں مبتلا ہوچکی ہیں۔ بادشاہوں کے ٹوٹے پھوٹے محلات اور متکبرین کی تباہ حال قبروں اور بوسیدہ ہڈیوں کو ملاحظہ کریں۔ مغرور ثروت مندوں کے مال و دولت کو دیکھیں جن کا اب اپنا کوئی وارث نہیں رہا۔ پھر اس بات کی خصوصی طور پر صراحت کی گئی ہے کہ گزشتہ لوگوں کے ان آثار کا مطالعہ جو ایک زندہ، گویا اور محسوس تاریخ ہے دلوں کو بیدار اور آنکھوں کو بینا کرتا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت، کیونکہ بعض اوقات آثار قدیمہ میں سے کسی ایک کا مشاہدہ انسان کے قلب و روح میں اس قدر طوفان برپا کر دیتا ہے کہ تاریخ کی کئی موٹی موٹی کتابوں کے مطالعے سے بھی اس قدر تاثیر نہیں ہوتی۔

اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد (سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۷ کی تفسیر) میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں پر "مکذبین" (قیامت کو جھٹلانے والوں) کی بجائے "مجرمین" کہا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی تکذیب اس وجہ سے نہیں تھی کہ انھوں نے تحقیق کرنے میں غلطی کی ہے بلکہ ان کی تکذیب کا اصل سبب ہٹ دھرمی، ضد، عناد، دشمنی اور مختلف جرائم میں ملوث ہونا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے انکار اور مخالفت کا سخت دکھ ہوتا تھا اور وہ دل ہی میں ان کے لیے رنجیدہ رہتے تھے کیونکہ وہ سچے دل سے ان کی ہدایت اور بیداری کے خواہاں تھے لیکن دوسری طرف انھیں متواتر ان کی سازشوں کا سامنا بھی تھا لہٰذا بعد والی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلجوئی کرتے ہوئے کہتی ہے: تم ان کی تکذیب و انکار سے گھبراؤ نہیں اور غم نہ کھاؤ (و لا تحزن علیهم)۔

ان کی سازشوں سے پریشان نہ ہو اور اس وجہ سے تمھیں رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ہم تمھارے حامی و ناصر ہیں۔ (ولا تکن فی ضیق مما یمکرون)۔

لیکن یہ ضدی مزاج منکر بجائے اس کے کہ اپنے مہربان غم خوار پیغمبر کی نصیحتوں پر عمل کرتے اور مجرمین کے انجام سے عبرت حاصل کرتے، الٹا مذاق اڑانے پر تل گئے اور انھوں نے کہا کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو عذاب الٰہی کا یہ وعدہ کب پورا ہوگا (و یقولون متٰی هٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

باوجودیکہ ان کے مخاطب پیغمبر اسلامؐ تھے لیکن وہ یہ بات جمع کے صیغے کے ساتھ کر رہے ہیں کیونکہ سچے مومن بھی اس گفتگو میں آنحضرتؐ کے ہم صدا تھے لہٰذا طبعی طور پر وہ بھی ان کے مخاطب تھے۔

اس موقع پر قرآن مجید ان کے مذاق کو حقیقی سمجھ کر انھیں حقیقت پر مبنی جواب دیتا ہے کہ "انھیں کہہ دو! کہ جس عذاب کی تم جلدی کرتے ہو شاید اس کا کچھ حصہ تمھارے نزدیک اور آس پاس ہی ہو" (قل عسٰی ان یکون ردف لکم بعض الذی تستعجلون)۔

جلدی کیوں کر رہے ہو؟ عذاب الٰہی کو حقیر کیوں سمجھ رہے ہو؟ کیوں اپنے آپ پر رحم نہیں کرتے ہو؟ آخر عذاب خداوندی کوئی مذاق نہیں ہے۔ سمجھ لو کہ بس تمھارے انھی الفاظ کی وجہ سے عذاب الٰہی اور قہر و غضب ذوالجلال تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور ابھی تم پر نازل ہوا ہی چاہتا ہے اور تمھیں نیست و نابود کرکے رکھ دینے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہے، اتنے ہٹ دھرم کیوں بن رہے ہو؟

"ردف" (بروزن "حرف") کسی چیز کے پیچھے آنے کے معنی میں ہے لہٰذا جو شخص گھوڑے پر کسی کے پیچھے بیٹھتا ہے اسے "ردیف" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ان افراد اور چیزوں کو بھی "ردیف" کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے ہوتی ہیں۔

اس عذاب سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سخت وار ہے جو ان سرکش اور ہٹ دھرم مجرمین کے

پیکر پر جنگ بدر کے دن پڑا۔ جنگ بدر مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہونے والی سب سے پہلی جنگ ہے جس میں کفّار کے ستر نامی گرامی افراد مارے گئے اور ستر آدمی اسیر ہوئے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عمومی دردناک عذاب ہو لیکن "رحمۃ للعالمین" نبیؐ کے وجود اقدس کی وجہ سے ان سے ہٹا لیا گیا ہو۔ سورہ انفال کی آیت ۳۳ اسی بات کی شاہد ہے، خدا فرماتا ہے:

وما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم

جب تک تم ان لوگوں میں موجود ہو خداوند عالم ان کو معذّب نہیں کرے گا۔

"عسٰی" (شاید) کی تعبیر پیغمبر اسلامؐ کی زبانی ہے بلکہ (بعض لوگوں کی سوچ کے برعکس) کلامِ الٰہی میں بھی اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ کسی چیز کے مقدمات اور اقتضاء کے وجود کی طرف اشارہ ہے ہر چند کہ ممکن ہے ان مقدمات کو کوئی رکاوٹ اور مانع پیش آجائے اور وہ چیز اپنے آخری مقصد تک نہ پہنچ سکے (غور کیجیے گا)۔

پھر اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر خداوند عالم تمھیں عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا تو اس کی وجہ اس کا تم پر فضل و رحمت ہے تاکہ تمھیں اپنی اصلاح اور گناہوں کی تلافی کا موقع مل سکے۔ ارشاد ہوتا ہے: تمھارا رب تمام لوگوں پر فضل و رحمت کرنے والا ہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہیں (وان ربك لذو فضل علی الناس و لکن اکثرھم لا یشکرون)۔

اگر ان کا یہ خیال ہو کہ خداوند عالم انھیں عذاب اس لیے نہیں کرتا کہ وہ ان کی بُری نیتوں اور غلط سوچوں سے بے خبر ہے تو یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ "تمھارا پروردگار تو اس چیز کو بھی بخوبی جانتا ہے جو وہ سینوں میں چھپاتے ہیں اور اس سے بھی باخبر ہے جسے وہ اعلانیہ انجام دیتے ہیں" (وان ربك لیعلم ما تکن صدورھم وما یعلنون)[1]۔

وہ ان کے باطن سے بھی اسی قدر آگاہ ہے جس قدر ظاہر سے، اصولی طور پر ظاہر و باطن اور غیب و شہود اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ یہ تو ہمارا محدود علم ہے کہ ہم نے ایسے مفاہیم وضع کر لیے ہیں ورنہ ایک غیر محدود اور لامتناہی ذات کے لیے تو ایسے مفاہیم کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہاں پر خداوند عالم کے عالم الغیب ہونے کا ذکر افعال کے عالم ہونے پر مقدّم ہے اور یہ نیت اور ارادے کے اہم ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس لیے ہو کہ ظاہری افعال کا سرچشمہ داخلی نیت ہی ہوتی ہے اور علّت کے علم کو معلول کے علم پر مقدّم ذکر کیا گیا ہے۔

پھر قرآن فرماتا ہے کہ خدا صرف ان کے ظاہری اور باطنی حالات و کردار ہی کو نہیں جانتا بلکہ اس کا علم اس قدر وسیع اور محیط ہے کہ آسمان و زمین میں کوئی موجود بھی ایسا پنہاں اور مخفی نہیں ہے جو (علمِ پروردگار کی) کتاب مبین میں درج نہ ہو۔

[1] "تکن" "کن" (بر وزن "جن") کے مادہ سے ہے اور اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں دوسری اشیاء کو چھپا کر رکھا جاتا ہے اور یہاں پر مراد کفار کے اسرار، افکار اور سازشیں ہیں جنھیں وہ دل میں چھپا کر رکھتے ہیں۔

(وما من غائبۃ فی السماء والارض الا فی کتاب مبین)[1]۔

ظاہر سی بات ہے کہ "غائبۃ" کا ایک وسیع معنی ہے جو بھی ہماری حس سے مخفی ہے وہ اس کے دائرے میں آجاتا ہے خواہ وہ بندوں کے مخفی اعمال ہوں یا ان کی باطنی نیتیں، خواہ وہ آسمان و زمین کے مخفی اسرار ہوں یا قیامت کا برپا ہونا اور عذاب کے نزول کا زمانہ وغیرہ، اور اگر ہم غائبۃ کی مذکورہ امور میں سے کسی ایک سے تفسیر کریں گے تو یہ بلا دلیل ہوگی۔

"کتاب مبین" سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ یہ خداوند عالم کے لامحدود علم کا دوسرا نام ہے جس کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد ۳ (سورہ انعام کی آیت ۵۹ کی تفسیر) میں گزر چکی ہے۔

ایک نکتہ

آیاتِ بالا میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد کے منکر لوگ قیامت پر ایمان لانے اور اس ایمان کی وجہ سے عائد ہونے والے فرائض سے جان چھڑانے کے لیے تین طرح کے اشکال کیا کرتے تھے۔

۱۔ خاک ہو جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو وہ بعید سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کے نظریے کے مطابق خاک سرچشمہ حیات نہیں ہو سکتی۔

۲۔ یہ ایک پرانا عقیدہ ہے کوئی نئی بات اس میں دکھائی نہیں دیتی۔

۳۔ منکرینِ معاد پر عذاب نازل نہیں ہوتا کیونکہ اگر منکرینِ معاد واقعًا عذاب میں مبتلا ہوں گے تو پھر یہ ان پر کیوں نازل نہیں ہوتا۔

قرآن مجید نے پہلے اور دوسرے سوال کا جواب تو اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ یہ بالکل واضح ہے۔ کیونکہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں کہ مٹی زندگی کا سرچشمہ بنتی ہے کیونکہ خود ہم بھی پہلے مٹی تھے پھر ہم نے ایک زندہ موجود کی صُورت اختیار کر لی۔

نیز کسی چیز کا قدیمی ہونا اس کی اہمیّت کو ہرگز کم نہیں کر دیتا، کیونکہ اس کائنات کے اصلی اور بنیادی قوانین ازل سے ابد تک ثابت، اٹل اور برقرار ہیں۔ اصول فلسفہ ہوں یا مسائل ریاضی اور دوسرے علوم، ان میں سے اکثر و بیشتر اٹل اور ناقابلِ انکار ہیں۔

مثلاً کیا اجتماعِ نقیضین کا محال ہونا یا فیثا غورث کا جدول ضرب اپنے قدیمی ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں

[1] "غائبۃ" ایک صفت ہے اور بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق اس میں "تاء" تانیث کی نہیں ہے بلکہ مبالغہ کے لیے ہے اور یہ ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے جو بہت زیادہ مخفی اور پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک یہ احتمال بھی ہے کہ شاید "تاء" تانیث کی ہو اور اس کا موصوف یا تو لفظ "اشیاء" ہے اور یا "خصلت" وغیرہ ہو کہ محذوف ہے۔

ہوں گے ؟

یا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ عدالت اچھی چیز ہے اور ظلم بری چیز اور ان کی یہ اچھائی اور برائی ہمیشہ سے چلی آری ہے اور ہمیشہ تک رہے گی تو کیا یہ ان کے باطل ہونے کی دلیل ہے ؟ بلکہ اصولی طور پر تو کسی چیز کا قدیم ہونا اس کی اصالت پر دلالت کرتا ہے۔

تیسرے اعتراض کا یوں جواب دیا گیا ہے کہ نزولِ عذاب کے بارے میں عجلت سے کام نہ لو یہ تو خدا کی مہربانی ہے کہ تمھیں جلد عذاب نہیں دیتا تاکہ تمھیں کچھ مہلت مل جائے اور سمجھ جاؤ لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین کرلو، کہ عذاب الٰہی اگرچہ دیر سے آئے لیکن آئے گا ضرور"۔

۷۶۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

۷۷۔ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

۷۸۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝

۷۹۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝

۸۰۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝

۸۱۔ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۶۔ یہ قرآن بنی اسرائیل کے لیے ان اکثر چیزوں کو بیان کرتا ہے جن کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

۷۷۔ اور مومنین کے لیے یہ ہدایت و رحمت ہے۔

۷۸۔ بے شک تمھارا پروردگار قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا اور وہ قادر و علیم ہے۔

۷۹۔ پس تم خدا پر توکل کرو کیونکہ تم واضح حق پر ہو۔

۸۰۔ تم نہ تو اپنی باتیں مُردوں کے کانوں تک پہنچا سکتے ہو اور نہ ہی ان بہروں کو بلا سکتے ہو جب وہ منہ پھیر کر پیچھے کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

۸۱۔ اور نہ ہی تم اندھوں کو گمراہی سے نجات دلا سکتے ہو تم تو فقط ان لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں اور حق کے سامنے جُھک جائیں۔

تفسیر

اندھے اور بہرے آپ کی بات نہیں مانیں گے

گزشتہ آیات میں مبداء اور معاد کی بات ہورہی تھی اور زیرِ نظر آیات میں نبوّت اور قرآن کی حقانیت کو بیان کرنے کے بعد اس گفتگو کو مکمل کر دیا گیا ہے ۔

دوسرے یہ کہ گزشتہ آیات میں خداوندِ عالم کے غیر محدود اور لامتناہی علم کی بات ہورہی تھی اور زیرِ نظر آیات میں اس کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے ۔

پھر یہ کہ گزشتہ آیات میں روئے سخن مشرکین کی طرف تھا جبکہ ان آیات میں دوسرے کفّار مثلاً یہود اور ان کے درمیان اختلافات کی بات ہورہی ہے ۔

چنانچہ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے : یہ قرآن بنی اسرائیل کے لیے اکثر ان چیزوں کو بیان کرتا ہے جن کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے (ان ھٰذا القراٰن یقص علٰی بنی اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ یختلفون)۔

بنی اسرائیل کا آپس میں بہت سے مسائل میں اختلاف تھا ۔ جناب مریمؑ اور حضرت عیسٰیؑ کے بارے میں ان کا اختلاف تھا ۔ جس پیغمبر کے بارے میں تورات میں خوشخبری دی جاچکی تھی اس میں ان کا اختلاف تھا کہ وہ کون پیغمبر ہے اور اسی طرح بہت سے دینی اور مذہبی احکام میں ان کے اختلافات تھے قرآن نے آکر اس سلسلے میں حق مطلب ادا کر دیا اور فرمایا :

مسیح نے صریح الفاظ میں اپنا تعارف یوں کروایا کہ میں خدا کا بندہ ہوں اسی نے مجھے (آسمانی) کتاب عطا کی ہے اور مجھے پیغمبر بنایا ہے قال انی عبد اللّٰہ اٰتانی الکتاب وجعلنی نبیّا (مریم ۳۰)

اور قرآن نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ جناب عیسٰی علیہ السلام صرف باپ کے بغیر پیدا ہوگئے ہیں اور یہ بات خدا کے لیے محال نہیں ہے کیونکہ اس نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر آدم کو خلق فرمایا ہے :

ان مثل عیسٰی عند اللّٰہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب

(آلِ عمران / ۵۹)

جس پیغمبر کی نشانیاں تورات میں بتائی گئی تھیں وہ سب کی سب پیغمبرِ اسلامؐ پر منطبق بتائیں ، کیونکہ آپ کے علاوہ کسی اور پر صادق نہیں آتیں ۔

بہرحال قرآنِ مجید کے دیگر فرائض کے علاوہ ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ ان اختلافات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور اپنا صحیح فیصلہ سنائے جو خرافات ، انبیاء کی تعلیمات کے حقائق کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ ہر نبی اور رسول کا فرض بنتا ہے کہ تحریفات اور باطل کے حق کے ساتھ گڈمڈ ہوجانے کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہوں ان کا خاتمہ کرے اور لوگوں کو صحیح راہ کی طرف راہنمائی کرے ۔ چونکہ یہ کام دورِ جہالت میں رہنے والے اور کسی کے آگے زانوئے تلمذ نہ کرنے والے

شخص سے انجام پا رہا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کا نہیں بلکہ خداوندِ عالم ہی کا کام ہے

نیز ہر قسم کے اختلافات کا نتیجہ ہدایت و رحمت کا سبب ہوتا ہے لہٰذا بعد والی ۔۔۔ میں ارشاد فرمایا گیا ہے : اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ قرآن مومنین کے لیے ہدایت ۔۔۔ و رحمۃ للمؤمنین)۔

ہدایت و رحمت اس لحاظ سے ہے کہ اختلافات کو دور کرتا اور خرافات کا ڈٹ ۔۔۔

ہدایت اور رحمت اس لحاظ سے ہے کہ اس کی عظمت کی دلیل اس کے عظیم مطا ۔۔۔

ہدایت اور رحمت ہے اس لحاظ سے کہ صحیح راہ کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور راہ پر بت ۔۔۔

اور "مومنین" کا اس مقام پر خصوصی ذکر اس لیے ہے (جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ۔۔۔ قبولیت اور پروردگارِ عالم کے سامنے سر جھکا دینے کی آمادگی نہیں پائی جائے گی اس وقت ۔۔۔ بہرہ ور نہیں ہوسکتا ۔

بنی اسرائیل کے کچھ گروہ قرآنِ مجید کی طرف سے حقائق بیان ہونے کے باوجود ۔۔۔ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے ، تمھارا پروردگار ان کے ۔۔۔ اور عالم ہے (ان ربک یقضی بینھم بحکمہ و ھو العزیز العلیم)۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت میں اس بات کی تو صراحت نہیں کی گئی کہ آخری فیصلہ بروز ۔۔۔ آیات کے قرینے کی رو سے جن میں بنی اسرائیل کے اختلافات اور خداوندِ عالم کے فیصلے کا واضح ۔۔۔ یہی چیز مقصود ہے ۔

سورۂ جاثیہ کی آیت ۱۷ میں ہے :

ان ربک یقضی بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ ۔۔۔

تمھارا پروردگار قیامت کے دن ان لوگوں کے درمیان ان چیزوں ۔۔۔ بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے ۔

اسی قسم کا مفہوم سورۂ یونس کی آیت ۹۳ میں بھی آیا ہے ۔

یہاں پر خداوندِ عالم کی دو اوصاف کے ساتھ توصیف کی گئی ہے ایک "عزیز ۔۔۔ کی طرف اشارہ ہے جو کسی قاضی میں ضرور ہونی چاہئیں ۔ ایک تو کافی حد تک علم ہو ۔۔۔ کی طاقت ہو اور خدا میں یہ دونوں صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں ۔ کیونکہ وہ سب سے ۔۔۔ قدرت مند ہے ۔

چونکہ یہ الفاظ قرآن مجید کی عظمت بیان کرنے اور بنی اسرائیل کو متنبہ کرنے ۔۔۔ کی تسکین اور قلبی سکون کا سبب بھی ہیں لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ۔۔۔

۔۔۔ قاعدہ کلیہ کی صورت
۔۔۔ ہ انہ لہدًی
۔۔۔ بتاتا ہے ۔
۔۔۔ نسان کے اندر حق کی
۔۔۔ منبع فیضِ الٰہی سے کماحقہ
۔۔۔ ور انھوں نے حقائق
۔۔۔ رے گا اور وہی غالب
۔۔۔ جائے گا لیکن دو دوسری
۔۔۔ زیرِ نظر آیت میں بھی
۔۔۔ جن کے
۔۔۔ یم" اور یہ ان دو اوصاف
۔۔۔ ہے پر عمل درآمد کروانے
۔۔۔ سب سے زیادہ
۔۔۔ سلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
۔۔۔ خدا پر بھروسہ کرو ۔

(فتوکل علی اللہ)۔

اس خدا پر بھروسہ کرو جو غالب اور ناقابلِ تسخیر ہے اور دنیا کی ہر چیز سے آگاہ ہے۔ اس خدا پر بھروسہ کرو جس نے اس قدر باعظمت قرآن تمھیں عطا فرمایا ہے۔

اس پر توکل کرو اور ان لوگوں کی مخالفت سے نہ گھبراؤ کیونکہ تم واضح حق پر ہو (انك علی الحق المبین)۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن واضح طور پر حق ہے تو پھر یہ لوگ اس کی اس حد تک مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ بعد والی آیات درحقیقت اس سوال کا جواب دے رہی ہیں کہ:

اگر وہ حقِ مبین کو قبول نہیں کرتے اور تمھاری گرمادینے والی باتیں ان کے سرد دلوں پر اثر نہیں کرتیں تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تم مُردوں کے کانوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے (انك لا تسمع الموتٰی)[1]

میرے پیغمبر! تمھارے مخاطب تو زندہ لوگ ہیں، جن میں زندہ، بیدار اور حق طلب روح پائی جاتی ہے نہ کہ زندہ نما مردہ لوگ کہ تعصب، ضد اور گناہوں پر اصرار نے ان سے ان کی سوچ اور فہم و فراست کو سلب کر لیا ہے۔

حتیٰ کہ ان لوگوں تک بھی تم اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے جو زندہ تو ہیں لیکن بہرے ہیں خاص طور پر جب وہ تم سے پشت پھیریں اور تم سے دُور ہو جائیں (ولا تسمع الصم الدعآء اذا ولوامدبرین)۔

اگر وہ تمھارے قریب ہوتے پھر تو ممکن تھا کہ تم اپنا منہ ان کے کانوں کے نزدیک لے جا کر بلند آواز سے ان تک حق کی آواز پہنچاتے اور شاید ان کے بہرے کان کچھ نہ کچھ سن لیتے۔ لیکن وہ تو ایسے بہرے ہیں جو تم سے روز بروز دور بھاگتے نظر آتے ہیں۔

پھر بھی اگر سننے والے کانوں کی بجائے ان کی دیکھنے والی آنکھیں ہی ہوتیں۔ اگرچہ ان کے کانوں تک کسی قسم کی آواز نہ پہنچتی، لیکن ممکن تھا کہ علامتوں اور اشاروں سے ہی صراطِ مستقیم تلاش کر لیتے لیکن افسوس کہ وہ نابینا بھی ہیں "اور تم نابیناؤں کو ان کی گمراہی سے نہ باز رکھ سکتے ہو نہ انھیں ہدایت کر سکتے ہو" (وما انت بهادی العمی عن ضلا لتهم)۔

"تم تو صرف اپنی حق باتیں ان لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لے آتے ہیں اور حق کے آگے سر جھکانے کی روح اپنے اندر رکھتے ہیں" (ان تسمع الا من یؤمن بایاتنا فهم مسلمون)۔

درحقیقت مندرجہ بالا دونوں آیات انسان کی بیرونی دنیا سے شناخت کے عوامل اور اس کے اس جہان سے مربوط ہونے کے طریقوں کا ایک واضح مجموعہ ہیں۔

دل کے مُردہ ہو جانے کے مقابلے میں "تشخیص کی حس" اور بیدار عقل۔

قوتِ سامعہ کے ذریعے حق بات کو قبول کرنے کے لیے "سننے والے کان"۔

---

[1] بعض مفسرین نے اس جملے اور بعد والے جملوں کو پیغمبر اکرمؐ کے توکل بر خدا کرنے اور مایوس نہ ہونے کی دلیل مانا ہے جب کہ ظاہری طور پر یہ اس سوال کا جواب ہے جو قرآن کے "حق مبین" ہونے کے بارے میں ہوا ہے۔

قوتِ باصرہ کے ذریعہ حق و باطل کے چہرد ں ... ننے کے لیے "دیکھنے و ... آنکھ"۔

لیکن ان کی ہٹ دھرمی، ضد اور اندھی تقلید ... تکاب گناہ نے ان کی حقیقت میں آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا بلکہ ان کی عقل و دل کو بے کار کر کے رکھ دیا ہے، اگر ... م کے لوگوں کو تمام ... اولیاء اور فرشتے بھی مل کر ہدایت کریں پھر بھی وہ ہدایت حاصل نہیں کریں گے، کیونکہ ان کا ... کی بیرونی دنیا سے ربطہ بالکل منقطع ہو چکا ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے من کی دنیا میں ہی ڈوب چکے ہوتے ہیں۔

اس قسم کا مفہوم سُورۂ بقرہ، سورہ رُدم اور قر ... کئی اور سورتوں میں بھی ملتا ہے اور ہم نے "شناخت کے آلات کی نعمت کی اہمیت کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ... میں سورہ نحل کی ... ۷۸، کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

ایک مرتبہ پھر ہم اس بات کی وضاحت کرتے ... ایمان اور تسلیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان دینی حقائق کو پہلے سے قبول کر چکا ہو کیونکہ اس سے تحصیل حاصل لازم آ ... مقصد یہ ہے کہ جب تک انسان کے اندر فرمانِ خدا کے آگے خضوع اور حق طلبی کی روح پیدا نہیں ہو گی اس وقت تک وہ ... باتوں پر کان نہیں دھرے گا۔

چند ایک نکات

۱۔ **توکل کے اسباب:** "توکل" ... "ت" کے مادہ سے ہے، قرآنی منطق کی رُو سے خدا کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرنے، اسے اپنا ولی اور وکیل بنانے ... ہر قسم کی مشکلات و رکاوٹوں سے نہ گھبرانے کے معنی میں ہے۔ یہ ایمان کی ایک اہم ترین نشانی اور مشکلات ... میں کامیابی کے حصول کے لیے اہم ترین عوامل میں سے ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات ... دلیل دو چیزیں بیان کی گئی ہیں:

ایک تو قدرت اور علم و آگاہی کہ جس کی وجہ ... انسان خدا پر اعتماد کرتا ہے اور دوسری اس راہ کا روشن ہونا ہے جسے انسان نے اختیار کیا ہے۔

درحقیقت وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ آپ کو گھبر ... خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کی امیدوں کا سہارا اور آپ کی آرزوؤں کا مرکز وہ خدا ہے جو عزیز اور ناقابلِ تسخیر ... علیم و آگاہ بھی ہے نیز آپ بھی حقِ مبین کی راہ پر گامزن ہیں جو شخص حقِ مبین کا دفاع کر رہا ہو اسے کیوں گھبرانا اور خوف کھانا پڑ ...

اگر آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ آپ ... نہیں تو آپ کو اس چیز کی ہرگز پرواہ نہیں کرنا چاہیے نہ تو ان کی آنکھیں بینا ہیں نہ کان سنتے ہیں اور نہ ہی قلوب زندہ ... طور پر وہ تو آپ کے حلقۂ تبلیغ سے ہی خارج ہیں۔ صرف حق طلب، خدا کے عاشق اور عدالت کے پیاسے ہی آپ ... آبِ زلال کی طرف لپک کر آئیں گے تاکہ اس سے سیراب ہو سکیں۔

۲۔ **موت اور حیات قرآن کی ... ت:** بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو مختلف زاویہ فکر سے اپنے لیے مختلف معانی پیدا کر لیتے ہیں جن میں "موت" اور ... الفاظ بھی ہیں جنھیں اگر مادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کا صرف طبیعیاتی (Physical) معنی ... جب تک دل کام کرتا رہے، اعضاءِ بدن میں خون کی گردش جاری رہے

جسم میں حس وحرکت اور جاذبہ و دافعہ کا سلسلہ جاری رہے تو کہا جاتا ہے کہ انسان زندہ ہے لیکن جب یہ سلسلہ رُک جائے تو اس کی موت کی قطعی دلیل بن جاتا ہے اور اس امر کا پتہ اچھی طرح دیکھ بھال کے ذریعے تھوڑی سی دیر میں لگایا جاسکتا ہے۔

لیکن قرآنی منطق کی رُو سے بہت سے ایسے افراد ہیں جو طبیعیاتی طور پر تو زندہ ہیں لیکن ان کا شمار مُردوں میں ہوتا ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی طرف آیات زیر بحث میں اشارہ کیا جاچکا ہے اور اس کے برعکس کچھ افراد وہ بھی ہیں جو ظاہراً تو مردہ ہیں لیکن درحقیقت زندہ جاوید ہیں جیسے شہداء راہِ خدا۔

ان مختلف نظریات کا سبب یہ ہے کہ اسلام نے جہاں انسانی زندگی اور اس کی شخصیت کا معیار اس کی روحانی اقدار میں منحصر کیا ہے وہاں پر وجود کے فائدہ مند ہونے کو حیات اور بے فائدہ ہونے کو عدم حیات پر محمول کیا ہے۔

جو شخص ظاہری طور پر زندہ ہے لیکن وہ نفسیاتی خواہشات میں اس قدر مگن ہوچکا ہے کہ نہ تو کسی مظلوم کی فریاد سنتا ہے نہ ہی منادیٔ حق کی آواز سنتا ہے نہ کسی بے نوا کا چہرہ دیکھتا ہے اور نہ ہی عالمِ وجود میں پروردگار کی عظمت کے نشانات پر نظر کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے ماضی اور مستقبل پر ایک لحظے کے لیے نہیں سوچ سکتا تو قرآنی منطق کی رُو سے ایسا شخص مُردہ ہے لیکن جو لوگ اپنے مرنے کے بعد بھی ایسے آثار چھوڑ گئے ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے افکار اور بتائے ہوئے راستے دنیا والوں کے لیے اسوہ، نمونہ اور راہنما اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں تو ایسے لوگ زندہ جاوید ہیں [1]

ان سب سے ہٹ کر بھی ہمارے پاس بہت سے ایسے ثبوت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسانوں کی برزخی زندگی کو تسلیم کرتا ہے اور تعجب تو ان بعض بے خبر "وہابیوں" پر ہوتا ہے جو پیغمبر اسلام کی ذات تک کے لیے بھی حیات بعد از موت کے قائل نہیں ہیں یعنی انھیں بھی مُردہ تسلیم کرتے ہیں اور آپ کو وسیلہ نہ ماننے کے لیے ان کی ایک دلیل یہی ہے کہ مُردوں کو وسیلہ نہیں بنایا جاسکتا وہ کہتے ہیں کہ وہ تو مرچکے ہیں اور مُردے کوئی بھی کام نہیں کرسکتے۔ اس سے بڑھ کر قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ وہ اپنے مدعا پر زیرِ نظر آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے وہابیوں نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک طرح کی برزخی زندگی ہے یہ زندگی حیاتِ شہداء سے بھی بڑھ کر ہے جس کے بارے میں قرآن نے تصریح کردی ہے حتیٰ کہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ آنحضرتؐ ان لوگوں کے سلام کو بھی سنتے ہیں جو آپ پر سلام بھیجتے ہیں [2]

شیعہ اور سنی کتابوں میں اس بارے میں بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اور حضرات آئمہ اطہار علیہم السلام) ان لوگوں کا سلام سُن لیتے ہیں جو ان پر دور یا نزدیک سے بھیجتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں حتیٰ کہ اُمت کے اعمال بھی ان کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں [3]

---

[1] روحانی زندگی اور موت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۷ سورہ انفال کی آیت ۲۴ میں تفصیل سے گفتگو کرچکے ہیں۔

[2] محمد بن عبدالوہاب کے رسائل "الھدیۃ السنیۃ" میں سے دوسرا رسالہ ص ۴۱۔

[3] مزید تفصیل کے لیے سید محسن امین عاملی کی کتاب "کشف الارتیاب" ص ۱۰۹ کا مطالعہ کیجیے۔

جنگ بدر کے بارے میں صحیح بخاری میں ایک حدیث یوں مرقوم ہے:

کفار کی شکست اور جنگ کے خاتمے کے بعد رسول اللہؐ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس کنوئیں کے پاس پہنچے جہاں مشرکین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں آپ نے انھیں نام لے لے کر پکارا اور فرمایا "کیا بہتر نہیں تھا کہ تم خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے؟ جو وعدہ ہم سے خدا نے کیا تھا اسے تو ہم نے پالیا ہے کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کے وعدہ کو پالیا ہے"۔ اس موقع پر جب حضرت عمر نے کہا یارسول اللہؐ! آپ ایسے جسموں سے ہم کلام ہیں جن میں روح نہیں ہے، تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ ما انتم باسمع لما اقول منھم

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم ان سے زیادہ نہیں سُن سکتے ہو۔ [1]

جنگ جمل کے واقعات میں ہے کہ اصحاب جمل کی شکست کے بعد حضرت علی مقتولین کے درمیان سے گزر رہے تھے جب قاضی بصرہ کعب بن سور کی نعش کے پاس پہنچے تو فرمایا اسے بٹھا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا پھر آپ نے اس سے مخاطب ہوکر فرمایا:

کعب! وائے ہو تم پر، تمھارے پاس علم کا خزانہ تو تھا لیکن اس نے تمھیں ذرہ بھر فائدہ نہ پہنچایا اور شیطان نے تجھے گمراہ کرکے جہنم بھیج دیا [2]

نہج البلاغہ میں ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام جنگِ صفین سے کوفہ واپس لوٹ رہے تھے تو شہر کوفہ کی دیوار کے اس طرف ایک قبرستان تھا، آپ قبرستان کے قریب پہنچے تو مُردوں سے مخاطب ہوکر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے سلسلے میں ارشاد فرمایا:

یہ تو ہمارے ہاں کی خبر تھی، تمھارے ہاں کی کیا خبر ہے؟

پھر آپؑ نے خود ہی ارشاد فرمایا:

اما لو اذن لھم فی الکلام لاخبروکم ان خیر الزاد التقوٰی

اگر انھیں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو بتائیں کہ آخرت کا بہترین توشہ اور زادِ راہ تقوٰی ہے۔

اور یہ بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مُردے بھی باتیں سنتے ہیں اور باتوں کا جواب بھی دے سکتے ہیں لیکن انھیں بولنے کی اجازت نہیں ہے [3]

یہ سب تعبیرات انسان کی برزخی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۵ ص ۹۷ (باب قتل ابوجہل)۔

[2] شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید جلد ۱ ص ۲۴۸۔

[3] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۱۳۰۔

۸۲۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ ۝

۸۳۔ وَیَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ یُّكَذِّبُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ۝

۸۴۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰیٰتِیْ وَلَمْ تُحِیْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

۸۵۔ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا یَنْطِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۸۲۔ اور جب ان پر عذاب کا حکم آپہنچے گا (اور وہ قیامت کے کنارے پہنچ جائیں گے) تو ہم ایک چلنے والا زمین سے نکالیں گے کہ جو ان سے گفتگو کرے گا اور کہے گا کہ لوگ ہماری آیات پر ایمان نہیں لاتے۔

۸۳۔ اس دن کا سوچو جب ہم ہر اُمت سے ایک ایسے گروہ کو محشور کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے اور انھیں روکے رکھیں گے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے آملیں گے۔

۸۴۔ یہاں تک (کہ جب وہ حساب کے لیے) پیش ہوں گے تو ان سے کہے گا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا ہے اور تحقیق سے کام نہیں لیا ؟ تم کیا اعمال انجام دیتے رہے ہو ؟

۸۵۔ تو اس وقت ان پر ان کے کردہ ظلم کی وجہ سے عذاب آجائے گا اور وہ کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں عذاب اور قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں کفار کی جلد بازی کا ذکر تھا اور وہ بڑی بےچینی سے اس کا انتظار کیا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ جس عذاب کا آپ وعدہ کیا کرتے ہیں وہ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتا ؟ قیامت کیوں نہیں برپا ہوتی ؟ زیر نظر آیات میں ایسے چند واقعات کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کے قریب واقع ہوں گے نیز ہٹ دھرم منکرین کا دردناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے : جب عذاب کا حکم آپہنچے گا اور وہ قیامت کے کنارے پہنچ جائیں گے تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک
چلنے والا ظاہر کریں گے جو ان سے باتیں کرے گا اور وہ کہے گا کہ لوگ خدا کی آیات پر ایمان نہیں لاتے (و اذا وقع القول
علیھم اخرجنا لھم دآبة من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بآیاتنا لا یوقنون)۔
" وقع القول علیھم " سے مراد یا تو خدا کا فرمان اور وہ عذاب ہے جس کا ان لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے یا
پھر قیامت کا قیام اور اس کی علامتوں کا ظہور ہے ایسی علامات جن کو دیکھ کر ہر شخص سر تسلیم خم کرلے گا اور اسے یقین آجائے گا
کہ خدائی وعدے برحق تھے اور قیامت بالکل قریب ہے تو اس وقت توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے کیونکہ ان حالات میں
ایمان لانا ایک اضطراری عمل ہوگا۔
البتہ یہ دونوں معانی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں کیونکہ قرب قیامت اور گنہ گاروں پر عذاب دونوں اکٹھے ہوں گے۔
یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ " دآبة الارض " کیا ہے اور کون ہے ؟ اس کا کیا کام ہوگا ؟ قرآن نے اسے
مجمل صورت میں ذکر کیا ہے اور گویا اجمال کی صورت میں ہی اس سے گزرنا چاہتا ہے بعض اوقات بعض باتیں اس وقت موثر ہوتی
ہیں جب کسی ہولناک بات کو درپردہ بیان کیا جائے۔
قرآن صرف یہ کہتا ہے کہ وہ ایک متحرک اور چلنے والا ہے۔ خداوند عالم اسے قیامت کے قریب زمین سے ظاہر کر دے گا
وہ لوگوں سے باتیں کرے گا اور کہے گا کہ لوگ آیات خدا پر ایمان نہیں لاتے۔
دوسرے لفظوں میں اس کا کام مختلف لوگوں میں ایسی تمیز کرنا ہے کہ منکر اور منافق لوگ خالص مومنین سے الگ
ہو جائیں۔
ظاہر ہے کہ منکر لوگ یہ کیفیت دیکھ کر ٹھٹک جائیں گے اور اپنے تاریک ماضی پر پشیمان ہوں گے لیکن کیا فائدہ ، جب
توبہ کے دروازے ہی بند ہو چکے ہوں گے۔
" دآبة الارض " کی تفصیلات ، صفات اور خصوصیات کے بارے میں متعدد روایات موجود ہیں شیعہ اور سُنی حضرات
کی تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں بہت کچھ بیان ہوا ہے اس پر ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔
پھر قیامت کی ایک اور علامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اس دن کا سوچو کہ جب ہم ہر اُمت میں سے
ان لوگوں کے گروہ محشور کریں گے جو ہماری نشانیوں کو جھٹلایا کرتے تھے اور انھیں روکے رکھیں گے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل
جائیں (ویوم نحشر من کل امة فوجا ممن یکذب بآیاتنا فھم یوزعون)۔
" حشر " کا معنی کسی گروہ کو اس کے اپنے ٹھکانے سے نکال کر میدان (جنگ) وغیرہ کی طرف حرکت دینا ہے۔
جیسا کہ راغب نے " مفردات " میں بتایا ہے " فوج " کا معنی ہے ایسا گروہ جو جلدی جلدی چلتا ہے۔
" یوزعون " کا معنی ہے افراد کی بہت بڑی تعداد کو روکے رکھنا تاکہ دوسرے تمام گروہ بھی ان سے آملیں۔
یہ لفظ عموماً افراد کی بہت بڑی اور کثیر تعداد کے لیے بولا جاتا ہے جیسا کہ اسی سورت میں ہم حضرت سلیمانؑ کے لشکر کے
بارے میں پڑھ چکے ہیں۔

بنابریں مجموعی طور پر آیت سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ خداوندِ عالم ہر قوم سے ایک ایک گروہ کو محشور کرے گا اور انھیں اپنے کیے کی سزا کے لیے حاضر کرے گا۔

بعض بزرگ مفسرین اس آیت کو مسئلہ رجعت اور قیامت سے نزدیک نیک اور بد لوگوں کے گروہوں کو اسی دنیا میں پھر لوٹ آنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ اگر اس سے قیامت کی طرف اشارہ ہو تو پھر " من کل امة فوجًا " (ہر قوم سے ایک گروہ) کی تعبیر صحیح نہیں ہو گی وہ اس لیے کہ قیامت میں تو سب کے سب لوگ جی اٹھیں گے جیسا کہ خود قرآن مجید سورۂ کہف کی آیت ۴۷ میں کہتا ہے:

وحشرناهم فلم نغادر منهم احدًا

ہم ان سب کو محشور کریں گے اور کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

اس کا ایک اور شاہد اسی آیت سے پہلے والی آیت ہے جس میں اس دنیا کے خاتمے پر قیامت کی نشانیاں بتائی گئی ہیں اور بعد کی آیات میں بھی اسی موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بنابریں یہ بات معلوم بعید ہوتی ہے کہ قبل اور بعد والی آیت تو قیامت سے پہلے واقع ہونے والی چیزوں کے بارے میں گفتگو کریں اور درمیانی آیت خود قیامت کے بارے میں۔ آیات کی ہم آہنگی اس بات کی متقاضی ہے کہ تمام آیات قبل از قیامت کے بارے میں ہوں۔

اس سلسلے میں بہت سی روایات بھی موجود ہیں جنھیں ہم نکات کی گفتگو میں " رجعت " کی تفسیر کے ضمن میں بیان کریں گے۔

البتہ مفسرین اہلسنت عام طور پر اس آیت کو قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور لفظ " فوج " کو ہر گروہ اور قوم کے سرداروں کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں، اس بارے میں آیات کی عدم موافقت اور ناہم آہنگی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ تاخیر اور تقدیم کے حکم میں ہیں گویا آیت ۸۳ آیت ۸۵ کے بعد قرار پاتی ہے۔

لیکن معلوم ہے کہ ایک تو لفظ فوج کی تفسیر اس معنی میں خلافِ ظاہر ہے اور دوسرے آیات کی تاخیر اور تقدیم کے ساتھ بھی یہ تفسیر خلافِ ظاہر ہے۔

انجامِ کار اس گروہ کو احتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے گا اور اللہ ان سے کہے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلایا، جبکہ اس سے تم آگاہ بھی نہیں تھے اور تم نے تحقیق سے بھی کام نہیں لیا" (حتّٰی اذا جاءو قال اکذبتم بأیاتی ولم تحیطوا بها علمًا)۔

"اور تم کیا کام کیا کرتے تھے؟" (اما ذا کنتم تعملون)[1]۔

---

[1] " اما ذا کنتم تعملون " جملہ استفہامیہ ہے اور " اما " مرکب ہے " ام " اور " ما " سے جبکہ " ام " حرفِ عطف ہے اور عموماً ہمزہ استفہام کے بعد دو چیزوں کی برابری کے لیے آتا ہے اور " ما " استفہامیہ ہے اور اس کا مجموعی طور پر یہ معنی بنے گا " او ای شیء کنتم تعملونه "۔

یہ بات کہنے والا خداوند عالم ہے اور آیات سے مراد انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا فرامین الٰہی ہیں یا یہ سب۔

" ولم تحیطوا بها علمًا " سے مراد یہ ہے کہ تم کسی قسم کی تحقیق کیے بغیر اور حقیقتِ امر سے آگاہی حاصل کیے بغیر جھٹلانے لگ گئے تھے اور جہالت اور نادانی کی یہ انتہا ہے کہ انسان کسی قسم کی تحقیق کیے بغیر اور معلومات حاصل کیے بغیر کسی چیز کو جھٹلانے لگ جائے۔

درحقیقت ان سے ایک سوال تو یہ ہو گا کہ بلا تحقیق اور معلومات حاصل کیے بغیر حقائق کو کیوں جھٹلایا؟ اور دوسرا سوال ان کے دیگر اعمال کے بارے میں ہو گا۔

اگر مندرجہ بالا آیت روزِ قیامت اور معاد کے بارے میں ہو تو اس کا مفہوم واضح ہے لیکن اگر مسئلہ رجعت کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ آیات کی ہم آہنگی کا تقاضا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو گا کہ اس دنیا میں کچھ بدکار لوگوں کی رجعت کے وقت خدا کا نمائندہ اور ولیٔ امر ان سے بازپرس کرے گا پھر اسے ان کے کیے کی دنیاوی سزا دے گا اور اس سزا کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں آخرت کا عذاب نہیں ہو گا۔ جیسا کہ بہت سے مجرم لوگوں پر اس دنیا میں شرعی حدود جاری کی جاتی ہیں لیکن توبہ کرنے کی صورت میں انھیں آخرت میں بھی سزا ضرور ملے گی۔

ظاہر ہے کہ ان مجرمین کے پاس ان دو سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہو گا لہٰذا زیرِ تفسیر آیات کے سلسلے کی آخری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ان کے بارے میں عذابِ الٰہی کا حکم جاری ہو گا اور ان کے پاس کرنے کی کوئی بات نہیں ہو گی (ووقع القول علیهم بما ظلموا فهم لا ینطقون)۔

اگر اس آیت کو رجعت کے معنی میں لیں تو یہ عذاب، دنیاوی عذاب ہو گا اور اگر آیت کو قیامت کے معنی میں لیں تو یہ عذاب آخرت کا عذاب ہو گا۔

چند ایک نکات

۱۔ " دابة الارض " سے کیا مراد ہے؟ " دابة " بمعنی " چلنے والا " اور " ارض " کا معنی ہے " زمین "، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا اطلاق صرف غیر انسان پر ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ انسان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ سورہ ہود کی چھٹی آیت میں ہے:

وما من دابة فی الارض الا علی الله رزقها

زمین میں کوئی بھی چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔

نیز سورۂ نحل کی آیت ۶۱ میں ہے:

ولو یؤاخذ الله الناس بظلمهم ما ترك علیها من دابة

اگر خدا لوگوں سے ان کے ظلم کا مواخذہ کرنے لگ جائے تو روئے زمین پر ایک بھی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑے۔

سورۂ انفال کی آیت ۲۲ میں ہے:

ان شر الدوآب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون

اللہ کے نزدیک چلنے پھرنے والوں میں سے بدترین وہ گونگے اور بہرے افراد ہیں جو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔

لیکن اس کلمے کی تطبیق کے سلسلے میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک اجمالی بات کی ہے صرف ایک صفت بیان کی ہے کہ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اور بے ایمان افراد کو اجمالاً مشخص کرے گا لیکن اس بارے میں روایات میں اور مفسّرین کی گفتگو میں بہت بحث کی گئی ہے جس کا ان دو نکات میں خلاصہ پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ بعض نے اسے ایک ایسی جاندار مخلوق سمجھا ہے جو عجیب و غریب ہوگی اور انسانوں میں سے بھی نہیں ہوگی اس کے لیے انھوں نے کئی عجیب و غریب باتیں نقل کی ہیں جو خارقِ عادت ہیں اور انبیاء کے معجزات سے مشابہت رکھتی ہیں۔

۲۔ بعض دیگر نے اس سلسلے میں وارد ہونے والی بہت سی روایات کی روشنی میں اس سے مراد ایک انسان لیا ہے۔ ایک غیر معمولی انسان، ایک متحرک اور فعّال انسان، جس کا ایک اصلی کام ہی مومنین کی صفوں سے منافقین کو جدا کرنا اور ان کی نشاندہی کرنا ہوگا بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی بھی اس کے پاس ہوگی۔ ہم جانتے ہیں کہ عصائے موسیٰ قدرت اور اعجاز کی علامت ہے اور سلیمانؑ کی انگشتری خدائی حکومت اور تسلّط کی نشانی ہے گویا وہ ایک طاقتور اور حقائق واضح کرنے والا انسان ہوگا۔

حذیفہ یمانی سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے "دابۃ الارض" کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے:

لا یدرکھا طالب ولا یفوتھا ھارب فتسم المؤمن بین عینیہ، ویکتب بین عینیہ مؤمن. وتسم الکافر بین عینیہ وتکتب بین عینیہ کافر، ومعھا عصا موسی وخاتم سلیمان

وہ اس قدر طاقتور ہوگا کہ کوئی شخص اسے نہیں پا سکے گا اور کوئی شخص اس سے بچ کر نہیں جا سکے گا وہ مومن کی پیشانی پر نشان لگائے گا تو "مومن" لکھا جائے گا اور کافر کی پیشانی کو داغے گا تو "کافر" لکھا جائے گا، اس کے پاس عصائے موسیٰ اور سلیمان کی انگشتری بھی ہوگی [1]

متعدد روایات میں یہ علامات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پر صادق آتی ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

ایک شخص نے عمار یاسر سے کہا کہ قرآن مجید میں ایک ایسی آیت ہے جس نے پریشان فکر کر رکھا ہے اور مجھے شک میں ڈال دیا ہے۔ عمار نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟ اس نے کہا کہ یہ آیت:

[1] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بآیاتنا لا یوقنون۔ آپ بتائیں کہ یہ "دابۃ الارض" کیا چیز ہے؟

عمار نے کہا: خدا کی قسم! جب تک میں تمھیں وہ "دابۃ الارض" نہ دکھا دوں، زمین پر نہ بیٹھوں گا نہ کھانا کھاؤں گا اور نہ ہی پانی پیوں گا۔

یہ کہہ کر وہ اسے حضرت علی کی خدمت میں لے آئے۔ آپ اس وقت کھانا کھا رہے تھے، جب امام علیہ السلام کی نگاہ عمار پر پڑی تو آپ نے فرمایا: ادھر آؤ، عمار امام کی خدمت میں پہنچے اور بیٹھ کر ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔

وہ شخص بہت حیران ہوا اور اس منظر کو بہت غور سے دیکھنے لگا، کیونکہ عمار نے اس سے قسم کھا کر کہا تھا کہ جب تک اپنا وعدہ پورا نہیں کر لے گا اس وقت تک وہ کھانا نہیں کھائے گا اس نے خیال کیا کہ شاید عمار نے اپنی قسم فراموش کر دی ہے۔

جب عمار اٹھے اور حضرت امیرؑ سے خدا حافظی کی تو اس شخص نے عمار سے مخاطب ہو کر کہا: حیرت ہے آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ جب تک آپ مجھے "دابۃ الارض" نہیں دکھا پائیں گے اس وقت تک آپ کھانا کھائیں گے نہ پانی پئیں گے اور نہ ہی زمین پر بیٹھیں گے، آپ نے یہ کیا کیا؟

عمار نے کہا:

ان یتکھا ان کنت تعقل

اگر تمھیں سمجھ ہوتی تو میں اسے تمھیں دکھا چکا ہوں اور وہ تم دیکھ چکے ہو [1]

اسی طرح کی ایک اور روایت جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی تفسیر عیاشی میں نقل ہوئی ہے [2]

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار الانوار میں معتبر سند کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث اس قسم کی نقل کی ہے کہ:

علی مسجد میں سوئے ہوئے تھے کہ پیغمبر خداؐ وہاں تشریف لائے علی کو بیدار کر کے فرمایا:

قم یا دابۃ اللہ

اے دابۃ اللہ اٹھو۔

رسول اللہؐ کے ساتھیوں میں سے کسی نے عرض کی: یا رسول اللہ کیا ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ایک دوسرے کو اس نام سے پکاریں تو آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: نہ یہ علی کا خاص نام ہے

[1]، [2] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

اور یہ وہی " دابۃ الارض " ہے جس کے متعلق قرآنِ مجید میں آیا ہے : " و اذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض..... "

پھر آپ نے فرمایا : علی ! آخری زمانے میں خداوندِ عالم تمھیں بہترین صورت میں زندہ کرے گا اور تمھارے ہاتھ میں ایک ایسی چیز عطا فرمائے گا جس سے تم دشمنوں پر نشان لگاؤ گے [1]

مرحوم ابوالفتوح رازی اپنی تفسیر میں مندرجہ بالا آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں :

ان روایات کی رُو سے جو ہمارے علماء کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں " دابۃ الارض " حضرت امام مہدی علیہ السلام کے لیے کنایہ ہے [2]

اس حدیث کو اور مندرجہ بالا دوسری احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ " دآبۃ الارض " کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر اس عظیم پیشوا پر صادق آتا ہے جو آخری زمانے میں قیام فرمائے گا اور ایک عظیم تحرک کرے گا اور حق و باطل اور مومن و کافر کو ایک دوسرے سے جُدا کرے گا۔

یہ جو روایات میں مذکور ہوا ہے کہ اس کے پاس موسیٰ کا عصا اور سلیمان کی انگشتری ہو گی اور یہ دونوں چیزیں قوت و طاقت فتح و کامرانی اور حکومت کی علامت ہیں ، اس پر دلالت کرتی ہے " دابۃ الارض " سے مراد ایک نہایت ہی فعال انسان ہے نہ کہ کوئی حیوان ۔

اور یہ چیز جو روایات میں بیان ہوئی ہے کہ وہ مومن اور کافر کو نشان لگا کر انھیں ایک دوسرے سے جُدا کرے گا یہ بھی کسی انسان سے متعلق ہو سکتی ہے ۔

قرآن کی آیت کے مطابق اس کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا ۔ یہ بات بھی اسی معنی سے مطابقت رکھتی ہے ۔

مندرجہ بالا تمام گفتگو کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف تو لفظ " دابۃ " کا استعمال بیشتر انسان کے علاوہ پر استعمال ہوتا ہے (ہر چند کہ قرآن میں اس کا استعمال انسان اور غیر انسان یا صرف انسان کے لیے بھی ہوا ہے) دوسری طرف خود آیت میں متعدد قرینے پائے جاتے ہیں اور اس آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی بہت سی روایات بھی بتلاتی ہیں کہ اس آیت میں " دابۃ الارض " سے مراد آیت میں مذکور خصوصیات کا حامل نہایت ہی فعال انسان ہے جو حق کو باطل سے اور مومنین کو منافقین و کفار کی صفوں سے جُدا کرے گا۔ وہ ایسا انسان ہے جو قیامت سے پہلے پہلے ظاہر ہو گا اور وہ خود بھی عظمتِ پروردگار کی آیات میں سے ایک آیت ہو گا ۔

۲۔ **" رجعت " کتاب و سنت کی روشنی میں :** ۔ مندرجہ بالا آیات میں جو مسائل غور طلب اور قابلِ تشریح ہیں

[1] بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۵۲ ۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۸ ص ۴۲۲ ۔

ان میں سے ایک مسئلہ رجعت بھی ہے ۔

" رجعت " مذہب شیعہ کے مشہور عقائد میں سے ہے جس کی تفسیر ایک مختصر سے جملہ میں یوں کی گئی ہے :

حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بعد اور قیامت کے نزدیک کچھ " خالص مومنین " اور کچھ " نہایت ہی شریر باغی اور کافر لوگ " اس دنیا میں واپس لائے جائیں گے پہلا گروہ کمال کے مدارج طے کرے گا اور دوسرے گروہ کو سخت سزا ملے گی ۔

مرحوم سید مرتضیٰ جن کا شمار مذہب شیعہ کے اکابر علماء میں ہوتا ہے ، اس سلسلے میں یوں فرماتے ہیں :

خداوند متعال امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بعد کچھ ایسے لوگوں کو اس دنیا میں واپس بھیجے گا ، جو قبل ازاں وفات پا چکے ہوں گے تاکہ وہ امام کی نصرت کا اعزاز اور ثواب حاصل کر سکیں اور ساری دنیا پر حق کی حکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں ، اسی طرح وہ سخت دشمنوں کو بھی زندہ کرے گا تاکہ ان سے انتقام لیا جائے ۔

آگے چل کر فرماتے ہیں :

اس عقیدے کی درستی کی دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی عقل مند اس بارے میں قدرتِ خدا کا انکار نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ یہ بات محال نہیں ہے جبکہ ہمارے کچھ مخالف حضرات اس امر کا انکار کرتے ہیں گویا وہ اسے محال اور ناممکن سمجھتے ہیں ۔

پھر فرماتے ہیں :

اس عقیدے کے ثبوت کی دلیل مذہب امامیہ کا اس پر اجماع ہے کیونکہ اس مذہب کے کسی بھی پیروکار نے اس عقیدے کی مخالفت نہیں کی ہے [1]

البتہ بعض قدیم شیعہ علماء مثلاً مرحوم طبرسی کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب کی ایک نہایت ہی قلیل تعداد اس عقیدے کی مخالف تھی ان کے نزدیک رجعت سے مراد اہلِ بیت علیہم السلام کی حکومت اور سلطنت ہے نہ کہ مُردوں کا دوبارہ زندہ ہونا لیکن ان کی مخالفت ایسی ہے جس سے اجماع کو کوئی خدشہ لاحق نہیں ہے ۔

بہرحال اس سلسلے میں بہت گفتگو کی گئی ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں کچھ باتیں مختصر اور جامع انداز میں حدودِ تفسیر کے اندر رہتے ہوئے بیان کر دیں :

(۱) اس بات میں قطعاً شک نہیں ہے کہ اس دنیا میں بعض مُردوں کا زندہ کیا جانا کوئی محال بات نہیں ہے ، جس طرح قیامت کے دن تمام انسانوں کو زندہ کیا جانا ناممکن نہیں ہے ۔ اس امر پر تعجب کرنا ایسے ہے جیسے زمانہ جاہلیت کے مشرکین مسئلہ معاد پر تعجب کیا کرتے تھے اس مسئلے کا مذاق اڑانا بھی مشرکین کے مسئلہ معاد کے مذاق اڑانے کے مترادف ہے ۔ کیونکہ ایسے کام کو

[1] سفینۃ البحار جلد اوّل ص ۵۱۱ (مادہ رجع) ۔

عقلِ سلیم محال نہیں سمجھتی اور خدا کی قدرت اس قدر وسیع اور حاوی ہے کہ اس قسم کے تمام امور اس کے سامنے آسان اور معمولی ہیں ۔

(۲) قرآنِ مجید میں پانچ مقامات پر گزشتہ امتوں میں رجعت کے وقوع کا اجمالی تذکرہ آیا ہے :

الف :۔ اس پیغمبر کے بارے میں جو ایک گاؤں سے گزر رہے تھے دیکھا کہ بستی کی دیواریں گر چکی ہیں اور بستی میں رہنے والوں کے اجسام اور ہڈیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں ، انھوں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ خداوندِ عالم انھیں مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا ؟ تو خداوند عالم نے انھیں ایک سو سال تک موت دے دی اور پھر زندہ کیا اور پوچھا کہ تم کتنا عرصہ سوئے رہے ہو ؟ تو انھوں نے عرض کیا ، ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ۔ خدا نے فرمایا : نہیں بلکہ پورے ایک سو سال تم پر بیت چکے ہیں ۔

(بقرہ / ۲۵۹)

یہ پیغمبر جنابِ عزیر ہوں یا کوئی اور ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اہم بات یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے انھیں مرنے کے بعد اسی دنیا میں دوبارہ زندہ کیا (فاماته الله مأة عام ثم بعثه) ۔

ب :۔ سورۂ بقرہ ہی کی آیت ۲۴۳ میں کچھ اور لوگوں کا ذکر ہے جو موت کے ڈر سے (بعض مفسرین کے بقول میدانِ جہاد میں شرکت کے خوف سے طاعون کا بہانہ بنا کر) اپنے گھر بار چھوڑ کر باہر چلے گئے ، تو خداوندِ عالم نے موت کا حکم دے دیا ۔ اور انھیں دوبارہ زندہ کیا (فقال لهم الله موتوا ثم احياهم) ۔

اگرچہ بعض مفسرین اس غیر معمولی واقعے کو برداشت نہیں کر سکے لہٰذا انھوں نے اسے مثال شمار کیا ہے لیکن واضح ہے کہ آیت کے ظہور بلکہ صراحت کے مطابق یہ واقعہ رونما ہوا ہے اس کے مقابلے میں اس قسم کی تاویلیں قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں ۔

ج :۔ سورۂ بقرہ کی آیات نمبر ۵۵ اور ۵۶ جو بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں کے مطابق کچھ لوگوں نے خدا کے دیدار کی درخواست کی تو وہ مہلک بجلی کا شکار ہو گئے اور اس دنیا سے چل بسے ، خداوندِ عالم نے انھیں دوبارہ زندہ کیا تاکہ وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں (ثم بعثناكم من بعد موتكم لعلكم تشكرون) ۔

د :۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ذکر میں ہم پڑھتے ہیں :

واذ تخرج الموتٰى باذنى

تم میرے فرمان کے مطابق مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے (مُردوں کے زندہ کرنے والے) اس معجزے کو دنیا کے سامنے پیش کیا بلکہ فعل مضارع (تخرج) کی تعبیر سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسے بار بار دہرایا ۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ بھی رجعت کی ایک قسم ہے ۔

ہ :۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۷۲ میں بنی اسرائیل کے اس مقتول کے قاتل کا سراغ لگانے کا واقعہ ہے کہ جس کے بارے میں تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا ، قرآن کہتا ہے :

حکم ملا کہ ایک گائے کو ذبح کیا جائے جس کی خاص علامتیں ہوں تاکہ اس کے بدن کا ایک ٹکڑا مقتول کو مارا جائے اور وہ اس سے زندہ ہو جائے (اور قاتل کا نام و نشان بتائے جس سے اس جھگڑے کا خاتمہ ہو) (فقلنا اضربوه ببعضها كذلك يحيى الله الموتٰى ويريكم اٰياته لعلكم تعقلون) ۔

ان پانچ مقامات کے علاوہ اور بھی کئی مقامات قرآن میں ملتے ہیں ۔ اسی طرح اصحاب کہف کی داستان بھی رجعت سے ملتی جلتی ہے نیز حضرت ابراہیم کے ان چار پرندوں کا واقعہ بھی رجعت کے حوالے سے قابلِ غور ہے اس واقعے میں ان پرندوں کو ذبح کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا تاکہ ان لوگوں کے بارے میں معاد کے امکان کو واضح کیا جا سکے ۔

بات خواہ کچھ ہو یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص قرآنِ مجید کو ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے بھی مانے اور پھر اس قدر واضح اور روشن آیات کے باوجود رجعت کے امکان کا انکار کر دے ۔ کیا اصولی طور پر " رجعت " کا معنی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے علاوہ کچھ اور ہے ؟

کیا رجعت اس چھوٹی سی دنیا میں قیامت (معاد) کا ایک چھوٹا سا نمونہ نہیں ہے ؟

جو شخص قیامت کو اس وسعت کے ساتھ مانتا ہے وہ مسئلہ رجعت کا اس قدر جلدی انکار کیوں کر دیتا ہے یا اس کا مذاق کیوں اڑاتا ہے ؟ جیسا کہ احمد امین مصری اپنی کتاب " فجر الاسلام " میں کہتا ہے :

اليهودية ظهرت بالتشيع بالقول بالرجعة

رجعت کے عقیدے کی وجہ سے مذہب شیعہ میں یہودیت نمایاں نظر آتی ہے [1]

اب آپ ہی بتائیے کہ احمد امین مصری کی ان باتوں میں اور زمانہ جاہلیت کے عربوں کے جسمانی معاد کے انکار میں کیا فرق رہ جاتا ہے ؟

(۳) اب تک جو کچھ ہم نے بتایا ہے وہ رجعت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں ہے کہ یہ بات قطعاً ناممکن نہیں ہے اور اس بات کی تائید بہت سی روایات سے ہوتی ہے جنھیں بہت سے ثقہ راویوں نے آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے نقل کیا ہے ۔

ان سب روایات کے یہاں پر لکھنے کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ اعداد و شمار درج کر دیں جو علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جمع کیا ہے ، وہ فرماتے ہیں :

یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے اقوال کی صداقت پر تو ایمان

---

[1] " عقائد الامامیہ " از شیخ محمد رضا مظفر ص ۱۷ ۔

رکھتا ہو لیکن رجعت کے بارے میں متواتر حدیث کو قبول نہ کرے اس بارے میں دو سو کے نزدیک
صریح احادیث موجود ہیں جنھیں چالیس سے زیادہ ثقہ راویوں اور علماءِ اعلام نے بچاس سے زیادہ
کتابوں میں درج کیا ہے .... اگر یہ احادیث متواتر نہیں ہیں تو پھر کونسی
حدیث متواتر ہوگی [1]

(۴) **رجعت کا فلسفہ**:۔ عام طور پر اس عقیدے کے بارے میں جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قیام قیامت سے قبل رجعت کے وقوع پذیر ہونے کا کیا فلسفہ ہے ؟

روایاتِ اسلامی کے پیش نظر رجعت سب کے لیے نہیں ہے بلکہ ایسے خاص خاص نیک اور صالح مومنین کے لیے مخصوص ہے جو ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں اسی طرح ان کفار اور سرکش ظالموں کے لیے کہ جو کفر و ظلم کے لحاظ سے نہایت ہی پستی کا شکار تھے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں قسم کے لوگوں کا دنیاوی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ پہلا گروہ کمال وارتقاء کے اعلیٰ ترین مرحلے کو پہنچ جائے اور دوسرا گروہ اس دنیاوی عذاب کا مزہ بھی چکھ لے ۔

بالفاظِ دیگر وہ خالص مومنین جو اپنی زندگی میں کچھ رکاوٹوں کی وجہ سے اعلیٰ ارتقائی مرحلے تک نہیں پہنچ سکے، حکمتِ الٰہی اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ دوبارہ اسی دنیا میں جا کر اپنا ارتقائی سفر طے کریں اور حق و عدالت کی عالمی حکومت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس حکومت کی تشکیل میں حصہ لیں کیونکہ ایسی حکومت کی تشکیل بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے ۔

اس کے برعکس بڑے منافق اور ظالم لوگ بھی قیامت کے دن اپنی مخصوص سزا کے علاوہ اس دنیا میں بھی اپنی سزا پالیں اور اپنے کیے کا مزہ چکھ لیں جس طرح سابقہ امتوں کے سرکش افراد نے اس دنیا میں بھی سزا پائی تھی ۔ جیسے فرعون اور اس کے ماننے والے، عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ اسی دنیا میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے اور اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے " رجعت "۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں :

ان الرجعة ليست بعامة ، وهی خاصة ، لا يرجع الامن محض الايمان
محضًا ، او محض الشرك محضًا

رجعت عمومی نہیں بلکہ خصوصی ہے جس میں صرف اور صرف وہی لوگ واپس لوٹیں گے جو خالص
مومن یا خالص مشرک ہوں گے [2]

ممکن ہے کہ سورہ انبیاء آیت ۹۵ بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہی ہو جس میں کہا گیا ہے :

" وحرام علی قرية اهلكناها انهم لا يرجعون "

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۳ ص ۱۲۲ ۔

[2] بحار الانوار جلد ۵۳ ص ۳۹ ۔

یعنی جس شہر و دیار والوں کو ہم نے (ان کے گناہوں کی وجہ سے) تباہ و برباد کر دیا تھا ان پر
حرام ہے کہ وہ واپس لوٹ آئیں ۔

کیونکہ یہ واپس نہ لوٹنے کا فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اس دنیا میں اپنی سخت ترین سزا پا چکے ہیں لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ایسی سزائیں نہیں ملی ہیں وہی واپس لوٹیں گے اور سزا پائیں گے (غور کیجیے گا)۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ایسے لوگوں کا تاریخ بشریت کے ایک اہم موڑ پر اس دنیا میں واپس آنا ممکن ہے کہ دو عظیم درس ہوں اور عظمتِ الٰہی اور قیامت کے بارے میں دو اہم ترین نشانیاں ہوں ۔ تاکہ اسے دیکھ کر یہ لوگ اپنے معنوی ارتقاء اور کمالِ ایمان کی آخری حدوں تک پہنچ جائیں اور کسی قسم کی کوئی کمی نہ پائی جائے ۔

۴۔ **رجعت اور ارادے کی آزادی**:۔ بعض لوگوں کے گمان کے مطابق رجعت کا عقیدہ انسان کی آزادیٔ ارادہ اور اختیار کے منافی ہے ۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ یہ محض ایک غلط فہمی ہے کیونکہ ان کا اس دنیا میں لوٹ آنا عام حالات کے تحت ہوگا جن میں وہ مکمل طور پر آزاد اور صاحبِ اختیار ہوں گے ۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ظالم اور کافر لوگ اس دنیا میں واپس آکر توبہ کر لیں گے اور راہِ حق اختیار کر لیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے لوگ ظلم و جور میں اس حد تک غرق ہو چکے ہوں گے کہ یہ امور ان کے وجود میں رچ بس چکے ہوں گے اور ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکے ہوں گے جن سے جدا ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ۔

جیسا کہ خداوند عالم ان اہلِ دوزخ کے جواب میں فرماتا ہے جو بروز قیامت درخواست کریں گے کہ انھیں دنیا میں لوٹ جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ وہاں اپنی غلط کاریوں کا ازالہ کر سکیں :

ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه

اگر وہ واپس آ بھی جائیں تو وہی کچھ کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا۔ (انعام / ۲۸)

نیز بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ رجعت کا مفہوم سورہ مومنون کی آیت ..۔ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ مشرک لوگ دنیا میں واپس لوٹ آنے کی درخواست کریں گے تاکہ وہ نیک اعمال بجا لائیں اور کہیں گے :

رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فيما تركت

پروردگارا! ہمیں لوٹا دے تاکہ جو نیک کام ہم سے رہ گئے ہیں ہم انھیں انجام دے سکیں ۔

تو انھیں منفی جواب ملے گا اور کہا جائے گا :

كلا انها كلمة هو قائلها

یہ سب ان کی باتیں ہیں اور کچھ نہیں ۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے اور رجعت کا مفہوم خاص ہے (خوب غور کیجیے گا)۔

۵۔ **عقیدہ رجعت اسلام کی بنیادی شرائط میں سے نہیں**:۔ اس سلسلے کی آخری بات کے طور پر عرض کرتے

جلیں۔ اگرچہ شیعوں نے اپنا یہ عقیدہ مکتب اہلِ بیت اور آئمہ اطہار سے لیا ہے لیکن وہ رجعت کے منکرین کو کافر نہیں سمجھتے کیونکہ رجعت شیعہ ہونے کے لحاظ سے ضروری ہے لیکن مسلمان ہونے کی ضروری شرائط میں سے نہیں ہے۔ بنابریں اس عقیدے کی وجہ سے مسلمانوں کا اسلامی رشتہ اخوت آپس میں نہیں ٹوٹتا۔ البتہ شیعہ حضرات منطقی طریقے سے اپنے اس عقیدہ کا دفاع ضرور کرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بعض اوقات مسئلہ رجعت کے ساتھ بعض ایسی خرافاتی باتیں ملا دی جاتی ہیں جن سے بعض لوگوں کے سامنے اس کا صحیح چہرہ پیش نہیں ہوتا لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی بنیاد صحیح احادیث پر رکھی جائے اور مشکوک و مخدوش احادیث سے پرہیز کیا جائے۔

ہم نے یہاں پر رجعت سے متعلق مباحث کا ایک خلاصہ پیش کیا ہے مزید تفصیلات اور معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جو اس سلسلے میں تحریر کی گئی ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر ان **حملوں** کا بخوبی جواب دیا جا سکتا ہے جو بعض ناآگاہ اہلسنت مفسرین نے مذہب شیعہ پر کیے ہیں (جیسا کہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں انھی آیات کے ذیل میں کیا ہے) کیونکہ ایسے معترضین نے حقیقتِ حال کو سمجھے بغیر ہی اسے افسانہ بنا دیا ہے۔

۸۶۔ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّیْلَ لِیَسْکُنُوْا فِیْہِ وَالنَّہَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝
۸۷۔ وَیَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا
مَنْ شَآءَ اللّٰہُ ؕ وَکُلٌّ اَتَوْہُ دٰخِرِیْنَ ۝
۸۸۔ وَتَرَی الْجِبَالَ تَحْسَبُہَا جَامِدَۃً وَّہِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ
اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ ؕ اِنَّہٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۸۶۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات اس لیے بنائی ہے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشنی دینے والا بنایا ہے ان امور میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان لانے کو تیار ہیں۔

۸۷۔ اس دن کا سوچو جب صور پھونکا جائے گا اور تمام لوگ جو کہ آسمانوں میں ہیں یا زمین میں، سب کے سب وحشت زدہ ہو جائیں گے سوائے ان لوگوں کے جنھیں خدا بچانا چاہے گا اور سب لوگ خضوع و خشوع کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

۸۸۔ تم پہاڑوں کو دیکھو تو سمجھتے ہو کہ ساکن و جامد ہیں حالانکہ وہ بادل کی مانند چل رہے ہیں یہ خداوندِ عالم کی صناعت اور تخلیق ہے جس نے ہر چیز کو پختہ بنایا ہے وہ تمھارے ان کاموں سے بھی باخبر ہے جنھیں تم انجام دیتے ہو۔

تفسیر

زمین کی حرکت ـــــ قرآن کا ایک سائنسی معجزہ

قرآن مجید ایک بار پھر ان آیات میں، مبداء و معاد اور کائنات میں خداوندِ عالم کی قدرت و عظمت کی نشانیوں اور اسی طرح حوادثِ قیامت کو بیان کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو ان کے آرام کے لیے

بنایا ہے (الم یروا انا جعلنا اللیل لیسکنوا فیہ)۔

اور دن کو روشنی عطا کرنے والا (و النہار مبصرًا)۔

ان امور میں خدا کی قدرت و حکمت کی روشن نشانیاں اور دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیات لقوم یؤمنون)۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید رات اور دن کے حیات بخش آثار اور نور و ظلمت کے نظام کے بارے میں گفتگو کر رہا ہو اور نہ ہی اس سلسلے کی یہ آخری گفتگو ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید تعلیم و تربیت اور انسان سازی کی کتاب ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے اصول کبھی اس امر کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ایک ہی موضوع کو مختلف حوالوں کے ساتھ مختلف مواقع پر پیش کیا جائے اور اسے بار بار دہرایا جائے تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

تاریکی شب کی وجہ سے حاصل ہونے والا سکون ایک ناقابلِ تردید علمی حقیقت ہے۔ رات کے تاریک پردے دن کی سرگرمیوں کو جبری طور پر روکنے کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ انسان اور دوسرے جانداروں کے اعصاب پر بھی ان کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ آرام کرتے اور گہری نیند کے مزے لیتے ہیں (اس بات کو قرآن مجید نے "سکونت" سے تعبیر کیا ہے)۔

اسی طرح دن کی روشنی کا حرکت اور دوڑ دھوپ سے تعلق بھی سائنسی نقطہ نظر سے ناقابلِ تردید ہے۔ آفتاب کا نور صرف مناظرِ زندگی ہی کو منور اور آنکھ کو فعال نہیں کرتا، بلکہ وجودِ انسانی کے تمام ذرات کو بھی بیدار اور فعال بنا دیتا ہے۔

یہ آیت "توحید ربوبی" کے ایک گوشے کو بیان کر رہی ہے اور چونکہ معبودِ حقیقی، عالم ہستی کا رب اور منتظم و مدبر ہی ہے لہذا قرآن اس سے دوسرے تمام بتوں اور بناوٹی معبودوں پر خطِ تنسیخ کھینچ کر مشرکین کو اپنے عقائد پر نظرِ ثانی کی دعوت دے رہا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو اس نظام سے ہم آہنگ کرے۔ رات کو آرام کرے اور دن کو اپنی دوڑ دھوپ میں لگ جائے۔ تاکہ ہمیشہ صحیح و سالم رہے۔ ان ہوس کے بندوں کی مانند نہیں جو راتوں کو تو جاگتے رہتے ہیں لیکن دن کو دوپہر تک سوئے رہتے ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ "مبصر" کا لفظ جو دراصل "بینا" (یعنی دیکھنے والا) کے معنی میں ہے یہ دن کی صفت کے طور پر بیان ہو رہا ہے جبکہ یہ دن کے وقت انسانوں کی صفت ہونا چاہیے یہ ایک طرح کی عمدہ تاکید ہے جس طرح بعض اوقات "سو جانا" رات کی صفت کے طور پر آتا ہے اور کہتے ہیں "لیل نائم" (سو جانے والی رات)۔

روز و شب کے فوائد میں آیت میں دو مختلف تعبیریں بیان کی گئی ہیں ایک جگہ "لتسکنوا فیہ" فرمایا گیا ہے اور دوسری جگہ "مبصرًا" اور ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ رات کا اصل مقصد تو سکون اور آرام ہے لیکن دن کی روشنی کا اصل مقصد صرف دیکھتے رہنا نہیں بلکہ دیکھنا تو زندگی کی نعمتوں تک پہنچنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ (غور کیجیے گا)

بہرحال یہ آیت اگرچہ براہِ راست توحید اور کائنات کے نظام کو چلانے کی بات کر رہی ہے لیکن معاد کے مسئلے کی طرف

بھی ایک لطیف سا اشارہ کر رہی ہے کیونکہ نیند موت کی مانند ہے اور بیداری مرنے کے بعد جی اٹھنے کی مانند۔

بعد والی آیت معاد اور اس کے مقدمات کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: اس دن کا سوچیے کہ جب صور پھونکا جائے گا اور ہر کوئی خواہ وہ آسمانوں میں ہے یا زمین میں وحشت زدہ ہو جائے گا سوائے ان لوگوں کے جنھیں خدا بچانا چاہے گا اور سب لوگ خضوع و خشوع کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے (و یوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السماوات و من فی الارض الا من شاء اللہ و کل اتوہ داخرین)۔

قرآن مجید کی آیات کے مجموعی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دو یا تین مرتبہ صور پھونکا جائے گا ایک تو اس وقت جب دنیا ختم ہونے کے قریب اور قیامت کے دہانے پر پہنچ جائے گی اس وقت تمام لوگ گھبرا جائیں گے۔

دوسری بار تمام دنیا اس کے سنتے ہی مر جائے گی ممکن ہے کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے ہوں۔

تیسری بار دوبارہ جی اٹھنے اور قیامت کے قائم ہونے کے وقت کیوں کہ صور پھونکے جاتے ہی تمام مردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

اس آیت میں پہلی اور دوسری مرتبہ صور پھونکنے کی طرف اشارہ ہے یا تیسری مرتبہ کی طرف؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے خود اسی آیت میں اور بعد والی آیات میں ایسے قرینے موجود ہیں جو دونوں نظریات کی تائید کرتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس سے مذکورہ تمام صور پھونکنا مراد لیا ہے۔

اگر آیت کے ظاہری معنی کو دیکھا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی مرتبہ پھونکے جانے کی طرف اشارہ ہے جو کہ دنیا کے اختتام کے نزدیک ہوگا کیونکہ "فزع" کا معنی ایسا خوف اور وحشت ہے جو انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دے اور اسے پہلی مرتبہ کی پھونک کے آثار میں سے شمار کیا گیا ہے کیونکہ قیامت کی پھونک سے جو خوف و وحشت طاری ہوگی وہ اعمال کی وجہ سے ہوگی نہ کہ پھونک کے اثر سے۔

بالفاظ دیگر "ففزع" میں "فاء تفریع" ظاہراً اس لیے ہے کہ یہ "فزع" یعنی خوف و وحشت صور پھونکے جانے کی وجہ سے ہوگی اور یہ "فزع" پہلی پھونک کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ آخری پھونک تو صرف دہلا دینے والی ہی نہیں ہوگی بلکہ زندگی اور تحرک کا سبب بھی ہوگی اگر وحشت ہوگی بھی تو انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوگی۔

اب ہم "نفخ صور" کے مفہوم کی طرف آتے ہیں۔ "نفخ" کے معنی پھونکنے کے ہیں اور "صور" کا معنی "قرنا" ہے۔ یہاں پر اس تعبیر سے کیا مراد ہے؟ تو اس بارے میں کرنے کی بہت سی باتیں ہیں جنھیں ہم انشاءاللہ تعالیٰ سورۂ زمر کی ۶۸ ویں آیت کے ضمن میں بیان کریں گے۔

اسی آیت میں ایک جملہ ہے "الا من شاء اللہ" کہ جس میں اس عمومی خوف و وحشت سے کچھ افراد کے لیے استثناء کا تذکرہ ہے جو نیک اور پاک افراد کی طرف اشارہ ہے خواہ وہ فرشتے ہوں یا وہ مومن جو آسمانوں اور زمین میں رہتے ہیں تو یہ سب افراد ایمان کے زیرِ سایہ ایک خاص اطمینان و سکون سے بہرہ ور ہوں گے نہ تو انھیں پہلی پھونک سے کوئی گھبراہٹ ہوگی اور نہ ہی آخری پھونک سے کوئی وحشت۔ بعد والی آیت میں بھی ہے کہ جو لوگ نیکی سے بھرے دامن سے بارگاہِ ربّ العزت میں

حاضر ہوں گے وہ اس دن کے ہر طرح کے خوف و وحشت سے امان میں ہوں گے :

من جاء بالحسنة فله خير منها و هم من فزع يومئذ آمنون

" كل اتوه داخرين " یعنی سب کے سب اس کی بارگاہ میں خضوع و خشوع کے ساتھ سر جھکائے پیش ہوں گے یہ جملہ بظاہر عام ہے اور اس میں کسی قسم کا استثناء بھی نہیں ہے حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء بھی اس کی بارگاہِ اقدس میں خاضع اور خاشع ہوں گے اور اگر ہم سورہ صافات کی آیت ۱۲۷، ۱۲۸ میں پڑھتے ہیں کہ :

فانهم لمحضرون الا عباد الله المخلصين

سب لوگ اس کے حضور پیش ہوں گے سوائے خدا کے مخلص بندوں کے ۔

تو اس کا زیر تفسیر آیت کی عمومیت سے کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ زیر تفسیر آیت بروز محشر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت حساب و کتاب اور اعمال کے مواخذے کی جانب اشارہ ہے ۔

بعد والی آیت کائنات میں عظمت الٰہی کی آیات میں سے ایک آیت کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے : تم پہاڑوں کو دیکھو گے تو انھیں ٹھہرا ہوا سمجھو گے جبکہ وہ بادل کی مانند حرکت کر رہے ہیں ۔ (و ترى الجبال تحسبها جامدة و هي تمر مر السحاب)۔

یہ اس اللہ کی صناعی اور تخلیق ہے جس نے ہر چیز کو محکم اور متقن بنایا ہے (صنع الله الذي اتقن كل شيء)[1]

جس کا تخلیقی نظام اس قدر منظم اور حساب شدہ ہے وہ یقیناً تمھارے ان کاموں سے (بھی) باخبر ہے جو تم انجام دیتے ہو (انه خبير بما تفعلون)۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت ، قیامت کے قریب کے حالات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز کے موقع پر زلزلے ، دھماکے اور دوسری عظیم تبدیلیاں رونما ہوں گی پہاڑ ایک دوسرے سے کٹ کٹ کر جدا ہو جائیں گے ۔ یہ نکتہ قرآن مجید کی بہت سی آخری سورتوں میں بھی صریحاً بیان ہوا ہے ۔

اس آیت کا قیامت کے سلسلے کی دو دوسری آیات کے درمیان آنا اسی تفسیر کا شاہد ہے ۔

البتہ بہت سے دوسرے ایسے قرائن بھی ملتے ہیں جو ایک اور تفسیر کی تائید کرتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ آیت اسی دنیا میں خداوندِ عالم کی توحید اور اس کی عظمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور یہ کُرہ زمین کی حرکت کی طرف اشارہ ہے جسے ہم محسوس نہیں کرتے ۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ :

۱۔ آیت مذکورہ کے الفاظ ہیں کہ تم سمجھتے ہو کہ پہاڑ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادل کی طرح حرکت کر رہے ہیں۔ واضح ہے کہ اس قسم کی تعبیر آغاز قیامت کے تغیرات سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ یہ حوادث اس قدر آشکار ہوں گے کہ خود

---

[1] " صنع الله " " انذر " یا " صَنَعَ " جیسے فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے ۔

قرآن کے الفاظ میں " ان کو دیکھ کر مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی اور حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے ۔ اور لوگ سخت وحشت کی وجہ سے حواس کھو بیٹھیں گے حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے ۔ (سورۂ حج / ۲)

۲۔ بادلوں کی حرکت کے ساتھ تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک حالت میں ... ی کے ساتھ اور بغیر کسی شور و غل کے ہے نہ کہ کسی دھماکے کے ساتھ ۔ جبکہ رعد کی ایک معمولی کڑک سے بھی کان گویا پھٹے جاتے ہیں ۔

۳۔ مذکورہ بالا تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہاڑ ظاہراً ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ ... ت وہ تیزی سے حرکت کر رہے ہیں (یعنی ایک چیز کی ایک ہی آن میں دو مختلف حالتوں کو بیان کیا جا رہا ہے)۔

۴۔ اتقان کا معنی ہے منظم اور محکم بنانا ۔ یہ تعبیر بھی اس زمانے سے ہم آہنگ معلوم ... ہے جب یہ نظام برقرار و بحال ہو نہ کہ اس دورانیے سے جبکہ یہ نظام تباہ ہو رہا ہو ۔

۵۔ " انه خبير بما تفعلون " کا جملہ خاص کر " تفعلون " کا کلمہ ... مضارع ہے بتا رہا ہے کہ یہ اسی دنیا سے متعلق ہے کیونکہ قرآن فرماتا ہے جو اعمال بھی تم زمانہ حال یا آئندہ زمانے میں ... ے اس سے وہ اچھی طرح باخبر ہے اور اگر اس کا تعلق اس دنیا کے خاتمے سے ہوتا تو یوں فرماتا " ما فعلتم " جو کام ... انجام دیا ہے اس سے باخبر ہے ۔ (غور کیجیے گا)

ان تمام قرائن سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت تخلیق کائنات کی ایک اور عجیب ... بیان کر رہی ہے جو در حقیقت پہلی دو آیات میں بیان ہونے والے عجائبات کی طرح ہے یعنی " الم يروا انا جعلنا الليل ليسـ... "

پس معلوم ہوا کہ زیر نظر آیات کا کچھ حصہ توحید کے بارے میں ہے اور کچھ معاد کے ... ۔

اس تفسیر سے ہم جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن پہاڑوں کو ہم ساکن تصور کرتے ... بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور یقینی بات ہے کہ پہاڑوں کی حرکت ان سے متصل زمین کی حرکت کے بغیر بے معنی ہے ۔ لہٰذا دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ بنے گا کہ زمین بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہے جیسے بادل حرکت کرتے ہیں ۔

دور حاضر کے سائنس دانوں کے نزدیک زمین ، اپنے محور کے گرد تیس کلومیٹر فی منٹ ... سے گھومتی ہے جبکہ سورج کے گرد اس کی رفتار اس سے بھی زیادہ ہے ۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن نے پہاڑوں ہی کو مرکز گفتگو کیوں قرار ... ، تو شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑوں کا ثقل ، بوجھ اور ٹھہراؤ ضرب المثل ہے اور یہ قدرت الٰہی کی وضاحت اور تشریح ... بہترین نمونہ سمجھے جا سکتے ہیں یعنی جہاں یہ پہاڑ اپنی اس عظمت اور بوجھ کے باوجود حکم خدا سے (زمین سمیت) حرکت کر رہے ... دوسری تمام چیزوں پر اس کی قدرت و طاقت مسلّم ہوگی ۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کے سائنسی معجزوں میں سے ہے کیونکہ جن ... وں نے سب سے پہلے زمین کی حرکت کا انکشاف کیا وہ اٹلی کے گلیلیو اور پولینڈ کے " کوپرنک " تھے ۔ انھوں نے سولہ ... عیسوی کے آخر اور سترھویں صدی کے آغاز میں اس نظریے کا اظہار کیا جس سے انھیں ارباب کلیسا کے زبردست دباؤ ... کرنا پڑا ۔

لیکن قرآن مجید نے توان سے تقریبًا ایک ہزار سال پہلے ہی اس حقیقت سے پردہ اٹھادیا تھا اور مندرجہ بالا صورت میں اسے توحید کی علامتوں سے ایک علامت کے عنوان سے پیش کیا۔

بعض مسلمان فلاسفہ دوسری تفسیر (اسی دنیا میں پہاڑوں کی حرکت) کو قبول کرنے کے باوجود آیت کو چیزوں کی "حرکت جوہری" کے بارے میں سمجھتے ہیں اور اسے مشہور جوہری حرکت کے نظریہ کا مویّد سمجھتے ہیں[1]

حالانکہ آیت کی تعبیرات اس نظریے کے بارے میں نہیں ہیں کیوں کہ پہاڑوں کی حرکت کو بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دینا مکانی حرکت (اَیْن میں حرکت) سے تو مناسبت رکھتی ہے جوہری حرکت سے نہیں۔

بنا بریں ظاہری طور پر آیت صرف ایک ہی تفسیر کو قبول کرتی ہے اور وہ ہے زمین کی (اپنے یا سورج کے گرد) مکینکل حرکت۔

---

[1] حرکت جوہری سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی مادّی اشیاء کی کیفیت، کمیت اور مکان وغیرہ میں مختلف تبدیلیوں کے علاوہ اپنی ذات کے اندر بھی حرکت موجود رہتی ہے یعنی ان کی ذات ایک متحرک وجود ہے اور ان میں ظاہری تبدیلیاں دراصل نتیجہ ہوتی ہیں ان کی مسلسل باطنی تبدیلیوں کا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے دو وجود ہیں جو ذاتی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک ثابت وجود (جو مادی وجود سے ماورا ہوتا ہے) اور دوسرا متحرک وجود (جو مادی وجود کہلاتا ہے) اور اس نظریہ کے ثبوت کی اہم ترین دلیل مادی اشیاء کا ایک زمانے کا حامل ہونا اور اندرونی تبدیلیوں سے بیرونی تبدیلی ہرگز جدا نہیں ہے۔ اس بحث کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

۸۹۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۝

۹۰۔ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

۹۱۔ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

۹۲۔ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝

۹۳۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۸۹۔ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں وہ اس کی جزا اس سے بہتر پائیں گے اور وہی لوگ [illegible] وحشت سے امان میں ہوں گے۔

۹۰۔ اور جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں وہ منہ کے بل جہنم میں ڈالے جائیں گے کیا جو [illegible] انجام دیتے ہو اس کے علاوہ تمھیں جزا ملے گی؟

۹۱۔ (کہہ دو) مجھے حکم دیا جا چکا ہے کہ میں اس (مقدس) شہر (مکہ) کے پروردگار کی [illegible]ت کروں، اسی [illegible] جس نے اس شہر کو حرمت عطا فرمائی ہے اور سب کچھ اسی کا ہے اور مجھے حکم [illegible]ے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں۔

۹۲۔ اور قرآن کی تلاوت کروں پس جو شخص ہدایت پائے وہ اپنے لیے ہدایت پائے [illegible] جو گمراہ ہو جائے [illegible]

اس کا گناہ خود اسی کی گردن پر ہے) کہہ دو: کہ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

۹۳۔ کہہ دو کہ حمد ذاتِ خدا کے لیے مخصوص ہے وہ بہت جلد اپنی نشانیاں تمھیں دکھلائے گا تاکہ تم انھیں پہچان لو اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو تمھارا پروردگار اس سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

رسول اللہؐ کی ذمہ داری

گزشتہ آیات میں بندوں کے اعمال اور خدا کی ان اعمال سے آگاہی کا ذکر تھا، زیرِنظر آیات میں سب سے پہلے نیک اعمال کی جزا اور قیامت کی ہلاکت آفرینیوں سے ان کے محفوظ رہنے کی بات ہو رہی ہے۔

فرمایا گیا ہے: جو لوگ نیک اعمال بجا لائیں گے وہ ان کی جزا ان سے بہتر پائیں گے اور اس دن کی وحشت سے امان میں ہوں گے (من جاء بالحسنة فله خير منها و هم من فزع يومئذ آمنون)۔

"حسنة" سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے مختلف آراء بیان کی ہیں:

کوئی کہتا ہے کہ اس سے مراد کلمہ توحید "لا الٰه الا الله" اور خدا پر ایمان ہے۔

بعض مفسرین اسے امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور اس بارے میں اہلبیت اطہار کے حوالے سے وارد ہونے والی متعدد روایات بھی اسی نظریہ کی تائید کرتی ہیں منجملہ ان کے:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ:

حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں میں سے ایک شخص ابو عبداللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام نے فرمایا: کیا خدا کے اس فرمان "من جاء بالحسنة فله خير منها ....." (آیت کے آخر تک) کے بارے میں تمھیں بتاؤں؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں امیرالمومنین! میں آپ پر قربان جاؤں۔

تو امام نے فرمایا:

الحسنة معرفة الولاية و حبنا اهل البيت والسيئة انكار الولاية و بغضنا اهل البيت

حسنة ہماری ولایت اور ہم اہل بیت کی دوستی کی شناخت کا نام ہے اور "سیئہ" ہم اہلبیت کی ولایت کا انکار اور دشمنی کا نام ہے[1]

---

[1] اصول کافی منقول از تفسیر نورالثقلین جلد ۴ ص ۱۰۴۔

البتہ جیسا کہ ہم پہلے بھی بارہا بتا چکے ہیں کہ آیات کا معنی وسیع ہوتا ہے اور یہاں پر "حسنہ" اور "سیئہ" کا معنی بھی وسیع ہے جو تمام نیکیوں پر محیط ہے جن میں خدا اور رسول اور آئمہ کی ولایت پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے جو تمام نیکیوں کے سرفہرست ہے اور اس بات سے بھی مانع نہیں ہے کہ دیگر اعمالِ صالحہ بھی اس آیت کا مصداق ہیں۔

بعض لوگوں کو لفظ "خیر" کی عمومیت دیکھ کر ایک پریشانی ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ایمانِ خدا سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے جس کی جزا زیادہ ہو تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ خدا کی رضا اور خوشنودی اس پر ایمان سے بھی بالاتر ہے ... یہ سب کچھ خوشنودی رب کا مقدمہ ہیں اور ہر چیز اپنے مقدمہ سے افضل ہوتی ہے۔

ایک اور سوال جو یہاں پر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ (سورۂ حج کی آیت ۲ جیسی) بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے خوف کی لپیٹ میں سب لوگ آجائیں گے تو پھر نیکوکار اس سے کیونکر مستثنیٰ ہوں گے۔

سورہ انبیاء کی آیت ۱۰۳ اس سوال کا جواب دے رہی ہے کہ جس میں ہے:

صالح مومنین اس عظیم وحشت سے امان میں ہوں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ اس عظیم وحشت سے مراد روزِ قیامت اور جہنم کا خوف ہے نہ کہ وہ خوف کہ جو صور پھونکے ... لاحق ہوگا۔ (غور کیجیے گا)

پھر اس گروہ کے مدمقابل گروہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ برے کام کریں گے وہ منہ کے بل جہنم میں ڈالے جائیں گے (و من جاء بالسيئة فكبت وجوههم في النار)۔

اور انھیں اس کے علاوہ کوئی اور توقع رکھنا بھی نہیں چاہیے "کیا تمھارے ان اعمال کی پاداش اس کے ... کچھ اور ہو سکتی ہے؟" (هل تجزون الا ما كنتم تعملون)۔

"کبت" "کب" (بروزن "جد") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو اوندھے منہ ... آیت میں لفظ "وجوہ" کا ذکر تاکید کے لیے ہے۔

ایسے لوگوں کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالنا عذاب کی ایک بدترین قسم ہوگا۔ علاوہ ازیں جب یہ لوگ حق سے ... موڑ لیا کرتے تھے اور اسی منہ کے ساتھ گناہوں کا استقبال کیا کرتے تھے اب انھیں سزا بھی اسی نوعیت کی ملنی چاہیے۔

ممکن ہے کہ "هل تجزون الا ما كنتم تعملون" کا جملہ اس سوال کا جواب ہو جو یہاں پر پیش ... ہے اور ... اگر کوئی شخص کہے "یہ بہت ہی سخت قسم کی سزا ہے" تو اس کے جواب میں کہا جائے گا یہ وہی تمھارے ... جو تمھیں ... چکے ہیں اور تمھاری جزا صرف تمھارے اعمال ہی ہیں۔ (غور کیجیے گا)

... ری تین آیات میں روئے سخن پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہوتا ہے اور آپ سے ... حقائق بیان کیے جاتے ہیں جو دراصل اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ آپ ان سے کہہ دیجیے میں تو اپنے فرائض بجا لاتا رہوں گا خواہ تم ہٹ دھرم مشرکین ایمان لاؤ یا نہ لاؤ۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: "کہہ دو) مجھے حکم دیا جا چکا ہے کہ اس (مقدس) شہر (مکہ) کے پروردگار ... عبادت

کرتا رہوں (انما امرت ان اعبد رب ھٰذہ البلدۃ)۔

یہ ایک ایسا مقدس شہر ہے جس سے تمھارے تمام اعزازات اور آبروئیں وابستہ ہیں ایسا مقدس شہر ہے کہ جس کی برکتیں خدا نے تمھیں عنایت فرمائی ہیں لیکن تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے انکار کرتے ہو۔

ایسا مقدس شہر حرم امن خدا بھی ہے۔ روئے زمین کا معزز ترین نقطہ بھی ہے اور توحید کی قدیم ترین عبادت گاہ بھی۔

جی ہاں مجھے تو حکم ہی یہ ہے کہ "میں اسی پروردگار کی عبادت کروں جس نے اس شہر کو حرمت بخشی ہے۔ (الذی حرمھا)۔

اللہ نے اس شہر کو کچھ خصوصیات عطا فرمائی ہیں، کچھ خوبیاں بخشی ہیں، اس کے لیے کچھ خاص احترام اور احکام مقرر فرمائے ہیں، اس کے لیے کچھ پابندیاں مقرر کی ہیں جو دوسرے شہروں کے لیے نہیں ہیں۔

لیکن تم یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ صرف یہی سرزمین خدا کی ملکیت ہے اور بس! نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے اسی کے لیے ہے (ولہ کل شیء)۔

اور دوسرا حکم جو مجھے دیا گیا ہے یہ ہے کہ "میں مامور ہوں کہ مسلمین میں سے رہوں" پروردگار عالم کے حکم کے سامنے غیر مشروط طور پر سر جھکائے رہوں نہ کہ اس کے غیر کے سامنے (وامرت ان اکون من المسلمین)۔

تو اس طرح سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دو اہم ذمہ داریوں اور فرائض منصبی کو بیان کر دیا۔ ایک تو "خداوند وحدہ لاشریک کی عبادت" اور دوسرے "اس کے حکم کی غیر مشروط طور پر پابندی"۔

پھر ان دو مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ یوں بیان کرتے ہیں "مجھے حکم ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کروں (وان اتلوا القرآن)۔

اس کے چراغ سے روشنی حاصل کروں، اس کے چشمۂ آب حیات سے پانی پیوں اور اپنی زندگی کے تمام پروگراموں میں اس سے راہنمائی حاصل کروں کیوں کہ ان دو مقدس مقاصد تک پہنچنے کے لیے یہ میرا وسیلہ ہے اور یہ ہر قسم کے شرک، کج روی اور گمراہی سے نجات کا ذریعہ ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: تم یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ایمان لانے سے میرا یا اس سے بڑھ کر خداوند عظیم کا کوئی فائدہ ہوگا نہیں نہیں "بلکہ جو ہدایت پا جائے گا وہ اپنے لیے ہدایت پائے گا" (فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ)۔

اور اس ہدایت سے حاصل ہونے والے فوائد خواہ اس دنیا میں ہوں یا آخرت میں تمھارے ہی لیے ہوں گے۔

اور جو شخص گمراہ ہو جائے گا تو اس کا بوجھ اور وبال اس کے اپنے ہی اوپر ہوگا اور تم کہہ دو کہ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں (ومن ضل فقل انما انا من المنذرین)۔

اس کے خطرناک نتائج میرا گریبان نہیں پکڑیں گے۔ میرا کام تو واضح تبلیغ ہے۔ میرا فریضہ یہی ہے کہ میں تمھیں سیدھی راہ کی ہدایت کرتا رہوں لیکن جو شخص اس بات پر مصر ہے کہ گمراہی میں ہی پڑا رہے تو وہ اپنے آپ ہی کو بدبخت کرے گا۔

یہاں پر یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ ہدایت کے بارے میں قرآن فرماتا ہے جو شخص ہدایت پائے گا اس کے اپنے

مفاد میں ہوگا لیکن گمراہی کے بارے میں نہیں فرمایا کہ جو گمراہ ہوگا اس کا اپنا نقصان ہوگا بلکہ رسول اللہؐ کی زبانی فرماتا ہے کہ "میں تو ڈرانے والوں میں سے ہوں"، ممکن ہے کہ تعبیرات کا یہ اختلاف اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ میں گمراہ لوگوں کے سامنے کبھی خاموشی اختیار نہیں کروں گا انھیں اپنے حال پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ انھیں برابر ڈراتا رہوں گا اور اس کام سے کبھی نہ تو باز آؤں گا اور نہ ہی کسی قسم کی تھکاوٹ کا اظہار کروں گا کیونکہ میں "منذر" ہوں (البتہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں دونوں تعبیریں ایک جیسی آئی ہیں لیکن واضح ہے کہ تعبیرات ہمیشہ موقع و محل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں اور بعض اوقات مختلف معانی کو بیان کرنے کے لیے بھی مختلف تعبیریں استعمال ہوتی ہیں)۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ سورت قرآن مجید کی اہمیت کے ذکر سے شروع ہوئی اور تلاوت قرآن کی تاکید پر ختم ہو رہی ہے گویا اس کا آغاز بھی قرآن کے سلسلے سے ہوا اور اختتام بھی اسی پر۔

اور آخر میں اسی سورہ کی آخری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ خداوند عالم کی اس قدر عظیم نعمتوں بالخصوص ہدایت جیسی نعمت کے بدلے میں خدا کی حمد بجا لائیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اور کہہ دو کہ تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں (وقل الحمد للہ)۔

ہوسکتا ہے کہ یہ حمد اور تعریف قرآن جیسی نعمت اور ہدایت الٰہی کی عنایت پر ادا کی جا رہی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعد والے جملے کے لیے مقدمہ بن رہی ہو جس میں فرمایا گیا ہے:

بہت جلد خدا تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تاکہ تم انھیں پہچان لو (سیریکم آیاتہ فتعرفونھا)۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرور زمان اور انسان کے علم و دانش اور عقل و خرد کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئی نشانیوں اور عالم ہستی کے تازہ ترین اسرار سے پردہ اٹھتا جائے گا اور تم پروردگار کی عظیم قدرت و حکمت سے روز بروز آشنائی حاصل کرتے رہو گے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا اور کبھی منقطع ہونے میں نہیں آئے گا، جب تک بنی نوع انسان اس دنیا میں موجود ہے آیات الٰہی کا یہ سلسلہ بھی قائم اور برقرار ہے۔

لیکن اس کے باوجود اگر تم غلط راستے پر چل نکلو گے یا راہ راست سے ہٹ جاؤ گے تو یاد رکھو تمھارا پروردگار تمھارے ان کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم انجام دیتے ہو (وما ربک بغافل عما تعملون)۔

اگر خداوند عالم اپنی مہربانی کی وجہ سے تمھاری سزاؤں میں تاخیر سے کام لیتا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ وہ تمھارے اعمال سے آگاہ نہیں یا اس کا حساب و کتاب غیر محفوظ ہے۔

"وما ربک بغافل عما تعملون" کا جملہ بعینہٖ یا تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں نو مقامات پر آیا ہے جو ہے تو ایک مختصر سا جملہ لیکن تمام انسانوں کے لیے ایک معنی خیز تنبیہ اور زبردست دھمکی کی حیثیت رکھتا ہے۔

سورہ نمل کی اس آخری آیت کے ساتھ ہی تفسیر نمونہ کی پندرھویں جلد کا اختتام ہوتا ہے۔ اس وقت ۱۴۰۲ھ کے ماہ شعبان کا

آخری دن ہے اور عنقریب ماہِ رمضان کا چاند دکھائی دینے والا ہے ۔

پروردگارا! ہم تجھے تیرے ان باعظمت مہینوں کی قسم دے کر سوال کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی خالص بندگی، اپنے فرمان کے آگے سر جھکا دینے اور اپنے قرآن مجید کی تلاوت کی توفیق عنایت فرما ۔

خداوندا! ہمیں ہر روز اپنی نت نئی نشانیاں دکھلا تاکہ ہم تجھے ہر روز پہلے سے بہتر پہچانتے رہیں اور ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہیں جو تو نے ہمیں عطا فرمائی ہیں ۔

بارالہا! ہمارے اسلامی معاشرے کو گوناگوں مشکلات نے گھیر رکھا ہے اور اندرونی اور بیرونی دشمن اس بات کی زبردست کوشش کر رہے ہیں کہ تیرے نور کو بجھا دیں ۔

لیکن تو نے ہی سلیمان کو اس قدر قدرت عطا فرمائی، موسیٰ کو فرعون اور فرعونیوں کے مقابلے میں اس قدر قوت عطا فرمائی ہمیں بھی ان دشمنوں پر کامیابی عطا فرما اور جو لوگ قابلِ ہدایت نہیں انھیں قوم عاد، قومِ ہود و ثمود اور قومِ لوط کی طرح نیست و نابود فرما ۔

والحمد للہ رب العالمین

۲۰ رشعبان ۱۴۰۲ ہجری

تفسیر نمونہ کی پندرہویں جلد کا ترجمہ بروز پیر بوقت پونے تین بجے سہ پہر تاریخ ۲۶ رشوال ۱۴۰۵ ہجری مطابق ۱۵ جولائی ۱۹۸۵ عیسوی بر مکان عزیزم محمد حسن فرزند سیٹھ نوازش علی سیٹھ برادرز بہادر یار جنگ روڈ کراچی میں حقیر پر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا ۔

الحمد للہ اوّلاً و آخرًا

والصلوٰۃ والسلام محمد و آلہ دائمًا سرمدًا

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآنِ پاک (تفسیر نمونہ جلد ۸) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے ۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)

مدرس / مہتمم

امامیہ قرأت کالج

اندرون موچی دروازہ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشاریے سے پہلے

زیرِ نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباحُ القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح مصباحُ القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کرکے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام رَوِش سے ہٹ کر زیرِ نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجُود قرآنی لُغت کے زیادہ دِقّت طلب الفاظ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مؤلفِ محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عالمِ پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام محترم سیّد شکیل حسین موسوی نے انجام دیا ہے۔ خُدا تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عُمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے مُفید ثابت ہوسکتی ہے۔

اِنچارج
شعبۂ تصیح وترتیب
مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

اشاریہ

تفسیر نمونہ ——— جلد ۸

ترتیب وتزئین ------ سیّد شکیل حسین موسوی
------ سیّد محمدؐ حسین زیدی الباھروی

مضامین :

اصول وعقائد ۷۴۶
احکام ۷۵۰
اخلاقیات ۷۵۱
اقوامِ گذشتہ ۷۵۲
شخصیات ۷۵۳
عُلماء ودانشور ۷۶۶
کُتب سماوی ۷۶۷
کتب تاریخ وتفسیر وسیر ۷۶۸
لُغاتِ قرآن ۷۷۰
متفرق موضوعات ۷۷۸
مقامات ۷۹۰

اُصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

اللہ	۳۰، ۵۴، ۱۸۴، ۱۹۵، ۲۲۴، ۲۴۴، ۲۶۳، ۲۶۸، ۳۱۴، ۵۱۶، ۷۱۱
بصیر	۲۵۶، ۳۵۷
حکیم	۱۹۵، ۲۹۷، ۶۱۲
خالق	۴۰، ۴۱
ربّ	۵۸، ۲۵۶، ۶۱۲، ۱۳۹
رحمٰن	۳۰، ۱۶۳، ۳۶۶، ۳۶۸، ۴۱۶، ۴۲۲، ۴۲۷
رحیم	۱۶۳، ۲۲۴، ۳۱۴، ۳۲۲، ۳۲۷، ۴۶۰، ۴۹۸، ۵۰۲، ۵۱۶، ۵۳۰، ۵۴۰، ۵۴۷، ۵۶۶، ۵۸۶، ۶۱۲
سمیع	۲۰۱، ۵۸۶
عزیز	۴۶۰، ۴۹۸، ۵۰۲، ۵۱۶، ۵۳۰، ۵۴۰، ۵۴۷، ۵۶۶، ۵۸۶، ۶۱۲، ۷۱۱
علیم	۱۹۵، ۲۰۱، ۲۴۴، ۲۶۳، ۲۹۷، ۳۱۴
غفور	۲۲۴، ۳۱۴، ۳۲۸، ۳۲۲، ۳۲۷
واسع	۲۲۴

٭

توحید

ہم نے تمہارے اُوپر سات راستے (منازل) بنائے ہیں، ہم اپنی مخلوق سے غافل نہ تھے اور نہ ہیں۔ آسمان سے پانی برسایا (بعض جگہوں پر جمع رکھا)، باغات اُگائے جن سے پھل کھاتے ہو، جانور پیدا کیے جن کی اون سے لباس بناتے اور جن کا گوشت کھاتے ہو اور ان پر سواری کرتے ہو۔ ۴۷، ۵۳

خدائے واحد کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کوئی تمہارا معبود نہیں، کیا اس کے باوجود تم شرک و بُت پرستی سے پرہیز نہیں کرتے۔ ۶۲، ۶۳

ہم نے عیسٰیؑ اور اس کی ماں کو اپنی نشانی قرار دیا۔ ۷۷، ۷۸

تم سب ایک اُمّت ہو اور مَیں تمہارا پالنے والا ہوں، میری نافرمانی سے بچو۔ ۷۹، ۸۰

ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے.... ان پر ظلم نہیں ہوگا۔ ۱۹

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کان، آنکھ اور دل (عقل) عطا فرمائے۔ ۱۰۲، ۱۰۳

اللہ نے ہرگز کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا، اس کے ساتھ کوئی معبود نہیں۔ وہ ہر پنہاں و آشکار سے واقف اور شرک سے بالاتر ہے۔ ۱۱۴، ۱۱۵

بزرگ و برتر ہے اللہ جو فرمانروائے حق ہے۔ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ ربِّ عرشِ کریم ہے۔ ۱۵۱ تا ۱۵۵

اللہ آسمانوں اور زمین کا نُور ہے۔ نورِ خدا کی مثال ایک روشن چراغ جیسی ہے۔ ۲۴۴ تا ۲۵۷

سب اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں ۲۶۳

اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے پیدا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۶۸، ۲۶۹

ہم نے حقیقت واضح کرنے والی آیات نازل فرمائیں ہم جسے چاہتے ہیں راہِ مستقیم کی ہدایت کرتے ہیں۔ ۲۷۷

صدق و خلوص سے اطاعت کرو، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۲۸۵

جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب اللہ کے لیے ہے۔ اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ ۳۱۵

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر قرآن نازل فرمایا۔ زمین و آسمان کی حکومت اور ملکیت اسی کی ہے۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں۔ ۳۲۵

بابرکت ہے اللہ۔ اگر وہ چاہے تو اس سے بہتر عطا کر سکتا ہے۔ ۳۳۸

تیرا پروردگار بصیر (دیکھنے والا) ہے ۳۵۶

آیات ۴۵ تا ۴۸ توحید کے بیان میں ہیں ۳۹۹، ۴۰۵

وہ تو وہ ہے جس نے دو سمندروں کو ملا دیا اور انسان کو پانی سے خلق فرمایا۔ ۴۰۷

اس اللہ پر بھروسہ رکھو جو کبھی نہیں مرے گا۔ وہ بندہ کے گناہوں سے آگاہ ہے۔ ۴۱۶

وہ تو وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ وہی مجھے ہدایت کرتا اور کھلاتا پلاتا ہے۔ بیمار ہو جاؤں تو شفا دیتا ہے۔ وہی موت دیتا ہے اور زندہ کرے گا۔ (ابراہیمؑ) ۴۱۱، ۵۰۱

اللہ کے سوا کسی اور معبود کو مت پکارو ورنہ عذاب پاؤ گے۔ ۵۸۶

بابرکت ہے وہ اللہ جو آگ اور اس کے نواح میں ہے۔ ۶۱۲

(موسیٰؑ سے) مَیں عزیز و حکیم ہوں، غفور و رحیم ہوں۔ ۶۱۲

خدا وہ ہے جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ۶۲۹، ۶۴۴

حمد اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے ۶۸۷

توحید کے دلائل، آسمان و زمین کی خلقت، بارش، خوبصورت باغات، زمین باعثِ راحت و آرام، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کا قیام، مضطر کی دُعا قبول کرنا، غموں کو دُور کرنا، زمین پر خلیفہ بنانا، صحرا و سمندر میں راستہ پیدا کرنا، خلقت معاد، روزی عطا کرنا اور دیگر نکات۔ ۶۹۱ تا ۷۰۰

اللہ کے سوا کوئی عالمِ غیب نہیں ۷۰۲

کہہ دیجیے کہ حمد اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے ۷۳۸ تا ۷۴۱

مسطح ابنِ اثاثہ کی مالی امداد کا بند ہونا ۲۰۴
بے پردگی بے حیائی ہے ۲۱۹ تا ۲۲۵
قومِ عاد و ثمود، اصحاب الرس، قومِ لوطؑ و
قومِ نوحؑ و فرعون میں ۔سے ایک فکری و اخلاقی
بے راہ روی کا شکار تھیں۔ ۲۸۹
بخل و فضول خرچی دونوں مذموم عادتیں ہیں ۴۳۳
عبداللہؓ ابنِ مسعود حدیثِ رسُولِ پاک کے راوی
ہیں کہ اولاد کا قتل (ہمسایہ کی بیوی سے) زنا
بدترین گناہ و بدفعلی ہیں۔ ۴۳۵، ۴۳۶
اپنے بڑوں کی خرافات پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ جہالت و
گمراہی چھوڑنے کو تیار نہیں۔ ۴۵۷
دین سے روگردانی۔ تکذیب و استہزاء کرتے ہیں ۴۵۷
عورتوں کی بجائے مردوں سے جنسی لذّت حاصل کرنا ۵۵۱ تا ۵۵۲

اقوامِ سابقہ

اصحاب الرّس

صنوبر کے درخت کی پوجا کرنے والے اور
بہت سی دوسری قومیں جو ان میں تھیں، ہم
نے انہیں ہلاک کر دیا۔ ۲۸۳
اصحاب الرّس کا تعارف ۲۸۶، ۲۸۷

اصحاب الایکہ

اصحابِ ایکہ نے رسُولوں کو جھٹلایا ۵۶۱
اے شعیبؑ تو پاگل ہے، جھُوٹا ہے، سچا ہے تو ہم
پر پتھر برسا دے شعیبؑ کو جھٹلایا اور سایہ دار
بادل نے انہیں آلیا۔ اس واقعہ میں عبرت ہے۔ ۵۶۶

بنی اسرائیل

بنی اسرائیل کس راہ سے گزرے ۵۰۲
بنی اسرائیل کی نجات، اہلِ فرعون کی غرقابی ۵۰۳

قومِ ثمود

بقول مفسرین صالحؑ نبی کو قومِ ثمود کی طرف
بھیجا گیا۔ آپؑ کی دعوت، قوم کا انکار و طغیان،
آسمانی بجلی سے ہلاک ہوئی۔ ۶۵ تا ۶۷
نافرمان قومِ ثمود کو ہلاک کر دیا۔ ۲۸۳
رسُولوں کو جھٹلایا۔ صالحؑ نے فرمایا تقویٰ اختیار
کیوں نہیں کرتے۔ ۵۴۲
ثمود کی ہٹ دھرمی۔ صالحؑ تم عقل کھو چکے
ہو، تم ایک بشر ہو، اپنی رسالت کی نشانی
لاؤ۔ ناقۂ صالحؑ کو مار ڈالا۔ مستحق عذاب ہوئے ۵۴۷، ۵۵۰
ہم نے ثمود کی طرف صالحؑ کو بھیجا۔ تم نیکی
سے پہلے بُرائی کی جلدی کرتے ہو۔ ہم تمہیں
اور تمہارے ساتھیوں کو فال بد جانتے ہیں۔ ۶۷۴ تا ۶۷۷
اس قوم میں نو فسادی گروہ تھے آؤ صالحؑ
کو قتل کر دیں، پھر سچے بن جائیں، مگر
معذب ہوئے۔ یہ خالی گھر ان پر عذاب
کی نشانی ہیں۔ ۶۷۹، ۶۸۴

قومِ عاد

ہم نے عاد اور ان میں بہت سی دوسری قوموں
کو ہلاک کر دیا۔ ۲۸۳
عاد نے اللہ کے رسُولوں کو جھٹلایا۔ قومِ عاد
کے جرائم اور بے راہ روی۔ ۵۲۴ تا ۵۲۹
قومِ عاد نے کہا کہ نصیحت کرو یا نہ کرو، ہم
پر کوئی اثر نہیں۔ ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا۔
نبی کو جھٹلایا۔ ہم نے ہلاک کر دیا۔ ۵۴۰، ۵۴۱

قومِ فرعون

وہ اللہ کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز نہیں کرتے ۴۶۳
قومِ فرعون نے تعاقب کیا اور غرق دریا ہوئی ۵۰۳، ۵۰۴
ہماری روشن دلیلوں کا انکار کیا کہ یہ کھُلا جادو
ہے، حالانکہ دل میں ان کا یقین رکھتے تھے۔ ۶۱۳

قومِ لوطؑ

وہ (قومِ لوطؑ کے) اس شہر کے پاس سے گزرے
جس پر پتھروں کی بارش ہوئی تھی۔ ۲۸۳، ۲۸۴
لوطؑ کی قوم نے رسُولوں کو جھٹلایا۔ عورتوں کی
بجائے مردوں سے شہوت رانی کی، بے حیا قوم تھی ۵۵۱، ۵۵۲
اے لوطؑ! یہ باز نہ آئے تو تم بستی سے نکال
یہ پاک بنتا ہے، اسے بستی سے نکالو، پھر ہم
نے پتھروں کی بارش سے ہلاک کر دیا۔ ۵۹۰، ۵۹۱
قومِ لوطؑ کی بے راہ روی۔ مبتلائے فحش ہونا ۶۰۵، ۶۱۰

قومِ نوحؑ

قوم کے سرداروں نے کہا یہ بھی بشر ہے، مگر تم
پر برتری چاہتا ہے، اللہ نبی بھیجتا تو وہ فرشتہ
ہوتا۔ یہ جنون میں مبتلا ہے۔ ۵۴، ۵۵
قومِ نوحؑ نے انبیاءؑ کو جھٹلایا۔ ہم نے انہیں
غرق کر کے لوگوں کے لیے درس عبرت بنا دیا۔ ۵۱۳
جب نوحؑ نے اُن سے کہا تقویٰ کیوں اختیار
نہیں کرتے، میری اطاعت کرو، تبلیغ کی
مزدوری نہیں مانگتا۔ وہ بولے اے نوحؑ اگر
باز نہ آئے تو سنگسار کیے جاؤ گے۔ ۵۲۵ تا ۵۰۹

شخصیات

آصف بن برخیا

حضرت سلیمانؑ کے بھانجے اور وزیر۔ کتاب میں
کچھ علم کے حامل۔ ۶۶۲
تختِ بلقیس کو کیسے حاضر کیا ۶۶۶

٭

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ان کے سامنے ابراہیم کی خبر پڑھو جب انہوں نے باپ اور قوم سے کہا کس کو پوجتے ہو؟ بتوں کو۔ کیا وہ آواز سنتے یا نفع و نقصان پہنچاتے ہیں؟ ۵۰۵ تا ۵۱۰

آپ کی دعا۔ علم و دانش عطا فرما، چچا کو بخش دے۔ آخرت میں رسوا نہ کرنا۔ ۶۱۰ تا ۶۱۲

حضرت ابوبکرؓ

واقعۂ افک کے بعد اپنے قریبی رشتہ دار مسطح ابن اثاثہ کی مالی امداد بند کر دی تھی۔ ۲۰۴

حضرت ابوذر غفاریؓ

دابۃ الارض پر رسولِ اکرمؐ کی حدیث بیان کی (تفسیر عیاشی) ۷۲۳

ابوسعید خدریؓ

قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ (حدیثِ رسولؐ) ۳۶۸

کتاب کا کچھ علم سلیمانؑ کے وصی کو تھا جبکہ علم الکتاب کے حامل میرے بھائی علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں۔ (حدیثِ رسولؐ) ۶۶۴

اُبیّ

اُبی نے عقبہ کو گمراہ کیا (جو اقرار توحید کر چکا تھا) دونوں جنگِ بدر میں مارے گئے۔ ۲۷۰

اخنس بن شریق (مشرکِ مکہ)

ابوسفیان و ابوجہل سے پوچھا کہ تم نے قرآن سن کر کیا سبق لیا؟ ۴۱۴، ۴۱۵

اُسامہ بن زیدؓ

حضرت عائشہؓ پر لگائی گئی تہمت کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے اُسامہؓ سے مشورہ کیا۔

اسحٰق بن عمار

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سن کر سورۂ فرقان کی فضیلت میں حدیث بیان کی۔ ۳۲۴

اُسید بن حضیر

سعدؓ بن معاذ کے چچازاد بھائی حضرت عائشہؓ کے بارے میں سعدؓ بن عبادہ کی مخالفت کی۔ ۱۸۷

اصبغ ابنِ نباتہ

جناب امیرؑ کے ایک صحابی۔ جناب امیرؑ کی ایک حدیث بیان کی۔ ۱۳۰، ۱۳۱

اصمعی

امام چہارم کے صحابی۔ آپ کی ایک دعا اور چند اشعار جو آپ نے غلافِ کعبہ کو پکڑتے ہوئے گریہ و زاری کے ساتھ پڑھ رہے تھے، بیان کیے۔ ۱۲۳ تا ۱۵۵

اُمِّ نہرول

ایک بدکار عورت۔ بطور علامت دروازہ پر جھنڈا لگایا ہوا تھا ۱۶۷

بلقیس (ملکہ سبا)

سردارو! یہ خط آیا ہے۔ رحمٰن و رحیم کے نام سے کہ سرکشی نہ کرو، حق کو تسلیم کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ۔ میں نے بغیر مشورہ کبھی کام نہیں کیا۔ بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوں تو اسے اجاڑ دیتے ہیں ـــــ بے عزت کرتے ہیں۔ ۶۴۸ تا ۶۵۱

سبا کے ایلچی جناب سلیمانؑ کے دربار میں۔ آپؑ کا جواب۔ ۶۵۵ تا ۶۵۷

ملکہ کے دل میں نورِ ایمان۔ تخت پہچان لیا، محل کے فرش کو پانی سمجھا۔ جناب سلیمانؑ کے ساتھ خدا پر ایمان کا اعلان کیا۔ ۶۷۷ تا ۶۸۱

جریح قبطی

حضور پاکؐ نے جناب امیرؑ کو جریح کے قتل پر مامور فرمایا۔ ۱۸۸

حضرت امام جعفر صادقؑ (امام ششم)

جمعہ کے دن سورۂ مومنون کو تلاوت کرنے والے کا خاتمہ سعادت پر ہوگا۔ ۲۷

اللہ نے زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ واجب فرمایا ۲۹

جب دو قاضی اختلاف کریں تو وہ روایت قبول کرو جو آئمہ ہدیٰ کے اصحاب و انصار میں مشہور ہو۔ ۱۰۱

جو زکوٰۃ کا ایک قیراط (چار دانوں کا وزن) نہ دے وہ نہ مومن ہے نہ مسلمان۔ ۱۲۷

برزخ وہی عالمِ قبر جو دنیا و آخرت کے درمیان ثواب و عذاب کا دور ہے۔ ۱۳۱

برزخ کے متعلق آپ کی احادیث اور دیگر روایات ۱۳۲، ۱۳۳

زانی مرد و عورت کے بارے میں آپؑ کا فرمان ۱۶۸

جو مرد و عورت زنا میں مشہور ہوں، اُن سے نکاح کی ممانعت۔ ۱۶۸

کوئی مومن اپنے مومن بھائی پر ایسا الزام لگائے جو اس میں نہیں تو اس کا ایمان اس کے دل میں ایسے گھل جاتا ہے جیسے پانی میں نمک۔ ۱۷۳

الزام لگانے والے توبہ کرلیں تو ان کا فسق بھی دور ہوگیا اور گواہی بھی قبول کی جائے گی۔ ۱۷۴

زنا کے مسئلہ میں دو حدیں، ایک عورت پر دوسری
مرد پر جبکہ قتل میں ایک حد قاتل پر ہے جس کے لیے
دو گواہ کافی ہیں۔ زنا کے لیے چار۔ ۱۷۵
قرآن میں حفظِ فرج سے ہر جگہ مراد زنا سے محفوظ رہنا
ہے، مگر یہاں دوسروں کی نگاہ سے محفوظ رہنا مراد ہے ۲۲۲
مناسب نہیں کہ مسلمان عورت یہودی عورت
کے سامنے عریاں ہو۔ ۲۲۱
ایسے ناسمجھ مراد ہیں جو جنسی احساس نہ رکھتے ہوں ۲۳۲
غلام سے جو کچھ لینا چاہو اس میں تخفیف کر دو ۲۳۸
مشکوٰۃ قلبِ رسولؐ، مصباح نورِ علم وہدایت اور
زجاجہ علیؑ ہیں جو بعد رسولؐ مصباح قرار پائے،
مشکوٰۃ جناب فاطمہؑ، مصباح امام حسنؑ اور زجاجہ
امام حسینؑ ہیں۔ ۲۵۶
الخمار والجلباب سے مراد دوپٹہ و برقعہ ہے ۳۰۱
عمر رسیدہ عورتیں جن کسی کے سامنے ہوں چادر و
برقعہ اتار دیں مگر خود نمائی و بناؤ سنگھار نہ کریں۔ ۳۰۱
دوستی کی کچھ حدود و شرائط ہیں جن کے بغیر دوستی
کا کوئی مفہوم نہیں۔ ۳۱۱، ۳۱۲
فرقان، آیاتِ محکمات کی طرف اشارہ ۳۲۶
ترتیل یہ ہے کہ آیات کو ٹھہر ٹھہر کر اچھی
آواز سے پڑھو۔ ۳۸۲
اصحاب الرس کی بیویاں ہم جنس بازی
کرتی تھیں۔ ۳۸۸
جو عبادت رات کو چھوٹ جائے اس کی دن
میں قضا کر لیا کرو۔ ۴۲۶
اسراف و اقتار اور میانہ روی پر
آپ کی دو حدیثیں۔ ۴۳۲، ۴۳۳
مؤمن سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں شک و شبہ
سے نہیں۔ ۴۴۳
سورۂ فرقان آیت ۷۴ سے ہم اہل بیتؑ مراد ہیں ۴۴۴
دعا نوکِ نیزہ سے بھی تیز ہے ۴۵۰
اس سے مراد بنی امیہ کے سرکش ہیں جو ظہورِ امام
کے وقت مجبوراً سرِ تسلیم خم کریں گے۔ ۴۶۰
جس دل میں شرک و شک ہو، بے قیمت ہے،
قلبِ سلیم وہ ہے جو حُبِّ دُنیا سے خالی ہو۔ ۵۲۱
قلبِ سلیم وہ ہے جس میں اللہ کے سوا کوئی اور
نہ ہو۔ دیگر احادیث۔ ۵۲۲
اپنی اولاد کو عیدی کے شعار کی تعلیم دو ۶۰۱
ذکرِ کثیر سے تسبیح فاطمہؑ مراد ہے ۶۰۲
جب انسان حلال و حرام کا سامنا کرے تو اللہ
کو یاد کرے، معصیت ہو تو اسے چھوڑ دے۔ ۶۰۲
جحود کفر کی ایک قسم، یقین کے باوجود انکار ۶۱۸، ۶۱۹
خط لکھنے والے کی عقل و بصیرت کا آئینہ دار
ہوتا ہے۔ ۶۵۲
خدا کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ مہدیؑ حجرِ اسود
سے ٹیک لگائے دعا مانگ رہے ہیں۔ دیگر دو
حدیثیں۔ ۶۹۸، ۶۹۹

عمار یاسر نے حدیث دابۃ الارض آپ کے
حوالہ سے بیان کی۔ ۴۲۲، ۴۲۳
رجعت عمومی نہیں بلکہ خصوصی، صرف خالص مؤمن
خالص مشرک پلٹیں گے۔ ۴۲۸

حذیفہؓ یمانی (صحابی)

آیت دابۃ الارض کے بارے میں حدیثِ رسولؐ کے راوی ۴۲۷

حضرت امام حسن عسکریؑ (امام یازدہم)

سورہ فرقان کی آیات ۷ تا ۱۰ کی شانِ نزول اپنے
والد محترم کے حوالہ سے بیان فرمائی۔ ۳۳۸

حنظلہؓ بن ابی عیاش

غسیل الملائکہ کا واقعہ ۳۱۵، ۳۱۶

حضرت داؤد علیہ السلام

ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو خاص علم دیا اور بہت
سے مومن بندوں پر فضیلت دی۔ ۶۲۰

زرارہؓ

امانت سے مراد حکومت و ولایت ہے جس کو
اس کے اہل کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔ ۳۵

سعدؓ بن عبادہ (سردار قبیلۂ خزرج)

سعدؓ بن معاذ کی مخالفت میں بات کی ۱۸۷

سعدؓ بن معاذ (سردار قبیلۂ اوس)

حضرت عائشہؓ کی افک سے برئیت کے لیے مشورہ دیا۔ ۱۸۷

حضرت سلیمان علیہ السلام

بلقیس ملکۂ سبا کے نام خط ۴۶۱
سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ہوئے، داؤدؑ و
سلیمانؑ کی حکومت۔ ۶۲۰ تا ۶۲۴
نظامِ حکومت۔ پرندوں کی بولی ۶۲۵ تا ۶۲۷
جنوں، انسانوں، پرندوں کے لشکر، چیونٹیوں
کی وادی۔ خبردار، لشکر تمہیں کچل نہ دے۔
آپؑ مسکرائے۔ ۶۲۳ تا ۶۳۶
جانوروں کی بولی کا علم، شکرِ الٰہی کی توفیق
طلب کرنا۔ ۶۳۶، ۶۳۷
عمل صالح اور صالحین میں شمار ہونے کی
اللہ سے توفیق طلب کرنا۔ ۶۳۸
داستانِ ملکۂ سبا، ہُدہُد کا غائب ہونا، واپس
آ کر ملکۂ سبا، رعایا کی حالت اور عبادت کی
کیفیت کا بیان۔ ۶۴۰ تا ۶۴۴

قصۂ سلیمانؑ کی سبق آموز باتیں، تحقیق کروں گا کہ تُو نے سچ کہا۔ یہ خط لے جا۔ پیروی کی دعوت اور دیگر مضامین۔ ۶۵۳، ۶۵۴
مجھے مال سے نہ ورغلاؤ۔ زہد کے تقاضے۔ سبق آموز باتیں۔ ۶۵۵ تا ۶۵۸
سردارو! کون ہے جو سبا کا تخت لائے۔ چشم زدن میں تخت لایا گیا۔ ۶۶۰ تا ۶۶۲
حضرت سلیمان کے متعلق چند سوال اور اُن کے جواب۔ ۶۶۳ تا ۶۶۶
ملکہ کے تخت میں تبدیلی کردو۔ ۶۶۷

حضرت شعیب علیہ السّلام

قوم سے کہا تقویٰ کیوں اختیار نہیں کرتے۔ مَیں رسُولِ امین ہوں، میری پیروی کرو، کم نہ بیچو، پیمانہ بھر کر دو، ٹھیک تولا کرو، اللہ سے ڈرو، لوگوں کا حق نہ مارو۔ ۵۶۱ تا ۵۶۵
میرا پروردگار تمہارے اعمال سے زیادہ واقف ہے۔ سرکش قوم کا انجام۔ ۵۶۶ تا ۵۷۱

شیطان الرجیم

ایمان والو! شیطان کی پیروی نہ کرو۔ اس کی پیروی کرنے والے کو شیطان گمراہ کر دیتا ہے ۲۰۱، ۲۰۲
خطوٰت الشیطٰن کی تشریح ۲۰۳
شیطان ہمیشہ سے انسان کو چھوڑ دینے والا ہے ۳۷۰
ابلیس کے سب لشکر جھگڑے پر مربستہ ہو کر کہیں گے کہ ہم تو واضح گمراہی میں تھے ہی! ۵۱۶
تمہیں بتاؤں شیطان کن پر نازل ہوتے ہیں؟ جھوٹے گنہگاروں پر۔ ۵۹۲

حضرت صالح علیہ السلام

صالحؑ کو قوم ثمود (وادی القراء) میں مبعوث فرمایا ۳۸۵
تقویٰ اختیار نہیں کرتے، مَیں رسُولِ امین ہوں، میری اطاعت کرو، مَیں اُجرت نہیں چاہتا مُسرفین کا کہا نہ مانو جو فساد کرتے ہیں۔ ۵۴۳
اس ناقہ کا بستی کے پانی میں حصہ ہے، اسے تکلیف نہ دینا ورنہ عذاب آجائے گا۔ ۵۴۷ تا ۵۵۰
صالح نے فرمایا کہ تم نیکی سے پہلے بُرائی کی جلدی کرتے ہو؛ تمہارا بخت وطالع، نیکی و نحوست سب اللہ کے پاس ہے۔ ۶۷۴ تا ۶۷۸

ضحاک

"ان یغفر اللہ لکم" کی شانِ نزول قرطبی نے ضحاک کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ ۲۰۴

حضرت عائشہؓ اُمّ المومنین

اپنے متعلق ایک طویل واقعہ بیان کیا، بالآخر آپ کی برئیت پر آیت نازل ہوئی۔ ۱۸۷، ۱۸۸

عبداللہ ابنِ ابی سلول

اس منافق نے حضرت عائشہؓ پر تہمت طرازی کی ۱۸۶

عبداللہؓ ابنِ عباسؓ

سُورہ نور آیت ۲۲ کی شانِ نزول قرطبی وطبری نے آپ کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ ۲۰۴
ترتیل کے بارے میں حضور پاکؐ کی حدیث بیان کی ۳۸۱
اطراف میں پانچ سو آدمی بیٹھے تھے جو فرعون کے خواص تھے۔ ۴۷۶

عبداللہؓ ابنِ مسعود

شرک، قتل اور زنا کی حُرمت پر حدیثِ رسُولؐ بیان کی۔ ۴۳۵، ۴۳۶

عبدی (شاعر)

امام جعفر صادقؑ نے عبدی کے اشعار کی تعریف فرمائی ۶۰۱

عداس

عداس، یسار اور جبر (یا جبیر) یہودیوں کے ایک گروہ کے تین افراد۔ ۳۳۵

عقبہ

عقبہ نے دعوت کا اہتمام کیا۔ آنحضرتؐ کے فرمان پر

حضرتِ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ

ہمیشہ بڑے گروہ کے ساتھ رہو، کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔ ۱۰۱
صفین سے واپسی پر کوفہ میں اہلِ قبور سے خطاب۔ فرمایا کہ اگر انہیں اجازت ملے تو تمہیں بتائیں کہ اس سفر کے لیے بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ ۱۳۰
اے ابنِ نباتہؓ اگر پردہ ہٹا دیا جائے تو تم دیکھو کہ مؤمنین کی ارواح حلقے بنائے بیٹھی باتیں کرتی کرتی ہیں۔ یہ مؤمنین کی جگہ ہے۔ کفّار کی ارواح وادیٔ برہوت میں ہیں۔ ۱۳۱
حضرت عائشہؓ پر لگائے گئے الزام کے بارے میں آنحضرتؐ نے آپ سے مشورہ فرمایا۔ ۱۸۶
سب سے بڑا گناہ وہ ہے جس کا مرتکب اسے معمولی جانے۔ ۲۰۰
غلام اپنی آقا عورت کے بال نہیں دیکھ سکتا ۲۲۱
بہترین تعاون یہ ہے کہ دو افراد کے درمیان شادی کے لیے ملاپ کرا دو۔ ۲۳۶
اقتباس از خطبۂ قاصعہ ۲۴۳، ۲۴۴
کہاں ہیں 'رس' کے شہروں والے جنہوں نے انبیاء کو قتل کیا۔ ۲۸۸
ہوا و ہوس پرستی پر ارشادات ۳۵۵ تا ۳۵۸

صبرواستقامت کو ایمان میں وہی درجہ حاصل
ہے جو سر کو جسم میں ہے۔ ۴۴۵
دُعا کامیابی کی دلیل اور فلاح وکامرانی کی چابی ہے ۴۴۹
لواطت کو کفر کے مترادف قرار دیا۔ ۵۵۵
اللہ چھ قسم کے لوگوں کو چھ صفات کی بناء پر
عذاب کرے گا۔ ۵۷۹
علیؑ کے علاوہ دعوتِ اسلام کو سب نے ٹھکرا دیا ۵۸۸
تمہارے کاموں کا معیار دین، تمہارا محافظ تقویٰ،
تمہاری زینت ادب اور حلم وبردباری تمہاری
آبرو کا محکم قلعہ ہے۔ ۵۹۸
سلیمانؑ ابن داؤدؑ کی طرح اللہ نے خشکی وتری میں
چلنے والی ہر مخلوق کی زبان ہمیں سکھلائی۔ ۶۲۷
ماتحتوں کو خطوط لکھنے کے بارے میں ہدایات
اور طرزِ تحریر۔ ۶۵۱، ۶۵۲
قاضیٔ بصرہ کعب بن اسود کی لاش سے خطاب
فرمایا کہ تمہارے علم نے تمہیں فائدہ نہ پہنچایا بلکہ
جہنم میں بھیج دیا۔ اسی طرح پس دیوار کوفہ
قبرستان میں مُردوں سے خطاب فرمایا۔

حضرت امام علی ابن الحسینؑ (امامِ چہارم)

قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ اور جہنم
کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ ۱۳۱
سورۂ نور آیت ۵۵ کے سلسلے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ ہمارے
شیعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی حکومت ایک مرد
کے ہاتھ سے قائم فرمائے گا۔ ۲۹۲

حضرت امام علی نقیؑ (امامِ دہم)

ممکن ہے سلیمانؑ اس طرح اپنے وصی کا تعارف
کروانا چاہتے ہوں۔ یحییٰ ابن اکثم کو دیا ہوا جواب
(تفسیر عیاشی) ۶۶۳

حضرت امام علی رضاؑ (امامِ ہشتم)

گناہ کی تشہیر کرنے والا مردود ہے، مخفی رکھنے
والے کے لیے اللہ کی مغفرت ہے۔ ۱۹۸
وہ ہادی ہے اہلِ آسمان کا اور ہادی ہے
اہلِ زمین کا۔ ۲۴۹
اصحاب الرس کے بارے میں امیرالمومنینؑ کی
گفتگو کا خلاصہ۔ ۳۸۷
مردوں پر ہر مرد اور عورتوں پر عورتیں حرام ہونے
کا سبب نسلِ انسانی کا انقطاع ہے۔ ۵۵۵

عمارؓ یاسر

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے
کہ عمارؓ نے دابۃ الارض کے بارے میں ایک
شخص کے سوال کا واضح جواب دیا۔ ۷۲۲، ۷۲۳

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت مریمؑ اور اُن کے فرزند کو اپنی نشانی قرار دیا۔
ایک بلند اور چشموں والی جگہ پر ٹھہرایا۔ ۷۷، ۷۸
مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزات ۷۲۶

حضرت سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا

تم اپنے باپ کے وارث بنو اور میں نہ بنوں، تم
نے کتابِ الٰہی کو پسِ پُشت ڈال دیا ہے، جبکہ
اللہ کا فرمان ہے کہ سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث ہوئے۔ ۶۲۳

فرعون

یہ ربّ العالمین کیا چیز ہے؟ سُنتے نہیں یہ کیا
کہہ رہا ہے؟ یہ تو پاگل ہے۔ میرے سوا کسی کو
معبود بنایا تو قید کر دوں گا۔ ۴۷۴

کافر

اُن کے دل اس نامۂ اعمال سے غفلت میں
ہیں اور ہمیشہ بُرے اعمال انجام دیتے ہیں۔ ۸۹، ۹۰
انہوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے کہتے تھے
ہم مٹی میں مل کر پھر کیسے اٹھائے جائیں گے۔ ۱۱۰
یہ وعدہ تو ہم سے پہلوں کے ساتھ بھی کیا گیا تھا،
یہ پرانے قصے ہیں۔ ۱۱۰
جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو پکارے اس
کے پاس اس کی کوئی دلیل نہ ہوگی، کافر ہرگز
کامیاب نہ ہوں گے۔ ۱۵۷، ۱۵۸
اس کے بعد بھی جو لوگ فاسق ہو جائیں وہ فاسق ہیں ۲۸۹
یہ گمان نہ کرو کہ کافر عذاب سے بچ کر زمین میں
کہیں پناہ حاصل کر لیں گے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم
ہے، وہ کیا بُرا ٹھکانہ ہے۔ ۲۹۵

کعب بن سور

قاضیٔ بصرہ، جنگِ جمل کا مقتول ۷۱۷

کعب بن مالک (شاعر)

اسلام کی تقویت کے لیے اشعار پڑھے ۶۰۰

حضرت لقمان

ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی ۶۱۱

حضرت لوط علیہ السلام

تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ میں رسول امین
ہوں، میری پیروی کرو، کوئی اجر نہیں چاہتا۔
بیویوں کو چھوڑ کر مردوں سے ..... ۵۵۱ تا ۵۵۲
بُرے کام کی طرف جاتے ہو، اس کی برائی کو بھی
جانتے ہو، عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت
رانی کرتے ہو، بڑی جاہل قوم ہو۔ ۶۸۵، ۶۸۶

لیتنے

سویڈن کا ماہر نباتات ۴۶۱

حضرت ماریہؓ قبطیہ (اُم المومنین)

والدۂ جناب ابراہیمؑ پر حضرت عائشہؓ نے الزام لگایا کہ ابراہیمؑ جریج قبطی کے بیٹے تھے۔

حضرت محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

سُورۂ مؤمنون کے قاری کو قبض رُوح کے وقت ملک الموت بشارت دے گا۔ قیامت میں فرشتے روح و ریحان کی خوشخبری دیں گے۔ ۲۷
مجھ پر دس ایسی آیات نازل ہوئیں کہ اگر کوئی ان کا عملی نمونہ بن جائے تو جنّت میں جائے گا۔ ۲۸
اگر اس کا دل (نماز میں) حالتِ عجز میں ہوتا تو اس کے اعضاء بھی عجز میں ہوتے۔ ۳۳
اللہ تعالیٰ خود پاک و پاکیزہ ہے اور پاکیزہ عمل کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتا۔ ۸۱، ۸۲
کیا انھوں نے اپنے رُسولؐ کو نہیں پہچانا، اس کی صداقت کو نہیں دیکھا، کیا وہ اسے دیوانہ سمجھتے ہیں؟ ۹۵
کہہ دو اے ربّ! اگر وہ عذاب جس کا ان سے وعدہ ہے، مجھے دکھائے تو مجھے اس عذاب سے بچا لینا۔ ۱۱۹
امیرالمومنینؑ علیؑ اور آئمہؑ ہی ناپ تول کیلیے میزان ہیں۔ ۱۴۰
کہہ دو میرے پروردگار مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، تُو بہترین رحم کرنے والا ہے۔ ۱۵۸، ۱۵۹
روزِ قیامت اس حاکم یا قاضی سے جس نے اللہ کی حُدود میں سے کم کیا ہوگا، پُوچھا جائے گا کہ ایسا کیوں کیا۔ ۱۶۵، ۱۶۶
تیرے کام کی تشہیر کرنے والا ابتدا کرنے والے کے برابر ہے۔ ۱۹۸
اندر آنے کی اجازت لیتے وقت دروازہ کے سامنے کھڑے نہ ہوا کرو۔ اپنی ماں کے گھر میں بھی بغیر اجازت داخل نہ ہوا کرو۔ ۲۱۶
آنحضرتؐ کا اپنی صاحبزادی کے گھر میں آنے کی اجازت چاہنا۔ ۲۱۷
جتنے قدم کوئی اپنے مسلمان بھائی کی شادی کے وسائل مہیا کرنے میں اٹھائے گا اسے ہر قدم کے بدلہ ایک سال کی عبادت کا ثواب ملے گا۔ ۲۳۶
شادی کرو کہ تمہاری تعداد بڑھے تاکہ قیامت میں فخر کروں اور سقط شدہ بچوں پر بھی۔
جس نے شادی کی اس نے آدھا دین محفوظ کر لیا۔ باقی آدھے میں بھی خدا سے ڈرے۔
تم میں بدترین افراد غیر شادی شدہ اور مجرد ہیں۔ ۲۴۰

جو شخص وسائل کے باوجود جوان بیٹے کی شادی نہ کرے، اگر بیٹا کوئی گناہ کرے تو دونوں کا گناہ شمار ہوگا۔ ۳۴۱
وہ عورت منحوس ہے جس کا مہر زیادہ ہو۔ ۳۴۱
جو شخص افلاس کے ڈر سے شادی نہ کرے اس نے اللہ پر سوئے ظن کیا۔ ۳۴۲
بیوت سے انبیاء کے گھر مراد ہیں، علیؑ و فاطمہؑ کا گھر تو افضل ترین گھروں میں سے ہے۔ ۲۵۴
کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ ۲۵۵
کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ ۲۶۹
کہہ دیجیے کہ اللہ اور رسُولؐ کی اطاعت کرو، اگر نافرمانی کی تو اپنے اعمال کے خود جوابدہ ہوگے، رسُولؐ تو اللہ کے احکام پہنچاتا ہے۔ ۲۸۵
اگر دُنیا کی زندگی کا ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ اسے طول دے گا اور مہدئ آخر الزمان کی حکومت کو قائم کرے گا۔ ۲۹۲، ۲۹۳
روئے زمین پر کوئی پتھر یا مٹی کا گھر ایسا نہ ہوگا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو۔ ۲۹۳
جب بچّہ گہوارہ میں پڑا دیکھ رہا ہو، اس وقت بھی مباشرت نہ کرو۔ ۳۰۳
اپنے درمیان رسولؐ کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کو بُلانے کی مانند نہ سمجھو۔ ۳۱۵
سُورۂ فرقان کی فضیلت میں آپ کی حدیث ۳۲۴
قرآن ترتیل سے پڑھا کرو، ٹھہر ٹھہر کر، سمجھ سمجھ کر ۳۸۱، ۳۸۲
زیرِ آسمان کوئی بت ہوا و ہوس کے بت سے بڑا نہیں۔ ۳۹۴
ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ۴۰۹
دیوانگی کی صفات پر آپؐ کی حدیث ۴۲۹
عبداللہؓ ابنِ مسعود نے مشرک، قتل، زنا کی حُرمت پر آنحضرتؐ کی حدیث بیان کی۔ ۴۳۵/۴۳۶
بکثرت دُعا مانگنا تلاوت سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ ۴۴۸
دُعا مومن کا ہتھیار، دین کا ستون، آسمانوں اور زمین کا نُور ہے۔ ۴۴۹
سُورۂ شعراء کی تلاوت کے فضائل ۴۵۳
ہر دل خدائے قادر کے قبضہ میں ہے، اگر چاہے تو راہِ راست پر لگا دے۔ (حدیث) ۴۸۹
بعض بہشتی پُوچھیں گے ہمارے دوست کا انجام کیا ہوا جبکہ وہ جہنّم میں ہوں گے۔ ۵۲۳
روزِ قیامت ہر عمارت مالک کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔ (جابرؓ بن عبداللہ) ۵۳۶
جس سے لواطت کی جائے وہ بہشت کی خوشبو نہ سونگھ سکے گا۔ ۵۵۵
آپ ہر روز شک، شرک، تعصّب، غضب ظلم اور حسد سے پناہ مانگتے تھے [illegible]

مَیں تمہیں پس پُشت سے بھی ایسے ہی دیکھ سکتا ہوں جیسے سامنے سے۔ ۵۹۰
پیغمبرؐ شاعر نہیں ہیں۔ ۵۹۴، ۵۹۷
بعض اشعار حکمت اور بعض بیانات جادو ہوا کرتے ہیں۔ ان اشعار کے ذریعہ گویا تم ان کی طرف تیر چلا رہے ہو۔ ۵۹۹
ان کی مذمت اور ہجو کرو کہ جبریلؑ تمہارے ساتھ ہیں ۶۰۰
مومن اپنی جان، تلوار اور اپنی زبان سے جہاد کرتا ہے ۶۰۰
خسرو پرویز اور قیصر رُوم کے نام خطوط کا طرزِ تحریر ۶۵۲
اللہ پر توکل کرو، تم واضح حق پر ہو، گمراہوں کو نجات نہیں دلا سکتے۔ ۷۱۱
کہہ دیجیے مجھے حکم ملا ہے کہ شہرِ مکّہ کے ربّ کی عبادت کروں۔ ۷۳۷، ۷۳۹، ۷۴۰

امام محمّد باقر علیہ السّلام (امامِ پنجم)

اللہ نے زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ واجب فرمایا ۲۹
زانی مرد و عورت کے لیے آپ کے ارشادات ۱۶۸
اس سے وہ بے سمجھ مرد مراد ہیں جو جنسی احساس نہ رکھتے ہوں۔ ۲۴۱
بیوت سے انبیاء کے گھروں کی طرف اشارہ ہے اور علیؑ کا گھر اسی زمرہ میں آتا ہے۔ ۲۵۴
مشکوٰۃ سینۂ رسولؐ میں نُورِ علم، زجاجہ سینۂ علیؑ اور نورِ علیٰ نور آئمہؑ اطہار ہیں۔ ۲۵۶
وحی، ایمان اور ہدایت کے گھر مراد ہیں، پتھر اور مٹی کے نہیں۔ ۲۵۷

اولٰئِکَ ھُمُ المفلحون کے مصداق

امیرالمومنین ہیں۔ ۲۸۶
آنحضرتؐ نے فرمایا: قرآن پڑھنے والو اللہ سے ڈرو، جو بوجھ تمہارے کاندھوں پر ڈالا ہے اس کے جوابدہ تم ہو، تبلیغ رسالت کا جوابدہ میں ہوں۔ ۲۸۸
جب کوئی آدمی کسی گھر میں داخل ہو تو اہلِ خانہ کو سلام کرے، اپنے گھر میں داخل ہو تب بھی سلام کرے، اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو اپنے اوپر سلام کرے، "سلامٌ علینا"۔ ۳۰۹
قیامت میں ایک گروہ کے اعمال سفید لباس کے مانند ہوں گے، پھر اللہ حکم دے گا ذرات میں بدل جاؤ، وہ ذرات بن جائیں گے۔ ۲۶۴، ۲۶۵
بکثرت دُعا مانگنا تلاوتِ قرآن سے افضل ہے (حدیث) ۲۴۸
یہ (فکبکبوا) آیت ان کے بارے میں ہے جو زبان سے حق و انصاف کی تعریف کرتے لیکن عمل سے مخالفت کرتے ہیں۔ ۵۲۳

مسیلمہ کذّاب

ایک جھوٹا نبی جسے لوگ رحمٰن کہتے تھے ۴۲۳

مرتضیٰ سیّد

امامِ زمانہ کے ظہور کے بعد اللہ کچھ مُومنین کو نصرت کے لیے کچھ دُشمنوں کو انتقام کے لیے زندہ کریگا ۷۲۵

مقدادؓ بن اسود

ان سے اہلسُنت کے مشہور مفسّر قرطبی نے روایت کی ہے کہ روئے زمین پر کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جس میں اسلام داخل نہ ہو۔ ۲۹۳

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ (امامِ ہفتم)

جو لوگ مُومنین کی بُرائیاں معاشرہ میں پھیلائیں ان کے لیے دُنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ ۱۹۸، ۱۹۹
ایسے بوڑھے مرد جو جنسی احساس نہ رکھتے ہوں ۲۳۲
قیامت میں عرشِ الٰہی کا سایہ تین گروہوں پر ہوگا جن میں ایک گروہ وہ ہوگا جو اپنے مسلمان بھائی کی شادی کے لیے وسائل مہیا کرے۔ ۲۳۶
سُورۂ فرقان کے فضائل ۳۲۴

حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السّلام

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی ۳۸۳
ظالم قوم کے پاس جا خوف ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔ میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ بھیج دے۔
مَیں نے آگ دیکھی ہے، تم ٹھہرو میں آگ لے آؤں۔ اے موسیٰ عصا پھینک دو، ڈرو نہیں ہاتھ جیب میں ڈالو۔ ۶۱۲ تا ۶۱۹

مؤمن

مومنین کے اوصاف، نماز میں عجز و انکساری و حفاظت، لغویات سے بچنا، زکوٰۃ دینا، بیویوں اور کنیزوں کے سوا شرم گاہوں کی حفاظت ۳۰ تا ۳۷
اے ایمان والو! دوسروں کے گھروں میں بغیر اذن داخل نہ ہوا کرو۔ ۲۱۳ تا ۲۱۵
اللہ کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم، نُورِ ایمان ایسے دلوں کو روشن کرتا ہے جو اُسے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ ۲۷۹
جب مُومنین کو اللہ و رسُولؐ ان کے درمیان فیصلہ کیلئے بلائیں تو وہ کہیں سُنا اور اطاعت کی، پھر جو لوگ اللہ اور رسُول کی اطاعت کریں اور ڈریں، یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ۲۸۴
جو ایمان لائے، نیک عمل کیے، اللہ انہیں زمین کا خلیفہ بنائے گا، جیسا کہ پہلے بنا چکا، اور خوف کو امن سے بدل دے گا۔ ۲۸۹
حقیقی مُومن وہ ہیں جو اللہ و رسُول پر ایمان لائے ہوں، اگر مصلحت دیکھو تو انہیں اجازت دے دو۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۳۱۵

منافق

کہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے، لیکن اس کے باوجود ایک گروہ روگردانی کرتا ہے، بلائیں تو مُنہ پھیر لیتا ہے فیصلہ ان کے حق میں ہو تو آجاتے ہیں، ورنہ سمجھتے ہیں کہ رسولؐ ہم پر ظلم کرے گا۔ دراصل وہ خود ظالم ہیں۔ ۲۷۷ تا ۲۸۲
قسم کھاتے ہیں کہ جان و مال کا نذرانہ پیش کرنے کو تیار ہیں، قسمیں نہ کھاؤ، خلوص عمل سے ثابت کرو، جو کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۲۸۵ تا ۲۸۸

حضرت نوح علیہ السّلام

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ فرمایا اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اور کوئی معبود نہیں تم کیوں بُتوں کو پوجتے ہو؟ ۵۴
پروردگار جھٹلانے والوں کے خلاف میری مدد فرما۔ ہم نے کشتی بنانے کا حکم دیا۔ ۵۸، ۵۹
اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ مَیں مومنین کو دھتکاروں گا نہیں۔ مَیں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ ۵۲۶
خدایا میری قوم نے تکذیب کی، میرے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے۔ ۵۳۰

حضرت ہارون علیہ السّلام

ہارونؑ کو موسیٰؑ کا وزیر بنا دیا۔

حضرت ہود علیہ السّلام

آپؑ کو یمن یا احقاف میں قوم عاد کی طرف مبعوث فرمایا۔ ۳۸۵
تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے، مَیں رسولِ امین ہوں، میری اطاعت کرو، میرا اجر اللہ کے پاس ہے۔ تم پر نزولِ عذاب سے ڈرتا ہوں ۵۲۳، ۵۲۴

یافث بن نوحؑ

یافث نے رودِ ارس کے کنارے صنوبر کا پودہ کاشت کیا تھا۔ اس نامی نہر کے کنارے بارہ شہر آباد تھے۔ ایرانی مہینوں کے نام انہی شہروں کے نام پر ہیں۔ ۳۸۷

عُلماء و دانشور

آلوسی مفسر (صاحب روح المعانی) ۳۴، ۲۶۶، ۶۰۷، ۶۸۳
ابن ابی الحدید معتزلی ۶۲۹
ابنِ منظور (صاحبِ لسان العرب) ۶۲۳
احمد امین مصری ۷۲۷
پرنک (پولینڈ کا سائنس دان) ۷۳۵
زرارہ (شاگرد امام جعفر صادقؑ) ۳۵

راغب ۳۲، ۳۴، ۸۱، ۹۷، ۱۵۵، ۱۹۰، ۲۷۰
۲۹۹، ۳۲۷، ۳۴۲، ۳۶۳، ۴۶۹، ۴۷۹
۵۰۲، ۵۱۲، ۵۲۳، ۵۳۷، ۶۹۳، ۷۱۹
زمخشری ۲۷۲
سیوطی ۲۸۹
طباطبائی، علامّہ (المیزان) ۲۹۱
طبرسی (علامّہ) ۱۹۰، ۲۰۴، ۲۶۶، ۲۸۹، ۳۰۶، ۳۱۶
۳۷۶، ۳۸۷، ۳۹۱، ۴۰۹، ۶۸۳، ۷۲۵
طوسی ۳۰۶، ۴۵۷
عبداللہ شبّر (سیّد) ۱۳۳
فخرالدین رازی ۳۴، ۳۰۶، ۳۸۷، ۵۶۸، ۶۲۴، ۶۳۰، ۶۳۱
فیض کاشانی ۳۰۶
قرطبی ۲۰۴، ۲۸۹، ۵۶۸، ۶۲۸، ۶۸۳
قطب (سیّد) ۲۸۹، ۳۱۶
کمال الدّین شیخ صدوقؒ ۴۵۸
گلیلیو اطالوی سائنسدان ۷۳۵
لینے (سویڈن کا ماہر نباتات) ۴۶۱
مجلسی (علامّہ) ۷۲۳
محسن امین عاملی (صاحبِ کاشف الدنیا) ۷۱۶
محمد بن عبدالوہاب (الہدایۃ السنیۃ) ۷۱۶
محمد رضا مظفر (عقائدِ امامیہ) ۷۲۷
مرتضےٰ (سیّد) جیّد شیعہ عالم ۷۲۵
مفید (شیخ) ۴۵۸
مقداد فاضل ۲۰۰
ویل ڈیورانٹ (مؤرخ) ۳۵

کُتبِ آسمانی

قرآنِ حکیم

ہمارے پاس کتاب ہے جو حق کہتی ہے ۸۹
کیا انہوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان کے لیے ہر بات ایسی تھی کہ ان سے پہلے لوگوں کو ہدایت نہ کی گئی تھی۔ ۹۴، ۹۵
ہم نے انہیں قرآن دیا ہے جو یاددہانی اور باعثِ شرف ہے۔ ۹۵، ۹۷
سُورۂ فرقان کے مضامین ۳۲۳
سُورۂ فرقان کے فضائل ۳۲۴
یہ تو وہی گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں ۳۳۲
کہہ دیجیے یہ اس نے نازل کیا جس کے پاس زمین و آسمان کے اسرار ہیں۔ ۳۳۲
یہ قرآن ایک ہی مرتبہ کیوں نہ نازل ہوا؟ ۳۷۵
پورے قرآن کا دوبار نزول ہوا، ایک بار شبِ قدر میں اور تدریجی نزول بائیس سال میں۔ ۳۷۹
قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھا کرو ۳۸۱
قرآن کے ذریعہ ان سے بڑا جہاد کیجیے ۴۰۷
قرآن ذریعۂ جہاد ہے ۴۱۴

قرآن روزِ روشن کی طرح نورانی، شبِ تاریک کی طرح تسکین دہ، ہوا کی طرح متحرک، ابر کی مانند عظیم اور قطراتِ باراں کی طرح حیات بخش ہے۔ ۴۰۹

سُورہ شعراء کے مضامین، عقائد توحید، معاد اور انبیاء کی دعوت الی اللہ۔ ۴۵۲

سُورۂ شعراء کی فضیلت ۴۵۳

کلام اللہ حادث ہے یا قدیم ۴۵۹

قرآن عالمین کے ربّ کی طرف سے روح الامین لے کر آئے تاکہ تم لوگوں کو ڈراؤ۔ پہلی کتابوں میں اس کا تعارف ہے۔ ۵۷۲ تا ۵۷۴

بنی اسرائیل کے عُلماء واقف ہیں، یہ عربی میں نازل ہوا۔ ۵۷۴

قرآن پاک پر تہمت۔ اسے شیاطین و جن نے نازل نہیں کیا۔ ۵۸۳ تا ۵۸۵

سُورہ نمل کے مضامین، حالاتِ انبیاء، مبداء و معاد، حضرت سلیمانؑ کے حالات ۶۰۴

سُورۂ نمل کے فضائل ۶۰۵

طٰسٓ۔ یہ قرآن و کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ مومنین کے لیے بشارت و ہدایت ہے، حکیم و دانا خدا کی طرف سے نازل ہوا۔ ۶۰۶

ان چیزوں کو بیان کرتا ہے جن میں بنی اسرائیل اختلاف کرتے ہیں۔ ۷۱۱

مومنین کے لیے ہدایت و رحمت، مجھے حکم ملا کہ قرآن کی تلاوت کروں۔ (رسُول پاکؐ) ۷۱۱، ۷۳۷، ۷۴۰

کُتُبِ تفسیر و تاریخ و سیر

احتجاج طبرسی ۶۲۳

احقاق الحق ۵۹۲

ارشاد (مفیدؒ) ۴۵۸

اُصولِ کافی ۱۶۸، ۱۷۳، ۲۲۰، ۲۲۲، ۳۲۳، ۳۳۹، ۳۸۲، ۳۸۸، ۴۴۹، ۵۲۳، ۵۷۸، ۵۷۹، ۶۰۲، ۶۱۸، ۶۳۰

اعلام القرآن ۳۸۶، ۵۰۳

الکنیٰ والالقاب ۶۰۲

الہدایہ والسنّیہ (محمد بن عبدالوہاب) ۷۱۶

امالی ۴۴۸

بحارالانوار ۱۳۱ تا ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰، ۳۰۳، ۳۷۴، ۵۲۱، ۵۵۵، ۵۸۰، ۶۵۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۸

تسلیۃ الفواد فی بیان الموت والمعاد ۱۳۳

ثواب الاعمال ۳۲۴

تفسیر اسباب النزول ۲۸۹، ۲۹۰

تفسیر البرہان ۳۵، ۳۲۶

تفسیر المیزان ۱۱۷، ۱۲۱، ۱۴۱، ۱۸۰، ۱۸۳، ۱۸۸، ۲۰۶، ۲۲۱، ۲۹۱، ۳۹۴، ۴۵۸، ۴۷۷، ۶۴۹

تفسیر تبیان ۲۷۹، ۳۰۶ تا ۳۰۸، ۳۵۷

تفسیر دُرِّ منثور ۳۰۶

تفسیر رُوح الجنان (ابوالفتوح رازی) ۱۲۱، ۱۲۲، ۴۵۶، ۴۷۶، ۴۷۷، ۷۲۴

تفسیر روح المعانی ۲۸، ۶۸، ۱۲۱، ۱۹۱، ۲۲۱، ۲۶۰، ۲۶۶، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۹، ۳۱۸، ۴۱۲، ۴۲۳، ۴۷۷، ۵۵۷، ۶۰۷، ۶۷۲، ۶۸۳

تفسیر صافی ۳۳، ۱۸۸، ۲۶۴، ۲۷۹، ۳۰۶، ۴۴۸، ۵۲۱، ۵۲۲

تفسیر علی بن ابراہیم ۲۲۲، ۳۱۶، ۳۶۵، ۳۹۳، ۴۴۴، ۴۴۸، ۵۲۲، ۷۲۲

تفسیر عیاشی ۶۶۳، ۷۱۳

تفسیر فی ظلال القرآن ۱۲۱، ۱۸۰، ۲۷۱، ۲۸۱، ۲۸۹، ۲۹۰، ۳۱۶، ۳۶۶، ۴۱۵، ۴۲۳، ۴۸۹

تفسیر قرطبی ۸۲، ۱۴۱، ۲۳۸، ۲۶۰، ۲۷۵، ۲۷۹، ۲۸۹، ۲۹۰، ۳۱۲، ۳۱۸، ۳۶۸، ۴۰۳، ۴۴۴، ۵۹۲، ۶۰۰، ۶۲۷، ۶۲۹، ۶۴۹، ۶۸۳

تفسیر قمی ۴۵۸

تفسیر کبیر (فخر رازی) ۳۳، ۱۲۱، ۱۶۶، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۷۳، ۳۰۶، ۳۸۷، ۴۳۵، ۴۴۴، ۵۳۶، ۵۵۷، ۶۵۳

تفسیر مجمع بیان ۲۷، ۳۴، ۴۲، ۱۲۱، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۶۸، ۱۸۰، ۱۹۰، ۲۱۰، ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۵۴، ۲۶۰، ۲۶۶، ۲۷۳، ۲۷۹، ۲۸۹، ۲۹۰، ۳۰۶، ۳۱۶، ۳۲۴، ۳۴۷، ۳۷۱، ۳۷۶، ۳۸۲، ۳۸۷، ۳۹۱، ۴۰۹، ۴۱۲، ۴۳۳، ۴۵۳، ۵۳۶، ۵۷۱، ۵۹۰، ۶۴۹، ۶۸۳، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۵

تفسیر مفاتیح غیب ۱۴۱، ۲۱۶، ۲۷۵، ۲۷۹، ۳۱۸

تفسیر نور الثقلین ۱۲۲، ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۷۵، ۱۸۰، ۱۸۸، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۳۱، ۲۳۸، ۲۴۲، ۲۵۴، ۲۵۷، ۲۷۹، ۲۸۷، ۳۰۶، ۳۰۹، ۳۱۶، ۳۳۹، ۳۵۶، ۴۲۶، ۴۳۲، ۴۳۸، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۵۸، ۵۲۳، ۵۸۱، ۵۹۰، ۶۰۱، ۶۲۳، ۶۲۷، ۶۶۳، ۶۸۸، ۶۹۸، ۶۹۹

جواہر الکلام ۳۰۴، ۳۱۰

جہان پس زمرگ ۱۳۳

دائرۃ المعارف ۲۷۱، ۵۴۶

رازِ آفرینش انسان ۳۳۱

روضۃ الکافی ۲۵۵، ۴۵۸

سفینۃ البحار ۲۴۰، ۲۷۳، ۲۷۵

سنن ابن ماجہ ۶۳۰

سیرت ابن ہشام ۴۱۵، ۵۹۱

سیرتِ حلبی ۶۲۹
شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) ۳۸۶، ۵۹۸، ۶۳۰، ۷۱۶
صحیح بخاری ۷۲۸، ۷۱۶
صحیح ترمذی ۶۳۰
صحیح مُسلم ۶۲۸
عقائد الامامیہ (شیخ محمد رضا مظفر) ۷۲۷
عوداراح ۱۳۳
عیون الاخبار الرضا ۳۸۷، ۳۸۸
فجر الاسلام (احمد امین مصری) ۷۲۷
فضائلِ صدوق ۳۷۴
کتابِ توحید ۲۴۹
کتاب الغدیر ۵۹۹
کتاب المراجعات ۵۹۲
کشف الارتیاب (سید محسن امین عاملی) ۵۱۸
کنز العرفان ۳۰۰، ۳۰۴
کنز العمال ۳۰۰
لسان العرب ۱۴۲، ۱۶۴، ۲۶۱، ۶۲۳
مجمع البحرین ۳۸۲
محاسن برقی ۵۲۳
مسند احمد حنبل ۵۹۹، ۶۰۰
مفردات راغب ۲۳، ۳۴، ۸۱، ۹۷، ۱۵۵، ۲۶۰، ۲۷۰، ۳۰۹، ۳۲۷، ۳۴۲، ۳۶۳، ۳۸۶، ۴۷۹، ۵۰۲، ۵۱۲، ۵۲۳، ۵۳۷، ۶۹۳، ۷۱۹
مناقب ابنِ شہر آشوب ۲۴۱
من لا یحضرہ الفقیہ ۲۲۱
نہج البلاغہ ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۳۰، ۲۰۰، ۳۴۳، ۳۹۵، ۴۵۸، ۵۷۹، ۶۵۲، ۷۱۶
وسائل الشیعہ ۸۰، ۱۰۱، ۱۷۴، ۱۷۶، ۲۱۰، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۳۰، ۲۳۲ تا ۲۳۶، ۲۴۱، ۲۴۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰، ۶۵۳

لُغاتِ قرآن

(ا)

اتقان: منظم و محکم بنانا ۷۳۵
اتیٰ: مادّہ 'اتی' اسم فاعل ہو یا مضارع ۶۶۱
اثیم: (اِثم بروزن اسم) گناہ گار ۵۹۴
اثم و آثام: جو اعمال ثواب تک نہیں پہنچنے دیتے، بعض کے نزدیک "اثم" گناہ اور آثام گناہ کی سزا۔ ۴۳۵
اجاج: کڑوا ۴۰۹
اربہ: 'ارب' (بروزن عرب) شدت احتیاج ۲۲۱
ارجہ: مادّہ 'ارجاء' فیصلہ میں تاخیر کرنا جلدی نہ کرنا۔ ۴۸۱
ازلفت: مادّہ 'زلفیٰ' (بروزنِ کبریٰ) قرب، نزدیکی ۵۱۸

استکانوا: مادّہ 'سکون' خشوع و خضوع کے عالم میں سکون ۱۰۵
اسطورہ: ایسی سطریں اور تحریر جو بطور یادگار رہ جائیں۔ ۱۱۳
اصنام: صنم کی جمع، مجسمہ، بُت ۵۰۷
اعقاب: عقب کی جمع۔ پاؤں کی ایڑی ۱۹۱
افاك: مادّہ 'افک' (بروزن پلک) بہت بڑا جھوٹ ۵۹۴
افتونی: مادّہ 'فتویٰ' صحیح فیصلہ کرنا ۵۵۱
افضتم: مادّہ 'افاضہ' زیادہ پانی نکلنا، پانی میں داخل ہونا، زیادہ شہرت۔ ۱۹۳
افك: بروزنِ 'فکر' وہ چیز مراد ہے جس کی اصلی اور طبعی حالت بدل جائے۔ جھوٹ، تہمت، بُہتان۔ ۱۳۰
افلح: صیغہ ماضی۔ پہلے ہی سے طے شدہ مومنین کی فلاح۔ ۳۸، ۲۳۶
امدّکم: مادّہ 'امداد' مسلسل و منظّم طور پر انجام شدہ اُمور۔ ۵۱۸
ابناء: بنا کی جمع۔ اہم خبر ۴۵۷
آنست: مادّہ 'ایناس' کسی چیز کو آرام سے دیکھنا۔ ۶۱۳
الفلق: مادّہ 'فلق' (بروزنِ فرق) پھٹ جانا، جُدا ہو جانا۔ ۵۰۰
اوزعنی: مادّہ 'ایزاع' الہام یا انحراف کو روکنا ۶۳۶

(ب)

باخع: مادّہ 'بخع' (بروزنِ بخش) شدتِ غم سے اپنے آپ کو مار ڈالنا۔ ۴۵۶
برزخ: پردہ، دو چیزوں کی درمیانی آڑ ۱۲۸، ۴۰۹
بشرًا: بشور (بروزنِ قبول) کی جمع بشارت دینے والا۔ ۴۰۴، ۶۹۷
بُشر: (بروزنِ عُشر) مبشر، بشارت دینے والا۔ ۴۰۴، ۶۹۷
بلدہ: بیابان و صحرا ۴۰۵
بور: بوار سے لیا گیا معنی کساد بازاری ۳۰۵
بھجہ: (بروزنِ لھجہ) پسندیدہ، زیبائش، رنگ۔ ۶۹۳

(ت)

تبخسوا: مادّہ 'بخس' ظالمانہ طور پر کسی کا حق گھٹا دینا۔ ۵۶۴
تتبیر: مادّہ 'تبر' (بروزن ضرب یا صبر)۔ ہلاک یا تباہ و برباد ہونا۔ ۳۸۵
تترا: مادّہ 'وتر'، لگاتار۔ وتر کمان کی وہ رسّی یا چمڑا جو دونوں سروں میں باندھا جاتا ہے۔ ۷۱
تحیّۃ: مادّہ 'حیات' مراد سلامٌ علیکم یا سلامٌ علینا۔ ۳۱۲، ۳۱۳

تدمیر: مادّہ 'دمار' تعجب خیز ہلاکت ۳۸۴
ترتیل: مادّہ 'رتل' (بروزنِ قمر) منظم و مرتب ۳۸۱
تشهدون: مادّہ 'شهود' ایسی موجودگی جو تعاون اور مشورہ پر مشتمل ہو۔ ۶۵۰
تصطلون: مادّہ 'اصطلاع' آگ تاپنا ۶۱۴
تضرع: مادّہ 'ضرع' پستان، اس نے دودھ دوہا، خضوع، انکساری۔ ۱۰۵
تطیر: مادّہ 'طیر' پرندہ، مراد بدشگونی ۶۷۷
تعبثون: مادّہ 'عبث' بے مقصد کام ۵۳۵
تعصب: مادّہ 'عصب' چربی جو اعضاء کے جوڑوں کو مربوط رکھتی ہے۔ ارتباط ۵۷۷
تغیظ: غصّہ جس میں چیخ و پکار بھی ہو۔ ۳۴۶
تکن: مادّہ 'کن' (بروزنِ جن) کسی چیز سے دوسری کو چھپانا۔ اسرار و رموز ۷۰۸
تلفح: مادّہ 'لفح' (بروزنِ فتح) تلوار کی ضرب ۱۴۱
تلقف: مادّہ 'لقف' (بروزنِ سقف) کسی چیز کو جلدی جلدی پکڑنا۔ ۴۸۸
تنکصون: مادّہ 'نکوص' پیچھے ہٹنا ۹۲
توکل: مادّہ 'وکالت'۔ خدا کو وکیل بنانا ۷۱۵
تهجرون: مادّہ 'ہجر' (بروزنِ فجر) جدائی اختیار کرنا
مادّہ 'ہُجر' (بروزنِ کُفر) گالی دینا ۹۲

(ث)

ثبورا: چیخ۔ ہائے میں مرگیا ۳۴۷
ثعبان: مادّہ 'ثعب' پانی کا چلنا، مراد سانپ جو پانی کی طرح لہرا کر چلتا ہے۔ ۴۷۹

(ج)

جاؤا: مادّہ 'مجی' آنا، مگر یہاں اس کے معنی لانا ہیں۔ ۳۳۵

(ح)

حاذرون: مادّہ 'حذر' سازشوں سے خطرہ بیداری، تیاری۔ ۴۹۵
حاشرین: مادّہ 'حشر' میدانِ مقابلہ میں لوگوں کو تیار کر کے لانا۔ ۴۸۲
حبال: حبل (بروزنِ طبل) کی جمع۔ رسّی ۴۸۸
حجر: (بروزنِ قشر) علاقہ جس کے اردگرد پتھر چُن دیے ہوں۔ عقل۔ ۳۶۱
حجراً محجورا: خوفزدہ ہو کر پناہ چاہنا ۴۰۹،۳۶۲
حدائق: حدیقہ کی جمع، چاردیواری والا باغ ۶۹۳
حسب: بزرگوں سے حاصل شدہ افتخار، اپنے عادات و اخلاق ۱۴۲
حُشر: مادّہ 'حشر' (بروزنِ قشر) کثیر تعداد کو ٹھکانوں سے نکال کر میدان (جنگ) کی طرف لے جانا۔ ۷۱۰،۶۳۴
حلم: (بروزنِ کُتُب) عقل، بلوغ، خواب دیکھنا ۲۰۰

(خ)

خاویه: مادّہ 'خوا' (بروزنِ ہوا) سقوط، ویرانی، خالی ہونا۔ ۶۸۴
خبأ: (بروزنِ صبر) ہر مخفی و پوشیدہ چیز ۶۴۳
خذول: صیغۂ مبالغہ۔ بار بار چھوڑنے والا ۳۷۳
خرج: خراج سے زیادہ وسیع معنی۔ خراج بمعنی مالیاتِ زمین۔ ۹۷
خلال: دو چیزوں کا درمیانی شگاف ۶۹۴
خلق: عادت، روش ۵۴۱
خمر: 'خمار' (بروزنِ حجاب) کی جمع۔ چھپانے والی چیز۔ ۲۲۳

(ذ)

ذرأکم: مادّہ 'ذر' (بروزنِ زرع) تخلیق، ایجاد، اظہار
مادّہ 'ذرو' (بروزنِ زرع) منتشر کرنا ۱۰۷

(ر)

ربوه: مادّہ 'ربا' افزائش، بہتات، بلند جگہ ۷۷
ردف: (بروزنِ حرف) کسی چیز کے پیچھے ہونا، گھوڑے کا پچھلا سوار 'ردیف' کہلاتا ہے ۷۰۷
رکام: (بروزنِ غلام) تہ در تہ چیزیں ۲۷۰
رواسی: راسیہ کی جمع۔ ٹھہرا ہوا۔ برقرار ۶۹۴
رهط: دس یا چالیس سے کم افراد کی جماعت ۶۸۰
ریع: بلند جگہ ۵۳۵

(ز)

زبر: 'زبرہ' (بروزنِ لقمہ) کی جمع، تمام اُمتوں کے مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔ ۸۳
زُبر: زبور کی جمع، مُراد کتاب (بروزنِ ابر) لکھنا ۵۷۴
زجاجه: فانوس ۱۵۱
زفیر: سانس اندر کھینچنے سے پسلیوں کا اُبھرنا۔ غصّہ کی حالت۔ ۳۴۷
زور: (بروزنِ کور) اصل میں زَوَر (بروزنِ غور) سینہ کا بالائی حصہ۔ مراد اعتدال سے ہٹی ہوئی چیز۔ 'جھوٹ' ۳۳۵

(س)

سامراً: مادّہ سمر (بروزنِ ثمر) رات کی باتیں سیاہی آمیز روشنی۔ ۹۳
سباتا: مادّہ 'سبت' کاٹ دینا۔ راحت و آرام ۴۰۲
سجّداً: سجد۔ ساجد کی جمع، سجدہ کرنا ۴۳۰
سراب: مادّہ 'سرب' (بروزنِ حرب) اُوپر جانے کا راستہ (بروزنِ شرف) اُوپر جانا۔ ۱۶۱

سعر : (بروزنِ قعر) بھڑکتی ہوئی آگ ۳۴۶
سلالۃ : (بروزنِ عصارہ) کسی چیز کا نچوڑ، جوہر ۴۱
سلیم : مادّہ 'سلامت'، اخلاقی واعتقادی
بے راہ روی سے پاک۔ ۵۲۰
سورہ : مادّہ 'سور'، عمارت کی بلندی ۱۶۴

(ش)

شرذمۃ : چھوٹا گروہ، پس ماندہ یا کم ہونا پراگندگی ۴۹۵
شقوۃ : شقاوۃ، سعادۃ کی ضد، دامن گیر ہونے والی
آفت ومصیبت۔ ۱۴۹
شہاب : روشنی جو آگ کے ستون کی مانند چمکتی ہے ۶۱۴

(ص)

صرح : (بروزنِ طرح) وسیع فضا، بلند وبالا
عمارت، محل کا دالان ۶۴۰

(ط)

طلع : مادّہ 'طلوع'، کھجور کے پھل کا پہلا شگوفہ
جو سر نکالتا ہے۔ ۵۴۴
طوافون : (مادّہ طواف)۔ آنا جانا ۳۰۰
طور : بہت بڑا پہاڑ ۵۰۰
طیّب : لذّت بخش، حلال وپاک اشیاء ۸۱

(ظ)

ظلّۃ : سایہ کرنے والا بادل کا ٹکڑا ۵۶۸
ظہیرا : دوسرا اور رُو دِ ظہر ۲۹۹

(ع)

عادین : شمار کرنے والے (غالباً فرشتے مراد ہیں) ۱۵۳
عاکف : مادّہ عکوف، کسی چیز کی طرف توجّہ کرنا ۵۰۷
عتو : (بروزنِ غلو) اطاعت سے نافرمانی جس
میں دشمنی اور ہٹ دھرمی بھی شامل ہو۔ ۳۶۱
عذب : خوشگوار، ٹھنڈا، پاکیزہ ۴۰۹
عرش : اونچے پایوں والا تخت ۱۱۳
عشیرۃ : عشرہ (دس) سے مشتق، قریبی رشتہ دار ۵۸۷
عصبہ : (بروزنِ غصّہ) اعصاب۔
ہم فکر جماعت۔ ۱۹۱
عصی : عصا کی جمع ۴۸۸
عفریت : مغرور، سرکش، خبیث ۶۶۱
عقد مکاتبہ : غلام کی آزادی کا شرائط نامہ ۲۴۲
عقروا : 'عقر' (بروزنِ فضل) سر یا پاؤں کاٹنا ۵۴۹
عورہ : مادّہ 'عار' عیب، آلۂ جنسی کا ظاہر نہ ہونا،
دیوار یا لباس کا سوراخ۔ ۲۹۹

(غ)

غاشیۃ : ہر چیز جو حس سے مخفی ہو ۷۰۹

غاوون : مادّہ 'غی'، ہر قسم کی گمراہی ۵۲۳
غثاء : بھوسہ، پانی پر تیرتی ہوئی جھاگ، تنکے،
اُبلتی ہوئی دیگ کی جھاگ وغیرہ۔ ۶۸
غرام : مادّہ 'غرم'، ایسی مصیبت جس سے
چھٹکارہ مشکل ہو، جیسے غریم بمعنی قرض خواہ ۴۳۰، ۴۳۱
غمام : مادّہ 'غم'، کسی چیز کا چھپانا، بادل جو
آسمان کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ ۳۶۶
غمرہ : (بروزنِ ضربہ) کسی چیز کا اثر ختم کرنا۔
زیادہ پانی جو راستہ بنا کر آگے نکل جائے۔ ۸۴
غیر اولی الاربۃ من الرّجال : جنسی خواہش
نہ رکھنے والے مرد۔ ۲۳۱

(ف)

فارہ : مادّہ 'فرہ' (بروزنِ فرح) جہالت اور
ہوس پر مبنی خوشی۔ ۵۴۴
فال : 'تفعل'، نیک فال ۶۷۷
فتنہ : قتل۔ گمراہی کا وسیع مفہوم ۳۹۹
فرات : مزہ دار، میٹھا ۴۰۹
فرض : یقین، قطع ۱۶۴
فرقان : قرآن، حق وباطل میں امتیاز
کرنے والے معجزات ۳۲۵، ۳۲۶
فروج : فرج کی جمع، افزائش نسل کی طرف اشارہ ۳۴
ففزع : 'فزع'، خوف ووحشت ۷۳۳

فلاح : کامیابی ومقصود تک پہنچنا، چیرنا
رکاوٹوں کو چیر کر کامیاب ہونا۔ ۲۸۶
فوج : جلدی جلدی چلنے والا گروہ ۷۱۹
فوز : سلامتی کے ساتھ کامیابی ۲۸۶

(ق)

قالین : 'قال' کی جمع، رُوح میں اُتر جانے
والی عداوت۔ ۵۵۸
قبس : (بروزنِ قفس) شعلہ جو آگ سے
الگ کیا جا سکے۔ ۶۲۴
قدمنا : قدوم سے ہے، وارد ہونا، تلاش
میں نکلنا۔ ۳۶۳
قذف : (بروزنِ حذف) لمبی چھلانگ،
دُور پھینکنا۔ ۱۷۶
قُرّ : (بروزنِ حُر) سرد، خنکی، راحت ۴۴۳
قرن : مادّہ 'اقتران'۔ قرون کا واحد قریب،
ہمعصر قومیں، مدّت ۴۰ یا ۱۰۰ سال ۳۸۵، ۴۴
قسطاس : (بروزنِ مقیاس) ترازو ۶۶۲
قواریر : قارورہ کی جمع۔ بلور، شیشہ ۶۷۰
قوام : (بروزنِ عوام) میانہ روی، اعتدال ۴۳۲
قیام : قائم کی جمع ۴۳۰
قیعہ : وسیع وعریض، بے آب وگیاہ زمین ۲۶۰

(ک)

کالح : مادّہ 'کلوح' (بروزن غروب) چہرہ سکڑنا ۲۴۰
کبت : مادّہ 'کب' (بروزن جد) کسی چیز کو اوندھے منہ زمین پر ڈالنا۔ ۷۳۹
کبکبوا : مادّہ 'کب' منہ کے بل گڑھے میں ڈالنا، جہنّم میں جھونکنا۔ ۵۱۹
کسف : کسفہ کی جمع ٹکڑا، آسمان سے برسنے والے پتّھروں کے ٹکڑے۔ ۵۶۷
کلّا : ہرگز نہیں، مثبت کی ضد ۱۲۷

(ل)

لا تخزنی : مادّہ 'خزی' (بروزن حزب) شرم ساری۔ ۵۱۴
لجہ : مادّہ 'لجاج' کسی کام کی انجام دہی میں سختی کرنا۔ ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجیں ۶۷۰
لغو : فعل بے مقصد، بے نتیجہ گفتگو، باطل گناہ جھوٹ، گالی، گانا، شرک۔ ۳۳
لواذًا : 'ملاوزہ' چھپنا، نظر بچا کر بھاگنا ۳۱۹

(م)

ماءطھوںا پاک و پاکیزہ کرنے والا پانی ۴۰۴
مبصر : دیکھنے والا۔ ۷۳۲
مبلس : مادّہ 'ابلاس' شدید، پُرغم و اندوہ واقعہ۔ ۱۵۰
مبین : مادّہ 'بیان' روشن
مادّہ 'ابانہ' واضح و آشکار ۴۸۰، ۶۰۷
متاب : مصدر میمی اور توبہ کے معنی میں ہے ۴۳۸
مخسر : خسارہ اٹھانے والا۔ ۵۶۴
مرج : مادّہ 'مرج' (بروزن طلیح) ملانا مخلوط کرنا ۴۰۹
مستقر : قرارگاہ، ٹھکانہ ۳۶۵
مسحر : جس پر کئی بار سحر کرکے اس کی عقل بیکار کر دی جائے۔ ۵۶۷
مشجون : مادّہ 'شجن' (بروزن صحن) پورے وجود میں بھر جانے والی دشمنی ۵۳۲
مشفق : مادّہ 'اشفاق و شفق' روشنی جس میں تاریکی ملی ہوئی ہو۔ ۸۷
مشکوٰۃ : سوراخ۔ چراغ رکھنے کے لیے دیوار میں بنایا ہوا طاق۔ ۲۵۰
مصانع : مصنع کی جمع، خوبصورت و پختہ مکان ۵۳۶
مصباح : چراغ ۲۵۰
معین : مادّہ 'معن' (بروزن شأن) جاری پانی۔ مادّہ 'عین' جو پانی آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ ۷۸
مقرنین : مادّہ 'قرن' رسّی جس سے کئی چیزوں کو اکٹھا باندھا جائے۔ ۳۴۷

مقیل : دوپہر کے وقت آرام (قیلولہ) کرنے کی جگہ ۳۶۵
ملحٌ : نمکین ۴۰۹
ملک : (بروزن گرگ) کسی شے پر اختیار و حاکمیت (بروزن سلک) ہر موقعہ پر ہمیشہ دلیل ملکیت نہیں ہے۔ ۳۲۷
ممرد : صاف شفاف ۶۷۰
موازین : میزان کی جمع، ترازو، ناپ تول کی چیز ۱۴۰

(ن)

ناقہ : اونٹنی ۵۴۸
نسقیہ : مادّہ 'اسقی' پانی تیّار رکھنا اور کسی کے اختیار میں دے دینا ۴۰۵
نشور : مادّہ 'نشر' کھولنا، واضح کرنا ۴۰۳
نفخ فی الصّور : بگل بجانا ۱۳۸
نمد : مادّہ 'امداد' مدّ، کسی چیز کے نقصان کو پورا کرنا ۸۷

(و)

ورق : (بروزن شرق) بارش کے قطرے ۲۷۰

(ھ)

ھباء : غبار کے بہت باریک ذرّات ۳۶۳
ھزو : مصدر، مگر یہاں مفعول کے معنی میں (مذاق اڑانا) ۲۹۱
ھضیم : مادّہ 'ہضم' اندر گھسی ہوئی چیز ۵۴۴
ھون : مصدر، نرمی و آہستگی ۴۲۸

(ی)

یاتل : مادّہ 'الیۃ' (بروزن عطیۃ) قسم کھانا ۲۰۵
یافکون : 'افک' (بروزن کذب) جھوٹ جھوٹے کرشموں کی طرف اشارہ ۴۸۸
یتسللون : مادّہ 'تسلل' کسی چیز کو اس کی جگہ سے الگ کرنا۔ نیام سے تلوار نکالنا۔ ۳۱۹
یرمون : 'رمی' تیر یا پتّھر پھینکنا۔ اذیّت ناک الزام۔ ۱۷۴
یزجی : مادّہ 'ازجاء' بہت سی چیزوں کو ایک جگہ کرکے آہستہ آہستہ چلانا جیسے بادل۔ ۲۷۰
یسارعون : ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں جلدی کرنا۔ ۸۸
یعدلون : 'عدول' حق سے باطل کی طرف لوٹنا 'عدل' (بروزن قشر) برابر، مشابہ، نظیر ۶۹۴
یعض : مادّہ 'عض' (بروزن سد) دانتوں سے کاٹنا۔ ۳۷۱
یغیضوا : مادّہ 'غض' (بروزن حز) کم کرنا نقصان کرنا۔ ۲۲۱
یقتروا : "اقتار" حق اور ضروری مقدار سے کم خرچ کرنا۔ ۴۳۱

یلقون : مادّہ 'القاء' خبروں اور مطالب کو منتقل کرنا ۵۹۵

یوزعون : مادّہ 'وزع' (بروزن جمع) لشکر کے اگلے حصّہ کو روکنا۔ ۶۳۴، ۷۱۹

یھیمون : مادّہ 'ھیام' (بروزن قیام) بے مقصد چلنا پھرنا۔ ۵۹۶

متفرق موضوعات

آسان شادی بیاہ کی ترغیب

غیر شادی شدہ مردوں عورتوں کی شادی کر دو غلاموں اور کنیزوں کی بھی، مال سے تعاون کرد اللہ تعالیٰ غنی کر دے گا۔ یہ پرہیز گاروں کیلئے نصیحت ہے۔ ۲۲۵ تا ۲۲۹

آسمانی بُرج

با برکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بُرج بنائے۔ ۴۲۲ تا ۴۲۶

آیت میں 'ماء' سے مراد

بعض کے بقول نطفہ، بعض نے عام پانی مراد لیا ہے۔ ایک سوال کا جواب، زندگی کی مختلف صورتیں۔ ۲۷۳ تا ۲۷۶

آیت نُور

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، نورِ خدا کی مثال روشن چراغ کی سی ہے۔ متعدد تفسیرات و نکات۔ ۲۴۴ تا ۲۵۸

اچھے اور بُرے لوگ اپنے جیسوں میں خوش رہتے ہیں

بدطینت عورتیں بدکردار مردوں کے لیے، پاکیزہ عورتیں پاک مردوں کے لیے مناسب ہیں۔ ۲۰۹ تا ۲۱۲

اس دُنیا کی عمر تھوڑی ہے

زمین میں کتنے برس رہے، ایک دن یا کم، ہاں تھوڑا ہی عرصہ، کاش تم جان لیتے کہ تمہیں ہماری طرف پلٹ کر ہی آنا ہے۔ ۱۵۱ تا ۱۵۵

اسراف اور فساد فی الارض

اسراف کے بہت سے معنی ہیں مگر ان سب کا نتیجہ فساد فی الارض ہے۔ ۵۴۵، ۵۴۶

اصحاب الرّس

اصحاب الرّس کا تعارف (ملاحظہ ہو اقوام سابقہ) ۲۰۶

❖

اصمعی کی دل ہلا دینے والی داستان

امام علی بن الحسینؑ رات کو غلافِ کعبہ پکڑ کر آہ و زاری سے دعائیں اور اشعار پڑھ رہے تھے ۱۴۲ تا ۱۴۵

اکثریت حق کی طرف نہیں ہوتی

آیاتِ قرآن، اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔ اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، اکثر ایمان نہ لائیں گے، اکثر لوگ انکارِ حق کرتے ہیں۔ وغیرہ ۱۰۰ تا ۱۰۲

اگر قرآن کسی عجمی پر نازل ہوتا

عرب اسے ہرگز قبول نہ کرتے، عجمیوں کا قبول و فضیلت۔ ۵۷۵، ۵۷۶

امانت

امانت کا تحفّظ اور ادائے امانت ۳۶

انبیاء کی دعوت ہم آہنگ ہے

تمام انبیاءؑ، توحید، تقویٰ اور غور و فکر کی دعوت دیتے رہے۔ ۵۶۹

اندھے بہرے آپکی بات نہیں مانیں گے

نابینا آنکھوں اور ناشنوا کانوں والے آپ کی بات نہ سُنتے ہیں نہ مانتے ہیں، قبولِ حق کے لیے بیدار عقل کی ضرورت ہے۔ ۷۱۱ تا ۷۱۴

ان سازشوں سے نہ گھبرائیں

روئے زمین پر چل پھر کر بدکاروں کے انجام کی نشانیاں دیکھ لو، عذاب کے وعدہ کا کچھ حصّہ شاید تمہارے قریب ہی ہو۔ ۷۰۴ تا ۷۱۰

ایک باغی قوم کا انجام

نوحؑ کا اپنے رب کو پکارنا، کشتی بنانے کا حکم، تنور سے پانی اُبلا، ہر چیز کا جوڑا کشتی میں سوار کیا۔ اللہ کی حمد، بابرکت جگہ پر اُتارنا، تُو بہترین پار لگانے والا ہے، نجاتِ نوحؑ اور ظالموں کی سزا میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے۔ ہم سب کی آزمائش کریں گے۔ ۵۸ تا ۶۱

ایک بہت بڑی تہمت

جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا وہ تم لوگوں میں سے تھے۔ بڑی تہمت پر کیوں خاموش رہے ۱۹۰ تا ۱۹۴

ایک عمومی انجام

ظالم رحمتِ پروردگار سے دُور ہیں۔ ۱۱۹

❖

اعمالِ صالح کی تباہی

مشرکین کے اعمالِ صالح بھی غبار کی طرح بے قیمت ہوں گے۔ ۳۶۳

ریا و تکبّر کے سبب اعمالِ صالح اکارت جائیں گے۔ ۳۶۴

ایمان آزادی کے ساتھ سُودمند ہے

اجباری دین قبول نہیں ہے ۴۵۸، ۴۵۹

بخل و فضول خرچی

بخل و فضول خرچی دونوں مذموم عادات ہیں ۴۲۳

برائیوں کی اشاعت ممنوع

اگر مومن ہو تو ہرگز ایسے کام کی تکرار نہ کرنا۔ اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تمہیں سخت سزا ملتی۔ ۱۹۵، ۱۹۷

بہت سے چوپائے اور انسان

بالخصوص خانہ بدوشوں اور ان کے چوپاؤں کا بارش کے پانی سے استفادہ کرنا۔ ۴۰۵

بھلائیوں میں سبقت کرنے والے

اپنے رب کے خوف سے کانپتے ہیں، اس کی نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں، راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں، نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ ۸۶، ۸۷

بے پردگی و بیحیائی کے خلاف اقدام

مردوں عورتوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم، عورتوں کو ہر قسم کی زینت کو نامحرموں سے چھپانے کا حکم۔ ۲۱۹ تا ۲۲۵

بیوی پر تہمت لگانے کی سزا

مرد اپنے لگائے ہوئے الزام پر چار مرتبہ شہادت اور پانچویں بار جھوٹ کی صُورت میں اپنے لیے لعنت کا مطالبہ کرے۔ عورت بھی اپنے دفاع میں چار مرتبہ اپنی عصمت کی گواہی دے اور پانچویں دفعہ جھوٹی ہونے کی صورت میں اپنے کو غضبِ خدا کا مستحق قرار دے۔ ۱۸۰ تا ۱۸۲

پردہ کا فلسفہ

عورتوں کی عُریانی و آرائش مردوں کے لیے جنسی تحریک کا سبب، مخالفین پردہ کے اعتراضات، چہرہ و ہاتھوں کا استثناء و محارم ۲۲۵ تا ۲۳۳

٭

پہلے زمینوں کا ذکر

مُردہ زمین، چوپائے اور انسانوں کا پانی سے استفادہ ۴۰۶

پیغمبروں کا رہن سہن

پیغمبرانِ ماسبق بھی کھاتے پیتے اور بازاروں میں جاتے تھے۔ ۳۵۷

تراب و عظام کا مفہوم

مرنے کے بعد مٹی اور ہڈیاں اور مختلف مطالب ۶۸

ترتیلِ قرآن

ترتیل کے معنی اور افادیت ۳۸۰، ۳۸۱

تکبّر

مشرکین غرور، تکبّر اور خود پسندی کا شکار ہو گئے ۳۵۸

توحید سے انحراف کیوں؟

اس لیے کہ مشرکین کو نعماتِ دُنیا سے نوازا مگر انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ ۳۵۴

تہمت کی سزا

پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے والے گواہ پیش نہ کر سکیں تو اسّی کوڑے لگائے جائیں، ان کی گواہی نامقبول، مگر جو توبہ کر لیں۔ ۱۷۲، ۱۷۴

جادوگروں کی آمد

مقابلہ کے لیے تیار ہو کر آئے، کامیابی پر فرعون سے اجر کی بات، روزِ عید کو مقابلہ کا وعدہ ہوا۔ ۴۸۳ تا ۴۸۵

جادوگر ایمان لے آئے

وعدہ کا دن، مقابلہ، عصٰی اژدہا بن گیا، سانپوں کو نگل گیا، ساحر سجدہ میں گر گئے، عالمین اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لے آئے۔ ۴۸۶ تا ۴۹۲

جانوروں سے زیادہ گمراہ

خواہشاتِ نفس کی پیروی تقاضائے عقل کے خلاف اور گمراہی کا سبب ہے۔ ۳۹۷، ۳۹۸

جزا و سزا استحصال کے مطابق

جیسے تم چاہتے ہو کہ اللہ تمہاری لغزشیں معاف کر دے، تم بھی دوسروں کی کوتاہیوں سے اسی طرح صرفِ نظر کرو۔ ۲۰۲ تا ۲۰۸

٭

جس روز رشتہ داریاں ختم ہوجائیں گی

آخرت میں خاندان وقبیلہ کے تعلقات ختم ہو جائیں گے، صرف عمل سے تعلق ہوگا اور عمل ہی کام آئے گا۔ ۱۴۱، ۱۴۲

جنّت و دوزخ کا موازنہ

ایک طرف سراسر راحت وآرام، دوسری طرف عقوبت وتکلیف۔ ۴۴۵ تا ۴۴۸

جن گھروں میں جاکر کھانا جائز ہے

باپ، دادا، بھائی۔ گیارہ گھروں کی تفصیل ۳۰۶ تا ۳۰۹

جہالت میں غرق دل

ان کے شرمناک اعمال کی بنیاد، ان کے دلوں کا جہالت میں ڈوب جانا ہے، وہ غافل ہیں، معذب ہوں گے، ان کی مدد نہیں کی جائیگی۔ ۹۰ تا ۹۳

جہاں پاکدامنی عیب بن جاتی ہے

لُوطؑ اور آلِ لُوطؑ کو بستی سے باہر نکالو، یہ پاک بنتے ہیں ۶۸۷ تا ۶۹۰

حق بینی وایمان

خداوندا! ہمیں حقائق وموجودات کو ایسے ہی دکھا جیسے وہ ہیں۔ (دعائے معصومینؑ) ۶۱۰، ۶۱۱

حق پرستی وخواہش پرستی

اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہوجائے تو زمین وآسمان بھی درہم برہم ہوجائیں۔ ۹۸، ۹۹

خدا کے بندوں کی صفات

تکبّر نہیں کرتے، رات کو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، بخل کی بجائے اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ ۴۲۸ تا ۴۳۲

شرک، قتل، زنا کے مرتکب نہیں ہوتے، توبہ کرتے ہیں عملِ صالح انجام دیتے ہیں۔ ۴۳۴ تا ۴۳۷

جھوٹی گواہی، باطل محافل میں شرکت سے گریز کرتے ہیں۔ بے سمجھے بوجھے آیاتِ خدا پر گر نہیں پڑتے، اہل وعیال کی نیک تربیت کرتے ہیں، ان کا اجر بہشتِ بریں ہے۔ ۴۴۱ تا ۴۴۶

خدا مختلف طریقوں سے بیدار کرتا ہے

ہماری مہربانی پر بھی وہ سرکشی پر اڑے رہے، سخت حوادث کا بھی ان پر اثر نہیں ہوتا۔ ۱۰۴، ۱۰۸

خداوندا لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا

رسُولِ پاکؐ کا استغاثہ! گویا آج بھی آپؐ یہ استغاثہ فرما رہے ہیں۔ ۳۷۶

دابّۃ الارض

معنی ومفاہیم۔ جناب امیرؑ کا لقب، متعدد روایات واحادیث۔ ۴۲۱ تا ۴۲۴

دائمی اور عارضی شریکِ حیات

بیوی، کنیز اور لونڈی (خاص شرائط کے ساتھ) ۳۷

درسِ عبرت سے لاپرواہی

برباد شُدہ بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھ کر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ ۳۸۴ تا ۳۸۶

دُعاء۔ خودسازی وخداشناسی کا راستہ

دُعا کی تاکید، اہمیت اور شرائط دُعا، متعدد احادیث ۴۴۸ تا ۴۵۰

دو مختلف سمندر ساتھ ساتھ

میٹھے، کڑوے، ہلکے وبھاری پانی ساتھ ساتھ۔ ان کا تفاوت وحد بندی۔ ۴۰۸ تا ۴۱۲

دین اور سیاست

دین سیاست سے جدا نہیں، ان سے ایک دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔ ۶۲۴، ۶۲۵

دیوانگی کی تہمت

یہ رسُول تو پاگل ہے، میں تمہیں قید کردوں گا ۴۷۵ تا ۴۷۷

رجعت کتاب وسُنت کی روشنی میں

رجعت بنیادی شرائط اسلام سے نہیں، فلسفۂ رجعت، متعدد کُتب واحادیث کے حوالے سے ۷۲۴ تا ۷۳۰

رحمِ مادر میں ارتقاء کا آخری مرحلہ

"ثُمَّ انشاناہ خلقاً آخر" تخلیق کے ساتھ پرورش کو بھی ظاہر کرتا ہے، نفخِ رُوح کے ساتھ جنین حرکت کرتا ہے۔ ۴۴، ۴۵

رحمِ مادر میں ارتقائی مراحل

انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، نطفہ کو رحم میں محفوظ کیا، پھر علقہ، مضغہ، ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا اور ان پر گوشت چڑھایا۔ ۴۰ تا ۴۴

رسُول اللہؐ کو تنہا نہ چھوڑو

جب رسُولؐ کے پاس کوئی اجتماع یا اجتماعی امور پیش ہو تو اجازت لیے بغیر نہ جاؤ ۳۱۶ تا ۳۲۰

رہبر کی صفات

ہادیانِ برحق مکتبِ حق کی ترویج کے لیے کوشش کرتے ہیں، اگرچہ لوگوں کو ناپسند ہی ہو۔ ۹۹

زانی کی سزا موت

شادی شدہ مرد و عورت، زنا بالجبر، محرم نیز دوسری عورتوں سے زنا کی سزا بھی موت ہے ۔ ۱۶۸

زانی مرد و عورت کی سزا

مومنین کی جماعت کے سامنے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ، اس کے اجراء میں ترس نہ کھاؤ، اس سے قبل زنا کی سزا عمر قید تھی۔ ۱۶۴

زمین کی حرکت

قرآن کا ایک سائنسی معجزہ، ہم نے دن رات بنائے، تم پہاڑوں کو ساکن دیکھتے ہو۔ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں ۔ ۴۲۱، ۴۲۶

سائے کی حرکت

سائے کا گھٹنا بڑھنا، دن رات کی آمد و رفت ۴۰۰ تا ۴۰۵

سب اس کی تسبیح کرتے ہیں

زمین و آسمان کی ہر چیز، فضا میں پر پھیلائے پرندے اس کی تسبیح کرتے ہیں، اپنے طریقۂ نماز و تسبیح کو جانتے ہیں، سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔ ۲۶۳، ۲۶۷

سب ایک اُمّت ہیں

پاک غذا کھاؤ، تم سب ایک ہی اُمّت ہو لوگوں نے اختلاف کیا، ہر گروہ اپنے حال میں خوش ہے، انہیں غفلت میں رہنے دو۔ ۷۸ تا ۸۴

سراب جیسے اعمال

کافروں کے اعمال سراب ہیں، شدّت پیاس میں ادھر دوڑتے ہیں، یا گہرے سمندر کی تاریکی ہے کہ اپنا ہاتھ دکھائی نہیں دیتا ۔ ۲۵۹ تا ۲۶۲

سرکش اقوام اور ان کا انجام

ان کے بعد اور قومیں پیدا کیں، وقت آنے میں تاخیر نہیں ہوتی، پیغمبر بھیجے، انہیں جھٹلایا سب کو جھٹلایا کر دیا۔ رحمتِ خدا سے دُور ہوئے۔ ۷۱ تا ۷۳
ایکہ والوں نے حضرت شعیبؑ کو جھٹلایا، مستحق عذاب ہوئے، مقامِ عبرت ہے ۔ ۵۶۷، ۵۶۹

سُورۂ مومنون کے فضائل

قاری سُورہ کو فرشتے روزِ قیامت روح و ریحان کی بشارت دیں گے، ملک الموت خوشخبری سنائے گا، سعادت پر خاتمہ ہوگا ۔ ۲۷

سزا و گناہ میں مناسبت

سزائیں اس دُنیا میں اور مرنے کے بعد بھی گناہوں کے اعتبار سے ملتی ہیں ۔ ۱۴۵، ۱۴۶

سُورۂ مُومنون کے مضامین

مُومنین کی فلاح و کامیابی، توحید و ایمان باللہ، نوحؑ، ہودؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی سوانح، مغرور طاقتیں قیامت، حساب، اللہ کی حاکمیت ۔ ۲۹

سُورہ مومنون کے فضائل

قاری سُورہ کو فرشتے روزِ قیامت روح و ریحان کی بشارت دینگے ۔ ملک الموت خوش خبری سنائے گا ۔ سعادت پر خاتمہ ہوگا ۔ ۲۷

سُورۂ نُور کے فضائل

قاریِ سُورہ کو گذشتہ و آئندہ مومنین و مومنات کی تعداد کے برابر نیکیاں بطور اجر ملیں گی ۔ (رسُول پاکؐ) ۱۶۱

سُورہ نور کے مضامین

پاک دامنی و عفت، جنسی بے راہ روی کے خلاف جہاد کے چھ مراحل ۱۶۱

شرک دُنیا کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے

تعدد کا لازمہ ہمیشہ ایک قسم کا اختلاف و تفاوت ہے ۔ ۱۱۶ تا ۱۱۸

شرک و کفر

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنا لیا ۳۳۲
وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتیں ۔ ۴۰۷
شرک سب برائیوں کی جڑ ہے ۔ ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، نوحؑ کی اقوام شرک میں مبتلا تھیں ۔ ۵۷۰، ۵۷۱

شعراء

شعراء عموماً ناؤ نوش کے رسیا، خال و زلف کے اسیر، گمراہ پیروکار، جذبات میں منقلب اور بے عمل ہوتے ہیں ۔ ۵۹۶
با مقصد شعراء کی صفات، ایمان، عمل صالح، کثیر ذکرِ خدا، اپنے فن سے مومنین کا دفاع ۔ ۵۹۷
پیغمبرؐ پر شاعری کی تہمت، اسلام میں شعر و شاعری کا مقام ۔ ۵۹۷، ۶۰۲

شعیب علیہ السلام اور اہلِ ایکہ

تقویٰ اور اپنی اطاعت کی تبلیغ، پُورا تولنے، حق ادا کرنے اور نقصان نہ پہنچانے کی نصیحت ۵۶۱، ۵۶۵
ظالمانہ منافع خوری کی ممانعت ۵۶۵

شیطانی وسوسوں سے خدا کی پناہ

عذاب سے محفوظ رہنے کے لیے رسُولِ پاکؐ کی دُعا اور پیروان کے لیے درس کہ اپنے آپ کو عذاب سے مامون نہ سمجھیں۔ ۱۲۰، ۱۲۱

صرف ایک قیادت

ہم ہر بستی میں ایک نبی بھیج دیتے، لیکن عالمین کی قیادت کے لیے یہ امر مانع ہے۔ ۴۱۳

طبقاتی تفاوت

دولت مند قسم نہ کھالیں کہ محتاجوں، مہاجروں کی مدد نہ کریں گے، مالداروں کا غریبوں کو دسترخوان پر نہ بٹھانا، طبقاتی فاصلہ کی نفی ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۸

حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے حلقہ بگوش مستضعف افراد کے بارے میں امرائے قوم کی گفتگو اور حضرت نوحؑ کا جواب۔ ۵۲۸

ظُلم

مشرکین نے مقدس و پاک پیغمبر اسلام پر تہمت لگا کر بہت بڑا ظلم کیا۔ ۳۳۵، ۳۴۰

شرک بہت بڑا ظلم ہے، جس نے بھی اس ظلم کا ارتکاب کیا ہم اسے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۳۵۲

عالمِ برزخ کیا ہے !

عالمِ برزخ کی تشریح کے لیے آیات واحادیث و روایات، برزخ وارواح کا ربط، عالم برزخ کا ایک خاکہ۔ ۱۲۸ تا ۱۳٦

عیش وراحت کی زندگی کے منحوس نتائج

پرتعیش راحت کی زندگی اللہ کو بھلا دیتی ہے، لذائذ دُنیا پر فریفتہ ہو کر مبداء و معاد کا انکار، آخر کار تباہی۔ ٦٧، ٦۸

غلط پروپیگنڈا ایک مصیبت ہے

سازشی لوگ غلط باتیں پھیلا کر لوگوں کی فکر کو مسموم کرتے ہیں۔ ۱۹۹، ۲۰۰

فحشاء کی اشاعت سے مراد

عیب پوشی کے حُکم کا ایک مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں گناہ پھیلنے نہ پائے۔ ۱۹۸، ۱۹۹

فرعون سے مقابلہ

حضرت موسیٰؑ کا تعارف، بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ، فرعون نے احسان جتایا کہ بچپن میں پرورش کی۔ ۴٦۹ تا ۴۷۳

فرعون کا مُلک خطرہ میں

عصا سے اژدہا اور یدِ بیضا معجزہ کے طور پر پیش کیے ۴۷۹، ۴۸۲

فرعونیوں کو ہم نے مصر سے نکال دیا

پُرعیش وراحت محلوں اور باغات وغیرہ سے بے دخل کر دیا۔ ۴۹۲ تا ۴۹٦

فرعونیوں کا دردناک انجام

بنی اسرائیل کا تعاقب، ان کی گھبراہٹ، حضرت موسیٰؑ کا اطمینان دلانا، دریا پر عصا مارنا، بنی اسرائیل کی نجات، فرعونیوں کا غرق ہونا۔ ۴۹۸ تا ۵۰۲

فیصلہ تمہارا ضمیر کرے

جب تم مانتے ہو کہ زمین وآسمان اور جو کچھ ان میں ہے سب اللہ کا ہے تو پھر کیوں تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ ۱۱۱، ۱۱۲

قرآن ایک حکیم ودانا کی طرف سے ہے

قرآن اور کتابِ مبین کی تعبیر، عظمتِ قرآن۔
قرآن مومنین کے لیے ہدایت وبشارت ہے ٦۰۷، ٦۱۰

قریبی رشتہ داروں کو دعوتِ اسلام

سب سے پہلے اپنے اقرباء کو شرک اور حکم الٰہی کی نافرمانی سے ڈراؤ، دعوت کا اہتمام، علیؑ کا اعلانِ نصرت، قریش کا استہزاء ۵۸۷ تا ۵۹۲

قلبِ سلیم ہی سرمایۂ نجات ہے

سوائے قلبِ سلیم کچھ کام نہ آئے گا ۵۲۰

قومی اور قبائلی تعصب

تعصب کا مفہوم، قبیلہ، نسل اور وطن سے وابستگی، تعصب پر اقوالِ آئمہؑ اور مذمت ۵۷۷ تا ۵۸۱

کچھ اور عجائباتِ خلقت

اللہ بادلوں کو چلاتا ہے، پانی اور اولے برساتا ہے، جسے چاہتا ہے فائدہ یا نقصان پہنچاتا ہے، ہر شے پر قادر ہے۔ ۲٦۹ تا ۲۷۳

کوردل مغروروں کی منطق

ہم نے اپنے اجداد سے کبھی نہیں سُنا کہ کوئی آدمی نبی بن کر آیا ہو۔ کچھ انتظار کرو کہ اس بیماری سے نجات پالے یا مرجائے۔ ۵۵ تا ۵۷

کیا بنی اسرائیل نے مصر میں حکومت کی

بقولِ بعض بنی اسرائیل مصر میں مدتوں حکمران رہے، دیگر اقوال ! ۴۹٦، ۴۹۷

گمراہوں سے دوستی کا نقصان

اُبی کی دوستی نے عقبہ کو گمراہ و مرتد کردیا۔ اسی طرح ہر بدقماش کی دوستی نامراد کردیتی ہے۔ ۳۷۲

گھر کی چار دیواری کا تحفظ

گھر کی چار دیواری میں داخلہ کے آداب و قوانین تاکہ احترامِ خانہ و آزادی برقرار رہے۔ ۲۱۵ تا ۲۱۷

لاوارث حدیث

ہم گروہ انبیاء ورثہ نہیں چھوڑتے، جو کچھ چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔ ۶۲۷، ۶۳۲

لواطت شرمناک فعل اور خطرناک نتائج

اسراف، فسق، تجاوز، جہل اور قطع سبیل کی تعبیرات و نتائج پر احادیث ۵۵۳ تا ۵۵۵

مجھ سے بات نہ کرو

تمہارے سامنے میری آیات پڑھی گئیں تو تم نے تکذیب کی۔ دُور ہو جاؤ، جہنم میں جاؤ۔ ۱۴۷ تا ۱۵۰

مستضعفین کی عالمی حکومت

روئے زمین پر حکومت، دینِ حق کی اشاعت، خوف و بدامنی کا خاتمہ، اللہ کا یہ وعدہ مُسلمانوں، بالخصوص امام آخرالزماں سے ہے ۲۹۰ تا ۲۹۲

مسرفین کی اطاعت نہ کرو

مُسرفین کی اطاعت فساد ہے۔ اسراف اور فساد فی الارض کا ربط، حضرت صالحؑ کی نصیحتیں، اللہ سے ڈرانا اور اپنی اطاعت کا حکم ۵۴۴ تا ۵۴۶

مصادیقِ نور

قرآن، ایمان، وغیرہ ۲۴۶ تا ۲۴۸

مضطر کون ہے!

آئمہؑ کی ہدایات کے مطابق امام زمانہ عجل فرجہم ۶۹۸، ۶۹۹

معاد پر ایمان قدرتِ خدا کے حوالہ سے

جب ہر طرح اللہ کو قادر و توانا تسلیم کرلیا تو پھر قبروں سے اٹھانا اس کے لیے کیا مشکل ہے! ۱۱۲، ۱۱۴

معبودوں اور گمراہ عابدوں کا جھگڑا

ہم واضح گمراہی میں تھے، تمہیں عالمین کے رب کے برابر سمجھتے تھے۔ افسوس آج کوئی ہماری شفاعت کو موجود نہیں۔ ۵۱۵ تا ۵۲۰

معبود اور پجاریوں کی گفتگو

معبود کہیں گے یہ خود گمراہ ہوئے، تیری نعمات کی ناشکری کی۔ ۳۵۱، ۳۵۲

منکرین کی بہانہ سازیاں

حکیمانہ کلام ہوس آلود خواہشات سے ہم آہنگ نہیں، حق کبھی لوگوں کے میلانات کے تابع نہیں ہوتا۔ ۹۴ تا ۹۸

موت

وہ اپنی غلط روش پر قائم رہتے ہیں، یہاں تک کہ موت انہیں گھیر لیتی ہے۔ ۱۲۴

انسانی زندگی جس میں بچپن، جوانی اور بڑھاپا ہیں بعد از موت ایک طولانی زندگی کا پیش خیمہ ہے موت زندگی کا اختتام نہیں۔ ۱۵۵، ۱۵۶

موت و حیات بروئے قرآنِ مجید

جن میں حق بات سُننے کا شعور نہ ہو، قرآن ان زندہ لوگوں کو مردہ کہتا ہے اور شہدائے راہِ خدا قرآن کی رُو سے زندہ ہیں۔ ۱۵ تا ۱۷

میری اُجرت تمہاری ہدایت ہے

تم ہدایت پا جاؤ بس یہی میری اُجرت ہے ۴۱۶ تا ۴۱۹

میں ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں

جس نے مجھے پیدا کیا اور ہدایت کی، کھلاتا پلاتا ہے، بیمار ہو جاؤں تو شفا دیتا ہے، وہی موت دے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا۔ ۵۰۵ تا ۵۱۰

ناممکن تقاضا

آستانۂ موت، اعمال کی سزا سامنے آنے پر نیک عمل و تلافئ مافات کے لیے واپسی کا تقاضا ناممکن بات ہے۔ قیامت ہی میں اٹھائے جائیں گے۔ ۱۲۵، ۱۲۶

نامہ نگاری کے آداب

سلیمانؑ کا خط خداوندِ رحمٰن و رحیم کے نام سے، عبارت مختصر و جامع۔ آئمہؑ کی نامہ نگاری کے نمونے ۶۵۱ تا ۶۵۴

نباتات میں زوجیت

نباتات کی افزائش نر و مادہ نطفوں کے ذریعہ ۴۶۰ تا ۴۶۲

نوحؑ نجات پا گئے، مشرک غرق ہوئے

خدایا! میری قوم اور میرے درمیان جدائی ڈال دے ۵۳۰، ۵۴۱ هم نے نوحؑ کو جو کشتی میں تھے، سب کو نجات دی، مشرکوں کو غرق کردیا۔ ۵۳۲

والدین کے کمرہ میں آنے کے آداب

تمہارے چھوٹے بچے اور غلام قبل از صبح، دوپہر میں آرام کے وقت اور بعد نماز عشاء تمہارے کمرہ میں اجازت لے کر داخل ہوں۔ ۹۸ تا ۱۰۲

والدین کے کمرہ میں جانے کے لیے اجازت لینے کا فلسفہ۔ ۱۰۳ تا ۱۰۵

وہ ہر نئی چیز سے خوف کھاتے ہیں

حق سے بے پرواہی، روگردانی، اس کے بعد تکذیب و انکار اور بالآخر استہزاء کرتے ہیں ۴۵۵ تا ۴۵۹

وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں

اگر وہ لمبی عمریں پائیں، پھر ہمارا عذاب پہنچے، پھر بھی دُنیا کی عیش و راحت ان کے لیے فائدہ مند نہ ہوگی۔ ۵۸۲، ۵۸۵

ھٰذا من فضل ربّی

یہ سب کچھ میرے پروردگار کا عطیہ ہے (سلیمانؑ) ۵۶۶، ۵۶۷

ہر جگہ منطقی دلائل کی دعوت

قرآن پاک دلیل کا مطالبہ کرتا ہے اور خود اپنی حقانیت پر دلیل رکھتا ہے۔ ۶۹۹، ۷۰۰

ہوس پرستی اور اس کا بھیانک انجام

ہوس پرستی کفر و بے ایمانی کا سرچشمہ ہے ۳۹۴

اس شخص سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں جو نفسانی خواہشات کا پیرو ہے۔ ۳۹۵

ہوس پرستی پر مزید ارشاداتِ قرآنی اور ارشاد جناب امیرؑ۔ ۳۹۵ تا ۳۹۸

مقامات

اٹلی

اطالیہ، جنوبی یورپ کا ایک مُلک ۷۳۵

احقاف

یمن کے قریب جہاں حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے ۳۸۵

ایکہ

مدین کے نزدیک ایک آبادی ۵۶۱

بیت المقدس (قبلہ اوّل) ۷۸

پولینڈ

برتک سائنسدان کا وطن مشرقی یورپ ۷۳۵

حضرموت

بقولے اصحاب الرّس کا علاقہ ۳۸۷

دمشق

شام کا دارالحکومت ۷۸

رملہ

بقولے بیت المقدس کے شمال میں ایک شہر ۷۸

سبا

یمن کے قریب ملکہ سبا کا مُلک ۶۴۵

سویڈن

شمالِ مغربی یورپ کا ایک مُلک ۴۶۱

مدین

حضرت شعیبؑ کا وطن ۵۶۲

مصر

شمالی افریقہ کا ایک مُلک ۷۸

مکّہ

مرکز اسلام ۶۷۳، ۷۲۷، ۷۳۹

ناصرہ

شامات کا ایک شہر۔ بقولے جائے ولادت حضرت عیسیٰؑ۔ ۷۹

وادی القریٰ

حضرت صالح علیہ السلام کی بستی ۶۸۰

وادی النمل

چیونٹیوں کی سرزمین۔ غالباً طائف کے قریب ۶۳۴

یمامہ

ایک علاقہ جہاں حنظلہ پیغمبر مبعوث ہوئے ۳۸۶

٭ ٭